سیرتِ سرورِ عالم ﷺ

(پر مستشرقین کے اعتراضات کے جوابات)

(جلد دوم)

ماسٹر محمد نواز

سیرتِ سرورِ عالم ﷺ

(پر اعتراضاتِ مستشرقین کے جوابات)

ماسٹر محمد نواز

(ریٹائرڈ ایس۔ایس۔ٹی، انچارج ہیڈ ماسٹر)

حسنِ ادب ،فیصل آباد

ASIAN RESEARCH INDEX

"جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ ہیں"

کتاب: سیرتِ سرورِ عالمؐ
پر اعتراضاتِ مستشرقین کے جوابات
(جلد دوم)
مصنف: محمد نواز
ترتیب و تدوین: اقرار مصطفیٰ
حروف بندی: عامر عباس (733 گ۔ب)
نظرِ ثانی: طالب حسین کوثری
پروفیسر عمر عادل (ساہیوال)
سرورق: عارف حسین عارف
ناشر: حسنِ ادب آباد
اشاعت: 2022ء
قیمت: 1200
رابطہ: 0321-6568941
ARI ID: 1689956752314

OPEN ACCESS
cc BY
ECO FRIENDLY
Licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License

انتساب

حضور نبی کریم احمد مجتبیٰ، محبوبِ خدا

محمدِ مصطفیٰ

کی خدمتِ اقدس میں

بہ صد عجز و نیاز

اشارات برائے مطالعہ

عبارت میں جہاں یہ علامتیں استعمال ہوئی ہیں ان کی تفصیل کچھ یوں ہے۔
ن: نقوش رسول نمبر
ص: صفحہ نمبر
ج: جلد نمبر
م۔م۔ک۔الف۔ف: مستشرقین مغرب کا اندازِ فکر
الف۔ن۔پ: اعلان نبوت سے پہلے
ش: شبلی نعمانی کی سیرت مراد ہے
اگر ۱۱/۶۰۷ جیسا لکھا ہو تو جلد اور صفحہ دونوں مراد ہوں گے
س: سیرت النبیؐ
س۔ش: سیرت النبی،شبلی نعمانی

ترتیب

❖ وصیتِ علم وعمل ٦
❖ کارِ سعادت ٩
❖ بنات النبی (اثبات اربعہ) ٣٣
❖ تعداد ازواج ٥٧
❖ کعبہ کی تعمیر نو ٩٥
❖ غارِ حرا ٩٩
❖ ابتدائے وحی ١٠٨
❖ مقاطعہ قریش ١٧٨
❖ سفر طائف ١٩٤
❖ اسرا و معراج ٢٠٠
❖ شق القمر ٢٠٤
❖ ہجرت مدینہ ٢٢٥
❖ مواخات مدینہ ٢٥٣
❖ تحویل قبلہ ٣١٩
❖ صلح حدیبیہ ٣٤٠
❖ غزوہ خندق ٤٦٧
❖ خطبہ حجۃ الوداع ٤٨٠
❖ وصال مبارک ٥٠٣

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

وصیتِ علم وعمل

وجودِ انسانی کے ارتقا کی تاریخ کو نظرِ غائر سے دیکھا جائے تو اس کی تمام تر ترقی ''علم'' کی مرہون منت ہے۔علم ہی وہ اکائی ہے جس میں تہذیب وتمدن اور تربیت کے سوتے پھوٹتے دکھائی دیتے ہیں۔علم کی خصوصیت کی وجہ سے انسان اشرف المخلوقات ہے اس کے سبب سے اسے فرشتوں پر فضیلت ملی اور اسی کی بدولت خلافت کا تاج سر پر سجا۔حدتو یہ ہے کہ پہلی وحی کا آغاز ہوا۔ارشاد ربانی ہے ترجمہ:''اپنے پروردگار کے نام سے پڑھ جس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا''۔یہ بھی ارشاد ربانی سنتے چلیے۔ ترجمہ:''اللہ تم میں سے ایمان والوں اور علم والوں کے درجات بلند فرماتا ہے''۔قرآن کریم میں ہی اللہ پاک نے اپنے نبی مکرم ﷺ کو یہ دعا عطا فرمائی۔ترجمہ:''کہو،اے میرے رب میرے علم میں اضافہ فرما''۔حدیث شریف میں آتا ہے کہ''علم حاصل کرنا ہر مسلمان (مرد اور عورت) پر فرض ہے'' یہی وہ علم ہے جس کی افضلیت کے پیشِ نظر حضرت علی کرم اللہ وجہ فرماتے ہیں''ہم اللہ تعالیٰ کی اس تقسیم پر راضی ہیں کہ اس نے ہمیں علم عطا کیا اور جاہلوں کو دولت دی کیوں کہ دولت تو عنقریب فنا ہو جائے گی اور علم کو زوال نہیں''۔

تاریخ انسانی میں ایک خواہش جو اپنے تمام تر مدارج سمیت جھلک رہی ہے وہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنی جداگانہ شناخت اور منفرد پہچان کا متمنی ہے اور اس خواہش کی تکمیل کے لیے مثبت اعمال وافعال بروئے کار لاکر ہی ازلی وابدی پہچان تک رسائی حاصل کر لینا اصل شناخت اور پہچان ہے۔اہل علم جانتے ہیں کہ یہ اسی وقت ممکن ہے جب علم کو اوڑھنا بچھونا بنالیا جائے اور فضل باری تعالیٰ بہ وسیلہ نبی مکرم ﷺ کا اقرار دل وجان سے کیا جائے۔

اگر غور وخوض سے کام لیا جائے تو یہ عمل عین فطرت ہے اور فطرت بھی اپنے اظہار کے لیے ہر دو حوالہ سے سرگرم عمل ہے۔میرے والد مرحوم (ماسٹر محمد نواز،ایس ایس ٹی،انچارج ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول 736 کمالیہ) درس وتدریس سے دم آخر تک منسلک رہے گو وہ 60 سال کی عمر میں ریٹائرڈ ہوئے،مگر اس کے بعد بھی علم تقسیم کرنے سے کبھی پیش وپس نہ کیا۔اس حوالے سے ان کا نظریہ اس شعر کے مصداق تھا کہ

سینے میں ہی دبانے سے کس کام کا ہے علم
تقسیمِ رزقِ فکر سے اس کا ثمر سمیٹ

ماسٹر محمد نواز میں وہ تمام اوصاف موجود تھے جو شرف انسانی کو ضروری خیال کیے جاتے ہیں۔ان کی زندگی کا ایک ایک پہلو نمایاں ہے۔اگر ان پہلوؤں پر قلم فرسائی کروں تو کئی دفتر تحریر ہو جائیں۔مگر میں ایسا اس لیے نہیں کروں گا کہ نہ تو قصیدہ نگاری مقصد ہے نہ ہی یہ سوانح نگاری کا محل ہے اور نہ ہی ان کو

کبھی ایسی خواہش رہی، بس ایک پہلو جوا کائی کی صورت ہے، جس سے زندگی کے تمام پہلوؤں میں سر سبزی دکھائی دیتی ہے وہ ہے علم۔ وہ علم سے منور، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حقیقی حب دار اور درویش صفت انسان تھے۔ ان کی شخصیت ڈاکٹر محمد علامہ اقبال کے اس شعر کی عملی تفسیر تھی۔

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

ان کی علمی اثاث اور علمی موانست جوان کے تمام شاگردان، دوست احباب، تکلف کی ملاقات والے، رشتہ دار، خاندان اور انجان ہر ایک میں یکساں تقسیم ہوئی، جس سے مستفیض ہو کر اب تک بہت سے حضرات زندگی کو شاداب کیے ہوئے ہیں۔ انھیں علم، صاحبانِ علم، تشنگانِ علم اور متلاشیانِ علم سے محبت تھی، ان کا سونا، جاگنا، اٹھنا، بیٹھنا سب کچھ علم، حصول علم اور تقسیم علم کے لیے وقف تھا۔ حتیٰ کہ وفات سے کچھ دن قبل انھوں نے مجھے وصیت فرمائی جو وصیت کی وصیت اور دعا کی دعا تھی۔ فرماتے ہیں کہ ''ساری زندگی مجھے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے کبھی کسی چیز کی کمی نہیں رہنے دی ہمیشہ نوازشات کا سلسلہ جاری رہا اور ان شاء اللہ تمہیں بھی کبھی اللہ اور اس کا رسول ﷺ کسی بھی چیز کی کمی نہیں رہنے دے گا۔ میری تالیف جو نبی آخر الزماں کی سیرت کے حوالہ سے اُن ﷺ کی شفقت، محبت اور اللہ پاک کے فضل سے مکمل ہوگئی ہے اس کی اشاعت لازمی کروانا''۔

میں نے عرض کی کہ آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں؟ ہم مل کر اس کتاب کو زیورِ طباعت سے آراستہ کر کے منصۂ شہود پر لائیں گے۔ وہ زیر لب مسکرائے اور یوں گویا ہوئے کہ ''نہیں، میں نہیں ہوں گا یہ کام تجھے کرنا ہے''۔ اس وصیت اور دعا کے چند روز بعد وہ انتقال فرما گئے۔ مجھے ان کی سنائی ہوئی حدیث یاد پڑتی ہے کہ حضرت ابوقتادہؓ بیان کرتے ہیں کہ ''رسول خدا ﷺ نے فرمایا کہ آدمی اپنی موت کے بعد جو کچھ دنیا میں چھوڑ جاتا ہے اس میں تین چیزیں بہترین ہیں۔ ایک نیک اولاد (جو بعد میں اس کے لیے دعائے خیر کرتی رہے)، دوسری صدقہ جاریہ (کنواں، نلکا، سرائے یا سڑک وغیرہ تعمیر کروائے) کا اجر ملتا رہتا ہے اور تیسری، وہ علم (جس پر اس کے بعد عمل ہوتا رہتا ہے)''۔ ابن ماجہ، فضائل اخلاق، کتاب اسوہ حسنہ جلد دوئم صفحہ نمبر 270۔

علم دو حیثیتوں سے باقی رہتا ہے ایک صورت یہ ہے کہ علم دوسروں کو سکھایا جائے اور انہیں اس پر عمل کی تلقین کی جائے، جسے عرف عام میں سینہ بہ سینہ علم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دوسری صورت یہ کہ انسان اپنا علم کتابی صورت میں پیش کرے جو اس کے بعد پڑھا جائے اور اس پہ عمل ہوتا رہے۔ لہٰذا علم کی ان دو حیثیتوں کی پہلی صورت جو سینہ بہ سینہ علم کی ہے اس میں محمد نواز احسن طریقہ سے سینوں کو علم سے منور کرتے رہے، جبکہ دوسری صورت کتابی صورت ہے جس کے لیے حدیث، وصیت اور دعا کی روشنی میں

سبک دوش ہونے کا قصد کیا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اس کے محبوب ﷺ کے وسیلہ سے میں اس کتاب کو منظر عام پر لانے میں کام گار رہا۔ کتاب کی حروف بندی پہ نظر ثانی (proof reading) کے لیے اور خاص کر کے قرآنی آیات کے لیے حفاظ اکرام نے کمال محبت دکھائی ممکن ہے اب بھی کہیں آیات کے اعراب درست نہ ہوں اس کے لیے پیشگی معذرت، اور آپ حضرات سے استدعا ہے کہ اگر کہیں کوئی اعرابی غلطی نظر آئے تو مطلع فرمائیں تا کہ آنے والی مزید اشاعتوں میں اس کو رفع کیا جا سکے۔

جو احباب اس کتاب کے لیے مدد و معاون ثابت ہوئے، اللہ پاک ان سب احباب کی توفیقات میں اضافہ فرمائے اور انہیں سلامت و شاداب رکھے۔

میری طرف سے آپ کو ہر دم دعا برائے خیر
صبح و مسا ہو آپ پر نظر خدا برائے خیر

یہ کتاب جہاں مرحوم محمد نواز کے لیے توشہ آخرت ہے وہیں میرے لیے بھی دنیا و آخرت کی کامرانی اور کامیابی کا ذریعہ ہے۔ کیوں کہ اسی کے ساتھ باپ کی دعا ہمیشگی کا روپ لیے ہوئے سایہ فگن ہے۔ اللہ پاک میرے والد مرحوم کے درجات بلند فرمائے اور اپنے محبوب کے صدقے صالحین، صادقین، صابرین، شاکرین، عابدین، ذاکرین اور سچے سُچے علما و فضلا کے ساتھ بروز حشر اٹھائے (آمین ثم آمین)

اقرار مصطفیٰ

کمالیہ، ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ

☆☆☆☆☆☆

کارِ سعادت

قیاس ذاتی کسی بھی اعتراض گزار کی بنیادی قوت ہوتی ہے جسے وہ شعور (خود ساختہ شعور جو آرٹ کے درجے میں ہے) کے ذریعے کسی معروضی حقیقتِ مطلق کو اپنے شعور کے مطابق قیاس کر کے مسرور ہوتا ہے تبھی کہا جاتا ہے خود سے یگانگی حقیقت سے بیگانگی کے مترادف ہوتی ہے۔ ہر ہیچ مدان و ناتواں کو اپنے عقلِ کل ہونے کا زعم وقوف سے عاری کرتا ہے اس لیے مضحکہ خیز اعتراضات کو فتوحات گردانتا ہے۔ حالاں کہ راست علم ہمیشہ کسی واقعی معروض کی تمیز سے اٹھتا ہے یعنی موجود پر قوتِ امتیاز یا وجدانی ادراک کے ذریعے جوہر کے اسما و شناخت کا سفر طے کیا جاتا ہے۔ ہر چند ہر مذہب موضوعِ علم بننے کی پوری استطاعت رکھتا ہے۔ ہاں مگر ناظر کا صاحبِ وجدان ہونا از حد ضروری ہوتا ہے۔ چوں کہ ہر قضیہ وجدانی ادراک کے متحرک ہونے سے جنم لیتا ہے۔ ہم زمان و مکان کا ادراک اسی استعداد کی تحریک سے کرتے ہیں۔ اسی لیے ایک طے شدہ امر ہے کہ شعورِ علمی کی تشکیل میں خارجی معروض کا ہونا بنیادی حیثیت کا حامل ہے۔ اگر خارجی معروض اور اس سے منسوب شعورِ انسانی میں مطابقت نہ ہو تو قضیہ کے بجائے بے بنیاد مناقشات ظہور کرتے ہیں، جن پہ خارجی واقعیت دلالت نہیں کرتی اور نتیجہ خیز حقانیت کی راہیں بھی برابر مسدود ہوتی جاتی ہیں۔ جب معترضین اپنے خود ساختہ علم کا قابلِ قبول شعور پیدا کرنے سے قاصر ہو جاتے ہیں تو اس کی غلط توجیہات پر قانع ہونے کے شعور سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ اکثر یوں ہوتا ہے کہ نظریاتی تسکین جب بھی ضرورت سے زیادہ بڑھ جاتی ہے تو معیاری اور یقینی علم کو محال کر دیتی ہے۔

اعتراض محاذ تب بنتا ہے جب علمی کے بجائے ذاتی تسکین اور ضرورت سر بلند ہو کر دل و دماغ پر چڑھ دوڑتی ہے۔ سوال بنیادی طور پر غذائے علم و جستجو ہے۔ شعور کا عینی، واقعی اور آزادانہ تحرک نہ ہو تو ہر قسم کے قضایہ دم توڑ دیں۔ سچ یہ ہے کہ علم اور علم کی صورت گری مماثلت و مغائرت سے ہی ممکن ہے۔ تخالف کبھی علم و امکان کے در بند ہونے نہیں دیتا البتہ اس کی نوعیت کا فطری اور حقیقی ہونا لازم ہے۔

اسلام اور پیغمبرِ اسلام، حضور ﷺ کی سیرت مبارک پر اعتراضات کی نوعیت عالمانہ اور محققانہ کی بجائے بالعموم متعصّبانہ، مخالفانہ یا عدم واقفیت کی بنا پر رہی ہے۔ موضوعات و محتویات میں تحقیق و تجزیہ کی کارفرمائی نہ ہونے کے مترادف ہے۔ اکثر معترضین کا مدعا مخالف کی دل آزاری اور آزردگی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اس لیے حقائق کو توڑ موڑ کر بیان کرنا قیاسی روایت و درایت پہ ایمان لانا، تاریخی معلومات اور جغرافیائی اعتبار سے بعض آیاتِ قرآنی کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنا، معترضین کا شیوا رہا ہے۔ ایسی ناانصافیاں صدیوں سے چلی آ رہی ہیں۔ بعض معترضین (مذہبِ غیر کے حامل) حقانیت اسلام کی بابت حق

گئی اور تسلیمات سے جی خوش ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ''جان ڈیون پورٹ'' اور ''گارڈ فری'' کی کتب معتبر ہیں۔ بے بنیاد اعتراضات، بے جا طرف داری اور تنگ نظری کی مثال ولیم میور ایسے مورخ بھی ہیں جو حقائق کو مسخ کرنے اور انھیں اپنے مقصد کی بجا آوری میں استعمال کرنے کے ماہر ہیں۔ ولیم میور کی کتاب ''لائف آف محمدؐ'' جب سر سید کی نظر سے گزری تو ان کی حالت یوں ہوئی کہ ''ان دنوں ذرہ قدرے دل کو سوزش ہے۔ ولیم میور صاحب کی کتاب کو میں دیکھ رہا ہوں۔ اس نے دل کو جلا دیا۔ اور اس کی ناانصافیاں اور تعصّبات دیکھ کر دل کباب ہو گیا'' حقائق کی راست بازیافت میں کوتاہیوں کی داستان صرف غیر مذہب معترضین نے ترتیب نہیں دیں بلکہ ان کے اعتراضات کو ہوا دینے میں اکثر مسلمان مفسرین نے بھی حصہ ڈالا ہے۔ ابتدائی کتب احادیث و سیر میں مفسرین نے بعض روایات کو طبعی جولان سے زیبِ داستان کیا ہے۔ جس پر مخاصمین نے انحصار کر کے اعتراضات کو تقویت دی ہے۔ یعنی غیر تو غیر ہی تھے اپنوں نے بھی ایسے کام انجام دینے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ سر سید لکھتے ہیں ''اپنی تصنیفات کا حجم بڑھانے کی نیت سے مفسرین اور اہلِ سیر نے تمام مہمل اور بے ہودہ افسانوں کو جو عوام الناس میں مشہور تھے بہ کمالِ آرزو جمع کر کے اپنی کتابوں میں درج کر لیا ہے۔ بعض نے اپنی تفسیروں میں واعظین کے لیے دل چسپ اور عجیب و غریب حمکاء کے خوش کرنے کے لیے دور از عقل و قیاس مضامین جو یہودیوں کے ہاں مروج تھے جمع کر دیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سی حدیثیں جناب پیغمبرؐ خدا کے نام سے جھوٹی اور موضوع بنائی گئیں'' (خطباتِ احمدیہ، ص ۸۰، ۸۱) حالاں کہ ایسی من گھڑت باتوں کی وہاں کیا ضرورت ہو سکتی ہے جہاں ایک ایسی ذات ہو جو بے شمار خصائل (وحدت، کثرت، اولیت، آخریت، بے مثالیت، خیریت) کی حامل ہو۔ اپنی مثال آپ ہو اور سچ یہ ہے کہ جن کی محبت ایمان کی بنیاد ہو اور صاحبِ ایمان ہونے کا واحد اور حتمی ذریعہ ہو۔

انھی ضعیف روایات کے سبب بعض سائنسی نکتہ نظر کے حامل افراد اکثر کہتے رہتے ہیں۔ یہ احادیث کی کتب ہیں یا تاریخ کی۔ اس سوال کا جواب جو بھی ہو یہ طے ہے کہ اس منفی پہلو نے معترضین کے اعتراضات کے لیے راہ ہموار کی۔ حقیقت یہ ہے ذرائع علم کے ماخذ کا مضبوط ہونا از حد ضروری ہے۔ جب ذرائع علم ہی بدل جائیں یا ماخذ غیر مستند ہو تو ہر توضیع و تفسیر بلا جواز ہو گی۔ تاریخ شاہد ہے کہ بعض مسلم محققین نے اعلیٰ و ارفع مقاصد کی بجا آوری کے لیے روایت و درایت کے بے مثل تحقیقی اصول و ضوابط کی مضبوط بنیادیں رکھیں۔ اس ضمن میں ان کا حزم و احتیاط کا سلیقہ واقعتاً قابلِ قدر اور قابلِ فخر ہے۔ کسی بھی کم فہم راوی کو ''مجروح'' اور اس کی روایت کو بلا تکلف ''مردود'' قرار دیا ہے۔ ان کے معیارِ تحقیق پر اقسامِ حدیث (مرفوع، موقوف، قولی و فعلی و تقریری، نیز آحاد و متواتر، مشہور و عزیز و غریب، صحیح و حسن، مقبول و مردود وغیرہ) گواہ ہیں۔ درایت کی بابت منافقین کی افترا پردازی کی قلعی کھولنے کے لیے

سکہ و مستند ہونے کے ساتھ منطقی صحت امانت، دیانت، صداقت کو معیار بنایا۔ روایت کے ضمن میں راوی کے لیے کوئی رو رعایت نہیں رکھی۔ ہر دو طرح کی چھان بین کو خارجی، نقد یا نقدِ سند سے گزارا۔ جب کہ متنِ حدیث کی پرکھ کے لیے نقد یا نقدِ متن کے پیمانے وضع کیے۔

تحقیق کی بابت کسی بھی محقق کا فی نفسہٖ معتدل و متوازن و غیر محتسب، حق گو و عالم فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ موضوع سے طبعی مناسبت کا ہونا از حد ضروری ہے۔ اندازِ تحقیق سائنسی ہو یا اطلاقی نتائج کا منطقی پہلو زور دار اور پروقار ہونا چاہیے۔ جوشِ خطابت میں بے جا طوالت یا پھر زعمِ علمیت میں ہٹ دھرمی دلائل کے بجائے طبعی مناسبت کو ترجیح محقق کے لیے زہرِ قاتل کے مصداق ہے۔ ان معیارات کو اپناتے ہوئے اور حشو و زوائد سے بچتے ہوئے محمد نواز صاحب (جو پیشہ کے اعتبار سے درس و تدریس سے وابستہ رہے ہیں) نے شاندار علمی و تحقیقی کارنامہ ''سیرتِ سرورِ عالم پر مستشرقین کے اعتراضات کے جوابات'' کے نام سے ترتیب دیا ہے، جس میں اسلام اور پیغمبرِ اسلام پر اعتراضات کو حقائق اور دلائل سے بے بنیاد ثابت کرنے کی بہترین کوشش کی ہے۔ میرے نزدیک ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے دستاویزی تحقیق میں سائنسی اور منطقی طریقے کو ترجیح دی ہے۔ حقائق پسندی میں اس قدر دلچسپی مثالی ہے کہ کسی بھی مرحلے پر جذباتی اسلوبِ بیان کی چھاپ نہیں پڑنے دی۔ مسائل کو استخراجی اور استقرائی طریق پر قوتِ استدلال کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں انھیں اخلاقی معیار قوتِ ارتکاز مسلسل توجہ، استقامت اور بااصول جدوجہد پر داد دیتا ہوں۔ ہمارا ایمان ہے کہ ایسے کام کیے نہیں جاتے بلکہ کروائے جاتے ہیں۔ یقیناً یہ کارِ سعادت انھی کے حصے میں آیا ہے۔ اسی لیے موصوف نے اداروں کا کام تنہا کر دکھایا۔ سیرتِ طیبہ کے اعتراضات کے جواب میں وسیع خزینہ تیار کیا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب اکرم ﷺ کے صدقے اس علمی و تحقیقی کاوش کو اپنی بارگاہ میں خاص مقام عطا فرمائے۔ سیرت کے باب میں ان کی خدمات قبول فرمائے اور نافع بنائے۔ امین

ڈاکٹر غلام شبیر اسد

جھنگ، ۲۔ رمضان، ۱۴۴۳ھجری

اعتراض نمبر ۱۵۹

بعض کا کہنا ہے کہ قرآن میں چار سے زیادہ بیویوں کی اجازت نہیں اور حضور ﷺ قرآن کے خلاف کوئی فعل نہیں کر سکتے تھے اس لیے یہ قصہ ہی غلط ہے کہ حضور کی نو بیویاں تھیں۔

جواب: آپ ﷺ وحی الٰہی کی پیروی فرماتے تھے۔قرآن مجید میں ہے''ان اتبع الا ما یو حیٰ الیٰ (احقاف:۹) ترجمہ'' آپ ﷺ کہہ دیجئے کہ میں صرف وحی کی پیروی کرتا ہوں''۔اس کے ساتھ یہ بات جان لینی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے افعال معلل بالاغراض نہیں ہوتے مثلاً۔کیا کوئی شخص بتا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہنم کے انیس فرشتے کیوں مقرر کیے؟ رسل ملائکہ چار کیوں پیدا کیے' زیادہ پیدا کر دیتا تو کیا حرج تھا؟ سات آسمان کیوں بنائے' کم وبیش کیوں نہیں بنائے۔۔۔؟ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی جو عمر طبعی مقرر کی ہے اس سے کم یا زیاد کیوں نہ تھی؟ جنات ہمیں دیکھتے ہیں ہم انہیں دیکھ سکتے اس کا الٹ کیوں نہ کر دیا؟ انبیاء علیھم السلام جتنے بھیجے اس سے کم یا زیادہ کیوں نہیں بھیجے' بیوہ کی عدت پہلے ایک سال رکھی تھی '' والذین یتوفون منکم و یذرون زواجاً وصیتہ لا زواجھم متاعاًالی الحول غیر اخراج : (البقرہ:۲۴۰) بعد میں اس آیت کا حکم نسخ کر کے چار ماہ دس دن عدت کیوں رکھ دی' کم یا زیادہ ہو جاتی تو کیا حرج تھا۔کیا اللہ پہلے نہیں جانتا تھا کہ ایک مسلمان کو دس کافروں سے لڑنے کا مکلّف بنایا: ان یکن منکم عشرون صابرون یغلبوا ما ئیتین وان یکن منکم مائۃ یغلبوا الغامن الذین کفروابأ نھم قوم لا یفقھون (انفال ۵۔۶) کیا اللہ تعالیٰ پہلے نہیں جانتا تھا کہ ایک مسلمان دس کافروں سے نہیں لڑ سکتا اگر جانتا تھا تو پہلے دس کافروں سے لڑنے کا حکم کیوں دیا؟ مطلقہ عورت کی عدت تین حیض رکھی' تین حیض سے کم یا زیاد کیوں نہ رکھی۔۔۔نکاح میں عورت کی اجازت ضروری ہے تو طلاق میں اس کی اجازت کا دخل کیوں نہیں رکھا اور صرف مرد کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ کیوں رکھی' بیدی عقدۃ النکاح'' کیا عورت مخلوق نہیں ہے۔۔۔ایسے سوالات کا حل محض عقل سے ممکن نہیں اور ان کے جواب میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے افعال معلل بالاعراض نہیں ہونگے وہ جو چاہیے شریعت بنائے' جو چاہیے کرے وہ کسی بات کا جواب دہ نہیں ہے اور یہی اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہے جو مالک علی الاطلاق ہے جس کی شان ہے۔

ویفعل اللہ ما یشاء (ابراھیم:۲۷)۔۔۔اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔

فعال لمایرید ۔۔۔(بروج:۱۶)۔اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے وہ سب کرنے والا ہے۔

لا یسئلو اعما ل یفعل وھم یسئلون (انبیاء:۲۳)۔۔اللہ تعالیٰ کسی فعل پر جواب دہ نہیں اور بندوں سے ان کے افعال کا سوال کیا جائے گا۔(تبیان القران:۲۔۳۳۳)

سورہ الاحزاب (۵۰-۵۳) میں اس قسم کے اعتراضات کا دوٹوک رد کر دیا گیا ہے ارشاد ربانی ہے جس کا ترجمہ ہے ''اے نبی! ہم نے تمہارے لیے حلال کر دیں وہ بیویاں جن کے مہر تم نے ادا کئے ہیں اور وہ عورتیں جو اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ لونڈیوں میں سے تمہاری ملکیت میں آئیں اور تمہاری وہ چچا زاد اور ماموں زاد اور خالہ زاد بہنیں جنہوں نے تمہارے ساتھ ہجرت کی اور وہ مومن عورت جس نے اپنے کو نبی کے لیے ہبہ کیا ہو' اگر نبی ان سے نکاح کرنا چاہیں' یہ رعایت خالصتاً تمہارے لیے ہے دوسرے مومنوں کے لیے نہیں ہے ہم کو معلوم ہے کہ تمام مومنوں پر ان کی بیویوں اور لونڈیوں کے بارے میں ہم نے کیا حدود عائد کی ہیں تمہیں اختیار ہے کہ اپنی بیویوں میں سے جسے چاہو اپنے سے الگ رکھو جسے چاہو اپنے ساتھ رکھو اور جسے چاہو الگ رکھنے کے بعد اپنے پاس بلالو اس معاملہ میں تم پر کوئی مضائقہ نہیں ہے اس طرح زیادہ توقع ہے کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں گی اور وہ رنجیدہ نہ ہوں گی اور جو کچھ بھی تم ان کو دو گے اس پر وہ سب راضی رہیں گی۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ تم لوگوں کے دلوں میں ہے اور اللہ علیم اور خبیر ہے اس کے بعد دوسری عورتیں تمہارے لیے حلال نہیں ہیں اور نہ ہی اس کی اجرت ہے کہ ان کی جگہ اور بیویوں کو لے آؤ خواہ ان کا حسن کتنا ہی پسند ہو البتہ لونڈیوں کی تمہیں اجازت ہے' اللہ ہر چیز پر نگران ہے ''۔ اللہ پاک نے نبی مکرم ﷺ کو اجازت دی کہ ان نو بیبیوں کے بعد آپ کے لیے دوسری عورتیں حلال نہیں اور نہ ان کو الگ کر کے دوسری ازواج کرنا حلال ہے اگرچہ ان دوسری عورتوں کا حسن بھی آپ کو بھاتا ہو۔ پھر اس ارشاد خداوندی کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیجئے۔ ترجمہ: ''اور تمھیں نہیں پہنچتا کہ رسول اللہ کو ایذا دو اور نہ یہ کہ ان کے بعد کبھی ان کی بیبیوں سے نکاح کرو''۔ یعنی جس عورت سے آپ کا نکاح ہوتا ہے آنحضرت ﷺ کے سوا ہر امتی پر وہ ہمیشہ کے لیے حرام ہو جاتی ہے اور حکم خداوندی ''النبی اولی بالمومنین من انفسهم و ازواجه امهاتهم'' (سورۃ احزاب۔۶) ترجمہ: نبی مومنوں کے ساتھ خود ان کے نفس سے بھی زیادہ تعلق رکھتے ہیں آپ کی بیویاں ان کی مائیں ہیں''۔ اس لیے حضور کا ان سب کو بے یار و مددگار چھوڑنا محال ہے۔ ان سب کو زوجیت میں رکھنا لازم و ناگزیر ہے اور ان مادران ملت کو فرزندان امت کے حوالے نہیں کیا جا سکتا' جس کی ممانعت امهاتهم سے واضح ہے اور نہ ہی بے سہارا چھوڑا جا سکتا ہے۔ اس بے کس پناہ ہستی کی رحمۃ اللعالمینی کا تقاضا بھی یہی تھا کہ ان تمام ازواج کو اپنے حرم ہی میں رکھتے اور یہی منشائے ایزدی بھی تھا۔

اعتراض نمبر ۱۶۰

مستشرقین کہتے ہیں کہ حضرت مسیح ؑ نے شادی نہیں کی اور آنحضرت ﷺ نے کئی شادیاں کیں' اس سے وہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ مسیح ؑ کو خواہشات پر مکمل کنٹرول حاصل تھا۔ اس لیے انھیں شادی

کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ دوسری طرف آنحضرت ﷺ نے متعدد عورتوں سے شادیاں کیں گویا انھیں خواہشات پر قابو نہ تھا بل کہ ان پر ہوائے نفسانی وشہوانی کا غلبہ تھا۔ یہ کتنا تفاوت ہے کہ ایک نبی کو اپنی خواہشات پر کنٹرول حاصل ہے جب کہ دوسرا مدت العمر اپنی خواہشات کی تسکین کے لیے کوشاں رہا۔

جواب: پہلی بات تو یہ ہے کہ ان دو مقدس ہستیوں میں موازانہ ٹھیک نہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے خود ان کی درجہ بندی کا اعلان کر دیا۔ ارشاد ربانی ہے۔ تلك الرسل۔۔۔۔۔یفعل ما یرید ''ترجمہ: یہ رسول ہیں کہ ہم نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر افضل کیا ان میں کسی سے اللہ نے کلام فرمایا اور کوئی وہ ہے جسے سب پر درجوں میں بلند کیا اور ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ کو کھلی نشانیاں دیں اور پاکیزہ روح سے اس کی مدد کی اور اللہ چاہتا تو ان کے بعد والے آپس میں نہ لڑتے بعد اس کے کہ ان کے پاس کھلی نشانیاں آچکیں اور لیکن وہ مختلف ہو گئے ان میں کوئی ایمان پر رہا اور کوئی کافر ہو گیا اور اللہ چاہتا تو وہ نہ لڑتے مگر اللہ جو چاہیے کرے۔'' (البقرہ۔۲۵۳)

نیز کسی جزئی فضیلت سے کلی فضیلت میں فرق نہیں پڑتا اور نہ ہی کمی واقع ہوتی ہے بل کہ کُلی فضیلت اپنی جگہ بدستور قائم رہتی ہے۔ عیسائیت تسلیم کرتی ہے کہ مسیحؑ نبی نہیں خدا کا بیٹا ہیں بل کہ خدا مانتے ہیں۔ اگر وہ خدا ہوں یا خدا کا بیٹا ہوں تو پھر نفسانی خواہشات پر کنٹرول چہ معنی دارد؟ عقل کے اندھوں کو یہ بھی پتہ نہیں چلا کہ خود حضرت مسیحؑ اور آنحضرتؐ کی ازدواجی زندگی کا موازانہ کر کے الوہیت مسیح کے عقیدہ کا رد کر رہے ہیں۔ بل کہ اس عقیدہ کو زمین بوس کر دیا۔ نبی کا تقدس ازدواجی زندگی سے مجروح نہیں ہوتا اور نہ ہی کم ہوتا ہے۔ مسیحؑ کے شادی نہ کرنے اور آنحضرتؐ کے متعدد شادیاں کرنے میں کوئی بات قابل اعتراض نہیں نہ ان دو ہستیوں میں کسی قسم کی کم زوری کا سراغ ملتا ہے اور نہ ہی اس ضمن میں دیگر انبیاءؑ کی ازدواجی زندگی پر الزام لگایا جا سکتا ہے۔ یہ مستشرقین کی ہٹ دھرمی اور تعصب کا نتیجہ ہے نیز حضور ﷺ پر زوجیت کے سلسلہ میں الزام لگا کر مسیح کی شان مبارک کو گھٹانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مسیحؑ کی شادی نہ کرنے میں جو حکمت ہے وہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ البتہ رسول وہی کرتا ہے جس کا بارگاہ ایزدی سے اذن ملتا ہے۔۲: مستشرقین کے اس الزام میں نبی مکرم ﷺ کو جنس پرستی اور ہوائے نفسانی کے غلبہ کی بو آتی ہے۔ آپ ﷺ نے ایک سے زیادہ عورتوں کو زوجیت میں قریباً ۵۵ سال کی عمر یا زیادہ عمر میں لیا۔ کیا خواہش پرست انسان دوشیزاؤں کو پسند کر کے اپناتا ہے یا بیواؤں اور مطلقہ عورتوں کو۔ آپؐ نے کسی قسم کی مجبوری کے بغیر سوائے ایک دو کے تمام بیوہ یا مطلقہ خواتین کو منتخب فرمایا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ خواہش پرست اور ہوائے نفسانی کے غلبہ سے مغلوب آدمی عورت کے ہاتھوں کھلونا بنا رہتا ہے وہ اس کی جائز و ناجائز باتوں کو پورا کرتا ہے مگر جب آپؐ نے اپنی ازواج کو اختیار دیا کہ اگر تم

مال و دولت کی خواہش مند ہو تو اس غرض کو پورا کرنے کے لیے اللہ کے رسول سے علیحدگی کرنا پڑے گی ۔اگر تم خدا کے رسول کا ساتھ دو تو صبر و قناعت سے گزر بسر کرنی ہوگی۔ تمام ازواج نے رسول اکرمؐ کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا اور مال و دولت کو ٹھوکر مار دی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضورؐ اور آپ کی ازواج مطہرات کا ازدواجی رشتہ کسی بھی خواہش کی بنیاد پر نہ تھا۔ آپ کی ازدواجی زندگی پر بات کرتے وقت یہ حقائق پیش نظر ہونے چاہییں۔

۱: آنحضرت ﷺ نے ۲۵ سال تک مجرد زندگی بسر کی۔ اس عنفوان شباب کے دور میں بھی آپ کی عفت و پاک دامنی پر کوئی معمولی سا دھبہ نہیں لگتا۔

۲: ۲۵ سال کی عمر میں آپ نے جس خاتون سے شادی کی وہ عمر میں ۱۵ سال بڑی تھیں اور وہ دو شوہروں کی بیوہ تھیں جب کہ اس معاشرہ میں دوشیزاؤں کی کمی نہ تھی۔ ایک سے ایک بڑھ کر حسن کی دیوی تھی۔

۳: آنحضرت ﷺ نے خدیجہؓ سے شادی کی اور جب تک وہ زندہ رہیں آپ نے دوسری شادی نہیں کی۔ خدیجہؓ کی وفات کے وقت آپ کی عمر ۵۰ سال اور خدیجہؓ کی عمر ۶۵ سال تھی۔

۴: خدیجہؓ کے انتقال کے بعد ایک معمر ۵۰ سالہ بیوہ خاتون سودہ بنت زمعہؓ سے نکاح کیا۔ آپ کی زوجہ میں سے حضرت عائشہ اور ماریہ باکرہ تھیں باقی بیوائیں یا مطلقہ تھیں۔ حالاں کہ آپ اپنے پیروؤں کو باکرہ عورت سے نکاح کرنے کی ترغیب اور تعلیم دیتے تھے۔ آپ نے حضرت جابرؓ کو خوش دیکھا اور پوچھا! کیا تم نے شادی کی ہے تو انھوں نے فرمایا' ہاں یا رسول اللہ! آپ نے پوچھا کیا تم نے کسی باکرہ عورت سے شادی کی ہے یا غیر باکرہ سے؟ انھوں نے کہا یا رسول اللہ! غیر باکرہ سے شادی کی ہے تو فرمایا! تمھیں کسی باکرہ عورت سے شادی کرنا چاہیے تھی کہ وہ تمھارے ساتھ دل لگی کرتی اور تم اس کے ساتھ ہنسی مذاق کرتے۔

۵: آپ نے متعدد عورتوں سے شادیاں کیں اس کے باوجود فرمایا "یعنی مجھے عورتوں کی حاجت نہیں"۔

۶: آپ کی شادیاں ۵۵ سے ۶۰ سال تک کی عمر کے درمیان ہوئیں۔ اس عمر کے حصے میں بندہ کے قویٰ کم زور اور جذبات ماند پڑ جاتے ہیں تو کیوں نہ تسلیم کیا جائے کہ ان شادیوں کے مقاصد اور تھے اور وہ مقاصد عظیم تھے جن کا ذکر پیچھے کیا جا چکا ہے۔ ہاں یہ حقیقت ہے کہ آپؐ کی شادیاں جنسی خواہشات کا نتیجہ نہ تھیں۔ نیز انھی پانچ سال میں جنسی جذبات میں طوفان برپا ہونا تھا؟ آپ سوچیں کہ ہر شخص اس کریم آقا ﷺ سے رشتہ مصاہرت جوڑنے کی بڑی سعادت سمجھتا ہو اور حسین عورتوں سے شادی کرنے میں کوئی امر مانع نہ ہو تو وہ شخص حسین ترین خواتین کا انتخاب کرے گا اس کی پسند بیوہ، مطلقہ اور معمر عمر خواتین نہیں ہوں گی۔ پھر ایسے شخص کے بارے کہا جا سکتا ہے کہ نفسانی خواہشات پر قابو نہ کر سکنے کی بنیاد پر متعدد شادیاں کیں۔ کتنی بڑی زیادتی اور ناانصافی ہے اور سب سے بڑھ کر ظلم و زیادتی یہ ہے کہ مخالفین

حقائق کو سرے سے تسلیم نہیں کرتے وہ اس لیے کہ وہ حقائق آپ کی پاکیزگی، عفت و پاک دامنی کے شاہد و گواہ ہیں جب کہ مستشرقین کے پاس سوائے باطل، لغو الزامات کے سوا کچھ نہیں ہے،

خود جنھیں اپنا احترام نہیں
وہ ترے ناز کیا اٹھائیں گے

شیخ تقی الدین سبقی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو جو چار سے زیادہ ازواج کی تعداد دی گئی اس میں بھید یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ بواطن شریعت وظواہر شریعت اور وہ امور جن کے ذکر سے حیا آتی ہے اور وہ جن کے ذکر سے شرم نہیں آتی یہ سب بطریق نقل امت تک پہنچ جائیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ لوگوں میں سب سے زیادہ شرمیلے تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے لیے چار سے زائد عورتیں جائز کر دیں جو شرع میں سے نقل کریں' حضرت کے افعال آنکھوں دیکھے اور اقوال کانوں سنے جن کو حضور ﷺ مردوں کے سامنے بیان کرنے سے حیا کرتے تھے تاکہ اس طرح نقل شریعت کامل ہو جائے ۔حضور ﷺ کے ازواج کی تعداد کثیر ہوگئی تاکہ اس طرح کے اقوال وافعال کے نقل کرنے والے زیادہ ہو جائیں ۔ ازواج مطہرات ہی سے غسل وحیض وعدت وغیرہ کے مسائل معلوم ہوئے ۔ یہ کثرت ازواج حضور ﷺ کی طرف سے معاذ اللہ شہوت کی غرض سے نہ تھی اور نہ آپ ﷺ وطی کو العیاذ باللہ لذت بشریہ کے لیے پسند فرماتے تھے۔عورتیں آپ ﷺ کے لیے صرف اس واسطے محبوب بنائی گئیں کہ وہ آپ ﷺ سے ایسے مسائل نقل کریں جن کے زبان پر لانے سے حضور ﷺ شرم وحیا کرتے تھے پس آپ ﷺ بدیں وجہ ازواج سے محبت رکھتے تھے کہ اس میں شریعت کے ایسے مسائل کے نقل کرنے میں اعانت تھی۔ ازواج مطہرات نے وہ مسائل نقل کیے جو کسی اور نے نہیں کیے چنانچہ انہوں نے حضور ﷺ کے مقام اور حالت خلوت میں جو نبوت کی آیات بینات دیکھیں اور عبادت میں آپ ﷺ جو اجتہاد دیکھا اور وہ امور دیکھے کہ ہر ایک عاقل شہادت دیتا ہے کہ وہ صرف پیغمبر میں ہوتے ہیں اور ازواج مطہرات کے سوا کوئی اور ان کو نہ دیکھ سکتا تھا۔ یہ سب ازواج مطہرات سے مروی ہیں اس طرح حضور ﷺ کو کثرت ازواج سے نفع عظیم حاصل ہوا۔۔۔۔۔ نیز کثرت ازواج پر طعن کرنے والے یہود ونصاریٰ کے رد میں خود اللہ تعالیٰ نے جواب عطا فرمایا" ولقد ارسلنا رسولا من قبلك و جعلنا لهم ازواجاً و ذريته (سورۃ الرعد۔ ۳۸)

ترجمہ: اور البتہ بے شک ہم نے تجھ سے پہلے پیغمبر بھیجے اور ان کو عورتیں اور اولاد دی۔

حضرت ابراہیم تین بیویاں (پیدائش باب ۱۱۔ آیہ۔ ۲۹ باب ۱۶ آیہ ۳ باب ۲۵۔ آیہ اول)

حضرت یعقوب چار بیویاں تھیں (پیدائش باب ۲۹ باب ۳۰' آیہ ۴ و ۹) ان چار میں سے راحیل خوبصورت اور خوشنما تھی۔ یعقوبؑ (نکاح سے پہلے) راحیل پر عاشق تھا"۔ (پیدائش باب ۲۹۔ آیہ ۱۷۔ ۱۸)

حضرت موسیٰ دو بیویاں تھیں (خروج باب ۲۔ آیہ ۲۱۔ اعداد باب ۱۲۔ آیہ اول)

حضرت جدعون اس کی بہت سی بیویاں تھیں جن سے ستر لڑکے پیدا ہوئے (اقضاۃ باب ۸۔ آیہ ۳۰)

حضرت داوٗد ان کے ہاں ۴۳۔ دوم سموئل باب ۳۔ آیہ ۲ تا ۵ باب ۵ آیہ ۱۳) حضرت داوٗدؑ نے حالت پیری میں ابی ساج سونمی سے نکاح کیا تا کہ وہ گرم رہیں (اول سلاطین باب اول)

حضرت سلیمان حضرت سلیمانؑ کی سات سو جیورو بیگمات تھیں اور تین سو حرمین اور اس کی جوروٗں نے اس کا دل پھیرا کیونکہ ایسا ہوا کہ جب وہ بوڑھا ہوا تو اس کی جوروؤں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کیا۔ (اول سلاطین باب ۱۱۔ آیہ ۴۰۳)

پس ثابت ہوا کہ ایک سے زائد زوجہ کا ہونا نبوت کے منافی نہیں اور ہم اسے بھی یکسر غلط سمجھتے ہیں جو بائبل میں پیغمبروں کی نسبت دریدہ دہنی کی گئی ہے کیونکہ پیغمبر معصوم ہوتے ہیں۔

اعتراض نمبر ۱۶۱

ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری بیوی (سوتن) لانا ایک بے رحمی کا پہلو رکھتا ہے کیوں کہ عورت اسے ٹھنڈے دل سے گوارا نہیں کرتی۔

جواب: اس کا جواب یہ ہے فرض کریں ایک شخص شادی شدہ ہے۔ امن وسکون کی زندگی بسر ہو رہی ہے۔ خوب زندگی کی گاڑی چل رہی ہے۔ اچانک ایک ایسا موڑ آتا ہے کہ ایک دوسری عورت اس شخص کو دل دے بیٹھتی ہے۔ وہ اس مرد پر مرمٹتی ہے۔ کوئی لمحہ از یادِ یار غافل نشود" دل یار و لے ہتھ کار و لے"یعنی دل تو دوست کی یاد میں مصروف ہے لیکن ہاتھ سے کام بھی جاری ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ اگر وہ اسے شادی کی دعوت قبول کر لیتا ہے تو پہلی بیوی کی دل شکنی ہوتی ہے۔ بیوی سوچتی ہے کہ اس کی حکومت ختم ہونے کو ہے۔ میری اس گھر میں تنکا برابر حیثیت نہ ہوگی وغیرہ وغیرہ۔ اگر وہ دوسری عورت سے شادی نہیں کرتا تو اس کی زندگی بے کیف ونا خوشگوار ہوتی ہے مگر یہ اس عورت کا اپنا کیا دھرا ہے۔ اسے اپنانے میں مرد کا کوئی قصور نہیں۔ ایسی صورت میں ٹھیک عمل اور طریقہ یہی ہے کہ وہ اسے انکار کر دے اور بیوی کا حق چوں کہ مقدم ہے اس لیے دوسری عورت کا وافر قلبی تعلق پیدا ہو جائے۔ پھر بھی اپنی بیوی کی خاطر دوسری عورت کے تمام جذبات اور خواہشات کو ترک کرنا ناگزیر ہے۔ ایسے

حالات میں اپنی بیوی کے مقابلے میں دوسری عورت کی رعایت نہ کرنا جائز اور درست ہے۔اسی طرح کسی جائز موقع پر اپنی بیوی کی رعایت نہ کرنا جائز ہے۔مثلاً ایک شخص عرصہ دس سال سے شادی کر چکا ہے اس کے اولاد نہیں ہوتی۔والدین کی خواہش کہ ان کا بیٹا پھلے پھولے، اس کے اولاد ہو۔ساری جائیداد مال وغیرہ کا وارث آئے۔ ایسے میں اپنی بیوی کو نہ مارے پیٹے، نہ طلاق دے بل کہ اسلامی تعلیمات کے مطابق افہام وتفہیم سے مسئلے کا حل نکالے۔جب وہ مرد اپنی بیوی کے سامنے کہے کہ میں شادی کر کے بھی تمھارے تمام حقوق کی پاس داری کروں گا اور انصاف کا رویہ اپنائے رکھوں گا۔اگر دوسری شادی ہو جائے تو کبھی اس میں بے رحمی کا پہلو نہیں نکلے گا۔نیز اگر پہلی عورت جھگڑا کرتی ہے تو وہ از خود بے رحمی اور ظلم کر رہی ہے جب کہ اسلام نے مرد کو دو، تین اور چار شادیاں کرنے کی رخصت دے رکھی ہے۔اگر مرد کے جائز مطالبہ کی بناء پر بھی پہلی بیوی تنازعہ کھڑا کرتی ہے تو یہ ناانصافی وزیادتی ہے اور اپنے پیروں پر کلہاڑی مار رہی ہے۔اگر عورت اجازت نہیں دیتی بلکہ خود طلاق کا مطالبہ کر بیٹھتی ہے تو اس صورت میں اگر مرد طلاق دیتا ہے تو یہ عورت کے نزاع کے سبب ہے اور سراسر اس کی ہٹ دھرمی ہے اور مرد بے قصور ہے۔اس کے سبب وہ عورت شادی نہیں کر پاتی تو عمر بھر پچھتاوار ہتا ہے اور یاس وناامیدی سے ہاتھ ملتی رہتی ہے۔دوسری سوتن کو لانا مرد کا بے رحمانہ فعل نہیں ہے۔نیز اسوہ رسول اللہ ﷺ ہمارے سامنے ہے۔کئی خواتین کی حرم نبوی میں موجودگی اس بات کی غماض ہے کہ مرد انصاف کا دامن تھامے رکھے۔ ہمیشہ عدل سے کام لیتا رہے تو گھر آنگن کی ہوا، فضا خوش گوار رہے گی اور ہمیشہ نباہ کی بھینی بھینی خوشبو ماحول کو معطر کرتی رہے گی۔یہ عقیدہ بے رحمی کا اس لیے پھوٹ پڑا ہے کہ گرد وپیش میں اسلامی تعلیمات کا دور دورہ نہیں۔اسلام سے دوری ہے اور اسلامی عقائد کی پابندی نہیں کی جاتی جبھی تو جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔انصاف نہیں ہو پاتا۔ان جھگڑوں کی بنیاد پر نام نہاد اور روشن خیال طبقہ کہتا ہے کہ سوتن لانے سے بے رحمی کا پہلو نکلتا ہے۔بھئی! یہ بے رحمانہ پہلو صرف اور صرف اسلام کی تعلیمات پر عمل نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔جب اسلام کے مطابق عمل ہوگا تو یہ نوبت کبھی نہیں آئے گی۔واٹ کہتا ہے (ضیاء النبی ج۔۷۔۴۵۹)'' تعدد ازواج کے قانون نے بعض زیادتیوں کا مداوا کر دیا جو انفرادیت پسندی کے ترقی کر جانے کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھیں۔اس قانون نے زائد عورتوں کو باعزت طور پر رشتہ ازواج میں منسلک ہونے کے مواقع فراہم کیے، سرپرستوں کی طرف سے عورتوں پر کی جانے والی زیادتیوں کو کم کیا۔اس قانون نے نکاح کے بغیر جنسی تعلقات قائم کرنے کی ترغیبات کو کم کیا جس کی عرب معاشرہ میں اجازت تھی۔اس زمانہ میں جو رسوم موجود تھیں ان کے پیش نظر معاشرے میں اصلاح کا یہ بڑا اہم قدم تھا''۔

اعتراض نمبر ۱۶۲

چینی حکام اور ماہرین اقتصادیات کے مطابق ایک بچہ فی گھرانہ کی پالیسی سے آج چین دنیا کی دوسری بڑی معیشت کی منڈی بن چکا ہے''

جواب: عورتوں کی تعداد کو کم کرنے کے کئی طریقے ایجاد ہو چکے ہیں جو زمانہ جاہلیت کی دختر کشی کی رسم کو بھی پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ ۱۹۷۴ء کے اوائل سے چین میں ایک بچہ فی گھرانہ کی پالیسی اپنائی گئی۔ اس صورت حال کا الم ناک پہلو یہ ہے کہ اس دوران اسقاط حمل کے ۹۰٪ کیسز صرف بیٹی (کی پیدائش روکنے) کی وجہ سے واقع ہوئے۔ نیز سالانہ ۳۹ ہزار بیٹیاں، بیٹوں کے مقابلہ میں عدم توجہ کے باعث اپنی عمر کے پہلے سال ہی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتیں۔ اس شدید منفی عدم توازن کی وجہ سے ۶۰ ملین یعنی چھ کروڑ لڑکے لڑکیوں سے زیادہ ہیں۔ یوں اس تہذیبی تاریکی میں بھی لڑکیوں کے لیے اسلامی تعلیمات منارہ نور کی حیثیت رکھتی ہیں (محمد رسول اللہ اکرم طاہر ۲۹۹۔۳۰۰) یہ راز ہے بڑی منڈی بننے کا۔ کسی جانور کی نسل ناپید ہونے لگے تو اس کے لیے ہزاروں کوششیں کی جاتی ہیں۔ لاکھ ہاتھ پاؤں مارے جاتے ہیں۔ بہتیرے جتن کیے جاتے ہیں کہ اس جانور کی افزائش نسل کر کے ناپید ہونے سے بچائیں۔ ادھر صورت حال مختلف ہے کہ صنف نازک کو ختم کرنے کے درپے آزار ہیں۔ جانوروں سے بھی وقار کم سمجھا گیا ہے۔ اور بے دریغ قتل کر کے خون کی ندیاں بہائی جا رہی ہیں۔

انسان کی عظمت کو ترازو میں نہ تولو
انسان تو ہر دور میں انمول رہا ہے

حالاں کہ معیشت بڑھانے کے کئی اور طریقے بھی ہیں۔ صرف معیشت کے کم ہونے کے خطرے کے پیشِ نظر دختر کشی کی مہم انسانیت سوز اور انسانیت کو ہلاک کرنے کا عمل ہے۔ رزق کی بڑھوتری اور کمی کے خوف کے باعث بچیوں کو قتل نہیں کرنا چاہیے۔ ارشاد ربانی ہے۔

" لَا تَقْتُلُوا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ" ۔ (سورۃ الانعام ۔۱۵۱) (اور اپنی اولاد کو قتل نہ کرو مفلسی کے ڈر سے)

ایک اور جگہ ارشاد ربانی ہے۔ " نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ" (بنی اسرائیل ۔۳۱) (ہم انھیں بھی رزق دیں گے اور تمھیں بھی)

جب رزق کی ذمہ داری رب اللعالمین نے لے رکھی ہے تو ایسے بچیوں کو قتل کر کے خواہ مخواہ گناہ کبیرہ اپنے سر لینے کی کیا ضرورت ہے؟ اور کیا صرف بچیوں کی پیدائش ہی سے معیشت کم زور ہوتی ہے، اولاد نرینہ سے نہیں ہوتی؟ یہ کسے خبر نہیں کہ ارتکاز دولت، ذخیرہ اندوزی اور سمگلنگ معیشت کو گھن کی طرح چاٹ جاتی ہیں۔ یہ بے بنیاد خوف ہے کہ بچیوں سے آبادی میں اضافہ ہوگا اور معیشت کم زور ہوگی۔ یہ درست نہیں کہ ایک

بچہ فی گھرانہ کی پالیسی سے چین دنیا کی دوسری بڑی معیشت کی منڈی ہے۔ کیوں کہ ہزار ہا وسائل پیدا کر کے چین نے اپنی معیشت کو بڑھایا ہے۔ مثلاً دوسرے ممالک سے تنازعات کو بجائے لڑائی کے ڈائیلاگ کے ذریعے حل کرنے کی خارجہ پالیسی کامیابی سے ہم کنار ہوئی ہے۔ خواہ جس قدر ہی ملک معیشت کے اعتبار سے مضبوط کیوں نہ ہو اگر وہ دنیا کے ممالک سے متصادم اور ٹکراؤ کی پالیسی اختیار کیے ہوئے ہوگا تو کبھی معیشت کی بڑی منڈی نہیں بن سکتا۔ لہٰذا اس ڈر سے بچیوں کو ٹھکانے لگا دینا وہم ہے اور بے بنیاد خوف چھایا ہوا ہے جب کہ باقی کے ہزاروں ایسے مسئلے ہیں جن سے معیشت کبھی مضبوط و مستحکم نہیں ہو سکتی۔ مثلاً دہشت گردی، ارتکاز دولت، حقوق کی پائمالی، ذخیرہ اندوزی، بھتہ خوری اور رشوت وغیرہ۔ اس کے ساتھ بجٹ میں اہم اشیاء مکان، ٹرانسپورٹ، خوراک، پارچات اور تفریح کے لیے خاص منصوبہ بندی کی ضرورت ہے جس سے مہنگائی میں کمی اور ارزانی لائی جا سکتی ہے اور کفایت شعاری سے رقم بچائی جا سکتی ہے۔ اگر کسی اور کو مہربان اور مربی نہ بناؤ گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں تمہارا حصہ دے گا نیز یہ بات ذہن میں پیوست رہے کہ رزق دو طرح کا ہوتا ہے ایک وہ جس کی تم تلاش کرتے ہو اور دوسرا وہ جو تمہاری تلاش میں ہوتا ہے یہ یقیناً تم تک پہنچ کر رہے گا۔

know it there are two kinds of livelihood one which) you are searching for and the other which is in search of you it will reach you)

ایک بزرگ کا قول ہے کہ جس طرح موت آدمی کا تعاقب کرتی ہے اسی طرح رزق بھی آدمی کے تعاقب میں رہتا ہے جب اسلام کی تعلیمات پر عمل کریں گے تو معیشت کے کم ہونے کے چکر سے بخیر و عافیت نکل جائیں گے۔ وہ چیزیں جو معیشت میں اضافے کا باعث ہیں اور اسلام ان کی اجازت دیتا ہے وہ نہایت محنت سے حاصل کریں اور جن سے معیشت تباہ ہوتی ہے اور اسلام بھی منع کرتا ہے ان سے پرہیز کیا جائے تو ان شاء اللہ معیشت دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرے گی۔

معیشت کو بڑھانے اور مضبوط کرنے کے لیے اپنی اولاد کو قتل کرنا یا مفلسی کے ڈر سے موت کے گھاٹ اتار دینا اسلام میں ممنوع ہے۔ سورہ الانعام آیت نمبر ۱۵۱ میں ہے ”ترجمہ: اور اپنی اولاد کو قتل نہ کرو ایک جگہ پر یوں ہے ”ہم تمہیں اور انہیں سب کو رزق دیں گے“۔

اعتراض نمبر ۱۶۳

بعض مستشرقین یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ حضورؐ ہر سال اپنی ازواج کو خیبر وغیرہ کی زمینوں کی آمدنی سے مال کثیر عطا فرماتے تھے اور مال کثیر کی وجہ سے ان کے درمیان حسد کے جذبات پروان چڑھتے تھے۔ (ضیاء النبی۔ ۴۹۹۔ ۷)

جواب: یہ الزام تاریخی حقائق سے چشم پوشی کا نتیجہ ہے۔اس میں بھی شک نہیں کہ قومی آمدنی کی بہت سی مدات ایسی تھیں جو مکمل طور حضور کے تصرف میں تھیں اور آپ ﷺ ان مدات سے اپنے اہل خانہ پر خرچ کرنے کے مجاز تھے۔ یہ اختیار بھی بارگاہِ ایزدی کی دین ہے۔اس کے باوجود آپ نے گھر کے لیے فقر کی نعمت کو پسند فرمایا۔ یہ آپ ﷺ کا اختیاری فعل تھا۔ جسے آپ کی ازواج نے بھی پسند فرمایا۔ جہاں تک خیبر کی زمینوں سے آمدنی آتی اور اس سے کثیر مال ازواج کو عطا فرماتے۔ جس سے ان کے درمیان حسد کے جذبات پروان چڑھتے تھے' امہات المومنین پر الزام اور تہمت لگائی گئی ہے۔ارشاد ربانی ہے "اِنَّ الَّذِیۡنَ یَرۡمُوۡنَ الۡمُحۡصَنٰتِ الۡغٰفِلٰتِ الۡمُؤۡمِنٰتِ لُعِنُوۡا فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ ۪ وَ لَہُمۡ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ' (سورہ النور۔۳۳) ترجمہ: جو لوگ تہمت لگاتے ہیں پاک دامن عورتوں پر جو انجان ہیں، ایمان والیاں ہیں، ان پر پھٹکار ہے دنیا اور آخرت میں اور ان کے لیے عذاب عظیم ہے۔

یہ خواتین نیک نیت اور پاک دامن ہیں۔ وہ کمینہ صفت لوگوں کے طور طریقوں سے ناواقف و انجان ہوتی ہیں۔انھیں یہ کبھی خیال نہیں آتا کہ کوئی ان پر انگلی اٹھائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے نیک فطرت مسلمان مرد و عورتوں پر جو اس قسم کا غلیظ الزام لگائے اس پر خدا کی پھٹکار ہوگی اور دردناک عذاب ان کے لیے ہوگا۔بعض حضرات نے اس آیت کو امہات المومنین سے مخصوص کیا لیکن اہل جمہور وعلماء کے نزدیک پہلا قول اصح ہے اور راجح ہے اور امہات المومنین بطریق اولیٰ اس میں داخل ہیں۔ نبی پاک کا فرمان ہے کہ" سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے بچو' ان میں سے ایک ہلاک کر دینے والی چیز" پاک دامن، انجان اور ایمان دار خواتین پر جھوٹی تہمت لگانا ہے۔ دوستی ہر ایک سے نہیں ہوجاتی بل کہ طبعی مناسبت کو بڑا دخل حاصل ہے۔ برے لوگ اپنے ہم جنس لوگوں کے پاس بیٹھ کر حظ محسوس کرتے ہیں۔مزے لے لے کر ڈینگیں مارتے اور گپیں ہانکتے ہیں۔اگر انھیں نیک لوگوں کی محفل میں بیٹھنا پڑے تو دل نہیں لگتا، اکتاہٹ اور بے چینی محسوس ہوتی ہے۔ اداس ہوجاتے ہیں۔اسی طرح اگر نیک لوگ نیکوں کے پاس بیٹھیں گے تو اکتاہٹ اور بے قراری کی بجائے خوشی وانبساط ہوگی۔اس لحاظ سے اثر ایسا ہوتا ہے کہ خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لیے اور پاکیزہ عورتیں پاک لوگوں کے لیے۔اس عام اصول سے قابل غور بات یہ ہے کہ جو اَطیَبُ الاَطیبین ہے جو خیر الاولین والآخرین ہے ان کی ازواج بھی اَطیب الطّیات ہوں گی۔تو پھر بھلا کیسے ان ازواج مطہرات میں کثرت مال سے حسد کے جذبات پیدا ہوں گے۔ ہرگز ہرگز نہیں!

خیبر کی غنیمت میں سونا چاندی کم تھا اور گائے بیل اونٹ اور کچھ دیگر سامان تھا اور سب سے زیادہ چیز وہاں کی زمینیں اور باغات کے علاوہ سارا سامان آپ ﷺ نے قرآنی حکم کے مطابق غنائم میں تقسیم کر دیا اور زمینیں کچھ لیں اور باقی یہود کو کاشت کے لیے دے دیں۔خیبر کی زمینوں اور باغات کی تقسیم کے

بارے سنن ابو داؤد میں مرقوم ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے خمس نکالنے کے بعد خیبر کی زمینوں کو چھتیس حصوں میں بانٹ دیا' ان میں سے اٹھارہ حصے مسلمانوں کی ضروریات کے لیے مخصوص کر لیے یعنی ان سے مسلمانوں کی اجتماعی ضروریات وحوادث کی تکمیل مقصود تھی۔ باقی اٹھارہ حصے مجاہدین میں تقسیم فرما دیئے اور ہر حصہ میں سوسو کا حصہ مقرر فرمایا یہ اہل حدیبیہ کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک عطیہ تھا۔ خیبر کی اس فوج میں دوسو گھوڑے بھی تھے چونکہ سوار کے علاوہ خود گھوڑے کو بھی حصہ ملتا ہے اور گھوڑے کا حصہ دوگنا ہوتا ہے اس لحاظ سے دوسو گھوڑ سواروں کو چھ سو سپاہیوں کے برابر حصہ ملا۔ خیبر کی اراضی کا وہ حصہ جس کو آپ ﷺ نے تقسیم نہیں فرمایا' اس میں الکتبہ اور وطیع وسالم اور اس کی ملحقہ اراضی تھی۔ جنگ کے نتیجہ میں حاصل شدہ اراضی کو آپ ﷺ نے مجاہدین میں تقسیم فرما دیا اور بغیر جنگ کے حاصل شدہ اراضی ریاست کی ملکیت تھی۔ اس کو سرکار نے یہود کو بٹائی پر دے دیا اور اس کی آمدن مسلمانوں کی اجتماعی ضروریات کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ ہر سال رسول اکرم ﷺ کی طرف سے عبداللہ بن رواحہؓ پیداوار کی بٹائی کے لیے خیبر تشریف لے جاتے' اجناس کی تمام اقسام دو حصوں میں تقسیم فرما کر مزارعین سے فرماتے کہ ''دونوں میں سے جو ڈھیر پسند ہو اٹھالو' ایک مرتبہ اہل خیبر نے کہا ''اسی عدل پر زمین وآسمان قائم ہیں''

خیبر کی غنیمت سے آسودگی ہوئی۔ اس اموال سے درماندگی دور ہوگئی حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ''ہم لوگ اس وقت تک اسودہ حال نہ ہوئے جب تک کہ خیبر فتح نہ کیا''۔ ایک روایت میں مسلمانوں کی خوشحالی اور آسودہ حالی کے بارے میں ہے کہ جب آپ ﷺ خیبر سے واپس مدینہ تشریف لائے تو مہاجرین نے انصار مدینہ کے کھجوروں کے وہ سب درخت واپس کر دیئے جو انصار نے ان کی نصرت اور امداد کے طور پر انہیں دے رکھے تھے کیونکہ اب انہیں خیبر سے مال اور کھجور کے درخت مل گئے تھے اور سیدہ عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ''جب خیبر فتح ہوا تو ہم نے کہا کہ اب ہمیں پیٹ بھر کر کھجور ملے گے''۔ (خاتم النبین۔۸۴۷)

ازاوج مطہرات نے جب انصار ومہاجرین کے گھروں میں فارغ البالی دیکھی کہ پہلے کی نسبت ان کے حالات اچھے اور خوش کن ہیں خوب گزر بسر ہو رہی ہے تو انہیں اپنے گھر میں فقر ہی کی بادشاہی نظر آتی ہے تو آپ ﷺ سے اس حالت زار کے متعلق درخواست کرنے کا فیصلہ کیا جب یہ مطالبہ کیا گیا تو یہ آیت تخییر نازل ہوئی جس میں آپ ﷺ کو حکم دیا گیا کہ آپ ﷺ اپنی ازواج سے کہہ دیں کہ اگر تم مال دنیا لینا چاہتی ہو تو میں تمہیں کثیر مال دے کر فارغ کر دوں اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول کا قرب چاہتی ہو تو پھر تمہیں کسی عسرت کی زندگی کو قبول کرنا ہوگا آپ ﷺ نے یہ حکم ربی حضرت عائشہؓ سے کہا ''میں تم سے ایک بات کہنے والا ہوں' اس کے جواب میں جلدی نہ کرنا' بلکہ اپنے والدین سے مشورہ کر کے اس کا

جواب دینا۔اس کے بعد حضور ﷺ نے آیت تخییر تلاوت کی ۔ بی بی عائشہؓ نے عرض کیا ’’کیا میں اس بات میں اپنے والدین سے مشورہ کروں! میں تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور آخرت کی زندگی کو منتخب کرتی ہوں ۔‘‘اور دوسری طرف آپ ﷺ کا یہ عمل دیگر ازواج مطہرات کے لیے مثال بن گیا اور انہوں نے بھی سیدہ عائشہؓ کی پیروی میں وہی کہا جوانہوں نے کہا تھا۔

آپ ﷺ کی زوجیت میں آنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خواتین پاک باز‘ پاک دامن اور تہمتوں سے مبرا‘ حرص وہوس سے پاک اور بغض وحسد سے منزہ ہیں۔اگر دوسروں یعنی انصار ومہاجرین کی دیکھا دیکھی خوشحالی کو پسند کرتیں تو وہ آپ ﷺ سے کنارہ کشی اختیار کر لیتیں لیکن وہ تو مال ودولت اور زر کثیر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اور تج کر کے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا دامن تھام لیتی ہیں ایسا نہیں کہ مال کثیر کی وجہ سے ان کے درمیان حسد کے جذبات پروان چڑھتے ہیں۔مستشرقین کا لزام محض باطل ہے۔

اعتراض نمبر۱۶۴

آپ ؐ نسل پرست تھے۔ڈوزی نے نسل پرستی کی تہمت لگائی اور اس کی دلیل یہ دی کہ حضور ؐ یمنی قبائل سے متنفر تھے۔ نیز اپنے دعویٰ کے ثبوت میں تحریر کیا کہ کسی نے یہ شعر پڑھا کہ ’’میرے آباؤ اجداد نہ مضر کی اولاد ہیں نہ ربیعہ کی‘‘۔

ڈوزی کہتا ہے کہ حضور ﷺ نے طبقاتی منافرت کا اظہار فرمایا اور وہ کسانوں سے نفرت کرتے تھے اور یہ ہجرت کے بعد اس نفرت کو ترک کرنا پڑا (۲) وہ یہ دعویٰ بھی کرتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ طبقہ اشرافیہ کے طرف دار تھے۔

جواب: (۱) اہلِ یمن کی نسبت حضرت اسمٰعیلؑ کی طرف ہے۔اہلِ یمن میں سے اسلم بن افصی بن حارثہ بن عمرو بن عامر ہیں جوخزاعہ مشہور ہیں۔حدیث میں ہے کہ ’’سلمہ بن اکوعؓ نے کہا کہ جناب رسول اللہ ﷺ اسلم قبیلہ کے چند لوگوں کی طرف تشریف لے گئے جو بازار میں تیراندازی کر رہے تھے۔آپ ؐ نے فرمایا اے اسمٰعیلؑ کی اولاد! تیراندازی کرو کیوں کہ تمھارا باپ اسمٰعیلؑ بھی تیرانداز تھا اور میں بنی فلاں کے ساتھ ہوں۔ یہ دوفریقوں میں سے ایک فریق کے لیے فرمایا۔انھوں نے اپنے ہاتھ روک لیے۔آپ ؐ نے فرمایا ان کو کیا ہوا۔انھوں نے کہا ہم کیسے تیراندازی کریں جب کہ آپ بنی فلاں کے ساتھ ہیں۔آپ ؐ نے فرمایا تم تیراندازی کرتے رہو میں تم سب کے ساتھ ہوں۔ (تفہیم البخاری۔۳۸۳ علامہ غلام رسول رضوی) آپ ؐ کی شفقت ومحبت کا یہ عالم ہے کہ یمنی لوگوں کی طرف تشریف لے جاتے ہیں۔وہ تیراندازی کر رہے ہیں۔آپ ؐ نے تیراندازی کی ترغیب دی اور ساتھ ان میں سے ایک فریق کے ساتھ ہونے کا عندیہ بھی دیا۔دوسروں نے تیر چلانے سے ہاتھ روک لیے۔پوچھنے پر انھوں نے کہا جب آپ ؐ

ان کے ساتھ ہیں تو ہم کیسے تیر چلائیں۔آپؐ نے اپنائیت سے فرمایا ’’میں تم سب کے ساتھ ہوں‘‘۔وہ ذات جو اہلِ یمن کے ساتھ ہو وہ ان سے متنفر ہو سکتے ہیں۔نہیں ہر گز نہیں۔

۲:اپنے دعوے کے ثبوت میں لکھا کہ کسی نے یہ شعر پڑھا کہ ’’میرے آباواجداد نہ مضر کی اولاد ہیں نہ ربیعہ کی‘‘۔آپؐ نے فرمایا کہ ’’تیری بدبختی کہ تیرا نسب تجھے اللہ اور اس کے رسول سے محروم کرتا ہے۔پھر تھوڑی سوجھ بوجھ رکھنے والا شخص بھی جان سکتا ہے کہ اس شعر میں نسل پرستی کا پہلو کہاں نکلتا ہے۔شعر کے مفہوم اور ارشادِ نبوی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مخاطب نے اس شعر میں اسلام سے گریز کا اظہار کیا ہے۔وہ کہنا یہ چاہتا ہے کہ میرے آباؤاجداد مضر یا ربیعہ کی اولاد نہیں کہ میں قریش پر ایمان لے آؤں۔اگر میرے قبیلہ سے ہوتا تو اسے قبول کر لیتا۔آپؐ نے نسل پرستی کو بدبختی فرمایا۔اعداء کی ستم ظریفی یہ کہ وہ ذات جس نے نسل پرستی اور نسلی غرور کی جڑ کو اکھاڑ کر پھینک دیا' زمانہ جاہلیت کے خاندانی تفاخر، رنگ ونسل کی برتری،قومیت میں امتیازات کو مٹا ڈالا۔اسی پر نسل پرستی اور قبائلی منافرت کا الزام لگاتے ہیں۔کیا مستشرق اس فرمان سے بھی بے خبر ہیں جو آپؐ نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر فرمایا تھا’’ اے لوگو! بے شک تمھارا رب ایک ہے اور بے شک تمھارا باپ (آدم) ایک ہے۔سن لو! کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی سرخ کو کسی کالے پر اور کسی کالے کو کسی سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب سے۔

کیوں کہ: خون شہ رنگین تر از معمار نیست۔

دوسرے جز کا جواب:ا:ماں باپ اور اولاد کے حقوق، زوجین کے حقوق،عزیز رشتہ دار' دوست اور سسرال کے حقوق' اساتذہ وتلامذہ کے حقوق' ہمسایہ' یتیموں' بیواؤں' حاجت مندوں' غلاموں اور لونڈیوں کے حقوق' خادموں اور ملازموں کے حقوق' مہمان ومسافر کے حقوق' عام مسلمانوں اور عام انسانوں کے حقوق (مسلم وغیر مسلم) جانوروں کے حقوق حتیٰ کہ دین اسلام نے ہر ایک کو حقوق عطا کیے اور ساتھ ہی ان کے فرائض وذمہ داریوں کو بھی بوضاحت بیان کر دیا اور ان حقوق پر ڈاکہ ڈالنے والوں کو قرارواقعی سزائیں دیں تو پھر کیا ایسے مذہب کے داعی سے طبقاتی منافرت کے اظہار کی توقع کی جاسکتی ہے؟ ایک بار بنی مخزوم کی فاطمہ بنت قیس نامی خاتون چوری کرتی ہے آپ ﷺ اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم فرماتے ہیں۔انہوں نے اسامہ بن زیدؓ کو سفارشی بنا کر حضور ﷺ کی خدمت اقدس میں بھیجا کہ وہ سفارش کریں کہ ہاتھ نہ کاٹے جائیں جب اسامہؓ نے آپ ﷺ کی خدمت میں یہ درخواست کی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ پہلی قومیں اس لیے تباہ ہوئیں کہ جب کوئی بڑا آدمی جرم کرتا تو اسے چھوڑ دیا جاتا اور اگر کوئی کمزور کرتا تو اسے سزا دی جاتی آپ ﷺ نے فرمایا اگر میری بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرتی تو میں یقیناً اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ دین سے طبقاتی منافرت اور اونچ نیچ اور تقسیم کا قلع قمع کر دیا۔

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

نیز عرب معاشرہ طبقات میں تقسیم نہیں تھا۔ وہاں قبائلی سسٹم تھا۔ ڈوزی نے طبقاتی منافرت کو کہاں سے لے لیا ہے۔

٢: اشرافیہ یا کسان نام کے کسی طبقے کا کوئی وجود نہ تھا۔ معاشرے کی تقسیم پیشے کے اعتبار سے نہیں تھی۔ شرافت کا تعلق پیشے سے نہ تھا بل کہ ذاتی کردار سے تھا۔ عدل وانصاف، صبر واستقامت، جود وسخا، ایثار وقربانی، مہمان نوازی، ایفائے عہد، جرات وبہادری اور قبائلی عصبیت وہ جوہر تھے جو شرافت کی تعمیر کے معمار تھے۔ یہ ساری خوبیاں اور قدریں انفرادی ہیں جن کا تعلق کسی طبقے سے نہیں ہوتا۔ مغربی معاشرے میں یہ خصوصیات صرف شرفاء یعنی جاگیرداروں میں ہی متوقع ہوتی تھیں۔ مخالفین کے یہ الزامات محض اس معاشرے سے لاعلمی کا نتیجہ ہیں۔

اعتراض نمبر ١٦٥

دی جیوش انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے "محمد ﷺ کی ہجرت مدینہ کے بعد ان کی ازواجی زندگی اور مذہبی زندگی میں تبدیلی محسوس ہوتی ہے"۔ (امہات المومنین اور مستشرقین۔ ٦٨)

جواب: اس تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ مدینہ منورہ میں آکر بہت سی شادیاں رچائیں۔ جس طرح فلپ اسکاف اپنی کتاب "ہسٹری آف کرسچین چرچ میں بیان کرتا ہے" ان کی تعدد الازواج جنسیت پرستی کے سبب تھی (معاذ اللہ) اور اولاد نرینہ کی خواہش میں عمر کے ساتھ ساتھ شدت آتی گئی"۔ مغربی ناقدین نے نہایت برے انداز میں جنسیت پرستی کو اچھالا۔ حرم جیسی مقبول عام فلمیں ان کے تصورات کا مظہر ہیں جب کہ آپ ﷺ کی شادیاں سماج میں باطل رسومات کی بیخ کنی کی خاطر تھیں جو اس وقت سماج میں موجود تھیں اور ان کی قانون سازی مقصود تھی۔ اس کے اور سبب بھی تھے جن میں خاص طور پر تالیفِ قلبی بھی تھی۔ ایسی خواتین جنھوں نے اسلام قبول کیا، ان کے شوہر جنگوں میں کام آگئے یا ایسی خواتین جو جنگوں میں قیدی ہو کر آئیں ان بے سہارا خواتین کے لیے ضروری تھا کہ ان کو بہتر سہارا ملے ایسا نہ ہو کہ کفار کہیں کہ اسلام کو گلے لگا کر مزا چکھ لیا ہے۔ اب تمھارا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ رفتگان کی بیواؤں، یتیم بیٹے بیٹیوں کی نگہبانی کی ضرورت تھی۔ ہرگز ہرگز جنس پرستی نہ تھی جس کے لیے شادیاں کیں۔ بلکہ بے بس اور بے یار ومددگاروں کی مدد مقصود تھی

گاڈ ہیگنز فری کہتا ہے "اگر عورتوں سے عشرت مقصود تھی تو یہ عجب بات ہے کہ آپؐ نے ٢٥ سال کی عمر میں جو وقت خاص جوانی کا خیال کیا جاتا ہے صرف حضرت خدیجہؓ سے نکاح کیا تھا۔ اگر آپؐ

چاہتے تو اپنے ملک کے رواج کے مطابق بہت سے نکاح کر سکتے تھے مگر آپ اس قاعدہ سے مستفید نہ ہوئے اور اس بیوی کے تاحین حیات اسی کے ساتھ ۲۷ برس تک نباہ کیا'' (ن ۔۵۳۳/۴)

ٹامس کارلائل: مخالفوں کا کہنا کہ جب آپ کا بڑھاپا آ پہنچا، ساری گرمی شباب ختم ہوگئی اور آپؐ کے لیے اس دنیا میں صرف اطمینان و عافیت ہی ایک چیز باقی رہی تو اس وقت آپ کو ہوس پرستی کی سوجھی اور اپنے گذشتہ سارے خصائل پر پانی پھیر دیا اور ایک ایسی شے کے لیے مکر و فریب اختیار کیا جس سے آپ کسی طور متمتع نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ ایسی بات ہے جس کو میں کبھی تسلیم نہیں کرتا۔ اس سیر چشم' پاک طینت اور صاف باطن انسان میں جسے مادر صحرا نے اپنے آغوش شفقت میں پالا تھا' جذبہ ہوس پرستی اور شہرت طلبی نہ تھی۔ یہ اس قسم کی بزرگ و برتر پاک جان تھی جسے خلوص و صداقت کے بغیر گذر رہی نہیں۔ (ن ۵۴۱/۴)

کارلائل مزید کہتا ہے کہ ''محمد ﷺ کے بارے میں جو کچھ بھی کہہ لیں وہ نفس پرست انسان ہرگز نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ صاحب تاج و کلاہ کی ایسی اطاعت نہیں ہوئی جیسی اپنی پیوند لگی عبا میں ملبوس اس انسان (محمد ﷺ) کی''۔ ایک نوجوان بارگاہ نبوی میں آتا ہے اور زنا کی اجازت طلب کرتا ہے۔ اس پر صحابہ ناراض ہوئے۔ آپؐ نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا اور فرمایا کہ تم اپنی ماں کے لیے ایسا پسند کرتے ہو؟ اس نے کہا ہرگز نہیں! فرمایا اسی طرح دوسرے لوگ بھی اپنی ماؤں کے لیے یہ پسند نہیں کرتے۔ پھر فرمایا' کیا تم اپنی بیٹی کے لیے یہ پسند کرتے ہو؟ اس نے کہا قربان جاؤں ہرگز نہیں! فرمایا ایسے ہی دوسرے لوگ بھی اپنی بیٹیوں کے لیے پسند نہیں کرتے۔ اسی طرح آپ نے اس کی بہن، خالہ وغیرہ کے لیے سوال کیا: اس نے ہر بار انکار کیا۔ اس کے بعد آپؐ نے دست شفقت اس کے سر پر رکھا اور دعا فرمائی ''اے اللہ! اس کا گناہ بخش دے۔ اس کا دل پاک کر دے اور اسے بدکاری سے بچا''۔ گناہوں سے بچانے، بدکاری سے رکنے کی دعا کرنے والا محسن ایسا ہو سکتا ہے کہ دوسروں کو لذت کیشی اور عیش پرستی سے باز رکھے اور خود اسی کام میں ملوث ہو۔ جو اوروں کو گناہ سے بچائے اور خود نہ بچے ایسے عام مصلح سے توقع نہیں کی جا سکتی تو بھلا اس محسن انسانیت اور ہادی عالم رسول اللہ ﷺ سے ایسی توقع کی جا سکتی ہے؟ ہرگز ہرگز نہیں!!

یہ جو راگ الاپا کہ ازواجی زندگی اور مذہبی زندگی میں تبدیلی محسوس ہوتی ہے۔ کیا کوئی معمولی سا واقعہ یا کہیں کوئی ادنیٰ اشارہ ملتا ہے کہ آپ نے مذہبی زندگی تبدیل کی۔ مستشرق ڈی ایس مارگولیتھ کے اس بیان کو پڑھ لیں انھیں اپنے بیان کا اندازہ ہو جائے گا۔ وہ لکھتا ہے ''مکہ سے ہجرت کے بعد پیغمبر ﷺ نے ایک محنتی خود مختار فرماں روا کی طرح فوجی مہمات کو بھی منظم کیا۔ ملاقاتیوں کو شرف باریابی بخشا۔ سفارت کار بھیجے۔ دعوت اسلام کے لیے خطوط بھی لکھوائے۔ ان کے علاوہ شکایات اور عرض داشتیں سن کر انصاف بھی بہم پہنچایا اور قانون کی تشریحات اور توضیحات بھی بتائیں۔ ایک دن کا آرام بھی اپنے لیے روا نہ رکھتے

ہوئے انھوں نے مسلسل کام کیا۔ ہمہ وقت لوگوں کو سننے اور مشاورت کے لیے تیار رہے اور کوئی بھی موضوع ہو، فیصلہ اپنے ہاتھوں میں رکھتے اور اس دنیا سے رحلت فرمانے تک ہر لحظہ پھلتی پھولتی اور وسعت پذیر اہل ایمان کی جماعت جس کی بنیاد خود انھوں نے رکھی اور جس کے وہ خود دینی و دنیاوی منتظم تھے، کے جملہ خارجی و داخلی امور کی خود نگرانی کرتے رہے مگر آخری دور میں ایک مکمل مذہبی نظام مرتب و تشکیل دے کر جملہ امور ریاست کو مختلف نمائندگان کے سپرد کر دیا تا کہ وہ ان امور کو سرانجام دیتے رہیں''۔

مذکور مصنف آگے یوں لکھتا ہے''ایک سپہ سالار، مقنن، مصنف اور سفارت کار کی حیثیت سے فرائض کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ پیغمبر اسلام ﷺ نے بہ طور مبلغ و معلم اپنے فرائض کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ تمام ممکنہ مسائل کے حل کے لیے ان کی رائے طلب کی جاتی اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انھوں نے اپنی صائب رائے سے انھیں حل نہ کر دیا ہو''۔(امہات المومنین اور مستشرقین ۱۰۵۔۱۰۴)

آپؐ نے فرمایا''جو شخص اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے اپنی بیوی سے متمتع کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر اس کو اجر سے نوازتا ہے۔صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ اپنی بیوی سے مقاربت پر بھی اجر ملے گا؟ آپؐ نے فرمایا: کیوں نہیں! ایسا شخص اگر ناجائز طریقے سے اپنی خواہشیں پوری کرتا ہے تو کیا مواخذہ نہ ہوتا؟ آپ کی تعلیم جنسی تعلقات یعنی جنس پرستی سے روکتی ہے۔زندگی کو پاکیزہ بناتی ہے۔کسی کے حق پر ڈاکہ ڈالنے سے روکتی ہے اور وہ ذات جسے یقولون مالا تفعلون کا درس دینا ہے۔وہ ذات جس کی شان میں ہے وما ینطق عن الھوی ''۔وہ ذات اس برے فعل کی گرد سے مبرا و منزہ ہے۔اور وہ ذات''فی رسول اللہ اسوۃ حسنہ'' ہے۔اس کا اسوہ تو ہر دور کے لیے مشعل راہ تب ہوسکتا ہے جو ہر اونچ نیچ سے پاک صاف ہو۔اسی لیے تو آپ کے اسوہ کو اپنانے کی ترغیب دی کیوں کہ ان کا ہر عمل منشائے ایزدی کے مطابق ہے اور یہی رول ماڈل ہے جس کی پیروی لازمی ہے۔یہ وہ ذات ہے جس نے فرمایا'' اللہ کی قسم! میں تم میں سے زیادہ خشیت الٰہی اور تقویٰ رکھتا ہوں لیکن مجھے دیکھو میں روزہ رکھتا ہوں اور چھوڑ بھی دیتا ہوں۔رات کو نماز پڑھتا ہوں اور آرام بھی کرتا ہوں۔جس نے میری سنت سے اعراض کیا وہ مجھ سے نہیں (محمد رسول اللہ ۱۹۷۔۱۹۶) اس میں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ صرف ایک طرف ہی میلان نہ ہو بل کہ تمام قسم کے حقوق و فرائض سے عہد برآ ہونا ضروری ہے۔مارگولیس ڈاڈز کہتا ہے'' مکہ کے متمول تاجر ہوتے ہوئے اور ایک انتہائی باوفا اہلیہ کی موجودگی میں مکہ کی پر تعیش زندگی کو چھوڑ کر آپ نے غارِ حرا کو اپنا مسکن بنالیا۔آپ کی غیر معمولی سنجیدگی کو ظاہر کرتی ہے''۔

گبین کہتا ہے انتقال سے تین دن پہلے تک آپ ﷺ باقاعدگی سے نمازوں کی امامت فرماتے رہے(till the third day before his death he regularly performed

the function 0f public prayers.

اعتراض نمبر ۱۶۶

''منٹگمری واٹ'' نے ضعیف اور موضوع روایات کے بل بوتے پر چھتیس خواتین کے نام گنوائے ہیں اور یہ باور کرایا ہے کہ یہ سب کی سب ازواج نبوی تھیں اور یہ دریدہ دہنی بھی کی کہ (نعوذ باللہ) شادی شدہ عورتوں سے تعلقات تھے۔

جواب:اس وقت سماج میں خواتین کا کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔کنیزوں کو روزانہ کی بنیاد پر پیسے کمانے بھیجا جاتا تھا۔اگر وہ مقررہ رقم رنڈی بازی کے ذریعہ کما کر نہ لاتی تو اسے زدوکوب کیا جاتا تھا۔بیواؤں کا برا حال تھا۔دوسری شادی سے محروم بیواؤں کو آہوں اور سسکیوں بھری زندگی گزارنا پڑتی۔آخر چل بستیں۔یتیموں کا کوئی والی نہ تھا۔اگر کوئی کفیل مل بھی جاتا تو محض اس یتیم کی جائیداد کو ہڑپ کر جانے کا متمنی اور خواہاں تھا۔ان برائیوں کے خاتمہ کے لیے دین اسلام نے تعدد ازواج کی مشروط اجازت دے دی۔

آپؐ کی عمر شریف	نام ازواج مطہرات	بہ یک وقت تعداد ازواج	کیفیت
۲۵ سال	حضرت خدیجہؓ	ایک	بیوہ
۵۰ سال	حضرت سودہؓ	ایک	بیوہ
۵۵ سال	حضرت عائشہؓ	دو	کنواری
۵۶ سال	حضرت حفصہؓ	تین	بیوہ
۵۶ سال	حضرت زینب بنت خزیمہؓ	چار	بیوہ
۵۷ سال	حضرت ام سلمہؓ	چار	بیوہ
۵۸ سال	حضرت زینب بنت جحشؓ	پانچ	مطلقہ
۵۸ سال	حضرت جویریہؓ	چھ	بیوہ
۵۹ سال	حضرت ام حبیبہؓ	سات	مطلقہ
۵۹ سال	حضرت ماریہ قبطیہؓ	آٹھ	کنواری
۶۰ سال	حضرت صفیہؓ	نو	بیوہ
۶۰ سال	حضرت میمونہؓ	دس	بیوہ

امام جوزیؒ نے حضرت ریحانہ کو بھی ازاوج میں شامل کیا ہے اور انہوں نے حضرت میمونہؓ سے پہلے

ازواج النبی کی فہرست میں لکھا ہے نیز وہ ان کے والد کا نام زید لکھتے ہیں۔ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ ریحانہ بنت زید کے متعلق ایک قول یہ ہے کہ وہ سریہ تھیں (آنحضرت ﷺ نے بعض لونڈیوں کو آزاد کیے بغیر ان کے ساتھ ملک یمین کے تحت مباشرت فرمائی ایسی لونڈیاں سراری کہلاتی ہیں۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ان کے علاوہ چند خواتین تھیں جن کے ساتھ آپ ﷺ نے نکاح فرمایا لیکن زفاف کی نوبت نہیں آئی تھی جن میں ایک کلابیہ ہیں جن کا نام بعض فاطمہ، عمرہ اور عالیہ بتاتے ہیں۔ اسی طرح اسماء بنت نعمان، قتیلہ بنت قیس، ملیکہ بنت کعب، ام شریک، خولہ، شراف، لیلہ بنت حطیم اور غفاریہ رضی اللہ عنہن کے ساتھ نکاح ہوا مگر زفاف نہیں ہوا۔

اور بعض کے ساتھ خطبہ ہوا اور دعوت نکاح دی گئی مگر نکاح تک نوبت نہیں آئی تھی اور ان ناموں میں اور فقط نکاح یا فقط خطبہ پائے جانے میں اختلاف ہے اور بعض عورتیں آپ ﷺ پر نکاح کے لیے پیش کی گئیں مگر آپ ﷺ نے ان کے ساتھ نکاح کرنا پسند نہ فرمایا اور اس سے انکار فرمایا۔ منٹگمری واٹ کا اشارہ کثرت ازواج اور کثرت مباشرت سے ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث شریف میں ہے۔'' حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کفیت عطا کیے گئے تھے، حضرت حسن بصریؒ جو حضرت جابرؓ سے اس روایت کو نقل فرما رہے تھے عرض کیا گیا ''کفیت'' کیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: جماع و مباشرت کی قدرت کاملہ۔ شیخ عبدالحق فرماتے ہیں کہ جن مواضع و مقامات کی حقیقت کما حقہ ادارک کرنے سے کوتاہ اندیشوں کے عقول قاصر و محجوب ہیں ان میں سے ایک مقام تعدد ازواج اور کثرت مباشرت ہے جس کو وہ نقصان اور تنزل پر محمول کرتے ہیں اور لہو و لعب کے قبیل میں شمار کرتے ہیں حالانکہ یہ نقصان فہم کی دلیل ہے اور رہبانیت کی طرف میلان کی بلکہ کثرت نکاح و جماع میں جہاں فقط نسل اور دوام انسانی جیسے عظیم منافع ہیں وہاں حفظ صحت اور نعمت خداوندی سے تمتع بھی اسی میں ہے اور حقیقت حال کا بغور جائزہ لیا جائے تو فعل و انفعال اور تاثیر و تاثر کا مکمل ظہور جو ظہور عالم کی علت غائیہ ہے جس قدر نکاح و جماع اور توالد و تناسل میں ہے اور کہیں نہیں ہے اور سید الانبیاء کا عمل اس پر واضح دلیل ہے اور سند و حجت تامہ کاملہ۔ کثرت ازواج اور کثرت جماع کو عموم پر قیاس کرنا درست نہیں ہے کیونکہ یہ آپ ﷺ کی قدرت و قوت محض قدرت الٰہی سے تھی اور دائرہ اسباب عادیہ سے خارج تھی (ان خواتین کی تعداد بیس یا اس سے کچھ زیادہ تھی) مبالغہ آمیزی سے جنسیت پرستی، تلذذ نفس اور شہوت رانی کا الزام لگانا محض باطل ہے۔ مذکور جدول سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک وقت کنیز ملا کر تعداد دس بنتی ہے جو سنت داؤدی سے مطابقت رکھتی ہے۔ آپؐ نے شادیاں دینی مصلحت، تالیفِ قلوب، جذبہ خیر الناس، علوئے مرتبت اور فلاح امت کے لیے کیں۔ دوسری بات یہ کہ آپؐ اس غلیظ اور برائیوں سے بھرے معاشرہ میں الصادق والامین کے القابات سے معروف تھے۔ اس ہستی کے بارے میں یہ کہنا کہ شادی

شدہ عورتوں سے تعلقات تھے محض باطل ہے۔ کیوں کہ یہ ماننا پڑے گا کہ کیا ایسے شخص کو الصادق والامین کے لقب دیے جاتے ہیں۔ نہیں نہیں ہرگز نہیں تو پھر یہ بات قابلِ تسلیم ہے اور آخری ہے کہ آپ ایسی ویسی حرکات سے مبرا و منزہ تھے۔ تب ہی تو اپنے پرائے بھی الصادق والامین کہتے تھے۔ یہ اس وقت کے جاہلی معاشرہ سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ ایک فرد برائیوں میں لتھڑا ہوا ہو اور اسے عالی شان القابات سے نواز رہے ہوں۔ حالانکہ اسے کہنا تو یہ چاہیے تھا کہ آپ نے بیواؤں، مطلقاؤں کو اپنے حرم نبوی میں داخل کیا۔ ان کی دستگیری کی اور نگہداشت کا فرض نبھایا لیکن اس نے اس حقیقت کو چھپا کر افسانوی رنگ بھر دیا اور ایک عام آدمی کی طرح الزام لگایا۔ وہ جانتا ہے کہ شادی شدہ خواتین بیوہ یا مطلقہ ہوئیں انھیں حرم نبوی میں داخل کیا گیا۔ مگر وہ ایسا کہنے سے قاصر ہے کیوں کہ اس کی سرشت میں نفرت و تعصب دین اسلام اور پیغمبر اسلام کے لیے کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ اگر چہ بعض مستشرقین کے خیالات و نظریات کا رد بھی کرتا ہے مگر قلبی شقاوت اور دلی رقابت بہ دستور براجمان رہتی ہے۔ ایک مستشرق کی رائے پیش کرتے ہیں جس سے 'واٹ' کی من گھڑت کہانی دلائل کے طوفان میں بہہ جائے گی۔ Sir john Begot Glubb کہتا ہے کہ ''آپ آزاد جنسی پیار و محبت کے قائل نہ تھے۔ آپ اللہ کی حمد و ثناء بیان کرتے تھے اور اپنے مشن سے پہلے کے جوانی کے دور میں بھی ان کے کسی عورت کے ساتھ غیر اخلاقی تعلقات نہ تھے اور اپنا مشن شروع کرنے کے بعد بھی ان کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے سوائے اپنی بیوی کے کسی غیر عورت کو ہاتھ تک نہیں لگایا''۔ (امہات المومنین اور مستشرقین۔۸۱)

اعتراض نمبر ۱۶۷

''جارج برناڈ شا'' آزادی فکر کے اول درجہ کے علم بردار ہیں لیکن یہی شخص داعی اسلام کا ذکر نہایت سوقیانہ انداز میں کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

" It could never Mahomet to convert the force tribes of itomes to an exalted monotheism Arabia from worshiping but it could not make him say to a pretty woman"

''محمد ﷺ عرب کے تند خو قبائل کو پتھروں کی پرستش سے ہٹا کر ایک خالص توحید کو منوانے کا عزم تو کر سکتے تھے مگر کسی حسین خاتون کو رد کرنا ان کے بس میں نہیں تھا''

جواب: اہل مغرب ایک انسان کو خدا تو مان سکتے ہیں لیکن کسی اور کو نبوت پر فائز نہیں دیکھ سکتے۔ ہر عیسائی پر روح القدس کا نزول ہوسکتا ہے لیکن یہی روح القدس کسی غیر عیسائی سے تعلق رکھے' عیسائیت

اس کو نہیں مانتی۔ یہی رقابت ہی اہل مغرب کو حق کہنے سے باز رکھتی ہے۔ برناڈ شا کا مذکور الزام کسی طور درست نہیں، وہ ذات جو اپنی جوانی اور عالم شباب میں اپنی پاکیزگی و پارسائی میں نمونہ عفت وسچائی ہو اور لوگ انھیں الصادق والامین کے القاب سے پکارتے ہوں وہ ایسی حرکات کا مرتکب نہیں ہوسکتا ہے وہ ذات جس نے اپنی جوانی کے ایام ایک عمر رسیدہ خاتون سے بتا دیئے ہوں اور ان کی موجودگی میں اور شادی نہیں کی۔ اور اس وقت عیاش عرب معاشرے میں باکرہ حسین عورتوں کی کمی نہ تھی۔ وہ چاہتے تو ایک سے زیادہ عورتوں سے نکاح کر لیتے مگر کمال یہ ہے کہ ایک باکرہ زوجہ مطاہرہ کے علاوہ باقی سب بیوائیں یا مطلقہ حرم نبوی میں داخل ہیں۔ ان سے نکاح کی دیگر حکمتوں کے علاوہ سب سے اہم حکمت تالیف قلبی ہے۔ عورتوں کے شوہر غزوات وسرایا میں کام آ گئے تو بیواؤں اور مطلقاؤں کا سہارا نہ رہا۔ در بہ در کی ٹھوکریں ان کا مقدر بنی اور پھر بھی وہ اسلام کی وفادار رہیں۔ ایسے میں انھیں سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی سہارا تھا ان عورتوں کو حرم نبوی میں جگہ مل گئی۔ اسے مستشرقین ناپسند کرتے ہیں۔ نسائی شریف میں حضرت انسؓ سے مروی آپ ؐ کا ارشاد ہے کہ ''مجھے تین چیزیں پسند ہیں۔ نماز، عورت، خوشبو۔ نسائی شریف میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''تین چیزوں کی محبت میرے دل میں رکھی گئی ہے' عورتیں' خوشبو اور آنکھوں کی ٹھنڈک میری نماز میں ہے۔'' یاد رہے کہ عورت کی پسندیدگی کسی تلذذ جنسی یا عیش وعشرت کے سبب نہیں ہے۔ وہ تو حد درجہ پسند تھی اس لیے کہ اس کا عرب معاشرہ میں کوئی مرتبہ ومقام نہ تھا۔ کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ کئی شوہر ایک ہی بیوی پر اکتفا کرتے تھے۔ باپ کے مرنے پر بیٹا اپنی ماں سے شادی کر لیتا۔ متعہ کا رواج عام تھا۔ یعنی کچھ مدت کے لیے عورت کو اپنا لیا جاتا (بیوی بنالیا) پھر اس مدت مقررہ کے بعد چھوڑ دیا جاتا خواہ مرے یا جیئے اس کی بلا سے! شوہر کے مرنے کے بعد عورت شادی نہیں کر سکتی تھی۔ شادی اس کے لیے شجرِ ممنوعہ کے مترادف تھی۔ عمر بھر کالا لباس زیب تن رہتا۔ ایک کال کوٹھڑی میں بند ہو کر عمر بھر سسکیوں آہوں اور سرد آہیں بھر کر آخر چل بستی۔ کسی کو دکھ ہوتا نہ تکلیف۔ عرب معاشرہ عورتوں کو گنتی میں نہیں لاتا تھا۔ وہ مردوں کے ساتھ ننگے خانہ کعبہ کا طواف کرتیں۔ کفار پیدا ہوتے ہی بچیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔ اس بے بس اور بے چارگی اور بے یارو مددگار عورت کا پرسان حال آ گیا۔ وہ مسیحا آ گیا جس نے عورت کو مردوں کے برابر حقوق عطا کیے۔ زندہ قتل کرنے سے روکا۔ دوبارہ شادی کرنے کی اجازت بخشی۔ ایک سے چار شادیوں کی اجازت مشروط کر دی۔ اس لیے عورت پسند تھی کہ معاشرے میں اسے بھی جینے کا حق حاصل ہو۔ ظلم وزیادتی کا نشانہ نہ بنے۔ جائیداد میں اسے حق نصیب ہوا۔ عورت کو معاشرے میں ایک معزز رتبہ عطا کیا حتیٰ کہ ''ماؤں کے قدموں تلے جنت ہے'' کے فرمان سے وہ اعزاز بخشا جس کی نظیر دیگر معاشروں میں نہیں

ملتی۔ ’’جان بیگٹ‘‘ کہتا ہے ’’آپ ﷺ کا عورتوں کی محبت کو عبادت کے ساتھ جمع کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ ﷺ کا عورتوں کی معیت کا شوق بالکل معصوم تھا۔(ضیاء النبی۔۷۔۵۴۴)

ان مستشرقین کے پہلوں یعنی کفار نے بھی کہا کہ اس شخص کا مطمح نظر تو صرف عورتیں اور نکاح ہے اگر یہ نبی ہوتے جس طرح کا یہ گمان کرتے ہیں تو نبوت انھیں خواتین کی طرف توجہ کرنے کی فرصت ہی نہ دیتی۔اس پر خود رب العزت کی بارگاہ سے اس اعتراض کا جواب عطا ہوتا ہے۔اور یکسر مذکورہ الزام توہین آمیز کی قلعی کھل جاتی ہے۔ارشادِ ربانی ہے ” وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّيَّةً (الرعد ۳۸)‘‘اور بے شک ہم نے بھیجے کئی رسول آپ ﷺ سے پہلے اور بنائیں ان کے لیے بیویاں اور اولاد‘‘۔

ہیکل (حیات محمد۔۶۵۸ بحوالہ نسائی: باب حب النساء) لکھتے ہیں۔ترجمہ (دنیا سے میرے لیے عورتیں اور خوشبو محبوب بنائی گئی اور میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں بنائی گئی) اس حدیث پاک کے معانی میں دو قول بیان کیے جاتے ہیں۔ایک یہ کہ حب ازواج زیادہ موجب ابتلا و تکلیف اور بمقتضائے بشریت آنحضرت ﷺ کے ادائے رسالت سے غافل ہونے کا اندیشہ ہے مگر اس کے باوجود حضور ﷺ اس سے کبھی بھی غافل نہیں رہے اس سے معلوم ہوا کہ حب نساء میں حضور ﷺ کے لیے مشقت زیادہ اور اجر عظیم ہے۔دوسرا یہ کہ حب نساء اس واسطے ہوئی کہ آپ ﷺ کے خلوات اپنی ازواج کے ساتھ ہوں اور مشرکین جو آپ ﷺ کو ساحر و شاعر ہونے کی تہمت لگاتے تھے، وہ جاتی رہے،بس عورتوں کا محبوب بنایا جانا آپ ﷺ کے حق میں لطف ربانی ہے اور ہر صورت یہ حب آپ ﷺ کے لیے باعث فضیلت ہے۔اور اس حدیث کے آخری جملے میں اس امر کی طرف اشارہ بھی ہے کہ وہ محبت آنحضرت ﷺ کے لیے اپنے پروردگار کے ساتھ کمال مناجات سے مانع نہیں بلکہ حضور ﷺ باوجود اس محبت کے اللہ تعالیٰ کی طرف ایسے متوجہ ہیں کہ اس کی مناجات میں آپ ﷺ کی آنکھیں ٹھنڈی رہتی ہیں اور ماسوا میں آپ ﷺ کے لیے ٹھنڈک نہیں پس حضور ﷺ کی محبت حقیقت میں صرف اشارہ ہے کہ حب نساء جب حقوق عبودیت کی ادائیگی میں مخل نہ ہو بلکہ انقطاع الی اللہ کے لیے ہو تو وہ از قبیل کمال ہے ورنہ از قبیل نقصان ہے۔

ایک اور تشبیہ عورت اور پسلی کے بارے میں ہے آپ ﷺ نے فرمایا ’’عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی میری نصیحت قبول کرو کیونکہ وہ پسلی سے پیدا کی گئی ہے۔‘‘ یہاں ایک غلطی کا ازالہ ضروری ہے کہ بہت سے جید مفسرین نے بھی استعارہ کی بجائے امر واقعہ کے طور پر لیا ہے اور اس سے عورت کے فروتر مقام پر استناد کیا ہے۔درحقیقت اس حدیث میں آدمؑ و حواؑ کی تخلیق کا ذکر نہیں ہے (جیسا کہ دوسرے بہت سے مفسرین کرام نے بھی وضاحت کی ہے) حدیث پاک کا مآل یہ ہے کہ عورت اپنی فطری ساخت کی وجہ سے خصوصی طور پر حسن سلوک کی مستحق ہے۔ایک دوسری حدیث سے بھی اس تفسیر کی تائید ہوجاتی ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ’’عورت پسلی کی مانند ہے اگر تم اس کو سیدھا کروتو اسے توڑ دو گے‘‘۔ واضح رہے کہ امام بخاری اس حدیث کو کتاب النکاح باب المداراۃ مع النساء (باب عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کا بیان میں لائے ہیں اس سے بھی یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ عورتیں حسن سلوک کی زیادہ مستحق ہیں۔ اسلام نے ماں کی عظمت اور والدین کے مقام کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ سورہ لقمان ۱۴ ’’اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اسے پیٹ میں رکھا اور دو سال اس کا دودھ چھوٹنے میں لگے (اس لیے ہم نے نصیحت کی کہ) میرا شکر کر اور اپنے والدین کا شکر بجالا میری ہی طرف تجھے پلٹنا ہے۔‘‘

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوتا ہے اور جہاد کے لیے اجازت کی درخواست کرتا ہے، مجھے جہاد میں حصہ لینے کا شوق ہے لیکن میں عاجز ہوں‘ آپ ﷺ نے فرمایا تمہارے والدین میں سے کوئی زندہ ہے؟ اس نے جواب دیا: میری ماں زندہ ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا اس کے ساتھ حسن سلوک کر کے اللہ سے ملو۔ اس کی خدمت کرو کہ ماؤں کے قدموں کے نیچے جنت ہے۔ (محمد رسول اللہ اکرم طاہر۔ ۲۸۰)

قرآن کریم نے عورت کی عزت وعظمت کو بلند کیا۔ پورے قرآن مجید میں کسی سورہ کا نام’’ رجال‘‘ نہیں ہے جبکہ اس کے برعکس عورت کے نام پر النساء موجود ہے نیز عورت کے حیض ونفاس، روزہ حج، نماز اور وراثت سے حصہ کی مالکہ کے مسائل وضاحت سے بیان کیے ہیں۔ طلاق، دوسری شادی کی اجازت، رضاعت ومصاہرت وغیرہ کے احکام سے روشناس کیا۔ اپنے فرائض وحقوق کے ساتھ مرد کے حقوق وفرائض کے ادائیگی کی تعلیم دی اسلام نباتات و جمادات اور جانداروں کی حفاظت کی تلقین کرتا ہے جبکہ انسانیت کے لیے ہر قسم کی آسودگی وسہولت کا داعی ہے۔ صرف اور صرف عورتوں کی کس مپرسی کی وجہ سے ان کا بدرجہ اتم خیال رکھنے کی ہدایت کی گئی ہے نہ کہ عیش وعشرت اور جنسی تلذذ سے شادکام ہونے کا سبب تھا، اسلام نے عورت کو جائز مقام ومرتبہ عطا کیا ہے اس پر اسلام کے نام لیوا خوش وخرم ہیں کہ اسلام نے عظیم کام سرانجام دیا ہے۔ شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم۔

بنات النبی اثبات بنات اربعہ

اعتراض نمبر ۱۶۸

شیعہ آپؐ کی ایک بیٹی تسلیم کرتے ہیں اور باقی گروہ چار بیٹیاں مانتے ہیں۔

جواب: حضرت سیدنا ابن عباس سے روایت ہے کہ آپؐ کے پہلے فرزند اعلان نبوت سے پہلے مکہ میں پیدا ہوئے۔ وہ قاسم تھے اور آپ کی کنیت ابوالقاسم انھیں سے تھی۔ پھر جو اولاد ہوئی وہ سیدہ

زینب، سیدہ رقیہ، سیدہ فاطمہ اور سیدہ ام کلثوم تھیں پھر جو اسلام میں (اعلان نبوت کے بعد) پیدا ہوئے وہ حضرت عبداللہؓ تھے جن کا نام طیب و طاہر رکھا گیا۔ (اثبات بنات اربعہ ص ۲۷)

ابن اسحاق نے کہا کہ نبی کریم کی تمام اولاد پاک سیدہ خدیجہؓ کے بطن اقدس سے ہے سوائے حضرت ابراھیمؓ کے (حضور کے ایک صاحب زادے جو ماریہ قبطیہ سے تھے)۔ حضرت قاسم آپ کے صاحب زادے تھے جن سے آپ کی کنیت (ابوالقاسم) تھی اور طیب و طاہر اور سیدہ زینب، رقیہ، ام کلثوم اور فاطمہ۔ (حوالہ بالا)

سورہ کوثر کی شان نزول میں اکثر مفسرین نے آنحضرتؐ کی چار شہزادیاں تحریر کی ہیں جن میں شیعہ کتب کے حوالہ جات بھی دیے ہیں۔

امام قسطلانی فرماتے ہیں کہ ”تم جان لو کہ نبی مکرم کی جملہ اولاد جن پر علماء کا اتفاق ہے ان میں سے چھ ہیں۔ ان میں سب سے پہلے حضرت عبداللہ و حضرت قاسم اور آخر حضرت ابراھیم اور آپؐ کی چار صاحب زادیاں ہیں جن میں بڑی زینبؓ ہیں اور حضرت رقیہؓ اور حضرت ام کلثومؓ اور حضرت فاطمہؓ ان سے اصغر ہیں‘ یہ صحیح قول ہے اور چاروں صاحب زادیوں نے اسلام کا زمانہ پایا ہے اور آپؐ کے ساتھ ہجرت مدینہ کی ہے۔

امام یوسف بن اسماعیل نبھانی فرماتے ہیں کہ آپؐ کی چار صاحب زادیاں تھیں۔ (۱) حضرت زینبؓ (۲) حضرت رقیہؓ (۳) حضرت ام کلثومؓ (۴) حضرت فاطمہؓ۔ آپ کے صاحب زادوں کی تعداد تین ہے۔ (۱) سیدنا قاسم (۲) سیدنا ابراھیم حضرت ماریہ قبطیہ کے بطن سے آپ کے صاحبزادے ہیں باقی چھ اولادیں آپ کی حضرت خدیجہ کے بطن سے ہوئی (۳) سیدنا عبداللہ۔ (حوالہ بالا ص ۴۶)

اس آیت یعنی یا ایھا النبی --- نساء المومنین (سورۃ الاحزاب۔۵۹) میں حضور ﷺ کی چار صاحبزادیوں کا ذکر آیا ہے قرآن نے ”بنت“ ایک صاحبزادی نہیں فرمایا بلکہ جمع کا صیغہ بنات استعمال کیا جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ حضور ﷺ کی ایک صاحبزادی نہیں تھی بلکہ متعدد صاحبزادیاں تھیں۔ شیعہ کی معتبر کتابوں میں بھی اس بات کی تصریح موجود ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے بطن سے آپ ﷺ کی چار صاحبزادیاں تھیں درج ذیل حوالے پیش خدمت ہیں۔

شیعہ علماء: ملا باقر مجلسی شیعہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو چار صاحب زادیاں عطا کیں (۱) سیدہ زینبؓ (۲) سیدہ رقیہؓ (۳) سیدہ ام کلثومؓ (۴) حضرت فاطمۃ الزہراؓ۔

اصول کافی: یہ شیعہ کی معتبر ترین کتاب ہے۔ اس میں ہے کہ ”نبیؐ نے حضرت سیدہ خدیجہؓ سے شادی کی جب کہ آپؐ کی عمر مبارک ۲۵ سال تھی اور خدیجہ کے بطن سے پہلے قاسمؓ، رقیہؓ، زینبؓ، ام کلثومؓ

اور بعثت کے بعد طیبؓ وطاہرؓ اور فاطمہ علیہا السلام پیدا ہوئیں۔

قرب الاسناد لابی العباس: حضرت جعفر صادق اپنے والد گرامی امام باقر سے روایت کرتے ہیں ۔انھوں نے فرمایا کہ حضرت خدیجہؓ سے رسول اللہ ﷺ کی اولاد پیدا ہوئی۔ قاسم، طاہر، ام کلثوم، رقیہ، فاطمہ اور زینب۔ پھر نکاح کیا حضرت علیؑ نے فاطمہؓ سے اور نکاح کیا ابوالعاص نے زینبؓ سے۔ حضرت عثمان نے ام کلثومؓ سے نکاح کیا۔انھوں نے دخول نہیں کیا تو وہ فوت ہو گئیں۔اور نکاح کیا حضرت عثمان ؓ سے رسول اللہ ﷺ نے حضرت ام کلثوم کی جگہ رقیہؓ کا۔(حوالہ بالا۔ص ۱۳۰)

مناقب آل ابی طالب: ''حضورؐ کی اولاد حضرت خدیجہؓ سے دولڑکے قاسم اور عبداللہ جن کو طیب و طاہر بھی کہتے ہیں اور انھیں سے چار بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ سیدہ زینبؓ، سیدہ رقیہؓ، سیدہ ام کلثومؓ جن کا نام آمنہ ہے (ام کلثوم کنیت ہے) اور سیدہ فاطمہؓ''۔

بحارالانوار: حضرت خدیجہؓ کے بطن سے نبی اکرمؐ کی چار شہزادیاں زینب، رقیہ، ام کلثوم اور فاطمہ پیدا ہوئیں۔ گویا ترتیب میں فرق ہے اور علماء میں اختلاف پایا جاتا ہے مگر اس پر معترضین سمیت علماء کا اتفاق ہے کہ آپ کی چار بیٹیاں تھیں۔

قرآن کی شہادت: ''يَآيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزوَٰجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤمِنِينَ'' (احزاب آیت ۵۹)

''اے نبی آپ اپنی ازواج (مطہرات) اور اپنی بیٹیوں اور مومنین کی عورتوں کو فرما دیجیے''۔

اس آیت پاک میں عورتوں کی عہد نبوی میں تین اقسام بیان ہوئی ہیں۔(۱) ازواج النبی (۲) بنات النبی (۳) نساء المومنین

اواج زوج کی جمع ہے۔ عربی میں ایک کے لیے واحد، دو کو تثنیہ اور دو سے زیادہ پر جمع بولتے ہیں۔ لہٰذا ازواجک سے ظاہر ہے کہ آپ کی کئی بیویاں تھیں اور خطاب کیا جا رہا ہے کہ اپنی بیویوں سے کہہ دیں تو یہاں پر آپ کی ازواج خطاب میں شامل ہیں۔اس سے آگے ''واؤ'' عاطفہ ہے جو مغائرت کے لیے آتا ہے یعنی اس ''واؤ'' سے پہلا اور دوسرا بیان الگ الگ ہے یعنی ازواج اور بنات میں مغائرت ہے۔

وبَنَاتِکَ بنات بنت کی جمع ہے یعنی دو سے زیادہ ہیں۔اب آیت مبارکہ کا ترجمہ ہوا کہ ''اے حبیب آپ فرما دیجیے اپنی (تمام) ازواج (بیویوں) اور اپنی (تمام) بیٹیوں کو'' جس سے معلوم ہوا کہ جس طرح ازواج دو سے زیادہ ہیں اسی طرح بیٹیاں بھی دو سے زیادہ ہیں۔

(سورہ ابراھیم ۱۴۱) ''يُذَبِّحُونَ أَبنَآءَكُم وَيَستَحيُونَ نِسَآءَكُم'' (وہ ذبح کر دیتے تمھارے بیٹوں کو اور زندہ رکھتے تمھاری عورتوں کو)

اگرچہ نساء تمام عورتوں پر بولا جاتا ہے مگر اس مقام پر اس سے مراد بیٹیاں ہیں کیوں کہ ابناکم کے

مقابلہ پر نساء کم فرمایا گیا تو اس قرینہ نے بیٹیاں متعین کر دیں اور دوسرا واقعۂ فرعون کا حکم جاری کرنا کہ بیٹوں کو ذبح کرو بھی یہ مفہوم متعین کرتا ہے کہ بیٹیوں کو چھوڑ دو تو یہاں لفظ نساء بول کر بیٹیاں مراد لی گئی ہیں۔ بہ خلاف ''قل ازواجک وبناتک ونساء المومنین'' کے کہ یہاں نساء المومنین میں تمام عورتیں مومنین کی مائیں، بہنیں، بیویاں اور بیٹیاں سب مراد ہیں اور آپؐ کی بیویاں اور بیٹیاں ازواجک اور بناتک میں متعین ہیں۔ اس وضاحت سے بنتک سے قوم کی بیٹیاں مراد لینا درست نہیں ہے اور بناتک کا لفظ قوم کی بیٹیوں کے لیے ہے۔ نیز شیعہ حضرات جو کہتے ہیں کہ آپؐ کی بیٹی تو ایک ہی ہے تو یہ الزام دو طرح سے غلط ہے ایک تو یہ کہ اس میں لفظ بناتک آیا ہے جس کے معنی کئی بیٹیاں لہٰذا ایک بیٹی کا عقیدہ درست نہیں ہے دوم اگر بناتک کے لفظ سے قوم کی بیٹیاں مراد لی جائیں تو ازواجک سے مراد بھی معاذ اللہ قوم کی بیویاں ہو ں گی جب کہ یہ کسی طرح مناسب و موزوں نہیں کیوں کہ تمام امت کی بیویاں بھی حضور ﷺ کی روحانی بیٹیاں ہیں۔ لہٰذا ازواجک سے مراد آپؐ کی ازواج مطہرات ہیں اور بناتک سے مراد آپؐ کی جسمانی بیٹیاں ہیں۔ شیعہ حضرات کا ایک بیٹی کہنا اور باقی بیٹیوں سے انکار جہاں نبی مکرم ﷺ کی بے ادبی ہے وہاں قرآن کی آیت کا انکار بھی ہے۔

مولانا محمد اچھروی کی تقریر: وہ فرماتے ہیں (۱) اللہ تعالیٰ نے (اس آیت میں) تین اقسام کی عورتوں کا ذکر فرمایا اور تینوں پر لفظ جمع استعمال فرمایا۔ (۱) ازواج (۲) بنات (۳) نساء المومنین۔ ان تینوں میں سے کسی لفظ میں واحد کا شائبہ نہیں ہے' بنت لفظ کہاں سے لاؤ گے؟ (۲) بنات کا لفظ حقیقی بیٹیوں پر استعمال ہوتا ہے۔ سوتیلی بیٹیوں پر نہیں ہوتا۔ (۳) بنات کی اضافت اللہ تعالیٰ نے ''ک'' کی طرف فرمادی تا کہ مصطفیٰ کی خصوصیت ثابت ہوجائے اگر حضرت خدیجہ سے پچھلی لڑکیاں ہوتیں تو بناتِ زَوجِکَ ہوتا وبَنَاتِکَ میں ''ک'' اضافی نے مصطفیٰ کی حقیقی صاحب زادیاں ثابت کر دیں۔ (حوالہ بالا۔ ۱۸ بہ حوالہ مقیاس خلافت حصہ اول)

کسی شخص کی سگی اولاد کے بارے میں کہا کہ وہ اس کی اولاد نہیں ہے اس سے بڑی اذیت اور کیا ہوسکتی ہے اور آپؐ کی سگی بیٹیوں کے متعلق ایسا کہنا کہ یہ ان کی بیٹیاں نہیں تھیں اس سے بڑھ کر رسول اللہؐ کو زیادہ تکلیف اور ایذا کون سی پہنچائی جاسکتی ہے۔

اعتراض نمبر ۱۶۹

آپؐ کی ایک ہی بیٹی تھی۔ آپؐ کی بیویوں سے جو اور شوہروں سے بیٹیاں پیدا ہوئیں انھیں بیٹیاں کہا گیا ہے۔

جواب: یہ بات قرآن سے ثابت ہے کہ نبی مکرمؐ کی بیٹیاں تین یا تین سے زیادہ ہیں۔ ارشاد خدا

وندی ہے" یایھا النبی قل لازواجك و بناتك ونساءِ المومنین ۔۔۔۔(سورۃ الاحزاب۳۳۔۵۹) یا ایھا النبی قل ازواجک و بناتک ونساء المومنین ۔۔۔۔جلابیجن" (اے نبی مکرم ﷺ ! آپ فرمایئے اپنی ازواج مطہرات کو، اپنی صاحبزادیوں کو اور جملہ اہل ایمان کی عورتوں کو کہ (جب باہر نکلیں تو) ڈال لیا کریں اپنے اوپر چادروں کے پلو۔۔۔" مذکورہ آیت میں بتایا جارہا ہے کہ حضور ﷺ کی اپنی ازواج مطہرات مراد ہیں اور اسی طرح "بناتک" میں بھی آپ ﷺ کی اپنی بیٹیاں مراد ہیں نیز جو ایک بیٹی کو مانتے ہیں اور باقی تین انکاری ہیں، ان کا بھی اس آیت مبارکہ سے رد ہو گیا کہ ازواجک اور بناتک، جمع کے صیغے ہیں جو کم از کم دو سے اوپر کو ظاہر کرتے ہیں لہٰذا آپ ﷺ کی صاحبزادی ایک نہیں ہے بلکہ زیادہ ہیں اور اصح قول یہ ہے کہ چار ہیں۔ وہ شہزادیوں کا انکار کر کے قرآن پاک کی آیت کے منکر ہوئے جاتے ہیں اصل ان کی کوئی ذہنی گرہ ہے صرف اور صرف وہ یہ ہے کہ اگر باقی شہزادیاں تسلیم کر لیں تو حضرت عثمان غنیؓ کو آپ ﷺ کا داماد ماننا پڑے گا اور اسی طرح ابوالعاص کو بھی جبکہ یہ دونوں حضرات خاندان امیہ سے ہیں۔ ان سے دشمنی کے غرض سے وہ اپنے من گھڑت عقیدہ پر ڈٹے ہوئے ہیں اور قرآن کریم کی آیت کے منکر ہو جاتے ہیں۔ سورہ احزاب کی آیت نمبر ۵ میں یہ حکم دیا گیا ہے" ادعُوھمِ لا بائھم ھُوَ اقسط عند اللہ" (ان کو ان کے باپوں کے نام سے پکارا کرو یہی بات اللہ کے نزدیک سچ اور انصاف ہے)

یہ حکم ایسے اشخاص سے متعلق ہے جن لوگوں کو ان کے اصلی باپوں کے سوا کسی دیگر تربیت کنندہ کی ابنیت کی نسبت دے کر بلایا کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے سورہ احزاب آیت ۵ میں حکم دیا کہ ہر شخص کو اس کے اصل باپ کے نام سے پکارا جائے اور اسی سورہ کے آٹھویں رکوع میں ایسی لڑکیوں کو نبیؐ کی بیٹیاں بتانا جو آپؐ کے خون سے نہیں تھیں، کھلا تضاد ہے اور قرآن پاک کے کلام الٰہی ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں اختلاف نہیں پایا جاتا۔ لہٰذا اس کلام محکم پر یہ قیاس نہیں چل سکتا کہ شائد بیویوں کی پچھلی شوہروں کی بیٹیوں کو مجازاً کہا ہو۔ نیز حقیقت کے سامنے مجاز کی کیا قدر و قیمت ہے اور کلام الٰہی کی حکمت کے سامنے انسانی قیاس کی کیا وقعت؟

اس کے علاوہ عربی زبان میں ایسی وسعت ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ بیویوں کی پچھلی بیٹیوں کے لیے الگ لغت موجود ہے۔ قرآن میں ایسی لڑکیوں کے لیے لفظ ربائب استعمال ہوا ہے لفظ بنات نہیں۔ المختصر کلام الٰہی کے لفظ بناتک نے علماء نسب کی تحقیقات کی تصدیق فرمادی ہے۔ حضرت زینبؓ نبوت کے اظہار سے کچھ دیر پہلے پیدا ہوئیں ایک قول ہے کہ دس سال پہلے پیدا ہوئیں ان کا نکاح ان کے خالہ زاد بیٹے ابوالعاص بن ربیع سے ہوا۔ ان سے ایک بیٹا علی ہوا جوان کی زندگی میں فوت ہو گیا اور ایک بیٹی امامہ جو زندہ رہی اور حضرت علیؓ نے فاطمہؓ کی وفات کے بعد ان سے نکاح کیا۔

حضرت رقیہؓ: سیدہ زینبؓ سے چھوٹی تھیں وہ اس وقت پیدا ہوئیں جب رسول اللہ ﷺ کی عمر

مبارک ۳۳ سال تھی۔ امام زہری لکھتے ہیں کہ سیدنا عثمانؓ سے آپ ﷺ کی صاحبزادی رقیہؓ کے ساتھ مکہ مکرمہ میں نکاح کیا ان دونوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی ان سے ایک صاحبزادہ عبداللہؓ پیدا ہوا انہی کے نام پر حضرت عثمانؓ کی کنیت ابوعبداللہ ہوئی۔ ابن اسحٰق نے کہا کہ حضرت عبداللہ بن عثمانؓ کا وصال جمادی الاول سن چار ہجری میں ہوا اس وقت ان کی عمر چھ سال تھی۔

ام کلثوم: ان کا نام امیہ تھا۔ بی بی رقیہؓ کی وفات کے بعد ان کا نکاح حضرت عثمانؓ سے ہوا وہ بعثت سے چھ سال قبل پیدا ہوئیں۔ ان کا وصال شعبان سن نو ہجری میں ہوا۔

حضرت فاطمہؓ: حضرت فاطمہؓ کی ولادت نبوت کے پہلے سال ہوئی یعنی آپ ﷺ کی عمر اکتالیس سال تھی۔ ان کا نکاح حضرت علیؓ سے ہوا۔ بی بی فاطمہؓ کی عمر بوقت نکاح پندرہ سال اور علیؓ کی عمر اکیس سال تھی ان کا انتقال رسول اللہ ﷺ کے وصال کے چھ ماہ بعد رمضان المبارک سن گیارہ ہجری میں ہوا۔

ادھر آ ستم گر ہنر آزمائیں
تو تیر آزما ہم جگر آزمائیں

اعتراض نمبر ۱۷۰

سیدہ رقیہ اور ام کلثوم دونوں ربیبہ تھیں۔ ان دو ناموں سے مخالفین شکوک وشبہات پیدا کر کے دھوکا دیتے ہیں۔

جواب: آپ ﷺ کے ربائب میں ام المومنین ام سلمہ کی لڑکیاں (۱) درہ (۲) زینب (۳) ام کلثوم اور ام حبیبہؓ کی دختر حبیبہ ہیں۔ دیگر ازواج النبی میں سے کسی کے پہلے شوہر سے کوئی لڑکی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اب یہ بھی ذہن نشین رہے کہ ام المومنین ام سلمہؓ کا نکاح نبی مکرمؐ سے سن ۴ ہجری میں ہوا اور ام المومنین ام حبیبہؓ سے نکاح سن ۶ ہجری میں ہوا۔ اس لیے مندرجہ بالا لڑکیوں کو ربائب ہونے کا درجہ سن ۴ ہجری سے پیشتر حاصل نہیں تھا اور سیدہ زینبؓ بنت النبی کا ذکر غزوہ بدر یعنی سن ۲ ہجری میں فدیہ اسیران میں آتا ہے کہ انھوں نے اپنی والدہ ماجدہ حضرت خدیجہؓ کا ہار جو انھوں نے اپنی بیٹی زینب کو جہیز میں دیا تھا، اپنے شوہر کی رہائی کے لیے بہ طور فدیہ بھیجا تھا اور ام کلثوم اور رقیہ بنات النبی کا ذکر واقعات قبل از ہجرت میں ابولہب کے خاسرانہ اعمال میں آتا ہے۔

سیدہ ام کلثومؓ اور سیدہ رقیہؓ کا ابولہب کے دو لڑکوں عتبہ اور عتیبہ سے نکاح ہوا تھا۔ ان کی ابھی رخصتی نہیں ہوئی تھی کیونکہ وہ نابالغ تھیں۔ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی دشمنی میں ابولہب نے اپنے لڑکوں سے بنات النبی کو طلاق دینے کو کہا، انھوں نے ایسا ہی کیا۔

ہر سہ بنات یعنی حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ اور حضرت ام کلثومؓ کی وفات بالترتیب ۸ ہجری، ۲،

ہجری اور ۹ ہجری میں آپؐ کی حیات میں ہوئی سوائے سیدہ فاطمہؓ کے جن کی وفات آپؐ کے وصال کے بعد سن ۱۱ ہجری میں ہوئی جب کہ مذکورہ ربائب ارتحال نبوی کے بعد دیر تک اپنے اپنے گھروں میں آباد تھیں۔ علامہ ابوالحسنات سید احمد قادری فرماتے ہیں کہ اس آیت (یایھا النبی قل الازواجک وبنات) میں شیعوں کے اس زعم باطل کا رد ہے جو وہ کہتے ہیں کہ حضور کی صاحب زادیاں نہ تھیں سوائے حضرت فاطمہؓ کے اور حضرت رقیہؓ اور ام کلثومؓ دونوں ربیبہ تھیں یعنی حضور کی ازواج پہلے شوہروں کی بیٹیاں لائی تھیں۔ تو آیت کریمہ میں یایھا النبی قل لازواجک وبنتک کیوں فرمایا؟ وبنتک فرمانا تھا تو ثابت ہوا کہ حضور کی متعدد صاحب زادیاں تھیں کم از کم تین ضرور تھیں۔ اس لیے تو جمع مافوق الاثنین پر آتی ہے تو ثابت ہوا کہ حضرات شیعہ کا خیال غلط ہے بل کہ بنات النبی تین تھیں سیدہ زہراؓ، سیدہ رقیہؓ اور سیدہ ام کلثومؓ۔ علیٰ ہذا القیاس تمام مفسرین کرام نے بنات کے لفظ سے حضورؐ کی چار صاحب زادیاں تحریر کی ہیں۔ (اثبات بنات اربعہ۔ ۲۰) مذکورہ گروہ (شیعہ حضرات) آپؐ کی بیٹیوں کو ربائب کہہ کر دھوکہ دیتے ہیں۔ اتفاقاً ان ربائب میں سے دو نام وہی ہیں جو آپؐ کی حقیقی بیٹیوں کے اسماء مبارک ہیں یعنی زینب اور ام کلثوم۔ اگر ناموں کے اشتراک کی وجہ سے یہ بات مان لی جائے تو حضرت رقیہؓ جو آپؐ کی صاحب زادی ہیں ان کے بارے میں یہ گروہ کیا کہے گا۔؟

ان کا نکاح حضرت عثمان غنیؓ سے ہوا تھا۔ ان کا انتقال غزوہ بدر کے بعد ہوا تھا۔ ان کی وفات سن ۲ ہجری میں ہوتی ہے اور ام سلمہ کا آپؐ سے نکاح سن ۴ ہجری میں ہوتا ہے گویا ام سلمہؓ کی بیٹیاں درہ، زینب اور ام کلثوم سن ۴ ہجری سے قبل ربیبہ نہیں تھیں۔ سیدہ رقیہؓ کو شمار میں نہ لانے والے ثابت کریں کہ وہ کس ام المومنین کے بطن سے تھیں جس بنا پر انھیں ربیبہ کا درجہ دیا جاسکتا ہے؟ نیز ربائب نبی مکرمؐ کے بعد دیر تک اپنے اپنے گھروں میں آباد تھیں جب کہ آپؐ کی تمام بیٹیوں کا انتقال سوائے سیدہ فاطمہؓ کے آپؐ کی ظاہری زندگی میں ہوا تھا۔

کسی شخص کو اس کی اپنی بیٹیوں کا باپ ماننے سے انکار کر دیا جائے اور اسے اپنی بیٹیوں سے محروم کر دیا جائے اس سے بڑھ کر اس شخص کے لیے اور اذیت کیا ہو سکتی ہے؟ عام آدمی کے بارے میں ایسا نہیں کہا جاسکتا چہ جائیکہ آنحضرتؐ کے بارے میں یوں کہا جائے لہٰذا اس گروہ کو یہی کہا جاسکتا ہے کہ شرم تم کو مگر نہیں آتی۔

حیات القلوب میں ہے "پیش از آنحضرت زوجہ ابی سلمہ بن عبدالاسد بود ابو سلمہ دختر عبدالمطلب بود و ام سلمہ از و زنیب و عمر را ہم رسانند و عمر در جنگ جمل در خدمت امیر المومنین بوذ او را والی بحرین گردانند"

دوم شیخ طبرسی وغیرہ نے روایت کی ہے کہ پہلی بیوی جو حضور ﷺ نے تزویج کی وہ حضرت خدیجہؓ بنت خویلد تھی اس وقت آپ ﷺ کی عمر پچیس سال تھی۔ اس سے قبل خدیجہؓ کی ایک لڑکی تھی پھر انہوں

نے ابو ہالہ سے نکاح کیا تھا اس سے بھی ہند نامی ایک بیٹا تھا اس کے بعد حضور ﷺ نے خدیجہؓ سے نکاح کیا اور اس کے بیٹے ہند کی تربیت کی۔ ان عبارات سے ثابت ہوا کہ پہلے شوہروں سے ایک بیٹی جس کا نام ملا صاحب نے نہیں بتایا اور ایک بیٹا ہند نامی تھا جنہیں حضور ﷺ نے پرورش کی نیز زینب اور عمر دو لڑکیوں کا پتہ چلتا ہے جو پروردہ تھیں۔ ان میں سے کسی کا نام رقیہ اور ام کلثوم نہیں تھا جبکہ مخالف گروہ رقیہ، ام کلثوم اور زینب حضور ﷺ کی پروردہ کہتے ہیں۔۔۔۔۔ زینب نام کی ایک لڑکی ہے لیکن جو بی بی زینبؓ ہے وہ حقیقی لڑکی ہے جس کی تاریخ شاہد ہے۔

ایک سوال یہ بھی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی الوہیت سے متعلق مناظرہ کرنے یمن سے تین پادری ۔۔ عاقب، عبدالمسیح اور ابو حارثہ آئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اگر تم حضرت عیسیٰؑ کو حضرت آدمؑ کی طرح انسان نہیں مانتے تو آؤ ہم دونوں فریق اپنے بیٹوں، عورتوں اور اپنی جانوں کو پیش کریں پھر اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ جھوٹوں پر اللہ کی لعنت ہو۔ اس سے عیسائی گریزاں ہوئے لیکن آپ ﷺ حسنین کریمین، فاطمہ اور حضرت علی کو لے آئے اگر حضور ﷺ کی صاحبزادیاں ہوتیں تو انہیں مباہلہ میں لاتے۔ یہ مباہلہ بقول "جامع عباسی" ۲۴ ذوالحج سن دس ہجری میں ہوا ہم یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا اس وقت حضرت ابراہیمؑ (آپ ﷺ کے فرزند تھے) جو اس وقت زندہ تھے انہیں لائے تھے، کیا ان کو نہ لانے کے سبب آپ ﷺ کی اولاد سے انہیں خارج کر دیا جائے؟ ۲۔ اس واقعہ سے سوا برس پہلے ان تینوں صاحبزادیوں میں سے کوئی زندہ نہ تھیں، سب انتقال کر گئی تھیں اگر وہ نہ مانے تو توجیح اس وقت پیش کریں جس سے ان تینوں صاحبزادیوں کا سن دس ہجری میں موجود ہونا ثابت فرمائیں۔

قرآن کریم کا حکم ہے ادعوا ھم لا بآئھم من اقسط عنداللہ " (سورۃ الاحزاب۔۵) اولاد کو ان کے اباء سے منسوب کر کے پکارو اللہ تعالیٰ کے ہاں یہی احسن طریقہ ہے اگر وہ صاحبزادیاں حضور ﷺ کی نہ تھیں (نعوذ باللہ) تو حضور ﷺ انہیں بیٹیاں کہہ کر کیا قرآن پاک کے صریح خلاف فرمایا۔ (معاذ اللہ)

اسم مبارک	تاریخ ولادت	نام شوہر	سال نکاح	تاریخ وفات	اولاد
حضرت زینب	دس برس قبل نبوت	حضرت ابو العاصؓ	قبل نبوت	۸ ہجری	علی بن ابو العاص
حضرت رقیہؓ	۷ سال قبل نبوت	حضرت عثمانؓ	سن ۵ ہجری سے قبل	رمضان ۱۰ ہجری	عبداللہ بن عثمان
حضرت ام کلثومؓ	۶ سال قبل نبوت	حضرت عثمانؓ	سن ۳ ہجری	۹ ہجری بعمر	کوئی اولاد نہیں

حضرت فاطمہ	۵ سال قبل نبوت	حضرت علیؓ	سن ۱ ہجری	۱۰ ہجری، بعمر ۱۸ سال	حسن، حسین، زینب، ام کلثوم

اعتراض نمبر ۱۷۱

بعض کہتے ہیں کہ سیدہ رقیہؓ اور سیدہ ام کلثومؓ واقعی حضورؐ کی بیٹیاں تھیں لیکن آپؐ نے انھیں (معاذ اللہ) ایک منافق اور فاسق کے ساتھ بیاہ دیا تھا چناں چہ نعمت اللہ الجزائری نے اپنی کتاب میں لکھا کہ ''اختلاف کا عثمان کے نکاح میں ان دونوں صاحب زادیوں کے یکے بعد دیگرے آنے کا کوئی اثر نہیں پڑتا کیوں کہ عثمان ان لوگوں میں سے تھے جو حضورؐ کے زمانہ میں بہ ظاہر مسلمان اور بباطن منافق تھے۔ رسول اللہؐ کے ظاہری احکام کے مکلّف تھے جیسا کہ ہم ہیں اور آپؐ منافقین کے دلی طور پر مومن ہو جانے کے خیال سے ان سے میل جول رکھتے تھے اگر رسول اللہ حقیقی ایمان کا ارادہ فرماتے تو بہت تھوڑے لوگ خاص مومن نکلتے کیوں کہ صحابہ کرام کی غالب اکثریت اس زمانہ میں منافق تھی۔ (امہات المومنین از حکیم محمود احمد ظفر۔ ۸۲)

جواب: کوئی عام شخص بھی اپنی بیٹی کسی برے آدمی کی زوجیت میں دینا گوارا نہیں کرتا، منافق کے ساتھ بیاہنا تو دور کی بات ہے تو پیغمبر اسلامؐ اپنی بیٹیوں کو نفاق و فسق کی برائیوں میں کیسے دھکیل سکتے ہیں۔ انھیں حضرات کی کتابوں میں مرقوم ہے کہ ''نبی کریم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اپنی پاک دامن بیٹی کا کسی فاسق کے ساتھ نکاح کرے اس پر ہر روز ایک ہزار لعنت نازل ہوتی ہے اور اس کا کوئی عمل آسمان کی طرف نہیں چڑھتا اور نہ ہی اس کی کوئی دعا قبول ہوتی ہے اور نہ ہی اس سے کوئی فدیہ یا معاوضہ قبول کیا جاتا ہے''۔ (امہات المومنین ۸۲ بہ حوالہ ارشاد القلوب)

یہ بات سرتاپا باطل ہے۔ اس کا رد قرآن کریم سے ثابت ہے۔ ارشاد ربانی ہے '' الخبیثت للخبیثن و الخبیثون للخبیثت و الطیبت للطیبین۔۔۔''

(ترجمہ) ''ناپاک عورتیں ناپاک مردوں کے لیے اور ناپاک مرد ناپاک عورتوں کے لیے ہیں اور پاک دامن عورتیں پاک مردوں کے لیے اور پاک مرد پاک عورتوں کے لیے ہیں، یہ مبرا ہیں ان تہمتوں سے جو (ناپاک) لگاتے ہیں۔ ان کے لیے ہی (اللہ کی) بخشش اور عزت والی روزی ہے''۔

اس آیت کریمہ میں الزام لگانے والوں کے لیے ایک اصول بتا دیا ہے کہ ناپاک عورتیں ناپاک مردوں کے لیے اور ناپاک مرد ناپاک عورتوں کے لیے ہیں۔ آپ کی صاحب زادیاں جو طاہر و طیب ہیں اور آپؐ کا داماد عثمان ذوالنورینؓ ہے۔ وہ داماد جو داماد رسول ہے ان کی پاک دامنی پر شک کرنا اپنی بدبختی اور اپنے آپ کو جہنم کا ایندھن بنانا ہے۔ نیز ان کے بارے میں ایسے خیالات رکھنا، نبی مکرم کو اذیت پہنچانا ہے اور جو اللہ

اور اللہ کے رسول کو ایذا دیتا ہے۔اس کا انتقام اور سزا خود مالک حقیقی نے مقرر رکھی ہے۔ارشاد ربانی ہے۔

" ان الذین یوذون اللہ ورسولہ لعنھم اللہ فی الدنیا و الآخرۃ واعدلھم عذاباً مھیناً"

(سورۃ الاحزاب۔۵۷) ترجمہ: (بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو اذیت دیتے ہیں۔ان پر دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اللہ کی لعنت ہے اور اللہ نے ان کے لیے اہانت آمیز عذاب تیار کر رکھا ہے"۔

عثمان غنیؓ مشرف بہ اسلام ہوتے ہیں۔حضرت ابو بکرؓ کی تحریک پر وہ ایمان لاتے ہیں۔وہ ابو بکرؓ جن کا انبیاء کرامؑ کے بعد کا درجہ ہے۔حضرت عثمانؓ سے مدت العمر ان کے خوشگوار تعلقات رہے۔اگر عثمانؓ میں نفاق کی کوئی علامت پائی جاتی تو ابو بکرؓ کب کے انھیں چھوڑ چکے ہوتے مگر ایسا نہیں ہوا۔دوسری بات یہ کہ ایک بار کسی طور آدمی دھوکا کھا سکتا ہے بار بار نہیں۔لیکن نبی مکرم ﷺ اپنی بیٹی کی وفات کے بعد دوسری بیٹی حضرت عثمانؓ کی زوجیت میں دے دیتے ہیں۔کیوں؟

یہ حضرت عثمانؓ کے ایمان کامل کی قوی دلیل ہے۔اگر ایمان کامل نہ رکھتے ہوتے تو آپؐ ان سے اپنی دوسری بیٹی بیاہ نہ دیتے؟

ارشاد نبوی نے مہر ثبت کر دی۔حضرت ابو سعید الخدری روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا"میں نے اپنی ازواج میں سے کسی عورت سے نکاح نہیں کیا اور نہ اپنی کوئی بیٹی کسی کے نکاح میں دی ہے مگر اس اجازت سے جو جبریل امین اللہ تعالیٰ کی طرف سے لے کر میرے پاس آئے (یعنی اللہ تعالیٰ کی اجازت سے میں نے ایسا کیا)"(امہات المومنین۔۲۸)

طبرانی نے معجم میں ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ"رسول اللہ نے فرمایا"اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی فرمائی کہ اپنی کریمہ (رقیہ) کا نکاح عثمان بن عفان سے کر دوں"۔

سعدیٰ بن کرز صحابیہ نے حضرت عثمانؓ اور رقیہؓ کی شان میں اشعار کہے ان کا ترجمہ یہ ہے"اللہ تعالیٰ نے عثمان باصفا کو اپنے قول سے کہ (اللہ تعالیٰ حق کی طرف ہدایت دیتا ہے) ہدایت اور رہنمائی بخشی اور حضورؐ نے اپنی بیٹی کا نکاح اس سے کر دیا' آپؐ ایسے چودھویں کے چاند کی طرح تھے جو افق میں سورج کو شرما رہے ہوں۔(اثبات بنات اربعہ۔۸۷)

حضرت ام کلثومؓ ۹ ہجری میں وفات پا گئیں اور ان سے کوئی بچہ پیدا نہ ہوا۔پھر رسول اللہ نے فرمایا"اگر میرے پاس تیسری کنواری لڑکی بھی ہوتی تو (یکے بعد دیگرے) اس کا نکاح بھی عثمانؓ ہی سے کر دیتا"۔(حوالہ بالا۔۴۱)

ایک اور روایت میں ہے کہ"اگر میرے پاس دس لڑکیاں بھی ہوتیں تو (یکے بعد دیگرے) میں عثمان کے ہی نکاح میں دے دیتا"۔(حوالا بالا۔۹۴)

شانِ عثمانؓ کی گستاخی کرنے پر حضرت علیؓ کا انتباہ: روایات میں آتا ہے کہ ایک شخص نے حضرت علیؓ کے سامنے کہا کہ حضرت عثمان (نعوذ باللہ) جہنمی ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ تجھے کیسے معلوم ہوا؟ اس نے کہا انھوں نے نئی بات ایجاد کی۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تیری کوئی بیٹی ہو تو کیا اس کی شادی بغیر مشورہ کیے کرے گا اس نے کہا ہرگز نہیں۔ تب (علیؓ) نے فرمایا تو کیا میری رائے حضور اکرمﷺ کی رائے جو انھوں نے اپنی دو بیٹیوں کے بارے میں کی اس سے بہتر ہو سکتی ہے اور تو نے مجھے حضورﷺ کی یہ بات بتا کر کہ جب حضور کسی کام کا ارادہ فرماتے تو عزوجل کی طرف رجوع کرتے تھے یا نہیں؟ اس شخص نے کہا کہ حضورﷺ رجوع فرمایا کرتے تھے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا: کیا اللہ عزوجل نے آپ کو خیر رائے دی یا نہیں؟ اس نے کہا: بے شک اللہ عزوجل نے نبی کریمﷺ کو خیر کی رائے دی۔ حضرت علیؓ نے فرمایا تو پھر تو مجھے بتا کہ کیا اللہ عزوجل کی رائے حضور ﷺ کی دو بیٹیوں کی شادی کے معاملے میں درست نہیں تھی اور اگر تو نے کبھی دوبارہ حضرت سیدنا عثمانؓ کی شان میں گستاخی کی توہین کی یا تو میں تیری گردن اڑا دوں گا۔ (سیرت خدیجہ الکبریٰ از محمد حسیب القادری۔۱۰۲۔۱۰۱)

ایسے شقی القلب اور گستاخ کی بات کو کیونکر تسلیم کر سکتے ہیں۔ الزام دھرا جس کی بنیادی غلطی اس طرح ثابت ہوتی ہے کہ اس بد بخت نے یہ مان لیا کہ سیدہ رقیہؓ اور سیدہ ام کلثومؓ واقعی حضورﷺ کی بیٹیاں ہیں جب کہ دوسرے اس کے ہم نوالہ و ہم پیالہ انھیں ربیب کہتے ہیں اور صرف سیدہ فاطمہؓ ہی کو آپﷺ کی بیٹی کہتے ہیں۔ یہ ایک دوسرے کا رد کر رہے ہیں۔ بایں عقل و دانش بباید گریست۔

اعتراض نمبر ۱۷۲

حضرت عثمانؓ اس لیے مسلمان ہوئے کہ رسول اللہ ﷺ کی صاحب زادی پر عاشق ہوئے اور نکاح کا اقرار ہوا۔ (نعوذ باللہ) (ن۔۱۱۔۴۸۹)

جواب: عرب معاشرے میں معمولی سے معمولی بات پر جھگڑا ہونا معمول کی بات تھی۔ ان کی تلواریں بے نیام ہو جاتیں اور یہ لڑائی صدیوں پر محیط ہوتی۔ سالہا سال قتل و غارت کا بازار گرم رہتا۔ یہ تو معمولی باتوں کا حال ہے اور اگر کوئی گھناؤنا واقعہ پیش آتا تو لڑائی جھگڑے کا یہ سیل کبھی رکنے کا نام نہ لیتا۔ مذکورہ گھناؤنا فعل قابل برداشت نہیں ہو سکتا تھا اور وہ بھی بنو ہاشم کے سردار قبیلہ سے متعلق۔ وہ کبھی خاموشی سے بیٹھنے والا نہیں تھا۔ حضرت حمزہؓ نے ابو جہل کے سر پر کمان ماری اور سر پھوڑ دیا۔ باقی لوگ حمایت میں اٹھنا چاہتے تھے مگر ابو جہل نے روک دیا۔ اس کا قصور یہ تھا کہ وہ نبی مکرم ﷺ کے ساتھ گستاخی سے پیش آیا تھا۔ اس گھناؤنے فعل پر اور بے حیائی کی حرکت پر بنو ہاشم کا قبیلہ اور اس کے حلیف قبائل خاموش تماشائی بنے رہے، بعید از قیاس ہے اور عربوں کے مزاج کے خلاف ہے۔

دوم: وہ لوگ جو اسلام میں داخل ہوئے وہ حضرت عثمانؓ کے ساتھ عمر بھر رہے۔ ان کے ساتھ اچھے تعلقات رکھتے تھے اور خاص طور پر حضرت ابو بکرؓ جن کی دعوت اور ترغیب سے حضرت عثمانؓ نے اسلام قبول کیا تھا وہ مدت العمر عثمانؓ کے ساتھ رہے۔ انھیں اگر اس فعل بد کی خبر تھی تو انھوں نے عثمانؓ کا بائیکاٹ کیوں نہ کیا۔ وہ ابو بکرؓ اپنا تمام اثاثہ نبی مکرم ﷺ کے قدموں میں لا کر ڈھیر کر دیتا ہے اور اہل وعیال کو چھوڑ کر مدینہ ہجرت کر جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے ساتھ کوئی بھی مخلص نہ تھا۔ (نعوذ باللہ)

سوم: اتنا سنگین فعل سرزد ہوتا ہے اسے یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور عثمانؓ کے نکاح میں پہلی بیٹی کی وفات کے بعد دوسری بیٹی دے دی جاتی ہے۔ اللہ کے رسولؐ کو وحی ہوتی ہے کہ رقیہؓ کا نکاح عثمانؓ سے کر دے۔ اس الزام میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ اور حضرت عثمانؓ کی توہین موجود ہے۔ ایک تیر سے کئی نشانے کیے۔ یہ سچ ہے کہ بد فطرت سے خیر کی توقع نہیں رکھی جا سکتی ہے۔ اہل علم اس الزام کی حقیقت کو جان سکتے ہیں۔

حضرت رقیہؓ کی بیماری کے سبب حضرت عثمانؓ غزوہ بدر میں شریک نہیں ہوئے مگر نبی کریم نے انھیں غنیمت عطا کی۔ کیا ایسی نوازشات ایسے فعل سرزد ہونے پر دی جاتی ہیں۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر عثمان کے قتل کی افواہ پھیلی۔ آپ نے تمام موجود صحابہ کرامؓ سے بیعت لی کہ عثمانؓ کا بدلہ لیں گے۔ تاریخ میں یہ واقعہ بیت رضوان کے نام سے مشہور ہیں۔ شہادت کے موقع پر عثمانؓ نے فرمایا ''میں مسلمانوں کے ساتھ جنگ نہیں کر سکتا۔ مجھے یہ منظور نہیں کہ میں رسول اللہ کا خلیفہ ہو کر امت کا خون بہاؤں۔ میں خلیفہ نہ بنوں گا جو امت محمدؐ میں خون ریزی کی ابتداء کرے۔ میں مکہ معظمہ میں بھی نہیں جا سکتا کیوں کہ میں نے آقا کریمؐ سے یہ سنا ہے کہ قریش میں کوئی آدمی حرم میں فساد کرے گا تو اس پر آدھی دنیا کا عذاب ہوگا۔ میں رسول اللہؐ کی اس وعید کا کبھی مورد نہیں بن سکتا۔ باقی رہا شام کا ارادہ تو میرے لیے یہ کس طرح ممکن ہے کہ میں اپنے دار ہجرت اور رسول اکرمؐ کے پڑوس کی نعمت کو پس پشت ڈال دوں اور محمدؐ کی ہمسائیگی ترک کر دوں''۔ ایسے اللہ کے برگزیدہ بندے سے ایسی توقع کی جا سکتی ہے کہ ایسے فعل کا مرتکب ہو اور خون ریزی اور قتل وغارت کا میدان سج جائے۔

جب آپؐ کو اپنی شہادت کا یقین ہو چلا تو آپ (عثمانؓ) نے ابو ثور الفہیمی سے فرمایا: ''مجھے اپنے پروردگار سے بہت بڑی امید ہے اور میری دس امانتیں اس کی بارگاہ میں محفوظ ہیں''۔ ان میں سے دو امانتیں یہ ہیں۔ (۱) میں نے کبھی بدی کی خواہش نہیں کی۔ (۲) میں نے زمانہ جاہلیت میں کبھی زنا نہیں کیا۔ (انسانیت موت کے دروازے پر۔ ص۔ ۱۱) وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ میں نے زمانہ جاہلیت اور اسلام میں کبھی چوری نہیں کی اور نہ ہی کبھی زنا کیا اور جب سے میں نے اسلام قبول کیا کوئی جمعہ ایسا نہیں گزرا کہ میں نے اس دن غلام آزاد نہ کیا ہو۔

اس قسم کا نہایت برا الزام دھرنے کا جھوٹ ایسے اللہ کے نیک اور برگزیدہ بندے کی شرافت و پاکیزگی اور عفت و پاک دامنی سے نیست و نابود ہو جاتا ہے جس کے لیے کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں رہتی۔

کیسے ہمیں بھلا گھٹائیں گی سکیں مٹا
ہیں گزرے سے سروں ہمارے ابر ہزاروں

حضرت فاطمہؓ کی عمر مبارک میں اختلاف

آپ کی عمر مبارک میں مورخین کا شدید اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ صحیح تر قول یہ ہے کہ آپ کی ولادت نبوت کے پہلے سال ہوئی جب حضورؐ کی عمر مبارک ۴۱ سال تھی۔ (اثبات بنات اربعہ۔۱۱۷)

محمد سلیمان سلمان منصور پوری (رحمۃ اللعالمین۔۲۔۱۰۸) بہ حوالہ استیعاب لکھتے ہیں کہ حضرت فاطمہؓ کی ولادت نبی مکرم ﷺ کی ولادت کے ۴۱ ویں سال میں ہوئی۔

مزید لکھتے ہیں کہ بہ حوالا اصول کافی میں شیخ محمد کلینی نے ولادت سیدہؓ سن ۵ نبوت بتائی ہے اور عمر بوقت وفات ۱۸ سال ۷۵ یوم جس میں ۷۵ یوم بعد از وفات نبوی تھے۔ ولادت امام حسنؓ سن ۲ ہجری بتائی ہے۔ اندریں صورت عمر سیدہ فاطمہؓ بہ وقت ولادت امام حسنؓ دس سال ہوتی ہے اور اگر ولادت امام حسنؓ سن ۳ ہجری مان لی جائے جیسا کہ اسی کتاب کی دوسری روایت میں ہے تب سیدہؓ کی عمر ۱۱ سال ہوگی۔ اسی لیے (سلمان) نے الاستیعاب کی روایت کو ترجیح دی ہے (الاستیعاب کی روایت کے مطابق حضرت امام حسنؓ کی ولادت کے وقت سیدہ کی عمر بالترتیب ۱۳ یا ۱۴ سال ہوگی۔)

شیخ محمد کلینی کے مطابق امام حسنؓ کی ولادت کے وقت سیدہؓ کی عمر بالترتیب دس یا گیارہ سال ہے۔ اسی کو بنیاد بنا کر بعض نے حضرت عائشہؓ کی عمر کو کم بیان کیا ہے۔ چھ سال میں منگنی اور نو سال میں رخصتی کا ذکر کیا ہے۔ یہ سیدہ فاطمہ کی کم عمری سے جوڑا گیا جب کہ اور روایات سے اس الزام کی تردید ہوتی ہے۔ اگر انھیں دیکھ لیا جاتا تو نہ صرف بی بی عائشہؓ کی عمر میں اختلاف پیدا ہوتا بل کہ سیدہ فاطمہؓ کی عمر کا صحیح تر قول بھی معلوم ہو پاتا۔ شیخ عبدالحق (مدارج النبوت۔۱۔۲۴۱) لکھتے ہیں کہ سیدہ فاطمہؓ کی پیدائش، ولادت رسول اللہ ﷺ کے ۴۱ ویں سال ہوئی۔ یہ ابوبکر رازی کا قول ہے اور یہ مخالف ہے اس قول کے جسے ابن اسحٰق نے آپ کی اولاد کے بارے میں بیان کیا ہے کہ حضور ﷺ کی تمام اولاد اظہار نبوت سے قبل ہوئی بہ جز حضرت ابراھیم کے۔

امام ابن جوزی نے کہا کہ فاطمہؓ کی ولادت اظہار نبوت سے ۵ سال قبل ہوئی اور یہی روایت مشہور تر ہے۔ گویا شیخ نے ابن اسحاق اور امام ابن جوزی کی روایت کو مشہور تر کہہ کے توثیق کر دی ہے۔

امام مدائنی نے ولادت سیدہ فاطمہؓ ۵ سال قبل از اظہار نبوت اور عمر بہ وقت وفات ۲۹ سال تحریر

کی ہے۔میں نے شیخ عبدالحق کی رائے کو ترجیح دی ہے جس کی تائید امام مدائنی نے بھی کی ہے۔

سیدہ فاطمہؓ کی ولادت آپؐ کی عمر کے ۳۵ ویں سال ہوئی۔آپؐ نے ۵۳ سال کی عمر میں ہجرت فرمائی اس حساب سے سیدہ فاطمہؓ کی عمر بہ وقت ہجرت ۱۸ سال بنتی ہے۔غزوہ بدر کی واپسی کے بعد ان کا نکاح حضرت علیؓ سے سن ۲ ہجری میں ہوتا ہے اس وقت آپ کی عمر ۲۰ سال بنتی ہے۔

بعثت سے ۵ سال قبل سیدہ فاطمہؓ کی ولادت تسلیم کرنے میں روایات موجود ہیں۔دوسرا یہ کہ تمام الزامات جو اس سلسلے میں لگائے جاتے ہیں سب دم توڑ دیتے ہیں۔تیسرا یہ کہ اس سے کسی اور پر جو الزام دھرا جاتا ہے وہ بھی خاک بوس ہو جاتا ہے۔ان وجوہات کی بنا پر اس روایت کو ترجیح دی جاتی ہے اور ان امور کا جائزہ لیا جاتا ہے جس سے یہ حقیقت نکھر کے سامنے آجاتی ہے۔

اول: سیدہ فاطمہؓ کی ولادت جو بعثت کے ایک سال بعد کہتے ہیں اس پر اشکال یہ ہے کہ ان (فاطمہ) کی کم سنی (یعنی ۱۲ سال کی عمر) میں شادی قرار پاتی ہے۔

دوسری بات یہ کہ سیدہ فاطمہؓ کی ولادت بعثت سے ۵ سال قبل ماننے سے سیدہ فاطمہ کی کم سنی کا اعتراض جاتا رہتا ہے۔اس وقت خدیجہؓ کی عمر سیدہ فاطمہ کی ولادت کے وقت ۵۰ سال بنتی ہے۔جس سے تولیدی صلاحیت کا اعتراض ختم ہو جاتا ہے۔وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ شادی کے وقت خدیجہؓ کی عمر چالیس سال نہیں تھی بل کہ ۲۸ سال تھی۔ڈاکٹر محمد ثنا اللہ ندوی لکھتے ہیں کہ یہ بات ہر کسی کی سمجھ میں آسکتی ہے کہ پچاس سال کی عمر تک تولیدی صلاحیت پائی جاتی ہے اس لحاظ سے حضرت خدیجہؓ کی عمر اپنی بیٹی کی ولادت کے وقت ٹھیک پچاس سال تھی۔اور بچے پیدا کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔عورت کو پچپن سال تک حیض آتا رہتا ہے اس عمر تک تولید کی صلاحیت موجود ہوتی ہے نہ صرف پچاس سال تک۔اس عمر والی عورت کو آئسہ اور اس عمر کو سن ایاس کہتے ہیں اگر اس عمر کے بعد حیض آئے جو پہلے جیسا نہ ہو تو وہ استحاضہ ہے البتہ پہلے کی طرح حیض خالص خون آئے جیسا زمانہ حیض میں آتا تھا، تو حیض ہے۔

سوم: بعض حضرت سیدہ فاطمہؓ کی کم عمری کی شادی پر اٹھنے والے سوالات سے دم بہ خود رہ گئے۔اس کا جواب نہ بن پایا تو انھوں نے سوچا کہ ایک ایسی اور محبوب شخصیت کے سر بھی کم سنی کی شادی کا الزام لگائیں جس سے حساب برابر ہو جائے گا۔اس سلسلے میں انھوں نے حضرت عائشہؓ کی منگنی ۶ سال اور رخصتی ۹ سال کی عمر تحریر کی۔یک نہ شد دو شد والا معاملہ ہو گیا۔یہ نہ سوچا کہ یہ الزام حضرت زہراؓ کی بریت ظاہر کرے گا بل کہ یہ الزام دو محبوب ہستیوں کو لپیٹ میں لے لے گا۔یہ مخالفین نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے۔

اعتراض نمبر ۱۷۳

آنحضرت ﷺ کی خواہش تھی کہ ان کے داماد (علیؓ) ایک ہی بیوی کے ساتھ ازدواجی زندگی بسر

کریں جبکہ قرآن کریم چند شرائط کی بنیاد پر چار عورتوں سے شادی کرنے کی اجازت دیتا ہے۔

جواب: مخالفین کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اوروں کے لیے چار تک کی رخصت ہے جس کے بارے قرآن کریم میں وضاحت موجود ہے اس کے باوجود اپنی بیٹی کے داماد سے خواہش کرنا کہ ایک ہی بیوی کے ساتھ زندگی گزار دیں، یہ کھلا تضاد ہے۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں بلکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ﷺ عام حالات میں اس طرح کی عائلی زندگی پسند فرماتے تھے آپ نے خود اس کا نمونہ فراہم کیا ہے۔ پچاس سال کی عمر تک آپ ﷺ نے صرف حضرت خدیجہؓ کے ساتھ ازدواجی زندگی بسر کی اس کے بعد حضرت سودہؓ سے نکاح فرمایا اور اس واحد بیوی کے ساتھ پانچ سال گزارے گویا پچپن سال تک آپ ﷺ کے حرم میں ایک ہی بیوی رہی۔ ازاں بعد آپ ﷺ نے شادیاں کیں جن کے مقاصد بہت سارے تھے مثلاً سیاسی معاشرتی تعلیمی، تشریعی، اجتماعی، اور تالیفِ قلبی وغیرہ۔ یہ مقاصد درپیش نہ ہوتے تو آپ ﷺ ایک بیوی کے ساتھ ہی ساری زندگی گزار دیتے۔ یہ نہ صرف اپنی اولاد کی خاطر خواہش تھی کہ ان کے شوہر دوسری شادی نہ کریں بلکہ آپ ﷺ نے از خود عائلی زندگی میں یک زوجگی کی ایک خوبصورت مثال پیش کی جس کو دوسروں میں بھی دیکھنا چاہتے تھے اس سے خواہ مخواہ کی شادیاں یا جنسی تلذذ پر مبنی شادیوں کا قلع قمع ہوتا ہے نیز انصاف نہ برتا جائے تو شادی رچا کر گھر جہنم کو نمونہ بن جاتا ہے۔ شادی کا مقصد دولت کا حصول اور مالی منفعت نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اس سے شادی زیادہ دیر تک نہیں چلتی کیونکہ ایسی شادی لالچ اور ہوس پر مبنی ہوتی ہے جب مطلب نکل جائے تو آنکھیں پھیر لی جاتی ہیں۔ زیرک و دانا خواتین شروع دن سے ہی ایسی شادی سے انکار کر دیتی ہیں اس کی مثال حضرت خدیجہؓ کے قول مبارک سے ملتی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ روسائے عرب کے نکاح کے پیشکشیں ٹھکرا دیں کہ ان کی نظر میرے مال پر تھی۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت علیؓ کو دوسری شادی کرنے سے منع فرمایا اس میں عجیب اسرار و رموز ہیں جو احادیث نبوی سے ظاہر ہیں۔ احادیث:

حضرت مسور بن مخرمہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ سے سنا کہ آپ ﷺ نے منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا ''ہشام بن مغیرہ کے بیٹوں نے مجھ سے اجازت طلب کی کہ اپنی بیٹی (یعنی ابوجہل بن ہشام کی بیٹی) کا نکاح علی بن ابی طالب سے کرنے کی'' تو میں اجازت نہ دوں گا، اجازت نہ دوں گا، اجازت نہ دوں گا''۔ البتہ اس صورت میں اجازت دیتا ہوں کہ علیؓ میری بیٹی کو طلاق دیں اور ان کی بیٹی سے نکاح کر لیں یہ اس لیے کہ میری بیٹی میرے جسم کا ٹکڑا ہے جو اسے شک میں ڈالتا ہے وہ مجھے شک میں ڈالتا ہے جس بات سے اسے اذیت پہنچتی ہے وہ میرے لیے بھی باعث تکلیف و اذیت ہے'' (مسلم شریف)

۲۔ یہ روایت بھی حضرت مسورؓ سے ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''میں کسی حلال کو حرام اور

حرام کو حلال نہیں کرتا لیکن خدا کی قسم! خدا کے رسول کی بیٹی اور دشمن خدا کی بیٹی ایک مکان میں جمع نہ ہوں گی، (مسلم شریف)

۳۔امام زہری سے یہ روایت ماثور ہے کہ فرمایا: میں حرام کو حلال اور حلال کو حرام نہیں کرتا لیکن بخدا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیٹی اللہ کے دشمن کی بیٹی کے ساتھ اکٹھی نہیں رہ سکتی (حاشیہ تفہیم البخاری۔ج۔۸۔ص۔۲۴۶)

۴۔حضرت مسور بن مخرمہؓ نے کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ کہتے سنا حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منبر شریف پر جلوہ افروز تھے بنی ہشام بن مغیرہ نے اجازت طلب کی ہے کہ وہ اپنی بیٹی کا علی ابن ابی طالب سے نکاح کر دیں میں اجازت نہیں دیتا پھر اجازت نہیں دیتا پھر اجازت نہیں دیتا مگر یہ کہ ابن ابی طالب ارادہ کرے کہ میری بیٹی کو طلاق دے دے اور ان کی بیٹی سے نکاح کر لے حضرت فاطمہؓ میرے گوشت کا ٹکڑا ہے جو چیز فاطمہؓ کو ناپسند ہے وہ مجھے بھی ناپسند ہے اور جو چیز اس کو اذیت پہنچاتی ہے وہ مجھے بھی اذیت پہنچاتی ہے۔(حوالہ بالا)

۵۔امام حاکم نے صحیح اسناد کے ساتھ سوید بن غفلہ سے روایت کی ہے کہ حضرت علیؑ نے حارث بن ہشام سے ابوجہل کی بیٹی جویریہ سے شادی کی خواہش کی اور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مشورہ لیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس کا حسب نسب پوچھتے ہو؟ عرض کیا نہیں، لیکن آپ مجھے اس کے ساتھ نکاح کی اجازت دیں فرمایا: یہ نہیں ہوسکتا، فاطمہؓ میرے گوشت کا ٹکڑا ہے اس طرح فاطمہؓ کو رنج پہنچے گا حضرت علیؑ نے کہا وہ کام ہرگز نہ کروں گا جو سیدہ کو ناپسند ہو۔(حوالا بالا)

۶۔امام زہری کی ایک اور روایت میں ہے "مجھے ڈر ہے کہ ان کے دین میں فتنہ واقع ہوگا (اَنَا اَتَخَوَّفُ اَنْ تُفْتَنَ فِی دِیْنِھَا) یعنی وہ غیرت پر صبر نہ کر سکیں گی اور غصہ کی حالت میں اپنے شوہر کے حق میں ان سے وہ صادر ہو جائے جو دین میں ان کے حال کے لائق نہ ہو کیونکہ دراصل عورت کی غیرت کا سبب یہ ہے کہ وہ اپنے شوہر کو خیال کرتی ہے کہ وہ اس کی سوکن سے زیادہ محبت کرتا ہے مذکور حدیث نمبر ۴ میں دو جملے قابل غور ہیں ایک یہ کہ آپ نے بار بار فرمایا "میں اجازت نہیں دیتا" یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اس فعل سے ناپسندیدگی کا اظہار ہے دوسرا یہ کہ "ابن ابی طالب ارادہ کرے" اس جملہ میں حضرت علیؑ کا نام تک نہیں لیا ہے یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سخت ناراضی کا اظہار ہے۔ بظاہر تو لگتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے محض اپنی بیٹی کی خوشنودی کی خاطر حضرت علیؑ کو دوسری شادی کرنے کی اجازت مرحمت نہ فرمائی جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ابوجہل اسلام کا بدترین دشمن تھا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ یہ میری امت کا فرعون ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس نے قدم بہ قدم مخالفت کی مسلمانوں پر مظالم کے پہاڑ ڈھائے یہاں تک کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دین اسلام کو ہمیشہ کے لیے مٹانے کی خاطر بدر کے میدان میں چڑھ دوڑا۔اس کی بیٹی نے فتح مکہ کے روز سیدنا بلالؓ کی اذان سن کر کہا کہ اللہ تعالیٰ نے میرے باپ پر کرم کیا ہے اور اسے گدھے کی ہینگ سننے تک زندہ نہیں رکھا۔(نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا گھرانہ۔۲۸۶)

اول اسلام نے چند شرائط کے ساتھ چار بیویوں کو رکھنے کی اجازت دی ہے۔ حضرت علیؓ کی خواہش کا باعث بھی یہی شرعی اجازت تھی اور نبی ﷺ نے بھی اس شرعی حق کی قطعاً نفی نہیں فرمائی جیسا کہ مذکور حدیث نمبر دو میں ہے کہ میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال نہیں کرتا اور نہ ہی یہ امر آپ ﷺ کی ناراضی کا باعث تھا اصل وجہ احادیث سے واضح ہے کہ خدا کے رسول ﷺ کی بیٹی اور خدا کے دشمن کی بیٹی ایک ساتھ علیؓ کے گھر میں نہیں رہ سکتیں اس لیے کہ جویریہ بنت ابو جہل کے دل میں اسلام راسخ نہیں ہوا تھا اس نے پوری جڑ نہیں پکڑی تھی اور ''اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ'' کا بھرپور رنگ نہیں چڑھا تھا جبکہ دوسری طرف حضرت فاطمہؓ سرتا پا اسلام کے زیور سے آراستہ و پیراستہ تھیں اس لحاظ سے حضرت فاطمہؓ کے ایک ساتھ رہنے کے لیے راسخ الایمان ہونا ضروری تھا تاکہ ہر قسم کے سابقہ وساوس اور خدشات و تنازعات سے کوئی خطرہ نہ رہے۔ آپ ﷺ نے ان خطرات کی نشاندہی فرمائی جو آپ ﷺ کے اس فرمان ''انا اتخوف ان یفتن فی دینھا'' سے ظاہر ہے یعنی آپ ﷺ نے فرمایا مجھے اس بات کا ڈر ہے کہیں دین کے معاملہ میں حضرت فاطمہؓ کسی پریشانی اور فتنہ میں نہ پڑ جائے یعنی فطری غیرت اور دوسرے دینی امور میں کسی آزمائش و ابتلا میں نہ پڑ جائے ان وجوہات کی بناء پر آپ ﷺ نے حضرت علیؓ کو دوسری شادی کرنے سے منع فرمایا۔

دوسری وجہ: بعض علماء اس امر کو آپ ﷺ کی خصوصیات میں شامل کرتے ہیں امام جلال الدین سیوطی نے امام ابن حجر عسقلانی کے حوالے سے لکھا ہے، ترجمہ (یعنی یہ امر بعید نہیں کہ حضور کی بیٹیوں پر دوسری شادی کرنے کی ممانعت آپ ﷺ کے خصائص سے ہو) (نبی اکرم ﷺ کا گھرانہ۔۲۸۷)

تیسری وجہ: امام احمد بن محمد بن ابی بکر الخطیب القسطلانی کی کتاب مواہب الدنیا کے ترجمہ سیرت محمدیہ کے حاشیہ ص ۲۶۳ پر ہے اسے شیخین رضی اللہ عنہما اور ابو دوؤدؒ نے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت علیؓ پر حضرت فاطمہؓ کی زندگی میں دوسری عورت سے شادی اس ارشاد ''ما اتکم الرسول فخز وہ وما نھکم عنہ فانتھو'' کی وجہ سے حرام کر دی تھی۔

چوتھی وجہ: حضرت ابوسعید الخدریؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں نے اپنی زوج میں سے کسی عورت سے نکاح نہیں کیا اور نہ اپنی کوئی بیٹی کسی کے نکاح میں دی ہے مگر اس اجازت سے جو جبرائیل امین اللہ تعالیٰ کی طرف سے لے کر میرے پاس آئے (یعنی اللہ تعالیٰ کی اجازت سے میں نے ایسا کیا)'' (امہات المومنین۔۲۸)

اعتراض نمبر ۱۷۴

اموی دشمنی میں آنحضرت ﷺ کی بیٹی کی نسبت غلط کر دیتے اور حقائق کو چھپاتے ہیں۔

جواب: علامہ یعقوبی حضورﷺ کی چار صاحبزادیوں کا قائل ہے مگر ان میں سے وہ صرف دو کی شادی کا ذکر کرتا ہے۔ حضرت فاطمہؓ کی شادی حضرت علیؓ سے اور اس رشتہ کو حکم ناطق الٰہی اور فیصلہ خدا وندی قرار دیتا ہے۔ حضرت زینبؓ کی شادی کے سلسلے میں وہ افتراء پردازی کا مرتکب ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ ہجرت نبوی کے وقت طائف میں اپنے شوہر ابوالعاص بن بشیر بن عبد دھمان ثقفی کے پاس تھیں یہ محض اموی دشمنی کا نتیجہ ہے کہ صریحاً جھوٹ بولا کیونکہ زینبؓ خاندان عبد شمس کے ایک فرد ابوالعاص بن ربیع کے نکاح میں تھیں کسی ثقفی کے عقد میں نہیں تھیں۔ اسی نفرت اور تعصب کے نتیجہ میں وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ بدر کے بعد حضرت زینبؓ کو مکہ سے مدینہ لانے کی سعادت حضرت عباس بن عبدالمطلب ہاشمی کے حصہ میں آئی۔ سچ تو یہ ہے کہ جھوٹ کے پیر نہیں ہوتے اسی لیے وہ حضرت زینبؓ کے معاملے میں سن چھ ہجری میں حضرت زید بن حارثہ کے سریہ عیص کے بیان میں حضرت زینبؓ کے شوہر کا صحیح نام لکھتا ہے اور کہتا ہے کہ رسول اللہﷺ نے پہلے نکاح کی بناء پر اپنی بیٹی کو ابوالعاص بن ربیع کے پاس لوٹا دیا تھا۔ اسی طرح حضرت رقیہؓ اور ام کلثوم کی یکے بعد دیگرے حضرت عثمانؓ سے شادی کی بابت بالکل کوئی بات نہیں کرتا کیونکہ اس سے ایک اموی فرد بلکہ پورے اموی خانوادے کو رسول اللہﷺ سے نسبت صہارت وازواج کا شرف نصیب ہو جاتا ہے۔ اندازہ لگایئے کہ کرے کوئی بھرے کوئی، کسی کی دشمنی میں رسول اللہﷺ کو اذیت دینا کس قدر گھناؤنی حرکت ہے بلکہ اس سے بڑھ کر اور کیا اذیت ہوسکتی ہے کہ عام شخص کی بیٹی کو بھی ایسی نسبت نہیں دی جاسکتی جو محض جھوٹ ہو۔ (نقوش رسول نمبر۔۱۔۵۶۷)

چند سوالات کے جوابات:

بعض کہتے ہیں کہ حضرت فاطمہؓ کی شان اتنی بلند ہے کہ جنت کی تمام عورتوں کی سردار صرف ان کو بتایا گیا ہے لہٰذا بنات کا صیغہ حضرت فاطمہؓ کی تعظیم کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ کو نبیﷺ سے زیادہ تعظیم سیدہ فاطمہؓ کی منظور تھی کہ آپﷺ کو تو صیغہ واحد نبی سے نہ کہ انبیاء سے مخاطب کیا اور آپﷺ کی بیٹی کے لیے اور وہ بھی بلا اظہار نام جمع کا صیغہ استعمال فرمایا حالانکہ وقت حکم پردہ جو سن پانچ ہجری میں نازل ہوا، اس وقت آپﷺ کی تمام بیٹیاں زندہ اور موجود تھیں۔ علاوہ ازیں منکر اب تک بتانے سے قاصر ہیں کہ ازواج مطہرات سے حضورﷺ کی کونسی زوجہ مراد ہے اور نساء سے کس مومن کی بیوی۔ اگر وہ اٹکل پچو سے کسی کا نام لے دے تو پھر اس اعتراض کا جواب کیا دیں گے کہ کیا یہ حکم پردہ دنیا میں صرف تین عورتوں کے لیے نازل ہوا تھا اور باقی کروڑہا مسلمان عورتیں آزاد ہیں کہ وہ بے پردہ پھریں۔

۲۔ اگر کوئی یہ کہہ دے کہ یہ بنات النبی میں حضورﷺ کی نواسیاں مراد ہیں کیونکہ جس طرح ابناء میں

پوتے اور پڑپوتے شامل ہوتے ہیں اسی طرح بنات میں نواسیاں شامل ہیں نہ کہ آپ ﷺ کی زیادہ لڑکیاں ۔اس کا جواب یہ ہے کہ سن پانچ ہجری میں نواسی یا تو کوئی تھی ہی نہیں اگر بالفرض موجود تھی تو بوجہ صغیر سنی پردہ کے حکم میں نہیں تھی۔ یہ معترض یا تو جاہل ہے یا فریب کاری سے کام لیتا ہے۔

۳۔بعض کہتے ہیں حضرت عیسیٰؑ کی الوہیت کے متعلق گفتگو کرنے کے لیے نجران واقع یمن کے تین پادری (بقول ملا باقر مجلسی بحوالہ حیات القلوب، عاقل عبدالمسیح ابو حارثہ) حضور ﷺ کی خدمت میں مناظرہ کے لیے حاضر ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا اگر تم عیسیٰؑ کو حضرت آدمؑ کی طرح انسان نہیں مانتے تو آؤ ہم دونوں فریق اپنے بیٹوں عورتوں اور اپنی جانوں کو پیش کریں پھر عاجزی سے اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ جھوٹوں پر لعنت ہو۔اس مباہلہ سے عیسائی اگرچہ گریزاں ہوئے مگر آپ ﷺ حسنین کریمین، فاطمہ اور حضرت علیؓ کو مباہلہ کے لیے لائے اگر حضور ﷺ کی اور صاحبزادیاں ہوتیں تو انہیں بھی مباہلہ کے لیے لاتے۔۔۔۔اس کا جواب یہ ہے کہ یہ مباہلہ ”جامع عباسی معتبر کتاب شیعہ مذہب ص۔۵۸ کے بقول ۲۴ ذوالحج سن دس ہجری میں ہوا۔ بر تقدیر تسلیم شیعہ سے ہم پوچھتے ہیں کہ آپ ﷺ تو اپنے صاحبزادے ابراہیمؑ کو بھی نہیں لائے تھے جو اس وقت زندہ تھے۔کیا اس کے نہ لانے کے سبب ان کو اولاد نبی سے خارج سمجھنا چاہیے؟ واقعہ مباہلہ کے وقت ان تینوں میں سے کوئی صاحبزادی بقید حیات نہ تھی جیسا کہ نقشہ سے ظاہر ہے کہ بی بی زینبؓ، رقیہؓ اور ام کلثومؓ کی وفات بالترتیب سن آٹھ ہجری، سن دو ہجری اور سن نو ہجری میں ہوئی لہٰذا مباہلہ کا واقعہ ان صاحبزادیوں کی وفات کے ایک یا سوا سال بعد وقوع پذیر ہوا تو انہیں آپ ﷺ کیسے لے آتے۔

۴۔بعض کہتے ہیں اگر حضور ﷺ کی اور صاحبزادیاں تھیں تو مشہور کیوں نہ ہوئیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شہرت نہ ہونے سے کسی بھی شے کا عدم ہونا لازم نہیں ہوتا مثلاً حضرت علیؓ بہت مشہور تھے حالانکہ ان کے تین بھائی اور بھی تھے جنہیں کم لوگ جانتے ہیں۔حضرت انبیاءؑ کے اور بھائی بھی تھے لیکن وہ غیر معروف ہیں۔انبیاء کی درجہ بندی میں ارشاد خداوندی ہے ”تلك الرسل فضلنا بعضهم علىٰ بعض منهم من كلم الله و رفع بعضهم “ (سورۃ البقرۃ۔۲۵۱)) ان صاحبزادیوں کی عدم شہرت اسلام کی شان شوکت سے پہلے وصال کے سبب ہے اور پھر ان کا درجہ بی بی فاطمہؓ سے کم سہی لیکن یہ مضر نہیں جیسے حضرت علیؓ دوسروں سے زیادہ مشہور اور معروف تھے۔

اعتراض نمبر ۱۷۵

جب تک اقتدار میسر نہ تھا ایک ہی شریک حیات پر اکتفا کیا، لیکن جیسے جیسے اقتدار مستحکم ہوتا گیا تعداد ازواج میں اضافہ ہوتا گیا۔بعض معاندین نے نفسیات کی آڑ لے کر اس تعداد ازواج کو ابتدائی دور

کی محرومیوں کا ردعمل قرار دیا۔(مستشرقین مغرب کا انداز فکر۔۳۴۷)

جواب: اول تو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اقتدار کب مستحکم ہوا؟ مستشرقین کی آراء کے مطابق مدینہ کے نصف دور کے واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ (نعوذ باللہ) محمد ﷺ کی حیثیت نہ تھی۔ اس رائے میں واٹ پیش پیش ہے۔ ۶۳۱ء کے بعد محمد ﷺ کا اقتدار مسلمہ ہو گیا اور اب ان کے حکم کی خلاف ورزی ممکن نہیں رہی تھی۔ آنحضرت ﷺ کا وصال مبارک ۶۳۲ء میں ہوا لہٰذا واٹ کے بقول آخری ایک سال میں اقتدار مستحکم تھا اس اعتبار سے یہ مفروضہ سراسر غلط ثابت ہوتا ہے کہ تعدد ازواج اقتدار کا نتیجہ تھا۔ تاریخی مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ۷ ہجری (بمطابق ۶۲۸ء) کے بعد کوئی نکاح نہیں کیا اگر یہ اقتداری نظریہ درست ہوتا تو ازواج کی تعداد آخری ایام میں بڑھ جاتی جبکہ آخری چار سالوں میں ازواج کی تعداد میں اضافہ نہیں ہوتا۔ اگر کثرت ازواج اقتدار کے مستحکم ہونے کا مرہون منت ہوتا تو پھر مستشرقین کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ اقتدار مدنی دور کے آغاز میں ہی مسلمہ ہو چکا تھا۔

لفظ اقتدار سے جبر واکراہ معلوم ہوتا ہے، لیکن یہ بغض وعناد کا نتیجہ ہے کیونکہ اقتدار کے سہارے آپ ﷺ نے نکاح نہیں فرمایا اس سلسلے میں یہ مستشرقین کو بتانا پڑے گا کہ اقتدار کے سہارے کس ام المومنین سے نکاح فرمایا تھا۔ لیکن وہ یہ بتا نہیں پائیں گے۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت سودہؓ کے عقد و نکاح مکی دور میں ہوا، وہاں اقتدار کا نام ونشان تک نہ تھا۔

(۲) حضرت عمرؓ نے اپنی صاحبزادی کے لیے خود خواستگاری کی تھی۔ حضرت ام حبیبہؓ بے یار و مددگار حبشہ میں رہ گئیں، ان کی تالیف قلبی کرتے ہوئے نکاح فرمایا اور حضرت میمونہؓ کا نکاح مکہ میں ہوا جبکہ ان دنوں مکہ فتح نہیں ہوا تھا۔ حضرت ام سلمہؓ نے نکاح کے لیے چند شرطیں رکھیں۔ حضرت زینبؓ سے نکاح ان کی طلاق کے بعد جو دیگر وجوہات کے علاوہ کیا یہ بھی ان کی تالیف قلبی کا نتیجہ تھا۔ حضرت جویریہؓ اور حضرت صفیہؓ دونوں سرداروں کی بیٹیاں تھیں، وہ قیدی ہو کر آئیں تو آپ ﷺ نے ان پر احسان کیا اور انہوں نے حرم نبوی میں داخل ہونے کو پسند کیا۔ حضرت ماریہؓ شاہ مقوقس نے بھیجی تھی اس سے نکاح ان کے علوئے مرتبت کا باعث ہوا۔ ان تمام ام المومنین کے رشتہ ازواج میں منسلک ہونے میں اقتدار کا رتی بھر شائبہ تک نہیں اور یہ شادیاں دینی مصلحت، تالیف قلوب، عامتہ الناس کی بہبود، جاہلیت کی بری رسموں کے خاتمہ اور علوئے مرتبت کے لیے کی گئی تھیں۔

آپ ﷺ کے نکاحوں کی حکمتیں اور منشائے ایزدی کی کارفرمائیاں

حضرت خدیجہؓ: حضرت خدیجہؓ نے خواب میں دیکھا کہ آسمان سے چاند ان کی گود میں آگیا ہے۔ اس خواب کی تعبیر بحیرا راہب سے پوچھی گئی۔ اس نے کہا: اے ملکہ قریش! ایک اولوالعزم رسول ملک

عرب میں پیدا ہو چکا ہے۔ عنقریب تمھیں اپنے نکاح میں لائے گا اور تمام جہاں اس کے مذہب کے انوار سے ضوفشاں ہو جائے گا۔

حضرت سودہؓ: ان کا اوڑھنا بچھونا محبتِ رسول ہے۔ حرمِ نبوی میں رہنے کے لیے اپنی باری بی بی عائشہؓ کو بخش دیتی ہیں اور ام المومنین کے اعزاز کو برقرار رکھنے کو صد افتخار سمجھتی ہیں۔ خدا کی راہ میں ہجرت کی۔ آپؐ نے ان کے شوہر کی وفات کے بعد نکاح تالیف قلبی کے لیے کیا تھا۔ عبداللہ بن عباس روایت کرتے ہیں کہ حضرت سودہؓ کا نکاح سکران بن عمرو سے ہوا جو سہیل بن عمرو کے بھائی تھے۔ یہ خواب میں کیا دیکھتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ سامنے تشریف لا رہے ہیں یہاں تک کہ آپؐ نے ان کی گردن پر قدم مبارک رکھ دیا ہے۔ یہ خواب انھوں نے اپنے شوہر سے نقل کیا۔ اس نے یہ تعبیر دی کہ اگر تیرا خواب سچا ہے تو میں عنقریب مر جاؤں گا اور آنحضرتؐ تجھ کو اپنی زوجیت میں مقبول فرمائیں گے۔ دوسری شب پھر کیا دیکھتی ہوں کہ لیٹی ہوئی ہوں اور آسمان سے چاند ٹوٹ کر مجھ پر آن پڑا ہے۔ اس خواب کو بھی شوہر سے ذکر کیا تو اس کی بھی اس نے یہ ہی تعبیر بتائی کہ اگر تیرا خواب سچا ہے تو میں اب بہت دیر تک زندہ نہیں رہوں گا اور جلد مر جاؤں گا اور تم میرے بعد نکاح کر لوگی۔ پھر ایسا ہوا کہ اسی دن سکران بیمار پڑا اور کچھ مدت نہ گزری تھی کہ اس کی وفات ہوگئی اور اس کے بعد آنحضرتؐ نے ان کو اپنی زوجیت میں قبول فرمالیا (خصائص الکبریٰ) حضرت سودہؓ سے نکاح کے بارے میں مستشرقین کی آراء درج ذیل ہیں۔

''واٹ'' کہتا ہے آنحضرتؐ کی سیدہ سودہؓ سے شادی کا اصل مقصد مسلمانوں کی بے سہارا بیواؤں کو تحفظ و نگہداشت دینا ہی ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ پیغمبر نے بعد میں جناب زینب بنت خزیمہؓ سے بھی اسی وجہ سے شادی کی۔ ''کیرن آرم سٹرانگ'' کا نظریہ ہے کہ ''یہ ایک انتہائی جرات مندی اور دلیری کا کام تھا جس کو انجام دینے کے لیے مضبوط قوت ارادی درکار تھی۔ امت کی غیر محفوظ خواتین کے لیے فکر مند ہونے اور ان کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے خود پیغمبرِ اسلام ﷺ نے مثال قائم کی۔ غزوہ احد کے شہید جہم بن عمرو کی بیوی زینب بنت خزیمہؓ سے غزوہ احد کے بعد پیغمبر نے ان سے شادی کر لی اور انھیں گھر فراہم کیا۔ وہ قبیلہ بنو ہوازن کے سردار کی بیٹی تھیں۔ اس شادی سے اس قبیلہ کے ساتھ سیاسی اتحاد مضبوط ہو گیا۔

حضرت عائشہؓ: ان کے والدِ ماجد ابوبکر صدیقؓ ثانی اسلام وغار و قبر ہیں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے مجھ سے نکاح فرمانے سے قبل ہی جبرائیل نے میری صورت لا کر آپ ﷺ کو دکھا دی تھی اور فرمایا تھا یہ آپؐ کی بی بی ہیں۔ مجھ سے جب آپؐ کا نکاح ہوا تو اس وقت میں بالکل لڑکی تھی پھر جب آپؐ نے عقد فرمایا تو نوعمری ہی میں اللہ تعالیٰ نے مجھ پر شرم و حیا غالب فرما دی تھی (ترجمان السنہ۔۳۲۰) ڈاکٹر حمید اللہ لکھتے ہیں کہ سیدہ عائشہؓ سے شادی کر کے نبیؐ نے جہاں جنابِ ابوبکر کے ساتھ پہلے سے موجود قلبی تعلق

کو مزید مستحکم و مضبوط کرنے کی خواہش کو پیشِ نظر رکھا وہاں حضور اکرمؐ جوان عمر ام المومنین سیدہ عائشہؓ کو اسلامی تعلیمات کی ماہر مُدرسہ بنانے کی تربیت دینا چاہتے تھے (امہات المومنین اور مستشرقین ص ۱۳۱)

''ولیم میور'' کہتا ہے کہ دوسری شادی جناب ابوبکر کی جواں سالہ بیٹی سیدہ عائشہؓ سے کر لی اور اس رابطہ سے ان کا بنیادی مقصد اپنے قلبی رفیق سے اپنے لگاؤ اور تعلق کو مضبوط کرنا تھا۔ (حوالہ بالا ۱۳۲)

''واٹ'' کہتا ہے چوں کہ جناب محمد ﷺ کی تمام تر شادیوں میں ان کا سیاسی مقصد پیش نظر تھا اس لیے انھوں نے سیدہ عائشہؓ سے شادی کو اپنے اور ابوبکرؓ جو آنخضرتؐ کے اہم ترین پیروکار تھے، کے درمیان موجود تعلقات کو زیادہ بہتر طریقے سے استوار کرنے کا ذریعہ سمجھا ہوگا۔

حضرت جویریہؓ: حضرت جویریہؓ بیان فرماتی ہیں کہ آنخضرتؐ کی تشریف آوری سے تین شب قبل میں نے خواب میں ایسا دیکھا کہ چاند یثرب کی جانب چلتا آ رہا ہے۔ یہاں تک کہ میری گود میں آ گیا۔ میں نے کسی شخص کے سامنے خواب کا تذکرہ کرنا نامناسب سمجھا، یہاں تک کہ آپؐ تشریف لائے تو اتفاق ایسا ہوا کہ ہم لوگ قید کر لیے گئے تو مجھے اپنے خواب کی تعبیر پوری ہونے کی امید ہوئی۔ اس کے بعد جب آنخضرتؐ نے مجھ کو آزاد کر کے اپنی زوجیت میں لے لیا تو بخدا میں نے اپنی قوم کی آزادی کے معاملہ میں آپؐ سے ایک حرف بھی نہیں کہا بل کہ خود مسلمانوں نے ہی آپؐ کی رشتہ داری کی خاطر ان سب کو رہا کر دیا اور مجھ کو تو اس واقعہ کی خبر بھی جب ملی ہے جب کہ میری ایک چچازاد بہن نے مجھے اس کی اطلاع دی۔ میں نے اس احسان پر حق تعالیٰ کا شکر ادا کیا (ترجمان السنہ۔ ۳۲۰۔۳۲۱) بی بی جویریہؓ کی خودداری کا عالم دیکھیے کہ آزادی کا احسان لینا بھی گوارا نہیں کیا اور قوم کی رہائی کی سفارش نہیں کی۔

''واٹ'' کہتا ہے کہ ''سیدہ جویریہ بنو مطلق قبیلہ سے تھیں جن کی جنابِ محمدؐ کے ساتھ خصوصی پرخاش تھے''۔ ''ولیم میور'' کہتا ہے ''جوں ہی شادی کی صدائے بازگشت چار دانگ عالم میں سنی گئی تو لوگ کہتے تھے کہ بنی المطلق ان کے رشتہ دار بن رہے ہیں۔ اس لیے ان کے بقیہ قیدیوں کو جناب جویریہ کے حق مہر میں آزاد کر دیا جائے''۔

''سر جان گلب'' کہتا ہے کہ ''اس طرح بنو مطلق جنگی فتح سے بڑھ کر دائرہ اسلام میں داخل ہوئے''۔

حضرت زینب بنت جحشؓ: آنخضرتؐ کی پھوپھی زاد بہن تھیں۔ آپ ﷺ نے اپنے غلام زید بن حارثہ سے نکاح کروا کر آقا و غلام کی تفریق کا خاتمہ کر دیا۔ نیز متبنیٰ کی رسمِ باطلہ زمیں بوس ہوگئی۔ ان کی شان میں قرآن پاک میں ہے ''فلما قضی زید منھا وطرا''۔ حضرت زینب کے نکاح کا بار آنخضرتؐ پر نہیں ڈالا بل کہ حق تعالیٰ خود ہی اس کا متکفل ہو گیا۔ یہ صورت بھی اختیار نہیں کی گئی کہ نکاح کے قائم رہتے ہوئے آپ ﷺ کی زوجیت میں منتقل کر دیا جائے اور نہ ہی زید کو طلاق دینے پر مجبور کیا گیا۔ خود

رب اللعالمین نے اس کا عقد فرما کر حضرت زینبؓ کو عمر بھر اس فخر و امتیاز پر نازاں ہونے کا شرف بخشا۔ وہ اعزاز یہ تھا کہ خود خدا نے میرا نکاح آسمان پر کیا۔

حضرت صفیہؓ: حضرت صفیہؓ کی آنکھ پر کچھ سفید سا نشان تھا۔ آنحضرتؐ نے ان سے پوچھا تمھاری آنکھوں پر یہ سفید نشان کیسا ہے؟ انھوں نے کہا کہ میں نے اپنے شوہر سے ایک بار کہا کہ جیسا لوگ خواب دیکھا کرتے ہیں میں نے بھی ایک خواب دیکھا ہے۔ گویا چاند میری گود میں آ گیا ہے۔ یہ سنتے ہی فوراً انھوں نے میرے منہ پر تھپڑ مارا اور کہا تیرا ارادہ ہے اس شاہِ یثرب سے نکاح کرنے کا؟ وہ کہتی ہیں (بھلا میرا ارادہ کیسے ہوسکتا تھا) میرے والد اور میرے شوہر آنحضرتؐ کے حکم سے قتل کیے گئے تھے۔ اس لیے مجھے تو آپ کی طرف سے سخت ناگواری تھی لیکن جب آپ نے مجھے یہ سمجھایا کہ تمھارے والد ہی تمام عرب کو میرے مقابلہ کے لیے چڑھا کر لائے اور میرے ساتھ یہ عداوتیں کی تھیں تو پھر میرے دل سے یہ بات نکل گئی۔ (الطبرانی)

حضرت ام حبیبہؓ: حضرت ام حبیبہؓ بنت ابوسفیان فرماتی ہیں کہ انھوں نے آپؐ کی زوجیت میں آنے سے قبل خواب دیکھا تھا کہ کوئی شخص ان کو ام المومنین کہہ کر پکار رہا ہے۔ اس خواب سے یہ ذرا متحیر سی ہوگئیں اور انھوں نے اس کی یہی تعبیر دی کہ آنحضرتؐ ان کو اپنی زوجیت میں لیں گے۔ (المستدرک)

''واشنگٹن ارونگ'' کہتا ہے کہ ''بیوہ ام حبیبہ جناب محمدؐ کے شدید دشمن ابوسفیان کی بیٹی تھی۔ سیاسی اندازِ فکر و سوچ کو بروئے کار لاتے ہوئے پیغمبر خدا نے سوچا کہ اس شادی سے ام حبیبہؓ کے والد کی اسلام دشمنی کو کم کیا جاسکتا ہے۔

''ولیم میور'' کے مطابق ''جناب پیغمبر کو یہ امید تھی کہ ام حبیبہ کے والد ابوسفیان کو وہ اپنے مشن کی کامیابی کے لیے مددگار بنانے کی توقع یا امید کرسکتے ہیں''۔

آرتھر این وولٹین: انھیں امید تھی کہ ام حبیبہؓ کسی حد تک اپنے تند و بے رحم طاقت ور دشمن اسلام باپ ابوسفیان کو نرم رویہ اختیار کرنے میں کام یاب ہوسکتی ہیں''۔

واٹ: محمدؐ کی ابوسفیان کی بیٹی سے شادی نے ان کے دل میں جناب محمدؐ کے لیے نرم گوشہ ضرور پیدا کر دیا ہوگا۔ جب جنابِ محمدؐ نے صلح حدیبیہ کے کچھ عرصہ بعد مکہ پر حملہ کیا تو ابوسفیان، حکم بن حزام کے ساتھ شہر سے باہر آیا اور آپؐ کی اطاعت تسلیم کر لی''۔

جان گلب: ''یہ واقعہ ہمارے اذہان پر عجیب و غریب اثر کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضورؐ نے مختلف خاندانوں کی لڑکیوں سے شادیاں محض اس لیے کیں کہ ان کے خاندان والوں سے حضورؐ سے تعلقات استوار ہوں۔ آپؐ نے خاص طور پر حبشہ کے شہنشاہ کو لکھ کر سیدہ ام حبیبہؓ کو مدینہ بلوایا۔ اگر آپؐ کا

مقصد صرف ایک عورت کا حصول تھا تو ایک سے بڑھ کر ایک حسین وجمیل اور خوب صورت لڑکی عرب میں آپؐ کو مل سکتی تھی۔ سینکڑوں خوب صورت لڑکیاں عرب میں موجود تھیں۔ ان ساری پری پیکروں کو چھوڑ کر ام حبیبہؓ کو جو بیوہ تھیں حبشہ سے بلوا کر حضورؐ کا شادی کرنا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ حضورؐ غالباً ام حبیبہؓ کے توسط سے ابوسفیان کے ساتھ اپنے تعلقات بہتر بنانا چاہتے ہیں لیکن اس کے شوہر کا چھوڑ جانا حرم نبوی میں داخلے کا سبب تھا۔

حضرت ام سلمہؓ: حضرت ام سلمہؓ بیان کرتی ہیں کہ آنحضرتؐ نے یہ ارشاد فرمایا کہ جس مسلمان کو کوئی مصیبت پہنچے اور وہ وہی کلمات پڑھ لے جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ یعنی "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ اَللّٰھُمَّ اَجِرۡنِیۡ فِیۡ مُصِیۡبَتِیۡ وَ اخۡلُفۡ لِیۡ خَیۡراً مِنۡھَا" (اللہ تعالیٰ اس کا بدلہ میں ضرور اس سے بہتر اس کو اور عنایت فرما دے گا)۔ جب ام سلمہ کا (ان کا شوہر) کا انتقال ہوا تو میں نے اپنے دل میں سوچا کہ بھلا ان سے کون سا مسلمان افضل ہوسکتا ہے جنھوں نے سب سے پہلے آنحضرتؐ کی طرف ہجرت کی تھی لیکن اس کے باوجود میں نے ان کلمات کو پڑھ ہی لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے مجھے آنحضرتؐ کی زوجیت کا شرف بخشا۔ (ترجمان السنہ ۳۲۷) آنحضرتؐ نے فرمایا: میں نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ میں اپنی امت میں سے کسی سے نہ نکاح کروں اور نہ ہی اس کے نکاح میں بیٹی دوں مگر یہ کہ میرے ساتھ جنت میں ہو۔ پس اللہ تعالیٰ نے میرے سوال کو شرف قبولیت بخشا۔ اس بات کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا میں نے اپنی ازواج میں سے کسی عورت سے نکاح نہیں کیا اور نہ ہی اپنی کوئی بیٹی کسی کے نکاح میں دی ہے مگر اس اجازت سے جو جبرائیلؑ انھیں اللہ کی طرف سے لے کر میرے پاس آئے یعنی اللہ تعالیٰ کی اجازت سے میں نے ایسا کیا"۔ (امہات المومنین ۲۸۔۲۷)

ولیم میور: سیدہ ام سلمہ ابوسلام کی بیوہ تھیں جن کی زوجیت کے نتیجے میں انھوں نے کئی بچوں کو جنم دیا۔ دونوں ملک بدر ہو کر حبشہ ہجرت کر گئے۔ وہ واپس مدینہ آئے تو ابوسلام غزوہ احد کی زخموں سے تاب نہ لا کر انتقال کر گئے۔ پھر چار ماہ بعد ان کی بیوہ سے پیغمبر خدا ﷺ نے شادی کر لی۔ ان کے بچوں میں ایک کی پرورش خود آنحضرتؐ نے کی۔ دیگر روایات وحکایات کے مطابق ان کے کئی بچے تھے اور ان کی قابلِ رحم حالت کے وقت پیغمبرِ اسلام ﷺ نے انھیں شفقت پدری سے نوازا۔

حضرت حفصہؓ: ہنری لیمنز متعصب عیسائی پادری ہے۔ انسائکلو پیڈیا آف اسلام میں سیدہ حفصہؓ سے متعلق لکھے گئے ایک مضمون میں تسلیم کرتا ہے کہ "یوم احد کے فوراً بعد نبی اکرمؐ نے عمر بن خطاب کے تعاون کی خاطر سیدہ حفصہ سے شادی کی۔ ولیم میور: سیدہ حفصہؓ کو حرم نبوی میں بہ طور زوجہ داخل کرنے سے نبی اکرم ﷺ نے ان کے والد جنابِ عمرؓ سے دوستی کے بندھن کو مستحکم کر دیا۔

ایمائیل ورنگھم: بیان کرتا ہے ''سیدہ حفصہؓ جو بیوہ تھیں، کو پیغمبرِ خدا ﷺ نے شریک حیات بناتے ہوئے جناب عمرؓ سے بہترین تعلق اور رشتہ قائم کر لیا۔

جان بیگٹ گلب: پیغمبر پہلے ہی عائشہؓ سے شادی کر چکے تھے اور حفصہ بنت عمر سے شادی کر کے پیغمبر اپنے دونوں قریبی جاں نثار ساتھیوں کو اپنے مزید قریب کرنا چاہتے تھے۔

واٹ: اواخر جنوری ۶۲۵ء میں جناب محمدؐ نے سیدہ حفصہ سے شادی فرمائی جو عمر کی بیٹی تھیں۔ وہ پیغمبر اسلام ﷺ کے بعد مسلمانوں کے خلیفہ ثانی مقرر ہوئے۔ ایک پنتھ دو کاج کے مصداق اس طرح سے ایک طرف تو جنابِ پیغمبر ﷺ نے اپنے نائب کمان دار اور ساتھی عمر سے رشتہ مضبوط کر لیا اور دوسری طرف سیدہ حفصہؓ کی دل جوئی مقصود تھی۔ اس شادی یا دیگر شادیوں کا پیغمبر نے اپنے لیے یا اپنے پیروکاروں کے لیے خود اہتمام کیا۔ ان میں سیاسی مقاصد یقیناً پیش نظر تھے چاہے کوئی دیگر وجوہات تھیں یا نہ تھیں۔

تعدد ازواج

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّيَّةً (رعد۔ ع ۶)

ڈاکٹر محمد حمید اللہ (پیغمبر اسلام ۲۲۸۔۲۲۷) لکھتے ہیں تاریخی طور پر کسی مذہب کے قوانین میں بیویوں کی تعداد پر کہیں پابندی نہیں لگائی گئی۔ بائبل میں مذکور تمام پیغمبروں کی ایک سے زیادہ بیویاں تھیں حتیٰ کہ عیسائیت میں بھی جو ''ایک وقت میں ایک بیوی'' کے قانون کی علامت بن گئی ہے عیسیٰؑ نے خود بھی کبھی تعداد ازواج کے خلاف ایک لفظ نہیں کہا جب کہ مذہبی علوم کے ممتاز مسیحی ماہرین مثلاً لوتھر میلنتھون اور بوسر وغیرہ نے تو میتھو کی انجیل (۲۵۔۱۔۱۲) میں دس کنواریوں کی تمثیل سے تعداد ازواج کا جواز حاصل کرنے میں کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا کہ عیسیٰؑ بیک وقت ایک مرد کی دس لڑکیوں سے شادی کے امکان کو پیشِ نظر رکھ رہے تھے۔ اگر مسیحی اس اجازت سے فائدہ اٹھانا نہیں چاہتے (جوان کے مذہب کے بانی نے دی) تو قانون بہ ہر حال تبدیل نہیں ہوا۔ (حاشیہ پر رقم طراز ہیں) یک زوجگی (ایک وقت میں ایک بیوی) کا اس طرح تصور کہ دوسری شادی (بہ یک وقت دو بیویاں) کو سنگین جرم، گناہ اور لعنت قرار دیا جائے بہت کم یاب ہے اور شادی کے ایسے منفرد، مثالی اور کڑے پن پر مبنی نظریہ کی مثال آج کے جدید دور سے پہلے شاید ہی ملتی ہو اور یہ صورت حال بھی مغربی تہذیب کی دورِ حاضر کی جدیدیت کا ثمر ہے۔ یہ مسیحی دینی نظریہ سے اخذ کردہ قانون نہیں۔ (انسائکلوپیڈیا۔ باب شادی)

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یک زوجگی، مسیحیت نے مغربی دنیا میں متعارف کروائی۔ مسیحیت بشپ اور پادری کے سوا باقی لوگوں کے لیے تعداد ازواج یعنی ایک سے زیادہ شادی کی ممانعت نہیں کرتی۔ مگر ابتدائی صدیوں میں مسیحت کی کسی کونسل آف چرچ نے ایک سے زیادہ شادی کی ممانعت نہیں کی اور

بادشاہوں نے بھی دورِ کفر (قبل از مسیحت) میں جہاں کہیں بھی یہ رائج تھی اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی۔ چھٹی صدی کے وسط میں آئرلینڈ کے شاہ ڈیار بیٹ کی دو ملکائیں اور دو داشتائیں تھیں۔ تعدد ازواج فرانس کے Merovingian بادشاہوں کے ہاں بھرپور انداز سے رائج تھی۔ چارلس دی گریٹ (شارلیمان) کی دو بیویاں اور ان گنت داشتائیں تھیں اور اس دور کے ایک قانون سے بھی ایسا تاثر ملتا ہے کہ پادریوں کے ہاں بھی ایک سے زیادہ شادیاں شجرِ ممنوعہ کی حقیقت نہیں رکھتی تھیں۔ بعد کے ادوار میں فلپ آف Hesse اور جرمنی کے بادشاہ فریڈرک ولیم نے لوتھرن کے مذہبی پیشواؤں کی منظوری سے ایک سے زیادہ شادیاں کیں۔ خود لوتھر نے اول الذکر فلپ کی دوسری شادی کی منظوری دی جب کہ میلنتھون سے بھی ایسا ہی منسوب ہے۔ مختلف مواقع پر لوتھر نے تعدد ازواج کا ذکر بڑی رواداری کے لہجے کے ساتھ کیا ہے۔ اس کی ممانعت خدا نے نہیں کی۔ ۱۶۵۰ء میں Wertphalia (جرمنی) کے امن معاہدے کے بعد جب کہ مردانہ آبادی کا بڑا حصہ تیس سالہ جنگ کی نذر ہو چکا تھا۔ جنگی پارلیمنٹ نے نورمبرگ سے ایک قرارداد منظور کی جس میں کہا گیا کہ اس کے بعد ہر مرد کو دو عورتوں سے شادی کی اجازت ہوگی۔ بعض مسیحی فرقوں نے بڑے زور کے ساتھ مردوں کی ایک سے زیادہ شادیوں کی حمایت کی ہے۔ ۱۵۳۱ء میں اینابیپٹسٹ نامی مسیحی فرقے (اس فرقے کا عقیدہ تھا کہ جن بچوں کو بچپن میں بپتسمہ دیا گیا انہیں بالغ ہونے کے بعد ایک بار پھر بپتسمہ دینے کی ضرورت ہے) منسٹر (MUNSTER) میں کھلے عام یہ اعلان کیا کہ جو کوئی سچا عیسائی بننا چاہتا ہے تو اسے کئی بیویوں کا شوہر ہونا چاہیے۔ ساری دنیا کو معلوم ہے کہ مارمنز (MORMONS) امریکہ کے ایک معروف مسیحی (فرقہ) کثیر الازواجی کو خدائی ادارے کا درجہ دیتے ہیں۔ عزت مآب فلپ آف HESSE کی طرف سے مارٹن لوتھر اور فلپ میلنتھون سے کیے جانے والے استفسارات کے بارے میں مارٹن لوتھر کی جو ہدایات دی گئی تھیں وہ اس طرح تھیں: ’’معلوم ہے کہ لوتھر اور میلنتھون نے شاہِ انگلستان کو مشورہ دیا تھا کہ وہ پہلی بیوی کو طلاق دینے کی بجائے دوسری شادی کر لے۔ شادی کی تنسیخ یا علیحدگی کا امکان اسلامی قانون میں بھی شروع سے موجود ہے۔ شوہر کو بیوی کو طلاق دینے کا حق حاصل ہے تاہم بیوی بھی یہ حق نکاح کے وقت مطالبہ کر کے حاصل کر سکتی ہے اور اسے نکاح نامہ میں درج کرنا ضروری ہے۔ عدالت اس صورت میں بیوی کی درخواست پر تنسیخ نکاح کی ڈگری جاری کر سکتی ہے اگر شوہر اپنے ازواجی فرائض ادا کرنے کی اہلیت سے عاری ہو یا وہ کسی سنگین قسم کے مرض میں مبتلا ہو یا سالہا سال سے مفقود الخبر ہو (وغیرہ)۔ علیحدگی کی ایک صورت اور بھی ہے جب نباہ نہ ہونے کی صورت میں میاں بیوی باہمی رضامندی سے ایک دوسرے سے الگ ہونے کا فیصلہ کر لیں۔ قرآنِ مجید میں اس بات پر زور دیا گیا ہے

کہ میاں بیوی جھگڑے کی صورت میں اپنا معاملہ کسی تیسرے ثالث یا بزرگ کے پاس لے جائیں تاکہ علیحدگی سے قبل گھر بچانے کی ایک اور کوشش کی جا سکے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس حوالے سے فرمایا ''اللہ کی نظر میں جائز چیزوں میں سے سب سے ناپسندیدہ چیز طلاق ہے''۔

اعتراض نمبر ۱۷٦

آپؐ دولت وثروت وحکومت کے خواہاں تھے؟ اہل مکہ آپؐ سے یہ چاہتے تھے کہ ان کے مذہب پر تنقید نہ کریں۔ شرک و بت پرستی سے نہ روکیں۔ آپؐ نے ایسا نہ کیا۔ مانا کہ آپ جو کچھ فرماتے تھے سچ فرماتے تھے اور انھیں کے فائدے کے لیے تھا لیکن جب وہ خود ہی اسے سننا نہ چاہیں تو آپ کو کیا پڑی کہ خواہ مخواہ ان کے لیے اپنے آپ کو اس بلا میں نہ ڈالتے اور نہ پریشان ہوتے۔ مخالف کہتے ہیں کہ آپؐ کی یہ تمام جدوجہد صرف دولت اور شوکت وحکومت حاصل کرنے کے لیے تھی۔ (ن۔۴۔۱۹۸)

۲۔ مستشرقین آپ ﷺ کو جاہ پسند کہتے تھے۔

جواب: یہ معترضین کی بھول ہے اور تاریخی حقائق سے آنکھیں بند کرنے کا نتیجہ ہے۔ یہ سب چیزیں تو اہلِ مکہ خود آپؐ کی خدمت اقدس میں پیش کرتے ہیں۔ اس وقت آپؐ تمام پیشکشیں ٹھکرا دیتے ہیں اور دوٹوک الفاظ میں اعلان فرماتے ہیں کہ یہ لوگ اگر میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند رکھ دیں تو پھر بھی میں اپنے مقصد سے پیچھے نہ ہٹوں گا۔ اگر ان کی تمام تگ ودو اور سعی وکوشش کی غرض یہی ہوتی تو اس وقت اہل مکہ کی پیش کردہ دولت کی پیش کش قبول کر لیتے۔ آپؐ اسے غنیمت سمجھ کر اختیار کر لیتے لیکن اس کے برعکس آپ ﷺ کی زندگی سادہ تھی اور آپ ﷺ کو دولت کی ہوس نہ تھی۔ آپ بے چھنے جو کی روٹی کھاتے، اپنی نعلین خود گانٹھ لیتے ہیں۔ آپ کے اہل بیت خود چکیاں پیستے ہیں یہاں تک کہ آپؐ نے اپنی اولاد پر زکوۃ وصدقات کو بھی حرام کر دیا۔ حالانکہ جس دولت کی خاطر آپؐ نے تکلیفیں اٹھائیں اپنے لیے استعمال میں کیوں نہیں لاتے بل کہ اولاد کو تو اس سے فائدہ حاصل کرنے دیتے۔ ہر لحاظ سے آنحضرتؐ کا دامن تمام بدافعال، آلائش، ریا وآمیزش، حرص وہوس، بے انصافی، مفاد پرستی اور نفس پرستی سے بالکل مبرا ومنزہ تھا۔

سیدنا حضرت عمرؓ کے پوتے حضرت صالح کے متعلق ہے کہ وہ طواف کعبہ میں مصروف تھے کہ اتنے میں ہشام بن عبدالملک خلیفۃ المسلمین بھی بغرض طواف حاضر ہوا۔ وہ ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے ان سے عرض کی کہ حضور کوئی حاجت ہو تو فرمائیے۔ انہوں نے فرمایا کہ دنیا یا آخرت کی؟ ہشام نے عرض کی کہ میں تو دنیا کی حاجت ہی کے بارے میں سوال کر سکتا ہوں۔ انہوں نے فرمایا کہ اللہ کے گھر کھڑے ہو کر اس کے غیر سے مانگتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے آخر جب وہ حرم

پاک سے باہر آئے ہشام نے عرض کی کہ جناب! اب تو تم خانہ کعبہ سے باہر تشریف لے آئے ہو، اب میرے لائق کوئی خدمت؟ انہوں نے پھر وہی سوال دہرایا کہ دنیا کی حاجت یا آخرت کی، تو خلیفہ نے دنیا کی حاجت کی بابت عرض کیا۔ حضرت صالحؒ نے فرمایا کہ جو دنیا کا مالک ہے میں نے کبھی اس سے دنیا نہیں مانگی تجھ سے کیا مانگوں؟ یہ غلامان رسول اور جانثاران رسول کا حال ہے تو اس ذات کے کیا کہنے جو ساری انسانیت کے لیے نمونہ ہے۔

جواب ۲: مستشرقین کہتے ہیں کہ آپ جاہ پسند تھے۔ اب اس اعتراض کا جائزہ لیتے ہیں۔ کسی علمبردار حق کے دامن خلوص پر حرص اور نفسانیت کی تہمت دھرنے کا رواج ہر دور میں رہا ہے۔ اور الزام لگایا جاتا ہے کہ یہ شخص کچھ بننا چاہتا ہے اپنا کوئی مقام بنانا چاہتا ہے۔ کسی منصب کو حاصل کرنے کا خواہاں ہے جس طرح حضرت موسیٰ و ہارون علیھم اسلام کے خلاف یہی پروپیگنڈا کیا گیا کہ یہ لوگ حکمران بننا چاہتے ہیں حکومت کی لگن میں محو ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کے خلاف بھی یہی زہر اگلا گیا کہ وہ تو یہودیوں کا بادشاہ بننے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ یہ قبیح الزام آپ ﷺ پر بھی لگایا گیا جب کہ آپ ﷺ ایسے منصب کے خواہاں تھے نہ کوئی اس سے غرض تھی۔ یہودیوں نے سرور عالم کے خلاف کہا کہ یہ ساری جان ماریاں تو بس اس غرض سے ہیں کہ جو مقام حضرت عیسیٰؑ کا چلا آ رہا ہے وہ آپ ﷺ کے قبضہ میں آ جائے اور عیسائیوں اور دوسرے لوگوں کو آہستہ آہستہ گھیر کر اپنی پرستش میں لگایا جائے۔ غور کیجئے کہ حضور ﷺ نے اس طرح کا کبھی کوئی دعویٰ نہیں کیا تھا ایسے منصب کی طلب کا اشارہ تک نہیں دیا تھا لیکن طاقت نے خود ہی اپنے ذہن سے ایک طومار گھڑ لی اور اپنی جگہ طے کر لیا کہ محمد ﷺ کا مقصد صرف یہ ہے کہ عیسیٰ بن کر پوجا کرائیں۔ دعویٰ نہ کیا ہو تو نہ سہی، دل میں اسی کے اردادے ہیں۔ یہ ارادے سامنے نہیں آئے تو کیا ہوا آثار بتا رہے ہیں کہ کبھی نہ کبھی یہ سامنے آ کر رہیں گے۔ وفد نجران کے ارکان کے کان ان فضولیات سے بھرے گئے ہوں گے جبھی تو اس وفد کے ایک رکن ابونافع قرضی نے یہ سوال آپ ﷺ سے دریافت کیا کہ کیا آپ ﷺ ہم سے یہ چاہتے ہیں کہ ہم آپ ﷺ کو عیسیٰؑ کی طرح پوجا کریں جیسے نصاریٰ عیسیٰؑ کی پوجا کرتے ہیں؟ وفد کے ایک رکن الربیس (الریس یا الرھیس) نے بھی پوچھا کہ ''اے محمد ﷺ کیا آپ ﷺ ہم سے بھی چاہتے ہیں اور اسی کے لیے دعوت دیتے ہیں''؟ آپ ﷺ نے فرمایا'' خدا کی پناہ اس بات سے کہ سوا کسی اور کی بندگی کروں یا اس کے سوا کسی اور کی بندگی کی دعوت دوں پس مجھے خدا نے اس مقصد کے ساتھ نہیں اٹھایا ہے اور نہ مجھے اس کا حکم دیا ہے قرآن مجید میں ہے مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (آل عمران۔۷۹)

(ترجمہ) کسی انسان کا یہ منصب نہیں ہے کہ خدا اسے کتاب اور حکمت اور نبوت سے سرفراز

کرے تو پھر وہ لوگوں سے یہ کہنے لگے کہ اللہ کی بجائے میرے بندے بن جاؤ‘‘)

قریش کا نمائندہ عتبہ بارگاہ نبوی میں آ کر عرض کرتا ہے ’’اے بھتیجے! اگر تم مال و دولت کے خواہاں ہو تو ہم سب تمھارے لیے اتنا مال جمع کر دیتے ہیں کہ ہم میں سے کوئی بھی آپ کا مقابلہ نہ کر پائے گا اور اگر کوئی عہدہ یا سرداری چاہتے ہو تو ہم آپ کو سردار مان لیتے ہیں۔ اگر حکومت و ریاست کے خواہاں ہو تو ہم تمھیں اپنا بادشاہ اور حاکم بنا لیتے ہیں اور اگر تم کسی حسین و جمیل عورت سے شادی کے لیے تیار ہو تو ہم شادی کرا دیتے ہیں اور اگر کوئی آسیب ہے تو ہم تمھارا علاج کرا دیتے ہیں۔ عتبہ کی پیش کش میں سرداری و بادشاہ کے منصب کا ذکر ہے۔ اگر آپؐ اقتدار کے متمنی (جاہ پسند) ہوتے تو یہ موقعہ خوب تھا۔ نہ ہلدی لگے نہ پھٹکڑی، رنگ چوکھا آئے۔ یعنی بدوں تگ و دو اور سعی و کوشش کے بادشاہت آپ کے در دولت کی بھکارن بن چکی تھی حسن کی دیویاں ایک ابرو جنبش کی منتظر تھیں مگر آپ نے سب کچھ ٹھکرا دیا کیوں؟ اس لیے کہ ان کا مشن دعوتِ توحید تھا۔ اس دین کا پرچار تھا جسے اللہ تعالیٰ نے تمام ادیان باطلہ پر غالب کرنا تھا۔ آپؐ اس نصب العین سے ہٹ نہیں سکتے تھے۔ وہ منصب جو عطائے خداوندی ہے اس سے بڑھ کر کوئی سرداری اور بادشاہت نہیں ہو سکتی ہے۔ وہ منصب جو صرف اللہ تعالیٰ کے فضل سے ملتا ہے وہ ہے نبوت و رسالت۔

ابوسفیان نے حضرت عباسؓ سے فتح مکہ کے موقعہ پر اسلامی لشکر کو دیکھ کر کہا تھا کہ تمھارے بھتیجے کی بادشاہت دور تک قائم ہو گئی ہے۔ حضرت عباسؓ نے فرمایا ’’یہ بادشاہی نہیں، نبوت و رسالت ہے۔ اس منصب کے سامنے سب مناصب ہیچ ہیں‘‘۔ آپؐ نے برتری کا خاتمہ کر دیا۔ پھر بھی یہ الزام کہ ان کی زندگی پیغمبرانہ تھی مگر مدینہ میں بادشاہی میں بدل گئی، باطل ہے۔

فتح مکہ کے موقعہ پر آپ ﷺ نے فرمایا تمام لوگ آدم سے ہیں اور آدم مٹی سے تھے۔ پھر آپؐ نے قرآن کریم کی آیت پڑھی۔ ترجمہ: ’’اے لوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمھیں قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کیا تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ اللہ کے نزدیک سب سے با عزت وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے بے شک اللہ تعالیٰ جاننے والا اور خبر رکھنے والا ہے‘‘۔ اس کے بعد فرمایا ’’اے قریش کے لوگو! تمھارا کیا خیال ہے میں تمھارے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہوں‘‘؟ انھوں نے کہا: اچھا! آپ کریم بھائی اور کریم بھائی کے بیٹے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا ’’لاتثریب علیکم الیوم‘‘ آج تم سے کوئی مواخذہ نہیں جاؤ تم سب آزاد ہو۔ کیا یہی جابر حکمران ہیں اور ان کا ایسا ہی سلوک اور رویہ ہوتا ہے؟ کیا یہی پیغمبری جو مکہ تک تو تھی مگر مدینہ جا کر تغیر پذیر ہو گئی؟ اسی کو تم کہتے ہو کہ نبوت کا تسلسل برقرار نہ رہا۔ ابوسفیان کو مکہ کی طرف آنے والے صحابہ کرام کے لشکر کا ایک تنگ گھاٹی کے پاس پہاڑی کے اوپر اسلامی لشکر کا نظارہ دکھایا گیا تو وہ دم بہ خود ہو گیا اور حضرت عباسؓ سے کہا: عباسؓ!

تمھارے بھتیجے کی بادشاہت تو بہت دور تک قائم ہوگئی ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ ''عباس! تیرا بھتیجا تو واقعی بہت بڑا بادشاہ بن گیا ہے''۔ حضرت عباسؓ نے کہا ''یہ بادشاہی کا نہیں، نبوت کا کمال ہے(سیدالوریٰ۔ دوم۔۲۸۳) آپ نے جہاں قدم مبارک رکھا مکہ کی سرزمین ہو یا مدینہ کی یا کوئی اور آپؐ ہر جگہ نبی اللہ تھے اور ہر لمحہ کارِ نبوت میں جاں فشانی اور تن دہی سے وقت صرف کیا۔ لمحہ بھر کے لیے نبوت کے تسلسل میں فرق نہ آیا۔ کہنے کو جس کا جو جی چاہے کہے لیکن آپؐ کا دامن نبوت و رسالت ہر الزام سے مبرا و منزہ ہے۔ دوسرا اعتراض کہ کچھ عرصہ تک یہود سے مطالبہ نہیں کیا تھا کہ وہ ان کو رسول اللہ کی حیثیت سے تسلیم کریں۔ مستشرق کیوں بھول جاتا ہے کہ مدینہ پہنچ کر آپؐ نے فوری حل طلب مسائل پر دھیان دیا اور ساتھ ہی دنوں یا ہفتوں کے اندر ایک دستاویز تیار کی جس میں مدینہ کی شہری ریاست کے آئین کی جملہ ضروری تفصیلات درج کی گئیں۔ اس کی شق نمبر ا میں غیر مسلموں نے آنحضرتؐ کو رسول مان لیا تھا۔ غیر مسلموں کو نبی رسولؐ کی نبوت و رسالت کا اقرار ہے لیکن مستشرق صدیوں بعد ماننے سے انکاری ہے گویا باپ داداؤں کی بات ماننے سے بھی انکاری ہے۔ بایں عقل و دانش بباید گریست۔

کیا یہ جاہ پسندی ہے یا کسی منصب اعلیٰ کی خواہش ہے کہ مخالفین نے ہنگامہ برپا کر رکھا ہے۔ ان کے اپنے ہمنوا گبن کا قول ہے کہ till the third day before his death he regularly performed the function of public prayer (انتقال کے تین دن پہلے تک آپ ﷺ باقاعدگی سے نمازوں کی امامت فرماتے رہے۔)

اعتراض نمبر ۱۷۷

(۱) اسلام ایک اشتراکی رجحان تھا اور محمد ﷺ صرف ایک معاشرتی مصلح تھے نہ کہ پیغمبر''۔ (حمادے۔ن ۱۱/۵۳۸)

(۲) جرمن مستشرق ''ہوبرٹ گریم'' اپنی کتاب محمدؐ میں لکھتا ہے ''شروع میں محمدؐ کسی نئے مذہب کے داعی نہ تھے، وہ جس چیز کی دعوت دے رہے تھے اسے ہم ایک طرح کی اشتراکیت کہتے ہیں، اسلام کو اس کی اصل ابتدائی صورت میں دیکھنے کے لیے ضروری نہیں ہے کہ ہم اس سے پہلے موجود کسی مذہب کی نقل ٹھہرائیں جس سے محمدؐ کی تعلیمات کی توجیہہ ہو سکے، کیوں کہ جب ہم اسلام کا براہِ راست مطالعہ کرتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ وہ مذہبی عقیدوں کے بجائے ایک سماجی اصلاح کے لیے جدوجہد کی صورت سامنے آیا۔ جس کے پیشِ نظر بگڑے ہوئے حالات کی اصلاح کرنا اور بالخصوص حریص دولت مندوں اور پریشان حال غریبوں کے درمیان واضح فرق کو مٹانا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ محمدؐ نے ضرورت مندوں کی مدد کے لیے ایک متعین ٹیکس عائد کیا، وہ اگر آخرت میں حساب کتاب کی باتیں

کرتے ہیں تو اس کا مقصد اپنی دعوت کو تقویت پہنچانا اور لوگوں پر نفسیاتی دباؤ ڈالنا ہوتا ہے"۔(علوم اسلامیہ اور مستشرقین۔ص۔۱۶۔۱۵)

۳۔اپنے زمانہ میں محمد ﷺ ایک سماجی مصلح تھے اور آپ ﷺ کی اصلاحات کا دائرہ اخلاقی پہلو کو بھی محیط تھا۔

۴۔ایک اور اعتراض یہ ہے کہ مکہ کا مظلوم مبلغ صرف مدینہ کا حکمران ہی نہیں تھا بلکہ اپنے دور کا عظیم انسان بھی تھا۔

جواب: یہ بات درست ہے کہ آپؐ شروع میں کسی نئے مذہب کے داعی نہ تھے۔ کیوں کہ دنیا میں جس قدر پیغمبر آئے وہ ایک ہی دین لائے اور ایک ہی عقیدہ لے کر آئے۔ وہی توحید، وہی نبوت، وہی عبادت، وہی اخلاق، وہی جزا و سزا اور عمل کی پرسش کا حساب و کتاب۔ اس لحاظ سے تمام انبیاء کی تعلیم میں کوئی اصولی فرق نہیں۔ اس لیے سورہ شوریٰ میں فرمایا کہ "شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نوحاً"(یعنی خدا نے تمھارے لیے وہی دین مشروع کیا جو نوح وغیرہ دوسرے پیغمبروں کو دیا تھا اور اسی کا نام اسلام ہے)۔ انبیاء کی تعلیم کا اصل الاصول اور سب سے ضروری پیغام توحید ہے اور وہی نبوت کے ساز کا اصلی اور ازلی ترانہ ہے۔ ممکن ہے کہ دنیا میں اسلام سے پہلے بہت سے اچھے لوگ گزرے ہوں، ان کی دعوت بھی مفید ہو، اخلاقی وعظ بھی دل پسند ہوں۔ وہ یونان کے حکیم یا ہندوستان کے اوتار ہوں۔ اگر ان کی تعلیم میں توحید کی دعوت شامل نہیں تو وہ نبوت کے رتبہ کے قابل نہیں کہ پیغمبرانہ تعلیم کی پہچان ہی توحید کی دعوت ہے۔ اگر یہ نہیں تو نبوت بھی نہیں۔ فرمایا "اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا لیکن اس کو یہ وحی کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں۔ میری ہی پرستش کرو"۔(سیرت النبی۔ج۴۔۱۹۲)

تمام انبیاء اور صحیفوں کی تصدیق کا لازمی نتیجہ ہے کہ محمدؐ کی تعلیم یہ ہو کہ آدم سے لے کر محمدؐ تک جتنے سچے مذاہب خدا کی طرف سے آئے وہ سب ایک تھے۔ اسلام اسی ایک دین کا نام ہے جو آدمؑ سے محمدؐ تک باری باری پیغمبروں کے ذریعہ سے آتا رہا اور انسانوں کو اس کی تعلیم دی جاتی رہی۔ ثابت ہوا کہ آپؐ کی دعوت میں اشتراکیت کا ذرہ برابر بھی شائبہ تک نہیں ہے۔ اشتراکیت منوانے کے لیے روس میں ابتدائی چند سالوں میں ۱۹ لاکھ آدمیوں کو موت کی سزا دی گئی۔ تیس لاکھ کو مختلف سزائیں دیں۔ پچاس لاکھ آدمیوں کو جلاوطن کر دیا گیا۔ جدید اشتراکی چین کے نمائندے نے ۳ دسمبر ۱۹۵۶ء کو اتحادی اسمبلی منعقدہ پیرس میں اعلان کیا کہ کمیونسٹ حکومت نے چین میں ڈیڑھ کروڑ زمین داروں کو پھانسی پر لٹکا دیا۔(مقالات افغانی۔ج۱۔ص۱۰۸)۔ ہوبرٹ کا یہ نظریہ کسی طور درست نہیں اور نہ ہی قابلِ قبول ہے۔

اسلامی اشتراکیت: معاشرتی عدل اور تقسیم دولت کے لیے قانون بنانے اور اپنی نشاۃ ثانیہ کے

لیے اشتراکیت کو عنوان اولین قرار دینے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اسلام کی اجتماعی تحریک ایمان باللہ کے عقیدہ اور افراد کی مساوات سے شروع ہوتی ہے جس کی غایت معاشرتی عدل کا مقام ہے۔ یہ ہے اسلام کی اپنی اشتراکیت جس کی غایت محض مال اور اس کی تقسیم نہیں بل کہ یہ دراصل اس روحانی تحریک کی ایک شاخ ہے جس کا مقصد ایک خاص نظام کے اندر خدا کے بندوں کے مابین عدل وانصاف کا قیام اور حسنِ سلوک کے ذریعہ رضائے الٰہی کی تحصیل ہے۔ غور فرمایئے اسلامی نظام کی تعبیر کے لیے اشتراکیت کے لفظ میں یہ صلاحیت کہاں کہ وہ اس نظام کا صحیح عنوان بن سکے'' (نقوش ۴۔۵۲۴) جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے کہ تمام سچے ادیان ایک ہی ہیں تبھی تو ''ہوبرٹ'' ابتدائی اصل صورت اسلام کی دیکھنا ضروری نہیں سمجھتا اور اسلام کے براہِ راست مطالعہ سے یہ اخذ کرتا ہے کہ آپ ﷺ مذہبی عقیدہ کی بجائے ایک سماجی مصلح تھے جس کے پیشِ نظر بگڑے ہوئے حالات کی اصلاح کرنا اور بالخصوص حریص دولت مندوں اور پریشان غریبوں کے درمیان فرق واضح ہے۔ یہ تعبیر بھی غلط ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ نبی اور غیر نبی کے فرق کو واضح کیا جائے۔ یہ فرق چار حیثیتوں سے نمایاں ہے۔ ا: مبداء کا فرق۔ ۲: غرض وغایت کا فرق۔ ۳: طریق دعوت کا فرق۔ ۴: علم وعمل کا فرق۔

نبی کے علم کا مبداء ومنبع، ماخذ وسرچشمہ جو کچھ کہو وہ تعلیم ربانی، شرح صدر اور وحی والہام ہوتا ہے اور حکیم اور مصلح کے علم کا ماخذ ومنبع تعلیم انسانی، گزشتہ تجربہ، اشعراء اور قیاس ہوتا ہے۔ یعنی حکیم عقل سے جانتا ہے اور نبی خالق عقل سے۔

۲: اسی طرح ایک حکیم کے تمام اقوال اور جدوجہد کا منشاء اپنی شہرت طلبی، علم کا اظہار، قوم یا ملک کی محبت کی خاطر اس کی اصلاح ہوتا ہے مگر ایک نبی کا مقصد وغرض خدا کے حکم کا اعلان اور خالق کی رضا مندی کے لیے مخلوق کی بھلائی ہوتا ہے۔

۳: طریق دعوت: حکیم ومصلح اپنی دعوت کی عمارت کو تمام تر حکمتوں، مصلحتوں اور علل واسباب کے ستونوں پر کھڑا کرتا ہے مگر نبی اپنی دعوت کو خالق کی اطاعت، محبت اور رضا جوئی پر قائم کرتا ہے۔

۴: علم وعمل: حکیم کہتا ہے لیکن اس کا کرنا اس کے لیے ضروری نہیں۔ نبی جو کہتا ہے وہ کرتا ہے اور اس کو کر کے دکھانا اس کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ وہ صرف جلوت کے منبر پر جلوہ نما نہیں ہوتا بل کہ وہ جلوت وخلوت اور ظاہر وباطن میں یکساں حسنات سے آراستہ اور برائیوں سے پاک ہوتا ہے۔ (سیرت النبی ۴۔۳۷) آپ ﷺ کا تعارف ''محمد رسول اللہ اور وما محمد الا رسول'' ہے (محمد اللہ کے رسول ہیں اور محمد پیغمبر کے سوا نہیں ہیں) اس کے سوا اور کوئی کلمہ موزوں نہیں۔ اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ نبی ورسول کے لیے لیڈر اور ریفارمر وغیرہ کے الفاظ استعمال کرنا جائز نہیں ہیں کیوں کہ نبی اور دیگر الفاظ

جیسے لیڈر اور ریفارمر وغیرہ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔اس زمانہ میں بعض مستشرقین اور بعض نام نہاد اسلام پسند لوگ نبی کو ایک لیڈر اور ریفارمر اور دین کو ایک تحریک سمجھتے ہیں۔نبی کے لیے ایسے الفاظ ہمارے نزدیک نہایت بے ادبی اور توہین کے ہیں اور اسے اپنے مقام سے گرا کر عوامی سطح پر لانا بڑی جسارت ہے۔۔ایک لیڈر اور ریفارمر کی تعلیم وتربیت عام انسانوں کی طرح ہوتی ہے۔ان ہی کی طرح وہ تعلیم وتربیت حاصل کرتا ہے۔ان ہی کی طرح اس کی زندگی میں اتار چڑھاؤ آتے ہیں۔پھر وہ اپنی سعی ومحنت اور اس کے ساتھ اپنی فطری صلاحیت اور دل سوزی کی بناء پر قوم یا ملک میں کوئی سیاسی، اجتماعی، اقتصادی، معاشرتی اور تعلیمی انقلاب برپا کرتا ہے۔کامیاب ہونے پر قوم اسے لیڈر یا ریفارمر تسلیم کر لیتی ہے لیکن انبیاء کی حالت ایسی نہیں ہوتی اول تو ان کی تعلیم وتربیت ہی صفت اجتباء اور اصطفاء کے تحت ہوتی ہے۔۔پھر ان کے ہر قول وفعل میں تضاد نہیں ہوتا۔قدرت اس کی خودنگرانی کرتی ہے۔حتیٰ کہ ان کی غذا' قوت شنوائی، قوت بینائی سب کو صفت عصمت کے تحت معصوم رکھا جاتا ہے۔پھر وہ لیڈر کی طرح قوم کے کہنے پر نبی نہیں بنتے بل کہ وہ رب العزت کی طرف سے اس منصب پر فائز ہوتے ہیں اور خود اعلان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں تمھاری بہتری وبھلائی کے لیے نبی ورسول بنا کر بھیجا ہے۔

۲:لیڈر اور ریفارمر اپنی تحریکوں اور پارٹیوں کو وقتی مصلحتوں کے تحت چلاتے اور اپنی ذہانت وحکمت عملی سے تحریک کے مختلف گوشوں میں ہوا کا رخ دیکھ کر ردوبدل کرتے رہتے ہیں۔نہ ان کے لیے معین حدود وقیود ہوتی ہیں اور نہ ہی پیروی کے لیے ان کے سامنے کوئی اسوہ حسنہ ہوتا ہے۔اس کے برعکس انبیاء کے لیے خود حق تعالیٰ کے مقررہ حدود وقیود ہوتے ہیں۔وہ حق تعالیٰ کی ہدایت کی روشنی میں چلتے ہیں۔ان کی جدوجہد کو یہ افتاد کبھی پیش نہیں آتی کہ وہ اٹھیں تو آندھی کی طرح اور بیٹھ جائیں بلبلے کی طرح۔(خاتم النبین۔۲۰۰)وہ طوفانوں کے زور کے ساتھ بھی چلیں گے تو اس میں نسیم صبح کی خوشگوار روانی اور باد بہاری کی عطر بیزی اور مشک ریزی ہوگی۔بجلیاں آئیں گی لیکن وہ بھی ان کو اپنے راستہ سے روک نہیں سکیں گی وہ زمانے کی ہوا کا رخ دیکھ کر نہیں چلتے بلکہ زمانے کو اپنے مطابق ساتھ لے چلنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کوشش میں آخر وہ کامیاب ہو جاتے ہیں۔لیڈروں کا مقصد کامیابی ہوتا ہے لیکن انبیاء کا مقصد کامیابی کے ساتھ ساتھ اللہ کی رضا ہوتی ہے۔وہ کوئی ایسا کام نہیں کرتے جو اللہ تعالیٰ کے احکامات کے خلاف ہو۔۳:پھر وہ لیڈروں کی طرح گفتار کے غازی نہیں ہوتے بل کہ وہ اپنے کردار کے غازی بھی ہوتے ہیں۔ان کے دل وزبان اور قول وعمل میں مطابقت ہوتی ہے۔مایقولون مالاتفعلون کے خلاف ہوتے ہیں۔ان کی زندگی کی کتاب اور ان کی دعوت کی کتاب میں ذرا برابر فرق نہیں ہوتا۔اس قدر واضح فرق کے بعد نبی کو ریفارمر یا دین کو تحریک کا نام دیں تو وہ لوگ کم علم ہیں۔اس طرح چند سر پھرے یا روشن خیال یا ناآشنا لوگ ''مفکر اسلام'' یا ''داعی اسلام'' کہنے لگیں تو

یہ اسلام کے ساتھ استہزا سے کم نہیں ہے۔(خاتم النبیین ۲۰۲۔۲۰۱)

۴: دوسرے لوگوں سے جو چیز نبی کو ممتاز کرتی ہے وہ وحی الٰہی ہے جس کا نزول اس پر ہوتا ہے تو اس کی حیثیت بالکل بدل جاتی ہے۔ ہاں ہے تو وہ انسان لیکن وحی کا حامل، جس سے وہ بھولی بھٹکی مخلوق کے لیے روشنی کا مینار اور دکھ وغم کا مسیحا بن جاتا ہے۔ ہاں ہے تو وہ انسان اور انسان ہی نظر آتا ہے لیکن اس کا دعویٰ یہ ہوتا ہے کہ ''انما انا قاسم'' (کہ میں اللہ کی رحمتیں اور نعمتیں تقسیم کرنے والا ہوں) یہی بات ''واٹ'' بھی کہتا ہے کہ "In this day and generation He was a social reformer even a reformer in the sphere of morals"

نبی اور رسول ﷺ کے الفاظ سب سے زیادہ بہتر اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ ہیں۔اس سے زیادہ کوئی اور کلمہ بہتر نہیں۔ بدر عالم کہتے ہیں۔''نبی اور رسول کا صحیح مقام سمجھنے کے لیے خود نبی اور رسول کے الفاظ سے زیادہ صحیح لفظ اور کوئی نہیں۔ان الفاظ سے محبت وعظمت کے وہ تمام تقاضے بھی پورے ہوجاتے ہیں جو ایک کامل سے کامل انسان کے لیے فطرت انسانی میں موجزن ہوتے ہیں اور عبد ومعبود کی وہ ساری حدود بھی اس میں محفوظ رہتی ہیں جو کفر وایمان کے درمیان خط فاصل ہوسکتی ہے۔اس لیے خدا تعالیٰ کے سب رسولوں نے اپنا تعارف اسی لفظ رسول کے ذریعہ پیش کیا اور آخر میں قرآن کریم نے سب سے افضل اور سب سے برتر رسول کا تعارف بھی جس لفظ میں پیش کیا وہ بھی رسول ہے۔''

محمد رسول اللہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔محمد اللہ کے رسول ہیں۔

وما محمد الا رسول۔۔۔۔۔۔۔۔اور محمد نہیں سوائے رسول کے ۔۔۔۔۔۔۔۔محمد ﷺ پیغمبر ہونے کے سوا الوہیت کا شائبہ تک نہیں رکھتے۔(ترجمان سنہ ۱۔۴۵۷)

اعتراض نمبر ۱۷۸

پیغمبر اسلام کے فرمان ''دولت سے محبت تمام برائیوں کی جڑ ہے''۔

جواب:اس پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ یہ فرمان واضح طور پر اشتراکی عقیدہ کی اہمیت کا غماض ہے۔ ہنری جارج نے بھی اسی نقطہ نگاہ کو اپنالیا ہے کہ ہماری بلند ترین تہذیب وثقافت میں انسان بخیلی کا شکار ہوکر نہیں مرتا بلکہ اس کی موت کا سبب دوسرے شخص کا نامنصفانہ رویہ ہے

اور وہ اسلامی معاشرے کے نظام حیات کے ان اصولوں سے بے بہرہ ہوتا ہے جو آج سے ۱۴۳۵ سال قبل داعی اسلام نے دیے تھے۔ممتاز مفکرین کو اس کا احساس شدت سے ہورہا ہے کہ نسل انسانی اجتماعی معاشرتی انصاف کی بنیادی اقدار پر عمل پیرا نہیں رہی۔حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ام المومنین حضرت عائشہؓ کے دروازے کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے سنا کہ ام المومنینؓ

قدرے بلند آواز میں پیغمبرؐ سے دل بستگی کا اظہار یوں کر رہی تھیں۔ حضورؐ آپ نے جو کی روٹی کبھی جی بھر کر نہیں کھائی۔ اے اللہ کے نبی آپؐ نے عسرت اور تنگی کو خوشحالی اور امارت پر ترجیح دی۔ آپؐ پاکیزگی اور طہارت کے پیشِ نظر کبھی شب بھر نہیں سوئے‘‘۔ حضرت عائشہؓ سے ایک معتبر حدیث میں ہے کہ جناب پیغمبرؐ نے فرمایا کہ ’’روز قیامت اللہ کے سائے کے نیچے سب سے پہلا شخص وہ ہوگا جس کو جب اللہ کے دیئے مال سے خرچ کرنے کو کہا گیا تو اس نے برضا و رغبت خرچ کیا اور یوں انصاف کیا جیسے وہ خود اس سے فائدہ مند ہو‘‘۔

دولت سے محبت اس وقت برائیوں کی جڑ بنتی ہے جب اسے ناجائز طریقے سے کمایا جائے اور غلط اور ناجائز طریقے سے خرچ کیا جائے۔ اس کے برعکس اگر درست اور صحیح طریقہ سے مال کمایا جائے اور صحیح استعمال میں لایا جائے تو عین سعادت و عبادت ہے مثلاً حضرت عثمانؓ نے دل کھول کر اسلام کی راہ میں خرچ کیا۔ جب سے اسلام قبول کیا کئی غلام آزاد کرتے رہے۔ حضرت صدیقؓ نے جنگ تبوک کے موقعہ پر اپنے گھر کا سارا مال سمیٹ کر بارگاہ نبوی میں پیش کر دیا جس کی مقدار چار ہزار درہم تھی۔ آپ ﷺ نے پوچھا: گھر والوں کے لیے کیا چھوڑ آئے ہو؟ عرض کیا ’’اللہ اور اس کا رسول بس حضرت عمرؓ اپنے مال کا نصف حصہ حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیتے ہیں یہ جائز ضرورتوں پر مال کا استعمال توشہ آخرت اور ذریعہ نجات ہے۔ حضرت عثمانؓ نے ایک قافلہ ملک شام کے لیے تیار کیا ہوا تھا جس میں پالان اور کجاوے سمیت دوسو اونٹ اور ساڑھے انیس کلو چاندی تھی یہ سب کچھ پیش کر دیا اس کے بعد ایک سو اونٹ پالان کجاوے سمیت پیش کیے۔ اس کے بعد ایک ہزار دینار بھی اور ساڑھے پانچ کلو سونا آپ ﷺ کے قدموں میں لا کر ڈھیر کر دیا ۔حتیٰ کہ نقدی کے علاوہ نوسو اونٹ اور ایک سو گھوڑے اللہ کی رضا کے لیے انہوں نے بارگاہ نبوی میں پیش کیے ۔عبدالرحمان بن عوفؓ نے دوسو اوقیہ (ساڑھے انتیس کلو) چاندی لا کر حضور ﷺ کو پیش کی۔ سیدنا عاصمؓ نے نوے وسق (ساڑھے تیرہ ہزار کلو) کھجور پیش کی۔ (خاتم النبین ۔١٧٨)

مسلمان کے دل میں دولت تو کیا کسی شے کی محبت جو اللہ سے غافل کرے، پیدا نہیں ہوتی۔ وہ تو ہمہ وقت بھلائی و خیر خواہی کے کاموں میں اپنی دولت کو صرف کرنے میں برضا و رغبت شاداں و فرحاں رہتا ہے اور اس مژدہ جاں فزا " فاستبقو الخیرات " پر عمل پیرا رہتا ہے۔ مومن جانتا ہے کہ یہ سب کچھ میرے خدا کی دین ہے یہ اسی کا دیا ہوا ہے اگر اس سے خرچ کرتا ہوں تو اسی کے دیئے سے کرتا ہوں اس میں میرا کچھ نہیں ہے یہ تو صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا انعام و فضل ہے جو اس نے عطا کیا ہے ارشاد ربانی ہے " ومما رزقنھم ینفقون " (اور جو ہم نے روزی دی خرچ کرتے ہیں)۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو کچھ کسی کے پاس ہے مثلاً مال و متاع ہو یا علم و عرفان، کسی کا اپنا نہیں بلکہ سب اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے۔ بقول شاعر

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اس طرح اگر اس مالک کی راہ میں خرچ کیا، اسی کے دیئے ہوئے مال سے کیا تو اس میں بندہ مومن کا کوئی کمال نہیں اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اسی میں ہے کہ اس سے محبت کر کے بخل نہ کرے بلکہ ان نعمتوں سے جو لوگ محروم ہیں ان میں بانٹتا چلا جائے۔ کسی وقت ریاست کو ضرورت پڑے تو اس موقعہ پر بھی پس و پیش نہیں کرنی چاہیے بلکہ جس قدر ممکن ہو بڑھ چڑھ کر ملکی مفاد کی خاطر خدمت کرنی چاہیے۔

حضرت ابی کبشہ کے اعاری سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''اس امت کا حال چار آدمیوں کے حال کی طرح ہے ایک وہ آدمی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے علم بھی دیا اور مال بھی دیا ہے وہ اپنے مال میں اپنے علم کے مطابق تصرف کرتا ہے دوسرا وہ آدمی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے علم تو دیا ہے لیکن مال نہیں دیا ہے۔ وہ یہ جذبہ رکھتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اسے مال دیا ہوتا تو وہ بھی اس بھائی کی طرح اپنے مال میں تصرف کرتا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ دونوں آدمی اجر میں برابر ہیں'' تیسرا وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے علم نہیں دیا لیکن مال دیا ہے وہ اپنے مال میں ناجائز تصرف کرتا ہے اور چوتھا آدمی وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے علم بھی نہیں دیا ہے اور مال بھی نہیں دیا ہے وہ یہ جذبہ رکھتا ہے کہ میرے پاس مال ہوتا تو میں بھی اس آدمی کی طرح اس مال کو اڑاتا آپ ﷺ نے فرمایا یہ دونوں گناہ میں برابر ہیں۔ (ترمذی، احمد، ابن ماجہ)

مال اللہ کی نعمت ہے جائز طریقہ سے کمانا اور جائز کاموں میں خرچ کرنا بھلائی کا کام ہے آدمی کو اللہ تعالیٰ مال دے دے تو وہ اسے صرف دنیا بنانے کے لیے استعمال نہ کرے بلکہ اس سے آخرت بھی سنوارے۔ ایسا آدمی خوش قسمت ہے۔ اسی طرح وہ آدمی بھی خوش قسمت ہے جسے مال تو نہیں ملا لیکن اس کی نیت، عزم اور جذبہ یہ ہے کہ اسے مال ملتا تو وہ بھی اسے جائز کاموں میں صرف کر کے آخرت میں بلند درجہ حاصل کرتا فرمان رسول کے مطابق یہ شخص بھی اجر عظیم کا مستحق ہے یہ بھی نیت اور جذبے سے اپنی آخرت بنا رہا ہے لیکن جو مال ناجائز کمایا جائے اور ناجائز کاموں میں لگایا جائے وہ گناہ گار ہے اور اسی طرح کا جذبہ رکھنے والا بھی گنہگار ہے۔ فقیر اور مساکین کے لیے اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ وہ انہیں ان کے اچھے اور پاک جذبات کی بناء پر نیک کاموں میں صرف کرنے والے امراء کے برابر ثواب عطا فرماتا ہے۔

حضرت ابو سعید خدری سے روایت ہے آپ ﷺ نے فرمایا: جس نے رزق حلال کمایا اور سنت پر عمل کیا اور لوگ اس کی طرف سے آفتوں سے بچے رہے وہ جنت میں داخل ہوگا۔ (المستدرک حاکم)

عبد الرحمٰن جامیؒ شیخ کامل کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ چلتے چلتے حضرت عبید اللہ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں وہاں ان کے خانقاہی نظام کو دیکھ کر پریشان ہو جاتے ہیں۔ جامی دیکھتے ہیں کہ ان کے

گھوڑوں کے کھونٹے سونے کے ہیں اس حالت تذبذب میں ان کے ذہن میں ایک فقرہ گردش کرنے لگتا ہے ''نہ مرد آنست کہ دنیا دوست دارد'' (مرد وہ نہیں ہوتا جو دنیا کو دوست رکھتا ہے) بس کیا تھا واپس چلے آتے رات خواب میں دیکھتے ہیں کہ میدان حشر بپا ہے ان سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ فلاں بندے کا حق واپس کریں۔ وہ کہتے ہیں کہ میرے پاس تو کچھ نہیں، خالی ہاتھ ہوں۔ اسے حکم ہوتا ہے کہ اسے دوزخ میں ڈال دو۔ ان پر نہایت پریشانی کا عالم طاری ہے کہ اس اثناء میں حضرت عبید اللہ پاس سے گزرتے ہیں۔ وہ جامی سے پریشانی کا سبب پوچھتے ہیں۔ وہ وجہ بتاتے ہیں کہ فلاں بندے کا حق واپس کرنا ہے اور عالم یہ ہے کہ میں خالی ہاتھ ہوں۔ حضرت عبید اللہ سونے کی ڈلی دیتے ہیں اور فرماتے ہیں یہ لو اور اس بندے کو دے دو حضرت جامی سونے کی ڈلی دیتے ہیں جس سے ان کی جان بخشی ہو جاتی ہے۔ صبح اٹھتے ہیں اور حقیقت نکھر کر سامنے آجاتی ہے فوراً حضرت عبید اللہ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ شیخ عبید اللہ آنے کی وجہ پوچھتے ہیں تو وہ سارا ماجرا سنا دیتے ہیں شیخ فرماتے ہیں کہ کل جو دن میں شعر پڑھ رہے تھے وہ سناؤ، جامی عرض کرتے ہیں کہ وہ نامکمل ہے، دوبارہ حکم پر شعر سناتے ہیں کہ ''نامرد آنست کہ دنیا دوست دارد'' شیخ عبید اللہ فرماتے ہیں آگے یہ فقرہ ملالو ''اگر دارد برائے دوست دارد'' (اگر اللہ کا بندہ دنیا پاس رکھتا ہے تو اپنے دوستوں کے لیے آسانی پیدا کرنے کے لیے رکھتا ہے۔ مکمل شعر یوں ہے ؎

نہ مرد آنست کہ دنیا دوست دارد
اگر دارد برائے دوست دارد

(مرد وہ نہیں ہوتا جو دنیا کو دوست رکھتا ہے۔ اگر بندہ رکھتا ہے تو دوستوں کے لیے)

یہود و نصاریٰ اپنے لیے جائز اور دوسروں کے لیے ناجائز کہتے ہیں۔ دولت حلال طریقے سے کمانا اور جائز کاموں میں صرف کرنا احسن اقدام ہے۔ کسی اپنے یا غیر سے مال و دولت کو ہتھیا لینا، اسلام اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا یہ بھی یاد رہے کہ مال کو جمع کرنا غلط نہیں ہے۔ آپ ﷺ کے دور میں مال دار صحابہ کرام موجود تھے اور حضور ﷺ نے انہیں کبھی حکم نہیں دیا کہ تم سارا مال صدقہ کر دو بلکہ حضرت سعد بن ابی وقاص نے جب اپنا سارا مال راہ خدا میں دینے کا اظہار کیا تو حضور ﷺ نے منع فرمایا البتہ صورت حال بگڑ جائے اور حالات اس کا تقاضہ کرتے ہوں جیسے قحط سالی کا دور دورہ ہو، لوگ فاقوں مر رہے ہوں اور بیت المال میں کوڑی نہ رہے اس وقت زکوۃ کی ادائیگی پر اکتفا نہیں کیا جائے گا بلکہ حاکم وقت ضرورت کے مطابق زیادہ ٹیکس وصول کر سکتا ہے ان حالات میں دولت کا جمع رکھنا بھی جائز نہ ہوگا۔ حضرت ابوہریرہؓ نے روایت کی ہے ''جس شخص کے پاس سونا اور چاندی ہو لیکن وہ اس کا حق ادا نہیں کرتا تو قیامت کے دن اس کی تختیاں بنائی جائیں گی اور انہیں جہنم کی آگ میں اس شخص کے پہلو، پیشانی اور پشت پر داغ لگائے

جائیں گے جب وہ ٹھنڈی ہو جائیں گی انہیں پھر گرم کیا جائے گا۔'' قران مجید سورت توبہ آیت نمبر ۳۴ میں ہے (ترجمہ) ''اے ایمان والو! بے شک اکثر پادری اور راہب کھاتے ہیں لوگوں کے مال ناجائز طریقے سے اور روکتے ہیں (لوگوں کو) راہ خدا سے اور جو لوگ جوڑ کر رکھتے ہیں سونا اور چاندی اور نہیں خرچ کرتے اسے اللہ کی راہ میں تو انہیں خوشخبری سنا دیجئے دردناک عذاب کی۔ جس دن تپایا جائے گا (یہ سونا چاندی) جہنم کی آگ میں پھر داغی جائیں گی اس سے ان کی پیشانیاں اور ان کی پشتیں اور ان کے پہلو کہ یہ ہے جو تم نے جمع کر رکھا تھا اپنے لیے تو چکھو (سزا اس کی) جو تم جمع کیا کرتے تھے۔'' مخالفین کی اپنوں پر نظر نہیں بلکہ دوسروں پر لگی رہتی ہے۔ یہود و نصاریٰ کے علماء اور راہب قانون سازی کے اختیارات کو اپنے ہاتھ میں لے کر حیلوں بہانوں اور خود ساختہ قانون سے لوگوں کا مال لوٹتے ہیں۔

عیسائیت کو قرون وسطیٰ میں جو تسلط اور اقتدار حاصل رہا اس سے انہوں نے جس طرح ناجائز فائدہ اٹھایا اور جس بے دردی سے اپنے عقیدت مندوں کی دولت کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹا اس کی کہانی بڑی دلچسپ اور بڑی دردناک ہے۔ کیتھولک فرقہ کا پوپ جنت کی ٹکٹ قیمتاً فروخت کیا کرتا تھا۔ اس کے نائب اور کارندے گناہ کی بخشش کا پروانہ لکھ دیتے تھے اور خریدار اپنی استطاعت کے مطابق اس کی قیمت ادا کرتا یہ راہب اور پادری بادشاہوں اور امراء کی خاطر حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر دیا کرتے۔ اس طرح منہ مانگی رقم لے کر اپنی تجوریاں بھرتے تھے۔ مقدمات کا فیصلہ رشوت کے بل بوتے پر کرتے تھے اس قسم کی کئی طریقے تھے جن سے دولت کے رسیا مال و دولت جمع کرنے میں شب و روز مصروف رہا کرتے اور جس طرح ناجائز طریقے سے دولت لوٹتے تھے وہ اسی طرح اس کو جمع کرتے اور اشد ضرورت کے ہوتے ہوئے بھی یہ ایک دام خرچ کرنے کے روادار نہ تھے جب کہ دین اسلام نازک حالات میں خواہ قحط سالی ہو لوگ بھوکے مر رہے ہوں یا زلزلہ زدگان ہوں اور بیت المال خالی ہو چکا ہو تو مال کو جمع رکھنا ناجائز ہے۔ اسلام غیر مسلموں سے جزیہ لے کر ان کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت کا بیڑا اٹھاتا ہے اگر حفاظت کرنے میں کوئی رکاوٹ اور دشواری پیش آ جائے تو وہ مسلمان جزیہ انہیں واپس لوٹا دیتے ہیں۔ حضرت خالد بن ولیدؓ نے صلوبا بن نسطونا اور اس کی قوم سے معاہدہ کیا تھا اور اس کے الفاظ یہ تھے۔ (ترجمہ) ''یہ عہد نامہ ہے جو خالد بن ولیدؓ صلوبا بن نسطونا اور اس کی قوم سے کیا۔ میں تم سے اس بات کو معاہدہ کرتا ہوں کہ تم جزیہ ادا کرو اور ہم تمہاری حفاظت کریں گے جب تک ہم تمہاری حفاظت کریں گے ہم جزیہ وصول کرنے کے حق دار ہیں ورنہ نہیں۔'' کوئی یہ کہے کہ یہ کہی گئی بات ہے عملی اظہار کی مثال پیش نظر ہونی چاہیے تھے۔ چلو وہ بھی سنئے! جنگ یرموک سے پہلے جب مسلمانوں نے جنگی مصلحت کے پیش نظر حمص وغیرہ کو خالی کرنا ضروری سمجھا تو اسلامی افواج کے سپہ سالار حضرت ابو عبیدہؓ

نے اپنے تمام ماتحت جرنیلوں کو حکم بھیجا کہ اپنے اپنے علاقے سے جو جزیہ وصول کیا ہے وہ لوگوں کو واپس کر دو اور انہیں بتاؤ کہ تمہاری حفاظت کی ذمہ داری ہم نے قبول کی تھی جس کے عوض تم نے ہمیں یہ رقوم دی تھیں سر دست ہم ان کو نبھانے سے قاصر ہیں اس لیے ہم یہ واپس کر رہے ہیں اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں دشمن پر کامیابی بخشی تو جو معاہدہ ہمارے اور تمہارے درمیان ہو چکا ہے وہ بحال رہے گا اور تم نے اسے نہ توڑا تو ہم اس کی پابندی کریں گے جب وہاں کے باشندوں نے یہ منظر دیکھا تو ان کی آنکھوں میں آنسو چھلک پڑے اور وہ دعائیں مانگنے لگے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں پھر ہمارے پاس واپس لائے اور دشمن پر غلبہ نصیب فرمائے۔ (ضیاء القران۔ا۔۱۹۶)

مذکورہ مفسر بیان سے یہ واضح ہوا کہ دولت کا حلال طریقے سے کمانا اور جائز کاموں میں خرچ کرنا احسن اقدام ہے اس طرح سے دولت سے محبت نیکی کا پیش خیمہ ہے ہاں مگر حرام کی کمائی اور حرام کاموں میں لگائی تو اس کی وعید پیغمبر اسلام ﷺ کے فرمان ''دولت سے محبت تمام برائیوں کی جڑ ہے''۔ کے مطابق ہے اور اس کی کڑی سزا ہے جیسا اوپر ذکر ہوا ہے۔

اعتراض نمبر ۱۷۹

اپنے زمانہ میں محمدؐ ایک سماجی مصلح تھے اور آپؐ کی اصلاحات کا دائرہ اخلاقی پہلو کو بھی محیط تھا۔ اس کا جواب پہلے ہو چکا ہے۔ اس کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ ''مکہ کا مظلوم مبلغ صرف مدینہ کا حکمران ہی نہیں تھا بل کہ اپنے دور کا عظیم انسان بھی تھا۔

جواب: بہ ظاہر ''واٹ'' تعریف کرتا نظر آتا ہے لیکن آنحضرتؐ کی شان اقدس میں زہر چکانی کر رہا ہے۔ آپ نمونہ کامل ہیں اور رہتی دنیا تک آپؐ کا اسوہ کامل ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔ آپ ﷺ قیامت تک آنے والی نسلوں کے رسول ہیں۔ لیکن ''واٹ'' یہ نشتر چلا رہا ہے کہ اگر آج کے ترقی یافتہ دور میں آپؐ کا معیار پرکھا جائے تو کئی کمیاں نظر آتی ہیں۔ جب کہ آپ ﷺ اپنے دور میں عظیم انسان تھے۔ کیا اس مستشرق کو اپنے دور اور آج کل کے ترقی یافتہ دور میں اخلاقی قدروں کے میدان میں بھی کہیں ترقی کی راہیں نظر آتی ہیں جس سے تا حال نسلیں محروم و نا آشنا چلی آ رہی ہیں۔ حتیٰ کہ یورپ اور امریکہ نے ٹیکنالوجی کے شعبہ میں زبردست ترقی کی ہے لیکن یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ اخلاقی میدان میں بھی وہ ترقی کی منازل طے کر چکے ہیں جن سے اب تک نسل انسانی بے خبر تھی خاندانی نظام کا وہ شیرازہ بکھر چکا ہے کہ نہ باپ، نہ بیٹے اور نہ بھائی بہن غرضیکہ کسی رشتے میں عظیم قدر نام کی کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی۔ شرم وحیا ناپید ہو چکی ہیں۔ اخلاص و ایثار کو دولت کی ہوس کی دیمک چاٹ گئی ہے۔ گویا اصولوں کی بجائے اصولوں کی بے ضابطگی اور نا ہم آہنگیوں کا اجارہ ہے۔ یہ اصولوں کی بہ جائے مفادات کا نظام

رائج ہے۔ جھوٹ، جوا، شراب، منافقت، نفرت، فحاشی، زنا اور خود غرضی آزادی کا محور ہیں۔ جھوٹ کو آزادی رائے میں لپیٹ کر سچ دکھانے کا آئے دن بازار گرم ہے۔

آپؐ صرف مدینہ ہی کے حکمران نہیں تھے بل کہ حضورؐ قیامت تک آنے والی نسلوں کے لیے رسول ہیں اور آپ کی زندگی کا نمونہ زندگی کے ہر شعبہ کے لیے کامل نمونہ ہے۔ آپؐ نا صرف اپنے دور میں عظیم انسان تھے بل کہ قیامت تک آنے والے ہر دور کے عظیم انسان ہیں جن کی عظمت کو چار چاند لگ گئے جبھی اللہ تعالیٰ نے ان کی شان میں یہ ارشاد فرمایا" ورفعنا لك ذكرك " اور وللآخرت خير الله من الاولی"۔ عظیم انسان کی عظمت کی ایک بہت بڑی نشانی یہ ہوتی ہے کہ اپنوں کے علاوہ غیر اور دوستوں کے علاوہ دشمن بھی ان کی تعریف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ عظمت کا کمال اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے ہزاروں دشمنوں کے دل جیت لیے۔ ''واٹ'' مخالفت کے باوجود چند اعترافات کرتا ہے۔

ا: محمدؐ نے ایک روحانی اور سماجی نظام قائم کیا جو آج کی ترقی یافتہ دنیا کے چھٹے حصے کی راہنمائی کرتا ہے۔ یہ کام کسی دھوکے باز یا عیاش شخص کا نہیں ہوسکتا۔

۲: آپؐ اپنے مذہبی افعال، جرات، استقلال، غیر جانب داری اور ثابت قدمی جیسی خصوصیات کے ذریعے لوگوں کا اعتماد حاصل کر لیتے۔ آپؐ تشدد کی طرف مائل تھے لیکن آپؐ کی سخاوت اس میں توازن پیدا کر دیتی تھی۔ ان کے علاوہ آپؐ کا حسن اخلاق لوگوں کو آپؐ کا گرویدہ بنا دیتا تھا۔ اوپر آپ ﷺ کی دو صفات خاص طور پر استقلال اور غیر جانبداری کا اعتراف اس کے الزام ''آپ تشدد کی طرف مائل تھے'' کا سختی سے رد کرتا ہے۔ مستقل مزاج اور غیر جانبدار شخص کبھی تشدد کی طرف مائل نہیں ہوتا۔ غیر جانبدار کبھی سچائی کا دامن نہیں چھوڑتا۔ سچا آدمی ہمیشہ سچ کو اپناتا ہے جس سے تشدد کا راستہ اپنانے یا اس کی طرف مائل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ٹارانڈ رائے: اس سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ محمدؐ بہ ذات خود کریم الطبع تھے۔ آپؐ ماضی کی تلخیوں کو فراموش کر سکتے تھے۔ آپؐ کی زندگی میں بعض واقعات ایسے پیش آئے جن سے پتہ چلتا ہے کہ کس طرح آپؐ ماضی کے دشمنوں کے دل اپنی اعلیٰ ظرفی سے جیت لیتے تھے۔ ایسا بہت کم ہوا ہے کہ کسی فاتح نے فتح کے وقت اس تحمل اور ضبط نفس کا مظاہرہ کیا ہو جس بات کا مظاہرہ محمدؐ نے کیا تھا۔

ولیم میور: in all dealings he was fair and up right and as be grew in years his houonrable bearing won for him the title of al.ameem the hathfull ''محمدؐ معاملات میں راست باز اور انصاف پسند تھے۔ جب آپؐ کی عمر میں زیادتی ہوئی تو آپؐ کے شریفانہ طرز عمل کی وجہ سے قوم نے آپؐ کو الامین کا لقب

دیا'' عبداللہ بن ابی آپ ﷺ کا بڑا دشمن تھا اس کے ساتھ آپ ﷺ نے حکیمانہ سلوک کیا۔ مزید کہتا ہے'' عبداللہ بن ابی کی مسلسل مخالفت کے پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ محمدؐ اس کے ساتھ ہمیشہ تحمل اور بردباری سے پیش آئے''۔

مستشرقین آپؐ کی خوبیوں کا اعتراف کر کے آپؐ پر لگائے گئے اخلاقی الزامات کا رد کر رہے ہیں۔ مستشرقین اور آپ ﷺ کے مخالفین کبھی ایک بات پر متفق ہوتے نظر نہیں آتے یہ حضورؐ کی عظمت کا بے مثال اور نا قابل تردید ثبوت ہے۔

اعتراض نمبر ۱۸۰

''وہ ایک موقع پرست' مفاد پرست تھے'' (نعوذ باللہ) اور ان کے ماننے والے غنیمت اور مال کے لالچ میں ان کے ساتھ ہوتے وہ دوسروں کو دھوکا دینا چاہتا بل کہ خود دھوکا میں رہتا تھا۔ "Bryan" (ن۔۱۱۔۵۳۹)

جواب: حقیقت تو یہ ہے جس کی گواہی پرائے اور دشمن دیں۔ اور خاص طور پر'' الفضل ما شھدت بہ الاعداء''۔ (ن۴ص۴۸۱) ''بے شک بزرگی اور فضیلت وہی ہے جس پر دشمن اور اعدائے اسلام گواہی دیں۔ اس سے بڑھ کر اعتراض کا رد کیا ہو سکتا ہے۔ تو "Bryan" کے لیے سر ولیم میور مستشرق اور دیگر کا بیان پیش کرتے ہیں۔ ''سر ولیم میور'' لکھتا ہے کہ '' اہل تصنیف محمد ﷺ کے بارے میں ان کے چال چلن کی عصمت اور ان کے اطوار کی پاکیزگی پر' جو اہل مکہ میں کم یاب تھی' متفق ہیں''۔

ن۔۴۔۴۷۹ر ڈاکٹر شیلے کہتا ہے کہ محمد ﷺ گزشتہ اور موجودہ لوگوں میں سب سے زیادہ افضل اور اکمل تھے۔ آئندہ ان کی مثال کا پیدا ہونا محال اور قطعاً غیر ممکن ہے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ '' ایک یہودی لڑکا آپؐ کی خدمت گزاری کرتا تھا۔ اتفاق سے وہ بیمار پڑ گیا۔ آپؐ اس کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے اور اس کے سرہانے بیٹھ گئے۔ پھر آپؐ نے اس سے اسلام قبول کرنے کے لیے کہا۔ اس نے باپ کی طرف دیکھا جو وہیں اس کے پاس تھا۔ اس نے کہا'' ابو القاسم ﷺ کا کہا مان لے۔ پس وہ مسلمان ہو گیا۔ اس سے آپؐ بہت خوش ہوئے اور وہاں سے نکلے تو فرمانے لگے کہ خدا کا شکر ہے کہ وہ آگ سے بچ گیا''۔ (ن۴ص۱۷۰) صاف ظاہر ہے کہ اس لڑکے کی حالت نزاع میں اسلام لانے سے آپؐ کا کسی قسم کا ذاتی مفاد نہ تھا۔ اور پھر مسرت صرف اور صرف اس کے مشرف بہ اسلام ہونے کے لیے تھی کہ وہ آگ سے بچ گیا۔ آپؐ کی یہ تمام کوشش و سعی احکام خداوندی کی اطاعت پر موقوف ہے۔ ارشاد خداوندی ہے۔ '' ھُوَ الَّذِی بَعَثَ فِی الْاُمِّیِّنَ رَسُولاً مِنھُم یَتلُوا عَلَیھِم اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیھِم وَیُعَلِّمُھُمُ الکِتَابَ وَالحِکمَۃَ وَاِن کَانُوا مِن قَبلُ لَفِی ضَلَالٍ مُّبِینٍ''۔ (سورہ جمعہ۔۲)

ترجمہ: وہی ذات تو ہے جس نے ان پڑھوں میں رسول بھیجا جو انھیں اللہ کی آیات پڑھ کر سناتے ہیں اور انھیں قرآن وحکمت کی تعلیم دیتے ہیں اس سے پہلے یہ لوگ گمراہی صریح میں تھے"۔

۲: محمد حسین ہیکل اپنی کتاب حیات محمد ص ۱۱۵ پر لکھتے ہیں کہ "اس میں شک نہیں کہ خدیجہؓ کے ہاں اکابر قریش نے نکاح کا پیغام بھیجا مگر انھوں نے کسی کی درخواست منظور نہ کی۔ فرماتی ہیں اس لیے درخواست منظور نہ کی کہ ان کی نظر میرے مال پر تھی"۔ اگر وہ عظیم خاتون آپ کو بھی مال پر نظر رکھنے والا سمجھتی تو وہ دوسروں کی طرح ان کی پیش کش بھی قبول نہ کرتیں۔ لیکن معاملہ اس کے برعکس ہے۔ خدیجہ الکبریٰ کے بیان نے ثابت کر دیا کہ وہ موقع پرست اور مفاد پرست نہیں تھے۔ اہل مکہ محمدؐ کو جانتے ہیں کہ وہ الصادق ہیں وہ الامین ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ آپؐ غریبوں، یتیموں، بیواؤں کی دستگیری فرماتے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ آپؐ مظلوم اور بے کس لوگوں کی مدد فرماتے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ آپؐ صلہ رحمی کرتے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ آپؐ نے کسی پر کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا یا کسی کا مال نہیں چھینا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ آپؐ ہر برائی سے پاک ہیں مگر چڑ اور حسد صرف اس بات پر تھی کہ ان کے آباؤ اجداد کے خلاف ان کا لایا ہوا دین تھا۔

قریش نے عتبہ بن ربیعہ کو بہ طور اپنا نمائندہ نبی مکرمؐ کی خدمت میں بھیجا کہ بات چیت اور گفت گو کر کے یہ منوائیں کہ وہ اپنے دین کی تبلیغ سے باز آجائیں اور اس کا پرچار نہ کریں۔ عتبہ نے حاضر ہو کر کہا' چند باتیں کہتا ہوں ان میں سے کوئی ایک بات پسند کرلیں۔ آپؐ نے فرمایا کہو! عتبہ نے کہا' بھائی کے بیٹے اس نئے مذہب سے آپؐ کا مقصود اگر مال و دولت ہے تو ہم آپ کے لیے اتنا مال جمع کر دیتے ہیں کہ آپ ہم سے زیادہ مال دار ہو جائیں گے۔ اگر اس سے ہم پر شرف حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہم آپ کو اپنا سردار بنا لیتے ہیں۔ اگر آپ کو ملک چاہیے تو ہم آپ کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیتے ہیں۔ اگر آپ کے دماغ میں خلل ہے تو اس کا علاج کروانے میں جتنا خرچہ اٹھا ہم برداشت کریں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔ آپؐ نے جواب میں فرمایا: مجھے مال' دولت' حکومت کچھ نہیں چاہیے اور نہ ہی میرے دماغ میں خلل ہے۔ میری حقیقت تمھیں قرآن سے معلوم ہو جائے گی پھر آپؐ نے سورہ حم سجدہ کی تلاوت آیت سجدہ تک فرمائی۔ " حٰمٓ۔ تنزیل مِنَ الرَّحمٰن الرَّحِیمِ ۔کتاب۔فصلت ایاته قرآن عربیا لقوم یعقلون۔بشیراً و نذیراً فاعرض اکثرھم فھم لا یسمعون ۔وقالوا قلوبنا فی اکنة مما تدعونا الیه"۔ پھر اللہ کے حضور سجدہ کیا۔ عتبہ مسحور ہو کر رہ گیا۔ ذرا سوچیے اور سمجھئے کہ اس سے بڑھ کر موقع پرستی کا کون سا بہتر موقعہ ہاتھ آ سکتا ہے؟ مفاد پرستی اور موقع پرستی مفاد پرست لوگوں کا کام ہوتا ہے اور وہ ہستی جو مامور من اللہ ہو اور جس کی ذمہ داری پیغام توحید پہنچانا ہو اور قعر مذلت میں ڈوبی انسانیت کو راہ مستقیم

کی راہ پر چلانا ہو اور ہر قسم کی برائیوں کے جال میں پھنسے ہوؤں کو آزاد کروانا ہو وہ بھلا کیوں کر ایسا ہو سکتا ہے جسے مستشرق موقع پرست اور مفاد پرست کہیں۔ مہمات باطل کا تدارک تھیں۔ قافلوں کی گرفتاری ریاست کی writ کو چیلنج کرنے کے لیے تھی۔ معاہدات امن عامہ قائم کرنے کی غرض سے تھے۔ معاہدات موقع پرستی نہیں معاشرے میں قیام العمل کے اقدامات تھے۔ معاہدات کی خلاف ورزی ملت اسلامیہ نے نہیں، فریق ثانی نے ہی کی۔ اس خلاف ورزی کے نتائج موقع پرستی نہیں، فریق ثانی کی شامت اعمال تھی۔ فتنہ پرور لوگ شہر بدر کیے گئے موقع پرستی نہ تھی ان کی بداعمالیوں کا نتیجہ تھی۔ ریاست سے غداری، معاشرے کے خلاف سازشیں موقع پرستی نہیں بل کہ ان کے جرائم اور سلامتی کے تقاضوں کے تحت سزا تھی۔ سب کچھ چھوڑ کر ہجرت کی۔ یہی مال کے حصول کی خواہش تھی؟ وہ مجبور انسان جو تپتی ریت اور بھاری پتھر سینہ پر رکھ دیتے پھر بھی احد احد کہتا ہے کس غنیمت اور کشور کشائی کے خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ انسان جس نے غلام خرید کر آزاد کیے کس سلطنت کا آرزومند تھا۔ وہ انسان جن کا جسم اونٹوں سے چیرا جاتا ہے کون سی دنیاوی لذتوں کے پیچھے یہ دکھ جھیل رہا تھا۔ یہ بھی ذہن نشین رہے کہ جنگیں کفار و مشرکین نے مسلط کی تھیں۔ سازشیں اور معاہدات شکنی یہود نے کی۔ ان کے دفاع میں جلاوطنی یا اور کوئی سزا دی گئی تو وہ صرف اور صرف ان مذموم حرکات کے سبب تھی۔ یعنی یہ سب کچھ ان کے کیے دھرے کا نتیجہ تھا۔ یہ سزائیں قانون کے تقاضوں اور امن وامان اور سلامتی کے لیے ضروری اور معقول تھیں۔ کسی صورت میں بھی کوئی متمدن معاشرہ اسے ناقابل معافی جرم نہیں گردانتا۔ نیز سزا ان کے اپنے اپنے جرائم کے سبب تھی جو برمحل تھی۔ ان کو جلاوطن کرنے، سزائیں دینے میں مفاد پرستی کا شائبہ تک نہ تھا۔ انھیں مسلمانوں نے تو نہیں کہا تھا کہ معاہدے توڑ کر writ کو چیلنج کر کے ان پر چڑھ دوڑنے کے لیے ہمہ وقت تیاری میں رہو۔ یہ تمام کارروائیاں صرف مسلمانوں کو مٹانے کے لیے تھیں تو موقع پرستی اور مفاد پرستی تو ان کے پلے اور گھٹی میں پڑی تھی جسے خواہ مخواہ رہنمائے دوجہاں ﷺ کے کھاتے میں ڈالتے ہیں۔ عقل مند اور ذی فہم کے لیے فیصلہ کرنا آسان ہے کہ موقع پرست اور مفاد پرست کون تھا؟

قریش نے مسلمانوں سے بائیکاٹ کا منصوبہ بنایا اور قریش مکہ نے ایک ہی شہر میں بسنے والوں سے لین دین، تجارت و کاروبار، حیات و ممات، شادی و بیاہ حتیٰ کہ سلام دعا تک کا مقاطعہ کر دیا۔ حرام مہینوں میں ڈاکہ، قتل و غارت اور ظلم و تشدد رک جاتا تھا لیکن مسلمانوں پر ظلم کا شکنجہ زیادہ کس دیا۔ ''طلح'' کے پتے کھا کر گزارہ کرتے تھے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص کا بیان ہے کہ ایک رات سوکھا چمڑا ہاتھ آ گیا۔ میں نے اس کو پانی میں دھویا پھر آگ پر بھونا اور پانی میں ملا کر کھایا۔ (شبلی۔۱۰۳) یہ کس موقع پرستی اور مفاد پرستی کا حصول تھا؟ رشتے ناطوں کی بندش، تجارتی کاروبار کا ٹھپ ہو جانا اور بھوک پیاس کی

صعوبتیں کون سے مال و دولت اور عزت و جاہ و جلال کے لیے برداشت کی جا رہی تھیں؟ عمر بھر کے ایک ساتھ رہنے والے مفاد پرست اور موقع پرست سمجھ کر آپؐ کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے اور پل بھر چین سے نہیں بیٹھتے تھے۔ ہر وقت یہی خیال کہ کس طرح ان مسلمانوں کو نیست و نابود کر دیں۔ آئیں میں بتاتا ہوں کہ وہ موقع پرستی اور مفاد پرستی کیا تھی؟ وہ مفاد پرستی اور موقع پرستی صرف یہ تھی کہ ایک خدا کو مانو اور شرک سے باز آ جاؤ۔ زمانہ جاہلیت کی لغو اور باطل رسومات کو ترک کر دو۔ بہ جز اس پیغام توحید کی اشاعت کی مفاد پرستی کے اور کوئی لالچ یا کوئی دنیاوی غرض نہ تھی۔ اگر موقع پرستی اور مفاد پرستی ہوتی تو حج کے دنوں میں گھاٹی سے نکل کر اپنے مقاطعہ کے خاتمہ کے لیے آئے ہوئے لوگوں سے بات چیت کرتے یا مکہ والوں سے ہی بائیکاٹ کا خاتمہ چاہتے۔ لیکن آپ ﷺ تو گھاٹی سے نکل کر حج پر آنے والے لوگوں کو خدا پر ایمان لانے کی دعوت دیتے ہیں۔ غضب خدا کا کہ اس کے جواب میں ابولہب آپؐ کے ساتھ ساتھ پھرتا اور کہتا ہے دیکھو! یہ دیوانہ ہے (نعوذ باللہ) اس کی بات نہ سنو۔ جو سنے گا اور مانے گا تباہ ہو جائے گا۔ (محمد۔ ۱۵۰)

سفرِ طائف میں آپؐ پر ظلم و تشدد کی انتہا کر دی گئی۔ خون سے نعلین مبارک بھر گئے۔ یہ تکالیف کس موقع پرستی اور مفاد پرستی کا پیش خیمہ تھیں؟ کس قسم کے نفع کے حصول کی آرزو تھی؟ فقط یہی نا کہ اللہ پر ایمان لائیں۔ برے اور قبیح افعال سے باز آئیں۔

کون سا ظلم جو روا نہ رکھا: اس ہستی مقدس کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے دروازہ پر کھڑے تلواریں لیے پہرہ دے رہے ہیں کہ کب نکلتا ہے؟ انہیں غلط فہمی ہوئی اور سمجھے کہ آپ ﷺ اپنے خانہ مبارک میں موجود ہیں جبکہ آپ ﷺ نے اپنے گھر مبارک کو دوپہر سے ہی خالی کر دیا تھا اور وہ ساری رات آپ ﷺ کے گھر سے باہر آنے کے منتظر رہے لیکن ناکام ہوئے اور یہ وہ ہستی جو خیر خواہی کا پیکر ہے۔ جس نے کسی کم زور اور نہتے پر ہاتھ نہیں اٹھایا حتیٰ کہ ہتھیار سے لیس ہو کر بھی پہل نہیں کی۔ ترپن سال تک مکہ میں رہ کر ظلم و ستم کا نشانہ بنتا رہا۔ ہر دکھ سہا مگر جواباً کوئی زیادتی نہ کی۔ بل کہ وہ تو ہر زیادتی اور ناانصافی کو روک رہا ہے۔ لڑکیوں کو زندہ درگور نہ کرو، عورت کو جینے کا حق دو، ذہن کو نشّہ سے آلودہ نہ کرو کہ حق اور ناحق کی تمیز اٹھ جائے، جوا سے باز آ جاؤ کہ جوا کسی کا نہ ہوا اور یہ شیطانی عمل ہے اور جوا میں عزت تک داؤ پر لگ جاتی ہے۔ ایسے مسیحا اور ہمدرد اعظم ﷺ کو کفار مکہ ہجرت کر کے مدینہ جانے دینا بھی نہیں چاہتے۔ ایک ایک فرد خون کا پیاسا ہے۔ بارہ آدمی ننگی تلواریں لیے آپؐ کے گھر کا محاصرہ کیے ہوئے ہیں لیکن آپؐ کی زبان سے ایک کلمہ ایک لفظ بددعا کا نہیں نکلتا ہے۔ کس کے مفاد پر اس مسیحا نے ڈاکہ ڈالا تھا؟ کہ وہ تلواریں سونتے دروازہ پر منتظر ہیں؟ کس غریب کا حق چھین کر امیر کی جھولی میں ڈالا تھا یا خود کسی امیر کے حقوق کو غصب کیا تھا؟ تو پھر کون سا جرم تھا جس کی پاداش میں آپؐ کو ٹھکانے لگانے کے درپے

تھے۔ کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا اور ہر موقع پر فائدہ اٹھایا، ہر موقع پر خود مفاد حاصل کیا، دوسروں کو محروم کیا، کوئی تو بتادے کہ وہ کون سا موقع تھا؟ تاریخی حقائق شہادت دیتے ہیں کہ وہ مسیحا تو ہر ایک کا خیال رکھنے والا، اپنے پرائے کا غم کھانے والا ہے۔ ایسے الزامات سے ان کی ذات مبرا و منزہ ہے۔ وہ تو صرف اور صرف کلمۃ الحق کا دعوے دار ہے۔ پہلے انبیاء کی طرح جو حق کی تعلیم دیتے تھے وہ انھیں اپنی بستیوں سے نکال دیتے تھے یا قتل کر دیتے تھے۔ اسی طرح حق کے مخالف قریش کے سرداروں نے بھی آپؐ کو مکہ میں رہنے نہ دیا۔ نوحؑ کی طرح ہجرت کرنا پڑی۔ حضرت صالحؑ کی قوم نے صرف اونٹنی کو ہلاک کیا تھا لیکن ادھر قریش مکہ اللہ کے حبیب نبی مکرمؐ کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت لوطؑ نے اپنی قوم کو ہم جنس پرستی کے فعل بد سے روکا تو انھوں نے کہا کہ انھیں بستی سے نکال دو لیکن اس طرف طاہر، صادق اور امین پر مشرکین تلواریں سونت کر مستور کھڑے ہیں۔ شہر مکہ سے جانے نہیں دے رہے بل کہ ٹھکانے لگانے کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔ اللہ نے توفیق بخشی اور آپؐ بہ حفاظت گھر سے چل پڑے۔ پھر تعاقب میں رات دن ایک کر دیا۔ ہر ایک نے اس کام میں برابر کا حصہ ڈالا۔ سو سرخ اونٹوں کا انعام رکھا گیا۔ یہ کس موقع پرستی اور مفاد پرستی کا نتیجہ تھا؟ موقع پرست ایک غیر مسلم کی رائے ہے کہ "حقیقت بہ ہر حال حقیقت ہے اگر بغض و عناد کی پٹی آنکھوں پر سے اتار دی جائے تو پیغمبرؐ اسلام کا نورانی چہرہ ان تمام داغ دھبوں سے پاک صاف نظر آئے گا جو بتلائے جاتے ہیں۔۔ سوامی برج نارائن سنیاسی (ن۔۴۔۴۸۷)

تاریخ شاہد ہے کہ موقع پرست اور مفاد پرست لوگوں کا ساتھ ابتداء میں لوگ دیتے ہیں لیکن جلد ہی وہ مفاد پرست اور موقع پرست کو چھوڑ دیتے ہیں کیوں کہ جان جاتے ہیں کہ وہ مفاد پرست اور غرض کا بندہ ہے دوسروں کی اسے کوئی فکر نہیں۔ اپنے فائدے کا کوئی موقع وہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ جب اس کے ساتھی سمجھتے ہیں لالچی ہے، حریص ہے، ناانصاف ہے تو اسے خیر باد کہہ دیتے ہیں مگر ادھر صورت حال ہی مختلف ہے۔ جس نے دامن پکڑا وہ دامن گیر رہا۔ جو ان کا غلام بنا اسے آزاد ہونے کی آرزو نہ رہی یعنی جو اس محبوب کے لائے ہوئے دین کی زلف کا اسیر ہوا وہ اسیر ہی رہا بل کہ گروہ کے گروہ اسلام کی کاکل پیچاں کے اسیر ہوتے چلے گئے۔

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے
سب اسی زلف کے اسیر ہوئے

حبشہ کا نجاشی بادشاہ، عمان کا ملک جیفر، دومۃ الجندل کا شاعر اکیدر آپ کے پیغام پر لبیک کہتے ہیں۔ نجد کے وحشی، تہامہ کے بدو اور یمن کے مسکین ایک ہی صف میں شامل ہونے پر نازاں ہیں۔ عبد اللہ بن سلام یہودیت، ورقہ بن نوفل عیسائیت اور عثمان بن طلحہ ابراہمیت کو چھوڑ کر اسلام کے حامی اور

خادم بننے پر فخر کرتے ہیں۔ یہودیوں کا زرخرید غلام سلمان فارسی اہلِ بیت میں سے ہے، کا درجہ حاصل کرتا ہے۔ خالد بن ولید جس نے جنگ احد میں مسلمانوں کو کافی نقصان پہنچایا تھا۔ وہ لات وعزیٰ کے بت اپنے ہاتھوں سے گراتا ہے۔ قریش کا سفیر عروہ بن مسعود مدینہ میں آ کر اسلام قبول کر لیتا ہے۔ سہیل بن عمرو معاہدہ حدیبیہ میں قریش کا نمائندہ تھا اور اسم محمد ﷺ کے ساتھ لفظ رسول اللہ ﷺ لکھنے کا انکاری تھا۔ وفات نبوی کے بعد بیت اللہ میں کھڑے ہو کر اسلام کی صداقت کا دم بھرتا ہے۔ وہ عمر جو تلوار لیے حضورؐ کا سر قلم کرنے نکلا تھا وہی تلوار وفات نبوی پر لہرا رہی ہے کہ اس کا سر تن سے جدا کر دوں گا جس نے کہا کہ نبی وصال کر گئے ہیں۔ اسلام کا بدترین دشمن سات سال تک حضورؐ کے سامنے فوجیں لا کر مقابلہ کرتا رہا وہی ابوسفیان جنگ حنین میں تن تنہا رکاب نبوی تھامے ہوئے تھا۔ طفیل دوسی جو کانوں میں روئی ٹھونستا تھا کہ محمدؐ کی آواز کانوں میں نہ پہنچے وہی طفیل گھر گھر پھر پھر کے محمد ﷺ کی آواز پہنچاتا نظر آتا ہے۔ بریدہ بن الحصیب اور سراقہ بن مالک بن جعشم ہجرت کے موقع پر انعام کے لالچ میں آپؐ کے تعاقب میں نکلا، کرنا خدا کا کہ بریدہ نبی مکرم ﷺ کے سفر ہجرت کا علم بردار بن جاتا ہے اور سراقہ کو کسریٰ کے کنگن پہنائے جانے کی بشارت ملتی ہے۔ آخر وہ بھی اسلام میں داخل ہو گیا۔ کیا یہ سب کے سب مخالفین آپؐ کی دعوت وتعلیم سے فیض یاب نہیں ہوئے اور سوائے دعوت توحید کے کہیں کیا حصولِ مفاد کا ذرا برابر شبہ پڑتا ہے یا انھوں نے کہا ہو کہ آپؐ موقع پرست اور مفاد پرست تھے؟ تو انھیں موقع پرست اور مفاد پرست کہنا کسی طور جائز ومناسب نہیں ہے بل کہ ناانصافی اور زیادتی ہے۔

آپؐ اور آپؐ کے ساتھی ہجرت کر کے مدینہ چلے آتے ہیں۔ مال ودولت، مکان، دکان، عزیز واقارب الغرض سب کچھ مکہ چھوڑ آتے ہیں۔ جب مکہ فتح ہوتا ہے کفار ومشرکین مغلوب ہو جاتے ہیں۔ آپؐ "لا تثریب علیکم الیوم یغفر الله لکم وھو ارحم الرحمین"۔ (۱۲-۹۲) فرما کر عام معافی کا اعلان فرماتے ہیں۔ سب کو معاف کر دیتے ہیں۔ کسی سے بدلہ نہیں لیتے اور نہ ہی اپنی جائیداد، مال اور مکان وغیرہ کی واپسی کا مطالبہ کرتے ہیں بل کہ وہ انھیں کے پاس رہے جنھوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ موقع پرستی اور مفاد پرستی کا بہترین موقعہ تھا۔ اب ان سے ہر چیز واپس لے لیتے بل کہ جیسا انھوں نے کیا تھا کہ آپؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کی ہر چیز ہتھیا بیٹھے تھے، قریش کی بھی ہر چیز جو ان کی ملکیت تھی، چھین کر محروم کر دیا جاتا۔ لیکن رحمت اللعالمین کی رحمت نے گوارا نہ کیا۔ ان سب کو معاف کر دیا۔ ختم المرسلین کے نور اور ہدایت نے تمام رنگ ونسل کے امتیازات کا خاتمہ کر کے واحد امت کے رنگ میں رنگ دیا۔ کیا اسی کا نام موقع پرستی اور مفاد پرستی ہے؟

ایک دفعہ پھر "BRYAN" مستشرقین کی آراء کو بہ طور رد پیش کرتا ہے۔

ہم نہیں جانتے کہ محمد ﷺ اپنی زندگی میں کبھی کسی رذیل حرکت کے مرتکب ہوئے ہوں البتہ نہایت اعلیٰ صفات کے مالک تھے۔

(مسٹر جان آرکسن۔ ن ۴ ص ۴۸۹) میں نیک اور فاضل ''سپین ہیمس'' کی جرات کی تحسین کیے بغیر نہیں رہ سکتا جس نے تسلیم کیا کہ محمد ﷺ کامل طور پر فطری قابلیتوں سے آراستہ تھے۔ شکل میں نہایت خوب صورت، فہم اور دوررس عقل والے، پسندیدہ وخوش اطوار، غربا پرور، ہر ایک سے متواضع، دشمنوں کے مقابلہ میں صاحب استقلال وشجاعت سب سے بڑھ کر یہ کہ خدائے تعالیٰ کے نام نہایت ادب واحترام سے لینے والے تھے۔ جھوٹی قسم کھانے والوں، زانیوں، سفاکوں، جھوٹی تہمت لگانے والوں، فضول خرچی کرنے والوں، لالچیوں اور جھوٹی گواہی دینے والوں کے خلاف نہایت سخت تھے۔ بردباری، صدقہ وخیرات، رحم و کرم، شکر گزاری، والدین اور بزرگوں کی تعظیم کی نہایت تاکید کرنے والے اور خدا کی حمد وتعریف میں نہایت کثرت سے مشغول رہنے والے تھے۔ (انگریزی ترجمہ قرآن بہ عنوان ٹو دی ریڈر مصنفہ)

۳: آپؐ فطرتاً امی اور سچے تھے۔ آپؐ کو حق کے علاوہ کچھ پسند نہ تھا۔ وہ نہ تو حریص تھے۔ نہ متکبر، نہ متعصب اور نہ ہوائے نفس کے پیرو، بلکہ نہایت بردبار، نرم دل اور بہت صاف شفاف کردار کے مالک تھے۔ عرب جو بدنظمی اور پراگندگی کے عادی تھے ان سب کو ایک دائرہ میں لا کر ایک سلسلے میں منضبط کر دیا۔ یہ محمد ﷺ کا ہی معجزہ تھا۔ (مصنفہ مسٹر میڈ ورنگھم، ن۔۴۔۴۹)

مذکورہ بیان میں ''حریص، ہوائے نفس کے پیرو'' کے الفاظ ہیں۔ جن سے مذکور امیڈ ورنگھم انکار کرتا ہے اور آپؐ کی ذات کو سچا اور اعلیٰ کریکٹر والا کہتا ہے۔ "BRYAN" اس کا جواب کیا دے گا؟ کوئی مسلمان ایسا کہتا تو الزام لگا سکتا تھا۔ اب اس کا اپنا ہم پلہ عالم مستشرق حقیقت نکھار رہا ہے۔ گویا الزام لگانے میں ''برائن'' کو لینے کے دینے پڑ گئے۔

''سر فلیکڈ'' کا بیان بھی پڑھ لیجئے: ''محمد ﷺ کی عقل ان عظیم ترین عقلوں سے تھی جن کا وجود دنیا میں عنقا کا حکم رکھتا ہے۔ وہ معاملہ کی تہہ تک پہلی ہی نظر میں پہنچ جایا کرتے تھے۔ اپنے خاص معاملات میں نہایت ہی ایثار اور انصاف سے کام لیتے۔ دوست و دشمن، امیر وغریب، قوی وضعیف ہر ایک کے ساتھ عدل وانصاف ومساوات کا سلوک کرتے''۔

''ڈاکٹر شیلے'': ''محمد ﷺ گزشتہ اور موجودہ لوگوں میں سب سے اکمل اور افضل تھے اور آئندہ ان کی مثال کا پیدا ہونا محال اور قطعاً غیر ممکن ہے''۔ یہ خوش نصیبی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہم پر فضل واحسان ہے کہ ہمیں محمد عربی ﷺ نبی ورسول عطا فرمائے ان کے دامن سے وابستہ ہو کر ماسوا کی ساری چیزیں آڑے نہیں آتیں۔ جبھی تو مے خانہ غیر سے مے کے لیے کاسہ گدائی پیش کروں میری توبہ!

کاسئہ غیر کو اور منہ سے لگاؤں توبہ
شان پہچانتا ہوں یار کے پیمانے کی

اعتراض نمبر ۱۸۱

جین براڈ (GENBARD) کہتا ہے کہ محمد ﷺ ایک حیوان تھے اور صرف حیوانی (جنگلی) زبان عربی جانتے تھے"۔ (۵۰۵ ن ۱۱/) جین براڈ ایک مشہور مناظرہ باز تھا۔ اس کو سب سے بڑا اعتراض اس بات پر تھا کہ حضورؐ نے قرآن کو عربی زبان میں کیوں لکھا؟ وہ خود اپنے سے سوال کرتا ہے کہ قرآن کو عبرانی، یونانی اور لاطینی جیسی خاص مہذب زبانوں میں کیوں نہ لکھا گیا؟ پھر خود ہی کہتا ہے کہ اس لیے کہ" محمد (خاکم بدہن) خود ایک حیوان تھے اور صرف ایک ہی حیوانی (وحشیانہ۔ جنگلی) زبان (عربی) جانتے تھے جو ان کے مخصوص وحشیانہ ماحول سے عین مطابقت رکھتی تھی۔ (نعوذ باللہ)

جواب: یہ تمام مستشرقین کا ایکا ہے کہ نبی مکرم ﷺ کی ذات کو تنقید کا نشانہ بنایا جائے لیکن بعض نے الزامات تو دھرے جوان کی گھٹی میں پڑے ہیں لیکن اس کے ساتھ ایسی غیر مہذب، ناشائستہ اور اخلاق سے گری زبان بھی استعمال کی جسے بیان کرنے سے سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ جیسے اوپر کے الزامات سے ظاہر ہے۔ نیز یہ الزامات محض تک بندی ہیں، مدلل نہیں۔ نیز مآخذ کا انکار کرتا ہے۔ تاریخی حقائق کو مسخ کر دیتا ہے۔ گویا

یہ بات لازمی تھی سو کہنا پڑی مجھے
جب بھی کرے وہ بات مدلل کیا کرے

یہ تو ان کے بس میں نہیں کہ حقیقت کا چہرہ دیکھا جائے۔ انھیں تو غرض اس بات سے ہے کہ آخرالزمان نبی ﷺ کے خلاف زہر چکانی کریں۔ چلو ان کے اپنوں کی گواہی سے الزام تراشی کا جواب لیتے ہیں۔

"آپؐ کی شکل شاہانہ تھی۔ خدو خال با قاعدہ اور دل پسند تھے۔ آنکھیں سیاہ اور منور تھیں۔ بتیسی ذرا اٹھی ہوئی۔ دہن خوب صورت تھا۔ دانت موتی کی طرح چمکتے تھے۔ رخسار سرخ تھے۔ آپ ﷺ کی صحت نہایت اچھی تھی۔ آپؐ کا تبسم دلآویز اور شیریں و دلکش تھا"۔ (جان ڈیون پورٹ۔ ن۔ ۴۔ ۵۳۰)

اور سنیئے!

"ایڈورڈ گبن" تاریخ روم میں لکھتے ہیں "آنحضرت ﷺ حسن میں شہرہ آفاق تھے اور یہ نعمت صرف انھی کو بری معلوم ہوتی ہے جن کو اللہ کی طرف سے عطا نہیں ہوئی۔ پیش تر اس کے کہ آپ ﷺ کوئی بات فرمائیں آپ ﷺ کسی خاص آدمی یا گروہ کو متوجہ کر لیا کرتے۔ لوگ آنحضرتؐ کی شکل شاہانہ، نورانی آنکھیں، خوش نما تبسم، بکھری ہوئی داڑھی یعنی گھنی اور ایسا چہرہ جو دل کے ہر ایک جذبہ کی تصویر کھینچ دے اور ایسے حرکات و

سکنات جو زبان کا کام دیں دیکھ دیکھ کر تعریف کیا کرتے تھے"۔ اگر ایک عیسائی مورخ آنحضرتؐ کے حسن و جمال کو اس انداز اور پیرایہ میں لکھتا ہے تو پھر مسلمان شاعر کی زبان سے یہ ادا ہو جائے تو بجا ہے۔

حسن یوسف، دم عیسیٰ ، ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری
تو بدیں جمال و خوبی سر طور گر خرامی
ارنی بگوید آنکس کہ بگفت من قرآنی

سیدنا عبداللہ بن سلام یہود کے ایک بہت بڑے عالم تھے۔ ان کا اصل نام حصین تھا۔ اسلام لانے کے بعد نبی مکرم ﷺ نے آپ کا نام عبداللہ رکھا اور اسی نام سے مشہور ہوئے۔ انھوں نے جب رسول اللہ ﷺ کے مدینہ تشریف لانے کی خبر سنی تو وہ فرماتے ہیں کہ خبر سنتے ہی میں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپؐ کے چہرہ انور کو دیکھتے ہی پہچان گیا کہ "یہ چہرہ جھوٹے شخص کا چہرہ نہیں"۔ (خاتم النبیین ۴۵۴)

حضرت حسانؓ فرماتے ہیں۔

وَاَحسَنُ مِنکَ لَم تَرَ قَطُّ عَینِی — آپؐ سے زیادہ حسین میری آنکھ نے کبھی نہیں دیکھا
وَاَجمَلُ مِنکَ لَم تَلِدِ النِّسَآءِ — اور آپؐ سے زیادہ حسین کسی ماں نے جنا ہی نہیں

"ولیم میور" کہتا ہے۔"اہل تصنیف محمد (ﷺ) کے بارے میں ان کے چال چلن کی عصمت اور ان کے اطوار کی پاکیزگی پر جو اہل مکہ میں کم یاب تھی، متفق ہیں"۔ (سید الوریٰ)

اس ناشائستہ، نامعقول، غیر مہذب الزام کو دہراتے نہیں بل کہ یہ کہتے ہیں کہ اب الزام کے دوسرے حصہ کو لیتے ہیں اور حسب سابق ان کے گھر کی شہادت پیش کرتے ہیں۔ سر ولیم میور لکھتا ہے "محمد ﷺ کی جسمانی حالت بہت اچھی تھی۔ ان کے اخلاق آزاد اور مستغنی عن الغیر تھے۔ جن کی وجہ سے ان کا پانچ سال تک بنی اسد میں بسر کرنا تھا اور اسی وجہ سے ان کی تقریر جزیرہ نمائے عرب کی خوشنما زبان کا نمونہ تھی جب کہ ان کی فصاحت و بلاغت ان کی کامیابی میں بڑا کام دینے لگی تھی تو ایک خالص زبان اور ایک دل فریب گفت گو سے عظیم مرتبت ہوا۔ اے کاش یہ بات بھی ولیم میور کو معلوم ہو جاتی وہ یہ کہ جب ہم آپؐ کے خطبات، خطوط اور تقریر کو دیکھتے ہیں تو واضح پتہ چل جاتا ہے کہ آپؐ کی زبان اور قرآن کی زبان ایک نہیں ہے۔ جب کہ دونوں کلام ایک ہی شخص کی زبان سے صادر ہوئے ہیں، اس کی وجہ صرف اور صرف یہی ہے کہ ایک کلام انسانی ہے دوسرا ربانی۔ مگر مستشرقین اس قاطع دلیل کے باوجود قرآن کریم کو آپؐ کی تصنیف مانتے ہیں۔ (ن۔۔۴۔۵۳)

عرب میں یہ رسم تھی کہ وہ اپنے بچوں کو دودھ پلانے کے لیے شہر سے باہر دیہات میں بھیج دیتے

تھے۔اس سے غرض یہ تھی کہ بچے حسن کلام،روح کی بالیدگی اور جسمانی لحاظ سے مضبوط ہوں کیوں کہ بہ قول لنگس مارٹن ''حسن کلام ایسی خوبی تھی جس کو سب عرب والدین اپنے بچوں میں دیکھنے کے خواہش مند تھے۔کسی آدمی کی قدر و قیمت کا پیمانہ اس کی فصاحت و بلاغت لسان ہوتی تھی۔صحرا میں جانے سے پھیپھڑوں کے لیے تازہ ہوا،زبان کے واسطے خالص عربی اور روح کی خاطر آزادی ملتی تھی''۔(حیات سرور۷۰)سیدنا حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے''معد بن عدنان کی ہیت کو اختیار کرو یعنی عجم کا لباس اور ان کی ہیئت اختیار نہ کرو اور شدائد و مصائب میں صبر کرو اور موٹا پہنو یعنی نعم اور عیش و عشرت میں نہ پڑو''۔(خاتم النبیین۔ص۱۲۴)فصاحت و بلاغت کے جواہر شہر سے باہر کی ہوا فضا میں پیدا ہوتے ہیں۔حتیٰ کہ بنوامیہ نے جب پایہ تخت دمشق بنایا اور قیصر و کسریٰ کی ہم سری کی پھر بھی ان کے بچے بدوی قبائل کے گھر پرورش پاتے تھے۔ولید بن ملک دیہات میں پروان نہ چڑھ سکا اور حرم شاہی ہی میں اس کی پرورش ہوئی۔شاہی محل میں پلنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ خاندان بنوامیہ میں صرف یہی فرد واحد تھا جو عربی صحیح نہیں بول سکتا تھا۔(ش ص۱۱۴)فصاحت و بلاغت کے جوہر پیدا ہونے کے بارے میں ایک حدیث پاک میں آتا ہے۔اسے امام سہیلیؒ نے نقل کیا ہے کہ''آنحضرتؐ فرماتے تھے کہ میں اس لیے فصیح ہوں کہ خاندان بنی سعد میں پلا ہوں''۔(ش۱۱۴)طبقات ابن سعد میں ہے کہ رسول اللہ فرمایا کرتے تھے'' میں تم سب سے فصیح تر ہوں کیوں کہ میں قریش کے خاندان سے ہوں اور میری زبان بنی سعد کی زبان ہے(بنی سعد بنو ہوازن کے قبیلہ ہی کو کہتے ہیں) ابن ہشام میں ہے کہ آپؐ فرمایا کرتے تھے''میں تم سب سے زیادہ خالص عرب ہوں۔میں قریش ہوں اور میں نے بنی سعد بن بکر کے قبیلہ میں دودھ پی کر پرورش پائی ہے۔(ابن ہشام ص۱۷/۱۸۷)

''جمال ارجل فصاحۃ لسانہ — زبان کی فصاحت انسان کی زینت ہے

''الجمال صواب المتعال الفعال — صحیح اور سچ بولنا انسان کا جمال اور اچھے اعمال اس کا کمال

(روح البیان ج۔۵۔۹۴۵)

آپ جوامع الکلم سے متصف ہیں۔آپ کا کلام گوش بنی نوع انسان تک پہنچے تو اسے یقین ہو جائے کہ بے شک یہ کلام' کلام نبوت ہے۔کوزہ میں دریا بند کرنے کی مثال کا جوامع الکلم سے کیا جوڑ اور مقابلہ،تاہم مختصر،سادہ،صاف،ہدایت کا مصدر،بر صدق معانی کا خزینہ،نجات و ہدایت کا منبع،اخلاق و تہذیب کا سرچشمہ آپ کا کلام ہے۔چند نمونے ملاحظہ فرمائیں۔

''اِیَّاکُم وَالظَّنَّ فَاِنَّ الظَّنَّ اَکذَبُ الحَدِیث'' — خبردار بدگمانی کو عادت نہ بناؤ' بدگمانی تو بالکل جھوٹی بات ہے

"تَرکُ الشَّرِ صَدَقَہ" — شر چھوڑ دینا صدقہ ہے

"اَلجَنَّۃُ تَحتَ اَقدَامِ الاُمَّہَاتِ" — جنت ماؤں کے قدموں تلے ہے

"خَیرُ النَّاسِ یَنفَعُہم لِلنَّاسِ" — بہترین وہ لوگ ہیں جو دوسروں کے لیے مفید ہوں

اَلوَاحِدَۃُ خَیرٌ مِن جَلِیسِ السُّوء — برے ساتھی سے اکیلا رہنا بہتر ہے

زبانیں اپنی جگہ فی نفسہ مہذب ہیں۔کوئی بھی حیوانی یا وحشیانہ نہیں ہوتی۔البتہ اس کے استعمال سے فرق پڑتا ہے وہ یوں کہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر غلیظ، نامعقول اور غیر مہذب و ناشائستہ الفاظ کا استعمال کیا جائے تو یہ استعمال کنندہ کا رویہ وحشیانہ ہے نہ کہ زبان حیوانی ہے۔اور پھر جن جن زبانوں میں الہامی کتب کا نزول ہوا وہ مشیت الٰہی کے تابع ہے تو بھلا کیوں کر وہ زبان جنگلی ہو سکتی ہے؟ نیز ان مقدس کتب نے انسانوں کی ہدایت کی تعلیم فراہم کرنا ہے تو جیسے یہ مقدس ہیں ویسے ہی ان کی زبان مقدس ہے۔کسی کے کہنے سے کوئی زبان بھلا کیسے حیوانی ہو سکتی ہے؟ جس سے تا قیامت انسانیت نے فائدہ اٹھانا ہے وہ کیوں کر حیوانی ہو گی؟ ورنہ تو حیوانیت اور وحشیانہ طور طریقوں کو فروغ دے گی جس سے وحشت و بربریت پھیلے گی۔جب کہ ان مقدس کتب اور خاص طور پر قرآن مجید نے تو رہتی دنیا تک انسانیت کو راہ ہدایت دکھانا ہے جس سے لوگ صراط مستقیم پر گامزن ہو کر منزل مقصود حاصل کر سکتے ہیں۔اگر راستہ ہی نہ ملا تو منزل کب ملے گی؟

ایک دن آپؐ کے صحابہ نے عرض کیا کہ ہم نے آپؐ سے زیادہ فصیح و بلیغ کسی کو نہیں دیکھا۔آپؐ نے فرمایا: اس میں کیا شک ہے' قرآن تو میری اپنی زبان میں نازل کیا گیا ہے۔عرب جنھیں اپنی فصاحت و بلاغت پر بڑا ناز تھا۔ان کے بڑے بڑے میلے ہوا کرتے تھے جہاں وہ باہم اپنے ادبی مظاہرے کیا کرتے تھے۔لاجواب اشعار کعبہ کی دیواروں پر آویزاں کیے جاتے تھے لیکن وہ عرب آپؐ کی فصاحت و بلاغت کی تاب نہ لا سکے۔حضرت ابوبکرؓ فرماتے ہیں کہ میں عرب کے گلی کوچے اور یہاں کے بازار گھوم چکا ہوں۔۔لیکن آپؐ کی فصاحت و بلاغت کے مقابلہ میں سب کو ہیچ پایا۔یہ ادبی شان آپؐ کو کیسے حاصل ہوئی، کس نے پیدا کی۔کس نے یہ معجزہ بیانی سکھائی۔آپؐ نے فرمایا: میرے پروردگار نے مجھے ادب سکھایا اور اعجاز بیان سے آراستہ پیراستہ کیا۔جاحظ جس کا ادب میں بلند مقام ہے وہ آپؐ کی فصیح و بلیغ کلام کو یوں بیان کرتا ہے۔"خدا نے آپؐ کے کلام میں لطافت و محبت کی چاشنی پیدا کی تھی اور اس کی مقبولیت کا شرف عطا کیا تھا۔اس میں شیرینی، دل آویزی اور شستگی بھی جمع تھی۔باوجود کلام کی تکرار اور سننے والے کو اعادہ کی عدم حاجت کے نہ آپ کے کلام کا وقار اور توازن گھٹتا نہ کسی سے کلمہ میں لغزش ہوتی۔آپؐ کی فصاحت کا نہ کوئی دشمن مقابلہ کر سکا اور نہ کسی خطیب کو آپؐ کی فصاحت کی

ہمسری کی ہمت ہوئی۔آپؐ طویل خطبوں کو موزوں محل کلام میں بیان فرمادیتے۔آپؐ نے صداقت و واقعیت کو کبھی اپنے ہاتھ سے نہ جانے دیا۔آنحضرتؐ کے کلام میں راست بازی، انصاف پسندی، نفع رسانی اور وزن ووقار کا پہلو غالب تھا اتنا کسی اور کے کلام میں ناپید تھا''۔

لالہ سدا سکھ لال کہتا ہے کہ'' حضرت محمدؐ اپنی فصاحت و بلاغت سے اکثر سکنائے عرب کو مرید کرتے''۔(حوالہ تاریخ ہند۔ص ن۔۴۔۴۶۰)

القلم۲، آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:'' آپ عرب میں فصیح و بلیغ ہیں۔آپؐ کی عقل کامل ہے۔آپؐ ہر عیب سے بَری ہیں اور فضیلت والے وصف سے متصف ہیں۔آپؐ کی سیرت کا حسن اور کمال آپؐ کے مخالفین کو بھی مسلم ہے اور ایسی شخصیت والا کب مجنوں ہوسکتا ہے؟''غلام رسول سعیدی نے کفار کے الزام'' وَقَالُوا يَا أَيُّهَا الَّذِي نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ إِنَّكَ لَمَجْنُونٌ'' (الحجر۔۶)(اور کفار نے کہا اے وہ شخص! جس پر یہ قرآن نازل کیا گیا ہے، بے شک تم ضرور مجنوں ہو) (تبیان القرآن جلد ۱۲ ص۔۱۶۴۔۱۶۵) میں اللہ تعالیٰ کا قول اس کے رد میں لکھا ہے۔''مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ''(القلم۲) اس میں اللہ تعالیٰ نے تین دلیلیں دیں۔ایک یہ کہ آپؐ کے اوپر رب کی نعمت ہے اور آپؐ اللہ کے فضل سے صاحب عقل ہیں۔آپؐ پر ظاہری نعمت یہ ہے کہ آپؐ عرب میں سب سے زیادہ فصیح اور بلیغ ہیں۔

یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کوئی زبان اپنے لغات، محاورات اور ادبی کمالات میں اس زمانہ میں ترقی کرتی ہے جب اس کے بولنے والوں کا تمدن عروج پر ہو اور اس سے پہلے اس زبان کی حالت پست ہوتی کہ اس کو جانوروں کی زبان سے کچھ ہی بلند قرار دیا جاسکتا ہے۔لیکن اس معیار پر اسلام سے عین پہلے کی عربی زبان کو جانچا جائے تو ہم زبان کی نزاکت، لغات کی کثرت، قواعد صرف ونحو کے استحکام اور خاصے بلند معیار کے نظم کے ذخیرے کے باعث حیرت زدہ ہوجاتے ہیں۔۔۔زمانہ جاہلیت کی عربی زبان مستند سمجھی جاتی ہے۔۔اگر ہم زمانہ حال کی کوئی زبان مثلاً جرمن، فرانسیسی یا انگریزی کو لیں تو ان کے دو مولف جن میں ڈیڑھ ہزار سال کا زمانہ حائل ہو تو ایک ہی زبان کے یہ دو مولف ایک دوسرے کو بالکل نہیں سمجھ سکیں گے۔اس کے برخلاف امراء القیس کی زبان اور قواعد صرف ونحو بالکل وہی ہیں جو مثلاً زمانہ حال کے مصری شعراء شوقی اور حافظ کے ہیں۔قرآن وحدیث زمانہ جاہلیت کے بدوؤں کو بھی اسی سہولت سے سمجھ آتے تھے جتنا آج کسی جدید عربی کے متعلم کو۔اس زمانہ میں عربی زبان، لغات کی حد تک اتنی وسیع اور متمول ہوگئی تھی کہ اس کا مقابلہ زمانہ حال کی انتہائی ترقی یافتہ زبانوں سے با آسانی کیا جاسکے''۔(نقوش رسول نمبر ص ۱۱۶ ج ۴) ایسی زبان جسے ہزار یا ڈیڑھ ہزار سال بعد سمجھا نہ جاسکے اس کی افادیت و اہمیت تو جاتی رہی اور برعکس اس کے وہ زبان جو زمانہ قدیم سے تا حال آسانی سے سمجھی

جا سکے۔اسے حیوانی زبان سے تعبیر کرنا لاعلمی یا تعصب کا نتیجہ ہے اور وہ ذات جس کے دہن مبارک سے حکمت بھرے بول اور رشد وہدیت کے چشمے پھوٹتے ہیں۔وہ ذات جسے اللہ تعالیٰ نے جوامع الکلم بنایا ہے وہ زبان کیسے حیوانی ہو سکتی ہے۔

تیرے آگے یوں ہیں دبے لچے فصحا عرب کے بڑے بڑے
کوئی جانے منہ میں زباں نہیں نہیں بلکہ جسم میں جاں نہیں

اعتراض نمبر ۱۸۲

ڈاکٹر اسپرنگر مشہور عیسائی مورخ نے آنحضرتؐ کے حالات پر انگریزی میں کتاب لکھی۔جو بہ قول سرسید یہ کتاب بہ سبب غلطیوں کے (جو اس کے مضمون کی صحت میں ہیں) کچھ اعتبار کے لائق نہیں۔۔۔اس کا طرز بیان نہایت مبالغہ آمیز ہے ان کی طبیعت پہلے ہی سے ایسے تعصّبات اور یک طرفہ رائے سے بھری ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ایک فقرہ لکھا جاتا ہے جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔اسپرنگر لکھتا ہے کہ ''اسلام محمدؐ کا ایجاد نہیں ہے وہ ایسے مکار کا نکالا ہوا مذہب نہیں ہو سکتا مگر اس میں شک نہیں کہ اس مکار نے اپنی بد اخلاقی اور طبیعت کی برائی سے اس کو بگاڑا اور جو بہت سے مسائل رہے ہیں قابل اعتراض رہے ہیں وہ اسی کی ایجاد ہیں''۔

۲: دھوکہ باز، مکار، کاذب، جھوٹے، خوف ناک حد تک بے شرم تھے (استغفراللہ)
مستشرق بیڈول

۳: آپؐ کو مدعی ''کاذب، مکار اور فریبی قرار دیا''۔ (ہمفرے ن ۱۱/۵۰۵)

اسپرنگر کے بارے میں سرولیم کی رائے: ''۔۔۔اور جیسا کہ میں نے اپنی کتاب کے بعض مقامات میں ثابت کیا ہے اس کے مضامین کی بنیاد غلطی پر معلوم ہوتی ہے۔چناں چہ انھوں نے محمد ﷺ کے ماقبل زمانہ عرب کا اور خاص محمد ﷺ کا اور ان کی خصلت کا جو حال لکھا ہے وہ سب غلط راویوں پر مبنی ہے۔

مسٹر جان ڈیون پورٹ: لکھتے ہیں ''کیا یہ بات خیال میں آسکتی ہے کہ جس شخص نے نہایت ناپسند حقیر بت پرستی کے بدلہ جس میں اس کے ہم وطن (یعنی اہل عرب) مدت سے ڈوبے ہوئے تھے خدائے برحق کی پرستش قائم کرنے سے بڑی بڑی دائم الاثر اصلاحیں کیں مثلاً اولاد کشی کو موقوف کیا۔نشے کی چیزوں کے استعمال کو اور قمار بازی کو جس سے اخلاق کو بہت نقصان پہنچتا ہے منع کیا۔بہتات سے کثرت ازواج کا اس وقت میں رواج تھا اس کو بہت کچھ گھٹا دیا۔غرض یہ کہ ایسے بڑے اور سرگرم پیغمبر کو ہم فریبی ٹھہرا سکتے ہیں؟ اور یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایسے شخص کی تمام کارروائی مکر پر مبنی تھی؟ نہیں ایسا نہیں کہہ سکتے۔بے شک محمد ﷺ بہ جز دلی نیک نیتی اور ایمان داری کے اور کسی سبب سے ایسے استقلال کے ساتھ

اپنی کارروائی پر ابتداء نزول وحی سے جو خدیجہؓ سے بیان کی۔ آخیر دم تک جب کہ عائشہ کی گود میں شدت مرض میں وفات پائی مستعد نہیں رہ سکتے تھے۔ جو لوگ ہر وقت ان کے پاس رہتے تھے اور جو ان سے بہت ربط وضبط رکھتے تھے۔ ان کو بھی کبھی ان کی ریاکاری میں شبہ نہیں ہوا اور کبھی انھوں نے اپنے نیک برتاؤ سے تجاوز نہیں کیا''۔

ہرقل نے ابوسفیان سے پوچھا: تم نے جو بات کہی ایسا کہنے سے پہلے تم نے اسے کسی معاملے میں جھوٹا تو نہیں پایا؟ ابوسفیان نے کہا: نہیں۔ ہرقل نے کہا: میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا کہ وہ لوگوں پر تو جھوٹ نہ باندھے اور اللہ پر جھوٹ باندھے۔ پھر قیصر نے پوچھا وہ کن باتوں کا حکم دیتا ہے تو ابوسفیان نے کہا کہ اللہ کی عبادت کرنے اور کسی کو اس کی ذات وصفات میں شریک نہ ٹھہرانے کا حکم دیتا ہے۔ بت پرستی سے روکتا ہے۔ نماز روزہ اور زکوٰۃ، سچائی اور پرہیزگاری اور عفت و پاک دامنی کا حکم دیتا ہے۔ قیصر نے کہا جو تم نے کہا اگر یہ سچ ہے تو یہ شخص بہت جلد میرے ان قدموں کی جگہ (سلطنت) کا مالک ہوگا میں جانتا تھا کہ ایک نبی آنے والا ہے لیکن یہ میرا گمان نہ تھا کہ وہ تم میں سے ہوگا، اگر مجھے یقین ہوتا کہ اس کے حضور پہنچ سکوں گا تو اس سے ضرور ملاقات کرتا اور اگر اس کے پاس ہوتا تو اس کے دونوں پاؤں دھوتا۔ (خاتم النبیین۔ص۔۶۳-۶۷) اسکندریہ کے بادشاہ مقوقس نے کہا: میں نے اس نبی کے بارے میں بہت غور و فکر کیا تو پایا کہ وہ پسندیدہ باتوں کا حکم دیتے ہیں اور ناپسندیدہ باتوں سے روکتے ہیں۔ قابلِ نفرت چیزوں کا حکم نہیں دیتے اور قابلِ رغبت باتوں سے روکتے نہیں۔ وہ نہ گمراہ اور جادوگر ہیں اور نہ ہی جھوٹے کاہن بل کہ ان میں نبوت کی علامات پائی جاتی ہیں۔ مثلاً غیب کی خبریں دینا۔ اس کے بارے میں مزید غور کروں گا۔ پھر اس نے آپؐ کے والا نامہ کو ہاتھی دانت کے ڈبہ میں بند کرکے اور اسے سر بہ مہر کرکے اپنے خازن کو حکم دیا کہ اسے حفاظت سے رکھیں اور ایک کاتب کو بلا کر آپؐ کے والا نامہ کا جواب لکھوایا۔ آپؐ کے خطوط سے کچھ بادشاہ ایمان لائے اور کچھ نے انکار کیا۔ جو ایمان لائے وہ تو زندہ و جاوید ہوئے اور جنھوں نے انکار کیا تباہ و برباد ہوگئے۔ (خاتم النبیین۔۷۰،۶۹-۶۸)

نہ صرف آپؐ کے ہم وطن (اہل عرب) بل کہ پوری دنیا کے لوگ کفر و شرک میں گھرے ہوئے تھے۔ دنیا جہاں کے رذائل اور تمام برائیاں ان میں رچ بس گئی تھیں۔ اخلاق کی پستی، نفرت و تعصب کی ڈیرہ داری، اولاد کشی، جوا، عورتوں کے حقوق کی پائمالی، غلاموں سے برا سلوک، نشہ بازی اور بت پرستی وغیرہ کا دور دورہ تھا۔ آپؐ نے پوری دنیا سے جہالت و گمراہی میں سسکیاں لیتی انسانیت کو روشنی اور اجالوں کی طرف گامزن کیا۔ دوم: کثرت ازواج کو گھٹایا نہیں بل کہ ختم کردیا وہ یوں کہ اسلام میں جو چار شادیوں کی اجازت ہے وہ مشروط ہے۔ اگر تم ایک بیوی سے انصاف نہیں کرسکتے تو دوسری شادی نہیں کرسکتے۔

مسٹر جان ڈیون پورٹ کے بیان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ:۔

ا: برائیوں کو ختم کرنے والے اور نیکی و بھلائی کی طرف بلانے والے کو فریبی نہیں کہا جا سکتا۔اس کی کارروائی مکر نہیں ہوتی اور جوان سے ربط رکھتے ہیں ان کے دامن بھی ریاکاری سے پاک ہیں۔عبد اللہ بن اسلام کا ایمان لانا اس کی مثال ہے

۲: ان کی تمام تر کارروائی بہ جز ایمان داری اور دلی نیک نیتی کے اور کچھ نہ تھی۔کوہ صفا پر وعظ اور قوم کا صادق کہنا۔

۳: ابتداء وحی سے تا دم آخر اپنے مشن میں مستعدر رہے۔

۴: مسٹر جان وحی کے قائل بھی ہیں۔نیز نبوت کے تسلسل کی برقراری پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔

۵: آپ کے ساتھیوں کو ان کی ریاکاری میں کبھی شبہ نہیں ہوا۔اس لیے وہ ہر وقت آپ کے ساتھ رہتے تھے اور سوائے نیک نیتی اور ایمان داری کے اور کچھ اخذ نہ کیا۔سب کچھ ان کی نظروں کے سامنے تھا۔آپ کی زندگی کھلی کتاب تھی۔کچھ بھی چھپا ڈھکا نہ تھا۔

۶: اگر مکر و فریب اور ریاکاری کا ادنیٰ سا شبہ بھی پایا جاتا تو آپؐ کے ساتھی آپ کا ساتھ چھوڑ جاتے جب کہ وہ آپ کے دامن گیر ہی رہے۔آپ کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہوئے تو پھر رہائی کے لیے بھولے سے بھی آرزومند نہ ہوئے۔یہی سچائی اور مکاری کی تمیز اور فرق کا سب سے بڑا پیمانہ ہے۔بہ قول ''واٹ'' خدا کا قائل کوئی شخص بھی یہ سوال اٹھا سکتا ہے کہ اگر اسلام کی بنیاد کسی جھوٹ اور فریب پر ہوتی تو اللہ تعالیٰ ایسے مذہب کو پھلنے پھولنے کیوں دیتا (محمد رسول اللہ ص ۳۵۷)

ڈاکٹر اسپرنگر کے لغو، باطل اور بے ادب اور بے تمیز بیان کے بارے میں ایڈورڈ گبن کہتے ہیں کہ کبھی مخالف اور کٹر کی زبان سے بھی سچی بات نکل جاتی ہے وہ لکھتے ہیں کہ ''محمد ﷺ کا مذہب شکوک و شبہات سے پاک صاف ہے۔قرآن خدا کی وحدانیت پر ایک عمدہ شہادت ہے۔مکہ کے پیغمبر نے بتوں کی،انسانوں کی،ستاروں کی اور سیاروں کی پرستش کو اس معقول دلیل سے رد کیا کہ جو شے طلوع ہوتی ہے غروب ہو جاتی ہے۔جو حادث ہے وہ فانی ہے اور جو قابل زوال ہے وہ معدوم ہو جاتی ہے۔اس نے اپنی معقول سرگرمی سے کائنات کے بانی کو ایک ایسا وجود تسلیم کیا جس کی نہ ابتداء ہے نہ انتہا نہ وہ کسی شکل میں محدود نہ کسی مکان میں اور نہ کوئی اس کا ثانی موجود ہے جس سے اس کو تشبیہ دے سکیں۔وہ ہمارے نہایت خفیہ ارادوں پر بھی آگاہ رہتا ہے۔بغیر کسی اسباب کے موجود ہے۔اخلاق اور عقل کا کمال جو اس کو حاصل ہے وہ اس کو اپنی ہی ذات سے حاصل ہے ان بڑے بڑے حقائق کو پیغمبر ﷺ نے مشہور کیا اور اس کے پیروؤں نے ان کو نہایت مستحکم طور سے قبول کیا اور قرآن کے مفسروں نے معقولات کے ذریعہ سے

بہت درستی کے ساتھ ان کی تشریح و تصریح کی۔ایک حکیم جو خدا تعالیٰ کے وجود اور اس کی صفات پر اعتقاد رکھتا ہو۔مسلمانوں کے مذکورہ بالا عقیدہ کی نسبت یہ کہہ سکتا ہے وہ ایسا عقیدہ ہے جو ہمارے موجود ادراک اور قوائے عقل سے بہت بڑھ کر ہے۔اس لیے جب ہم نے اس نامعلوم چیز (یعنی جس خدا) کو زمان و مکان، حرکت و مادہ اور حس و تفکر کے اوصاف سے مبرا کر دیا تو پھر ہمارے خیال کرنے اور سمجھنے کے لیے کیا چیز باقی رہی وہ اصل اول ہے (یعنی ذات باری تعالیٰ) جس کی بنا عقل اور وحی پر ہے۔محمد ﷺ کی شہادت سے استحکام کو پہنچی چناں چہ اس کے معتقد ہندوستان سے لے کر مراکو تک موحد کے لقب سے ممتاز ہیں اور بتوں کو ممنوع سمجھنے سے بت پرستی کا خطرہ مٹا دیا گیا ہے“۔اس عبارت سے چند امور سامنے آئے۔

۱: محمد ﷺ کا لایا ہوا دین شکوک و شبہات سے پاک صاف ہے۔

۲: واحدانیت پر قرآن ایک عمدہ شہادت ہے۔

۳: نبی مکرم ؐ نے پوجا پاٹ اور پرستش کے تمام طریقوں سے منع فرمایا اور خاتمہ کر دیا۔

۴: کائنات کا بانی اللہ تعالیٰ ہے۔کوئی اور نہیں۔بہت سی صفات کو بھی بیان کیا گیا ہے۔

۵: وہ اصل اول (یعنی ذات باری تعالیٰ) جس کی بنا عقل اور وحی پر ہے۔محمد ﷺ کی شہادت سے استحکام کو پہنچی۔وہی ذات قدیم و ازلی ہے اور باقی رہنے والی ہے۔باقی سب فانی ہیں۔کیا یہ باتیں کسی فریبی کی ایجاد ہیں یا غلط مسائل کو ختم کرنے میں سعی و کوشش کی اور لازوال تعلیم دی۔البتہ اللہ نے پسندیدہ دین اسلام آپ کو عطا فرمایا درست ہے۔تو پھر کیوں کر اللہ کے پسندیدہ دین میں بگاڑ پیدا کیا جا سکتا ہے۔کیوں کہ ” وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی “کا واضح ارشاد خداوندی قرآن کریم میں موجود ہے۔

مسٹر ٹامس کارلائل لکھتا ہے کہ ” ہم لوگوں (یعنی عیسائیوں) میں جو بات مشہور ہے کہ محمد ﷺ ایک پرفتن اور فطرتی شخص اور گویا جھوٹ کا اوتار تھے اور ان کا مذہب دیوانگی اور خام خیالی کا ایک مجموعہ ہے“۔کذب واختراع کا وہ انبارِ عظیم ہے جو ہم نے اپنے مذہب کی حمایت میں اس ہستی کے خلاف کھڑا کیا ہے۔خود ہمارے لیے شرم ناک ہے۔اس شخص کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ آج بارہ سو برس سے اٹھارہ کروڑ انسانوں کے حق میں شمع ہدایت کا کام دے رہے ہیں۔یہ اٹھارہ کروڑ انسان بھی ہماری طرح دست قدرت کا نمونہ ہیں۔بندگان خدا کی آج بھی بیش تر تعداد کسی اور شخص کی بہ نسبت محمد ﷺ کے اقوال پر ایمان رکھتی ہے۔کیا ہم کسی طرح اسے تسلیم کر سکتے ہیں کہ یہ سب روحانی بازی گری کا ایک ادنیٰ کرشمہ تھا جس پر اللہ کے بندے ایمان لائے؟ کیا جھوٹا آدمی کسی مذہب کا بانی ہو سکتا ہے۔جھوٹا آدمی تو اینٹ اور چونے کا ایک مکان تک نہیں بنا سکتا۔اگر اسے مٹی چونے اور اشیاء کے خواص کا صحیح علم نہ ہو تو اس کا بنایا ہوا مکان، مکان نہ کہلائے گا بل کہ مٹی کا ایک ڈھیر ہو گا۔ایسا مکان بارہ صدی تک قائم نہیں رہ سکتا

اور نہ ہی اس میں اٹھارہ کروڑ انسان سما سکتے ہیں۔

ہم کسی طرح حضرت محمد ﷺ کو حریص، منصوبہ ساز اور ان کی تعلیمات کو جہل و نادانی نہیں سمجھ سکتے۔ وہ پیغام جو آپؐ لے کر آئے تھے بالکل سچا تھا۔ وہ ایک آواز تھی جو پردہ غیب سے بلند ہوئی۔ اس شخص کے نہ اقوال جھوٹے تھے نہ افعال۔ اس تنگ ظرفی اور نمائش کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ زندگی کا ایک جادۂ تاباں تھا جو خاص سینہ فطرت سے ہویدا ہوا اور جسے خالق عالم نے کائنات کو منور کرنے کے لیے بھیجا تھا۔

شرم وحیا: جہاں تک شرم وحیا کا تعلق ہے۔ صحاح میں ہے کہ آپؐ دوشیزہ لڑکیوں سے بھی زیادہ شرمیلے تھے اور شرم وحیا کا اثر ایک ایک ادا سے ظاہر ہوتا تھا۔ ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے ”رسول اللہ ﷺ میں اس کنواری لڑکی سے جو پردے میں رہتی ہے زیادہ شرم تھی اور آپؐ جب کسی چیز کو برا جانتے تو ہم اس کی نشانی آپؐ کے چہرے سے پہچان لیتے تھے“۔ مسروق سے روایت ہے ”ہم عبداللہ بن عمرو کے پاس گئے جب معاویہ کوفہ میں آئے انھوں نے ذکر کیا رسول اللہ ﷺ کا تو کہا آپ بدزبان نہ تھے اور نہ بدزبانی کرتے تھے اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے بہتر وہ لوگ ہیں جن کے خلق اچھے ہیں۔ (مسلم شریف کتاب الفضائل ج۔۶۔ص ۳۵)

قاضی عیاض کہتے ہیں کہ حسن خلق یہ ہے کہ لوگوں سے اچھی طرح ملے، محبت رکھے۔ ان پر شفقت کرے۔ اگر وہ کوئی سخت بات کہیں تو تحمل کرے اور صبر کرے مصیبت میں اور غرور نہ کرے۔ زبان درازی نہ کرے۔ مواخذہ اور غضب کو چھوڑ دے۔ زبان سے برا نہ کہنا یہ وہ حیا ہے جو اخلاق حسنہ سے ہے اور ایمان کا جزو ہے۔

آپؐ نے کبھی کسی سے بدزبانی نہیں کی۔ بازاروں میں جاتے تو چپ چاپ گزر جاتے، تبسم کے سوا کبھی لب مبارک خندہ (قہقہہ سے آشنا نہ ہوئے) بھری محفل میں کوئی بات ناگوار ہوتی تو لحاظ کی وجہ سے زبان سے کچھ نہ فرماتے، چہرہ کے اثر سے ظاہر ہوتا اور صحابہ متنبہ ہو جاتے۔ عرب میں اور ممالک کی طرح شرم وحیا کا بہت کم لحاظ تھا۔ ننگے نہانا عام بات تھی۔ حرم و کعبہ کا طواف ننگے ہو کر کرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کو بالطبع یہ باتیں سخت ناپسند تھیں۔ ایک دفعہ فرمایا کہ حمام سے پرہیز کرو۔ لوگوں نے عرض کی کہ حمام میں نہانے سے میل چھوٹتا ہے اور بیماری میں فائدہ ہوتا ہے۔ ارشاد فرمایا کہ نہاؤ تو پردہ کر لیا کرو۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ جب عجم فتح کرو گے تو وہاں حمام ملیں گے ان میں جانا تو چادر کے ساتھ جانا۔ بھلا پوری انسانیت کو زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق ہدایت عطا کرے۔ تمام برائیوں کے خاتمہ میں مستعد رہے اور خاتمہ کر ڈالے۔ گم راہی سے نجات اور صراط مستقیم پر گامزن کرے تو بھلا وہ کیسے شرم وحیا کا پیکر نہ ہوگا۔ کیوں کہ جسے برائی پسند نہیں، بھلائی پسند ہے۔ نفرت پسند نہیں محبت پسند ہے کسی

کی پوجا پسند نہیں صرف خدا کی پرستش پسند ہے تو یقیناً وہ مسیحا وہ رہبر شرم وحیا کا پیکر ہے۔

اعتراض نمبر ۱۸۳

''والٹیر'' نے آنحضرتؐ کے خلاف زہر اگلا ہے اور کہتا ہے نعوذ باللہ ''نبی کاذب ہیں اور اسلام ایک وحشی مذہب ہے''۔

جواب: پہلے اعتراض کا جواب پیچھے بیان ہوا۔ اب دوسرے حصہ کو زیر بحث لاتے ہیں۔ جرمنی کے مشہور شاعر گوئٹے نے اپنی مشہور نظم "MAHOMETS GESANG" ۱۷۷۱ء میں لکھی جس میں ذکر مصطفیٰ ﷺ کی رفعت کو بیان کیا اور مزے کی بات یہ کہ جانی اور کٹڑ دشمن والٹیر نے بھی اس (عیسائی) کا اعتراف کیا کہ اگر تم اٹھارہ اٹھارہ عورتوں سے لطف اندوز ہو رہے ہوتے اور حکم دیا جاتا کہ صرف چار بیویاں رکھی جاسکتی ہیں تو کیا تم یہ مان لیتے؟ کیا ایسے مذہب کو شہوانی کہہ سکتے ہو۔؟ (محمد رسول اللہ۔۳۱۷)

۱: ہم نہیں جانتے کہ محمد (ﷺ) اپنی زندگی میں کسی رذیل حرکت کے مرتکب ہوئے ہوں۔ البتہ نہایت اچھی صفات کے مالک تھے (۔مسٹر جان آرگس۔ن۴۔۴۸۹)

۲: پیغمبر اسلام ﷺ کی صداقت کا یہی بڑا ثبوت ہے کہ جو آپؐ کو سب سے زیادہ جانتے تھے وہی آپؐ پر سب سے پہلے ایمان لائے۔ حضرت محمد ﷺ ہرگز جھوٹے مدعی نہ تھے۔ (پروفیسر ایچ جی ویلزن۴۔۴۹۰)

پیر محمد کرم شاہ بھیروی فرماتے ہیں کہ آپؐ کی عظمت وصداقت کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ آپؐ کے دشمن آپؐ کے خلاف کبھی کسی الزام پر متفق نہیں ہو سکے۔ ایک مستشرق نے آپؐ کے خلاف جو الزام تراشا، دوسرے مستشرق نے اس کی تردید کی۔ ایک دشمن نے حضورؐ کے کردار کو مجروح کرنے کے لیے کوئی شوشہ چھوڑا تو کسی دوسرے دشمن نے اسے بے بنیاد قرار دے دیا۔ ہمیں مستشرقین کی تحریروں میں اس قسم کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ جیسے پہلے ذکر ہوا۔ اسپرنگر نے الزام دھرا پھر خود اس کی تردید کر دی یا اس کے دیگر ہمنوا مستشرقین نے اسے باطل قرار دیا۔

آپؐ حسن سیرت و کردار، صبر وتحمل، معتدل مزاجی، طہارت و پاکیزگی، اعلیٰ نسبی، رحم وکرم، نیک نیتی، متانت، سخاوت، نرم روی، عجز وانکساری، صداقت وامانت الغرض تمام فضائل اور خوبیوں سے متصف اور رذائل سے مبّرا ہیں۔ ظالم کو معاف کرنے والا، غریبوں، یتیموں کا ماویٰ، قرابت داروں اور پڑوسیوں کا خیر خواہ، مظلوموں کا والی، فریادیوں کا ملجایٰ، نیکی کا پرچارک اور بدی سے روکنے والے ہیں۔ نیز کبھی اس حامل نبوت ذات میں گمراہی اور بھٹکنے کا ذرہ بھر شائبہ نہیں ہوتا جس کی گواہی خدا نے دی۔

''مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى'' (النجم۲) ترجمہ: تمھارا ساتھی (پیغمبر) نہ گمراہ ہوا نہ بھٹکا۔

توراۃ کی کتاب پیدائش باب ۲۰ کے مطابق ام اسرائیل ربقہ نے سازش کر کے حضرت اسحقؑ سے حضرت یعقوبؑ کو برکت (نبوت) دلوائی جو وہ اپنے بڑے بیٹے عیسو کو دینا چاہتے تھے۔اس طرح باب ۲۹ میں حضرت یعقوبؑ اوران کے سسرالی رشتہ دار ایک دوسرے کے ساتھ بد معاملگی میں ملوث کیے گئے۔کتاب خروج باب ۱۲ کے مطابق خروج سے پہلے حضرت موسیٰؑ کے حکم پر بنی اسرائیل نے مصریوں سے ان کے زیورات اور ملبوسات مستعار لیے اور پھر وہ یہ مال اپنے ساتھ لے کر خروج کر گئے۔اس طرح انھوں نے مصریوں کو دھوکا دے کر لوٹا۔غرضیکہ مکر وفریب، دھوکہ اور جعل جب خود اپنے مقدس انبیاء سے منسوب کیا جاسکتا ہے تو دیگر اس سے کب محفوظ رہ سکتے ہیں۔پھر وہ جھوٹ جو کسی اعلیٰ مقصد کے لیے ہو، ان کی اصطلاح میں مقدس جھوٹ کہلاتا ہے؛ جو ہر کہ ومہ کے لیے جائز تصور کیا جاتا ہے۔(مستشرقین مغرب کا انداز فکر ۱۹۵) الاماں

مارکوس ڈاڈز (Marcus Dods) Imposter Theory کی تردید میں دو واقعات کا بطور خاص ذکر کرتا ہے۔ایک مسیلمہ کذاب، جب اس نے اپنا ایلچی اس پیغام کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بھیجا تھا کہ رسالت میں مجھے آپ ﷺ کے ساتھ شریک کیا گیا ہے تو آپ ﷺ نے واضح اور دوٹوک انداز میں اس کی پیشکش کو رد کیا، وہ کسی نبی کا ذب (نعوذ باللہ) کی زبان سے نکل نہیں سکتا۔مسیلمہ نے لکھا تھا ''مسیلمہ خدا کے نبی کی طرف سے محمد پیغمبر ﷺ کے نام۔زمین آدھی میری اور آدھی آپ کی ملکیت ہے'' آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا ''اللہ کے پیغمبر محمد ﷺ کی جانب سے مسیلمہ کذاب کے نام! زمین اللہ کی ہے وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے اور جو لوگ اس سے ڈرتے ہیں ان کے لیے خوشخبری ہے۔'' دوسرا یہ کہ جب رسول اللہ ﷺ کے فرزند حضرت ابراہیمؑ کا انتقال ہوا تو آپ ﷺ کا ردعمل آپ کی شخصیت کے نقطہ عروج پر تھا اور آپ کی شخصیت کے شایان شان تھا اتفاق سے اس روز سورج گرہن تھا، چند صحابہ نے کہا کہ آپ ﷺ کے فرزند کی موت کا سوگ سورج بھی منا رہا ہے تو آپ ﷺ نے جواب دیا ''سورج اور چاند میں کسی انسان کی موت سے گہن نہیں لگتا، وہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے نشانیاں ہیں۔'' (محمد رسول اللہ ﷺ۔۳۱۸)

فرانسیسی دانشور پروفیسر (موسوسیڈیو) لکھتا ہے کہ حضور ﷺ خوش خلق وملن سار، بری باتوں سے نفرت کرنے والے صحیح رائے دینے والے، بہت عقل مند تھے، انصاف کرنے والے، اپنے اور غیر کے ساتھ یکساں سلوک کرنے والے تھے۔غریبوں اور مسکینوں کے ساتھ پیار کرتے تھے صحابہ کرام سے شفقت فرماتے تھے، اپنی نعلین خود گانٹھ لیتے اور اپنے کپڑوں کو خود پیوند لگا لیتے تھے۔دوست اور دشمن سب سے خوش اخلاقی سے ملتے تھے۔پروفیسر یہ بھی لکھتا ہے کہ اسلام ان گنت اچھائیوں سے بھرپور مذہب ہے

جواس کو وحشیانہ مذہب کہتے ہیں، جھوٹے ہیں۔(سوچ پراگے۔۸)

پروفیسر ایڈوائز مونتے لکھتا ہے: ''آپ ﷺ کا تمام مذہب نرالے اصولوں سے بھرپور ہے اس کی معقولیت مسلم ہے اور توحید کے مسئلے کو ایسا کامل یقین کے ساتھ جدا ثابت کیا ہے جو اسلام کے بغیر کسی اور مذہب میں نہیں''۔

میجر آرتھر کلائین لیونارڈ لکھتا ہے ''تحقیق کرنے والوں کو ماننا پڑے گا کہ حضور ﷺ کا دین ایک ایسا سچا مذہب ہے جس نے اپنے پیروکاروں کو اندھیروں اور گمراہیوں سے نکال کرا جالے اور سچائی کی بلندیوں تک پہنچانے کا چارہ کیا ہے۔''

جارج برناڈ شا: ''کرسچین لوگوں نے جہالت، کم عقلی اور تعصب کے سبب اسلام کی ایک ڈراونی شکل پیش کی ہے اور آپ ﷺ کے دین کے خلاف ایک سوچی سمجھی تحریک چلائی اور آپ ﷺ کو اچھے الفاظ سے یاد نہیں کیا (نعوذ باللہ)۔ میں نے باریک بینی سے دیکھا اور مشاہدہ کر کے میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ آپ ﷺ ایک مہان ہستی اور انسانیت کے نجات دہندہ ہیں۔''

اعتراض نمبر ۱۸۴

آپ ؐ کو مغرب نے بہروپ یا جعل کے الفاظ سے نوازا ہے۔(نعوذ باللہ)

جواب: اہل مغرب کہتے ہیں کہ وحی کوئی بیرونی القانہ تھی بل کہ لاشعور کی پیداوار تھی جسے غلط فہمی سے پیغام خداوندی سمجھا گیا۔ عہد وسطیٰ میں بہروپ اور جعل کے الفاظ سے جو کام لیا جاتا تھا یا جس کی تشہیر کی جاتی تھی جب اس پر سوال اٹھے، تنقید ہوئی تو اس تنقید سے بچنے کے لیے ایک نئے الفاظ ''عدم خلوص'' کا سہارا لیا جس کا مفہوم وہی تھا یعنی وحی، قرآن، نبوت اور دین کو مسخ کیا جائے۔ خلوص ایک ذہنی کیفیت ہے جس کو پرکھنے سمجھنے کے لیے صرف ایک ہی پیمانہ ہے کہ مدعی کے قول و فعل کا جائزہ لیں۔ ان کے وقوع اور اثرات کو احاطہ میں لانے کی کوشش کریں جو نتائج ایمان داری اور غیر جانب داری سے بر آمد ہوں اس کی بنیاد پر کوئی رائے قائم کی جائے۔ اس عظیم خوبی خلوص کے بارے میں ٹامس کارلائل لکھتا ہے کہ ''میرا خیال ہے کہ خلوص بڑا گہرا خلوص اور سچا خلوص بڑے انسان کی پہلی خصوصیت ہے اور ایسے شخص کو ہم اوریجنل (Original) انسان کہتے ہیں۔ اس کی فطرت کسی پہلے مرقع کی نقل نہیں ہوتی وہ ایک ایسا قاصد ہے جو پردہ غیب سے پیغام دے کر بھیجا جاتا ہے ہمارے پاس۔ خواہ ہم اسے شاعر کہیں یا پیغمبر یا دیوتا۔ بہ ہر صورت ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ ساری نوع انسانی کے الفاظ سے مختلف ہوتے ہیں۔ وہ حقیقت اشیاء کی روح رواں سے نکلتا ہے اور رات دن اسی میں بسر کرتا ہے۔ اوہام اس سے اس حقیقت کو نہیں چھپا سکتے۔ وہ اندھا ہو، بے خانماں ہو، مصیبت زدہ ہو، روزمرہ کی

گفت گو میں منہمک ہو لیکن یہ حقیقت روز روشن کی طرح ہر وقت پیش نظر رہتی ہے۔ کیا اس کے الفاظ فی الحقیقت ایک طرح کی وحی نہیں ہیں۔ جب اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی لفظ اور نہ ہو تو پھر ہم وحی کے سوا اسے کس نام سے تعبیر کریں۔ ایسے انسان کی ہستی قلب کائنات سے ابھرتی ہے اور وہ اشیاء کا بنیادی جز و ہوتا ہے۔ خدائے تعالیٰ نے اس دنیا میں بہت سے الہام بھیجے ہیں لیکن کیا یہ شخص آخری اور تازہ ترین مظہر نہیں ہے۔ اس کی عقل وحی کی پرورده ہوتی ہے تاہم کسی طرح حضرت محمد ﷺ کو حریص و منصوبہ ساز اور ان کی تعلیمات کو جہل و نادانی نہیں سمجھ سکتے۔ وہ پیغام جو آپ لے کر آئے بالکل سچا تھا۔ وہ ایک آواز تھی جو پردہ غیب سے بلند ہوئی۔ اس شخص کے اقوال جھوٹے تھے نہ افعال۔ اس میں تنگ ظرفی اور نمائش کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ زندگی کا ایک جادۂ تاباں تھا۔ جو خاص سینہ فطرت سے ہویدا ہوا اور جسے خالقِ عالم نے کائنات کو منور کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ (ن۔۴۔۵۴۰)

یہ اس قسم کے بزرگ و برتر کی جاں پاک تھی جسے خلوص و صداقت کے بغیر گزر ہی نہیں۔ جس کے خمیر میں خود فطرت اخلاص کو جگہ دیتی ہے جس وقت اور لوگ اوہام میں مبتلا تھے اور اسی پر اڑے اپنے لیے جنگ وجدل کر رہے تھے۔ اس شخص کی عقل پر وہم وگمان کا پردہ نہ پڑ سکا وہ اپنی روح اور حقائق اشیاء کے ساتھ سب سے الگ تھا اس کی نگاہوں کے سامنے رازِ ہستی ایک بیم ورجا کے ساتھ روز روشن کی طرح عیاں تھا جس کے وجود کو کسی طرح کا وہم وگمان پوشیدہ نہ کر سکا۔ یہ حقیقت جسے (ٹامس کارلائل) نے ''خلوص'' کے لفظ سے تعبیر کیا، درحقیقت صفات ایزدی کا ایک پرتو ہے اور ایسے انسان کی آواز دراصل ہاتف غیبی کی آواز ہے جسے لوگ انتہائی توجہ سے سنتے ہیں اور انھیں سننا چاہیے کیوں کہ اس کے مقابلہ میں دنیا کی ہر چیز ہیچ ہے''۔ اب اس مستشرق کے خیالات وآراء کی روشنی میں دیگر مستشرقین کے جعل، بہروپ اور عدم خلوص کے الزام کی کوئی وقعت رہ جاتی ہے؟ مزے کی بات یہ ہے کہ ہمیں دلائل دینے کی ضرورت نہ رہی بل کہ ان کے اپنوں نے ان کے الزام کی دھجیاں بکھیر دیں اور ان کی بے علمی، تعصب، نفرت اور جہالت کی پگڑی اچھال دی بل کہ تار تار کر دی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک بہروپ وجعل ساز (نعوذ باللہ) کمر باندھ کر نکلے اور چند سالوں میں پورے جزیرہ نمائے عرب کو ظلمت کی اتھاہ گہرائیوں سے نکال کر ہدایت کی روشنی عطا کر دے۔ خون کے پیاسوں کو ہم درد، دوست اور غم خوار بنا دے۔ دشمنوں کی دشمنی محبت و پیار میں بدل دے۔ جوا، شراب، قمار بازی وغیرہ برائیوں سے معاشرہ کو پاک کر کے پاکیزہ بنا دے۔ لڑکیوں کو قتل کرنے والوں کو احترام آدمیت کا رہبر ورہنما بنا دے۔ بت پرستوں کو بت شکن اور ظلم کی آندھیوں کی جگہ انصاف کی پرکیف ہوائیں چلا دے۔ بھٹکتی انسانیت کو صراط مستقیم پر گامزن کر کے ان کی اصل منزل کی نشان دہی کر دے تاکہ مقصد

زیست کا فریضہ انجام پذیر ہو سکے۔ شاعر اور جھوٹا تھا؟ لیکن میں تمھارے روبہ رو اعلان کرتا ہوں کہ محمد ﷺ کی زندگی اور تاریخ کے مطالعہ کے بعد ان کے متعلق ایسے خیال نہیں رکھے جا سکتے۔ یہی فلسفی مزید لکھتا ہے کہ ''کون سا شخص ایسا ہے، جس کو ان معیارات پر پرکھا جائے جو عظمت انسانی کو پرکھنے کے لیے وضع ہوئے ہوں تو وہ محمد ﷺ سے بڑا نظر آئے۔ محمد ﷺ کے سوا وہ کون ہے جس میں ہر انسانی عظمت اپنے عروج پر نظر آتی ہو'۔ یوں بھی لکھتا ہے کہ ''محمد ﷺ خدا سے کم ہیں اور انسان سے برتر ہیں یعنی وہ خدا کے نبی ہیں''۔ ارشادِ خداوندی ہے '' وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوا يَا مُوسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِندَكَ لَئِن كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ'' (الاعراف ۱۳۴) ترجمہ: ''اور جب ان پر عذاب پڑتا کہتے اے موسیٰ ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کرو اس عہد کے سبب جو اس کا تمہارے پاس ہے بے شک اگر تم عذاب اٹھا دو گے تو ہم تم پر ضرور ایمان لائیں گے اور بنی اسرائیل کو تمہارے ساتھ کر دیں گے۔''

اس آیت کے تحت غلام رسول سعیدی جلد ۱۲ صفحہ ۳۴۶ تبیان القرآن میں لکھتے ہیں۔ جو عصمت انبیاء کے قائل نہیں ہیں اس آیت سے استدلال لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس سے ثابت ہوا کہ آپؐ پہلے معاصی کا ارتکاب کرتے تھے تبھی تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں آپ کو ارتکاب معصیت سے منع فرمایا ہے کہ آپ گناہ نہ کریں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں آپ کو گناہ نہ کرنے کے معدوم کا حکم دیا ہے جیسا کہ ہم نماز میں کہتے ہیں'' اھدنا الصراط المستقیم'' ہم کو سیدھے راستے کی ہدایت دے اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم پہلے ہدایت یافتہ نہیں ہیں بل کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم کو ہدایت پر ہمیشہ برقرار رکھ' اگر ہم پہلے ہی ہدایت یافتہ نہ ہوتے تو نماز کیسے پڑھتے''۔

مسٹر اے فری مین: اس میں شک نہیں کہ حضرت محمد ﷺ بڑے پکے راست باز اور سچے ریفامر تھے اگر وہ ایسے نہ ہوتے تو ہرگز اپنے مقدس مشن میں آخر تک مستقل اور ثابت قدم نہ رہ سکتے تھے وہ ڈگمگا جاتے اور ان کو لغزش ہو جاتی۔ ڈاکٹر لین پول کہتا ہے کہ: اگر محمد ﷺ سچے نبی نہیں تھے تو کوئی نبی دنیا میں برحق آیا ہی نہیں۔

سیرت و کردار کی تابانی اور قول و فعل کی ضوفشانی نے دنیائے فکر کو جلا بخشی آپ ﷺ کے بجز کوئی فرد ایسا نظر نہیں آتا جس کا ہر ہر لفظ محفوظ کیا گیا ہو۔ اس کا ہر قول تقدس و حجت بالغہ کا عکاس ہے انہوں نے جس بات سے منع فرمایا حرام ہو گئی اور جس بات کا حکم دیا واجب ٹھہری، جس کا حکم نہ دیا مباح ہوا۔ جس بات سے ناگواری فرمائی مکروہ ہو گئی جس کا حکم نہ دیا لیکن روا رکھا وہ جائز قرار پائی جس کی چشم ناز کے بار بار اٹھنے سے تحویل کعبہ ہوا، ان کی نوازش و توجہ حاصل دو جہاں، جن کی تعلیم و تربیت سے بدو دنیا کے رہبر و رہنما بن گئے۔ اس شاہ دو عالم ﷺ کے علاوہ کسی کو یہ مقام حاصل نہیں ہوا۔ ایسے کامیاب شخص

کی کامیابی کیسے خلوص کو متاثر کر سکتی ہے۔ تمام پیغمبر ایک خدا کے قائل، اس کے احکام کے پابند سب کی تعلیمات اللہ کی دی ہوئی اور سب کے سب انسانیت کے غم گسار اور عظیم محسن جن کے بغیر انسانیت کو راہ مستقیم نہ ملتی۔ تمام انبیاء سے وفاداری اور نبی آخر ﷺ سے ناگواری کیوں؟ کیونکہ اگر سارے انبیاء پر خلوص ہیں تو اسی راہ کے دوسرے انبیاء کے خلوص پر شک وشبہ اور تشکیکات ہر گز نہیں ہو سکتی۔

جی ڈبلیو لیٹنر'' آپ کی نبوت کی تصدیق کرتے ہوئے اس تاریخی واقعہ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتا ہے'' محمد رسول اللہ ﷺ نے از خود کسی معصومیت کا دعویٰ نہیں کیا بل کہ ایک موقع پر تو ایسی وحی نازل ہوئی جس میں انھیں تنبیہ کی گئی کہ انھوں نے ایک باعزت شہری سے بات کرنے میں ایک فقیر بے نوا سے منہ کیوں موڑا۔ یہی نہیں انھوں نے اس وحی کو شائع بھی کیا۔ یہ وہ آخری دلیل ہے۔ جس کی روشنی میں اس بات کی تردید ہو جاتی ہے کہ وہ نعوذ باللہ نبی کاذب تھے جیسا کہ معصوم مسیحی اس عظیم عرب کو الزام دیتے ہیں۔ جس واقعے کی طرف جی ڈبلیو لیٹنر نے اشارہ کیا ہے وہ یہ ہے۔ ایک نابینا صحابی ابن مکتوم آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ اس وقت سرداران قریش آپ کی خدمت میں آئے ہوئے تھے۔ شیبہ، عتبہ، ابو جہل، ولید بن مغیرہ وغیرہ۔ آپ نہایت تندہی سے تبلیغ حق فرما رہے تھے۔ اس دوران وہ نابینا صحابی آیا۔ اپنی نابینائی کے سبب صورت حال کا اندازہ نہ لگا سکے اور فی الفور ہدایت کی درخواست کی۔ اس بے جا مداخلت پر آپؐ کے چہرہ اقدس پر ناگواری کے اثرات نمودار ہوئے لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ بات غریبوں کے ملجا، یتیموں بیواؤں کے والی اور بے کسوں کے آقا نبی کی رحمۃ اللعالمینی کے شایان شان نہ تھی۔ اس پر قرآن کی سورہ عبس کی آیات ۱ تا ۱۶ نازل ہوئیں۔

کعبہ کی تعمیر نو:

آپ ﷺ کی عمر مبارک پینتیس برس کی تھی جب قریش نے کعبہ کی تعمیر نو کا ارادہ کیا۔ تعمیر نو کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ایک عورت کعبہ کو خوشبودار دھونی دے رہی تھی کہ آگ لگ گئی جس سے کافی نقصان ہوا ۔دوسری یہ وجہ تھی کہ دیواروں میں شگاف پڑے ہوئے تھے۔ وہ اس طرح کہ بند ٹوٹ گیا جو مکہ کو سیلاب سے بچانے کے لیے بنایا گیا تھا۔ سیلاب کی وجہ سے صحن حرم پانی سے بھر گیا تھا۔ پہلے کعبہ کی چار دیواری تھی مگر چھت نہیں تھی۔ ان حالات میں از سر نو تعمیر کعبہ کا بیڑا اٹھایا گیا یہ بہت دلچسپ بات ہے کہ کسی غیر قوم کا قبضہ کر کے گرا دینے، منہدم کرنے کا واقعہ خانہ کعبہ کے ساتھ پانچ ہزار سال سے نہیں ہوا تھا جیسا کہ ہیکل یروشلم کے ساتھ بارہا ایسے واقعات پے در پے ہوتے رہے اور یہ ایسا شرف ہے کہ دنیا کے کسی عبادت خانہ کو حاصل نہیں۔ (رحمت اللعالمین۔ ۱۔ ۴۳)

دوران تعمیر حجر اسود کے نصب کرنے کا مرحلہ آیا تو اختلاف پیدا ہوا، یکے یوسف ہزار خریدار والا معاملہ

تھا یعنی ہر شخص کی خواہش تھی کہ وہ حجر اسود کو کعبۃ اللہ کی دیوار میں نصب کرے، بالآخر ایک بزرگ کی بات پر اتفاق ہوا کہ کل جو شخص سب سے پہلے باب بنی شیبہ سے حرم میں داخل ہو اس کو حکم مان لو اور وہ جو فیصلہ کریں اس پر عمل کریں۔اس رائے کو بالاتفاق پسند کیا گیا اور اسی پر عمل درآمد کرنے کا فیصلہ ہوا۔اگلی صبح آنحضرت ﷺ سب سے پہلے باب بنی شیبہ سے حرم میں داخل ہوئے۔آنے والوں نے آپ ﷺ کو دیکھا تو پکار اٹھے۔ھذا الامین۔رضینا۔۔۔۔۔ھذا محمد ﷺ (یہ امین ہے۔۔ہم اس پر راضی ہیں۔یہ محمد ﷺ ہیں)

آپ کے سامنے مسئلہ رکھا گیا مسئلہ مشکل تھا مگر ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، آپ نے کم عمری کے باوجود ایسا فیصلہ فرمایا کہ بڑے بڑوں نے اس فیصلے کے آگے سر جھکا دیا اور سب راضی ہو گئے اور خوشی سے کھل اٹھے، آپ نے ایک چادر بچھانے کا کہا: چادر بچھ گئی تو آپ ﷺ نے حجر اسود کو اٹھا کر چادر میں رکھ دیا پھر فرمایا تمام قریش جو چار بڑی جماعتوں میں تقسیم تھے، اپنا اپنا نمائندہ منتخب کریں اور ہر نمائندہ چادر کا ایک کونہ پکڑ لے اس سلسلے میں ایک کونہ پر عقبہ بن ربیعہ دوسرے کونے پر ابوزمعہ، تیسرے کونے پر ابوحذیفہ بن المغیرہ اور چوتھے پہ قیس بن عدی کھڑا ہوا'' اس چادر کو سب مل کر اٹھا لیں اور کعبہ کے قریب لے جائیں، سب نے ہاتھ بڑھا کر اس چادر کو اٹھایا اور جب کعبہ کے پاس پہنچا دیا، پھر آپ نے اپنے دست مبارک سے حجر اسود کو اٹھا کر مقررہ جگہ پر نصب کر دیا۔گویا آپ کے حکم بنائے جانے پر قرآن مجید شہادت دیتا ہے نیز تنبیہ بھی کرتا ہے اور کل جسے حکم بنانے کی حکمت کا ذکر قرآن مجید میں آنا تھا اسے آج ہی وہ سعادت عطا فرما دی، ارشاد ربانی ہے ''فلا و ربك لا یومنون حتیٰ یحكموك فیما شجر بینهم ثم لا یجدو فی انفسهم حرجا مما قضیت و یسلموا تسلیما'' (سورۃ النسا۔۶۴،۶۵) ترجمہ: اے محمد ﷺ تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم محمد ﷺ فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی نہ محسوس کریں بلکہ سر تسلیم خم کریں۔''

علامہ سہیلی نے لکھا ہے کہ شیطان شیخ نجدی کی صورت میں نمودار ہوا، اور چلانے لگا! کیا کر رہے ہو، کیا تمہیں گوارا ہے کہ اتنے شرفا و روسا کے ہوتے ہوئے ایک یتیم نوجوان کو منصف مان لیا ہے؟ وقتی طور پر کچھ لوگ اس کی چیخ پکار سے متاثر ہوئے مگر پھر خاموش ہو گئے اور جان دو عالم ﷺ کو وہ اعزاز مل کر رہا جو ازل سے آپ کا مقدر تھا۔

ایک اہم نقطہ: خانہ کعبہ کی تعمیر میں آنحضرت ﷺ نے بھی حصہ لیا۔اپنے چچا عباسؓ کے ساتھ مل کر پتھر اٹھاتے رہے، عرب میں دستور تھا کہ وہ وزن اٹھاتے وقت اپنی ازاریں کھول کر کندھوں پر رکھ لیتے تھے۔اس موقع پر بھی کئی افراد نے ایسا کیا۔آپ ﷺ کو بھی چچا عباسؓ نے ازار کو کندھوں پر رکھنے کا

مشورہ دیا۔آپ ﷺ نے ان کے مشورہ پر عمل کیا لیکن اس طرح آپ ﷺ برہنہ ہو گئے (قمیض چھوٹا ہونے کی وجہ سے گھٹنے یا ران کے کچھ حصے برہنہ ہو گئے)۔رب تعالیٰ کو یہ گوارا نہ ہوا کہ وہ ہستی جس نے دنیا کو شرم وحیا کی تعلیم و ہدایت کے زیور سے آراستہ کرنا ہے وہ کیونکر برہنہ ہو۔اسی وقت آواز آئی ،ترجمہ ،یا محمد! قابل پردہ حصہ ڈھانپ دیجئے ، بے ہوش ہو کر گر پڑے ،افاقہ ہوا تو اپنی ازار کا پوچھا اور پھر ازار باندھ لی۔حدیث میں ''عورۃ'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔عورۃ دو قسم کی ہوتی ہے۔عورۃ غلیظہ اور عورۃ خفیفہ ۔پہلی قسم کو شرم گاہ کہتے ہیں اور دوسری کو ناف سے گھٹنوں تک کے باقی حصہ کو کہا جاتا ہے۔صاحب سید الوریٰ (ا۔۱۵۵) بحوالہ زرقانی لکھتے ہیں کہ علامہ زرقانی نے تصریح کی ہے اور آپ ﷺ کے جسم کا جو حصہ برہنہ ہوا تھا، وہ عورۃ غلیظہ نہ تھا،عورۃ خفیفہ تھا، نعم لیس المراد۔۔۔ العُورَۃ الغَلِیظَہ۔

نکتہ: جسم کا جو حصہ ظاہر ہوا تھا وہ عورۃ غلیظہ نہ تھا،تو پھر آپ بے ہوش ہو کر کیوں گر گئے؟ آپ ﷺ کے بارے میں شہادت موجود ہے کہ حضور ﷺ کنواری لڑکیوں سے بڑھ کر باشرم و باحیا تھے اس سبب سے آپ ﷺ کا عورۃ خفیفہ کا کوئی جسمانی حصہ نظر آتا ہے تو وہ بھی آپ ﷺ کے لیے شرم وحیا کا باعث ہے نہ کے صرف عورۃ غلیظہ کا، بایں سبب آپ ﷺ بے ہوش ہو کر گر گئے۔

اعتراض نمبر ۱۸۵

گریونے باؤم (Von Grunebaun) نے حجر اسود کے بارے میں تحریر کیا کہ کعبہ کے پرستاروں کے لیے حقیقی کشش ایک سیاہ پتھر میں تھی ، یہ قدیم الایام پتھر اس کی دیواروں میں نصب تھا حضور(ﷺ) کو بادل نخواستہ اس پتھر کے تقدس و احترام کو اسلامی رسوم میں جگہ دینا پڑی جہاں وہ اب بھی اس امر کے ثبوت کے طور پر موجود ہے کہ اسلام قدیم رسوم سے اپنا دامن چھڑانے میں ناکام رہا ۔(مستشرقین مغرب کا انداز فکر۔۱۶۵)

جواب: اس کے جواب میں عرض یہ ہے کہ کعبہ کی عمارت کی چھت نہ تھی صرف قد آدم اونچی تھی یہ عمارت نشیب میں تھی ، بارش کا پانی حرم میں آتا تھا اگر چہ اس کی روک کے لیے بالائی حصہ پر بند بنوا دیا گیا تھا لیکن وہ ٹوٹ پھوٹ جاتا تھا اور عمارت کو نقصان پہنچتا تھا۔آخر کار اسے دوبارہ مستحکم بنانے کا فیصلہ ہوا۔عمارت تیار ہونے کے قریب تھی کہ حجر اسود نصب کرنے معاملہ الجھ گیا۔ہر شخص کی خواہش و آرزو تھی کہ اپنے ہاتھ سے اسے کعبہ کی دیوار میں نصب کرے لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ ہر فرد کو یہ سعادت نصیب ہوتی۔چار دن گزر گئے آخر پانچویں دن ابو امیہ بن مغیرہ جو قریش میں سب سے معمر تھے، نے رائے دی کہ کل صبح سب سے پہلے جو شخص آئے اسی کو ثالث قرار دیا جائے اس پر سب کا اتفاق ہو گیا۔اگلے دن قبائل کے آدمی موقع پر پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ نبی مکرم ﷺ جلوہ افروز ہیں۔آپ ﷺ کو حکم مان لیا۔

اور آپ ﷺ نے ایک ایک سردار کو لیا۔ آپ ﷺ نے ایک چادر بچھا دی اور حجر اسود اپنے ہاتھ سے اس میں رکھ کر کہا اب تم سب اس چادر کے کونوں کو پکڑ کر اٹھائیں۔ جب چادر حجر اسود نصب کرنے کے مقام کے برابر ہوئی تو آپ ﷺ نے حجر اسود کو اٹھا کر دیوار کعبہ میں نصب کر دیا گویا یہ اعجاز ربانی تھا کہ دین الٰہی کی عمارت، جس کو رہتی دنیا تک کے لیے قبلہ بنانا تھا، کا آخری تکمیلی پتھر بھی آپ ﷺ دستِ مبارک سے نصب ہوگا۔ مولانا شبلی (سیرت النبی۔۱۲۱) لکھتے ہیں کہ یہ ایک حدیث کی طرف تلمیح ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''میں نبوت کی عمارت کا آخری پتھر ہوں''

دوم: اس پتھر کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ کعبۃ اللہ کا طواف اس پتھر سے شروع ہوتا ہے اور اس پر آ کر ختم ہوتا ہے لہذا حج کے ارکان میں ایک رکن طواف ہے جس کے بجا لانے کا عمل کس مقام سے شروع ہو، کا علم ہمیں حجر اسود سے ہوتا ہے۔

سوم: حجر اسود کے بارے میں یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ مسلمان اس کی پرستش کرتے ہیں حالانکہ ایسا ہرگز نہیں۔ خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ کے بقول یہ صرف ایک پتھر ہے جسے نبی مکرم ﷺ نے بوسہ نہ دیا ہوتا تو ہرگز کعبہ کے دوسرے پتھروں سے ممتاز نہ ہوتا یہ نہ تو معبود ہے نہ اس کی پوجا پاٹ ہوتی ہے اس کی عظمت ہے تو صرف اس لیے کہ حبیب کبریا ﷺ کے لب مبارک اس سے مس ہوئے ''اے حجر اسود تیرا مقدر اللہ اکبر اللہ اکبر'' بعد ازاں آپ ﷺ کی یہ سنت ٹھہری۔ یہ وہ مستند ترین شے ہے جس کے توسط سے ایک عام آدمی محسوس کرتا ہے کہ اس نے عباد صالحین سے بُعد زمانی کے باوجود قرب حاصل کر لیا ہے اور یہ سب کچھ لب مصطفیٰ ﷺ کا عطا کردہ سرمایہ ہے۔ (مستشرقین مغرب کا انداز فکر۔۱۶۵) اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کعبہ کی پوجا کی جاتی ہے۔ اس پر غور فرمائیں کہ ہندو دھرم میں گائے کی پوجا پاٹ ہوتی ہے اس کو مقدس سمجھا جاتا ہے اور نقصان نہیں پہنچایا جاتا اسے ذبح کر کے ٹکڑے ٹکڑے نہیں کیا جاتا اور نہ ہی اس کا گوشت بھون کر یا پکا کر کھایا جاتا ہے نہ اس پر سوار ہوتے ہیں نہ اسے ہل میں جوتتے ہیں نہ پانی نکالنے کے لیے رہٹ پر جوڑا جاتا ہے جبکہ حضرت بلالؓ کعبہ کی چھت پر چڑھ جاتے ہیں اور اذان دیتے ہیں اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ اگر اس کو پوجا پاٹ کے قابل سمجھا جاتا تو اس پر چڑھ کر اذان نہ دی جاتی کیونکہ بھلا کوئی اپنے معبود برحق پر چڑھتا ہے۔

علامہ سیوطی (تاریخ مکہ میں لکھتے ہیں کہ کعبہ کو دس مرتبہ تعمیر کیا گیا۔

۱۔ سب سے پہلے فرشتوں نے ٹھیک ''بیت المعمور'' کے سامنے زمین پر خانہ کعبہ کو بنایا۔

۲۔ پھر حضرت آدمؑ نے اس کی تعمیر فرمائی۔

۳۔ اس کے بعد حضرت آدمؑ کے فرزندوں نے اس عمارت کو بنایا۔

۴۔اس کے بعد حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور ان کے فرزند حضرت اسمعیلؑ نے اس مقدس گھر کو تعمیر کیا جس کا تذکرہ قرآن مجید میں ہے

۵۔قوم عمالقہ کی عمارت

۶۔اس کے بعد قبیلہ جرہم نے اس کی عمارت بنائی۔

۷۔قریش کے مورث اعلیٰ ''قصی بن کلاب'' کی تعمیر

۸۔قریش کی تعمیر جس میں خود نبی ﷺ نے بھی شرکت فرمائی اور قریش کے ساتھ خود بھی اپنے دوش مبارک پر پتھر اٹھا اٹھا کر لاتے تھے۔

۹۔حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے اپنے دور خلافت میں حضور ﷺ کے تجویز کردہ نقشہ کے مطابق تعمیر کیا یعنی حطیم کی زمین کو کعبہ میں داخل کر دیا اور دروازہ سطح زمین کے برابر نیچا رکھا اور ایک دروازہ مشرق کی جانب اور ایک دروازہ مغرب کی سمت بنا دیا۔

۱۰۔عبدالملک بن مروان اموی کے ظالم گورنر حجاج بن یوسف ثقفی نے حضرت عبداللہ بن زبیر کو شہید کر دیا اور ان کے بنائے ہوئے کعبہ کو ڈھا دیا اور زمانہ جاہلیت کے نقشہ کے مطابق کعبہ بنا دیا جو آج تک موجود ہے لیکن حضرت علامہ حلبیؒ نے اپنی سیرت میں صرف تین بار تعمیر کا ذکر کیا ہے۔

۱۔حضرت ابراہم خلیل اللہ کی تعمیر۔

۲۔زمانہ جاہلیت میں قریش کی عمارت (اور ان دونوں عمارتوں کی تعمیر میں دو ہزار سات سو پینتیس (۲۷۳۵) برس کا فاصلہ ہے۔

۳۔حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی تعمیر (یہ قریش کی تعمیر کے ۸۲ سال بعد ہوئی۔

حضرات ملائیکہ اور حضرت آدمؑ اور ان کے فرزندوں کی تعمیرات کے بارے میں علامہ حلبیؒ نے فرمایا کہ یہ صحیح روایات سے ثابت ہی نہیں ہے باقی تعمیروں کے بارے میں انہوں نے لکھا ہے کہ یہ عمارت میں معمولی ترمیم یا ٹوٹ پھوٹ کی مرمت تھی تعمیر جدیدہ نہیں تھی واللہ تعالیٰ اعلم۔

غار حرا

مکہ معظّمہ سے تین میل کے فاصلہ پر ایک غار ہے جس کو حرا کہتے ہیں۔اب اس کو جبل النور کہتے ہیں۔اس غار کا طول چار گز اور عرض پونے دو گز ہے اونچائی اتنی ہے کہ ایک دراز قد آدمی کھڑے ہو کر اس میں نماز پڑھ سکتا ہے دھوپ اور بارش سے بھی بہت حد تک محفوظ ہے۔آپ ﷺ کھانے پینے کا سامان لے کر وہاں چلے جاتے اور جب تک کھانے پینے کی اشیاء ختم نہ ہوتیں، آپ ﷺ واپس تشریف نہ لاتے۔آپ ﷺ وہاں عبادت میں مصروف رہتے۔یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ کس قسم کی

عبادت کیا کرتے تھے۔شرح بخاری عینی میں ہے۔ترجمہ ''یہ سوال کیا گیا کہ آپ کی عبادت کیا تھی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ غور وفکر اور عبرت پذیری''۔مولانا شبلی لکھتے ہیں ''یہ وہی عبادت تھی جو آپ ﷺ کے دادا ابراہیمؑ نے نبوت سے پہلے کی تھی۔ستاروں کو دیکھا تو چونکہ تجلی کی جھلک تھی، دھوکہ ہوا، چاند نکلا تو اور بھی شبہ ہوا، آفتاب پر اس سے بھی زیادہ شبہ ہوا لیکن جب سب نظروں سے غائب ہو گئے تو بے ساختہ پکار اٹھے '' اِنِّي لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ o

انی وجہت ۔۔۔۔ والارض (الانعام۔۷۹) ترجمہ (میں فانی چیزوں سے محبت نہیں کرتا میں اپنا منہ اس کی طرف کرتا ہوں جس نے زمین وآسمان پیدا کیا''۔ایک مغربی مورخ کارلائل نے آنحضرت ﷺ کی عبادت کی کیفیت اس طرح بیان کی ہے''سفر وحضر میں ہر جگہ محمد ﷺ کے دل میں ہزاروں سوال پیدا ہوتے تھے، میں کیا ہوں؟ یہ غیر متناہی عالم کیا ہے؟ نبوت کیا شے ہے؟ میں کن چیزوں کا اعتقاد کروں؟ کیا کوہ حرا کی چٹانیں، کوہ طور کی سر بہ فلک چوٹیاں، کھنڈر اور میدان، کسی نے ان سوالوں کا جواب دیا؟ ہرگز نہیں بلکہ گنبد گرداں گردش لیل ونہار، چمکتے ہوئے ستارے، برستے بادل، کوئی ان سوالوں کا جواب نہ دے سکا۔'' حضرت شیخ محی الدین العربی نے لکھا ہے کہ اس وقت آپ شریعت ابراہیمی کے مطابق عبادت کرتے تھے، حتیٰ کہ آپ پر پیغام رسالت آ گیا۔(السیرت النبویہ دھلان۔۱۸۹)

غار حرا میں قیام: غار حرا میں مدت قیام کیا تھی؟ قیام کی مدت کو مبہم رکھا کیونکہ یہ مدت مقرر نہ تھی، کبھی تین رات کبھی پانچ کبھی سات رات اور کبھی رمضان کا پورا مہینہ قیام کرتے تھے۔(حوالہ بالا)

آنحضرت ﷺ نے غار حرا کا انتخاب کیوں کیا؟

جواب: غار حرا مکہ شہر سے تین یا ساڑھے تین میل کے فاصلے پر ہے۔شہر کی سرگرمیوں سے قدرے دور واقع ہے نیز دوسری غاروں کی نسبت یہ کم اونچائی پر واقع ہے جہاں لوگوں کی آمد ورفت نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے اور وہاں یکسو ہو کر مراقبہ اور غور وفکر کرنے کے لیے نہایت موزوں مقام ہے۔ دھیان کسی طرف نہیں جاتا۔

دوسری وجہ یہ ہے غار حرا کے لمبے شگاف سے کعبۃ اللہ صاف نظر آتا ہے۔غور وفکر کرنے کے ساتھ کعبہ شریف پر تجلیات الٰہیہ کے انوار کا نظارہ ومشاہدہ بھی ہو پاتا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ غار حرا کا منہ مشرق کی جانب ہے۔آفتاب جونہی طلوع ہوتا ہے تو آفتاب کی روشنی غار حرا کو جگمگا دیتی ہے اس سے اشارہ ملتا ہے کہ آفتاب آسمانی جیسے مشرق سے طلوع ہوتا ہے، اسی طرح سے آفتاب نبوت بھی مشرق سے طلوع ہونے والا تھا۔جس کی ضیاباریوں اور ہدایت کی گوہر فشانیوں سے پوری دنیا جگمگا اٹھنے والی تھی۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ (محمد رسول اللہ۔۳۳) لکھتے ہیں کہ یہ بھی درست ہے کہ محمد ﷺ کے دوست زید بن عمرو بن نوفل اور آپ ﷺ کے دادا جان حضرت عبد المطلب بھی بعض اوقات غار حرا میں جا کر عبادت کرتے تھے۔ بہر حال آپ نے بھی اس غار کو منتخب فرمایا اور وہاں تشریف لے جاتے تھے۔۔۔۔اپنے اہل خانہ سے علیحدگی اختیار کر کے مسلسل پانچ برس تک ہر سال میں ایک مہینہ کے لیے غار حرا میں جاتے تھے۔''

اپنے دادا کی نسبت سے کہ وہ بھی اس غار میں عبادت و ریاضت کے لیے جایا کرتے تھے آپ نے بھی جد امجد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اسی غار کو مراقبہ وعبادت کے لیے منتخب فرمایا۔

پانچویں وجہ علامہ غلام رسول رضوی (تفہیم البخاری۔۱۰۔۵۱۱) لکھتے ہیں کہ غار حرا میں تنہائی اختیار کرنے میں یہ حکمت تھی کہ کعبہ اس کے سامنے ہے وہاں کعبہ پر خوب نظر جمتی ہے تو غار حرا میں رہنے والے کے لیے تین عبادتیں ہیں۔ایک تنہائی، دوسری عبادت اور تیسری بیت اللہ پر نظر۔''

چھٹی وجہ یہ بھی ہے کہ غار حرا میں حضور ﷺ کی گوشہ نشینی عبادت و ریاضت سے روح کی پاکیزگی کو اس مقام پر لے جانا تھا کہ آپ کلام الٰہی اور احکام خداوندی کی پذیرائی کے لیے آمادہ ہو جائیں۔اس قسم کا ایک واقعہ حضرت موسیٰ کو طور پہاڑ پر پیش آیا تھا کہ چالیس دن کی خلوت کا حکم ہوا تھا اور جب یہ چلہ ختم ہوا تو الواح تورات عطا ہوئیں، چنانچہ سورت طٰہٰ میں ارشاد ہوتا ہے'' ثم جئت علیٰ قدر یا موسیٰ ''فرق یہ ہے کہ موسیٰ کی چلہ کشی بعد از نبوت تھی اور آپ کی عزلت گزینی قبل از رسالت (سیرت طیبہ پروفیسر غلام ربانی۔۱۔۸۷)

ساتویں وجہ یہ ہے: کہ عرب کا ماحول بت پرستی کی بھینٹ چڑھ چکا تھا ہر قبیلے کا ایک بت تھا انفرادی طور پر ہر ایک اپنی مرضی کا بت بنا کر اس کی پوجا کرتا تھا ان کا عقیدہ یہ تھا جسے قرآن مجید نے بیان کیا ہے۔''ترجمہ: ہم ان بتوں کو صرف اس لیے پوجتے ہیں کہ ہم کو خدا کے قریب کر دیں۔(ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفیٰ)۔تمام قبائل بت پرستی کی لپیٹ میں تھے ان کو پوجنے کا مقصد ان کے ذریعے حاجت روائی تھی۔لڑائیوں میں فتح دلانے، قحط کو ٹالنے والے وغیرہ کو حاجت روا سمجھتے تھے۔ان کے مشہور بت لات، عزیٰ، منات، ود، سواع، یغوث اور یعوق تھے سب سے بڑا ہبل تھا جو کعبہ کی چھت پر نسب تھا۔خانہ کعبہ ۳۶۰ بتوں کا مسکن تھا۔آپ ﷺ بت پرستی سے شدید نفرت تھی۔اس تاریک اور بے روشن ماحول میں آپ ﷺ گوشہ تنہائی اختیار کر کے بت پرستی کی لعنت کو ترک کر سکتے تھے اس علیحدگی کی فضا کے حصول کے لیے آپ ﷺ غار حرا میں ہر سال ایک ماہ قیام فرماتے تھے۔

اعتراض نمبر ۱۸۶

''واٹ'' کہتا ہے کہ ''غار حرا میں آپ ﷺ کے جانے کی ایک سے زیادہ وجوہ ہوسکتی ہیں مثلاً گوشہ نشینی کو مستحسن سمجھتے ہوئے یہودیوں اور مسیحوں کا راہبانہ جذبہ کارفرما ہوسکتا ہے، محدود شخصی تجربہ بھی ایک امکانی وجہ ہوسکتی ہے۔ یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے کہ جو لوگ مکہ میں سخت گرمی سے بچنے کے لیے طائف جانے کی قدرت نہیں رکھتے تھے، وہ گرمی کی شدت سے بچنے کے لیے غاروں کا بھی رخ کیا کرتے تھے، ممکن ہے محمد ﷺ نے ایسا ہی کیا ہو'' (حوالہ بالا۔۳۶۵)

جواب: دنیا میں جس چیز نے سب سے زیادہ گمراہی پھیلائی، وہ دین اور دنیا کا فرق ہے۔ دین کا کام الگ کیا گیا اور دنیا کا الگ، اللہ کا حکم الگ ٹھہرایا گیا اور قیصر کا حکم الگ، دنیا کے حصول کا الگ راستہ بتایا گیا اور دین کے حصول کا الگ۔۔۔لوگ سمجھتے ہیں کہ ذکر وفکر، گوشہ نشینی وعزلت گزینی، کسی غار اور پہاڑ کی کھوہ میں بیٹھ کر اللہ کو یاد کرنا۔۔۔دین داری ہے اور دوست احباب، آل واولاد، ماں باپ ،قوم وملک اور خود اپنی مدد آپ ،فکر معاش اور پرورش اولاد۔۔۔دنیا داری ہے۔اسلام نے اس غلطی کو حرف مکرر کی طرح مٹا دیا اور بتایا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ان حقوق اور فرائض کا بخوبی ادا کرنا بھی دین داری ہے۔ارشاد ربانی ہے۔ '' رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللَّهِ''(نور۔۲۴۔۳۷) (ترجمہ) یہ وہ لوگ ہیں جن کو تجارت اور خرید وفروخت اللہ کی یاد سے غافل نہیں کرتی ۔'' جہاں تک ''واٹ'' کے راہبانہ جذبہ کا سوال ہے اس کی سرے سے اسلام نے جڑ کاٹ کر رکھ دی قرآن مجید کی سورہ الحدید میں ارشاد ربانی ہے '' وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ '' (ترجمہ) اور رہبانیت جس کو انہوں نے (عیسائیوں نے) دین میں داخل کیا ہم نے ان پر اس کو فرض نہیں کیا تھا ۔'' اور آنحضرت ﷺ نے اعلان فرمایا ''لَا صَرُورَةَ فِي الْاِسلَامِ'' (ابوداؤد) ترجمہ ''اسلام میں رہبانیت نہیں'' ،اور جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی جائز لذتوں کو اپنے اوپر حرام کر دیا تھا۔ان سے قرآن مجید سوال کرتا ہے '' قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ '' ترجمہ: '' کہو کس نے اللہ کی آرائش، جس کو اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کیا: حرام کی ''

پیغمبر اسلام ﷺ وہ دین لائے جس میں رہبانیت کی گنجائش نہیں ہے تو وہ از خود یہودیوں اور مسیحوں کے جذبہ رہبانیت پر بھلا کیسے عمل پیرا ہو سکتے ہیں؟ واٹ اسلام کے ڈانڈے عیسائیت اور یہودیت سے ملانے کی کوشش کرتا ہے جبکہ قرآن مجید اور فرمان نبوی رہبانیت کا قلع قمع کرتے ہیں۔اللہ کی عبادت ہر مذہب میں تھی اور ہے۔۔۔لیکن قدیم مذاہب میں ایک عام غلط فہمی پھیل گئی تھی کہ عبادت کا مقصود جسم کو تکلیف دینا ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں ہے کہ یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ جس قدر اس

ظاہری جسم کو تکلیف دی جائے گی اسی قدر روحانی ترقی ہوگی اور دل کی باطنی صفائی بڑھے گی۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہندوؤں میں عام طور سے جوگ اور عیسائیوں میں رہبانیت پیدا ہوئی اور بڑی بڑی مشکل ریاضتوں کا وجود ہوا اور ان کو روحانی ترقی کا ذریعہ سمجھا گیا۔۔۔کوئی عمر بھر نہانے سے پرہیز کر لیتا تھا، کوئی عمر بھر ٹاٹ کا کمبل اوڑھے رہتا، کوئی ہر موسم میں ننگا دھڑنگا رہتا تھا تو کوئی عمر بھر کھڑا رہتا تھا، کوئی عمر بھر دھوپ میں کھڑا رہتا، کوئی پوری زندگی صرف درختوں کی پتیاں کھا کر گزارہ کرتا تھا، کوئی عمر بھر تجرد میں گزار دیتا تھا اور قطع نسل کو عبادت سمجھتا تھا، کوئی درخت پر الٹا لٹک جاتا تھا، کوئی عمر بھر چٹان پر بیٹھا رہتا تھا اور کوئی عمر بھر غار میں بیٹھا زندگی گزار دیتا تھا۔ان تمام مصائب سے دین اسلام نے انسان کو نجات بخشی ۔اسلام میں طاقت سے زیادہ تکلیف کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ارشاد ربانی ہے ''لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَہَا'' ترجمہ:اللہ کسی جان کو اس کی وسعت سے زیادہ کا حکم نہیں دیتا''۔آنحضرت ﷺ کا غار حرا میں غور وفکر میں مشغول رہنا کسی صورت میں بھی رہبانیت نہیں ہے بلکہ یہ چیزیں تو دیگر مذاہب کی ایجاد کردہ ہیں اور آپ ﷺ ان تمام اوہام کو ختم کرنے والے تھے نیز آپ ﷺ از خود ہر حقیقت کو اس حد تک جان گئے تھے کہ پوری کائنات کا خالق صرف اور صرف ایک ہی ہے۔وہ ہے اللہ! جس کے ہاں ہر شخص کے لیے سزا و جزا ہے۔سو جو کرتا ہے ذرہ بھر بھلائی وہ دیکھ لے گا اور جو کرتا ذرہ بھر برائی وہ دیکھ لے گا۔

واٹ یہ شوشہ بھی چھوڑتا ہے گرمی سے بچنے کے لیے جن لوگوں میں طائف جانے کی استطاعت نہیں تھی وہ غاروں کا رخ کرتے تھے۔ یہ درست نہیں ہے بلکہ بات یہ ہے کہ شروع دن سے آج تک انسان کی یہ خواہش رہی ہے کہ سکون وقرار میسر آئے۔اکثر انبیاء ورسل نے سکون اور یکسوئی کے لیے پہاڑوں اور غاروں کو کچھ عرصہ کے لیے پناہ گاہ بنایا حتیٰ کہ وہ سکون نصیب ہوا جس کی انہیں تلاش تھی۔ حضرت آدمؑ کی جب توبہ قبول ہوئی تو ''جبل رحمت'' پر حضرت حوا سے ان کی ملاقات ہوئی اور اسی کی یادگار وہ مقام ہے جس کا نام ''عرفہ'' (یعنی پہچان کی جگہ) حضرت نوحؑ کی کشتی اِراراط پہاڑ پر جا رکی تھی ۔سیدنا موسیٰؑ کو کوہ طور پر تجلی وکلام کا شرف حاصل ہوا تھا۔قرآن پاک میں اصحاب کہف کا ذکر ہے جو اس وقت کے ظالم بادشاہ دقیانوس نامی سے دور رہنے کی خاطر غار میں پناہ گزین ہوئے تھے کیونکہ وہ بادشاہ جبراً بتوں کی پوجا کرواتا اور جو نہ مانے اسے سنگسار کرا دیتا تھا۔خدا کے مقدس پیغمبر حضرت عیسیٰؑ نے بھی بیت المقدس کے کوہ زیتون کی کھوہ میں قیام فرمایا تھا اسی طرح پیغمبروں اور رسولوں کی پیروی کرتے ہوئے آپ ﷺ نے بھی مراقبہ وغور وفکر کے لیے غار حرا کا انتخاب فرمایا نیز ایک موقع پر لوگوں کو ایک خدا کی عبادت کرنے کا درس دینے کے لیے کوہ صفا پر اعلان کیا تھا اور ہجرت کے موقع پر غار ثور جو مکہ سے پانچ چھ میل دور ہے، اس کی بلندی بہت زیادہ اور راستہ بہت سنگلاخ ہے، میں تین شبانہ روز اقامت

فرما کر اگلے دن عازم مدینہ ہوئے تھے گویا پیغمبروں کی زندگی میں غاروں کی ایک خاص اہمیت ہے۔ یہ نہیں ہے کہ گرمی سے بچنے کے لیے آپ ﷺ نے غار حرا کا رخ کیا تھا۔ (۲) کیا دیگر پیغمبروں نے بھی گرمی کی شدت کے باعث پہاڑوں اور غاروں کا رخ کیا تھا، ہرگز نہیں بلکہ حضرت موسیٰؑ کو وہ طور پہاڑ پر تجلی و کلام سے نوازا گیا اور اصحاب کہف ظالم بادشاہ سے محفوظ رہنے کے لیے غار میں جا لیٹے تھے سیدنا عیسیٰؑ نے کوہ زیتون کی ایک کھوہ میں قیام کیا۔ گویا پیغمبرانہ زندگی میں غاروں کی اہمیت دوسری ہے اور اس میں کسی قسم کی گرمی کی شدت سے بچاؤ کا اظہار نہیں ہے بلکہ غاروں میں قیام میں کئی حکمتیں اور اسرار پوشیدہ ہیں۔ دراصل واٹ خواہ جتنی چالیں چلے، پینترے بدلے لیکن وہ صرف گرمی سے بچنے کا شوشہ چھوڑ کر وحی الٰہی کے مقدس مقام حرا کو محو نہیں کر سکتا۔ یہ وہ غار ہے جس نے انسانیت کو درس دیا اور علم کے چشمے پھوٹے اور انسانیت کو راہ مستقیم اور ہدایت نصیب ہوئی۔ اگر واٹ کی یہ بات مان بھی لی جائے کہ گرمی سے بچاؤ کے لیے آپ ﷺ غار میں تشریف لے جاتے تھے تو واٹ کے پاس اس سوال کا جواب کیا ہے۔ کہ آپ ﷺ اکیلے ہی غار حرا میں کیوں تشریف لے جاتے تھے اور اپنی زوجہ محترمہ کو ساتھ کیوں نہیں لے جاتے تھے؟ کیا انہیں گرمی کی شدت محسوس نہیں ہوتی تھی جیسا کہ تاریخ گواہ ہے کہ خدیجہ الکبریٰؓ صرف خور و نوش کا سامان لے جاتیں اور آپ ﷺ کے سپرد کر کے واپس آ جاتی تھیں۔ حالانکہ آپ ﷺ کو گرمی نہیں لگتی تھی۔ آپ ﷺ پر بادل سایہ کناں رہتا تھا۔ اپنی رضاعی ماں کے ہاں بکریاں چرا رہے تھے کہ آپ ﷺ کی رضاعی والدہ حلیمہ سعدیہ آتی ہیں اور اپنی بیٹی شیماؓ کو ڈانٹ پلاتی ہیں کہ اتنی گرمی میں تو میرے بیٹے کو یہاں لے آئی ہو اس نے کہا امی جان! محمد ﷺ کو گرمی نہیں لگتی کہ ایک ابر کا ٹکڑا آپ ﷺ پر ہمیشہ سایہ کیے رہتا ہے۔ یہ روایت بھی ہے کہ زید بن عمرو اور آپ کے دادا عبدالمطلب بھی غار حرا میں بغرض عبادت جاتے تھے۔ یہی جذبہ آپ کو بھی وہاں کشاں کشاں لے گیا اور ہر سال ایک ماہ کے لیے آپ غار میں قیام فرماتے تھے، آخری قیام کے دوران آپ رات کو غار میں سوئے ہوئے تھے، ایک شاندار خواب دیکھا۔۔۔ یعنی پہلی وحی کا نزول ہوا۔ امام سہیلی کہتے ہیں کہ پہلی وحی سترہ رمضان تیرہ قبل از ہجرت بمطابق بائیس دسمبر ۶۰۹ء نازل ہوئی۔ یہ ماہ دسمبر کی خنک رات تھی جس سے واٹ کا گرمی سے بچاؤ کا من گھڑت قصہ ملیا میٹ ہو جاتا ہے۔ اہل معرفت غار ثور اور غار حرا کی عزت و عظمت کو جانتے ہیں تبھی تو اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں کہتے ہیں کہ کاش ہماری قسمت میں بھی ثور و حرا جیسی ہو جائے اور ہمارے دل میں ایک گہرا غار بن جائے جس میں محبوب دل نواز آ کر رونق افروز ہوں۔

قسمتِ ثور و حرا کی حرص ہے
چاہتے ہیں دل میں گہرا غار ہم

مستشرق واٹ دور کی کوڑی لاتا ہے اور غار حرا میں گوشہ نشینی کو راہبانہ زندگی اور گرمی سے بچاؤ کی تاویلات کر کے اس بات سے انکار کرنا چاہتا ہے کہ غار حرا میں وحی کا نزول نہیں ہوا تھا۔ جب وحی کا نزول ہی نہیں ہوا تو پھر قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی نازل نہیں ہوا تھا اور نہ ہی آپ ﷺ اللہ کی طرف سے بھیجے گئے رسول نہیں تھے اس لیے وحی کے نزول اور قرآن کے نازل ہونے کا انکار کرتا ہے ۔جبکہ مآخذ ''واٹ'' کے اس نظریہ کی بلا روک ٹوک تردید کرتے ہیں۔

اثبات وحی میں قرآن کا فرمان

ارشاد خداوندی ہے '' قُلۡ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُکُمۡ یُوۡحٰۤی اِلَیَّ (الکھف۔۱۱۰) میں تمہاری طرح بشر ہوں، مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔امام غزالی معارج النبوہ میں نبوت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں'' نبوت انسانیت کے رتبہ سے بالاتر ہے جس طرح انسانیت حیوانیت سے ۔۔۔وہ عطیہ الٰہی اور موہبت ربانی ہے۔سعی ومحنت اور کسب و تلاش سے نہیں ملتی ارشاد خداوندی ہے '' اَللّٰہُ اَعۡلَمُ حَیۡثُ یَجۡعَلُ رِسَالَتَہٗ (الانعام۔۱۲۴) ترجمہ ''اللہ بہتر جانتا ہے کہ جہاں وہ اپنی پیغمبری کا منصب بنائے۔'' ایک مقام پر ہے ۔وَکَذٰلِکَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ رُوۡحًا مِّنۡ اَمۡرِنَا ط مَا کُنۡتَ تَدۡرِیۡ مَا الۡکِتٰبُ وَلَا الۡاِیۡمَانُ وَلٰکِنۡ جَعَلۡنٰہُ نُوۡرًا نَّہۡدِیۡ بِہٖ مَنۡ نَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِنَا ط وَاِنَّکَ لَتَہۡدِیۡۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ○ (سورۃ الشوریٰ۔۵۲)

ترجمہ ''اور یونہی ہم نے تمہیں وحی بھیجی ایک جان فزا چیز اپنے حکم سے اس سے پہلے نہ تم کتاب جانتے تھے نہ احکام شرع کی تفصیر ہاں ہم نے اسے نور کیا جس کو ہم راہ دکھاتے ہیں اپنے بندوں سے جسے چاہتے ہیں اور بے شک تم ضرور سیدھی راہ بتاتے ہو''۔

وحی کی حجیت: قرآن پاک میں بیسیوں آیات مبارکہ وحی کی حجیت میں موجود ہیں چند ایک آیات بیان کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

وَمَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡہَوٰی ط اِنۡ ہُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی (سورہ نجم۔۴۔۳) ترجمہ ''اور تو بولتا ہی نہیں خواہش اپنی سے نہیں ہے یہ مگر وحی جو ان کی طرف بھیجی جاتی ہے۔'' ایک اور مقام پر ارشاد ربانی ہے '' قُلۡ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُکُمۡ یُوۡحٰۤی اِلَیَّ اَنَّمَاۤ اِلٰـہُکُمۡ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ ج (الکھف۔۱۱۰)'' ترجمہ کہہ دے کہ میں تو تمہاری طرح ایک بشر ہوں مجھ پر وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔''

انبیاء کو وحی سے نوازا جاتا رہا آپ سے پہلوں کو بھی یہ شرف حاصل رہا اور جھٹلانے والے کفار کو دوٹوک رد فرمایا جاتا رہا، ارشاد خداوندی ہے۔وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا قَبۡلَکَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِیۡۤ اِلَیۡہِمۡ فَسۡـَٔلُوۡۤا اَہۡلَ الذِّکۡرِ اِنۡ کُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ○ (الانبیاء۔۷) (اور ہم نے نہیں بھیجا رسول بنا کر تم سے پہلے لیکن انسانوں ہی کو ہم وحی کرتے تھے، جاننے والوں سے پوچھو اگر تم نہیں جانتے)۔

ایک اور مقام پر ہے۔

" وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِىۡۤ اِلَيۡهِمۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡقُرٰىؕ (یوسف۔۱۰۹) ترجمہ "اور ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھیجے وہ بشر ہی تھے آبادیوں میں رہنے والے، ہم ان پر وحی کرتے تھے"۔

ایک اہم نکتہ: "نبی ﷺ وحی کا پیغام وصول کرنے کے دوران میں اسے یاد کرنے اور زبان سے دہرانے کی کوشش فرمارہے ہوں گے اس کوشش کی وجہ سے آپ ﷺ کی توجہ بار بار بٹ جاتی ہوگی۔ سلسلہ اخذ وحی میں خلل واقع ہو رہا ہوگا۔ پیغام کی سماعت پر توجہ پوری طرح مرکوز نہ ہو رہی ہوگی اس کیفیت کو دیکھ کر یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ آپ ﷺ کو پیغام وحی وصول کرنے کا درست طریقہ سمجھایا جائے۔"

ایک سطر آگے چل کر مولانا مودی لکھتے ہیں "ابتدائی زمانہ میں جب نبی ﷺ کو اخذ وحی کی عادت اچھی طرح نہ پڑی تھی آپ ﷺ سے کئی مرتبہ یہ فعل سرزد ہوا ہے۔ (ضیا القران۔۳۔۱۳۷۔۱۳۸) آپ ﷺ جلد جلد زبان کو حرکت دیتے " وَلَا تَعۡجَلۡ بِالۡقُرۡاٰنِ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ يُّقۡضٰۤى اِلَيۡكَ وَحۡيُهٗ ، "(ترجمہ: اور عجلت نہ کیجئے قرآن کے پڑھنے میں اس سے پہلے کہ پوری ہو جائے آپ ﷺ کی طرف اس کی وحی)

علامہ ابن کثیر نے حضرت ابن عباس کی حدیث نقل کی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ کو نبوت کے ابتدائی ایام میں نزول وحی کے وقت بڑی شدت کا سامنا کرنا پڑتا جو جبرائیلؑ کی زبان سے نکلتا اس کی طرف بھی پوری توجہ از بس ضروری تھی اور جو وہ سناتے اس کا یاد رکھنا بھی از حد اہم تھا نہ توجہ کو ادھر سے ہٹایا جاسکتا تھا نہ وحی کو فراموش کرنے کا خطرہ برداشت کیا جاسکتا تھا چنانچہ جبرائیلؑ جو کلام الٰہی سناتے حضور ﷺ اسے پورے انہماک اور توجہ سے سنتے بھی اور ساتھ ہی ساتھ اسے زبان سے دہراتے بھی دونوں بوجھوں کا بیک وقت متحمل ہونا گراں اور شاق ضرور تھا لیکن نبوت کی نازک ذمہ داریوں کے پیش نظر اس کے بغیر چارہ کار بھی نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس مشکل کو یہ فرما کر آسان کر دیا کہ اے محبوب! جبرائیلؑ جب میرا کلام پڑھ کر تمہیں سنائے تو آپ ﷺ اسے سنتے رہیے اور یہ فکر نہ کیجئے کہ بھول جائے گا اسے یاد کرا دینا اور اس کے معنی و مطالب سے آگاہ کرنا ہم نے اپنے ذمہ لے رکھا ہے آپ کو اس لیے متردد اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ حصول علم کا عام طریقہ تو یہی ہے کہ استاد جو کہے شاگرد اسے غور سے سنتا بھی جائے اور ساتھ ساتھ اسے ذہن میں محفوظ بھی کرتا جائے لیکن اللہ تعالیٰ کے عطیات نرالے ہیں وہ بغیر مشقت کوئی نعمت عطا فرمادے تو یہ اس کا کرم ہے۔ کرم شاہ بھیروی لکھتے ہیں جب عصر حاضر کے ایک مشہور مصنف کی تفسیر میں یہ پڑھا تو انتہائی دکھ ہوا۔ وہ لکھتے ہیں کہ "نبی وحی کا پیغام وصول کرنے کے دوران میں اسے یاد کرنے اور زبان سے دہرانے کی کوشش فرمارہے ہوں گے اس کوشش کی وجہ سے آپ ﷺ کی توجہ بار بار ہٹ جاتی ہوگی۔۔۔ پیغام کی سماعت پر توجہ پوری طرح

مبذول نہ ہوگی اس کیفیت کو دیکھ کر یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ آپ ﷺ کو پیغام وحی وصول کرنے کا صحیح طریقہ سمجھایا جائے۔ میرے جیسا مبتدی بہر حال اس عبارت کا مدعا نہیں سمجھ سکا۔ حصول وحی کے لیے حضور ﷺ کی یہ مشقت آپ ﷺ کا کمال اور احساس ذمہ داری کا ثبوت تھا یا وجہ نقص تھی۔ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اس کا محض احسان اور لطف تھا یا کسی غلطی کی اصلاح اور کوتاہی کی تلافی تھی؟ کیا نبوت اور اس کے لوازمات وہبی ہیں یا کسبی اور عادت سے حاصل ہوتے ہیں؟ یہ چیزیں غور طلب ہیں۔

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

وحی کا نزول (کس دن، کس تاریخ اور کس مہینہ میں ہوا)

وحی کے نزول کے دن تاریخ اور مہینہ کے بارے میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ ربیع الاول کا مہینہ تھا بعض کہتے ہیں کہ یہ رمضان کا مہینہ تھا اور بعض کے نزدیک رجب کا مہینہ ہے۔ دوسرا قول زیادہ صحیح ہے یعنی نزول وحی کا مہینہ رمضان ہے کیونکہ ارشاد خداوندی ہے ''شَھْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْہِ الْقُرْاٰنُ'' ترجمہ: (رمضان کا مہینہ بھی (وہ بابرکت مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا اور یہ بھی ارشاد ہے ''انا انزلناہ فی لیلۃ القدر (۹۷۔۱) یعنی ہم نے قرآن کو لیلۃ القدر میں نازل کیا''۔

رمضان کے مہینہ میں نزول وحی کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ غار حرا میں رسول اللہ ﷺ رمضان کے مہینہ میں قیام فرمایا کرتے تھے اور یہ بھی معلوم ہے کہ جبرائیلؑ حرا ہی میں تشریف لائے تھے۔

جب وحی کا نزول ہوا تو اس دن کونسی تاریخ تھی؟ بعض سات، بعض سترہ اور کئی اٹھارہ کہتے ہیں اس بات پر سیرت نگاروں کا اتفاق ہے کہ آپ ﷺ کی بعثت دوشنبہ کو ہوئی اس کی تائید ابو قتادہ کی روایت سے ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دوشنبہ کے روزہ کے بارے میں پوچھا گیا فرمایا: کہ یہ وہ دن ہے جس میں، میں پیدا ہوا اور جس میں مجھے پیغمبر بنایا گیا یا جس روز مجھ پر وحی نازل کی گئی۔ (مسلم شریف)

اس سال دوشنبہ ۷، ۱۴، ۲۱ اور اٹھائیس تاریخوں کو پڑتا ہے اور یہ صحیح روایات سے ثابت ہے کہ لیلۃ القدر رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں ہے۔ اول قرآن کا نزول لیلۃ القدر میں ہوا دوم مذکور ابو قتادہ کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ دوشنبہ کو مبعوث ہوئے سوم تقویمی حساب دیکھتے ہیں کہ دو شنبہ کا دن رمضان کی کونسی تاریخوں میں پڑتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی بعثت اکیسویں رمضان کی رات میں ہوئی، یہی وحی کے نزول کی تاریخ ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے رحیق المختوم۔ ۱۱۸)

خواب کے ذریعے نبوت کا آغاز چالیس سال کی عمر مکمل ہونے پر ماہ ربیع الاول میں ہوا یہی آپ ﷺ کی ولادت کا مہینہ ہے اور وحی کا نزول حالت بیداری میں غار حرا میں رمضان میں ہوا۔

ابتداءِ وحی

وحی کی ابتدا رویائے صادقہ سے ہوئی جو کچھ آپ خواب میں دیکھتے اسی طرح وہی ظہور میں آتا۔ یہ مقدمات نبوت کا ظہور ہو رہا تھا اس وقت آپ کی عمر چالیس سال کے پیٹے میں تھی۔ رویائے صادقہ چھ ماہ تک رہے آخر کار ایک روز غار حرا میں مراقب تھے کہ جبرائیلؑ فرشتہ آپ ﷺ کے پاس اللہ کا پیغام لے کر آیا اور کہا: اقراء (پڑھو) آپ نے فرمایا مَا اَنَا بِقَارِیٍ (میں پڑھنے والا نہیں ہوں) فرشتہ نے آپ ﷺ کو سینہ سے لگا کر بھینچا پھر اقراء کہا: آپ نے فرمایا ''ما انا بقاری'' فرشتہ نے دوبارہ بھینچا اور کہا اقراء، تیسری بار فرشتہ نے کہا: اِقرَ ا بِاسمِ رَبِّکَ الَّذِی خَلَق'' آپ نے ان کلمات کو پڑھا (اقراء باسم ربك الذی خلق ۝ خلق الانسان من علق ۝ اقراء وربك الاكرم ۝ الذی علم بالقلم ۝ علم الانسان مالم تعلم ۝) آپ پڑھیے اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا فرمایا، پیدا کیا انسان کو جمے ہوئے خون سے، پڑھیے آپ کا رب بڑا کریم ہے جس نے علم سکھایا قلم کے ذریعے سے، اس نے سکھایا انسان کو جو وہ نہیں جانتا تھا۔''

مستشرقین ایسی چیزوں کی تلاش میں مصروف رہتے ہیں جن کو بنیاد بنا کر اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ اور ان کے اصحاب کو نشانہ تنقید بنا سکیں۔ بدقسمتی سے انہیں اپنے موقف کے لیے مواد بھی ہمارے اپنوں کی تحریروں سے ہاتھ لگ جاتا ہے پھر انہیں مزید غلط رنگ دے کر اور خوب نمک مرچ لگا کر شکوک وشبہات کے علاوہ فی نفسہٖ واقعہ کو غلط ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں۔ اسی طرح وحی کے متعلق عجیب وغریب باتیں کرتے ہیں۔ کئی وحی کے منکر ہیں، کئی کہتے ہیں پیغمبر اسلام ﷺ کو خود اپنے اوپر آنے والی وحی پر یقین نہیں تھا، ذہنی کشمکش طویل آزمائش کے بعد ہوئی، کسی نے کہا کہ پیغمبر ﷺ نے ایک سدھائے ہوئے کبوتر کو فرشتہ کہا جو ان کے پاس وحی لایا کرتا تھا۔ یہ بات مشہور ہے کہ جب پاکرک صاحب نے کروبٹس سے پوچھا کہ یہ قصہ تم نے لکھا ہے کہ محمد ﷺ نے ایک کبوتر پال رکھا تھا اور اسے تعلیم کیا تھا اور وہ ان کے کان سے میل نکالا کرتا تھا اور مشہور کیا تھا کہ وہ فرشتہ ہے جو ان کے پاس وحی لایا کرتا ہے تو اس عجب قصہ کی کیا سند ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ ''اس قصہ کی کوئی سند اور کچھ ثبوت نہیں، حقیقت یہ ہے کہ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ایسے جیسے قصوں کو بالکل چھوڑ دیا جائے جو باتیں اس انسان (محمد ﷺ) نے اپنی زبان سے نکالیں، بارہ سو برس سے اٹھارہ کروڑ آدمیوں کے لیے بمنزلہ ہدایت کے قائم ہیں۔ ان اٹھارہ کروڑ آدمیوں کو بھی اسی طرح اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا جس طرح ہم کو پیدا کیا ہے۔ اس وقت جتنے آدمی محمد ﷺ کے کلام پر اعتقاد رکھتے ہیں، اس سے بڑھ کر اور کسی کے کلام پر اس زمانہ کے لوگ یقین نہیں رکھتے۔'' کسی نے کہا کہ یہ ان کی اپنی اختراع ہے کہ اپنے کو رسول منوا سکیں۔ کسی نے کہا کہ وحی ایک قوت جبرائیلہ کا نام ہے جو ایک مقام پر جا کر آدمی میں پیدا ہوتی ہے اور خارج میں کچھ نہیں نیز آغاز وحی کے متعلق کتب واحادیث

میں جو روایات پائی جاتی ہیں ان میں وہ جملے جن سے وہ پیغمبر ﷺ کی ذات کو موردالزام ٹھہراتے ہیں، لے لیتے ہیں مثلاً ”لَقَد خَشِيتُ عَلٰی نَفسِی“ (مجھے اپنی جان کا خوف لاحق ہو گیا ہے)

ملکۂ نبوت: کائنات میں علم وتعقل نے پستی سے بلندی کی طرف ترقی کی ہے جمادات بے حس ہیں۔ان کے اوپر نباتات، جن میں صرف احساس ہوتا ہے اور ذہنی ودماغی قویٰ، حافظہ، غوروفکر اور تدبر کی قوت سے محروم ہیں۔ان سے اونچا درجہ حیوانات کا آتا ہے، جن میں قویٰ ناقص ونا تمام طریقے سے ظاہر ونمودار ہوتے ہیں۔آخر میں ان سے بالاترین ہستی انسان ہے، جس میں تمام قویٰ پورے طور اور پورے کمال سے ظاہر ہوتے ہیں۔ان قویٰ کی ترقی یہیں رک نہیں جاتی بلکہ جس طرح نباتات میں قوت احساس ہے مگر جمادات اس سے محروم ہیں۔حیوانات میں حافظہ، تصور، تعقل وغیرہ کے وہ قوانین جو نباتات میں نہیں، انسان میں وہ دماغی وذہنی قویٰ ہیں جو حیوانات میں نہیں، اسی طرح انبیاءؑ میں علم وتعقل کی ایک ایسی قوت اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کی جاتی ہے جو عام دوسرے انسانوں میں سوائے نبی کے نہیں ہوتی ہے، اسی کا نام ملکہ نبوت ہے۔

حواس صرف حیات کو دریافت کرتے ہیں۔دماغی قویٰ مادیات سے بلند ذہنیات اور عقلیات کو، اور ملکہ نبوت اس سے بھی اونچا مقام و درجہ ہوتا ہے، وہ ذہنیات وعقلیات سے بلند تر حقائق یعنی غیبیات دریافت کرتا ہے۔اس ذریعہ علم میں غوروفکر کی ضرورت نہیں پڑتی ہے بلکہ حقائق اس طرح سامنے آتے ہیں جس طرح وجدانیات، فطریات، بدیہات اور محسوسات سامنے آتے ہیں۔اور ان کی طرح وہ یقینی بھی ہوتے ہیں اور چونکہ اس ذریعہ میں علم انسانی کے عام ذریعے یعنی وجدان، فطرت نوعی، بداہت اولیہ، احساس اور غوروفکر سے معلومات حاصل نہیں کی جاتیں بلکہ خود علام الغیوب وہ علم ان انسانی وسائط کے بغیر عطا کر دیتا ہے۔یہ علم یقینی اور اٹل ہوتا ہے۔اسے شرع کی زبان میں وحی والہام کہتے ہیں۔۔۔۔ بلکہ اللہ تعالیٰ پیغمبروں کو وقتاً فوقتاً احکام اور ارادوں سے براہ راست فرشتوں کے ذریعے مطلع کرتا رہتا ہے یہی وحی ہے۔

اہم نکتہ: اہل عقل ونقل کا منشاء یہ ہے کہ آیا وحی جو خود پیغمبر کے مافوق اور غیر معمولی وہبی علم وفہم کا نتیجہ ہوتی ہے یا خود براہ راست وقتاً فوقتاً تعلیم ربانی کا، دوسرے لفظوں میں یہ کہوں کہ جس طرح عام انسانوں میں علم وفہم کی قوت آغاز پیدائش ہی میں ودیعت کر دی جاتی ہے، اسی طرح انبیاء میں منشائے ایزدی سے ان کو کسی غیبی ذریعہ سے وقتاً فوقتاً آگاہ کرتا رہتا ہے۔لیکن واقعہ یہ ہے کہ حقیقت عقل کی نقل سے اور نقل کی عقل سے علیحدگی میں نہیں بلکہ اتحاد میں ہے۔وہ لوگ جو عقل ونقل دونوں کو مجتمع کرتے ہیں، انبیاء میں اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے بداءِ فطرت اور آغاز پیدائش سے ان امور کے متعلق جن کا ان کی نبوت ورسالت سے تعلق ہوتا ہے اور جن کو دین کہتے ہیں، کلیؒ استعداد اور عمومی فہم ہوتا ہے جس سے غیر

انبیاء محروم ہوتے ہیں۔ اوراس میں پوشیدہ قوت کا عملی ظہوراس وقت شروع ہوتا ہے جب وہ نبوت کے منصب پر عملاً فائز ہوتے ہیں، اسی کا نام ملکہ نبوت ہے۔ اوراہم امور دین کے متعلق ان کوغیب سے اطلاع ملتی رہتی ہے، اس کا نام وحی ہے۔ آجکل قرآن فہمی اور عقل کے مدعیان اورنقل کے لفظی پابند یہ سمجھتے ہیں کہ ہرلفظ جو نبی کے منہ سے نکلتا ہے وہ اس معنی میں وحی ہے جس معنی میں قرآن مجید ہے کہ وہ براہ راست خدا کی غیب کی اطلاع ہے اور عقل کے مدعی یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن مجید بے شک خدا کی براہ راست وحی ہے مگراس کے سوا جو کچھ رسول کہتا ہے وہ اس کے پیغمبرانہ نہیں بلکہ اس کے بشری علم وفہم کا نتیجہ ہے۔ لیکن حقیقت ان دونوں سے ماوراء ہے جیسے وحی قرآنی وحی براہ راست ہے، اسی طرح نبی کے دوسرے احکام اس کے عام انسانی و بشری علم وفہم کا نہیں بلکہ اس کی پیغمبرانہ وہبی قوت علم وفہم کا نتیجہ ہیں، جووحی کی ایک دوسری قسم اس لیے کہی جاسکتی ہے کہ یہ کائنات بحثیت مجموعی کیا ہے؟ اس کونظم وضبط میں رکھنے اورایک محکم قانون کے مطابق چلانے والی ہستی کونسی ہے۔ اس کی خوبیاں کیا ہیں۔ اس کا انسانوں سے اورانسانوں کا اس ذات سے کیا تعلق ہونا چاہیے؟ اس دنیا کا آغاز وانجام کیا ہے۔؟

اعتراض نمبر ۱۸۷

آپ (اس صورت حال سے) مایوس ہوگئے اورشیاطین کے زیراثر ہونے کے خوف سے اپنے آپ کوختم کرنے کی کوشش کی۔ (ضیا النبی۔۷۔۳۰۰) He grew down cast and fearing possession of devils ,had thoughts of destroying himself

جواب: حضرت عائشہؓ سے مروی حدیث میں لَقد خَشِیتُ عَلٰی نَفسِی " یعنی مجھے اپنی جان کو خوف لاحق ہوگیا ہے۔ یہ جو جملہ روایت ہوا ہے اس سے کسی صورت میں یہ نتیجہ نکالنا ممکن نہیں کہ حضور ﷺ کو اپنے مجنون ہونے، جنوں کے زیراثر ہونے یا کاہن ہونے کا خوف لاحق ہوگیا تھا۔ اس جملے کی اس قسم کی تمام تعبیریں بعید از قیاس ہیں۔ علامہ غلام رسول رضوی (تفہیم البخاری۔ا۔۳۹) لکھتے ہیں کہ۔۔۔ "کسی خوف کا باعث نہ تھا بلکہ اس لیے تھا کہ آپ ﷺ پر اللہ تعالیٰ نے قول ثقیل نازل فرمایا ہے جسے آپ کفار ومشرکین ومنکرین کے پاس لے جائیں گے وہ آپ کی تکذیب کریں گے۔ ان کی تکذیب کے خوف سے آپ ﷺ پر گھبراہٹ طاری تھی نیز اچانک عادت کے خلاف کسی امر کے آجانے سے بشری طبع گھبراتی ہے اوراس حالت میں کچھ سوچا نہیں جاتا کیونکہ نبوت طبائع بشریہ کو زائل نہیں کرتی"۔ وحی کو خود قرآن نے قول ثقیل کہا ہے اور تصریح کردی کہ اگر وحی آسمانوں، زمینوں اور پہاڑوں پر نازل کی جاتی تو جلال الٰہی سے وہ پاش پاش ہوجاتے۔ ارشاد ربانی ہے۔ " اِنَّا عَرَضنَا الاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالاَرضِ وَالجِبَالِ "(سورۃ

الاحزاب ۔۷۲) (ہم نے آسمانوں، زمینوں اور پہاڑوں پر امانت پیش کی) مگر یہ تو ذات نبوی تھی جس نے بتوفیق الٰہی پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کرنے والی چیز کی شدت کو برداشت کرلیا۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ نبی ﷺ کو نبوت کے ابتدائی مرحلہ میں فرائض نبوت کو سنبھالنے کا عارضی فکر ہو جانا شان نبوت کے خلاف نہیں۔

مستشرقین اپنے موقف کی تائید میں قرآن کریم سے دلیل پکڑتے ہیں کہ سیدنا موسیٰؑ کو جب نبوت ملی تو حکم ہوا کہ تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ (اِنَّہٗ طَغٰی) بے شک اس نے سر اٹھایا ہے تو دونوں عرض کرتے ہیں۔" قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ یَّفْرُطَ عَلَیْنَآ اَوْ اَنْ یَّطْغٰی (طہ۔۴۵) ترجمہ: (دونوں نے عرض کیا کہ اے ہمارے رب بے شک ہم ڈرتے ہیں کہ وہ ہم پر زیادتی کرے یا شرارت سے پیش آئے) اللہ تعالیٰ نے فرمایا "قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِیْ مَعَکُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰی (طہ۔۴۶) (فرمایا ڈرو نہیں میں تمہارے ساتھ ہوں سنتا اور دیکھتا) دیکھیے سیدنا موسیٰ کو بھی خوف ہو رہا ہے اس خوف کی علامت بھی یہ نہ تھی کہ جناب کلیمؑ کو اپنی نبوت میں شک تھا بلکہ یہ خوف ادائیگی فرائض نبوت سے تھا کہ مجھے فرعون جیسی طاقت کے مقابلہ کے لیے بھیجا جا رہا ہے تو میں کیسے فرائض نبوت سے عہدہ برآء ہوں گا۔ اسی فکر نے موسیٰؑ کو خوف زدہ کیا اور عرض کی کہ الٰہی میں ڈرتا ہوں کہ ہم پر فرعون زیادتی نہ کرے، اس سے بات واضح ہوتی ہے کہ نبی کا نبوت کے بالکل ابتدائی مرحلہ میں فرض نبوت کی ادائیگی اور کار رسالت کی ذمہ داریوں کے متعلق وقتی طور پر ذرا سی دیر کے لیے باقتضائے بشریت خوف واضطراب میں مبتلا ہو جانا شان نبوت کے منافی نہیں ہے۔ اسی طرح لقد خشیت علی نفسی کا یہ مطلب لینا بھی باطل ہوگا کہ آپ ﷺ پر فرشتہ کو دیکھ کر رعب اور خوف طاری ہو گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے جان کا خطرہ ہے۔ (۲) جبرائیلؑ فرشتہ کی صورت میں آتے تو شائد خوف ممکن تھا (حالانکہ ایسا بھی ممکن نہیں) لیکن جب فرشتہ انسانی صورت میں آیا تھا۔ اور ملکی صورت میں آنے کا حدیث میں ذکر نہیں ہے جب کہ بشری صورت میں آنے کے واضح اشارات موجود ہیں۔ (۳) یہ خوف فرشتہ کو دیکھتے ہی طاری ہونا چاہیے تھا مگر آپ ﷺ نے جوابات تسلی سے دیئے اور ہر بار فرشتہ کے اقراء کہنے پر مَا اَنَا بِقَارِیٍٔ فرماتے تھے اگر ڈر ہوتا تو کچھ بھی نہ کہتے یا گھبرا کر گھر کی راہ لیتے یا کسی کو مدد کے لیے بلاتے یا جیسے فرشتہ کہتا وہی کہتے جاتے (لیکن یہ تو تین بار کے بعد ایسا ہوا) فرشتہ کا خوف ہوتا تو حضرت خدیجہؓ پوچھتیں کہ وہ فرشتہ کیسا تھا؟ وہ کیسے آیا تھا؟ کیوں آیا اور کیا ڈراتا دھمکاتا تھا بلکہ حضرت خدیجہؓ کہتی ہیں کہ جس ذات نے آپ کو یہ بار گراں سونپا ہے وہی آپ کا معاون اور مددگار رہوگا۔ علامہ نووی شرح مسلم میں فرماتے ہیں کہ قاضی عیاض نے فرمایا" یہاں خوف طاری ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو جو عطا فرمایا تھا، آپ ﷺ کو اس میں ریب تھا بلکہ اتنے عظیم امر نبوت کو اٹھانے کی طاقت مجھے کیسے حاصل ہوگی، اس کا خوف دامن گیر تھا۔ یہ وحی کا بوجھ

جو میرے اوپر ایک چادر کی طرح تان دیا گیا ہے میں اس کو اٹھانے کی قدرت کیسے رکھوں گا؟ اس سبب سے آپ نے فرمایا ''میری تو جان جا رہی ہے۔''

آپ ﷺ کے قلب اطہر پر تئیس سال تک قرآن کریم کا نزول ہوتا رہا اور جب بھی وحی آتی تو آپ ﷺ اس کے ثقل کو محسوس فرماتے اس لیے جب پہلی بار وحی کے تجربہ سے گزرے ہونگے تو اس وقت بھی آپ ﷺ کی طبیعت پر اس کا زبردست اثر ہوا ہوگا جب کہ یہ بات غلط ہے کہ شیطانوں کے اثر سے خوف ہوا تھا۔ آپ ﷺ وحی کے ثقل سے بخوبی واقف تھے اور شیطانی اور وحی کے فرق سے بدرجہ اولیٰ باخبر تھے۔ ابو بشر الدولابی اپنی سند سے حضرت عبداللہؓ بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم سے روایت کرتے ہیں اور یہ حدیث طویل ہے جس کا ایک جملہ یہ ہے ''وَبَشَّرَہٗ بِرِسَالَۃِ رَبِّہٖ حَتّٰی اِطْمَانَّ'' جبرائیل امین نے حضور ﷺ کو رسالت کی بشارت دی حتیٰ کہ آپ مطمئن ہو گئے۔ یہ حدیث نزول وحی کے آغاز کے وقت کسی خوف و اضطراب کا ذکر نہیں کر رہی بلکہ آپ ﷺ کے اطمینان کا ذکر ہے۔

اعتراض نمبر ۱۸۸

حضرت محمد ﷺ کو خدا کی طرف سے اپنے اوپر وحی نازل ہونے کا یقین ذہنی کشمکش کی طویل آزمائش کے بعد حاصل ہوا۔ (سر ولیم میور) (ضیاالنبی۔ ۷۔ ۲۹۹)

۲۔ یہی مصنف یہ بھی لکھتا ہے کہ ''آپ اپنے الہامی اور الہیاتی مشن کے بارے میں خود مشکوک و متذبذب تھے۔''

جواب: منٹگمری واٹ کہتا ہے۔

To carry on in the face of persecution and hostility would have been impossible for him unless He was fully persuaded that God had sent Him .and the receiving of revelation was included in his divine mission.

''اگر محمد ﷺ کو یقین نہ ہوتا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور آپ پر وحی نازل ہوتی ہے تو اذیتوں اور مخالفتوں کے طوفان میں آپ ﷺ کے لیے اپنے مشن کو جاری رکھنا ممکن نہ رہتا۔''

حقائق و معارف کا سلسلہ ایک نبی کے قلب اطہر پر منکشف ہوتا ہے۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ آپ ﷺ اپنے بچپن سے جن محیر العقول تجربات سے گزر رہے تھے مثلاً بی بی حلیمہ سعدیہ دوبارہ آنحضرت ﷺ کو مکہ سے اپنے گھر لاتی ہیں۔ آپ کا پہلے سے زیادہ خیال رکھنے لگتی ہے، حتی کہ ایک دن آپ کو گھر میں نہ پا کر باہر نکل آئیں۔ آپ کو دیکھا کہ اپنی بہن شیما کے پاس بیٹھے ہیں۔ شیما کو ڈانٹا اور

کہا ''اس گرمی میں تو اسے باہر نکال لائی ہے''۔ شیما نے کہا امی میرے بھائی کو تو ذرہ سی گرمی بھی نہیں لگتی کیونکہ اس پر ایک بادل کا ٹکڑا سایہ کناں رہتا ہے۔ یہ چلتا ہے تو سایہ بھی چلتا ہے یہ رکتا ہے تو سایہ بھی رک جاتا ہے۔'' دوسروں کو بادل سایہ کرتا نظر آتا ہے آپ کو گرمی بھی نہیں لگتی، کا علم بھی ہے۔ تو کیا اس ہستی کو معلوم نہ ہوگا کہ مجھ پر بادل سایہ کیے ہوئے ہے۔ اتنی شدت کی گرمی میں گرمی محسوس نہیں ہوتی کا علم بھی آپ کو لازماً ہوگا تو ایسی صورت میں آپ ﷺ سوچتے نہ ہوں گے کہ بادل دوسروں پر سایہ نہیں کرتا اور دوسروں کے لیے گرمی سے بچنے کے لیے کوئی انتظام نہیں ہے۔ میرے لیے ہے، تو یہ خاص انعام خداوندی ہے۔ اسی طرح بارہ سال کی عمر میں شام کے تجارتی سفر میں قافلہ نے بُصریٰ کے مقام پر پڑاؤ کیا وہاں ایک راہب جرجیس رہتا تھا اس نے دیکھا کہ جس درخت کے نیچے آپ ﷺ بیٹھے ہیں، اس کی شاخیں آپ پر جھک جاتی ہیں اور بادل کا ٹکڑا سایہ کیے ہوئے ہے۔ وہ کبھی قافلہ والوں کے پاس نہیں آتا تھا نہ ان کی ضیافت کرتا تھا مگر اس قافلہ میں آتا ہے اور ان کی ضیافت کا انتظام بھی کرتا ہے، ایسا کرنے پر قافلہ والے بھی عجیب محسوس کر رہے تھے، حتیٰ کہ ایک شخص نے راہب سے پوچھا: آپ کو کیسے پتہ چلا کہ آپ ﷺ نبی ہیں؟ وہ بولا! جب تم لوگ آپ ﷺ کے ہمراہ گھاٹی کے قریب سے گزرے تو ہر درخت اور ہر پتھر نے آپ ﷺ کو سجدہ کیا، درخت پتھر سوائے نبی کے کسی کو سجدہ نہیں کرتے۔ دلائل النبوہ میں علامہ بیہقی نے بعض اہل علم سے یہ روایت کی ہے کہ جس وقت اللہ پاک نے رسول کریم ﷺ کی کرامت کا ارادہ کیا اور نبوت کے ساتھ ابتداء کی، آپ جس درخت اور جس پتھر کے پاس سے گزرتے تھے، وہ پتھر اور درخت آپ کو سلام کرتا تھا۔ درختوں اور پتھروں سے آواز سن کر آپ ﷺ اپنے پیچھے، دائیں بائیں دیکھتے لیکن کوئی شے نہیں دیکھتے تھے، سوائے درختوں اور پتھروں کے جو ہر طرف سے نبوت کے سلام کے ساتھ آپ کو اسلام علیک یا رسول اللہ کہہ کر سلام کرتے تھے۔ (مواہب لدنیہ۔ا۔۱۳۹)

بحیرہ راہب منظر دیکھ کر آپ ﷺ کے نبی ہونے کا عندیہ دیتا ہے۔ آپ بارہ سال کی عمر میں ایسے محیر العقول تجربات سے گزر رہے ہیں۔ پادریوں کی زبانی اپنی نبوت کا اقرار بھی سن رہے ہیں، پھر بھی ولیم میور شک کرے تو عجب ہے۔ غار حرا میں آپ ﷺ کو خواب کی حالت میں ان امور کا مشاہدہ کرا دیا تھا جو آیات قرآنی کے نزول کے وقت حالات پیش آئے تھے، جس طرح آپ خواب دیکھتے اس کی تعبیر بھی ہو بہو اسی شکل میں نظر آتی۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں'' آپ کے ہر خواب کی تعبیر صبح درخشاں کی طرح نمودار ہو جاتی'' (سید الوریٰ۔ا۔۱۵۹)

جب حضور ﷺ پر سچے خوابوں کے ذریعے نزول وحی کا سلسلہ شروع ہوا (آپ اسی وقت سے نبی تھے)۔ آپ ﷺ کو اپنی نبوت کا یقین بھی تھا اور یہ بھی جانتے تھے کہ آپ ﷺ پر اللہ کی طرف سے اللہ کا

مقرب فرشتہ وحی لے کر آتا ہے۔امام شعبی نے غار حرا میں حضور ﷺ کے پاس جبرائیلؑ امین کے تشریف لانے اور قرآن مجید کی ابتدائی آیات نازل ہونے سے تین سال پہلے رویائے صادقہ کے ذریعہ حضور ﷺ کے لیے نبوت کو ثابت کیا ہے اور امام بیہقی نے یہ مدت چھ مہینے بتائی ہے۔(ضیا النبی۔ ۷۔ ۳۱۶) گویا وحی کے نزول کا یقین ذہنی کشمکش کی طویل آزمائش کے بعد حاصل ہونا مستشرقین کا باطل خیال ہے کیونکہ آپ ﷺ کا وحی سے قبل رویائے صادقہ کے ذریعے نبوت کا ثبوت موجود ہے اس طرح آپ ﷺ کو وحی کے نزول میں نہ کسی ذہنی کشمکش اور طویل آزمائش کا سامنا تھا بلکہ رویائے صادقہ کے ذریعے وحی کے نزول پر یقین کامل ہو گیا تھا۔مسٹر کونسٹن ورژیل لکھتا ہے کہ ”پیغمبر اسلام ﷺ اگر ایک ضعیف العزم انسان ہوتے تو ان مصائب (شعب ابی طالب جیسے مصائب) سے گھبرا کر اپنے مشن سے چشم پوشی کر لیتے یا کم از کم عارضی طور پر دکھاوے کے لیے ہی سہی اپنے دین کی تبلیغ ملتوی کر دیتے تا کہ جب قریش کا غصہ فروکش ہو جاتا، ان کے غضب کی آگ ٹھنڈی ہو جاتی تو پھر مناسب موقع ملنے پر اپنے دین کی نئے سرے سے تبلیغ شروع کر دیتے لیکن چونکہ وہ مضبوط ارادے اور آہنی عزم کے مالک تھے اور انہیں پختہ یقین تھا کہ وہ اللہ کے رسول ﷺ ہیں لہٰذا انہوں نے اپنے دین کو نہ چھوڑا، اور اپنی رسالت کی حسی، عارضی یا ظاہری طور پر نفی نہ کی۔۔۔انہوں نے ایسا نہ کیا اور عرصہ تین سال تک پہاڑ کے شگاف میں گرسنگی اور تشنگی سے نبھاتے رہے حتی کہ چمڑا اور کھالیں ابال ابال کر گزر اوقات کر لی لیکن اپنی رسالت کا انکار نہ کیا۔(رسالہ حکمت بالغہ۔ ۴۰)

ایک شبہ کا ازالہ: جب آپ ﷺ پر خوابوں کا سلسلہ شروع ہوا، آپ اس وقت سے نبی تھے۔یہ ظاہری حالات کی بناء پر ہے، ورنہ آپ ﷺ کو نبوت اس وقت سے ملی ہوئی تھی جب آدم روح و جسم کے درمیان تھے اس کی تصدیق حدیث پاک سے ہوتی ہے۔صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ کو نبوت کب ملی؟ فرمایا 'جب آدم روح و جسم کے درمیان تھے' (ترمذی شریف)

اس حدیث کو بعض لوگ یوں بیان کرتے ہیں ”كُنتُ نَبِيًّا وَّآدَمُ بَيْنَ الْمَاءِ وَالطِّينِ“ لیکن معلوم ہونا چاہیے کہ ان الفاظ کے ساتھ یہ روایت حدیث کی کسی کتاب میں موجود نہیں ہے۔(سید الوریٰ۔ ۱۵۹)

مذکورہ اعتراض کے دوسرے جز ”اپنے الہامی اور الہیاتی مشن کے بارے خود مشکوک و متذبذب تھے“ کا جائزہ لیتے ہیں۔

یہی مستشرق یوں بھی کہتا ہے کہ ابتداء میں انہیں (محمد ﷺ) یقین نہ تھا کہ وہ خدا کی طرف سے فرستادہ ہیں، البتہ ایک طویل عرصہ تک شک و تذبذب میں رہنے کے بعد بالآخر آمادہ بہ تبلیغ ہوئے۔

جواب: مستشرق آپ کی حیات مقدس کے محیر العقول کارناموں کو دیکھتے ہیں تو تسلیم کرنے پر

مجبور ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر آپ ﷺ کو اپنے مشن کی صداقت پر کامل ایمان نہ ہوتا تو آپ ﷺ سے محیر العقول کارنامے سرانجام نہ پاتے، جو آپ نے انجام دیئے۔ یہی مستشرق لوگوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ ابتداء میں آپ ﷺ کو اپنے مشن پر یقین نہ تھا اس تعصب و نفرت کے باوجود سر ولیم میور اعتراف کرتا ہے اور خدا پر حضور ﷺ کے یقین کے متعلق لکھتا ہے۔ indeed nothing is so remarkable as the faith reposed by Muhammed in the deity as an ever present and all controlling ageency . (سب سے زیادہ نمایاں اور حیرت انگیز چیز وہ ایمان ہے جو آپ ﷺ کو خدا پر تھا جو ہر جگہ حاضر ناظر اور ساری کائنات کا چلانے والا ہے)

منٹگمری واٹ ولیم کے الزام کی تردید کرتا ہے ”محمد ﷺ کی زندگی میں افسردگی کے لمحات بھی آئے ،آپ کو جن بظاہر ناقابل تسخیر مشکلات سے واسطہ تھا ان کے پیش نظر افسردگی کے ان لمحات کا آنا کوئی حیرت کی بات بھی نہ تھی لیکن اس کے باوجود آپ کے اس ایمان میں کبھی کمی نہیں آئی کہ خدا نے آپ کو اپنا رسول بنایا ہے اور اپنے دور میں ایک اہم کام کی انجام دہی کا فریضہ آپ ﷺ کو سونپا ہے۔ یہی وہ یقین تھا جس نے مخالفت، تضحیک، افتراپردازی اور اذیتوں کے دوران آپ ﷺ کو ثابت قدم رکھا اور جب کامیابی نے آپ ﷺ کے قدم چومے تو آپ ﷺ کے یقین میں کمی نہ آئی بلکہ یہ یقین اور گہرا ہو گیا اور آپ ﷺ یہ سمجھے کہ جس خدا نے آپ ﷺ کو بھیجا ہے وہ خدا تاریخی واقعات میں بھی آپ ﷺ کی دستگیری کر رہا ہے۔(ضیا النبی۔ ۷۔ ۳۲۲)

لین پول: کہتا ہے: وہ خدائے واحد کا پیغمبر تھا اور اپنی زندگی کے آخری لمحے تک اس نے اس امر کو فراموش نہیں کیا اور نہ اس نے اس پیغام کو فراموش کیا جو اس کا مدار زندگی تھا، اس نے اپنی قوم کو جو بشارت دی، وہ ایک عظیم الشان وقار کے ساتھ دی جس کا سرچشمہ وہ احساس تھا جو اسے اپنے اونچے منصب کے بارے میں تھا اور ساتھ ہی ساتھ جس کی بنیاد اس کا ایک انسان ضعیف البنیان ہونے کا شعور تھا (روح اسلام۔ ۲۱۹) واٹ کہتا ہے کہ (آنحضرت ﷺ) کے اپنے آپ پر اور اپنے نصب العین پر غیر متزلزل یقین و اعتماد نے آپ ﷺ کو ہمیشہ حق پر گامزن رکھا۔(محمد رسول اللہ۔ پروفیسر محمد اکرم طاہر۔ ۳۵۶)

اعتراض نمبر ۱۸۹

منٹگمری واٹ لکھتا ہے کہ ”بتایا گیا ہے کہ محمد ﷺ کو ابتدائے وحی نازل ہونے کے بعد خدیجہؓ نے یقین دلایا کہ آپ ﷺ واقعی اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں اور خدیجہؓ سے بھی زیادہ یقین دہانی آپ ﷺ کو ورقہ بن نوفل نے کرائی، ایک عیسائی کی اس یقین دہانی نے کہ آپ ﷺ پر جو وحی نازل ہوتی ہے وہ حضرت موسیٰؑ پر نازل

ہونے والی وحی کے مشابہ ہے اپنے منصب نبوت پر آپ کے یقین کو پختہ کیا گیا ہوگا‘‘ (ضیا النبی۔ ۷۔ ۳۰۱)

ایک اور مقام پر یہی مستشرق لکھتا ہے کہ ’’حضرت خدیجہؓ کے ساتھ شادی نے محمد ﷺ کے روحانی ارتقاء میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ خدیجہؓ کا چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل جو عیسائی ہو گیا تھا، اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے محمد ﷺ کے اس یقین میں ان کی مدد کی تھی کہ ان پر کسی قسم کی وحی نازل ہوتی ہے جس قسم کی وحی کی تعلیمات یہود و نصاریٰ کے پاس ہیں، وہ بھی خدیجہؓ ہی تھیں کہ محمد ﷺ کو عالم افسردگی میں جب اپنے منصب نبوت کے متعلق شکوک و شبہات کا شکار ہوتے تو انہی کی طرف رجوع کرتے تھے‘‘ (ضیا النبی۔ ۷۔ ۳۰۰)

جواب: یہ حقیقت ہے کہ حضور ﷺ نزول قرآن کے آغاز سے کافی عرصہ سے غار حرا میں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ سچے خواب جو وحی کا حصہ ہیں آپ کو غار حرا میں جانے سے پہلے آنا شروع ہوئے تھے۔ امام شعبی نے وحی کے نزول اور قرآنی آیات کے نازل ہونے سے تین سال پہلے رویائے صادقہ کے ذریعے حضور ﷺ کے لیے نبوت کو ثابت کیا ہے۔ آپ ﷺ اس دور سے نبی تھے۔ آپ ﷺ کا نبوت پر کامل یقین تھا اور یہ بھی یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک فرشتہ وحی لے کر آتا ہے۔ قرآن حکیم کی آیات ابتدائیہ کا نزول آپ کے قلب اطہر پر ہوا تھا، اس وقت آپ یقین کے اس بلند مقام پر فائز تھے جسے حدیث نے اطمینان کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں پھر بھی کہا جائے کہ حضور نزول وحی کی وجہ سے بے یقینی اور شک میں مبتلا تھے، تو یہ نہ صرف عصمت نبوت پر حملہ ہے بلکہ قدرت خداوندی کا بھی انکار ہے کیونکہ اگر یہ کہا جائے کہ تربیت خداوندی کے اتنے زبردست اہتمام کے باوجود حضور ﷺ کو اپنی نبوت کا یقین نہیں آ رہا تھا اور کبھی آپ ﷺ کو یہ یقین حضرت خدیجہؓ کی باتوں سے آتا تھا اور کبھی ورقہ بن نوفل کی باتوں سے اور کبھی جبرائیل امین کے آپ ﷺ کو یاد دہانی کرانے سے کہ آپ ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں، تو نتیجہ یہی نکلے گا کہ خدا کی تدابیر کارگر ثابت نہ ہوئیں (نعوذ باللہ) (ضیا النبی۔ ۷۔ ۳۱۷)

کتنی حیران کن بات ہے کہ نبی مکرم ﷺ بچپن سے بڑے بڑے حیران کن حالات و واقعات اور تجربات سے مرحلہ وار گزر رہے تھے۔ کہیں بادل سایہ کرتا ہے۔ کہیں راہب آپ ﷺ کو نبی کہتا ہے۔ کہیں شق صدر کا محیر العقول واقعہ پیش آتا ہے اس قسم کی یہ ساری چیزیں آپ ﷺ کو اپنی نبوت کا یقین فراہم نہ کر سکیں اور وہ یقین کبھی آپ کو خدیجہؓ اور کبھی ایک عالم عیسائی ورقہ بن نوفل سے حاصل ہوتا ہے، کس قدر نادانی ہے؟ تعجب اس بات پر بھی ہے کہ یہی مستشرق کہتا ہے کہ آپ ﷺ کو اپنے مشن پر یقین نہ تھا، کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور آپ پر وحی آتی ہے اور وہ خدیجہ اور ورقہ بن نوفل کی یقین دہانی کے مرہون منت ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ پھر اپنے اس بیان کی خود تردید کرتا ہے۔ ’’اگر محمد ﷺ کو یقین نہ ہوتا کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول

ہیں اور آپ ﷺ پر وحی نازل ہوتی ہے تو اذیتوں اور مخالفتوں کے طوفان میں آپ ﷺ کے لیے اپنے مشن کو جاری رکھنا ممکن نہ رہتا''۔اس پر یہ کہنا کہ ''دروغ گورا حافظہ نباشد'' صادق آتا ہے۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے ''حضور ﷺ پر نزول وحی کی ابتداء حالت خواب میں سچے خوابوں سے ہوئی۔آپ ﷺ جو کچھ خواب میں دیکھتے وہ صبح کی روشنی کی طرح بالکل واضح طور پر آپ ﷺ کے سامنے آجاتا پھر آپ ﷺ کے دل میں تنہائی کی محبت پیدا ہوگئی۔آپ ﷺ غار حرا کی خلوتوں میں تشریف لے جاتے اور وہاں عبادت کرتے''۔اس حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ سچے خوابوں سے آپ ﷺ کے دل میں تنہائی کی محبت جاگ اٹھی جس کے سبب آپ ﷺ غار حرا میں تشریف لے جاتے تھے۔سچے خواب جو وحی کا حصہ تھے اسی دوران آنا شروع ہوئے جبکہ ابھی آپ ﷺ نے غار حرا میں جانا شروع نہیں کیا تھا امام شعبی نے رویائے سابقہ کی مدت تین سال جبکہ امام بیہقی نے یہ مدت چھ ماہ بتائی ہے۔

جب حضور ﷺ پر سچے خوابوں کے ذریعے نزول وحی کا سلسلہ شروع ہوا تھا اس وقت بھی اپنی نبوت کا یقین تھا اور آپ ﷺ کو یہ بھی علم تھا کہ فرشتہ خدا کی طرف سے وحی لے کر آتا ہے۔آپ ﷺ معصوم تھے اور کوئی ایسا فعل، قول یا خیال جو عصمت نبوت سے متصادم تھا اس کا آپ ﷺ کی ذات سے صدور ممکن نہ تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ اس قسم کی چیزوں سے اپنے نبیوں اور رسولوں کی خود حفاظت فرماتا ہے۔

امام بخاریؒ نے حضرت عائشہؓ سے مروی اس حدیث کو کتاب التفسیر میں سورۃ علق کی تفسیر میں بھی درج کیا ہے لیکن اس روایت میں آپ ﷺ کو پہاڑوں سے گرانے کے ارادہ کا ذکر نہیں ہے بلکہ آخر پر ہے کہ ''اور وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا حتیٰ کہ حضور ﷺ غمگین ہو گئے۔اس مقام پر ان الفاظ کے بعد امام بخاریؒ نے حضرت جابر بن عبداللہؓ کی وہ حدیث درج کی ہے جس میں حضرت جبرائیل امینؑ کے دوبارہ نظر آنے اور سورہ مدثر ہونے کا ذکر ہے۔امام بخاریؒ نے اس حدیث جو بی بی عائشہؓ سے مروی ہے'' باب کیف کان بدءالوحی الی رسول اللہ''۔ میں بھی درج کیا ہے۔اس مقام پر حدیث اور وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا کے الفاظ پر ختم ہوتی ہے۔اس کے بعد امام بخاریؒ نے حضرت جابرؓ کی مذکورہ حدیث درج کی ہے اس میں نہ تو حضور ﷺ کے غمگین ہونے کا ذکر ہے اور نہ ہی پہاڑوں سے اپنے آپ کو گرانے کا ذکر ہے۔فترت وحی کے ذکر کے معاً بعد اس حدیث کو درج کیا گیا ہے جس میں وحی کا سلسلہ از سر نو شروع ہونے کا ذکر ہے۔

امام مسلم نے بھی اپنی صحیح کی کتاب الایمان میں حضرت عائشہؓ کی اس حدیث کو درج کیا ہے لیکن اس حدیث میں فترت وحی کا ذکر نہیں ہے امام مسلم نے بھی اس حدیث کے بعد حضرت جابر بن عبداللہ کی حدیث درج کی ہے جس میں وحی کا سلسلہ منقطع ہونے اور دوبارہ شروع ہونے کا ذکر ہے۔

حضرت عائشہؓ سے مروی ایک حدیث چار مقامات پر درج ہے اور ان میں سے صرف ایک مقام پر وہ فقرہ ہے جس نے حضور ﷺ کے پہاڑوں سے چھلانگ لگانے کے ارادے کا ذکر ہے۔

امام زہری نے فیما بلغنا کے الفاظ کا اضافہ کیا یعنی اس سلسلے میں جو اطلاعات پہنچی ہیں، ان میں یہ جملہ بھی ہے لیکن امام زہری نے یہ نہیں بتایا کہ یہ جملہ یا جملے کس حوالے سے پہنچے ہیں۔ اس حدیث کو کئی راویوں نے روایت کیا ہے لیکن یہ جملے صرف معمر کی روایت جو اس نے زہری سے روایت کی ہے موجود ہے۔

باب کیف کان بدء الوحی میں یہ حدیث امام زہری سے عقیل نے روایت کی ہے اس میں نہ تو غمگین ہونے کا ذکر ہے اور نہ ہی پہاڑوں سے گرانے کے ارادے کا۔ امام زہری سے یونس بن یزید نے بھی روایت کی ہے مگر مذکورہ جملہ اس روایت میں بھی موجود نہیں۔

معمر کی روایت کے بارے علامہ ابن حجر نے کہا ''میرے نزدیک یہ زیادتی معمر کی روایت کے ساتھ خاص ہے۔۔۔۔ ان حقائق کے بعد بھی اگر یہ کہا جائے حضور ﷺ نزول وحی کی وجہ سے بے یقینی اور شک کا شکار ہوئے تھے تو یہ نہ صرف عصمت نبوت پر حملہ ہے بلکہ قدرت خداوندی کا بھی انکار ہے۔ قدرت خداوندی اس قدر تربیت کا انتظام فرما رہی ہے اس کے باوجود اپنی نبوت کا یقین نہیں آ رہا تھا جو کبھی خدیجہؓ کی باتوں سے یقین آ جاتا اور کبھی ورقہ بن نوفل کی باتوں سے اور کبھی جبرائیل امینؑ کے آپ ﷺ کو یاد دہانی کرانے سے کہ آپ ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں تو نتیجہ یہی برآمد ہوگا کہ (نعوذ باللہ) خدا کی تدابیر کارگر ثابت نہ ہوئیں۔

اعتراض نمبر ۱۹۰

واٹ کہتا ہے کہ اس بیان میں حیران ہونے کی کوئی بات نہیں کہ محمد ﷺ خوف اور شکوک میں مبتلا ہوئے اس بات کا ثبوت قرآن میں بھی موجود ہے اور سیرت کی کتابوں میں بھی، اگرچہ یقین کے ساتھ یہ کہنا ممکن نہیں کہ قرآن کے ذریعے آپ کو یہ یقین دہانی کس موقع پر کرائی گئی، کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو چھوڑا نہیں ہے۔ (ضیا النبی۔ ۷۔ ۳۰۱)

جواب: سورۃ والضحیٰ'' کے شان نزول میں ایک روایت یہ ہے کہ ''ابتدائے بعثت میں کچھ عرصہ وحی کا سلسلہ جاری رہا اور پھر یکدم رک گیا۔ یہ انقطاع بارہ، پندرہ یا پچیس یا چالیس دن تک باختلاف روایات برقرار رہا۔ حضور ﷺ کی طبع مبارک پر یہ بہت گراں گزرا، وہ کان جو کلام الٰہی سننے کے عادی ہو چکے تھے۔ وہ دل جو ارشادات ربانی کا خوگر ہو چکا تھا، اس کے لیے یہ بندش اور بے قراری ناقابل برداشت تھی نیز کفار نے بھی طعنہ زنی شروع کردی کہ محمد ﷺ کو خدا نے چھوڑ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ناراض ہوگیا ہے۔ اس لیے وحی کا نزول رک گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کفار کے ان خرافات کی تردید قسم اٹھا کر بیان

کر دی اور اپنے حبیب ﷺ کو تسلی دی کہ آپ پریشان نہ ہوں کیوں کہ جس طرح دن کی روشنی کے بعد تاریکی میں گوناگوں حکمتیں ہیں، اسی طرح نزول وحی اور پھر اس کے بعد انقطاع میں بڑی بڑی حکمتیں مضمر ہیں اللہ تعالیٰ نے سورۃ والضحیٰ نازل فرمائی۔ " وَالضُّحٰى o وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى o مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى o وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ۔۔۔۔۔ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى " نہ آپ کو آپ کے رب نے چھوڑا اور نہ ہی وہ ناراض ہوا" واٹ کا الزام کا رد ہوا اور اس کا یہ کہنا کہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ قرآن کے ذریعے یہ یقین دہانی کس موقع پر کرائی گئی اس پر قرآن نے وضاحت فرما دی۔ اب اسے معلوم نہ ہو سکے یا جان بوجھ کر چھپاتا پھرے تو اس لاعلمی اور بددیانتی کا علاج ممکن نہیں۔ یہ اس وقت کے کفار کے لیے ہی نہیں بلکہ رہتی دنیا تک کے منکرین کے لیے اس کا رد فرما کر اپنے حبیب ﷺ کی شان بڑھا دی۔

اعتراض نمبر ۱۹۱

واٹ یہ شوشہ بھی چھوڑتا ہے " یہ خیال کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ محمد ﷺ نے ورقہ بن نوفل جیسے عیسائیوں کے ساتھ گفت وشنید کے ذریعے زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی"۔ (ضیا النبی ۳۰۰)

جواب: واقعہ یہ ہے کہ حضرت خدیجہؓ آپ ﷺ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے جاتی ہیں اور فرماتی ہیں کہ اپنے بھتیجے کی بات سنئے! ورقہ بن نوفل نے وہ تمام باتیں آپ ﷺ سے سنیں جو وحی کے نزول سے متعلق تھیں یعنی غار حرا میں وحی کے نزول کا پورا واقعہ بیان فرمایا۔ یہ سن کر ورقہ بن نوفل نے کہا کہ یہ تو وہی فرشتہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کے پاس بھیجا تھا۔ ورقہ بن نوفل نے کہا کہ کاش! میں آپ کے زمانہ نبوت میں تندرست و جوان ہوتا، کاش! میں اس وقت تک زندہ رہتا جب آپ کی قوم آپ کو مکہ سے نکال دے گی۔ آپ ﷺ نے اس پر تعجب فرمایا کہ کیا مکہ والے مجھے اس شہر سے نکال دیں گے؟ ورقہ نے ہاں میں جواب دیا، جو شخص بھی آپ کی طرح نبوت لے کر آیا لوگ اس کے ساتھ دشمنی پر کمربستہ ہو گئے۔ مگر قابل غور بات یہ ہے کہ ورقہ بن نوفل جیسے عیسائیوں سے گفت وشنید کے ذریعے بہت زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی، بعید از قیاس ہے۔ پھر یہ بھی عجیب بات ہے کہ وہ کس قسم کی معلومات تھیں جو عیسائیوں سے حاصل کی گئیں جبکہ ورقہ بن نوفل آپ ﷺ کی نبوت کا اقرار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ کاش میں زندہ رہتا جب آپ کی قوم آپ کو مکہ سے باہر نکال دے گی اور ورقہ نے یہ کہہ کر کہ یہ وہی فرشتہ ہے جو حضرت موسیٰؑ کے پاس اللہ تعالیٰ نے بھیجا تھا، کا سرے سے معلومات کے حصول کا دروازہ بند کر دیا کیونکہ جنہوں نے آپ ﷺ کو معلومات فراہم کیں وہ تو کہتے ہیں کہ ان کے پاس تو فرشتہ

آتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا پیغام لاتا ہے۔ کسی اور سے معلومات حاصل کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ اگر مستشرق کا مدعا یہ ہے کہ ورقہ بن نوفل کی معلومات سے آپ نے نبوت کا دعویٰ کیا تو یہ بالکل بے بنیاد اور غلط الزام ہے۔ ورقہ بن نوفل تو خود آپ ؐ کی نبوت کا اقرار کرتا ہے نیز فرشتہ کے متعلق کہتا ہے کہ یہ وہی ناموس ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت موسیٰ ؑ پر آتا تھا وہ یہ بھی تسلیم کر رہا ہے کہ یہ مُنزل من اللہ ہے۔ نیز وہ یہ نہیں کہتا کہ میں نے وقتاً فوقتاً آپ ﷺ کو جو معلومات فراہم کیں وہ آج سچ ثابت ہوئیں۔ ذرا برابر اور ادنیٰ سا اشارہ بھی اس بات کا نہیں ملتا البتہ یہ درست ہے کہ وحی کے نزول کے بعد آپ خدیجہ ؓ یا ایک روایت کے مطابق ابوبکر ؓ کے ہمراہ ورقہ بن نوفل کے پاس گئے اور اس سے وہی کہا جو اوپر مذکور ہوا۔ ایک شہر میں رہنا یا ایک محلّہ میں یا پاس پاس رہنا اس بات کی علامت نہیں کہ آپ اس شخص سے معلومات حاصل کرتے ہوں گے۔ یہ ایک مفروضہ ہے اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ عیسائی مذہب میں تغیر و تبدل ہو چکا تھا۔ ورقہ اور دیگر لوگ عیسائیت کے پیروکار تھے آپ ان کے تبدیل کردہ مذہب کے عقائد سے سخت نفرت کرتے تھے تو پھر آپ ﷺ کیونکر ان سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔

اعتراض نمبر ۱۹۲

۱۔ جو روحانی اذیتیں، شکوک وشبہات اور امیدوں کی جو زبردست ذہنی کشمکش آنحضرت ﷺ کے دل کو مشوّش کر رہی تھیں ان کا کچھ اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ اپنی رسالت کا پوری طرح یقین ہونے سے پہلے آپ خودکشی کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے اس ارادے سے فرشتہ نے آپ کو وہ فرض یاد دلایا کہ جو نوع انسانی کی طرف سے آپ پر عائد ہوتا تھا باز رکھا اور آپ کے مضطرب دل کو جو شبہات اور اندیشوں کے پیچ و تاب میں مبتلا تھا، اس روشن مستقبل کی ایک جھلک دکھا کر جب ساری اقوام عالم ایک سچے دین کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوں گے، امید اور یقین دلانے کی کوشش کی۔ (سپرٹ آف اسلام روح اسلام۔۹۵)

۲: آپ (وحی کی وجہ سے) پریشان و مایوس ہو گئے اور شیاطین کے زیر اثر ہونے کے خوف سے آپ نے اپنے کو ختم کرنے کی کوششیں کیں (ولیم میور۔ ضیا النبی۔۳۰۰)

جواب: مذکورہ الزامات کی بنیاد صحیح بخاری باب التعبیر کی ایک روایت ہے کہ چند روز تک جب وحی رک گئی تو آنحضرت ﷺ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ جاتے تھے کہ اپنے آپ کو گرا دیں۔ دفعتاً جبرائیل نظر آتے تھے اور کہتے تھے ''اے محمد! تم واقعی خدا کے پیغمبر ہو'' اس وقت آپ ﷺ کو تسکین ہو جاتی تھی لیکن جب پھر وحی کچھ دنوں کے لیے رک جاتی تھی تو پھر آپ کسی پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر اپنے آپ کو گرا دینا چاہتے تھے، پھر جبرائیل ؑ نمایاں ہو کر تسکین دیتے کہ آپ واقعی خدا کے پیغمبر ہیں

اول مذکورہ عبارت میں مصنف نے آنحضرت ﷺ کے بارے میں شکوک وشبہات یا باطنی کشمکش

اور خلش کا ذکر کیا ہے اس کو سمجھنے کے لیے ایک تو وہ انداز ہے جو بعض محدثین نے اختیار کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کشمکش یا خلش کا تعلق اس بات سے نہیں کہ آنحضرت ﷺ کو خدانخواستہ ایسے منصب کی حقانیت میں کوئی شبہ پیدا ہو گیا تھا بلکہ اس کا تعلق تحمل سے ہے یعنی اس حقیقت سے ہے کہ منصب کی حقانیت کے باوجود تشویش اس بات کی تھی کہ کیا آپ ﷺ نبوت کی ان گراں قدر ذمہ داریوں سے عہدہ براء ہو سکیں گے یا دوسرے لفظوں میں آیا نبوت کے اس غیر معمولی ظہور کو انسانی فکر و تعقل کا یہ کمزور ڈھانچہ آسانی سے قبول کر سکے گا؟

دوسرا انداز وہ ہے جس کو مولانا شبلی نعمانی نے اختیار کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ سرے سے یہ روایت ہی مرفوع متصل نہیں، جس میں اس بات کا ذکر ہے کہ آپ شدت احساس سے خودکشی پر آمادہ ہو گئے تھے، ان کی رائے میں اس کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ اس کو امام زہری نے بیان کیا اور بس یعنی سند کا سلسلہ زہری تک ختم ہو جاتا ہے، جیسا کہ شارحین بخاری نے تصریح کی ہے۔ ظاہر ہے ایسے عظیم الشان واقعہ کے لیے سند مقطوع کافی نہیں۔ (روح اسلام۔۹۵۔۹۶)

علامہ غلام رسول سعیدی (تبیان القرآن۔ج ۱۲۔ص ۸۵۴۔۸۵۵) لکھتے ہیں ''اور پہاڑ سے خود کو گرا دینے کے مقصد کی حسب ذیل روایت صحیح نہیں ہے۔ اس حدیث میں ہے جو حضرت عائشہؓ کی روایت کردہ طویل حدیث ہے۔ اس کے آخر میں ہے ''حضرت خدیجہؓ آپ ﷺ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں، ورقہ نے آپ ﷺ کو تسلی دی اور کہا: آپ کے پاس وہی ناموس آیا ہے، جو حضرت موسیٰؑ کے پاس آیا تھا۔۔۔۔ پھر کچھ دنوں بعد ورقہ فوت ہو گئے اور وحی کا آغاز رک گیا حتی کہ نبی مکرم ﷺ بہت غمگین ہوئے (امام زہری فرماتے ہیں) فیما بلغنا'' ہمیں جو حدیث پہنچی ہے اس میں یہ مذکور ہے کہ آپ ﷺ پر غم کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ آپ نے کئی بار خود کو پہاڑ کی چوٹیوں سے گرانے کا ارادہ کیا اور ہر بار جب بھی آپ خود کو پہاڑ کی چوٹی سے گرانے کا ارادہ کرتے تو آپ ﷺ کے سامنے جبرائیلؑ آ جاتے اور کہتے اے محمد ﷺ! بے شک آپ رسول برحق ہیں، پھر آپ کا اضطراب ختم ہو جاتا اور آپ کا دل ٹھنڈا ہو جاتا اور آپ واپس چلے جاتے، پھر جب کافی دنوں تک وحی نہ آتی تو پھر آپ اسی طرح پہاڑ پر جاتے اور پہاڑ کی بلندی سے خود کو گرانے کا ارادہ کرتے تو جبرائیلؑ آپ کے سامنے نمودار ہو کر اسی طرح کہتے (جیسے پیچھے مذکور ہوا)

حافظ احمد بن علی بن حجر عسقلانی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ اس حدیث کے آخر میں یہ اضافہ صرف معمر کی روایت میں ہے۔

امام ابونعیم نے اپنی مستخرج میں امام بخاری کے شیخ یحییٰ بن بکیر سے اس حدیث کو اس اضافہ کے بغیر روایت کیا ہے۔ اسماعیلی نے بھی کہا ہے کہ یہ اضافہ صرف معمر کی روایت میں ہے۔

امام مسلم، امام احمد، امام اسماعیلی اور ابونعیم نے اس حدیث کو بغیر اس اضافہ کے روایت کیا ہے اور

یہ حدیث بلاغات زہری سے ہے اور متصل نہیں لہٰذا یہ حدیث منقطع ہے اور چونکہ امام بخاری کے شیخ یحییٰ بن بکیر اور دیگر آئمہ حدیث نے اس حدیث کو اس اضافہ کے بغیر روایت کیا ہے اس لیے یہ حدیث شاذ ہے اور کیونکہ اس حدیث کا متن رسول اللہ ﷺ پر موجب طعن ہے، اس لیے یہ حدیث نہ روایتاً صحیح ہے اور نہ درایتاً (سعیدی غفرلہ) حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ اس روایت کا متصل نہ ہونا ہی معتمد ہے۔

امام بخاری نے جب باب التعبیر میں اس حدیث کو لکھا تو اس کا خاتمہ ان الفاظ پر کیا ''وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا حتی کہ آپ غمگین ہو گئے''

امام بخاری نے حضرت عائشہؓ سے مروی حدیث کو کتاب التفسیر سورہ علق کی تفسیر میں بھی یہ درج کیا ہے اور اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے ''اور وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا حتی کہ آپ غمگین ہو گئے''۔ (اس میں بھی آپ کا پہاڑوں سے گرانے کا ذکر نہیں ہے) نیز اس مقام پر حضرت جابرؓ کی وہ حدیث درج کی ہے جس نے جبرائیلؑ امین کے دوبارہ نظر آنے اور سورہ مدثر کے نزول کا ذکر ہے۔

امام بخاریؒ نے حضرت عائشہؓ سے مروی اس حدیث کو باب ''کَیفَ بَدءُ الوَحیِ اِلٰی رَسُولِ اللہ ﷺ میں بھی درج کیا ہے اس مقام پر یہ حدیث ان الفاظ پر ختم ہوتی ہے ''اور وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا'' اس جابر والی حدیث میں نہ غمگین ہونے کا ذکر ہے اور نہ ہی اس غم کی وجہ سے آپ کے پہاڑوں سے چھلانگ لگانے کے ارداہ کا ذکر ہے بلکہ فترت وحی کے ذکر کے بعد معاً بعد اس حدیث کو درج کیا گیا ہے، جس میں وحی کا سلسلہ از سرنو شروع ہونے کا ذکر ہے۔

امام مسلم نے بھی مسلم شریف کی ''کتاب الایمان'' میں حضرت عائشہؓ کی اس حدیث کو درج کیا ہے لیکن اس حدیث میں فترت وحی کا ذکر نہیں ہے۔ امام مسلم نے بھی اس حدیث کے بعد حضرت جابرؓ بن عبداللہ کی حدیث درج کی ہے جس میں وحی کا سلسلہ منقطع ہونے اور دوبارہ شروع ہونے کا ذکر ہے۔

حضرت عائشہؓ سے مروی ایک حدیث صحیحین کے چار مقامات پر درج ہے اور ان میں سے صرف ایک مقام پر وہ فقرہ ہے جس میں آنحضرت ﷺ کے پہاڑوں سے چھلانگ لگانے کے ارادے کا ذکر ہے۔ زیر بحث جملہ روایت کرنے سے پہلے امام زہری نے فیما بلغنا کے الفاظ کا اضافہ کیا یعنی اس سلسلہ میں ہمیں جو اطلاعات پہنچی ہیں ان میں یہ جملہ بھی ہے۔ امام زہری نے یہ نہیں بتایا کہ انہیں یہ جملہ یا جملے کس حوالے سے پہنچے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ امام زہری سے اس حدیث کو کئی راویوں نے روایت کیا ہے لیکن ان متعدد راویوں میں سے صرف ایک روایت کے ساتھ یہ جملے منسلک ہیں جو حضرت معمر نے زہری سے روایت کی ہے۔ یہ روایت امام زہری سے عقیل نے روایت کی (باب کیف بدء الوحی) اس میں غمگین ہونے کا ذکر ہے نہ کہ پہاڑوں سے گرانے کا، کتاب التفسیر میں امام زہری سے یونس بن

یزید نے روایت کیا ہے، مذکورہ جملہ اس روایت میں بھی موجود نہیں۔ کتاب التعبیر میں جو روایت درج ہے اس کو امام زہری سے روایت کرنے والے عقیل کے علاوہ معمر بھی ہیں اور صرف یہی وہ روایت ہے، جس میں مذکورہ جملہ موجود ہے۔ اس بناء پر علامہ ابن حجر نے فرمایا، میرے نزدیک یہ زیادتی معمر کی روایت کے ساتھ خاص ہے۔۔۔۔ اس بحث سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ حدیث مذکورہ کے ساتھ اس جملہ کو بعد میں شامل کیا گیا ہے۔ جب اس جملہ کا الحاقی ہونا بھی ظاہر ہے اور یہ جملہ عصمت نبوت جیسے متفق اسلامی عقیدہ سے بھی متصادم ہے تو پھر اس کو مسترد کرنا ضروری ہے، خواہ اس کو روایت کرنے والوں میں کتنے ہی بڑے بزرگوں کے نام آتے ہوں کیونکہ روایت اور درایت کے اصول اس قسم کے جملوں کو قبول کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ (ضیا النبی۔ ۷۔ ۳۰۵)

ایک ایمان افروز نکتہ: جبرائیلؑ نے کہا پڑھیے تو آپ نے فرمایا 'میں نہیں پڑھنے والا' سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ نے انکار کیوں کیا؟ ہیکل (حیات محمد۔ ۱۲۵) لکھتے ہیں کہ حق تو یہ ہے کہ حضرت جبرائیل کا تین مرتبہ اقراء اور حضور ﷺ کا ہر بار ''ما انا بقاری'' کہنا اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ اس میں کیا حکمتیں ہیں؟ اس کے متعلق کوئی فیصلہ کن بات کہنے کی تو گنجائش نہیں ہے، البتہ بظاہر انکار کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ آپ ﷺ غار حرا میں ذکر الٰہی سے لطف اندوز تھے، قلب اقدس پر کیف کا عالم طاری تھا کہ اچانک جبرائیل امینؑ نے حاضر ہو کر استدعا کی کہ پڑھیے! تو ظاہر ہے جب آپ ﷺ کا قلب مبارک محبوب حقیقی کی یاد میں سرشار تھا اور استغراق کی کیفیت طاری تھی تو ایسی صورت میں آپ ﷺ نے دوسری جانب توجہ مبذول فرمانا گوارا نہ کیا۔ جبرائیلؑ نے تین بار اپنی طرف سے متوجہ کرنے کے لیے معانقہ بھی فرمایا مگر آپ کا قلبی اقتضاء یہی رہا کہ ذکر حبیب سے لطف اندوز ہوتا رہوں، یہاں تک کہ جب جبرائیلؑ امین نے اس محبوب حقیقی کے نام کی برکت سے پڑھنے کی استدعا کی جس کے مشاہدہ جمال میں حضور ﷺ مستغرق تھے، تو آپ ادھر متوجہ ہوئے اور سورۃ اقراء کی پانچ آیتیں نازل ہوئیں۔

اعتراض نمبر ۱۹۳

وہ بزعم خویش اس خام خالی میں مبتلا تھے کہ ان پر وحی نازل ہوتی ہے۔ حالانکہ یہ ایک محض ڈھونگ تھا بہر حال دوسروں کو یقین دلانے کے لیے کہ ان پر وحی اترتی ہے۔ محمد ﷺ نے ایک سفید دودھیا رنگ کے کبوتر یا فاختہ کو سدھار کھا تھا جو ان کے کاندھے پر بیٹھا رہتا تھا، وقفہ وقفہ کے بعد وہ چونچ مار کر ان کے کان سے دانے چگا کرتا تھا اور اس طرح وہ دوسروں پر یہ تاثر قائم کرتے تھے کہ فرشتہ جبرائیلؑ ان پر وحی نازل کر رہا ہے اور انہیں املاء کرا رہا ہے۔

جواب: وحی اور نبوت کے رشتہ کو سمجھے بغیر ایک شخص اگر اپنے نظریات اور تجربات کی روشنی میں

ان ہر دو کو جانچنے کی سعی کرتا ہے تو یقیناً وہ ان کی حقیقتوں اور حکمتوں کو جان نہیں سکتا۔ وحی کو ماننا اور نہ ماننے والوں میں یہی بنیادی اختلاف ہے کہ ہر ایک وحی کے مفہوم کو الگ الگ سمجھتا ہے۔ قدیم و جدید علماء اور فلاسفہ نے مذہب کے تقابلی مطالعہ سے بحث و تحقیق کے بعد وحی کے وجود کو تسلیم کیا اور تمام شبہات اور دعووں کو دلائل کے ذریعے رد کیا ہے، جو منکرین کہتے ہیں۔ اب تحقیقی طور پر یہ ثابت شدہ ہے کہ وحی ایک مقدس و پاک شے ہے جس میں کسی آمیزش باطلہ کی گنجائش نہیں ہے۔

امام غزالی فرماتے ہیں کہ انسان کی امتیازی حرکات تین طرح کی ہوتی ہیں۔ ان میں سے دو طرح کی حرکات زیر بحث مسئلہ سے متعلق ہیں۔

اوّل: فکری حرکت جس میں حق و باطل کا احتمال ہوتا ہے۔

دوم: قولی حرکت جس میں سچ اور جھوٹ کا امکان ہوتا ہے۔ ان حرکات سے پیدا ہونے والی صفات (حق، سچائی اور بھلائی) جب کسی ایسے شخص میں موجود ہوں، جس کو خدا نے آسمانی وحی دے کر بھیجا ہو اور غور و فکر اور تحقیق سے یہ بات ثابت ہو جائے کہ حق اور سچ کے برعکس صفات باطل جھوٹ اور برائی اس میں معدوم ہیں، جس کی تائید اس شخص کی حیات اور متواتر تاریخی روایتوں سے ہوتی ہے تو پھر ایسی صورت میں اس پر وحی کے نزول کا انکار نہیں کیا جا سکتا، اس وحی کو باطنی الہام کہہ کر نظر انداز کرنا بھی درست نہیں ہوگا۔

لقد ارسلنا بالبینات ۔۔۔۔ الناس بالقسط (الحدید ۔ ۲۵) ترجمہ ''یقیناً ہم نے بھیجا ہے اپنے رسولوں کو روشن دلیلوں کے ساتھ اور ہم نے اتاری ان کے ساتھ کتاب اور میزان (عدد) تا کہ لوگ انصاف پر قائم رہیں''۔

سورۃ الجمعہ ۔۲۔ میں ہے ''وہی (اللہ) جس نے مبعوث فرمایا امیوں میں سے ایک رسول انہیں میں سے''۔

پہلی آیت الحدید میں وضاحت ہے کہ رسولوں کی روشن دلیلوں کے ساتھ، ان پر کتاب بھی نازل فرمائی۔ اب آخری پیغمبر ﷺ پر قرآن مجید نازل فرمایا۔ آپ نے لوگوں کو اس کی تعلیم دی۔ اس کے ساتھ آپ ؐ نے عوام کے رشتہ و ہدایت کے لیے انہیں نصیحتیں کیں۔ لاینحل مسائل کی گتھیاں سلجھا کر لوگوں کی بے چینی اور بے قراری کو دور کیا جو آپ سے قبل خرافات در آئی تھیں، ان کی حقیقت سے آگاہ کیا گویا قرآن مجید کے علاوہ یہ سارا رشد و ہدایت کا ذخیرہ پیغمبر کا اپنا کلام تھا، جسے احادیث کا ذخیرہ کہا جاتا ہے۔ غور فرمائیں کہ قرآن مجید اور احادیث مبارکہ کے چشمے ایک ہی زبان مقدس سے پھوٹ رہے ہیں مگر ان کے کلام میں زمین و آسمان کا بعد ہے۔ ایک شخص کتنا ہی عالم فاضل یا فنکار ہو، کیا اس کے لیے ایسا ممکن ہوگا کہ ایک خاص اسلوب میں گفتگو کرنے کے بعد اسے خدا کی طرف سے نازل ہونے والا کلام ٹھہرا دے، پھر دوسرے اسلوب میں گفتگو

کا آغاز کر کے اسے اپنا کلام قرار دے۔ جہاں آپ ﷺ کے اپنے اسلوب میں گفتگو کرنے سے آپ کا کلام قرار پاتا ہے اور دوسرے اسلوب میں گفتگو کرنے سے کلام الٰہی ٹھہرتا ہے، اس سے نہ صرف قرآن مجید کی حقانیت اور کلام الٰہی ہونا ثابت ہوتا ہے بلکہ آپ کی نبوت و رسالت بھی ثابت ہوتی ہے اور وحی کا نازل ہونا بھی آشکار ہوتا ہے۔ انبیاء کا اس دنیا میں تشریف لانے کا مقصد بھٹکی اور گمراہ انسانیت کو رشد و ہدایت کی تعلیم دینا ہوتا ہے تا کہ جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر انہیں رہنمائی کے نور کی چادر میں لپیٹیں، ارشاد ربانی ہے "كِتَٰبٌ أَنزَلْنَٰهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ ٱلنَّاسَ مِنَ ٱلظُّلُمَٰتِ إِلَى ٱلنُّورِ" (سورہ ابراہیم) ترجمہ "یہ کتاب ہے ہم نے اتارا ہے اسے آپ کی طرف تا کہ نکالیں لوگوں کو تاریکیوں سے نور کی طرف"

اعتراض نمبر ۱۹۴

اعصابی دورے پڑتے تھے اور وہم ہو جاتا تھا کہ تابع الہام ہیں۔ انہیں (نعوذ باللہ) اعصابی مرض لاحق تھا اور وہ توہمات زدہ تھے۔

(۲) مرگی زدہ تو نہیں البتہ جنونی ضرور تھے کیونکہ وہ غیر متوازن، اعصابی مزاج والے تھے۔ (اسپرنگر۔۵۳۰)

(۳) نزول وحی کے وقت مرگی کا دورہ پڑتا تھا۔ (نعوذ باللہ)

(۴) نبی جسمانی بشریت سے جدا ہو کر روحانی پیکر میں سمو جاتے تھے اور ایک مخصوص کیفیت سے دوچار ہوتے تھے، جو ایک طرح کا جنون یا مرگی ہوتا تھا۔

جواب: اس الزام کا تعلق وحی الٰہی سے ہے مگر مستشرقین نہیں مانتے کہ وحی کا آپ ﷺ پر نزول ہوتا تھا بلکہ وہ کہتے ہیں کہ مرگی کے دورے پڑتے تھے یا اعصابی مرض تھا یا جنون تھا یا آپ ﷺ توہمات زدہ تھے۔ الزام میں جن کیفیات کا ذکر کیا گیا ہے ان کا رد مرگی کے مرض کا ذکر کرنے سے ہو گا جو اپنے مقام پر آئے گا لیکن یہاں مرگی کا رد وحی الٰہی کی حقیقت بیان کرنے سے کیا جاتا ہے یعنی مرگی اور وحی کی علامات کے فرق سے اس الزام کی قلعی کھل جاتی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس لائق سمجھتا ہے کہ اس کو منصب نبوت سے بہرہ ور کرے تو اس کے قلب و ضمیر اور وجدان و فکر کو وحی تنزیل کے نور سے روشن کر دیتا ہے۔ وحی رشد و ہدایت کی حاصل ہوتی ہے اور خیر و شر کے فرق کو واضح کرتی ہے جس سے انسان میں ایک خاص عمل اور مقرر فکر کی تخلیق ہوتی ہے۔ سیرت و کردار، اخلاق کے پاکیزہ سانچوں میں ڈھلتے ہیں۔ نیز وحی والہام کی روشنی سے بیگانہ نہیں رہتا یا اس منصب سے اس کی زندگی متاثر نہیں ہو پاتی بلکہ پیغمبر کے عمل سے سیرت و کردار اور ہر ہر لمحہ معمولات کا گوشہ گوشہ منور ہو جاتا ہے اور یہ کیفیت و حالت یہاں جا پہنچتی ہے کہ پیغمبر انسانی خواہشات کی پیروی نہیں کرتا اور نہ ہی نفس کے سبب بولتا ہے اور نہ ہی اپنی مرضی

سے کوئی اقدام کرتا ہے بلکہ اس کا ہر عمل رضائے الٰہی اور احکام خداوندی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ارشاد خداوندی ہے۔وَ ما يَنطِقُ عَنِ الهَوىٰ ا،ن هُوَ اِلَّا وَحيٌ يُّوحىٰ (النجم۔۳۔۴) ''ترجمہ:اور وہ خواہش نفسانی سے نہیں بولتا یہ تو وحی ہے جو اس کی طرف بھیجی جاتی ہے۔''

تو پھر بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ بزعم خویش اس خام خیالی میں مبتلا تھے کہ ان پر وحی نازل ہوتی ہے بلکہ یہ تو انعام الٰہی اور فضل ربی ہے نیز وہ ہستی جس کو کفار و مشرکین بھی صادق اور امین کہتے تھے وہ اس صداقت سے کیونکر دور ہو سکتے ہیں وہ مدت العمر اس شرف سے بدرجہ اتم فیض یاب رہے۔تو وہ ہستی اپنی ذات کے لیے اللہ تعالیٰ پر کیونکر شک کر سکتی ہے۔

وحی کی کیفیات سے نا آشنائی یا ارادتاً چھپا کر مرگی وغیرہ کا الزام لگاتے ہیں۔احادیث نبوی: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر سردی کے دن وحی اترتی، آپ کی پیشانی سے پسینہ بہہ نکلتا۔ایک روایت میں ہے حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حارث بن ہشام نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا! آپ پر وحی کیونکر آتی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ابھی تو ایسی ہے جیسے گھنٹے کی جھنکار، وہ مجھ پر سخت ہوتی ہے پھر موقوف ہو جاتی ہے جبکہ میں یاد کر لیتا ہوں اور کبھی ایک فرشتہ آتا ہے، مرد کی صورت میں اور وہ جو کچھ کہتا ہے اس کو یاد کر لیتا ہوں۔

عبادہ بن ثابت سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر جب وحی آتی تو آپ پر سختی ہوتی، آپ ﷺ کا چہرہ راکھ کی طرح ہو جاتا ہے اور دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ کا چہرہ وحی کے وقت سرخ ہوتا۔ عبادہ بن ثابت سے یہ روایت بھی ہے کہ جب آپ پر وحی آتی تو آپ سر جھکا لیتے۔(مسلم شریف کتاب الفضائل۔ص۱۴۱۔ج۶)

حلیمہؓ کا گھرانہ اور وحی کا حال: آپ ﷺ اپنے رضاعی بہن بھائیوں کے ساتھ بکریاں چرانے گئے ہوئے تھے۔انہوں نے حسین اور خوش لباس شخصوں کو دیکھا، انہوں نے آپ کو اٹھایا اور الگ جگہ پر لے گئے، آپ کا سینہ مبارک چاک کیا۔یہ منظر دیکھ کر آپ کا رضاعی بھائی بھاگ کر آیا اور کہا کہ دو آدمی آئے، میرے بھائی کو لٹایا اور سینہ چاک کر دیا۔رضاعی والدہ ماجدہ اور اس کا شوہر حارث دوڑے آئے، وہاں دیکھا کہ آپ خوش باش ہیں، مسکرا رہے ہیں البتہ چہرے پر کچھ خوف کے آثار ہیں۔حلیمہ سعدیہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے آپ کو پکڑا اور سینہ سے لگا لیا پھر آپ کے رضاعی باپ نے سینے سے لگایا اور سر پر ہاتھ رکھ کر کہا، کیا ہوا؟ آپ نے فرمایا کہ دو آدمی آئے، سفید کپڑوں میں ملبوس تھے۔مجھ کو لٹا کر میرا شکم چاک کیا اور میرے سینے سے کوئی چیز نکال دی پھر میرے شکم کو درست کر کے جدا ہو گئے۔انہیں کسی چیز کی تلاش تھی، مجھے کچھ تکلیف نہیں ہوئی بلکہ ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے اور اب بھی ہو رہی ہے۔'' مخبر صادق اور

عینی راست باز شاہدوں کی شہادت کہ آپ پر وحی آتی ہے صرف مفروضوں کی بناء پر جیسا کہ مستشرق کہتا ہے کہ وہ بزعم خویش اس خام خیالی میں مبتلا تھے کہ ان پر وحی نازل ہوتی ہے، قابل تسلیم نہیں ہوسکتی نیز فرشتوں کا آنا، شق صدر کرنا، سعد قبیلہ کے رضاعی بہن بھائی، رضاعی ماں باپ کی گواہی وحی کے نازل ہونے کے لیے سونے پر سہاگہ ہے، بجز اس کے ماخذ سے یہ کہیں واضح نہیں ہوتا کہ آپ پر وحی نازل نہیں ہوتی تھی۔ کاش یہ مستشرقین اپنے بڑوں کی بات مان لیتے جیسے ان کے ایک بڑے عالم ورقہ بن نوفل نے کہا کہ یہی وہ ناموس اکبر ہے جو حضرت موسیٰؑ پر نازل ہوتا تھا لیکن ان کے نصیبوں میں یہ سعادت کہاں! یہودی مستشرقین بھی بے خبر ہیں کہ ان کے بزرگ عبداللہ بن سلامؓ ایمان لائے اور پیغمبر اسلام ﷺ کو نبی برحق جان و دل سے تسلیم کیا یہود و نصاریٰ کے متقدمین علماء متاخرین سے بلند پایہ عالم تھے۔ وہ آپ ﷺ کو نبی اور آپ پر نازل ہونے والی وحی کا اقرار کرتے ہیں اور آج کے نام نہاد یہودی و عیسائی علماء ان دونوں باتوں کے ماننے سے انکاری ہیں۔ وہ سراسر برسر خطا ہیں۔ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف زہر چکانی کرنے والے دورِ حاضر کے مستشرقین کو اتنا بھی علم نہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی نبوت کی شہادت عیسائی عالم نے دی۔ ہجرت حبشہ کے مہاجرین کی پشت پناہی بھی عیسائی بادشاہ نجاشی (اصحمہ) نے کی تھی۔ اس نے پیغمبر اسلام ﷺ کو برحق نبی مانا اور اسی نے آپ ﷺ کی ہونے والی زوجہ محترمہ کا غائبانہ نکاح آپ سے باندھا تھا اور بعض روایات کے مطابق اپنی گرہ سے حق مہر ادا کیا۔ اب عیسائی مستشرقین کے لیے چیلنج ہے کہ بتائیں، یہ انجیل کیا ہوئی جو ورقہ بن نوفل اور اصحمہ نجاشی کے پاس تھی، جنہوں نے انجیل کی پیش گوئی پر آنحضرت ﷺ کی نبوت کا اقرار کیا۔ کیا یہ دور حاضر کے مستشرقین ورقہ بن نوفل سے علم میں آگے ہیں یا آج کے مستشرقین کے پاس ورقہ بن نوفل اور اس دور کی انجیلوں سے آج کی انجیل زیادہ معتبر ہے۔ خدارا ہوش کے ناخن لو!

ٹامس کارلائل: اب مستشرقین اپنوں کی سن لیں۔ ٹامس کارلائل لکھتے ہیں کہ ''ہم لوگوں میں (عیسائیوں) جو یہ بات مشہور ہے کہ محمد نعوذ باللہ ایک پرفن اور فطرتی شخص اور گویا جھوٹ کے اوتار تھے اور ان کا مذہب دیوانگی اور خام خیالی کا ایک تودہ ہے، اب یہ سب باتیں لوگوں کے نزدیک غلط ٹھہرتی جاتی ہیں، جو جو جھوٹ کی باتیں دور اندیش اور مذہبی سرگرمی رکھنے والے آدمیوں (عیسائیوں) نے اس انسان ﷺ کی نسبت قائم کی تھیں۔ اب وہ الزام قطعاً ہماری روسیاہی کا باعث ہیں چنانچہ ایک یہ بات مشہور ہے کہ ''پاکرک'' نے جب ''گرویٹس'' سے پوچھا کہ یہ قصہ جو تم نے لکھا ہے کہ محمد (ﷺ) نے ایک کبوتر کو تعلیم کیا تھا اور وہ ان کے کان میں سے میل نکالا کرتا تھا اور مشہور کیا تھا کہ وہ فرشتہ ہے جو ان کے پاس وحی لایا کرتا ہے تو اس قصہ کی کیا سند ہے؟ تو انہوں نے جواباً کہا کہ اس قصہ کی کوئی سند اور کوئی

ثبوت نہیں۔ گویا خود قصہ گھڑنے والا خود اس قصہ کی سند اور ثبوت سے انکاری ہے۔ ٹامس مزید کہتا ہے کہ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ایسے قصوں کو بالکل چھوڑ دیا جائے جو جو باتیں اس انسان (محمد ﷺ) نے اپنی زبان سے نکالیں اور بارہ سو برس سے اٹھارہ کروڑ آدمیوں کے لیے بمنزلہ ہدایت کے قائم ہیں۔ ۔۔۔اس وقت جتنے آدمی محمد ﷺ کے کلام پر اعتقاد رکھتے تھے اس سے بڑھکر اور کسی کے کلام پر اس زمانہ کے لوگ یقین نہیں رکھتے تو پھر کیا ہم یہ خیال کر سکتے ہیں کہ جس کلام پر اللہ تعالیٰ کی اس قدر مخلوق زندگی بسر کر گئی اور مر گئی، کیا وہ ایک جھوٹا کھیل ہے جیسا ایک بازی گر کا ہوتا ہے۔ میں اپنے نزدیک ہرگز ایسا خیال نہیں کر سکتا بلکہ میں بہ نسبت اور چیزوں کے اس پر جلد یقین کرتا ہوں۔ اگر جھوٹی اور فریب کی باتیں دنیا میں اس قدر رزور آور ہوں اور رواج پکڑ جائیں اور مسلم ٹھہر جائیں تو پھر اس دنیا کی نسبت کوئی کیا سمجھے گا؟ اس قسم کے خیالات جو بہت پھیلے ہوئے ہیں بہت ہی افسوس کے قابل ہیں، اگر ہم خدا کی سچی مخلوقات کا علم کچھ حاصل کرنا چاہیں تو ہم کو ایسی باتوں پر ہرگز یقین نہیں کرنا چاہیے۔

ڈاکٹر جے ڈبلیو لیٹز: کہتے ہیں کہ ''اگر سچے رسول میں ان علامتوں کا پایا جانا ضروری ہے کہ وہ ایثار نفس اور اخلاص نیت کی جیتی جاگتی تصویر ہو اور اپنے نصب العین میں یہاں تک محو ہو کہ طرح طرح کی سختیاں جھیلے، انواع واقسام کی صعوبتیں برداشت کرے لیکن اپنے مقصد کی تکمیل سے باز نہ آئے، جنس کی غلطیوں کو فوراً معلوم کرے اور ان کی اصلاح کے لیے اعلیٰ درجہ کی دانش مندانہ تدبیر سوچے اور ان تدابیر کو قوت سے فعل میں لائے تو میں نہایت عاجزی سے اس بات کے اقرار کرنے پر مجبور ہوں کہ محمد ﷺ خدا کے سچے نبی تھے اور ان پر وحی نازل ہوتی تھی۔''

ضمنی اعتراض:

آپ ﷺ نے دعویٰ نبوت کر کے اپنی عزت کو ٹھیس لگائی۔

امریکی مصنف واشنگٹن ارونگ جو ۹ ویں صدی کے آخر میں سپین میں امریکی سفیر رہ چکا ہے اس نے رسول کریم ﷺ کی سیرت پر کتاب لکھی جس میں وہ آنحضرت ﷺ کی دعوت کے اسباب و بواعث کیا تھے؟ سے متعلق لکھتا ہے کہ کیا اس ذریعہ سے دولت وثروت حاصل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا خود آپ ﷺ کی اپنی یہ حالت تھی کہ وحی کے نزول سے پہلے آپ ﷺ نے کبھی مال و دولت کی طرف رغبت ظاہر نہیں کی تھی کیا آپ ﷺ کا مقصد یہ تھا کہ اس اپنے ہم قوم لوگوں میں عزت وتکریم اور بڑے بڑے مرتبے حاصل کیے جائیں؟ لیکن آپ ﷺ کو تو نبوت کے وعدہ سے پہلے ہی ہر شخص عزت وتکریم کی نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ آپ ﷺ تمام مکہ میں اپنے صدق وامانت کے باعث مشہور تھے علاوہ بریں آپ ﷺ قریش میں سے تھے جو عرب کا سب سے زیادہ معزز قبیلہ شمار کیا جاتا تھا۔ کعبہ کی دربانی کا اہم

منصب پشت ہا پشت سے آپ ﷺ کے خاندان میں چلا آ رہا تھا اس سے بڑھ کر بلند مرتبہ اور کیا ہوسکتا تھا ؟ لیکن جو کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے نبوت کا دعویٰ کر کے خود اپنی عزت کو خاک میں ملا دیا (نعوذ باللہ)۔ یہ دراصل نبوت کے مقام و مرتبہ سے لاعلمی ہے یا نبوت کے منکر ہو کر اپنے تعصب کا اظہار مذکورہ الفاظ میں کرتے ہیں۔ مکہ کا ہر فرد اور بشر آپ ﷺ کا دشمن اور آپ ﷺ کے درپے آزار ہو گیا اور آپ ﷺ کے خاندان والے آپ ﷺ کے جانی دشمن بن گئے۔ کیا کسی قسم کا لالچ آپ ﷺ کو دعوائے نبوت پر مجبور کر رہا تھا؟ لیکن اس کا جواب بھی سراسر منفی میں ہے کیونکہ ہر ایک جانتا ہے کہ ابتدا میں آپ ﷺ نے تبلیغ کو مخفی رکھا تھا اور کئی سال تک آپ ﷺ اس طرح مخفی طور پر تبلیغ کا کام سرانجام دیتے رہے اس کے بعد جوں جوں آپ ﷺ نے تبلیغ کے کام کو وسعت دینا شروع کی تو آپ ﷺ کی مخالفت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ دین کی تعلیمات کے پیغام کو لوگوں تک پہنچانا حکم خداوندی تھا۔ جس مشن کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو منصب نبوت پر فائز کیا تھا۔ اس کٹھن کام میں مصائب و آلام راہ روکے کھڑے ہوتے ہیں مگر آپ ﷺ نے امداد الٰہی سے یہ کام اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر کرتے چلے گئے آخر دنیا نے دیکھا کہ اللہ کا دین تمام ادیان پر غالب آ گیا اور اللہ کے رسول ﷺ کے فتح و نصرت نے بڑھ کے قدم چومے ہر لمحہ، ہر پل آپ ﷺ کے عزت و وقار میں اضافہ ہوا اور اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدہ ''ورفعنا لک ذکرک'' کا تاج آپ ﷺ کے سر سجا کر رہتی دنیا تک کے لیے اس ظاہری دنیا میں اور آنے والی آخری زندگی میں اعلیٰ مقام و مرتبہ عطا کیا۔ نہ جانے مخالف یہ بات کس منہ سے کہتے ہیں کہ '' دعوائے نبوت سے عزت خاک میں مل گئی (نعوذ باللہ)۔ عقل کے اندھوں کو کیا کہیے کہ انہیں یہ خبر نہیں کہ رسالت و نبوت کے منصب سے بڑھ کر کوئی اعلیٰ ارفع مقام نہیں ہے یہ خاص اللہ تعالیٰ کا فضل اور انعام ہے۔ کسی شخص کو اپنی سعی و کوشش اور ریاضت و عبادت سے حاصل نہیں ہو پاتا وہ ذات علیم و خبیر ہی جانتی ہے کہ رسالت کے منصب کو کہاں رکھنا ہے ارشاد خداوندی ہے اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ '' ترجمہ (اللہ بہتر جانتا ہے کہ جہاں اپنی پیغمبری کا منصب بنائے)

رسالت جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے فضل اور انعام ہے تو بھلا کوئی نبی از خود یہ دعویٰ کیسے کر سکتا ہے کہ وہ نبی ہے۔ جب یہ فضل خداوندی ٹھہرا تو پھر آپ ﷺ سے دعوائے نبوت منسوب کرنا سراسر غلط قرار پاتا ہے کیونکہ یہ دعویٰ اللہ تعالیٰ کے حکم سے نبی اپنی امت کو بتاتا ہے۔ دیگر اگر کوئی نبوت کا جھوٹا ٹھیکیدار بنتا ہے تو اپنی زندگی میں سزا پا کر مر جاتا ہے اور اس کا جھوٹ ثابت ہو جاتا ہے۔

مومنین پر ظلم وستم: اسلام لانے والوں پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ انھیں اذیتیں دی جاتی تھیں تاکہ پھر سے وہ اپنے دین پر لوٹ آئیں اور نئے لوگ اسلام کو قبول کرنے سے باز رہیں۔ قریش

نے مسلمانوں پر جو مظالم ڈھائے ان کا مفصل بیان مشکل ہے۔ مختصراً ان کے مصائب دینے کے طریقوں اور آپؐ اور آپؐ کے چند جاں نثاروں کا حال درج ذیل ہے۔

حضرت بلالؓ: امیہ بن خلف کے غلام تھے۔ امیہ کو معلوم ہوا کہ بلال مسلمان ہو گئے ہیں۔ ان کے لیے عذاب کے طرح طرح کے طریقے نکالے۔ گردن میں رسی ڈال کر لڑکوں سے کہا جاتا کہ انھیں گھسیٹیں۔ وہ مکہ کی پہاڑیوں میں گھسیٹتے پھرتے۔ مکہ کی گرم ریت پر لٹا کر گرم پتھر ان کی چھاتی پر رکھ دیا جاتا۔ مشکیں باندھ کر لکڑیوں سے پٹائی کی جاتی۔ دھوپ میں بٹھایا جاتا اور کھانے کو کچھ نہ دیا جاتا۔ ان تمام حالتوں میں حضرت بلالؓ کی زبان پر احد احد کا جان فزا ورد رہتا تھا۔

حضرت عمارؓ: کے ماں باپ یاسرؓ و سُمیہ مسلمان ہوئے تو ابوجہل نے طرح طرح کی تکلیفیں دیں۔ حد تو یہ ہے کہ بی بی سُمیہؓ کے اندام نہانی میں نیزا مارا جس سے وہ جاں بحق ہو گئیں۔ ایک دن آپؐ نے آلِ یاسر کو عذاب سہتے دیکھا۔ فرمایا: یاسر والو! صبر کرو، تمھارا مقام جنت ہے''۔ ابوجہل سُمیہ سے کہا کرتا تھا کہ تو اس لیے ایمان لائی ہے کہ تو ان سے عشق کرتی ہے تو ان کے حسن و جمال کے سحر سے سرشار ہے۔

ابو فلیح: جن کا نام افلح تھا۔ اس کے پاؤں میں رسی ڈال کر انھیں پتھریلی زمین پر گھسیٹا جاتا ہے۔

خباب بن ارتؓ: کے سر کے بال کھینچے جاتے ہیں۔ گردن مروڑی جاتی، گرم پتھروں سے بار ہا لٹایا جاتا۔ خبابؓ خود بیان کرتے ہیں ''ایک دن میرے لیے آگ جلائی گئی۔ میری پشت کو اس کے انگاروں پر رکھ دیا گیا، میری پشت کی چربی نے ہی وہ آگ ٹھنڈی کی۔ ام عمارہؓ نے خریدا۔ اسلام قبول کرنے پر وہ اسے اذیت دیتی۔ لوہے کو آگ میں تپاتی پھر اسے خباب کے سر پر رکھ دیتی۔ خبابؓ نے بارگاہ نبوی میں عرض کیا۔ آپؐ نے دعا فرمائی ''مولا خباب کی مدد کر''۔ اس کی ملکہ کے سر میں درد ہو گیا۔ وہ خباب سے کہتی کہ گرم لوہا لے کر میرے سر کو داغ دیں، وہ لوہا لیتے اور اس کا سر داغتے۔ (دحلان ۳۰۳ ج ۱) غریب و غلام لوگوں کے ساتھ ہی قریش کا ایسا ناروا سلوک نہ تھا بل کہ امیر بھی ان مظالم سے محفوظ نہ تھے۔ قریش کے نشانے پر وہ تمام لوگ تھے جو اسلام قبول کر چکے تھے۔ کیا امیر کیا غریب!

حضرت عثمان بن عفانؓ کا چچا انھیں صف میں لپیٹ کر باندھ دیتا اور نیچے سے دھواں دیا کرتا۔ اسلام قبول کرنے کی پاداش میں مصعب بن عمیرؓ کو ان کی ماں نے گھر سے دیس نکالا دے دیا۔ کئی صحابہؓ کو گائے، اونٹ کے چمڑے میں لپیٹ کر دھوپ میں پھینک دیتے تھے جیسے آج کل پولیس مجرموں کو اونی کمبل میں لپیٹ کر دھوپ میں رکھ دیتی ہے۔ ان کے الفاظ میں اس سزا کو گیدڑ کٹ کہتے ہیں۔ کئی صحابہ کرام کو زرہ پہنا کر گرم جلتے پتھروں پر لٹا دیتے۔ اسی پر بس نہیں کی بل کہ مسلمانوں کے آقا و مولا حضرت محمد ﷺ کو ایسی اذیتیں دی گئیں جن سے انسان کا ذہن کھولنے لگتا ہے۔ بیان کرنے سے

زبان گنگ ہو جاتی ہے۔ تکالیف کو سن کر دل کانپ اٹھتا ہے۔ مختصر سنیئے! عتیبہ کہنے لگا: بخدا! میں ضرور محمد عربی ﷺ کے پاس جاؤں گا، میں ضرور انھیں ان کے رب کے متعلق اذیت دوں گا‘‘۔ وہ حضورؐ کی خدمت میں آیا اور کہا ’’محمد ﷺ والنجم کا انکار کرتا ہے‘‘۔ دوسری روایت میں ہے کہ اس نے کہا ’’والنجم اذا ھویٰ۔ دنیٰ فتدلیٰ‘‘ کا انکار کرتا ہے۔ پھر اس نے آپؐ کے روئے تاباں پر تھوکنے کی جسارت کی اور آپ کی نورِ نظر کو طلاق دے دی‘‘۔ (السیرت النبویہ (دھلان) ۲۵۲)

آپؐ مسجد حرام میں نماز ادا فرما رہے تھے۔ ابوجہل نے کہا کہ اوجھڑی پڑی ہے۔ ایسا کون شخص ہے جو اس غلاظت کو اٹھا کر محمد ﷺ پر پھینک دے۔ بدبخت ترین وہ شخص عقبہ بن ابی معیط نامی نے یہ کام کر دکھایا۔ عبداللہ بن جدعان کی لونڈی جب کہ دوسری روایت میں ہے کہ حضرت حمزہؓ کی بہن حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب کی لونڈی نے حضرت حمزہ کو بتایا کہ ابوجہل نے آپؐ کے بھتیجے کے سر اقدس میں مٹی ڈالی۔ ان پر گندگی پھینکی اور اپنی ٹانگ سے ان کی گردن روند ڈالی۔ عقبہ بن ابی معیط نے چادر کو بل دے کر اسے رسی جیسا بنا کر آپؐ کی گردن میں ڈال کر مزید بل دینے لگا۔ پھر زور سے کھینچا قریب تھا کہ آپؐ کی چشمان مقدس باہر نکل آتیں۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے عقبہ کو کاندھوں سے پکڑا اور حضورؐ سے دور ہٹایا۔ بسا اوقات آپؐ کی راہوں میں کانٹے بچھائے جاتے۔ دروازے پر غلاظتیں اور عفونتیں پھینک دیتے تا کہ صحت و جمعیت خاطر میں خلل پیدا ہو۔ آپؐ صرف یہ فرما دیا کرتے کہ فرزندان عبد مناف! حق ہمسائیگی خوب ادا کرتے ہو‘‘۔ وہ آپؐ کو کاہن، دیوانہ، شاعر، ساحر کہتے تھے۔ یعنی جسمانی ایذاؤں کے ساتھ ساتھ زبان درازی سے کام لیتے اور طرح طرح کے القابات دیتے۔ ہر طرح سے دق کرنے کی کوششیں بسیار ہوئیں۔ یعنی حرص و ہوا اور لالچ کے چنگل میں پھانسنے کے لیے تدابیر کی گئیں۔ عتبہ مکہ کا مشہور مال دار سردار تھا۔ وہ آپؐ کے پاس آیا اور کہا ’’میرے بھتیجے محمدؐ! اگر تم اس کارروائی سے مال و دولت جمع کرنا چاہتے ہو تو ہم خود اتنی دولت تمھارے لیے جمع کر دیتے ہیں کہ تو مالا مال ہو جائے۔ اگر تم عزت کے بھوکے ہو تو ہم سب تم کو اپنا رئیس مان لیتے ہیں۔ اگر حکومت کی خواہش ہے تو ہم تم کو بادشاہ عرب بنا دیتے ہیں جو چاہو سو کرنے کو حاضر ہیں مگر تم اپنا یہ طریق چھوڑ دو اور اگر تمھارے دماغ میں کچھ خلل آ گیا ہے تو بتا دو کہ ہم تمھارا علاج کرائیں۔ آپؐ نے فرمایا ’’جو کچھ تم نے میری بابت کہا وہ بھی صحیح نہیں، مجھے مال، عزت، دولت، حکومت کچھ درکار نہیں اور میرے دماغ میں خلل بھی نہیں۔ میری حقیقت تم کو قرآن کے اس کلام سے معلوم ہو جائے گی ’’یہ فرمان خدا کے حضور سے آیا ہے۔ وہ بڑی رحمت والا اور نہایت رحم والا ہے۔ یہ برابر پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ عربی زبان میں‘ سمجھ دار لوگوں کے لیے ہے اس میں سب باتیں کھلی درج ہیں۔ جو لوگ خدا کا حکم مانتے ہیں ان کے واسطے اس فرمان میں بشارت ہے اور جو انکار

کرتے ہیں ان کو خدا کے عذاب سے ڈراتا ہے۔ تاہم بہت سے لوگوں نے اس فرمان سے منہ موڑ لیا ہے۔ وہ اسے سنتے ہی نہیں اور کہتے ہیں کہ اس کا ہمارے دل پر کوئی اثر نہیں اور ہمارے کان اس کے شنوا نہیں اور ہم میں اور تم میں ایک طرح کا پردہ ہے تم اپنی تدبیر کرو ہم اپنی تدبیر کر رہے ہیں۔

حضرت حمزہ کا اسلام لانا: آپؐ کوہ صفا یا الحجون میں تشریف فرما تھے۔ وہاں سے ابو جہل کا گزر ہوا۔ اس نے آپؐ سے اذیت دہ گفت گو کی۔ دوسرے قول کے مطابق اس نے آپؐ کے سر اقدس میں مٹی ڈالی۔ آپؐ پر گندگی پھینکی اور آپؐ کی مقدس گردن اپنی ٹانگ سے روند ڈالی۔ آپؐ نے اس سے بات تک نہ کی۔ وہاں عبداللہ بن جدعان کی لونڈی اپنے گھر میں تھی وہ سب کچھ سن اور دیکھ رہی تھی۔ ابو جہل چلا گیا۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت حمزہ کی بہن حضرت صفیہؓ کی لونڈی نے بتایا تھا۔ ہوسکتا ہے دونوں نے بیان کیا ہو۔ تھوڑی دیر بعد حضرت حمزہ تلوار حمائل کیے شکار سے لوٹے۔ ان کا معمول تھا کہ شکار سے واپس آتے تو پہلے خانہ کعبہ کا طواف کرتے پھر گھر جاتے۔ مذکورہ لونڈیوں نے سارا حال بیان کیا۔ وہ غصہ میں سرخ ہو گئے۔ اور ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی وہ مسجد حرام میں گئے۔ ابو جہل اپنی قوم میں بیٹھا تھا۔ وہ سیدھے اس کی طرف گئے۔ اس کے سر پر کھڑے ہو گئے اور کمان اوپر تان کر اس کے سر پر دے ماری۔ شدید زخمی کر دیا۔ پھر فرمایا کہ ''کیا تو میرے بھتیجے کو برا بھلا کہتا ہے، حال آں کہ میں انہی کے دین پر ہوں جو کچھ وہ کہتے ہیں وہی کچھ میں کہتا ہوں۔ اگر استطاعت ہے تو مجھ سے بدلہ لے لو''۔ ابو جہل کے قبیلہ نے کہا تو صابی ہو گیا ہے۔ انھوں نے فرمایا: ''مجھے اس دین حق سے کون روک سکتا ہے؟ اب میرے لیے یہ امر عیاں ہو چکا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں وہ حق ہے۔ بخدا میں یہ دین متین نہیں چھوڑوں گا۔ اگر تم سچے ہو تو مجھے اس سے روک لو''۔ ابو جہل نے اپنے قبیلہ کے لوگوں سے کہا '' ابو عمارہ کو چھوڑ دو۔ بخدا میں نے ہی ان کے بھتیجے کو ستایا تھا۔ (دھلان۔ ۲۶۱) حضرت حمزہؓ نے کہا میں اسلام قبول کرتا ہوں، روک لو اگر روک سکتے ہو۔ ابو جہل بھونچکا رہ گیا۔ حضرت حمزہؓ کا اسلام میں داخل ہونا غیر معمولی اقدام تھا یوں کہہ دیں تو بجا ہوگا کہ ایسے بہادر اور نڈر کے اسلام قبول کرنے میں کفر کی شکست تھی۔ ابو جہل اپنی بے عزتی و توہین کے بجز حضور ﷺ سے ناروا سلوک پر پچھتایا تو ہوگا کہ اس کی حماقت و نادانی کی وجہ سے کفر کا ایک اہم اور مضبوط ستون دھڑام سے گر گیا لیکن اب پچھتائے کیا ہووت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ اس واقعہ سے کفار میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی کہ ان کی تمام جدوجہد اکارت گئی کیونکہ انہیں یہ خطرہ لاحق تھا کہ اگر اس طرح ایک ایک کر کے قریش کے لوگ ٹوٹتے رہے تو چند سالوں میں یہ سب کچھ ملیا میٹ ہو جائے گا۔ ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دینے والوں کی نیندیں حرام ہو چکی تھیں ''ہم جس سے ڈر رہے تھے وہی بات ہو گئی'' یعنی ایک ایک کر کے

کفار دائرہ اسلام میں داخل ہونا شروع ہو گئے۔

اعتراض نمبر ۱۹۵

''یتیم لڑکے کی حالت کچھ اچھی نہ تھی اور آخیر زندگی میں ان کے چچا حمزہ نے نشہ کی حالت میں محمدؐ کو طنزاً اپنے باپ کا غلام کہا''۔ (لائف آف محمد از مارگولیس) عبدالمطلب کا آنحضرتؐ کو عزیز رکھنا ایک مسلم واقعہ ہے لیکن مارگولیس صاحب کو دادا کا پوتے پر مہربان ہونا بھی گوارا نہیں۔

جواب: آپؐ کے دادا جان عبدالمطلب کو حضرت عبداللہ اور آمنہ کے نور نظر کی ولادت باسعادت کی خبر دی گئی۔ خبر سنتے ہی عبدالمطلب کی آنکھوں کے سامنے اپنے نور نظر حضرت عبداللہ کی تصویر گھومنے لگتی ہو گی۔ فوراً اٹھے اور سیدہ آمنہ کے گھر جا کر اپنے پوتے کو دیکھ کر مسرور و محظوظ ہوئے۔ (خاتم النبین ص ۱۱۸ بہ حوالہ عیون الاثر جلد ا ص ۸۷)

اسی وقت اٹھا کر حصول برکت کے لیے خانہ کعبہ میں مولود سید الابرار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لے آتے ہیں۔ دیر تک طویل عمری کی دعائیں مانگتے رہے۔ اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک کا شکریہ ادا کیا اور آپ کو اپنی والدہ کے پاس لے آئے۔ آپ کے دعائیہ کلمات اشعار کی صورت میں تھے جنھیں امام سہیلی نے ''روض الانف'' میں نقل کیا ہے۔ ان کا ترجمہ پیش خدمت ہے۔

ا: ''اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ جس نے مجھے یہ پاکیزہ جسم و جان فرزند عطا کیا''۔ ۲: جو جھولے میں بھی بچوں کا سردار ہے اور میں اسے رب البیت کی پناہ میں دیتا ہوں۔ ۳: جب تک یہ بولے، باتیں کرے اور اس کی زبان کھلے، دشمنوں کا کوئی شر اسے ضرر نہ پہنچا سکے اور حاسدوں کی آنکھ سے خداوند دو جہاں اسے محفوظ و مصئون رکھے''۔ (طبقات ابن سعد ج ا)

ساتویں دن آپ کا عقیقہ کیا۔ بہت سے اونٹ ذبح کیے اور قریش مدعو کیے گئے مہمانان کی دعوت کی۔ اپنے دامن تربیت میں لیا۔ اپنی اولاد سے بڑھ کر عزیز رکھا۔ اس بات کی شہادت یہ ہے جب حضرت عبدالمطلب کے لیے مسجد حرام میں خانہ کعبہ کے سایہ میں ان کی نشست کے لیے فرش بچھا دیا جاتا۔ اس پر صرف وہی جلوہ افروز ہوتے اور کسی کو مجال نہ تھی کہ اس فرش پر قدم رکھے سارے ارد گرد بیٹھتے لیکن وہ آپ ہی تھے جس کے لیے دادا نے دعائیں مانگیں۔ وہ آپؐ ہی تھے جو دادا کے پیارے بیٹے حضرت عبداللہ کی نشانی تھے۔ وہ آپ ہی تھے جسے جھولے میں بچوں کا سردار کہا گیا۔ وہ آپؐ ہی تھے جن کے پیدا ہونے پر اللہ کا شکریہ ادا کیا گیا۔ وہ آپ ہی تھے جو فرش پر بلا تکلف آ کر بیٹھ جاتے۔ آپ کو حاضرین ہٹانا چاہتے مگر جناب عبدالمطلب نہ صرف منع کرتے بل کہ یوں فرماتے ''میرے بیٹے کو چھوڑ دو بخدا اس کی خاص شان ہو گی''۔ (سیرت ابن ہشام ج ا ص ۱۰۶) یہ اظہار نسبتی انتہائے کمال محبت ہے۔

دادا جان کی بے قراری: سیرت خاتم النبیین ص ۱۳۳ کے مصنف (بہ حوالہ عیون الاثر اور دیگر کتب) بیان کرتے ہیں کہ ''کندیر بن سعید اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ قبل از اسلام مکہ مکرمہ حج کے لیے آئے۔ وہاں دیکھا کہ ایک شخص طواف کعبہ میں مشغول اور شعر پڑھ رہا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے ''اے اللہ! میرے محمد ﷺ کو واپس بھیج دے اور مجھ پر اپنا خاص احسان فرما''۔ انھوں نے اس شخص کے متعلق پوچھا تو معلوم ہوا کہ قریشی سردار عبدالمطلب ہیں۔ انھوں نے اپنے پوتے محمد (ﷺ) کو گم شدہ اونٹ کی تلاش میں بھیجا تھا کہ وہ ہر کام میں کام یاب ہوتے ہیں۔ ذرا سی دیر پر ان کی جدائی میں بے قرار ہو جاتے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد آپ اونٹ لیے آگئے۔ دیکھتے ہی انھوں نے اپنے پوتے کو گلے سے لگا لیا اور کہا میں تمھاری وجہ سے سخت پریشان ہوں۔ اب کبھی تم کو اپنے سے جدا نہ ہونے دوں گا۔ اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا کی زندگی میں ایک ساتھ رہیں گے۔ کبھی جدا نہ ہوں گے اور یہ مطلب ہرگز نہیں کہ موت بھی جدا نہ کر سکے گی۔ انھیں موت کا یقین کامل تھا۔ قدرت کے فرمان ''کل نفس ذائقۃ الموت'' سے واقف تھے۔ آپ تو دنیا کی چار دن کی زندگی میں جدا نہ ہونے کا ذکر کر رہے ہیں۔

دکھی انسانیت کا مسیحا: آپ ﷺ غریب کی دستگیری کرتے تھے۔ محتاج کی حاجت روائی کرتے تھے۔ بے سہارا کا سہارا بنتے تھے۔ دکھیوں کے دکھ کا مداوا کرتے تھے۔ یہی راہ حق کا راہنما اپنے جذبہ امداد و تعاون میں ہر وقت مستعد نظر آتا ہے۔ آپؐ نے حضرت علیؓ کی اونٹنیوں کو چیرنے پھاڑنے پر اپنے چچا حمزہ کو تنبیہ فرمائی۔ اگر حالت اچھی نہ ہوتی، اگر آپ کچھ نہ کر سکتے ہوتے (نعوذ باللہ) تو چچا کے پاس جانے کا کیا فائدہ؟ یہی دلیل ہے کہ آپ نے چچا کا احتساب کیا اگر نہ کرتے تو کہا جا سکتا تھا کہ آپ کی حالت اچھی نہ تھی اس لیے اپنے چچا کو ایک حرف تک نہ کہہ سکے۔ اوروں کو نصیحت خود میاں فصیحت۔ حضرت خدیجہؓ کا اٹل اور فیصلہ کن بیان کہ ''خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ آپ کو شرمندہ نہ کرے گا۔ آپؐ صلہ رحمی کرتے ہیں۔ بے وسیلہ کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ محتاج کی حاجت پوری کرتے ہیں۔ مہمان کی مہمان نوازی کرتے ہیں اور راہِ حق میں آنے والے حادثوں میں لوگوں کی امداد کرتے ہیں، کے کیا معنی؟ گویا تمام خوبیوں سے متصف تھے اور ہر خوبی کا اظہار عمل سے کر دکھایا۔ حضرت حمزہ کا آپؐ کو اپنے باپ کا غلام کہنے سے یہ شوشہ چھوڑا کہ عبدالمطلب آپؐ کے دادا نے انھیں غلام بنا کر رکھا ہوا تھا۔ ایسی بے سروپا دلیل ہے جس کی تردید مراجع اور مآخذ کرتے ہیں جس سے اس بات کی کوئی وقعت نہیں رہتی۔ وہ دادا جس نے اپنی زندگی میں آپؐ کا ہر قسم کا خیال رکھا اپنوں سے بڑھ کر سمجھا، اپنوں سے بڑھ کر عزت دی۔ حتیٰ کہ مرتے وقت بھی آپ ﷺ کو بے یار و مددگار نہ چھوڑا۔ آپؐ کو اپنے خاندان کے ایک فرد کی کفالت کی ذمہ داری سونپی۔ آخر دم تک آپؐ کا خیال رکھنے والا ذی شان دادا اس دنیا سے رحلت کرتا ہے تو آپؐ ان

کے جنازہ کے پیچھے روتے جاتے تھے۔ گویا آپ کو بھی اپنے دادا سے اتنی ہی شدید محبت تھی جتنی دادا کو تھی۔ اسی شفقت و محبت کا نتیجہ تھا کہ اپنا تعارف اپنے دادا کی نسبت سے کرایا۔ آپؐ نے ایک موقعہ پر فرمایا ''انا النبی لا کذب انا ابن عبدالمطلب''۔ کوئی شخص جس کی ذات پر کوئی احسان کرے اور عمر بھر احسان کرتا رہے تو یہ ممکن ہے کہ وہ بھی اپنی زندگی کے مختلف مراحل میں اس محسن کا ذکر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آنحضرتؐ کا فرمان انا ابن عبدالمطلب ہے اور انا ابن عبداللہ نہیں فرمایا اس کی کوئی بھی وجہ ہو اظہار کمال محبت ہے جیسے کہ آپ کے والد فوت ہو گئے اور عبدالمطلب آپ کے والد سے زیادہ شہرت والے تھے اور دادا کی کفالت میں رہے اور عبدالمطلب کا فرزند کہا جانے لگا۔ ضمام بن ثعلبہ کی حدیث میں ہے کہ جب آنحضرت ﷺ ہجرت کر کے مدینہ آئے تو ضمام بن ثعلبہ مدینہ آئے انھوں نے اپنا اونٹ مسجد کے قریب بٹھایا اور پوچھا ''ایکم ابن عبدالمطلب'' تم میں سے ابن عبدالمطلب کون ہے۔ آپ کی نسبت والد کی بہ جائے دادا سے کی جاتی ہے۔ کیوں کہ لوگوں میں یہ بات مشہور تھی کہ ''عبدالمطلب کی اولاد سے ایک ایسا مرد ظہور کرے گا جو اللہ تعالیٰ کی طرف چلائے گا اور اس کے ہاتھوں پر اللہ تعالی مخلوق کو ہدایت فرمائے گا اور وہی مرد خاتم الانبیاء ہوگا''۔ (مواہب الدنیا ص ۱۴۴ ج اول)

دوسرا الزام کہ چچا حمزہ نے نشہ کی حالت میں محمد ﷺ کو طنزاً اپنے باپ کا غلام کہا تھا''۔ مارگولیس اعتراف کرتا ہے کہ حمزہؓ نشہ کی حالت میں تھے اس کی تفصیل تفہیم بخاری غزوہ بدر جلد ۶ ص ۶۶۸ اور خمس جلد ۴ ص ۶۵۵ میں ہے کہ حضرت علی بن حسینؓ نے فرمایا کہ امام حسینؓ نے ان سے بیان کیا کہ حضرت علیؓ نے فرمایا بدر کی جنگ میں غنیمت میں سے ایک اونٹنی میرے حصہ میں آئی تھی اور ایک اونٹنی نبی کریم ﷺ نے مجھے غنیمت کے خمس سے دی تھی۔ جب میں نے سیدہ فاطمہ زہرہؓ بنت رسول معظم ﷺ کو رخصتی کرا لانے کا ارادہ کیا تو میں نے ایک شخص سے معاہدہ کیا جو بنی قینقاع کا سنار تھا کہ وہ میرے ساتھ چلے اور ہم ازخر گھاس لائیں۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ ازخر گھاس سناروں کے پاس فروخت کروں گا اور اس کی قیمت سے اپنی زوجہ کے ولیمہ میں مدد لوں گا۔ چناں چہ میں اپنی اونٹنیوں کے لیے سامان، کجاوہ، گھاس کا جال اور رسیاں وغیرہ جمع کر رہا تھا اور دونوں اونٹنیاں ایک انصاری کے مکان کے قریب بیٹھی ہوئی تھیں۔ جب میں جمع کردہ سامان لے کر آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میری دونوں اونٹنیوں کے کوہان کاٹ لیے گئے ہیں اور ان کے کولہے پھاڑ دیئے گئے ہیں اور ان کے جگر نکال لیے گئے ہیں۔ جب میں نے ان کا یہ منظر دیکھا تو میں اپنی آنکھوں کا مالک نہ رہا (رونے لگا) میں نے کہا یہ کس نے کیا ہے؟ تو لوگوں نے کہا یہ حمزہ بن عبد المطلب کا فعل ہے اور وہ اس گھر میں شراب پینے کے لیے چند انصاریوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں وہاں سے چلا آیا اور سیدھا نبی کریم ﷺ کی مجلس شریف میں حاضر ہوا جب کہ آپؐ کے پاس

زید بن حارثہؓ بیٹھے ہوئے تھے نبی کریم نے میرے چہرے سے قلبی وجدان کو پہچان لیا اور فرمایا کیا بات ہے؟ میں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ! میں نے آج جیسا منظر کبھی نہیں دیکھا۔حمزہؓ نے میری اونٹیوں پر ظلم کیا۔ان کے کوہان کاٹ ڈالے اور ان کے کولہے پھاڑ دیئے ہیں۔وہ اس مکان میں ہیں۔ان کے ساتھ اور لوگ شراب پینے کے لیے جمع ہیں۔نبی کریم ﷺ نے اپنی چادر منگوائی، اوڑھی پھر روانہ ہوئے۔میں اور زید آپ کے پیچھے چلے۔حتیٰ کہ آپ اس مکان میں گئے جہاں حمزہ تھے۔آپؐ نے اجازت لی تو انھوں نے اجازت دے دی۔کیا دیکھتے ہیں کہ وہ سب شراب پی رہے ہیں۔آپ نے حمزہ کو ان کے کیے پر ملامت کی۔حمزہ کی آنکھیں شراب کے نشہ میں سرخ تھیں۔اس نے جناب نبی مکرم ﷺ کو دیکھا پھر نظر اوپر کی تو آپ کو گھٹنوں تک دیکھا۔پھر نظر اوپر کی تو آپ کو ناف تک دیکھا پھر نظر اوپر کی تو آپ کے چہرہ انور کو دیکھا۔پھر حمزہ نے کہا تم تو میرے باپ کے غلام ہو۔جناب رسول کریم ﷺ نے پہچانا کہ وہ نشہ میں دھت ہیں تو آپ ایڑھیوں کے بل پچھلے قدم واپس آ گئے اور ہم بھی آپ کے ساتھ باہر نکل آئے۔علامہ شبلی فرماتے ہیں کہ ''حضرت حمزہ سخت مخمور تھے اس حالت میں وہ الفاظ ان کی زبان سے نکلے تھے۔کیا اس حالت کا کوئی بیان شہادت میں پیش کیا جا سکتا ہے؟ (سیرت النبی ص ۱۱۶) جب کوئی شخص ہوش میں نہ ہو اور اسے خبر تک نہ ہو کہ کیا کہہ رہا ہے تو اس کے کسی بیان کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔اسی لیے تو شرعی امور کے نہ کرنے کا حکم ہے۔ارشاد خداوندی ہے۔ "یَاَیُّهَا الَّذِینَ اٰمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوا مَا تَقُوْلُوْنَ''۔ (النساء۴۔۴۳) ترجمہ: اے ایمان والو نہ قریب جاؤ نماز کے، جب تم نشہ کی حالت میں ہو جب تک کہ تم سمجھنے لگو جو (زبان سے) کہتے ہو''۔

نماز کی حاضری سے روک دیا گیا کیوں کہ بے ہوشی میں جو کہا جاتا ہے معلوم نہیں ہوتا۔ایک روز حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے ہاں کئی صحابہ مدعو تھے۔کھانے کے بعد شراب کا دور چلا۔جب وہ نشہ میں دھت تھے۔مغرب کی نماز کا وقت آ پہنچا۔ایک صاحب نے امامت کرائی اور اتفاق سے سورہ الکافرون پڑھنا شروع کی۔بے ہوشی میں "لا اعبد ما تعبدون" کی بہ جائے اعبد ما تعبدون' پڑھ دیا جس سے معنی بالکل بدل گئے۔بدیں سبب حکم ہوا کہ نشہ کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ۔یعنی نشہ کی حالت میں کی گئی کوئی بھی کاروائی قابل یقین نہیں ہوتی کیوں کہ جب کوئی آدمی ہوش میں نہیں رہتا تو جو اس کے منہ میں آتا ہے بک دیتا ہے اس کے خلاف کارروائی درست نہیں ہے۔اسی طرح آپ کے چچا حمزہ کا نشہ کی حالت میں طنزاً اپنے باپ کا غلام کہنا قابل مواخذ نہیں۔

دوم: تم تو میرے باپ کے غلام ہو، اس کا معنی یہ ہے حمزہؓ اور عبداللہؓ بھائی ہیں۔دادا کو سید اور مولیٰ کہا جاتا ہے اس سبب سے حمزہ سید عالم ﷺ اور علیؓ کی نسبت عبدالمطلب کے زیادہ قریب

ہیں۔اس وجہ سے انھوں نے بہ طور افتخار اور مباحات یہ کہا تھا۔(تفہیم البخاری جلد ۴ ص ۶۵۸) (یہ بھی یاد رہے کہ اس وقت شراب کے حرام ہونے کا حکم نہیں ہوا تھا)

سوم: حضرت حمزہ ابھی اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے۔شکار سے واپس آ رہے تھے۔تیر کمان پاس تھی۔عبداللہ بن جدعان کی لونڈی نے سیدنا حمزہؓ کو بتایا کہ تھوڑی دیر پہلے تیرے بھتیجے کو ابوجہل نے بہت سخت سست کہا ہے۔اپنے معمول کے مطابق حرم پہنچے یعنی شکار سے سیدھا گھر نہیں جاتے تھے حرم جاتے تھے۔دیکھا کہ ابوجہل قریش کی ایک مجلس میں بیٹھا ہے۔سیدھا اس کی طرف گئے اور اس کے سر پر زور سے کمان ماردی۔خون بہہ نکلا اور کہا تو محمد ﷺ کو گالیاں بکتا ہے۔سن لے میں خود ان کے دین کو قبول کرتا ہوں۔قریشی ابوجہل کی حمایت میں اٹھنا چاہتے تھے لیکن ابوجہل نے روک دیا اور کہا کہ واقعی میں نے ان کے بھتیجا کو سخت سست کہا ہے۔یہ وہی سیدنا حمزہ ہیں کہ ابھی اسلام سے مشرف نہیں ہوئے تھے اور گوارا نہیں کرتے کہ کوئی شخص ان کے بھتیجا کو نازیبا اور گستاخانہ کلمات کہے۔یہ وہی سیدنا حمزہ ہیں جنھوں نے دشمن رسول ابوجہل کا سر پھوڑ دیا۔یہ وہی سیدنا حمزہ ہیں کہ ابوجہل کے پاس بیٹھے لوگوں سے ذرا برابر نہ ڈرا اور اپنے بھتیجے کا بدلہ لیا۔یہ وہی سیدنا حمزہ ہیں جنھوں نے اسلام قبول کر لیا تو سوچیں کہ دوسرے لوگ جو آپ کی توہین کریں حضرت حمزہ برداشت نہیں کرتے اور اس وقت اپنے بھتیجے کا دفاع کرتے ہیں جب ایمان بھی نہیں لائے تھے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ خود اپنے بھتیجے کو اپنے باپ کا غلام کہیں؟ دونوں باتیں قابل لحاظ ہیں اول فخر و مباحات کی بنا پر کہا یا دوم نشہ کے سبب کہا' جیسا کہ واقعہ سے صاف ظاہر ہے۔اور نکتہ چیں مارگولیس کا تنقیص کا پہلو ڈھونڈ نکالنا محض تعصب و نفرت پر مبنی ہے۔تاریخی حقائق اور شواہد اس کا رد کرتے ہیں۔اور اس الزام کی قطعاً ذرا برابر گنجائش نہیں۔اللہ تعالیٰ صحیح سوچنے سمجھنے اور کہنے کی جزائے خیر عطا فرمائے۔آمین۔نشہ کی حالت میں یہ الفاظ کہے جیسے مستشرق خود تسلیم کرتا ہے۔اگر نشہ کی حالت میں نہ ہوتے تو ایسا نہ کہتے لہٰذا پہلا اعتراض جاتا رہا کہ یتیم لڑکے کی حالت اچھی نہ تھی۔اب رہا کہ نشہ کی حالت میں کلمات کہے تو یہ کلمات بہ سبب نشہ قابل مواخذہ نہیں۔یہ مارگولیس کی نفرت و تعصب کا نتیجہ ہے کہ جانتے بوجھتے اور واقعہ کے خلاف ثبوت و شواہد کے ہوتے ہوئے نہیں مانتا اور بعض دفعہ اپنے اعتراضات کا خود بطلان کرتا ہے۔یعنی ایک بار کوئی بیان داغ دیا دوسری بار کوئی اور کبھی اس کے اپنے اعتراض کی عبارت ہی سے اعتراض باطل ہو جاتا ہے۔کبھی دیگر مستشرقین کی آراء سے باطل ہو جاتا ہے مگر مارگولیس باز نہیں آتا۔صرف اور صرف الفاظ کو الٹ پلٹ کر کے اور بدل بدل کر لاتا ہے مگر اس کے جذبات و افکار وہی پرانے اور باطلہ ہوتے ہیں۔

الفاظ نئے ہیں مگر افکار پرانے
دستار تو بدلی ہے مگر سر نہیں بدلا

اعتراض نمبر ۱۹۶

مسلمانوں پر مظالم کے سد باب کو غرانیق کا واقعہ تصور کیا جا سکتا ہے‘‘۔(۲۹۷۔ مستشرقین مغرب کا انداز فکر)

جواب: راویوں کے بہ قول اگر یہ واقعہ غرانیق ہجرت حبشہ کے بعد کا ہے تو یہ محرک باقی نہ رہا۔ کیوں کہ ۱۳ نبوی میں مکہ کے مرد مہاجرین کی تعداد ۹۰ تھی تو ۴ نبوی میں یہ تعداد بدیہی کم ہوگی۔ ان میں سے تراسی لوگ حبشہ ہجرت کر جاتے ہیں۔ باقی حضرت طلحہؓ، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت حمزہؓ، حضرت علیؓ اور حضرت زید بن حارثہؓ رہ جاتے ہیں۔ یہ کفار کی دسترس میں نہیں تھے۔ اگر غرانیق کا واقعہ قبل ہجرت حبشہ واقع ہوتا ہے۔ پھر بھی مظالم قریش اس واقعے کے محرک نہیں ہو سکتے۔ بایں سبب کہ پہلے تین سال خفیہ تبلیغ کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ اعلانیہ تبلیغ ۴ نبوی میں شروع ہوتی ہے۔ جب اسلام کا سیل حق بڑھتا ہوا کہیں نہیں تھمتا۔ تب قریش کے ظلم و ستم اور جبر و تشدد کی مہیب آندھیاں چلنے لگتی ہیں۔ اہل مکہ کی اذیتوں سے بچنے اور اسلامی تعلیمات کو بجالانے کی خاطر ہجرت حبشہ واقع ہوتی ہے۔

اعتراض نمبر ۱۹۷

’’واٹ کے بہ قول کفار مکہ کی طرف سے ظلم و ستم کے پہاڑ ڈھائے گئے ان کے بیان میں مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا۔ قریش کی طرف سے حریفانہ دباؤ بہت معمولی تھا‘‘۔(محمد رسول اللہ۔۳۶۵)

’’واٹ‘‘ ظلم و ستم کے ان واقعات کو مبالغہ آرائی کی بھینٹ چڑھا کر مشکوک بنا دیتا ہے۔ اس کے نزدیک قریش کی طرف سے حریفانہ دباؤ معمولی تھا۔ مسلمانوں نے اگرچہ اس دباؤ کو مبالغہ سے بیان کیا ہے۔ دراصل اس سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ معمولی ستم کی وجہ سے کسی نے اسلام نہیں چھوڑا۔ ابن اسحٰق کے حوالے سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ محمدؐ کو سب و شتم کا نشانہ بنایا گیا اور معمولی انداز کے اہانت آمیز واقعات پیش آئے، جیسے پڑوسیوں کا ان کے گھر کے سامنے کوڑا کرکٹ ڈال دینا۔ ابو طالب کے انتقال کے بعد غالباً پریشان کرنے کا سلسلہ تیز ہو گیا تھا۔ مگر مسلمانوں پر دباؤ کی چند صورتیں تھیں، جیسے کسی مسلمان پر اس قبیلہ والوں کی طرف سے دباؤ جس سے رکاوٹ ڈالنا یا لفظی سب و شتم کا نشانہ بنانا اور اسی قسم کی دوسری کارروائیاں جو عزت و شرف کے مروجہ قانون کے خلاف نہ ہوں، اس طرح کے دباؤ سے اسلام کو فروغ ہی ملتا تھا۔(علوم اسلامیہ اور مستشرقین ۹۷)

جواب: ظلم و ستم کی تفصیلات تاریخی کتب میں موجود ہیں۔ ہر چھوٹی بڑی سزا کو تاریخ نے اپنے دامن میں سمیٹ رکھا ہے۔ ان واقعات کو تعصب کی نظر سے پڑھ کر انکار کرنا مستشرقین کی پرانی روش

ہے۔کوئی بھی شخص تاریخ کے مطالعہ سے اس باب کو پڑھ کر اندازہ لگا سکتا ہے کہ لوگوں کو نئے دین میں داخل ہونے کے جرم کی پاداش میں گھناؤنی سزائیں دی جاتی رہیں۔دھونس، دھمکی، مار کٹائی سے کام لیا جاتا ہے۔دہکتے انگاروں پر چت لٹاتے۔گرم پتھر چھاتی پر رکھ دیتے،کبھی پتھریلی زمین پر گھسیٹتے اور کبھی گرم گرم ریت پر گرا دیتے۔بھوکا رکھتے،دھوپ میں بٹھا دیتے۔یہی نہیں انھیں دیس نکالا دے دیتے۔ جلاوطن ہونے والوں کے مال و دولت اور جائیداد پر قبضہ جما لیتے ہیں۔مسلمانوں نے ہر ظلم برداشت کیا مگر اسلام کو گلے لگائے رکھا کبھی ایسا وقت نہ آیا کہ مومنین نے مختلف شدید مظالم کو برداشت نہ کر کے دین سے راہ فرار اختیار کی ہو لیکن اس کی تردید میں ''واٹ'' یہ دلیل لاتا ہے کہ ایسے مظالم سے مسلمان یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ لاکھ ستم سہے مگر وہ دین اسلام پر ڈٹے رہے۔جب کہ حقیقت یہ ہے کہ قریش کے مظالم اس وجہ سے تھے کہ ان تکالیف اور ظلم روا رکھنے سے مسلمان اس نئے دین کو چھوڑ کر دوبارہ اپنے دین پر لوٹ آئیں گے اور نئے لوگ اس نئے دین کو اختیار کرنے سے باز رہیں گے۔لیکن ان کی یہ خام خیالی رنگ نہ لا سکی۔کسی نے دین اسلام قبول کر کے اسے پھر خیر باد نہ کہا۔ہر طرح کے ظلم کو برداشت کیا حتیٰ کہ موت کو گلے سے لگا کر ابدی نیند سو گئے۔اسلام پر مر مٹے۔یہ لوگ موت سے گھبراتے نہیں تھے۔تشدد و زیادتی ان کا کچھ بگاڑ نہ سکتی تھی بل کہ وہ توپ سے ٹکرا جانے والے تھے۔

یعنی تیغ تو کیا چیز ہے ہم توپ سے لڑ جاتے ہیں۔اس بلا کے حوصلہ والے لوگ کب اپنے درست موقف سے انحراف کر سکتے تھے۔مستشرق ''واٹ'' کا کہنا مبالغہ آرائی ہے اور ابن اسحٰق کے حوالہ سے محمدؐ کو سب و شتم کا نشانہ بنایا گیا اور معمولی اہانت آمیز واقعات جیسے پڑوسیوں کا ان کے گھر کے سامنے کوڑا کرکٹ ڈالنے کے پیش آئے۔متعصب مستشرق کے کہنے پر یہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ ابن اسحٰق کے علاوہ دیگر تاریخی کتب ان واقعات سے بھری پڑی ہیں۔وہ کیوں کر اس کو نظر نہیں آئیں۔نیز مسلمانوں کے غیر متزلزل ایمان کو دیکھ کر یہ تہمت دھری کہ قریش کا مسلمانوں پر حریفانہ دباؤ معمولی تھا۔مسلمانوں پر دباؤ کی چند صورتیں بیان کرتا ہے۔اول مسلمانوں پر اس کے قبیلہ والوں کی طرف سے دباؤ جس سے قبائلی تعلقات متاثر نہ ہوں اور وہ فرد بھی ایسا ہو جسے کسی قبیلہ کی حمایت حاصل نہ ہو۔ذرا سوچیے کہ ابوبکر صدیقؓ اور عثمان غنیؓ جیسی مقتدر شخصیتوں کے ساتھ ناروا سلوک اور ظلم و زیادتی سے قبائلی تعلقات متاثر نہیں ہو سکتے تھے۔انھیں اپنا گھر بار چھوڑنے پر مجبور کیا گیا۔عثمان غنیؓ نے دوبارہ ہجرت کی۔آپؐ کی اہلیہ بھی آپؐ کے ساتھ تھیں۔ہجرت کرنے والے ہتھے چڑھ جاتے تو انھیں روک لیا جاتا ہے اور پہرے لگا دیے جاتے ہیں اور کبھی موقعہ پر تشدد کیا جاتا ہے اور روح فرسا واقعات پیش آتے ہیں۔جیسے سفر ہجرت میں سیدہ زینبؓ کی مزاحمت ہبار بن الاسود نے نیزہ تان کر کی تھی۔اس صدمہ سے ان کا حمل

ساقط ہو گیا تھا۔ کیا اس سے قبائلی تعلقات متاثر نہیں ہو سکتے تھے۔ گویا ''واٹ'' اپنی خفگی کو دور کرنے کے لیے یہ الزام لگاتا ہے جس میں ذرا برابر بھی حقیقت نہیں۔ ''واٹ'' کہتا ہے معاشی معاملات میں رکاوٹ ڈالنا یا لفظی سب وشتم کا نشانہ بنانا اور اسی قسم کی دوسری کاروائیاں جو عزت و شرف کے مروجہ قانون کے خلاف نہ ہوں، اس طرح کے دباؤ سے اسلام کو فروغ ہی ملتا تھا۔ معاشی و معاشرتی مقاطعہ کچھ کم سزا ہے؟ خوردنی اشیاء کی کمی کے باعث بچے بلکتے رہتے تھے۔ ایک بڑے کو چمڑا ملا۔ اس نے دھو کر اور بھون کر کھایا یا درختوں کے پتے کھا کر گزارہ کرتے تھے۔ اشیاء کی خرید وفروخت ممنوع تھی۔ اگر خریدنے جاتے تو اتنے مہنگے دام بتائے جاتے کہ مسلمان خرید نہ سکتے تھے۔ مہنگی قیمت بتانے کا عندیہ ابو لہب نے دیا تھا۔ ساتھ یہ بھی کہا کہ اگر آپ کو اندیشہ ہو کہ اتنی قیمت پر کوئی اور نہ خریدے گا اور تمھیں خسارہ ہوگا تو یہ خسارہ میں پورا کر دوں گا۔ (سیرۃ النبویہ دحلان ۳۳۲) معاشرتی پابندی شادی بیاہ، صلح، نرمی و مہربانی اور مجلس میں آنے جانے پر تھی۔ یہ بائیکاٹ زندگی کو مفلوج کرنے کا کارگر حربہ تھا لیکن اس مقاطعہ میں آپؐ اور آپؐ کے ساتھی سرخ رو اور کامیاب ہوئے۔ قید اور نظر بندی کا رواج عرب میں قطعاً نہ تھا۔ ''واٹ'' کیسے کہہ دیتا ہے کہ عزت و شرف کے مروجہ قانون کے خلاف مظالم نہ ہوئے جب کہ عرب میں مقاطعہ کا رواج بھی نہ تھا۔ یہ بات تین میں نہ تیرہ میں۔ المختصر ''واٹ'' ان پہاڑ جیسی مصیبتوں اور اذیتوں کا اندازہ بہ خوبی لگا لیتا اگر وہ قرآن پاک کی سورہ عنکبوت، سورہ قصص، سورہ زمر اور سورہ النحل کا مطالعہ کرتا۔ حقیقت یوں ہے کہ

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

اگر اسے سچی اور غیر جانب دارانہ بات کہنا ہوتی تو یہ الزام کیوں لگاتا یا الزام لگا کے مصادر و مآخذ سے تحقیق و تفتیش کر لیتا اور اپنی بات اور رائے قائم کر لیتا لیکن ان کی طبع دم تولہ دم ماشہ میں سکون کہاں۔

اعتراض نمبر ۱۹۸

''سر ولیم میور'' یہ استدلال کرتے ہیں کہ واقعہ غرانیق ان دلائل کی روشنی میں صحیح ہے کہ مہاجرین جو نجاشی کی سلطنت میں آرام وسکون کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اگر ان کو محمدؐ اور کفار کے باہم مفاہمت کی اطلاع نہ ملتی تو وہ حبشہ سے قیام ترک کر کے اپنے عزیزوں میں رہنے کے لیے مکہ واپس نہ آتے' نہ حضرت محمد ﷺ اور قریش کی مصالحت ہی اس صورت کے بغیر ہو سکتی تھی۔ کیوں کہ حضرت محمدؐ کے مقابلہ میں قریش اس قدر طاقت ور تھے کہ ان کے دوست دار بھی ان کے ظلم وستم سے محفوظ نہ تھے اور قریش کو صلح کا یہ اچھا بہانہ ہاتھ آ گیا تھا۔ (حیات محمد ۱۹۳)

جواب: مسلمانوں کی حبشہ سے واپسی کے دو اسباب ہیں۔ یہ دونوں نہایت قوی ہیں پھر بھی حضرت عمرؓ کا اسلام لانا بہت بڑا سبب ہے۔ مہاجرین کی حبشہ سے واپسی سے کچھ عرصہ پہلے خلیفہ ثانی کے اسلام قبول کرنے کا واقعہ پیش آتا ہے۔ ان کی اسلام دشمنی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ ایک موقعہ پر وہ تلوار لیے داعی اسلام کا کام تمام کرنے نکل پڑتا ہے (نعوذ باللہ) اور یہ بھی سب جانتے ہیں کہ جب وہ اسلام قبول کرتے ہیں تو برملا اپنے اسلام قبول کرنے کا اعلان کرتے ہیں اور لمحہ بھر کے لیے اسلام قبول کرنے کو پوشیدہ نہیں رکھتے ہیں۔ مخالفین نے مخالفت کا بازار گرم کیا تو آپ نے بڑھ کر ان کا مقابلہ کیا حتیٰ کہ وہ کعبہ میں کھلم کھلا نماز ادا کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری میں خوف اور ڈر کا خیال تک نہیں رکھتے ہیں۔ دوسری اہم وجہ یہ کہ اگر مسلمانوں کو ایذائیں دینے کا سلسلہ جاری رہا تو خانہ جنگی کا دروازہ کھل جائے گا۔ پھر خدا جانے یہ سلسلہ کب رکے اور کن کن کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا۔ قریش یہ بھی جانتے تھے کہ ان قبائل اور خاندانوں میں سے کئی لوگ اسلام قبول کر چکے ہیں۔ اب ان میں سے کسی کا قتل ہوتا ہے تو متعلقہ قبائل ان کی حمایت میں نکل کھڑے ہوں گے۔ ایسے حالات میں ان کے پاس یہی چارہ تھا کہ وہ خود کوئی صلح کی راہ نکالیں۔ یہ حالات مہاجرین حبشہ کے لیے غور کا باعث ہوئے اور سوچا کہ اگر قریش درپے آزار نہیں ہیں تو کیوں نہ مکہ کو مراجعت کی جائے۔

اعتراض نمبر ۱۹۹

''واٹ'' کہتا ہے ''اس سلسلے میں ہمیں شیطانی آیت کی داستان کو مدنظر رکھنا چاہیے۔ اس قصہ کو بنیادی طور پر درست ہونا چاہیے کیوں کہ کوئی بھی مسلمان اسے محمد ﷺ کے بارے میں گھڑنے کی جسارت نہیں کرتا تھا اور بلاشبہ اس کی تصدیق قرآن میں موجود ہے۔ قصہ یہ ہے کہ غالباً ۶۱۵ء یعنی ہجرت سے سات سال پہلے ان کے پاس وحی آئی کہ یہ بڑی پہنچ والیاں ہیں (دیویاں) اور ان سے شفاعت کی امید کی جاسکتی ہے۔ محمدؐ نے فوراً اس وحی کو لوگوں تک پہنچایا اور ان کی عبادت کی اجازت نے مکہ کے باسیوں کو محمد کے ساتھ عبادت میں شریک ہونے پر مائل کر دیا۔ بعد میں بہ ہر حال محمد ﷺ کو یہ احساس ہوا کہ یہ آیات درست نہیں ہوسکتیں اور پھر ان پر آیتیں صحیح تسلسل میں نازل ہوئیں''۔ (مستشرقین کا انداز فکر ۲۸۹۔۲۸۸)

جواب: ''واٹ'' یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ کچھ عرصہ تک پیغمبر اسلام ﷺ اور ان کے پیرو ایک خدا کے ساتھ دوسری دیویوں کی عبادت میں کوئی مضائقہ تصور نہیں کرتے تھے۔ واٹ اس واقعہ کو مصالحت کی کوشش قرار دیتا ہے اور پھر اسی وقت اپنے دعویٰ کی تردید کرتا نظر آتا ہے گویا موافقین اور مخالفین کو ایک ہی تیر سے دو شکار کرنے کی خوب کاوش کرتا ہے۔ لکھتا ہے ''محمد ﷺ مکہ کے سرکردہ لوگوں کے ساتھ کسی مصالحت کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کا مدخولہ الفاظ کی غلطی کا احساس دراصل اس بات کا احساس تھا کہ

مصالحت ناممکن تھی‘‘۔کلائن نے اس واقعہ کو بت پرستی کا نام دیا۔کوئی اس واقعہ سے اخذ کرتا ہے کہ قرآن محمدؐ کی تصنیف ہے۔کوئی کہتا ہے کہ یہ موقع پرستی ہے وغیرہ وغیرہ۔

ہجرت حبشہ

ہجرت حبش کے بارے مستشرقین مغرب نے بہت اول فول بکا ہے کیونکہ وہ یہ تسلیم نہیں کرتے کہ مسلمانوں کو اتنی ایذادی جاتی تھی کہ وہ وطن کو خیر باد کہہ کے دوسرے ملک کی راہ لیتے ہیں۔بعض لوگ یہ راگ الاپتے ہیں کہ حضور ﷺ نے مسلمانوں کو ترک وطن کی ترغیب اس لیے دی تھی کہ مسلمانوں نے ارتداد کا فتنہ سر پر اٹھا رکھا تھا۔کئی ایک کا خیال ہے کہ حضور ﷺ کا مقصد یہ تھا یہ کہ مسلمان وہاں تجارت میں لگ جائیں گے اور ان کی تجارت کو فروغ ہوا تو کفار کی اقتصادی حالت زبوں حالی کا شکار ہو جائے گی اور مسلمانوں پر ان کا دباؤ کم ہو جائے گا۔کچھ کا خیال ہے کہ مسلمان شاہ نجاشی سے فوجی امداد مانگنے کی غرض سے گئے تھے اس کے ساتھ یہ غرض بھی تھی کہ اگر وہ وہاں رک گئے اور آسودگی ملی تو سلطنت روم کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم کر کے مستحکم کریں گے پھر کچھ دنوں کی بات ہوگی کہ قریش سے انتقام لے سکیں گے مگر واٹ کی منطق نرالی ہے اس کی بیان کردہ وجہ بوالعجبی میں سے بڑھ کر ہے۔وہ کہتا ہے کہ چونکہ مسلمان دو فرقوں میں بٹ گئے تھے ان میں اختلاف رائے پایا جاتا تھا اس لیے آپ ﷺ نے کچھ لوگوں کو حبشہ بھیج دیا تا کہ کوئی دنگا فساد اور جھگڑا کر کے اٹھ کھڑے ہونے کی نوعبت پیش آئے۔اسلام میں داخل ہونے والوں کی تعداد میں روز بہ روز اضافہ ہونے کے پیش نظر قریش کا ان پر جور وظلم اور تشدد و زیادتی میں بہ تدریج اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔مسلمان کہیں بھی ملتے، درندوں کی طرح ان پر لپک پڑتے اور قرار واقعی سزا دیتے۔عربوں میں معاہدہ کی قدر و منزلت تھی جو جان و مال کی ضمانت تھا۔ان معاہدوں سے قدرے معاشرے میں نظم رہتا تھا۔سیدنا ابوبکرؓ، عبدالرحمٰنؓ بن عوف اور سعد بن ابی وقاصؓ اور ان کے علاوہ کئی صحابہ کرام نے خود اپنے تئیں مختلف قبائل سے معاہدے کیے ہوئے تھے۔آپؐ کا معاہدہ نہ تھا۔ اگرچہ ابوطالب کے کئی دوسرے قبائل سے معاہدے تھے۔بنو ہاشم کے سردار ہونے کے سبب ان کی ایک حیثیت تھی۔ابوطالب کی وجہ سے متعلقہ قبائل بھی آپؐ کی حفاظت کے ذمہ دار تھے۔مگر اسلام میں داخل ہونے والوں کی اکثریت وہ تھی جس کے کسی سے خود معاہدے نہیں تھے۔یہ سربراہوں کے تابع تھے۔سربراہوں کے معاہدوں کی بنیاد پر غیر قبائل کے لوگ ان پر ظلم وستم نہیں کر سکتے تھے۔خود قبیلہ کے لوگوں کی مخالفت ہی ان کے لیے تکلیف دہ اور اذیت ناک تھی۔قبیلہ کے لوگوں کی اذیتوں سے مستثنیٰ نہ تھے۔لوگ مسلمان تو ہوئے مگر انھیں وہ رعائتیں اور مقاصد حاصل نہ تھے جن کے لیے انھوں نے اسلام قبول کیا تھا۔عبادت نہیں کر پاتے تھے۔کھلے بندوں قرآن کریم کی تلاوت نہیں کر سکتے تھے۔حد تو یہ کہ

اپنے اسلام قبول کرنے کا اظہار تک نہیں کر سکتے تھے۔ان حالات کے پیش نظر آپ ﷺ نے ستم رسیدہ لوگوں کو ہجرت کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔فرمایا ''تم اللہ کی زمین پر کہیں چلے جاؤ۔یقیناً اللہ تعالیٰ تم سب کو عنقریب جمع کرے گا۔ان مظلوموں نے پوچھا کہ کہاں جائیں؟ آپؐ نے حبشہ کے ملک کی طرف اشارہ کیا۔آپؐ نے فرمایا'' وہ راستی کی زمین ہے۔وہاں کا حکمران ایسا ہے جس کی قلم رو میں کوئی کسی پر ظلم نہیں کر سکتا''۔لہٰذا گیارہ یا بارہ مرد اور چار یا پانچ عورتیں رات کی تاریکی میں چھپتے چھپاتے سوار یا پیدل مکہ مکرمہ سے روانہ ہوئے۔ہجرت حبشہ ثانی میں تراسی مرد اور اٹھارہ عورتیں تھیں۔

کرمِ **خداوندی:** یہ حسن اتفاق نہ تھا کہ مہاجرین یکے بعد دیگرے شیبہ کی بندرگاہ پر پہنچے۔اس وقت سامان سے لدے جہاز بالکل تیار کھڑے تھے جنھیں حبشہ جانا تھا۔یہ کرم خداوندی تھا کہ ان جہازوں میں انھیں جگہ مل گئی اور حبشہ کو چل دیئے۔اگر جہاز روانہ ہو جاتے اور قریش پیچھا کرتے اور ان مسلمانوں پر آ پہنچتے تو کچھ اور ہی منظر ہو سکتا تھا۔جہاز سامان سے بھرے تھے۔آن کی آن میں روانہ ہونے والے تھے۔اس وجہ سے جہاز والوں نے نہایت سستے کرایہ یعنی تمام کو پانچ درہم میں سوار کر لیا۔بے بس و بے کس لوگوں کی مشکل کشائی کرنے والے کا کرم ہے کہ وہ بہ خیریت حبشہ پہنچ گئے۔

اعتراض نمبر ۲۰۰

مورخین کا خیال ہے کہ ہجرت کرنے والے وہ لوگ تھے جن کا حامی و مددگار نہ تھا۔(سیرت النبی۔۱۴۸)

جواب: ہجرت حبشہ اول میں گیارہ مرد اور چار عورتیں تھیں۔ان کے نام درج ذیل ہیں۔

۱: حضرت عثمان بن عفانؓ مع اپنی زوجہ محترمہ (قریش کے مقتدر اموی خاندان سے تھے۔بہت مال دار تھے اسی لیے غنی کہلائے)

۲: حضرت ابوحذیفہ بن عتبہؓ مع اپنی زوجہ (اس کا باپ عتبہ قریش کا مشہور سردار تھا۔اسلام کا کڑا دشمن تھا)

۳: حضرت زبیر بن العوامؓ (رسول اللہ کے پھوپھی زاد تھے)

۴: حضرت معصب بن عمیرؓ ہاشم کے پوتے قریشی جوان تھے۔ناز و نعم میں پلے بڑھے تھے۔

۵: حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ قبیلہ زہرہ سے تھے۔یہ آپؐ کے ننھیالی رشتہ دار تھے۔

۶: حضرت ابوسلمہ بن عبدالاسدؓ مخزومی مع اپنی زوجہ سلمٰی

۷: حضرت عثمان بن مظعونؓ جمحی۔

۸: حضرت عامر بن ربیعہؓ مع اپنی زوجہ محترمہ۔سابقین اولین میں سے ہیں۔حضرت عثمان غنیؓ نے سفر حج میں ان کو مدینہ کا گورنر بنایا تھا۔

۹: حضرت سہیل بن بیضاءؓ (انھوں نے بدر میں شرکت کی)
۱۰: حضرت ابو برہ بن ابی رہمؓ یا ابو حاطب' یہ آپ کی پھوپھی کے بیٹے تھے۔ یہ سابقین فی الاسلام ہیں۔
۱۱: عبداللہ بن مسعودؓ مجتہدین صحابہ میں سے ہیں۔

پھولوں کے گل دستہ کو قسم قسم اور رنگارنگ پھولوں سے بنایا جاتا ہے۔ ہجرت حبشہ اول کا گروہ بھی گل دستہ کی مانند ہے۔ کیوں کہ مہاجرین کے اس گل دستہ میں امیر، غریب، آزاد، غلام اور مرد و زن شامل تھے۔ مذکور فہرست سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ سارے لوگ معمولی نہ تھے۔ قریش کے جور وستم اور ظلم وتشدد کا نشانہ سبھی لوگ تھے۔ کوئی فرق روا نہیں رکھا جاتا تھا۔ ہر وہ شخص ان کا دشمن تھا اور ان کے ظلم کا تختہ مشق بنا ہوا تھا جو اسلام کو قبول کر چکا تھا یا کرنے والا تھا۔

دوم: قریش کے مظالم سے تنگ آ کر اور بالخصوص اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی آزادی نہ ہونے کے سبب ہجرت کی راہ اختیار کی۔ عبد اللہ بن مسعودؓ کو سورہ رحمٰن پڑھنے پر زد و کوب کیا گیا۔ حضرت صدیقؓ کو اونچی آواز سے قرآن پڑھنے کی اجازت نہ تھی۔ حال آں کہ مسلمانوں کا دین اسلام ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔

سوم: مہاجرین کوئی معمولی لوگ نہ تھے۔ بہ جز ایک دو کے قریش کے مقتدر خاندانوں سے تھے۔ ان کے رشتہ دار اور عزیز و اقارب مکہ میں موجود تھے۔ یہ سب حمایتی ہونے کے باوجود حمایتی نہیں لگ رہے تھے۔ اگر حامی تھے اور ان کی مدد پر آمادہ تھے تو یہ حمایت ان کی مشروط تھی کہ وہ نئے دین کو چھوڑ دیں اور اپنے آباؤ اجداد کے مذہب کی طرف پلٹ آئیں۔ گویا مہاجرین نئے دین کو خیر باد کہہ دیں تو رشتہ داریاں اور حمائتیں برقرار۔ رشتہ دار اور رشتہ داروں کے تعلقات والے سارے قبائل مددگاری کے لیے تیار۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حمایتی تو تھے لیکن ان کی حمایت سے اس لیے محروم تھے کہ وہ چاہتے تھے کہ یہ ہمارے مذہب کو دوبارہ اپنا لیں اور قبول کرنے والے نو وارد لوگ اسلام قبول کرنے سے رک جائیں۔ پھر ان کی حمایت و مدد کے دروازے ان کے لیے ہمیشہ کے لیے کھلے ہیں۔ اگر اسلام سے دست بردار ہوں تو پھر یہ اذیتیں، تکلیفیں دربدری اور دیس نکالا کے مصائب و آلام اور لڑائی بھڑائی نہیں تھی۔ کیوں کہ لڑائی اور فساد کی جڑ ان کے خیال میں دین اسلام تھا جس کا پرچار جاری تھا اور لوگ آئے دن جوق در جوق اسلام قبول کرتے جا رہے تھے۔ یہ روز افزوں تعداد قریش کے لیے باعث تشویش اور خطرے کی گھنٹی تھی۔

اعتراض نمبر ۲۰۱

مہاجرین کی فہرست میں حضرت بلالؓ اور عمار یاسرؓ کے نام نہیں ہیں۔ انھیں اسلام کا وفادار، جان نثار سمجھا جاتا ہے۔ کیوں کر ہجرت نہیں کرتے؟

جواب: اولاً تو ان باوفا جانثاران توحید کے ایمان پر شک کرنے کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ ان پر توحیدی رنگ اس قدر چڑھا تھا کہ پہاڑوں جیسی مصیبتیں ٹوٹیں مگر ان کے نشہ دینی کو ہرا نہ سکیں۔ حضرت بلالؓ کو دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں تپتی ریت پر لٹا دیتے اور گرما گرم پتھر کی چٹان چھاتی پر رکھ دیتے۔ مگر ان کا نعرہ احد، احد ہی ان کی زبان پر جاری وساری رہتا۔ اس نعرہ جاں فزا سے تمام دکھ اور درد وغم دور ہو جاتے، مصائب و آلام کافور ہو جاتے تھے۔ حضرت عمارؓ کو اس قدر مارا جاتا کہ وہ بے ہوش ہو جاتے۔ ان کی والدہ حضرت سُمیہ کو ابوجہل نے اندام نہانی میں نیزہ مار کر شہید کر ڈالا۔ راہِ حق میں یہ پہلی شہادت تھی۔ ان کے والد ماجد بھی کفار کی اذیتوں سے دار الفنا سے دار البقا سفر کر گئے۔ لیکن لاکھ ظلم وستم، تشدد وزیادتی کے باوجود ان لوگوں کے پائے استقلال میں ذرا بھر لغزش نہ آئی۔ البتہ توحید کے نشہ میں اس قدر سرشار تھے کہ کفار کی بے رحمی اور سفا کی ان کی دینی وارفتگی اور نشہ کو اتار نہ سکیں۔ (یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے) دشواریاں آسانیوں میں بدل چکی تھیں۔ یہ لوگ تکلیفیں سہتے سہتے دکھ درد اور غم والم کے عادی وخوگر بن چکے تھے اور ہر رنج وتکلیف کا غم جاتا رہا تھا۔ بہ قول غالبؔ

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پہ کہ آساں ہو گئیں

وہ ڈرنے اور بھاگنے والے نہ تھے۔ ایک نصرانی مورخ نے کیا سچ کہا ''عیسائی اس کو یاد رکھیں تو اچھا ہو کہ محمد ﷺ کے خصائل نے وہ درجہ نشہ دینی کا آپ کے پیرووں میں پیدا کیا جس کو عیسیٰؑ کے ابتدائی پیروکاروں میں تلاش کرنا بے فائدہ ہے۔ جب حضرت عیسیٰؑ کو سولی پر لے گئے تو ان کے پیروکار بھاگ گئے۔ ان کا نشہ دینی جاتا رہا اور اپنے مقتدا کو موت کے پنجہ میں گرفتار چھوڑ کر چل دیئے۔ برعکس اس کے محمد ﷺ کے پیرو اپنے مظلوم پیغمبر کے گرد آئے اور آپ ﷺ کے بچاؤ میں اپنی جانیں خطرہ میں ڈال کر کل دشمنوں پر آپ کو غالب کیا''۔ (سیرت النبی ۱۴۹) ''ولیم میور'' بھی اس امر کی مثبت انداز میں تائید کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے ''خطرے کی بھنک پڑتے ہی حواری بھاگ کھڑے ہوئے''۔ (روح اسلام۔۱۰۰)

کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ دیگر صحابہ میں نشہ دینی کم تھا۔ نہیں نہیں وہ بھی دین کی پیروی میں وارفتہ و سرشار تھے مگر ان غلاموں کا مسئلہ یہ تھا کہ یہ اپنے آقاؤں کے رحم وکرم پر تھے۔ ایسے میں ہجرت کرنا ممکن نہ تھا۔ حضرت بلالؓ جب آزاد ہوئے تو ہجرت کے اعزاز سے سرفراز ہوئے۔

ارشاد ربانی ہے '' قُل اِن کَانَ اٰبَآئُوکُم ۔۔۔۔۔ وَاللّٰہُ لَا یَھدِی القَومَ الفٰسِقِینَ (سورۃ التوبہ۔۲۴) (ترجمہ) اے نبی فرما دیں کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز واقارب، وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور تمہارے وہ کاروبار جن کے

ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں، تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس راہ جدو جہد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے اور اللہ فاسق لوگوں کی راہنمائی نہیں کرتا۔)

دوم: یہ لوگ غلام تھے۔ بے سروسامان تھے۔ بے سروسامانی کا یہ عالم کہ زادِ سفر میسر نہ تھا۔ غلامی کی زنجیروں میں جکڑے تھے۔ رہائی پاتے تو ہجرت کرتے۔ ان حالات میں اس وقت ان کا ہجرت کرنا ممکن نہ تھا۔ اس لیے ان حضرات کا نام ہجرت حبشہ کرنے والوں کی فہرست میں درج نہیں ہے۔

سوم: اسلام نے ان میں ایمان داری، امانت داری اور سچائی کے وہ اوصاف کوٹ کوٹ کر بھر دیئے تھے جن پر ایسا رنگ چڑھا اور اپنے عمل سے صحیح ثابت کر دکھایا۔ وہ یوں کہ ان غلاموں نے چھپ چھپ کر بھاگنے کی کوشش نہیں کی۔ بل کہ یہ بھاگنے والے نہیں تھے۔ اپنے آقاؤں کے کام کاج کو بہ دستور ایمان داری سے کرتے رہے، تکلیفیں سہتے رہے اور اپنے دین سے وابستہ رہے۔

اعتراض نمبر ۲۰۲

جب محمد ﷺ نے دیکھا کہ قریش سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے اور یہ پہلے سنا تھا کہ کعبہ کو گرانے ابرہہ الاشرم جو آیا تھا وہ حبش ہی کا تھا اس لیے انھوں نے چاہا کہ بادشاہ حبش سے سازش کر کے اس کو مکہ مکرمہ پر حملہ کرنے کی ترغیب دیں تا کہ قریش کا زور ٹوٹ جائے۔ اسی غرض سے ہجرت کا بہانہ کر کے اپنے اصحاب کو حبش بھیجا، لیکن پھر سمجھے کہ نجاشی اگر مکہ میں آیا تو خود مکہ پر قابض ہو جائے گا، مجھ کو کیا ہاتھ آئے گا۔ اس بنا پر اس ارادے سے باز رہے"۔ (مارگولیس۔ سیرت النبی ۱۵۰۔ ضیا النبی ۲/۳۷۷)

جواب: نبی مکرم ﷺ نے اپنے پیروؤں کو ایذا رسانی کے سبب ملک حبشہ ہجرت کر جانے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ ہجرت حبش کے اسباب سے مستشرقین کو چشم پوشی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ کبھی تو غیر جانب دار مورخ کی حیثیت سے تاریخی حقائق کو مان لینا چاہیے۔ چلو خیر! اب بات یہ ہے کہ قریش کے دل میں یہ کھٹکا تھا کہ مسلمان حبش میں اپنی تعداد بڑھا لیں گے۔ وہاں کے باشندے ان کے دین کی طرف راغب ہوں گے۔ مکہ کے لوگوں کی طرح اسلام کے ہیرو بن جائیں گے۔ حبش میں رہ کر وہ اس قدر طاقت بڑھا لیں گے کہ واپس آ کر حبشہ کے لوگوں کی حمایت سے ہمارے مقابل صف آرا ہو جائیں گے۔ یہ ڈر اور خوف بذاتِ خود قریش کو تھا نہ کہ مسلمانوں کو اور نہ ہی مسلمان اس بات سے خائف تھے کہ حبشہ کے بادشاہ نے حملہ کیا تو مکہ ان کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ یہ تو تب ہوتا اگر ان کی نیت ایسی ہوتی۔ جب کہ ایسی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ تو شاہ حبشہ کو مکہ پر چڑھ دوڑنے کی دعوت ترغیب دینے کا کیا مطلب؟ کیا حملہ کروانے کے لیے سفارشی نمائندے مرد و زن بادشاہوں کے ہاں بھیجے جاتے

ہیں۔اس وفد میں عورتیں بھی ہیں اور انھیں کہا تاوقتیکہ مکہ کی فضا اور ماحول خوش گوار نہیں ہو پاتا وہ واپس نہیں لوٹیں گے مرد وزن کا حکم بارگاہ نبوی سے ملتا ہے۔مگر سفارشی نمائندگان واپس آجاتے ہیں اور انھیں وہاں اس وقت تک رہنے کی ہدایت نہیں کی جاتی کہ ماحول اچھا ہو تو لوٹ آئیں۔قریش نے مسلمانوں کو کہیں بھی سکھ کا سانس لینے نہ دیا۔قریش نے اپنا وفد نجاشی کی خدمت میں بھیجا تاکہ مسلمانوں کو حبش سے بھی نکال دیا جائے یا ان کے سپرد کردیا جائے۔نجاشی کا دربار لگتا ہے۔مسلمانوں کو بلایا جاتا ہے۔مسلمانوں کی قیادت حضرت جعفرؓ کرتے ہیں۔نجاشی کی حمایت و ہمدردی حاصل کرنے کے لیے عورتیں بھی جاتیں مگر ایک عورت بھی دربار میں نہیں جاتی۔مرد وزن کا ہجرتی قافلہ جو قریش کے مظالم سے تنگ آکر حبش چلا آیا تھا۔اس سے کیسے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ نجاشی کو مکہ پر چڑھ دوڑنے کی خواستگاری کے لیے آیا تھا؟ ایسا سمجھنا نادانی ہے۔اول و آخر ہجرت کی وجہ قریش کا ظلم تھا جس کی گواہی قرآن کریم دیتا ہے۔"وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا"۔ (سورۃ النسا،۷۵)(ترجمہ)اور کم زور مرد، عورتیں اور بچے جو یہ کہتے ہیں کہ اے خدا! ہم کو اس شہر سے نکال کہ یہاں کے لوگ ظالم ہیں"۔

مظلوم مسلمانوں کو قریش کے ظلم و ستم اور جبر و تشدد سے بچانے کے لیے کسی باہر کے ملک میں پناہ لینے کی اجازت بارگاہ نبوی سے ملتی ہے۔صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ! دنیا میں کون سا ملک ہم کو امان دے سکتا ہے۔آپؐ نے فرمایا"حبشہ کی مسیحی سلطنت میں تمھیں آرام مل سکتا ہے۔اس ریاست میں کسی پر ظلم نہیں ہوتا۔وہ سچائی کی سرزمین ہے جب تک یہاں کے حالات خوش گوار نہیں ہو جاتے تم تب تک ہجرت کر کے وہاں چلے جاؤ۔یہ ہجرت کرنے کی اجازت صرف اور صرف قریش کی ایذا رسانیوں اور اسلامی تعلیمات کی اچھی طرح بجا آوری کے نہ ہونے کے سبب تھی۔حبش میں ظلم و جبر سے چھٹکارا بھی مل رہا تھا نیز لگتے ہاتھ اپنی دینی تعلیمات کی انجام دہی کا موقعہ بھی میسر آرہا تھا۔

حضرت جعفرؓ نے نجاشی کے دربار میں اُس کے جواب میں تقریر فرمائی۔کہا کہ اس (محمد ﷺ) نے ہم کو دوسروں کی حفاظت کرنے، صلہ رحمی کرنے اور نرمی سے پیش آنے کا حکم دیا۔مال یتیم پر تعرض ناجائز قرار دیا۔ایک خدا کی عبادت، قیام صلوۃ کی ہدایت فرمائی۔اس (محمد ﷺ) نے ہمیں اپنے مال سے زکوۃ ادا کرنے کا حکم دیا۔ماہ رمضان کے روزے رکھنے کی تاکید کی۔ہم نے اس کے حکم کو عمل کا حصہ بنالیا۔ان لوگوں (قریش) نے ہمیں وحشیانہ سزائیں دیں۔صرف اس لیے کہ ہم ایک خدا کو ماننا چھوڑ دیں اور پھر سے بے حیائی اور فحاشی کو اپنا شعار بنائیں۔ان کا ہر ستم سہا اور نبی مکرم کا ساتھ نہ چھوڑا۔اس وجہ سے انھوں نے ہمارا پیچھا نہ چھوڑا۔آخر تنگ آکر ہجرت کے سوا کوئی راستہ نہ تھا، ہم نے آس پاس کے

ملکوں کے بارے سوچا۔آپ کے سوا دوسرا انصاف پسند بادشاہ ہماری نگاہوں میں نہ جچا۔یہ وہ حالات ہیں جس کی بناء پر ہجرت حبشہ اولی وثانی وقوع پذیر ہوئیں۔یہ کوئی بہانہ نہ تھا۔نہ وہاں کے بادشاہ کو مکہ پر حملہ کرنے کی سازش تھی اور نہ ہی اپنے ملک کا اپنے ہاتھوں سے نکل جانے کا خوف اور ڈر تھا۔یہ بھی یاد رہے کہ آنحضرتؐ کے جدامجد حضرت ابراھیمؑ کے تعمیر کردہ کعبہ جس کی حفاظت کے لیے آپؐ کے دادا عبد المطلب نے ابرہہ کے خانہ کعبہ پر حملہ کے وقت دعا مانگی تھی کہ اے اللہ اپنے گھر کی حفاظت فرما۔بھلا اب کیوں اس کو تاخت وتاراج کرنے کے درپے ہوکر نجاشی کو مکہ پر چڑھ دوڑنے کی دعوت دیں گے۔جس کعبہ سے بتوں کو باہر نکال کے بتوں کی آلودگیوں اور آلائیشوں سے پاک کیا تھا' اب انھیں صلیب لٹکانے اور بتوں کو ٹھہرانے کی اجازت دی جائے گی۔کعبہ کو پھر سے مورتیوں سے سجانے کی تدبیر سوچی جارہی ہے یا کعبہ کو پیوند خاک کرنے کی مذموم کارروائی کی جارہی ہے۔اس (محمد ﷺ) ذات سے ایسی توقع رکھنا ناممکن ہے کہ اسے اپنے آباؤاجداد کے معبد کی پروانہ ہو اور نہ ہی اپنی قوم کی تباہی کا فکر ہو۔یہ مستشرقین کی بھول ہے۔کیا یہ جانتے ہیں کہ وہ مکہ میں قحط کے دنوں مدینہ سے اشیاءِ ضرورت کی چیزوں کے لدے اونٹ بھیج دیتا ہے۔کیا کفار اس وقت آپؐ کے جانی دشمن نہ تھے؟ یہ بھی یادرہے کہ ابرہہ کے لشکر کے ساتھ جو کچھ ہوا،سب جانتے ہیں۔اب کسی مائی کے لال میں دم خم نہیں کہ مکہ پر چڑھ دوڑے کیوں کہ ابرہہ اور ابرہہ کے لشکر کی تباہی دوسروں کے لیے نشان عبرت بن چکی تھی۔اب آسانی سے کسی کے کہنے پر بھی مکہ کی طرف چڑھ دوڑنے کا خیال ناممکن اور محال تھا۔علامہ شبلی نعمانی اس الزام پر رائے زنی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''یہ بالکل بے ثبوت بات ہے''۔

جب حضور ﷺ بغرض تجارت مکہ مکرمہ سے نکلے۔آپ ﷺ نے الحزورہ کے مقام پر بیت اللہ کی طرف دیکھا،فرمایا: بخدا تو مجھے رب تعالیٰ کی ساری زمین سے پیارا ہے تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی اس کی ساری زمین سے پیارا ہے اگر تیرے باسی مجھے یہاں سے نہ نکالتے تو میں کبھی نہ نکلتا۔حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ''تو کتنا پاکیزہ شہر ہے،تو مجھے کتنا محبوب ہے اگر میری قوم مجھے تجھ سے نہ نکالتی تو میں تجھے چھوڑ کر کہیں اور سکونت اختیار نہ کرتا''۔وہ مکہ جس سے محبت کا اظہار ہے بھلا آپ ﷺ اسے کسی کے سپرد کرنے کا سوچ سکتے ہیں،کبھی نہیں!ہرگز نہیں! بلکہ قریش نے آپ ﷺ کو ہجرت کر جانے پر آمادہ کیا اگر کسی کو قابض کرنا مقصود ہوتا تو مکہ سے ہجرت کر جانے کے بعد کیوں نہ نجاشی کو مکہ پر حملہ کرنے کی دعوت دی جبکہ اس وقت میدان صاف تھا۔

ایک شبہ کا ازالہ

کوئی کہے کہ آپؐ نے ملک حبش کو ہجرت کرنے کی اجازت فرمائی اور باقی ملکوں کی طرف

اجازت نہ دی۔ کیوں؟ ۲۔ مسلمانوں نے ہجرت کے لیے ملک حبشہ کو کیوں پسند کیا؟

جواب: ان دنوں آمدورفت کے ذرائع محدود تھے۔ دور دراز کے ملکوں کا سفر کرنا مشکل تھا۔ راستے غیر محفوظ تھے۔ اسی طرح خبر رسانی کے ذرائع بھی محدود تھے۔ دنوں کی خبریں ہفتوں اور ہفتوں کی مہینوں میں پہنچ پاتی تھیں۔ ان حقائق کے باوجود پھر بھی ممالک سے رابطہ رہتا تھا۔ عربوں کا پیشہ تجارت تھا۔ دور نزدیک کے ملکوں میں بہ غرض تجارت جایا کرتے تھے۔ آپؐ کے خاندان کا پیشہ بھی تجارت تھا۔ آپؐ کے آباؤ اجداد کے قیصر وغسان اور نجاشی کے ساتھ تجارتی معاہدے تھے۔ تجارت ایک مضبوط ذریعہ ہے جس سے دیگر ممالک کے معاشی، سماجی سیاسی، اخلاقی اور مذہبی حالات کا پتہ چلتا ہے۔ بدیں سبب آپؐ کی نظر میں دیگر ممالک کے حالات تھے۔ نیز دیگر ملکوں کی نسبت ملک حبش کے حالات خوش گوار تھے جہاں کسی پر ظلم نہ ہوتا تھا عدل وانصاف کی گنگا بہہ رہی تھی۔ اسے ترجیح دی گئی۔

دوم: ملک حبش دیگر ممالک کی نسبت نزدیک تھا۔ سفر کی تکلیفیں کم اٹھانا پڑتی تھیں۔ کرایہ کا بوجھ بھی زیادہ نہ تھا۔ فی کس ایک درہم جہاز والے شیبہ کی بندرگاہ سے حبشہ تک لیتے تھے۔

اعتراض نمبر ۲۰۳

اعتراض کا دوسرا جز کہ مسلمانوں نے ہجرت کے لیے ملک حبش کو کیوں پسند کیا، کا جائزہ لیتے ہیں۔

جواب: یہ ذہن نشین رہے کہ مسلمانوں نے ملک حبش کو پسند نہیں کیا تھا بلکہ یہ ان کے محبوب آقا کریم ﷺ کی پسند تھی۔ بدیں سبب مسلمانوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی نیز اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ قریش کا ظلم حد سے بڑھا اور ان کے جبر و تشدد کی انتہا ہوگئی۔ جان نثاران اسلام کے لیے مکہ کی سرزمین تنگ ہوگئی۔ رہنا محال ہوگیا۔ اس وقت بارگاہ الٰہی سے ایک مژدہ جان فزا نظر آتا ہے۔ ''ان کے لیے جنھوں نے نیک اعمال کیے اس دنیا میں نیک صلہ ہے اور اللہ کی زمین بڑی وسیع ہے۔

جرات ہو نمو کی تو فضا تنگ نہیں ہے
اے مردِ خدا ملکِ خدا تنگ نہیں ہے

صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا۔ اگر اہل مکہ عبادت سے روکتے ہیں تو کاہے کی فکرمندی۔ اللہ کی زمین وسیع ہے ایسی جگہ کا انتخاب کریں جہاں آزادی سے اپنے فرائض عبادات بجا لاسکتے ہیں۔ حبش کی سرزمین اس بجا آوری کے لیے نہایت موزوں مناسب تھی۔

دوم: آپ ﷺ کے جد امجد خواجہ ہاشم نے قیصر روم سے اپنے تجارتی قافلوں کے لیے اجازت نامہ لے رکھا تھا کہ اس کی مملکت میں تجارت آزادی سے کرسکیں۔ کوئی بلاوجہ روک ٹوک نہ ہو۔ یہی نہیں بل کہ آپؐ نے قیصر روم سے نجاشی والئی حبشہ کے نام بھی ایک خط لکھوایا کہ مکہ کے تاجروں کو حبشہ میں کاروبار

کرنے کی کھلی اجازت دے۔ گویا کئی پشتوں سے عربوں کے تعلق اہل حبشہ سے تھے ان علاقوں اور وہاں کے باسیوں سے خوب واقف و آشنا تھے۔ کوئی منچلا یہ کہہ دے کہ اس طرح کے تعلقات تو قیصر روم سے بھی تھے وہاں کیوں نہ گئے؟ ایک تو یہ کہ ملک حبش دور نہیں تھا۔ آنا جانا بھی آسان تھا اور وہاں جانے کے لیے خرچ بھی زیادہ نہیں اٹھتا تھا۔ کرایہ کا بوجھ کم پڑتا تھا، صرف نصف دینار فی کس یا ایک روایت میں چار دینار فی کس تھا۔ یہ کرایہ سمندر پار کا تھا۔ ان سہولیات کے پیش نظر حبشہ کو ہجرت کرنا مناسب گردانا گیا اور خاص طور پر وہاں کسی پر ظلم بے جا نہ ہوتا تھا۔

دوسرا یہ کہ وہاں کا حکمران اصحمہ بڑا عادل تھا۔ اس کی تصدیق خود مکرم و محترم نبی ﷺ نے فرمائی۔ جب صحابہ کو حبشہ جانے کی اجازت مرحمت فرمائی تو آپؐ نے فرمایا ''وہاں ایک ایسا بادشاہ ہے جس کے سامنے کسی پر ظلم نہیں کیا جا سکتا، تم وہاں رہو گے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ان مشکلات کو جن میں تم اب مبتلا ہو آسان فرما دے (ضیاالنبی۔ ۲/۳۷۸)

تیسرا یہ کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی عالمی حالات پر گہری نگاہ تھی۔ بایں سبب مسلمانوں کو حبشہ ہجرت کرنے کی ہدایت فرمائی۔ آپؐ کا دوسرے ممالک کی نسبت حبشہ کو ترجیح دینے کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ دوسرے ملکوں کے حالات سے بھی بخوبی واقف تھے اور حبشہ کے حالات دیگر ممالک کی نسبت انتہائی سازگار پائے گئے جبھی وہاں جانے کی اجازت عطا کی۔

واٹ کی نظر میں ہجرت حبشہ:

''واٹ''، ہجرت حبشہ کو جس انداز سے موضوع بحث بناتا ہے۔ اس پر مسلمان محققین کو بجا طور پر شدید تحفظات ہیں۔ پروفیسر محمد اکرم طاہر (محمد رسول اللہ۔ ۳۶۹) پروفیسر ظفر علی قریشی کی کتاب "prophet Muhammad and his western critics" جس میں انھوں نے واٹ کے نظریہ کو عجیب و غریب اور دور از کار قرار دے کر اس کی بنیادی نقائص کی خوب نشان دہی کی ہے، کے حوالے سے کہتے ہیں کہ ان کے بیان کے مطابق:۔

مہاجرین حبشہ کے پہلے گروہ کی قیادت کے بارے میں ابن ہشام کے ہاں کسی گم نام عالم کے حوالے سے حضرت عثمان بن مظعونؓ کے بارے میں معمولی اشارہ ملتا ہے۔ مسلمانوں کی تاریخی روایت میں کسی مجہول راوی کی کوئی اہمیت نہیں۔ کوئی دوسری قابل ذکر روایت میں بھی عثمانؓ کی قیادت کا ذکر نہیں ملتا۔ یہ بات ثابت شدہ ہے کہ جب مہاجرین حبشہ کو نجاشی کے دربار میں بلایا گیا تو مسلمانوں کی طرف سے عثمان بن مظعونؓ نے نہیں، حضرت جعفر طیارؓ نے نمائندگی کی تھی۔

۲: یہ بات قرین قیاس نہیں کہ اسلام کے بالکل ابتدائی دور میں بنیادی اختلافات بہت شدید ہو

گئے تھے یا ان اختلافات کے حل کی واحد صورت یہ تھی کہ ایک گروہ کو ملک سے باہر بھیج دیا جائے۔ خصوصاً اس حالت میں کہ مسلمانوں کی جمعیت پہلے ہی کل چالیس نفوس قدسیہ سے زیادہ نہ تھی۔ یہ بات بھی ناقابل تصور ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے بنیادی اختلافات کے بعد ان اختلافات کو اپنے منطقی انجام تک پہنچائے بغیر حضرت عثمانؓ نے حبشہ کی راہ لی ہو۔

۳: ''واٹ'' نے حضرت عثمانؓ کے خصوصی مزاج پر ایک بہت بڑی لیکن بہت کم زور عمارت کھڑی کی ہے۔ اس کا کہنا کہ حضرت عثمانؓ ایام جاہلیت میں بھی فسق و فجور، شراب وغیرہ سے کنارہ کش تھے۔ یہی بات حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں ریکارڈ پر ہے کہ وہ عہد جاہلیت میں بھی رائج الوقت ثقافتی عیاشیوں کے قریب نہیں بھٹکتے تھے۔ اسلام لانے کے بعد ان کا کردار اور زیادہ قابل رشک ہو گیا۔ دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ جب کبھی حضرت عثمانؓ پر ترک دنیا کا غلبہ ہوتا تو حضور ﷺ کی بر وقت ہدایت کے بعد وہ اپنے رویے پر نظر ثانی کر لیتے۔

۴: فاضل مصنف اس بات سے پوری طرح آگاہ نہیں ہے کہ اسلام نام ہے احکام الٰہی اور فرمودات رسولؐ کے مجموعے کا۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عثمان بن مظعونؓ جیسی بلند مرتبت شخصیات بھی اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھیں کہ اسلام میں کبھی اپنے ذاتی نظریے بالخصوص مزاج کو داخل کرنے کا استحقاق حاصل نہیں ہے۔ اسلام عیسائیت نہیں ہے جس میں کسی وقت کوئی سینٹ پال اٹھے اور اپنے ذاتی نظریات اور مزعومات کو مذہب میں داخل کر کے اس مذہب کا بانی ثانی قرار پائے۔

اعتراض نمبر ۲۰۴

''واٹ'' کہتا ہے کہ حبشہ کو مسلمانوں کی ہجرت اور ایک زمانہ تک قیام کے پانچ اسباب ہو سکتے ہیں۔

۱: ظالمانہ دباؤ سے بچنے کی کوشش۔

۲: ارتداد کے خطرے کو ٹالنا۔

۳: تجارتی سرگرمیوں کو جاری رکھنا۔

۴: حبشہ کے باشندوں سے جنگی امداد کی کوشش۔

۵: اس وقت اسلام نوخیز ملت کے اندرونی معاملات میں فکری خلفشار کا پیدا ہونا، حبشہ میں حال آں کہ خالد بن سعید کے لمبے قیام سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ ان کو محمد ﷺ کی پالیسیوں سے اختلاف تھا۔ اگر خالد کو پالیسیوں کا لحاظ ہوتا تو وہ اپنے اختلاف کو نظر انداز کر کے ۷ھ میں واپس آجاتے''۔ (علوم اسلامیہ اور مستشرقین ۹۷)

جواب: یہ بات درست ہے قرآن کریم اس کی تائید کرتا ہے اور واٹ بھی اسے مانتا ہے۔ اور تسلیم کرتا ہے کہ ظالمانہ دباؤ کے پیش نظر مسلمانوں نے ہجرت کا اقدام کیا۔ اس کا مفصل بیان پیچھے گزر چکا ہے۔ اب ''واٹ'' کے مفروضے کی دوسری شق ''ارتداد کے خطرے کو ٹالنے کا جائزہ لیتے ہیں۔

''واٹ'' نے ارتداد کے خطرے کی بات کی ہے۔ اس کا اشارہ عبید اللہ بن جحش اور سکران بن عمرو کی طرف ہے۔ انھوں نے اسلام کو چھوڑ دیا اور نصرانیت اختیار کر لی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ابتداء میں ان کے دلوں میں اسلام راسخ نہ ہوا تھا۔ گومگو کی حالت میں پھنس گئے۔ شومئی قسمت کہ اسلام سے دور ہو گئے اور مرتد ہو گئے۔ عبید اللہ بن جحش کی بیوی رملہ جس کی کنیت ام حبیبہ تھی یعنی ان کے ہاں بیٹی ہوئی تھی جس کا نام حبیبہ رکھا گیا۔ اس نسبت سے ام حبیبہ کہلائیں اور کنیت ایسی غالب ہوئی کہ ان کا نام یاد نہ رہا۔ رملہ ابوسفیان کی بیٹی تھیں۔ شوہر کے مرتد ہونے کے بعد بیوگی کے سائے منڈلائے۔ ہر وقت سوچ بچار میں ڈوبی رہتیں۔ اس غم کو سہتی رہیں لیکن اسلام کو سینے سے لگائے رکھا۔ شوہر کے چھوڑ جانے اور پردیس کا رنج اور سب سے بڑھ کر جدائی و تنہائی کا غم سہتی رہیں مگر دین اسلام پر کاربند رہنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا حتیٰ کہ ان کی قسمت کا ستارہ چمکا اور نبی مکرمؐ نے انھیں حرم نبوی میں شامل کر لیا۔ ام حبیبہ ام المومنین کے عالی شان اور عظیم الشان اعزاز سے سرفراز ہوئیں۔ ان دو مہاجرین کے علاوہ کسی نے اسلام سے انحراف نہیں کیا۔ ''واٹ'' کے لیے چیلنج ہے کہ ہجرت حبشہ اولی اور ثانی کے مہاجرین میں سے سوائے ان دو کے کسی اور کا نام لے جو ارتداد میں ملوث ہوئے ہوں۔ نیز اگر قریش کے دل میں یہ دھڑکا لگا تھا کہ مسلمان اپنا دین چھوڑ کر اہل حبشہ کا مسیحی مذہب اختیار کریں گے تو انھیں اپنے وفد حبشہ میں نجاشی کی خدمت میں نہیں بھیجنا چاہیے تھا اور نہ ہی یہ درخواست کرنا چاہیے تھی کہ ان مسلمانوں کو ہمارے حوالہ کر دیں۔ انھیں تو مسلمانوں کا اسلام چھوڑنے پر شاداں و فرحاں ہونا چاہیے تھا کہ وہ اپنے پیغمبر کے لائے ہوئے دین کو خیر باد کہہ رہے تھے۔ پیغمبر اسلام ﷺ یکہ و تنہا رہ جائے گا۔ لیکن انھیں یہ خدشہ اور ڈر تھا کہ مسلمان اپنے دین سے دست بردار ہونے والے نہیں ہیں اور ہو سکتا ہے کہ اہل حبشہ ان سے نہ مل جائیں اور مسلمان اپنی تعداد بڑھا لیں گویا اہل حبشہ بھی اسلام کے پیروکار بننے لگیں اور اس قدر مہاجرین اسلام طاقت حاصل کر لیں کہ مسلمان از خود اہل حبشہ کی مدد سے رسول اللہ ﷺ کی حمایت میں مکہ پر حملہ آور ہوں اور ہمارے مقابل صف آراء ہو جائیں۔ قریش کو علم تھا کہ مومنین اپنے آقا و مولا کو چھوڑنے والے نہیں تھے۔ مسیحی حواریوں کی طرح ساتھ چھوڑ کر بھاگنے والے نہیں تھے اور نہ ہی اسلام سے انحراف کرنے والے تھے۔ قیاس کیجئے کہ اگر مسلمان اسلام سے دست بردار ہو جاتے تو پھر قریش مکہ سے ان کی لڑائی کیسی اور کیوں کر ہو۔ کیوں کہ کفار کے نزدیک لڑائی اور فساد کی جڑ دین اسلام تھا۔ جس کا پرچار جاری و ساری تھا اور

آئے دن اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔

۳: ''واٹ'' کے بہ قول ہجرت کا ایک سبب تجارتی سرگرمیوں کو جاری رکھنا ہے۔ یہ عجیب منطق ہے کہ بے چارے مسلمان اپنے دین کی خاطر اور مصیبتوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کی خاطر ایک پناہ گاہ کی تلاش میں ہیں۔ ہجرت تجارتی غرض سے نہیں قریش کے ناروا اور ظالمانہ رویوں اور اسلامی تعلیمات پر عمل نہ کرنے کے سبب تھی۔ تاجر جو تجارت کی غرض سے جاتے ہیں ان کی خواہش ہوتی ہے کہ اپنا کام ختم کر کے جلد از جلد واپس وطن لوٹ آئیں۔ وہاں قیام کرنا اور لمبے عرصے تک رہنا مقصود نہیں ہوتا۔ جب کہ مہاجرین حبشہ کو ہدایت بارگاہ نبوی سے ملتی ہے کہ حبشہ میں رہیں تا وقتیکہ مکہ کے حالات خوش گوار نہیں ہو جاتے۔ حتیٰ کہ وہاں ۱۳ سال قیام رہا مگر کہیں تجارت کا اشارہ تک نہیں ملتا۔ ہاں اگر اپنے گھر کا چولہا گرم کرنے کے لیے دیگر کاموں کے علاوہ تجارت بھی کر لیتے تو کوئی حرج نہ تھا ''واٹ'' کے یہ محض مفروضے ہیں جو کہ یک سر غلط ہیں۔

۴: اسی طرح نہ جنگی امداد کی کوشش تھی۔ کافی لمبے عرصہ تک قیام کے دوران جنگی امداد کی کوشش کا ادنیٰ اشارہ تک نہیں ملتا۔ نیز مآخذ بھی اس کی تردید کرتے ہیں۔ اس کا جواب مفصل گزر چکا ہے۔

اب رہا ''واٹ'' کا یہ الزام کہ اندرونی خلفشار اور آپؐ کی پالیسیوں سے اختلاف کا نتیجہ ہے کہ خالد بن سعیدؓ وہاں لمبے عرصہ تک رہا۔ انھیں پالیسیوں کا لحاظ ہوتا تو وہ اپنے اختلافات کو یک سر نظر انداز کر کے ۷ھ میں واپس آ جاتے۔ اس بات میں صداقت نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے جس طرح مسلمانوں نے یک بارگی ہجرت نہیں کی تھی۔ دو بار ہجرت حبشہ ہوئی۔ ہجرت اولیٰ میں گیارہ مرد اور چار عورتیں تھیں اور ہجرت حبشہ ثانی میں تراسی مرد اور اٹھارہ عورتیں تھیں۔ اسی طرح واپسی بھی یک بارگی نہیں ہوئی تھی۔ حالات سازگار ہوتے تو وطن چلے آتے لیکن مکہ کا ماحول مکدر ہی رہا۔ نیز مکی و مدنی آقا ﷺ نے ہدایت فرمائی تھی کہ تم وہاں رہو یہاں تک اللہ تعالیٰ ان مشکلات میں جن میں اب مبتلا ہو آسان فرما دے۔ صحابہ کرامؓ کو جب امید لگی کہ حالات ٹھیک ہیں وہ چلے آئے۔ یہ بات کسی طرح درست نہیں کہ آپؐ یا آپؐ کے صحابہ کے درمیان کسی قسم کے اختلاف تھے۔ ان اختلاف کی وجہ پر حبشہ میں کافی عرصہ مقیم رہے۔ ''واٹ'' خالد بن سعیدؓ کے نہ آنے پر سیخ پا ہو رہا ہے مگر اس کے پیٹ میں مروڑ کیوں نہیں اٹھتے کہ عبداللہ بن مسعودؓ جلد ہی مکہ واپس آتے ہیں۔ ان کے بارے میں کچھ کہنے میں چپ سادھ لیتا ہے۔ زبان پر مہر لگ جاتی ہے کیوں؟ چاہیے تو یہ تھا کہ ''واٹ'' عبداللہ بن مسعودؓ کے بارے میں کہتا کہ انھیں بھی آپؐ کی پالیسیوں سے اختلاف ہوا اور کفار کے ساتھ سمجھوتہ کر کے مکہ میں رہنے کی ٹھان لی۔ حبشہ میں رہنا یا وہاں سے چلے آنا' دیر تک یا تھوڑے عرصہ قیام کرنا، ہر دو صورتوں میں پالیسیوں سے اختلاف کی وجہ سے تھا تو تسلیم

کرنا پڑے گا اور واضح کرنا پڑے گا کہ عبداللہ بن مسعودؓ مکہ آئے تو کفار نے ان کا استقبال کیا؟ انھیں منہ مانگی رعایتیں دیں یا اس نے آپؐ کی پالیسیوں کی برملا کھلے بندوں مخالفت کی؟ یا انھوں نے آنحضرتؐ کا ساتھ چھوڑ دیا اور دین اسلام کو بھی خیر باد کہہ دیا؟ ایسی کوئی بات نہیں پائی جاتی بل کہ ان کو مکہ میں کسی نے پناہ نہ دی۔ وہ بغیر کسی کی پناہ کے مکہ چلے آئے تھے۔ قلیل عرصہ قیام کے بعد دوبارہ ملک حبش لوٹ گئے۔ (ضیاء النبی۔ ۲۔ ۳۵۵) عبداللہ بن مسعودؓ خانہ کعبہ میں قرآن کریم پڑھنے پر زدوکوب کیا جاتا تھا۔ ابوبکر جیسوں کو بھی قرآن پڑھنے کی اجازت نہ تھی۔ یہ بھی سن لیں کہ حضرت جعفرؓ اور ان کی معیت میں مہاجرین اس وقت مدینہ آئے جب خیبر کے سارے قلعے فتح ہو چکے تھے۔ یعنی ایک طویل عرصہ حبشہ میں گزار کر واپس آئے تھے۔ مسلمان ہر قسم کی تکلیفیں سہتے ہیں۔ جان کی بازی لگا کر اسلام کا دم بھرتے ہیں۔ بیبیوں کے شوہر مر جائیں یا چھوڑ جائیں مگر ان کے پائے استقلال میں لغزش نہیں آتی۔

اصحاب کی واپسی کے اسباب: حضرت عمرؓ کے اسلام قبول کرنے کے بعد اسلام کی اعلانیہ تبلیغ شروع ہوتی ہے۔ حرم میں نماز ادا ہونے لگتی ہے۔ حالات نے کروٹ لی۔ دشمنان اسلام کو مسلمانوں کی یہ کامیابی ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ وہ افواہ اڑاتے ہیں کہ مسلمانوں اور کفار کے درمیان سمجھوتا ہو گیا ہے تب کچھ مہاجرین حبشہ مکہ کی راہ لیتے ہیں۔ جب افواہ کا پتہ چلتا ہے تو چھپتے چھپاتے دوبارہ حبش لوٹ جاتے ہیں۔

دوم: مہاجرین صحابہ آنحضرت ﷺ کی ہجرت مدینہ کا سنتے ہیں۔ ۳۳ مرد اور آٹھ عورتیں حبشہ سے مدینہ چلی آتی ہیں۔ ان میں سے ۲۴ نے غزوہ بدر میں شرکت کی۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ قافلہ پہلے مکہ آتا ہے بعد میں مدینہ روانہ ہوتا ہے۔ ان مہاجرین میں سے دو نے مکہ میں وفات پائی اور سات کو قریش پکڑ لیتے ہیں۔

اعتراض نمبر ۲۰۵

''واٹ'' کی طرح ''وان گریونے باؤم'' نے دوسری ہجرت حبشہ میں ۸۳ افراد اور اٹھارہ عورتوں نے حبشہ میں پناہ لی، مہاجرین کی اس تعداد کو دیکھتے ہوئے یہ نظریہ پیش کیا کہ ہجرت ابتدائی مسلمانوں میں افتراق ختم کرنے کی کوشش تھی۔ اس نے لکھا (نعوذ باللہ)

" Probably this Hijra the immigration to Abyssinia was motivated to be an attempt to smooth out a split that was begining inside the point of view was hyperasetic"

''غالباً یہ ہجرت (ہجرت حبشہ) مسلم گروہ میں پیدا ہونے والی اس تفریق کو ختم کرنے کی ایک ترغیبی کوشش تھی جو محمد ﷺ اور ان کے ساتھیوں کے درمیان جو ان کے نقطہ نظر سے زیادہ ہی رہبانیت

پسند تھے' پیدا ہو گئی تھی''۔

جواب: ''لا رہبانیت فی الاسلام'' اسلام میں رہبانیت (ترک دنیا) کا کوئی وجود نہیں ہے کہ کسی گروہ کو رہبانیت پسندی کا طعنہ دیں۔ اگر ایسا مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ نعوذ باللہ یہ گروہ داعی اسلام ﷺ کا پیرو تھا بل کہ داعی اسلام ﷺ کے لائے ہوئے دین سے کوئی چیز تھی جسے آپؐ سے منوانا چاہتا ہے۔ نیز یہ بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس گروہ نے حضورؐ کے حکم پر ہجرت کی تھی یا اپنی مرضی سے۔ اگر آپؐ کے ارشاد پر ہجرت نہیں کی تھی تو پھر حبشہ میں قریش کے وفد کی مخالفت کیوں کی تھی اور اپنے آقا و مولا جناب محمد ﷺ کی پر جوش حمایت کے کیا معنی ہوں گے؟ اگر ہجرت آپ کے ارشاد کی تعمیل کرتے ہوئے کی تھی تو وہ گروہ جو رسول اللہ ﷺ کے حکم پر گھر بار، وطن، کاروبار، مال و دولت، مکان، دکان اور جائداد سب کچھ چھوڑ دیتا ہے بھلا' وہ اپنے رسول کی مخالفت پر آمادہ کیسے ہو سکتا ہے؟ چوں کہ زندگی ایک وحدت کا نام ہے اسے روح و مادہ اور دین و دنیا کے دو مختلف خانوں میں بانٹا نہیں جا سکتا۔ روح و مادہ میں ایسا تعلق ہے جس سے یہ ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ ترک دنیا کر کے دین پر عمل کرنے کا ہر عمل رہبانیت ہے اور دین کو چھوڑ کر دنیا کو اوڑھنا بچھونا سمجھ لینا چنگیزیت ہے۔ اسلام نہ رہبانیت کی تعلیم دیتا ہے نہ ہی چنگیزی جبر و استبداد اور ظلم و ستم کا درس دیتا ہے۔ انسان کی زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق راہیں طے شدہ ہیں۔ تجارتی سرگرمیوں کی اجازت ہے مگر دنیاوی ہر قسم کی سرگرمیوں کا مقصود بالذات نہیں ہے بل کہ اصل تو رضائے خداوندی کا حصول ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔ ''رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللَّهِ وَإِقَامِ الصَّلَوٰةِ وَإِيتَآءِ الزَّكَوٰةِ''۔ (سورہ ال نور۔۳۷) ترجمہ: ''وہ (جواں) مرد جنھیں غافل نہیں کرتی تجارت اور خرید و فروخت یادِ الٰہی سے' اور نماز عام کرنے اور زکوٰۃ دینے والے''

حقیقت میں روحانی زندگی کے اقدار تمام مادی شعبوں میں ترقی کا باعث بنتے ہیں۔ ان کے امتزاج سے دنیاوی امور بھی دینی امور قرار پاتے ہیں۔ حضرت عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص بارگاہ نبوی میں آتا ہے اور کہتا ہے ''میں اپنے ماں باپ روتے چھوڑ آیا ہوں کہ آپؐ سے ہجرت پر بیعت کروں۔ فرمایا'' واپس جاؤ اور انھیں ہنساؤ جیسے تو نے انھیں رلایا ہے۔ (محمد رسول اللہ۔۳۶) اللہ تعالیٰ نے دین و دنیا کی بھلائی کے لیے بندے کو یہ دعا سکھائی ہے۔ ''ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار''۔

اس سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ رسول اللہ کے اصحاب میں اس قدر یقین محکم، پابندی احکامات اور غیر متزلزل ایمان کیوں تھا؟ اس بات نے گریو نے باؤم کو باولا کر رکھا ہے۔ جس کی خفت مٹانے کے لیے اس الزام کا سہارا لیتا ہے جو بے بنیاد ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ مسلمانوں کی روز افزوں تعداد سے ذہنی خلفشار کا شکار ہو گیا ہے جیسے کہ اہل حبش کی بڑی تعداد نے اسلام قبول کیا۔ یہ نو مسلم کشتیوں پر سوار ہو کر

پیغمبر اسلام ﷺ سے ملنے آرہے تھے۔کئی مورخین نے لکھا ہے کہ کئی کشتیاں نو مسلموں سے بھری سمندر میں ڈوب گئیں جو لوگ آپ ؐ کی خدمت اقدس میں پہنچے ان میں نجاشی کا فرزند ارجمند بھی تھا جس کے حضرت علیؓ سے برادرانہ تعلقات استوار ہو گئے۔اس نے واپس جانے سے انکار کر دیا حتیٰ کہ ولی عہدی چھوڑ دی۔امام سہیلی کا کہنا ہے کہ اسے غلام بنایا گیا تھا اور حضرت علیؓ نے خرید کر آزاد کر دیا۔نجاشی نے اپنے فرزند کے ہاتھ ایک خط رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ارسال کیا تھا جس میں اس نے قبول اسلام کی اطلاع دی تھی۔(پیغمبر اسلام ۳۰۹)

اعتراض نمبر ۲۰۶

''غالباً مہاجرین حبشہ کی بڑھتی ہوئی شدید مزاحمت کے بارے میں حضور ﷺ کے اختیار کردہ رائے کو ناپسند کرتے تھے۔محمدؐ ابتدائی گروہ بندی سے آگاہ ہو گئے ہوں گے اور اس کی درستی کے اقدامات اٹھائے ہوں گے۔آپ نے ایسے صحابہ کو حبشہ جانے کے لیے کہا ہو گا تا کہ اسلامی مفادات کو آگے بڑھایا جا سکے۔(محمد رسول اللہ۔۳۶۸)

۲۔نوزائیدہ اسلام کے اندر اختلاف رائے کی وجہ سے ایک زبردست تقسیم رونما ہو چکی تھی۔اس کے کچھ ہلکے نشانات اس رقابت میں مل جاتے ہیں جو ابو بکرؓ اور عثمان بن مظعونؓ کے گروہ کے مابین موجود تھے''۔(محمد رسول اللہ۔۳۶۷)

جواب:''واٹ'' کا مذکورہ الزام بعید از قیاس ہے۔اسلام کے بالکل ابتدائی دور میں بنیادی اختلاف بڑھے ہوں اور ان اختلافات کا حل یہ نکالا ہو کہ ایک گروہ (ابو بکرؓ کا گروہ) کو مکہ میں ہی رہنے دیا جائے اور دوسرے گروہ (عثمان بن مظعونؓ) کو باہر کسی ملک میں بھیج دیا جائے۔اس وقت مسلمانوں کی تعداد زیادہ نہ تھی۔یہ بھی درست نہیں کہ ان اختلافات کا حل نکالے بغیر ایک مکہ میں مقیم رہے اور دوسرا حبشہ کی راہ لے۔اختلافات کو نمٹائے بغیر ایک گروہ کا مکہ میں رہنا اور دوسرے کا حبشہ چلے جانا مزید جلتی پر تیل چھڑکنے کے مترادف معاملہ ہے۔اس سے اختلافات بڑھنے کی گنجائش ہے جب کہ ایک ساتھ رہنے سے اختلافات پیوند خاک ہو سکتے ہیں کیوں کہ ان کے درمیان اپنوں کی مداخلت سے مصالحت کی کوئی صورت نکل سکتی ہے اس کے علاوہ دیکھتے ہیں کہ ابو بکرؓ و عثمانؓ کے گروہوں کے درمیان وجہ رقابت کیا تھی؟ واٹ نے عثمان بن مظعونؓ کے خصوصی مزاج کے سہارے رقابت کی کم زور دیوار کھڑی کی ہے۔اس کا کہنا کہ عثمانؓ ایام جاہلیت میں بھی فسق و فجور،شراب اور دیگر رذایل سے کنارہ کش رہے تھے۔یہ بات تو ابو بکرؓ کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے کہ مروجہ ہر برائی کے قریب نہیں جاتے تھے۔اصل واقعہ یہ ہے کہ عثمان بن مظعونؓ اسلام میں اس قدر وارفتہ ہو گئے تھے کہ ایسے معمولات سے گریز اور پر

ہیز کرنے لگے تھے جس کی دین اسلام قطعاً اجازت نہیں دیتا۔ اسلام چھوٹی یا بڑی چیز میں کسی فرد کو اپنے ذاتی نظریات وخیالات یا مخصوص مزاج واحوال کو داخل کرنے کا حق نہیں دیتا۔ یہ عیسائیت نہیں کہ کوئی سینٹ پال آدھمکے۔ اور مسیحؑ کی تعلیمات سے منہ موڑ لے اور اپنے ذاتی نظریات کو یک جا کر کے ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈال کر اس کا بانی بن بیٹھے۔ حضرت عثمانؓ کا مزاج زاہدانہ تھا۔ ایک بار خدمت نبوی میں حاضر ہو کر عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ میں نہیں چاہتا کہ میرے بدن قابل ستر حصوں پر میری بیوی کی نظر پڑے۔۔۔۔ فرمایا کیوں؟ اس میں کیا قباحت ہے؟ جان دو عالم ﷺ نے حیرت سے پوچھا۔ عرض کی مجھے شرم آتی ہے یا رسول اللہ! ﷺ آپ نے ان کو سمجھایا کہ اللہ تعالیٰ نے خاوند بیوی کو ایک دوسرے کا لباس کہا ہے اس لیے ان میں کوئی پردہ نہیں ہوتا' میری اپنی ازواج ہیں ان کی نظر ستر والے حصہ پر پڑ جاتی ہے۔ یہ سن کر عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! پھر آپ سے زیادہ شرم وحیا والا کون ہوسکتا ہے۔ ایک بار ان کی بیوی امہات المومنین کی خدمت میں آئی۔ پوچھا! کیا پریشانی ہے، تمھارا شوہر مال دار ہے؟ مال دار تو ہے مگر ان کو روزہ اور رات کے نوافل سے فرصت نہیں۔ وہ میری طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ آپؐ نے یہی بات ان سے فرمائی اور اس نے اقرار کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا ایسا نہ کیا کرو تم پر تمھارے نفس کا بھی حق ہے۔ آنکھوں کا بھی حق ہے اور بیوی کا بھی حق ہے۔ اس طرح رات کو نماز پڑھا کرو اور سویا بھی کرو' روزہ بھی رکھا کرو' کبھی چھوڑ بھی دیا کرو'۔ یہ اس صحابی کا ذکر ہے جس کی میت کو نبی مکرم ﷺ نے بوسہ دیا تھا اور آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے تھے۔ (سید الوریٰ)

یہی دو گروہوں کے مابین وجہ رقابت ہے۔ عثمان کے افراط والے رویوں کی آنحضرت ﷺ نے توثیق نہیں فرمائی۔ یہ ان کی عبادت گزاری اور اللہ سے محبت کی وارفتگی کا عالم ہے جس میں رہبانیت کی ادنیٰ سی جھلک بھی نظر نہیں آتی۔ وہ گوتم کی طرح بال بچوں کو چھوڑ کر جنگل کی راہ نہیں لیتا۔ اسلام ایک حق کو پورا کرنے اور باقی حقوق کی بجا آوری نہ کرنے پر قطعاً استثنیٰ نہیں دیتا۔ جبھی تو عثمان وقتاً فوقتاً آپؐ کی تعلیم اور ہدایت کے فیض سے حقوق کی بجا آوری کی طرف توجہ دینے لگے۔ جنھیں وہ ترک کر چکے تھے یا ترک کرنے کا ارادہ رکھتے تھے جس کی جیتی جاگتی مثال ان کی بیوی کا وہ قول ہے جو انھوں نے امہات المومنین سے بیان کیا'۔ جی ہاں! اب وہ میری ضروریات کا خیال رکھتے ہیں۔ حضرت ابو درداؓ کی ازدواجی تعلقات سے لاتعلقی اور نفلی عبادت میں مگن رہنے پر ان کی اہلیہ نے بن سنور کر رہنا چھوڑ دیا۔ آپؐ کو معلوم ہوا تو آپؐ نے انھیں نفلی عبادت میں ایسے استغراق سے منع فرمادیا۔ (محمد رسول اللہ۔ ۱۹۷) ایسے حالات میں اگر صحابہ کرامؓ دوسرے کسی صحابی کو تنبیہ کریں تو یہ رقابت نہیں بل کہ دینی فریضہ کی بجا آوری ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی مدد کرے۔ اچھا مشورہ دے اور بے جا کام سے روکے۔ ابو بکرؓ و عثمانؓ میں یہی

اختلاف تھا جو سراسر مبنی بر خیر و انصاف تھا۔

ایک شبہ کا ازالہ: مہاجرین حبشہ کے پہلے گروہ کی قیادت کے بارے میں ابن ہشام کے ہاں کسی گم نام عالم کے حوالے سے حضرت عثمان بن مظعونؓ کی قیادت کے بارے میں معمولی سا اشارہ ملتا ہے۔ (محمد رسول اللہ۔ ۳۶)

اول: مسلمانوں کی تاریخی روایات میں کسی مجہول راوی کی قطعاً کوئی اہمیت نہیں اور وہ روایت معتبر نہیں سمجھی جاتی۔

دوم: کسی دوسری قابل ذکر روایات میں ان کے قائد ہونے کا ذکر نہیں ملتا۔

سوم: یہ بات مسلمہ ہے کہ مہاجرین حبشہ کو نجاشی نے جب دربار میں آنے کا عندیہ دیا تو مسلمانوں کی قیادت حضرت جعفر بن ابی طالبؓ نے کی تھی نہ کہ حضرت عثمانؓ نے۔ چہارم نجاشی کے سامنے حضرت جعفرؓ کی تقریر سیرت کی کتابوں میں موجود ہے جب کہ اس تقریر میں حضرت عثمانؓ کو کوئی نسبت نہیں۔

اعتراض نمبر ۲۰۷

''واٹ'' کہتا ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کرام کے ہوش و خرد کو مسحور و مفلوج کر دیا تھا اس لیے صحابہ کرام آپ ﷺ کی کورانہ تقلید کرتے تھے۔ (پیغمبر آخر ص۔۱۰۹، از ڈاکٹر نصیر احمد ناصر)

جواب: سورت الفرقان (۲۵۔۷۳) میں اللہ کے بندوں کی ایک امتیازی وصف و خوبی میں یہ بات بیان ہوئی ہے ارشاد ربانی ہے ''وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا'' ترجمہ: وہ لوگ جنہیں نصیحت کی جاتی ہے ان کے رب کی آیت سے تو نہیں گر پڑتے ان پر بہرے اور اندھے ہو کر۔

اللہ تعالیٰ کے بندوں کو جب آیات ربانی سے نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اندھا دھند اس کی پیروی نہیں کرتے جس طرح بہروں اور اندھوں کا کام ہوتا ہے بلکہ وہ آیات کو ہوش و خرد سے سنتے ہیں پھر ان میں پوشیدہ رموز و اسرار کے انوار کا ادارک کرتے ہیں اور اپنی خداداد صلاحیتوں اور قوتوں کو بروے کار لا کر راہنمائی و آگاہی حاصل کر کے عمل پیرا ہوتے ہیں۔ ظہور اسلام سے قبل ایک نوفلاطونی مذہبی تحریک تھی جس کے اثر سے انسانی ذہن اپنے اصل و حقیقی مقصد اور مادی وسائل کو خیر باد کہہ چکا تھا۔ دنیا کو گورکھ دھندہ اور جنجال پورہ سمجھ کر تن تنہا اور الگ تھلگ ہو چکا تھا اس تحریک کے پیروان کی لاحاصل کوشش تھی اور سر توڑ اسی لگن میں مگن تھے کہ مادی تقاضوں کو تج کر کے اور آنکھوں کو بند کر کے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کر لیں گے۔ اس تحریک کے پیروؤں کا ایمان تھا کہ حقیقی سعادت و خوش بختی اس وقت حاصل ہو سکتی ہے جب انسان اپنے حال سے بے قابو ہو کر وجد و سرور اور مستی کی کیفیت سے آشنا ہو جاتا ہے وہ خود کو اور خارجی عالم کو یکسر فراموش کر دیتا ہے۔ اس تحریک کے نظریات سے سائنس اور علم کی غیر معمولی ناقدری ہوئی کہ اس سے قبل نہ ہوئی تھی۔

دوسری طرف دین اسلام عمل کا دین ہے جمود و تعطل کو خاطر میں نہیں لاتا۔حریت و فکر نظر کا نقیب ہے یہ اپنے پیروی کرنے والوں کو زندگی کے پر خطر اور دشوار گزار مراحل اور جھمیلوں سے راہ فرار اختیار کرنے کی ترغیب و تلقین نہیں کرتا۔راہبانہ زندگی اختیار کرنے کی ممانعت کرتا ہے۔اخلاقی پاکیزگی کی بلندی ترک دینا نہیں بلکہ زندگی کے نشیب و فراز سے نمٹنے اور کامیابی حاصل کرنے میں ہے۔زندگی کی شورشوں اور اونچ نیچ سے گزرنے کے باوجود اس کی زندگی بے داغ اور صاف شفاف رہتی ہے جو آئینہ کی طرح چمک رہی ہوتی ہے اس دین کے ماننے والے کسی طرح تقلید نہیں کر سکتے ہیں۔یہ بات دو حال سے خالی نہیں،ایک یہ کہ بندے کا اگر دین اسلام نہیں ہے پھر وہ کورانہ تقلید کا مرتکب ہو سکتا ہے۔دوسرا یہ کہ بندہ دین اسلام کی پیروی کرتا ہے اور اس کا مخلص پیرو ہے تو وہ کبھی اندھی تقلید نہیں کر سکتا کیونکہ اس کا دین اسے کورانہ پیروی سے منع کرتا ہے جب ایسی تقلید ممنوع اور غلط ٹھہری تو مسلمانوں کے سر یہ الزام تھوپ دینا مشرکین اور مستشرقین کی اسلام دشمنی اور تعصب کا نتیجہ ہے۔

قرآن کریم عقلیات کا علم بردار ہے کہ وہ اپنے مقلدین کو کورانہ تقلید سے روکتا ہے کہ اندھوں اور بہروں کی طرح ٹوٹ نہ پڑیں ورنہ عقل و فکر سے کام نہ لینے میں نقصان ہے جس سے زمین مردہ اور عقل مفلوج ہو جاتی ہے ایسی صورت میں اچھائی برائی کی تمیز کا فرق اٹھ جاتا ہے انسان اس دلدل میں پھنس کر رہ جاتا ہے اور اس سے نکلنے کا راستہ محال ہو جاتا ہے۔چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔صحابہ کرام میں علمی قابلیت اور فکر کی بلندی اور رسائی کا عالم اس معیار پر تھا جس کی نظیر بمشکل ملے گی۔حضرت ابو بکر صدیقؓ نے جب یہ آیت " اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدہ۔۵۔۳) ترجمہ:آج ہم نے تمہارا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کر دیں اور تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کیا،سنی تو وہ رونے لگے۔ان سے پوچھا گیا کہ تم کیوں روتے ہو۔فرمایا: کہ اب آپ ﷺ اس دنیا میں نہیں رہیں گے،اپنے رفیق بالا علی سے جا ملیں گے۔

دوسری مثال:قریش مکہ نے جنگ بدر میں ایک طرف پڑاؤ کیا اس کے دوسری جانب سرکار دو عالم ﷺ نے ڈیرہ ڈالا۔سیدنا خباب بن منذرؓ نے بارگاہ رسالت میں حاضر ہو کر عرض کی یا رسول اللہ ﷺ!یہ جگہ جو آپ نے پڑاؤ کے لیے انتخاب فرمائی ہے یہ وحی ربانی کی روشنی میں ہے یا اتفاقی طور پر یا آپ ﷺ کا انتخاب ہے۔آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:یہ اتفاقی طور پر ہے،وحی کے تحت نہیں۔عرض کی کہ میں یہاں کے دو چشموں اور کنوؤں سے بخوبی واقف ہوں قریش کے پڑاؤ کے قریب ایک چشمہ ہے اگر آپ ﷺ چاہیں تو ہم آگے بڑھ کر قبضہ کر لیں وہاں ایک میٹھے پانی کا کنواں ہے اس کا پانی اتنا گہرا ہے کہ کبھی ٹوٹتا نہیں ہم اس کے قریب حوض بنا کر اس میں پانی بھر لیں گے تا کہ ہمیں پانی کی سہولت رہے

اور آس پاس کے کنویں بند کر دیں گے۔ آپ ﷺ نے خبابؓ کے اس تجویز کو قبول فرمایا۔ اگر وہ مسحور و مفلوج تھے ہوش و خرد گنوا چکے تھے تو پھر خبابؓ کیونکر جناب رسول اللہ ﷺ کے سامنے مشورہ کے لیے اپنی زبان کھولتے۔ اس کے ساتھ ساتھ بارگاہ نبوی میں ہر ایک کو بات کرنے کی اجازت تھی کوئی روک ٹوک نہ تھی اگر بات درست ہوتی تو قبول فرماتے ورنہ رد کر دیتے یہ مشاورت اور جمہوری طرز کے بے نظیر حسن کا مظہر ہے۔

تیسری مثال: رومن ایمپائر اپنے کو سپر پاور سمجھتی تھی لیکن وہ ہر وقت اس خطرہ سے باخبر رہتی تھی کہ مسلمان کہیں حملہ نہ کر دیں دوسری طرف مسلمانوں کو بھی رومن ایمپائر کی کارروائیوں سے بے خبری نہ تھی مسلم حکومت سمجھتی تھی کہ کہیں رومن حکومت سر اٹھالے اور چڑھ دوڑے۔ آپ ﷺ نے اس خطرہ کی پیش بندی کی اور حجۃ الوداع سے واپسی کے تھوڑے عرصہ بعد آپ ﷺ نے شام پر چڑھائی کا حکم صادر فرمایا اور فرمایا زیادہ سے زیادہ فوج اکٹھی کی جائے۔ اس لشکر اسلامی میں حضرت صدیق اکبرؓ، حضرت عمرؓ اور دیگر جلیل القدر صحابہ بطور سپاہی شامل تھے آپ ﷺ نے لشکر کا سپہ سالار اسامہ بن زیدؓ کو مقرر فرمایا ان کی عمر تقریباً بیس سال کے لگ بھگ تھی بعض صحابہ نے ان کی کم عمری پر اعتراض کیا جس سے تنقیدی پہلو نکلتا تھا اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''اگر تم لوگ اسامہ بن زیدؓ کی سپہ سالاری پر رائے زنی اور تنقید کر رہے ہو تو اس سے قبل ان کے والد زید بن حارثہؓ پر بھی کہہ چکے ہو حالانکہ وہ سپہ سالاری کے اہل تھے اور میرے نزدیک محبوب ترین لوگوں میں سے تھے اور اسامہؓ بھی ان کے بعد میرے نزدیک محبوب ترین لوگوں میں سے ہیں ایسے مکالمات سے شک و شبہات دور ہو جاتے ہیں بغض و کینہ اور عداوت جنم نہیں لیتی اس کے ساتھ اس مثال سے اشارہ ملتا ہے کہ مطلق العنان اور جابر حکمران کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور جابرانہ نظریہ کو ملیا میٹ کر دیا۔ آپ ﷺ کی بارگاہ میں ہر فرد کو اپنی بات سنانے کی آزادی اور اجازت تھی اگر صحابہ مسحور و مفلوج بنا دیئے گئے ہوتے تو کسی موقعہ پر عرض گزار نہ ہوتے۔

اعتراض نمبر ۲۰۸

مارگولیس کہتا ہے کہ حضرت جعفرؓ کی تقریر و مکالمت سے اس بناء پر شک ہے کہ نجاشی عربی زبان سے واقف نہ تھا۔ (سیرت النبی ۱۵۰)

جواب:

جانتا	ہوں	وہ	ہار	جائے گا
میں	نے	سکہ	اگر	اچھال دیا

پہلی بات یہ ہے کہ اہل حبش عربی زبان بے تکلف سمجھ سکتے تھے۔ یہ دو زبانیں ایک دوسرے کے

ایسے قریب ہیں جیسے آج کل اردو اور پنجابی۔ دوسری بات یہ ہے کہ درباروں میں ترجمان ہوتے ہیں۔ان کے بغیر درباری کام نمٹانے مشکل ہوتے ہیں۔ان کے ذریعے تقریروں اور تحریروں کو سمجھا جاتا ہے۔مثال کے طور پر ابوسفیان اور قیصر روم کے درمیان مکالمہ ہوتا ہے۔قیصر اپنے ترجمان کو طلب کرتا ہے۔اس کی مدد سے ایک دوسرے سے گفت گو ہوتی ہے۔قیصر کہتا ہے کہ تم میں سے اس شخص کے جو کہتا ہے کہ وہ نبی ہے' کے نسب میں زیادہ قریب کون ہے؟ ابوسفیان بولا! میں ان سب میں سے نسب میں ان سے زیادہ قریب ہوں۔ یہ سارا مکالمہ ترجمان کی مدد سے سرے لگا یعنی انجام پایا آج کل بھی ترجمانوں سے مدد لی جاتی ہے۔ایسا نہیں کہ ایک فرد تمام زبانوں پر عبور رکھتا ہو۔شائد کوئی ایک آدھ ہو جب کہ اکثریت اس سے عاری ہے۔ نبی مکرمؐ نے اس غرض سے حضرت زیدؓ کو عبرانی زبان سیکھنے کا حکم ارشاد فرمایا۔غیر مسلم جب کوئی مقدمہ لائیں تو ان کی کتاب سے اس کا حل بتا دیا جائے۔

مارگولیس مذکورہ دو واقعات سے چشم پوشی کرتا ہے۔اگرچہ عہد نبوی میں عام تعلیم قرآن کریم، احادیث نبوی اور نوشت وخواند تک محدود تھی تاہم آنحضرتؐ کے پاس مدینہ کی اسلامی ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے غیر زبانوں میں بھی خطوط بھیجے جاتے تھے اور ان کے جواب آتے رہتے تھے جنھیں غیر مسلموں اور بالخصوص یہودیوں کی مدد سے پڑھواتے تھے۔ان خطوط میں بعض معاملات پوشیدہ ہوتے تھے جن کا سرعام اظہار خطرے سے خالی نہ تھا اس لیے آپ نے یہ ضرورت محسوس کی کہ کوئی صحابی غیر زبان سیکھ لے۔ چناں چہ حضرت زید بن ثابتؓ خود فرماتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا''میرے پاس مختلف ملکوں سے خطوط آتے ہیں اور میں یہ پسند نہیں کرتا کہ ان خطوط کو ہر کوئی پڑھے،تو کیا تم عبرانی زبان کا لکھنا پڑھنا سیکھ سکتے ہو یا یوں فرمایا کہ تم عبرانی زبان کا لکھنا پڑھنا سیکھ سکتے ہو۔میں نے عرض کیا''جی ہاں''(سیکھ سکتا ہوں) چناں چہ میں نے سترہ دن میں وہ زبان سیکھ لی۔حضرت زید بن ثابتؓ نے نہ صرف عبرانی اور سریانی زبانیں سیکھیں بل کہ غیر زبانوں پر مہارت اور ملکہ ہونے کی بہ دولت وہ فارسی، رومی، قبطی اور حبشی زبانیں بھی جانتے تھے اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ان زبانوں کی ترجمانی کے فرائض انجام دیتے تھے۔انھوں نے یہ زبانیں آزاد کردہ غلاموں سے سیکھی تھیں جو ایسی قوموں سے تعلق رکھتے تھے اور مدینہ منورہ میں رہتے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عبداللہ بن زبیرؓ بھی بہت سی زبانیں جانتے تھے۔حضرت جعفرؓ نے سورہ مریم کی چند آیات کی تلاوت کی جنھیں سنتے ہی نجاشی کی آنکھوں میں آنسو چھلک پڑے۔(ن۔۴۔۱۲۴)

قرآن کی حقانیت کا اعجاز دیکھیے کہ نجاشی رونے لگا۔نجاشی نے کہا تم لوگ حضرت عیسیٰؑ کے متعلق کیا اعتقادات رکھتے ہو؟ حضرت جعفرؓ نے کہا! ہمارے پیغمبر نے بتایا ہے کہ ''عیسیٰؑ ابن مریم اللہ کا بندہ اور پیغمبر اور کلمۃ اللہ ہیں'' نجاشی نے زمین سے تنکا اٹھایا اور کہا'' واللہ جو تم نے کہا عیسیٰؑ اس تنکے کے برابر

بھی اس سے زیادہ نہیں ہیں''۔اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ شاہِ حبشہ نے پیغمبر کی بات کو تسلیم کیا بل کہ عیسیٰ کے متعلق غلط عیسائیت کے اعتقاد کی بھی نفی کر دی۔ گویا بادشاہ نے قرآنی آیات اور پیغمبر کے فرمان کی تصدیق کی۔ ہوسکتا ہے نجاشی عربی زبان سے واقف ہو یا ترجمان کے ذریعے مکالمہ ہوا ہو۔ ہر دو صورتوں میں حضرت جعفرؓ کی تقریر اور مکالمہ پر شک نہیں کیا جا سکتا۔ بادشاہ سلامت نے قرآنی آیات اور فرمان نبوی کو سچ مانا۔ ہر دو کو حق مان لیا۔ان مستشرقین کو چاہیے کہ اپنے وڈیروں کی بات مان لیں۔ جو قرآن کو کلام الٰہی اور نبی کو نبی مانتے ہیں۔ خدا بخشے توفیق ان کو!

سچ کی فتح: جان جائے پر ایمان نہ جائے۔ علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ حضرت جعفرؓ اپنے ساتھیوں کے ہم راہ نجاشی کے دربار میں آئے۔ وہ شاہی دربار کے آداب کے مطابق ادب و آداب بجا نہیں لائے یعنی بادشاہ کو سجدہ نہ کیا بل کہ سر اٹھائے سینہ تان کے آئے۔ بادشاہ کو السلام علیکم کہا۔ بادشاہ ناراض ہوا اور کہا کہ تم نے مجھے سجدہ کیوں نہیں کیا؟ حضرت جعفرؓ نے جواب دیا ''ہم اللہ کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کرتے اور ہمارے رسول ﷺ نے ہمیں بتایا ہے کہ اہل جنت ایک دوسرے سے انھیں الفاظ سے سلام کہتے ہیں اور انھی الفاظ سے ہم نے آپؐ کی خدمت میں سلام پیش کیا۔ (ضیاء النبی۔۲۔۳۶۸)

واقعہ غرانیق

مسلمانوں کے ملک حبش میں قیام کے تین ماہ بعد سیدنا حضرت عمرؓ اسلام قبول کر لیتے ہیں۔ان کے قبول اسلام کی خبر حبشہ پہنچتی ہے کہ قریش نے آنحضرت ﷺ اور آپ کے پیروؤں کو اذیتیں دینا بند کر دیا ہے۔اس اڑتی خبر پر سارے مسلمان یا ایک روایت کے مطابق چند مسلمان مکہ واپس آئے۔ وہ یہاں آ کر دیکھتے ہیں کہ مسلمان بدستور پہلے کی طرح ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں۔تب بعض نے شہر میں قدم رکھے بغیر دوبارہ حبشہ کی راہ لی اور بعض چھپ چھپا کر حبشہ چلے گئے اور بعض کفار کی پناہ میں رہنے لگتے ہیں اور کچھ اہل مکہ میں سے کئی اور مسلمانوں کے ہم راہ دوبارہ ہجرت کرتے ہیں۔

اعتراض نمبر ۲۰۹

بعض مورخین مسلمان مہاجرین کی حبشہ سے واپسی واقعہ غرانیق گردانتے ہیں۔

جواب: مستشرقین ہمارے بھولے اور بے سرمایہ سیرت نگاروں اور ارباب تفسیر کی زبان سے یہ روایات اچک لیتے ہیں اور خوب مرچ مصالحہ لگا کر اس باطل قصہ کو ہوا دیتے ہیں۔طرح طرح کی تاویلات اور تفسیروں سے رنگ آمیزی کر کے اسلام اور داعی اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کا طوفان بدتمیزی برپا کرتے ہیں۔ روایوں نے حبشہ سے مہاجرین کی واپسی کو ایک عجیب وغریب واقعہ غرانیق جوڑ

دیا ہے۔ابن سعد لکھتے ہیں کہ حضورﷺ حرم میں دوران نماز سورہ النجم تلاوت فرمارہے تھے جب آپ ﷺ نے افرایتم اللات والعزیٰ ومنات الثالثۃ الاخریٰ پڑھا تو شیطان نے آپ ﷺ کی زبان سے تلک الغرانیق العلیٰ وان شفاعتھن لترجی کہلوا دیا جب حضورﷺ نے سجدہ کیا تو وہاں موجود کفار نے بھی جن میں قریش کے سردار بھی تھے سجدہ کیا، یہ خبر حبشہ پہنچی اور مسلمان اس خوشی میں کہ تمام کفار نے اسلام قبول کرلیا ہے، روانہ ہو پڑے۔ابن سعد اس روایت کی تکذیب کرتے ہیں کیونکہ جس نبی کے متعلق قرآن ''ماینطق عن الھویٰ'' کہتا ہے تو اس کی زبان مبارک سے یہ کافرانہ کلمات کیسے نکل سکتے ہیں؟۔کفار مکہ کی ضد اور ہٹ دھرمی سے کون واقف نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کے عبادات بجا لانے میں خلل ڈالتے دوران نماز شور وغوغا کرتے یہی صورت یہاں بھی پیش آئی ہوگی۔دوران تلاوت کسی کو یہ فقرے بھلے لگے ہوں گے اور کہہ دیئے ہوں گے۔سامعین نے رائی کا پہاڑ بنا دیا کیونکہ شیطان ایسا عربی دان نہیں جو ایسا کام کر دکھاتا۔ہمارے ہاں روایت پرستی کے فروغ کی حد نہیں یہ اس کا کیا کرایا اور کرشمہ ہے چنانچہ احادیث کتب کی کئی کتابیں رطب ویابس سے بھری پڑی ہیں اگر راوی ذرا سوجھ بوجھ سے کام لیتا تو حضور ﷺ کی حیات مقدس کے سیاق وسباق پر غور کرتا ہے، جب آپ ﷺ سے قبل از بعثت ایسی کوئی لغزش سرزد نہیں ہوئی تو بعد از اعلان نبوت اس کا کیا امکان ہے۔؟

واقعہ غرانیق کی ایک روایت یوں بیان کی جاتی ہے کہ ایک روز نبی مکرمؐ حرم شریف میں سورہ نجم کی تلاوت فرمارہے تھے جب آپؐ '' افرایتم اللت و العزی و منوۃ الثالثۃ الاخریٰ''۔(۵۳۔۲۰)(تو کیا تم نے دیکھا لات وعزیٰ اور اس تیسری منات کو) پر پہنچے تو یہ جملے آپؐ کی زبان مبارک سے قرآن ہی کے لہجہ میں نکل گئے۔''تلک الغرانیق العلا وان شفاعتھن لترتیجی''(ان خوب صورت اور سر بلند سے عنداللہ شفاعت کی جاسکتی ہے)۔اس جملہ کے شامل ہونے کے ساتھ نبی کریمؐ نے مجمع میں پوری سورہ نجم پڑھی اور سورہ کے اختتام کے بعد جب آپؐ نے سجدہ کیا تو آپؐ کے ساتھ مشرکین بھی سجدہ ریز ہو گئے۔سجدہ سے اٹھے تو قریش نے کہا واقعی اللہ زندہ کرنے والا اور جان لینے والا ہے۔خالق اور رزاق ہے لیکن ہمارے معبود اس کے حضور سفارش کرتے ہیں شفاعت کی۔

اے محمدؐ! آج آپ ﷺ نے ہمارے معبودان کی شفاعت کا اعتراف کر ہی لیا ہے لہٰذا ہماری تمھاری لڑائی ختم۔۔۔۔یہ خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیلی۔یہاں تک کہ حبشہ میں پہنچی۔چند مہاجرین یا ایک روایت کے مطابق سارے مکہ چلے آئے۔مکہ سے کئی میل دور صحرا میں کاروان کنانہ سے ملے۔دریافت کیا انھوں نے کہا بے شک آپ کے صاحب نے بتوں کی تعریف کی ہے۔قریش اور ان کے درمیان صلح ہوگئی ہے مگر پھر آنحضرتؐ (نعوذ باللہ) نے انکار کر دیا ہے۔پہلے کی طرح بتوں کی مذمت کرنا شروع کی اس لیے اہل مکہ پھر

سے آپؐ اور آپ کے پیروکاروں کی جان کے درپے ہو گئے ہیں۔

ایک روایت میں ہے سورہ نجم کے نزول سے دوسرے روز جبرائیل امین تشریف لائے اور (سورہ نجم) کی مراجعت ہوئی تو حضور ﷺ کی زبان سے تلک الغرانیق۔۔۔۔لترتجی" (یہ حسین وجمیل باوقار دیویاں یقیناً ان کے ذریعے اللہ کے ہاں شفاعت کی توقع کی جا سکتی ہے) سن کر جبرائیل نے عرض کی! یہ آیتیں میں تو نہیں لایا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "مبادا میں نے ہی یہ بڑھا دی ہوں؟ نیز سورہ کے ساتھ سورہ حج کی ایک آیت " وان کادو لیفتونك الذی اوحینا الیك" کو بھی اپنے استدلال میں جامعین کتب نے شامل کر دیا ہے۔

" وما ارسلنك من قبلك من رسول ولا نبی الا اذا تمنی الفی الشطین فی امنیة فینسخ اللہ ما یلقی الشطین ثم یحکم اللہ ایته واللہ علیم حکیم لیبجعل ما یلقی الشیطن فتنة للذین فی قلوبهم مرض والقاسیة قلوبهم وان الظالمین لفی شقاق بعیده"۔ (سورۃ حج، آیت ۵۲)

"اور جو رسول بھیجا ہم نے تجھ سے پہلے یا نبی سو جب لگا خیال باندھنے تو شیطان نے ملا دیا اس کے خیال میں' پھر اللہ تعالیٰ مٹا دیتا ہے شیطان کا ملایا ہوا' پھر پکی کر دیتا ہے اپنی باتیں اور اللہ سب خبر رکھتا ہے۔ حکمتوں والا ہے۔ اس واسطے کہ جو کچھ شیطان نے ملایا اس سے جانچے ان کو کہ جن کے دل میں روگ ہے اور جن کے دل سخت ہیں اور گناہ گار تو ہیں مخالفت میں دور جا پڑے"۔

محمد حسین ہیکل (حیات محمد۔۱۹۲) لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے نادان سخن فہم جامعین روایات اور ارباب تفسیر کی پیروی میں مستشرقین بھی ان سے متفق ہو گئے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ مسلمانوں پر کفار کا جبر وتشدد اس انتہا کو پہنچ چکا تھا کہ وہ جب چاہتے کسی مسلمان کو قتل کر دیتے' جس کو چاہتے کڑکتی دھوپ میں گرم ریت پر لٹا دیتے' اس غریب کے سینے پر پتھر رکھ دیتے۔ حضرت بلالؓ سے جتنا وحشیانہ سلوک ہوا کس کو نہیں معلوم ۔حد یہ ہے کہ مسلمان ان ناقابل برداشت مظالم سے تنگ آ کر حبشہ ہجرت کر گئے۔ لیکن رسول خدا ﷺ چوں کہ قریش کی ہدایت اور بتوں سے نجات ہر قیمت پر چاہتے تھے۔ اس لیے کفار سے قرب کے طمع میں انھوں نے سورہ النجم کی دو آیتوں (تلک الغرانیق۔۔۔لترتجی) کا اضافہ کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب سورہ نجم کی آیت سجدہ پر حضورؐ نے اللہ کے حضور سجدہ کیا تو آپؐ کے ساتھ مطابقت ثابت رکھنے کے لیے مستشرکین بھی سجدہ میں گر گئے کیوں کہ حضورؐ نے اللہ کے ساتھ ان کے بتوں کا تقرب تسلیم کر ہی لیا تھا۔

انبیاء کرام اور بالخصوص رسول خدا حضرت محمد ﷺ کی طرف ایسی باتیں منسوب کرنا صراحتاً کفر ہے۔ کیوں کہ انبیاء ورسل ایسی کفر وشرک کی آلائشوں سے مبرا ومنزا ہوتے ہیں۔ نیز نہ ہی کفر وشرک کی تعلیم دیتے ہیں۔ ایسی باتیں جو ان سے منسوب کی جاتی ہیں سب کی سب لغو' باطل اور من گھڑت ہیں۔

ارشادِ خداوندی ہے۔

" ما کان بشران یوتیه الله الکتب و الحکم و النبوة ثم یقول للناس کونوا عبادا لی من دون الله ولکن کونوا ربنیین بما کنتم تعلمون الکتب وبما کنتم تدرسون ولا یامر کم ان تتخذوا الملئکة و النبیین اربابا"، (سورۃ آلِ عمران ۔۷۹۔۸۰) ترجمہ: "کسی آدمی کو یہ حق نہیں کہ اللہ اسے کتاب اور حکم وپیغمبری دے پھر وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے ہو جاؤ۔ ہاں یہ کہے گا کہ اللہ والے ہو جاؤ۔ اس سبب سے کہ تم کتاب سکھاتے ہو اور اس سبب سے کہ تم درس دیتے ہو اور نہ تمھیں یہ حکم دے گا کہ فرشتوں اور پیغمبروں کو خدا ٹھہرالو"۔

دوم: ارشادِ خداوندی ہے " ما ضل صاحبکم وما غوی ۔ وما ینطق عن الھوی۔ ان ھو الا یوحیٰ۔ (سورۃ النجم ۔(۱تا۴) ترجمہ: "تمھارے صاحب نہ بہکے اور نہ بے راہ چلے اور وہ کوئی بات اپنی خواہش سے نہیں کرتے۔ وہ تو نہیں مگر وحی جو انھیں کی جاتی ہے"۔ پیغمبروں کا بہک جانا ناممکن ہے اور نہ ہی وہ شرک کی دعوت دیتے ہیں بل کہ وہی کہتے ہیں جو ان کو وحی کی جاتی ہے۔ تو پھر کیسے مان لیں کہ کفار سے قرب کی طمع اور مسلمانوں کے مظالم میں کمی کے باعث آپ نے آیات کا اضافہ کر دیا۔ (نعوذ باللہ)

اعتراض نمبر ۲۱۰

آپ ﷺ کو متبعین کی حالت زار دیکھ کر سخت رنج ہوتا تھا۔ عربوں کی بت پرستی کے خلاف نڈھال کر دینے والی جنگ نے آپ کو غم زدہ کر دیا تھا۔ کوئی مقام تعجب نہیں اگر اپنے متعصب دشمنوں کے حق میں تھوڑی سی رعایت کر کے کش مکش کو ختم کرنے کا خیال لمحہ بھر کے لیے آپؐ کے دل میں آیا ہو۔ (روح اسلام ۔۱۱۵)

جواب: یہ واقعہ مغرب والوں نے بہت اچھالا اور من بھاتا اور من مرضی کے مواد سے مختلف عنوانات دے ڈالے۔ کسی نے اسے وقتی مفاہمت، کسی نے اسے اکتاہٹ سے تعبیر کیا۔ ایک دوسرے نے اسے سپردگی کا نام دیا اور کسی نے موقعہ پرستی کہا، کوئی اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالنے لگا کہ قرآن خدائی کلام نہیں بلکہ پیغمبر اسلام ﷺ کی تصنیف ہے کیونکہ جب چاہا کوئی آیت زیادہ کر دی یا بڑھا دی یا منسوخ کر دی۔ کلائن نے اس واقعہ کو بت پرستی اور عارضی مصالحت کا نام دیا۔ واٹ کہتا ہے کہ اس سلسلہ میں ہمیں شیطانی آیت کی داستان کو مدنظر رکھنا چاہیے اس قصہ کو بنیادی طور پر درست ہونا چاہیے کیونکہ کوئی بھی مسلمان اسے محمد ﷺ کے بارے میں گھڑنے کی جسارت نہیں کر سکتا تھا اور بلا شبہ اس کی تصدیق قرآن میں موجود ہے۔ قصہ یہ ہے کہ غالباً چھ سو پندرہ عیسوی یعنی ہجرت سے سات سال پہلے ان کے پاس وحی آئی کہ یہ بڑی پہنچ والے ہیں اور ان سے شفاعت کی امید ہے، محمد ﷺ نے فوراً اس وحی کو لوگوں تک پہنچایا اور ان کی عبادت کی اجازت نے مکہ کے باسیوں کو محمد ﷺ کے ساتھ عبادت میں شریک

ہونے پر مائل کر دیا۔ بعد میں بہرحال محمد ﷺ کو یہ احساس ہوا کہ یہ آیات درست نہیں ہو سکتیں اور پھر ان پر آیتیں تصحیح لسلسل میں نازل ہوئیں۔ یعنی واٹ نے یہ اخذ کیا کہ ایک خدا کے ساتھ دوسری دیویوں کی پوجا پاٹ میں کوئی مضائقہ نہیں۔ واٹ نے پھر سے اس واقعہ کو مصالحت کی کوشش کہا اور دوسرے لمحے اپنے دعویٰ کی تردید کر دی۔ مخالفین کے دعویٰ اور موافقین کی تردید کے لیے ایک تیر سے دو شکار کرنے کی بھونڈی کوشش ہے۔ وہ لکھتا ہے محمد ﷺ مکہ کے سرکردہ لوگوں کے ساتھ کسی مصالحت کی کوشش کر رہے تھے ان کا مدخولہ الفاظ کی غلطی کا احساس دراصل اس بات کا احساس تھا کہ مصالحت ناممکن ہے۔ غرانیق کا قصہ بالکل لغو اور بے ہودہ ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جب سورہ نجم کی ان آیات کی تلاوت کی ہو تو کسی شریر نے کہہ دیا ہو کہ آنحضرت ﷺ نے چند لمحوں کے لیے سہی بتوں کی عظمت کو تسلیم کر لیا تھا اور ان کی شفاعت کو پذیرائی کے لائق سمجھ لیا تھا"۔ آنحضرتؐ کا فی الواقعہ ایسا کرنا قطعی قرین عقل نہیں۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل نکات پر غور کر لینا چاہیے۔ قرآن حکیم نے منصب نبوت کے بارہ میں جن خصائص کی تشریح کی ہے۔ ان میں ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ پیغمبر کبھی باطل سے سمجھوتہ نہیں کرتا۔ کوئی بات اپنی طرف سے سمجھوتہ نہیں کرتا۔ مصالحت اور تالیف قلب اپنی جگہ اچھی چیز ہے مگر پیغمبر اس کے لیے بنیادی عقیدہ سے انحراف نہیں کر سکتا کہ جس پر اس کی دعوت کا دارومدار ہوتا ہے۔ وہ اپنے منصب جلیل کے اعتبار سے ایک طرح کاربند ہے کہ توحید کے انوار کو عام کرے رہے۔ منصب نبوت کے فرائض کی بجا آوری کے بارے میں چند آیات ملاحظہ فرمائیں۔

"فاصدع بما تومروا عرض عن المشرکین"۔ (الحجر ۹۴) ترجمہ: غرض آپ کو جس بات کا حکم کیا گیا ہے اس کو صاف صاف سنا دیجئے اور مشرکین کی پرواہ نہ کیجئے۔

"قل ما یکون لی ان ابدلہ من تلقائی نفسی ان اتبع الا ما یوحی الی"۔ (یونس۔۱۵) ترجمہ: آپ یہ کہہ دیجئے کہ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ میں اپنی طرف سے اس میں ترمیم کروں۔ بس میں تو اسی کا اتباع کروں گا جو میرے پاس وحی کے ذریعہ پہنچا ہے"۔

"لو تقول علینا بعض الا تاویل لاخذ نا منہ بالیمین ثم لقطعنا منہ الوتین"۔ (الحاقہ۔۴۶) ترجمہ: اگر یہ پیغمبر ہمارے ذمہ جھوٹی باتیں لگا دیتے تو ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑتے۔ پھر ہم ان کی رگ دل کاٹ دیتے"۔

اگر آپ ﷺ نے اضافہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت کے مطابق عمل کیوں نہ کیا۔ خود خدا کو بھی منکرین نے لپیٹ میں لے لیا۔ کیا ان شواہد کے بعد ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ بتوں کی تعریف میں آنحضرت ﷺ کے منہ سے یہ الفاظ نکلے ہوں گے؟ یا کیا ہم فرض کر سکتے ہیں کہ لمحہ بھر کے لیے اپنی اور

اپنے پیروکاروں کی تکالیف اور بتوں کی مخالفت کرتے کرتے نڈھال کر دینے والی جنگ نے آپ کو غم زدہ کر دیا اور آپ ﷺ نے دوسرا راستہ اختیار کر لیا ہو حالانکہ وہ ہستی جس نے بڑھتے ہوئے قریش کے مظالم کے وقت دوٹوک فرما دیا تھا کہ یہ لوگ اگر میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے ہاتھ پر چاند رکھ دیں، میں پھر بھی اپنے مشن سے باز نہیں آؤں گا۔

اعتراض نمبر ۲۱۱

آپ نے قرآن کی ایک آیت تلاوت کی جس میں آپ نے ان تین چاند دیویوں کا تذکرہ احترام سے کیا اور اس کا اقرار کیا کہ ان سے عنداللہ شفاعت کی امید کی جا سکتی ہے، پس خدا کے آگے جھک جاؤ اور اس کی بندگی کرو۔ ''لین پول'' کہتا ہے کہ سارا مجمع مصالحت سے خوش ہو کر محمد کے خدا کے حضور سجدہ میں گر گیا۔ سارے شہر نے اس دوگونہ مذہب کو قبول کر لیا لیکن صحرا کا یہ رویا دیکھنے والا ایسا شخص نہ تھا کہ ایک جھوٹی بات پر توقف کرتا۔ مکہ کا سارا شہر بھی اس کی نذر کر دیا جاتا تو وہ اپنے اندر کی صداقت کو جھٹلانے پر راضی نہ ہوتا۔ اس نے میدان میں آ کر اقرار کیا کہ اس سے لغزش ہو گئی تھی۔ اسے شیطان نے ورغلایا تھا۔ اس نے کھلم کھلا اپنے الفاظ واپس لیے اور کہا ''جہاں تک ان بتوں کا تعلق ہے وہ محض خالی خولی نام ہیں جنھیں انھوں نے اور ان کے آباء نے وضع کر لیا ہے''۔

جواب: لین پول بظاہر تو پیغمبر اسلام ﷺ کی تعریف کرتا نظر آتا ہے مگر اپنے بیان میں زہر گھول رہا ہے بھلا وہ ہستی جسے دشمن اور مخالف بھی صادق اور امین کہتے ہیں۔ وہ صاحب جو کبھی نہ بھولا اور نہ بھٹکا تو بھلا کیسے شیطان کے ورغلانے سے اس کے نرغہ میں پھنس گیا ہو اور لغزش واقع ہو گئی ہو۔

کبار محدثین مثلاً علامہ عینی، حافظ منذری، بیہقی، قاضی عیاض اور نووی نے اس قصہ کو باطل اور موضوع قرار دیا ہے۔ نووی کا کہنا ہے ''یہ قصہ نہ تو روایت کے اعتبار سے صحیح ہے اور نہ عقل و درایت کے اعتبار سے درست ہے۔ آخری اور اہم نکتہ یہ ہے کہ سورہ نجم کی جن آیات کے بعد اس جملہ کو بڑھایا گیا ہے سیاق وسباق کے لحاظ سے اس کے لیے کوئی گنجائش نہیں نکلتی کیوں کہ اگر اس قصہ کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ مضمون و معنی کا پورا کارخانہ ہی مختل ہو کر رہ جائے گا۔ یہی نہیں لات ومنات سے متعلق قرآن حکیم نے جو اعتراض کیا ہے یعنی یہ سب تو مونث ہیں اور کیا انصاف ہے کہ تم اپنے لیے تو بیٹے تجویز کرتے ہو اور اللہ کے لیے بیٹیاں۔ اگر یہ مان لیں کہ اہل مکہ کی تالیف قلبی اور ان کے شدت آمیز مظالم سے امان حاصل کرنے کی خاطر محمد ﷺ نے ان کی بات کی تغلیط نہ کی تو ہم اس بارے میں کہیں گے کہ اس نے مصالحت سے کیا کچھ حاصل کیا تھا جس سے وہ مردانہ وار دست بردار ہو گیا اور اپنی غلطی کا اعلانیہ اقرار کر کے دوبارہ قریش کی توہین و تحقیر کا مورد بننے کے لیے سینہ سپر ہو گیا۔ آپ ﷺ کے

اعلان کرتے ہی کہ لات وعزیٰ اور منات صرف نام ہیں، محض نام ہیں اور کچھ نہیں اس پر ظلم وزیادتی از سرنو امڈ آئی لیکن تائید الٰہی کا جو یقین کامل تھا اور فرشتہ رحمت آپ ﷺ کو جو آسمانی پیغام دے رہا تھا اس کے بل بوتے پر آپ ﷺ نے دشمنوں کے جور وظلم کی پروا کیے بغیر تبلیغ کے کام کو جاری رکھا چنانچہ ہر طرح کی مخالفت ومزاحمت کے باوجود تعلیمات اسلامی پھیلتی ہی گئیں۔ دین اسلام کی جو تخم ریزی کی گئی اسے پھلنے پھولنے اور بڑھنے میں کوئی چیز نہ روک سکتی تھی۔ صحرائی لوگ اور تاجر دور دراز سے قومی میلوں میں آتے تھے وہ اس انسان کی عجیب وغریب باتیں سنتے جسے اس کے دشمن ساحر، جادوگر اور آسیب زدہ سمجھتے تھے اس کی تعلیمات جو اس کے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے نکلتی تھیں خوف وحیرت سے اس کے وہ ملامت آمیز کلمات سنتے جو وہ ان کے بتوں، ان کی توہم پرستیوں اور ان کی بدافعالیوں اور برے طور طریقوں کے بارے میں کہتا تھا وہ یہ سب کچھ سنتے اور اس سے غیر شعوری طور پر ایک نئی روشنی اور ایک نئی زندگی حاصل کر کے اپنے افتادہ علاقوں میں اپنے ساتھ لے جاتے، وہ ہجو آمیز باتیں اور گالیاں جو آنحضرت ﷺ کے دشمن آپ ﷺ کی شان میں بکتے تھے، الٹا آپ ﷺ کے کلام کی شہرت کو دوبالا کر دیتیں۔ واقعہ غرانیق دین اسلام کی تعلیمات کو بڑھنے سے روکنے کا ایک اقدام تھا لیکن نچلے نہ بیٹھنے والے اہل مکہ اسلامی تعلیمات کی اشاعت میں اس سیل کے آگے بند نہ باندھ سکے۔

الزامی جواب: آپؐ سے طفولیت، جوانی بل کہ مدت العمر کسی وقت بھی کذب کا صدور نہیں ہوتا''۔ یہی وجہ ہے کہ کٹر اور جانی دشمن کی زبان پر صادق اور امین کے القاب ہوتے ہیں۔ یہ القابات بزبان زد خاص وعام ہوتے ہیں اور روز بہ روز ان کی قدر وقیمت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ بعثت کے بعد آپؐ کوہ صفا پر تشریف لے جا کر قریش کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں ''اے قریش! اگر میں کہوں کہ اس پہاڑ کے اُدھر ایک لشکر جرار تم پر حملہ آور ہونے والا ہے تو تم میری بات کو سچ سمجھو گے؟ سب بہ یک زبان بولے!'' ہم آپ کی بات صحیح تسلیم کریں گے اس لیے کہ آپؐ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا''۔ ایسے صادق وامین ذات کی طرف ایسا بہتان تراشنا اور منسوب کرنا دوزخ میں ٹھکانا بنانا ہے اور وہ بات خدا تعالیٰ نے فرمائی ہی نہ ہو اور وہ بھی اللہ کے ڈر سے نہیں بندوں کے ڈر سے قربت کے حصول اور اذیتوں سے بچنے کی خاطر اور مصالحت کی خاطر کہی بالکل غلط ہے۔ آپ کا اللہ کی فرماں برداری اور احکام خداوندی کی بجا آوری اوڑھنا بچھونا ہے اور ذات خداوندی کی محبت میں اس قدر سرشار ہو وہ یہ ارتکاب نہیں کر سکتا۔ وہ مشن الٰہی کو پورا کرنے کے لیے جاں کی بازی لگاتا ہے اور واضح کرتا ہے کہ اے قریش اگر تم میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے میں چاند بھی رکھ دو تو میں اپنے مشن کو چھوڑنے والا نہیں ہوں ایسے واشگاف الفاظ میں حقیقت کو بیان کر دیا کہ اب کسی کو جرات نہیں کہ ایسا کہہ دے۔ بہ قول شاعر

زباں پر مصلحت دل ڈرنے والا
بڑا آیا محبت کرنے والا

اعتراض نمبر۲۱۲

محمد حسین ہیکل (حیات محمد۔۱۹۶) لکھتے ہیں ''قرآن سے ثابت ہے کہ واقعہ غرانیق کا کوئی درجہ نہیں ۔اسے دشمنان محمد ﷺ نے وضع کیا کہ آپؐ قریش کی باتیں سنتے رہے، یہاں تک کہ خود ان کی زبان سے بھی بتان قریش کی قبول شفاعت پر ایک کلمہ نکل گیا لیکن جب کعبہ سے اٹھ کر اپنے دولت خانہ پر تشریف لائے تو اپنے پر پچھتاوا ہوا اور خدا کے حضور توبہ پیش کی جس پر جبرائیل امیں حاضر ہوئے۔

جواب: ہیکل جواب میں کہتے ہیں کہ الزام لگانے والے نے غرانیق کے رخ پر ملمع کاری کر کے دکھانا چاہا لیکن نفس واقعہ کی نفی کے لیے یہ ملمع بہ جائے خود شہادت ہے اس لیے کہ حضور اکرمؐ کی زبان والوں سے یہ کلمات نکل جاتے تو آپ کو گھر جا کر سوچنے کی بہ جائے وہیں غور کرنے میں کیا امر مانع تھا؟ ذرا سے پچھتاوے پر آ کر گھر میں وحی آسکتی ہے تو وہاں بھی آسکتی تھی جہاں یہ واقعہ ہوا۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ (اسلام کے) صدر اول میں اس واقعہ کا کسی کو سان وگمان بھی نہ تھا۔صرف حاسدان اسلام نے بعد میں اسے وضع کر کے اپنے دل کا غبار نکالنا چاہا ہے۔یہ اختراع عائد کرنے والوں کی جرات پر اور بھی حیرت ہے انھوں نے الزام تراشی کے لیے کون سا مسئلہ تراشا۔توحید جو رسالت کا اولین مقصد ہے جس کی تبلیغ کے لیے آپ کی بعثت ہوتی ہے اور جس (توحید) کی تبلیغ کے لیے بعثت سے یک سر زندگی کے کسی لمحہ میں سہل انگاری سے کام نہ لیا وہ توحید جس کی تبلیغ کرنے کے لیے قریش کی طرف سے مال ومنصب اور حسینہ عرب کا لالچ دیا گیا یہ سب سانحہ اس وقت رونما کیوں نہ ہوا۔۔دشمنان محمدؐ کا ان پر اس کا بہتان لگانا خود کفار کا چھچھوراپن اور نبی مکرم ﷺ کے تبلیغ توحید میں ثابت قدم ہونے کا واضح ثبوت ہے۔

لفظ غرانیق پر شیخ محمد عبدہ کی رائے: شیخ فرماتے ہیں کہ اہل عرب نے کبھی اپنے اشعار' اپنے خطبوں یا ادب پاروں میں لفظ غرانیق اپنے معبودوں کے لیے استعمال نہیں کیا۔کیوں کہ غرانیق اور غرنوق (دونوں الفاظ) سیاہ وسفید رنگت والے حسین آبی پرندہ کے لیے استعمال ہوتے ہیں مثلاً کلنگ و قاز وغیرہ۔یا یہ الفاظ سفید رنگ حسین نوجوان کے لیے آتے ہیں لیکن بتوں کے ساتھ ان لفظوں کی مطابقت غیر متعلق ہے۔

روایات میں لفظاً تطابق نہیں: اگر واقعہ غرانیق کا جدید علمی طریق سے تجزیہ کیا جائے تو ان روایات میں لفظاً تطابق نہیں پایا جاتا ہے۔مثلاً ایک روایت کے الفاظ ہیں۔

۱: تلك الغرانيق العلاوان شفاعتهن لترتجى

دوسری روایت میں الفاظ ہیں۔

۲: تلك الغرانقة العلاوان شفاعتهن ترتجی

تیسری روایت کے الفاظ ہیں

۳: الغرانقه العلاوان شفاعتهن ترتجی

چوتھی روایت کے الفاظ ہیں

۴: انها لهی الغرانیق العلاوان شفاعتهن ترتجی

پانچویں روایت کے الفاظ ہیں

۵: وانهن الغرانیق العلاوان شفاعتهن لهی التی ترتجی

یہ روایت ان الفاظ کے سوا دوسری کتب میں اور الفاظ سے منقول ہے اور متن کا اختلاف الفاظ روایت کے موضوع ہونے کے لیے کافی ہے جس طرح ابن اسحاق نے فرمایا ''اس روایت کے وضع کرنے سے دشمنان داعی اسلام کا مقصد آپ ﷺ کی صحت رسالت پر شک پیدا کرنا ہے۔سورہ النجم کی آیات کا سیاق بہ جائے واقعہ کے غلط ہونے کی ناقابل تردید دلیل ہے۔ترجمہ'' بے شک اپنے رب کی بہت بڑی نشانیاں دیکھیں تو کیا تم نے دیکھا لات اور عزیٰ اور اس تیسری منات کو کیا تم کو بیٹا اور اس کو بیٹی ، جب تو یہ سخت بھونڈی تقسیم ہے وہ تو نہیں مگر کچھ نام کہ تم نے اور تمھارے آباء نے رکھ لیے ہیں۔اللہ نے ان کی کوئی سند نہیں اتاری وہ تو نرے گمان اور نفس کی خواہشوں کے پیچھے ہیں حال آں کہ بے شک ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے ہدایت آئی''۔ یہ آیت وضاحت کے ساتھ دلالت کرتی ہے کہ لات ،عزی اور منات اپنی وضع قطع کے اعتبار سے بھی اس قدر بے مایہ ہیں کہ تم ہی نے انھیں تراشا اور ان کے نام اپنے بزرگوں سے سن سنا کر رکھ لیے اور کچھ خود بہ خود تجویز کر لیے۔کیا خدائے یکتا نے بھی اس پر دلیل تمھیں سپرد فرمائی؟ کیا اس وحدہ لاشریک نے بھی ان کی الوہیت پر تمھیں کوئی دلیل دی ہے؟ (حیات محمد۔۱۹۴۔۱۹۳)

اعتراض نمبر۲۱۳

غرانیق کے معتقدین اور موید ین سورہ الحج کا حوالہ دیتے ہیں کہ اس واقعہ کی تائید میں قرآنی آیات موجود ہیں۔پھر کیسے انکار؟ (مستشرقین مغرب کا انداز فکر۔۲۹۳)

جواب: یہ بات قابل غور ہے کہ سوچیں کہ یہ سورہ کب نازل ہوئی؟ کیا اس واقعہ کے فوراً بعد؟ جی نہیں ! یہ سورہ مدنی ہے۔ترتیب نزول کے اعتبار سے یہ ایک ۱۰۷ویں سورہ ہے۔مدینہ میں کل اٹھائیس سورتیں نازل ہوئیں۔اس سورہ کا نزول طوال سورتوں کے بعد ہوا جب نصف سے زیادہ مدنی دور گزر چکا تھا۔اگر غرانیق کا واقعہ کسی شکل میں ہوا مان لیں تو اس کو کم از کم بارہ سال گزر چکے تھے۔اگر یہ

آیات تائید میں نازل ہوئی تھیں تو کیا اس واقعہ کی تائید کی ضرورت بارہ سال کے بعد محسوس ہوئی تھی۔اگر یہ لغزش تھی تو لغزش کے اثرات کو دور کرنے کے لیے اس سورہ کی متعلقہ آیات اسی دور میں نازل ہونی چاہیے تھیں۔قرآن کی ایسی تمام آیات جو کسی واقعہ کے تعلق سے نازل ہوئیں وہ ہمیشہ موقع پر ہی نازل ہوئیں۔ذرا سورہ الحج کی آیات پر غور فرمائیے۔اس میں یہ کہاں کہا گیا ہے کہ شیطان انبیاء کی زبان سے کلمات خبیثہ ادا کرواتا ہے۔اس میں تو ایک کائناتی حقیقت بیان کی گئی ہے کہ ''جب رسول اور نبی پیغام حق لوگوں تک پہنچاتے ہیں تو شیطان اس کام میں وسوسے اور شبہات پیدا کرتا ہے۔اپنی جانب سے کچھ آمیزش کرتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ اپنے پیغام کو ان شیطانی شبہات سے' وسوسوں اور آمیزشوں سے منزہ کرتے ہیں کہ وہ علیم و حکیم ہیں''۔یہ آثار مقدسہ تو تاریخ نبوت اور اصول ابلاغ حق بیان کر رہی ہیں کہ آدم کے بعد ان کی تعلیمات نوح کے بعد ان کی تعلیمات اور اسی طرح دیگر انبیاء کی تعلیمات کو شیطان نے مسخ کیا اور جب بھی تعلیم حق مسخ ہوئی۔اللہ تعالیٰ نے محکم آیات نازل فرمائیں اور اپنی تعلیمات کو شیطانی آمیزش سے پاک کیا ۔یہ تو اس امر کی اطلاع ہے کہ آخری رسول کی تعلیمات کو بھی شیطان اسی طرح مسخ کرنے کی کوشش کرے گا جسے اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے ذریعے سے محفوظ رکھیں گے۔ان آیات کو واقعہ غرانیق سے متعلق کرنا اگر دیدہ دلیری نہیں ہے تو بھی غلط فہمی ضرور ہے۔(مستشرقین مغرب کا انداز فکر۔۲۹۳)

ولیم میور اور نولدیکی نے سورہ النجم کا نزول مکی دور کے چوتھے حصہ کے آخر میں قیاس کیا۔علامہ عنایت اللہ مشرقی نے تکملہ جلد اول ص ۶۷ پر نولدیکی کے حوالہ سے سورہ النجم کی ترتیب نزولی ۲۸ویں اور وقت نزول یکم سن نبوی تا ۴ سن نبوی کے درمیان بیان کیا ہے۔علمائے ازہر کے مطابق یہ سورہ ترتیب نزولی کے اعتبار سے تیئسویں ہے۔جب کہ سورہ مریم ۴۴ ہے۔ہم جانتے ہیں کہ دربار حبشہ میں حضرت جعفرؓ نے سورہ مریم کی آیات تلاوت کی تھیں۔لہٰذا یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ہجرت حبشہ تک ۴۴ سورتیں نازل ہو چکی تھیں اور سورہ النجم ہجرت حبشہ سے کئی برس پہلے اتر چکی تھی۔سورہ الحج ترتیب نزولی کے اعتبار سے (۱۰۷ویں) سورہ ہے۔مدینہ میں کل اٹھائیس سورتیں نازل ہوئیں۔اس سورہ کا نزول طوال سورتوں کے بعد ہوا جب نصف سے زیادہ مدنی دور گزر چکا تھا۔(مستشرقین مغرب کا انداز فکر ۲۹۳)

ترتیب نزولی کے اعتبار سے سورتوں کی مدت میں فرق ہے جب کہ کسی واقعہ سے متعلق قرآن کی آیات کا نزول ہوتا ہے۔ہمیشہ موقع پر ہوتا ہے۔سورہ النجم مکی دور میں نازل ہوتی ہے اور سورہ الحج مدنی دور میں تو کیا اس واقعہ کی تائید میں کئی سالوں بعد ضرورت محسوس ہوتی ہے۔نعوذ باللہ کئی سالوں تک بت پرستی کی طرف مائل رہے اور بعد میں ان دیویوں کی مذمت کر کے دین اسلام کی طرف پلٹ آئے۔اللہ تعالیٰ ایسی تحقیق و تفتیش سے بچائے!

اعتراض نمبر ۲۱۴

''واٹ'' کہتا ہے یہ ایک عجیب وغریب اور حیران کن داستان ہے۔ایسا لگتا ہے جیسے انتہائی بے لچک توحیدی مذہب لانے والا پیغمبر شرک کو سند جواز بخش رہا ہے۔فی الحقیقت یہ داستان اس قدر متحیر کر دینے والی ہے کہ بنیادی امور کی حد تک تو ضرور ہی مبنی بر حقیقت ہوگی۔ یہ بات قابل قیاس ہے کہ کسی ایک شخص نے یہ کہانی خود گھڑی اور مسلمانوں کی ایک تعداد کو اس واقعہ کی مقبولیت کے لیے بھی آمادہ کر لیا۔(محمد رسول اللہ۔۲۔۳۷)

جواب:اس کے جواب میں Torundrae ٹارانڈ رائے کا بیان لکھ دینا ہی کافی ہے۔شائد وہ اپنے ہمنوا کی بات مان لیں۔وہ کہتا ہے اس قسم کی لکھی ہوئی کہانی مشکل ہی سے قابل اعتماد کہی جا سکتی ہے۔وہ مزید کہتا ہے''موجودہ حیثیت میں شیطانی آیات کی ساری کہانی تاریخی اور نفسیاتی تضادات سے لبریز ہے۔''واٹ'' نے خود اپنی کتاب محمد ایٹ مکہ میں اس افسانے کو یہ کہہ کر نظر انداز کر دیا تھا کہ اس کی تفصیلات ہمارے اندر کوئی اعتماد پیدا نہیں کرتیں''۔ پھر ایک شوشہ چھوڑتا ہے اور اپنی پرانی چال بے ڈھنگی کی روش پر چل پڑتا ہے۔اور افسانے کی آڑ میں فن تفسیر کی اصطلاح ناسخ ومنسوخ کے حوالے سے یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ جس آیت کو جب کبھی مصلحت سمجھتے تھے اسے منسوخ کر دیا کرتے تھے اور اس میں عقیدہ توحید تک کو استثنیٰ حاصل نہ تھا''۔قرآن کریم کا ادنیٰ سا طالب علم بھی جانتا ہے کہ ناسخ ومنسوخ کا یہ مفہوم ہے اور نہ اس کا کوئی تعلق عقائد کے ساتھ ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے نسخ کی وضاحت کر دی جائے۔

نسخ کی تعریف:

نسخ ایک شے کو باطل کرنا اور دوسری شے کو اس کا قائم مقام کرنا ہے۔سورج نے سایہ مٹا دیا آیت کریمہ میں بھی نسخ کا یہی معنی ہے یعنی جس آیت کو منسوخ کر دیا یعنی اس کا حکم بدل دیا،علماء کی اصطلاح میں ناسخ اس طریق شرعی کو کہتے ہیں جو اس پر دلالت کرتا ہے کہ جو حکم پہلے طریق شرعی سے ثابت تھا اب وہ نافذ العمل نہیں رہا اور یہ (طریق شرعی) پہلے طریق شرعی سے موخر ہوتا ہے بایں طور کہ اگر یہ نہ ہوتا تو پہلا طریق شرعی ثابت رہتا۔نسخ کے لغوی معنی تبدیل کرنا اور شرع میں حکم مطلق کی انتہا بیان کرنا ہے۔

نسخ کی اقسام:

اس کی چار قسمیں ہیں۔اول قرآن کا قرآن سے،دوم: قرآن کا حدیث سے،سوم: حدیث کا حدیث سے چہارم: حدیث کا قرآن سے۔(شرح مسلم شریف جلد۲۔۶۹)

نسخ القرآن بالقرآن: اگر تم میں سے بیس صابر ہوں تو وہ دوسو پر غالب ہوں گے اور اگر تم سے سو صابر ہوں تو وہ ہزار کفار پر غالب ہوں گے کیونکہ کفار اپنی عقل سے ادراک نہیں کرتے اب اللہ تعالیٰ نے تم پر تخفیف فرمائی ہے اور اس نے تمہارے ضعف کو ظاہر کر دیا ہے، اگر تم میں سے سو صابر ہوں تو وہ دوسو پر غالب آئیں گے اگر ہزار ہوں تو دو ہزار پر۔ (انفعال ۶۶۔۶۵)

ان آیات سے ظاہر ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے ایک مسلمان کو دس کافروں کے ساتھ لڑنے کا مکلّف کیا پھر یہ حکم منسوخ کر کے ایک مسلمان کو دو کافروں کے ساتھ لڑنے کا مکلّف کیا۔

نسخ القرآن بالحدیث: یہ قسم انتہائی نازک اور اہم ہے منکرین حدیث فقہا کی توہین کرتے ہوئے اس قسم کا بہت پرچار کرتے ہیں اور یہ مغالطہ پیدا کرتے ہیں کہ خبر متواتر (لفظی) صرف ایک ہے باقی اخبار احاد ہیں۔ قرآن مجید جو کہ تواتر سے ثابت ہے خبر واحد سے کیسے منسوخ ہو سکتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس قسم سے یہ مراد نہیں کہ حدیث کے ذریعے متن قرآن کو یا اس کے عام حکم کو کلیۃً منسوخ کر دیا جائے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کے کسی عام حکم کے بعض افراد کو زبان رسالت سے خاص کر لیا جائے یہ تخصیص ہم تک جن اسانید سے پہنچی وہ متواتر نہیں لیکن جن لوگوں نے زبان رسالت سے یہ تخصیص سنی ان کے لیے وہ تخصیص ایسی ہی قطعی اور یقینی تھی جیسا کہ قرآن کریم کا قرآن ہونا قطعی اور یقینی ہے کیونکہ جس زبان سے کسی آیت کی تلاوت کر کے آپ ﷺ نے یہ بتلا دیا کہ یہ قرآن ہے اسی زبان سے یہ بتلایا کہ اس حکم عام سے فلاں فلاں شخص خاص کر لیے گئے ہیں مثلاً قرآن کریم نے عام حکم دیا کہ ہر مسلمان اپنی پسند کی چار شادیاں کر سکتا ہے (النساء۔۳) لیکن حضور ﷺ نے علیؓ کو اس حکم سے مستثنیٰ قرار دیا اور فرمایا علیؓ، حیات فاطمہؓ میں ابوجہل کی بیٹی سے شادی نہیں کر سکتے اسی طرح قرآن کریم نے عام حکم دیا کہ ہر نزاعی معاملہ میں دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی معتبر ہوگی۔ لیکن حضور ﷺ نے حضرت خزیمہؓ بن ثابت انصاریؓ کو اس حکم سے مستثنیٰ قرار دیا اور فرمایا کہ خزیمہ اکیلے کی گواہی دو کے برابر ہے۔

نسخ الحدیث بالحدیث: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا میں نے تم کو پہلے زیارت قبور سے منع کیا تھا سنو! قبروں کی زیارت کیا کرو: اس حدیث سے ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پہلے قبروں کی زیارت سے منع فرمایا بعد میں اس حکم کو منسوخ کر کے قبروں کی زیارت کا حکم دیا۔

نسخ الحدیث بالقرآن: قرآن کریم سے حکم حدیث کے منسوخ ہونے کی واضح مثال وہ حدیث ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کے معین کردہ قبلہ کو اللہ تعالیٰ نے بدل کر کعبہ کو قبلہ بنا ڈالا (شرع مسلم شریف کتاب المساجد۔۶۸ تا ۷۱)

اعتراض نمبر ۲۱۵

شوافع کہتے ہیں کہ قرآن کا نسخ حدیث سے مانا جائے تو لازم آئے گا کہ اللہ کے کلام کی سب سے پہلے تکذیب اس کے رسول نے کی اور اگر حدیث کا نسخ قرآن سے مانا جائے تو لازم آئے گا کہ رسول اللہ ﷺ کے کلام کی سب سے پہلے تکذیب اللہ تعالیٰ نے کی ہو۔

جواب: یہ دلیل اس لیے مخدوش ہے کہ شوافع نسخ القرآن بالقرآن مانتے ہیں اس صورت میں لازم آئے گا کہ قرآن کا سب سے پہلا مکذب خود اللہ تعالیٰ ہو نیز وہ نسخ الحدیث بالحدیث بھی مانتے ہیں اس طور پر لازم آئے گا کہ حدیث کا مکذب سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کا رسول ہو (العیاذ باللہ) دراصل ان حضرات نے نسخ کے معنی پر غور نہیں کیا نسخ کے معنی تکذیب نہیں "بیان" ہیں جیسا کہ نسخ کی تعریف میں بیان ہوا۔

اعتراض نمبر ۲۱۶

منکرین حدیث کا ایک اعتراض یہ ہے کہ سنت قرآن کریم کے کسی حکم کو منسوخ نہیں کر سکتی ہے۔

جواب: فقہا حنفیہ جس چیز کو "نسخ الکتاب بالسنہ کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں اس سے مراد دراصل قرآن کریم کے کسی حکم عام کو مخصوص کرنا اور اس کے ایسے مدعا کو بیان کرنا ہے جو اس کے الفاظ سے ظاہر نہ ہوتا ہو مثلاً سورہ بقرہ میں والدین اور اقربین کے لیے وصیت کا حکم دیا گیا تھا (آیت نمبر ۱۸۰) پھر سورہ النساء (۱۱۔۱۲) تقسیم میراث کے احکام نازل ہوئے اور فرمایا گیا کہ یہ حصے متوفی کی وصیت پوری کرنے کے بعد نکالے جائیں۔ نبی مکرم ﷺ نے اس کی وضاحت یہ فرما دی کہ "لا وصیۃ لوارث" یعنی اب وصیت کے ذریعے سے کسی وارث کے حصے میں کمی بیشی نہیں کی جا سکتی کیونکہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے وارثوں کے حصے خود مقرر فرما دیئے ہیں۔ ان حصوں میں اگر کوئی شخص وصیت کے ذریعے سے کمی بیشی کرے گا تو قرآن کا خلاف ہوگا اس طرح اس سنت نے وصیت کی اجازت عام کو، جو بظاہر قرآن کی ان آیات سے مترشح ہوتی ہے، غیر وراث مستحقین کے لیے خاص کر دیا اور یہ بتا دیا کہ شرعاً جو حصے وارثوں کے مقرر کر دیئے ہیں ان میں کمی بیشی کرنے کی وصیت کی اس اجازت عام سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔

اسی طرح قرآن کی آیت وضو (المائدہ۔۵:۶) میں پاؤں دھونے کا حکم دیا گیا تھا جس میں کسی حالت کی تخصیص نہ تھی۔ نبی مکرم ﷺ نے مَسحَ عَلَ الخفین " پر عمل کر کے اور اس کی اجازت دے کر واضح کر دیا کہ یہ حکم کس حالت کے لیے ہے جب آدمی موزے پہنے ہوئے نہ ہو اور موزے پہننے کی صورت میں پاؤں دھونے کی بجائے مسح کرنے سے حکم کا منشاء پورا ہو جاتا ہے اس چیز کو گواہ نسخ کہا جائے ، یا تخصیص یا بیان۔ اس سے مراد یہی ہے اور یہ اپنی جگہ بالکل معقول اور صحیح چیز ہے۔ پرویز بعض صریح احکام

کو محض اپنے ذاتی نظریات کی بنیاد پر عبوری دور کے احکام قرار دیتے ہیں جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ عبوری دور جب ان کی رائے نامبارک میں گزر جائے گا تو قرآن کے وہ احکام منسوخ ہو جائیں گے۔(جناب پرویز قرآن کریم کے قانون وراثت اوران تمام احکام کو جن سے صریحاً کسی شخصی ملکیت کا جواز ثابت ہوتا ہے عبوری دور کے احکام قرار دیتے ہیں۔ان کے نزدیک قرآن کریم کے یہ تمام احکام اس وقت منسوخ ہو جائیں گے جب ان کا اپنا تجویز کردہ ''نظام ربوبیت قائم ہوگا۔(حاشیہ سنت کی آئینی حیثیت۔ص۔۴۷)

اکابرین علماء کی رائے: اس روایت کے بارے میں امام محمد بن اسحاق نے فرمایا: یہ روایت زندیقوں کی گھڑی ہوئی ہے۔

۲: امام بیہقی نے فرمایا: یہ قصہ صحیح نقل سے ثابت ہی نہیں اور جن راویوں نے اسے نقل کیا ہے سب مطعون ہیں۔صحاح ستہ میں اور دیگر احادیث کی مشہور کتب میں اس کا نام ونشان نہیں ہے۔اس لیے اس کو ردی چیز کی طرح پھینک دینا ضروری ہے۔

۳: ابن حبان فرماتے ہیں کہ اسی لیے میں نے اپنی تفسیر کو اس کے بیان سے آلودہ نہیں کیا۔مجھے ان لوگوں پر حیرت ہے کہ انھوں نے اپنی تالیفات میں اس واقعہ کو لکھنے کی کیسے جسارت کی حال آں کہ قرآن کریم کی ان آیات کی وہ تلاوت کرتے ہیں۔اس سورہ النجم کے آغاز میں ہے۔''قسم ہے اس (تابندہ) ستارے کی جب وہ نیچے اترا تمھارا (زندگی بھر کا ساتھی) نہ راہِ حق سے بھٹکا اور نہ بہکا اور وہ تو بولتا ہی نہیں اپنی خواہش سے۔نہیں ہے یہ مگر وحی جو ان کی طرف کی جاتی ہے۔(النجم۔۴) کیا ان آیات کی روشنی میں ایسے قبیح کلمات زبان سے نکلے ہوں گے۔دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے محبوب کریمؐ کو یہ اعلان کرنے کا حکم فرمایا'' قُل مَا یکُونُ'' ۔فرمایا مجھے اختیار نہیں کہ ردوبدل کروں اس میں اپنی مرضی سے' میں نہیں پیروی کرتا (کسی چیز کی) بہ جز اس کے جو وحی کی جاتی ہے میری طرف۔اللہ تعالیٰ نے واضح الفاظ میں یہ اعلان کر دیا''اگر وہ خود گھڑ کر بعض باتیں ہماری طرف سے منسوب کرتا ہے تو ہم اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے۔پھر ہم کاٹ دیتے اس کی رگ دل''۔ ۶۹۔۴۶۔۴۴)

کیا اس ارشاد خداوندی کے بعد اس بات کا گمان بھی کیا جا سکتا ہے؟۔پھر لکھتے ہیں کہ یہ قرآنی نصوص وقطعیہ میں جو آنحضرت ﷺ کی عصمت پر دلالت کرتی ہیں۔اس کے بعد لکھتے ہیں کہ قطعی طور پر یہ روایت من گھڑت ہے کیوں کہ اگر ایسا ہونا ممکن ہوتا تو تمام احکام، آیات اور سارا دین مشکوک ہو جاتا۔

۴: علامہ قرطبی نے قاضی کا قول نقل کیا ہے''یعنی امت کا اس پر اجماع ہے کہ تبلیغ کلام الٰہی میں حضورؐ سے غلطی نہیں ہو سکتی نہ قصداً نہ عمداً نہ سہواً اور نہ غلطاً۔اس میں ہر نبی معصوم ہے۔علامہ قرطبی لکھتے ہیں کہ یہ روایت ضعیف ہے اس لیے اس کی تاویل کی بھی ضرورت نہیں ہے۔آخر میں فرماتے ہیں کہ اگر

اس روایت کی کوئی سند صحیح بھی ثابت ہو جائے تو بھی وہ ضعیف ہے اور نا قابل اعتبار ہو گی کیوں کہ قرآنی آیات کے صریحاً خلاف ہے۔

۵: علامہ آلوسیؒ نے امام ابو منصور تریدی کا یہ قول نقل کیا ہے ''تلک الغرانیق العالیٰ'' والی بات یہ ان باتوں میں سے ایک بات ہے جو شیطان اپنے زندیق پیرو کاروں کے دلوں میں ڈالتا ہے تا کہ لوگوں کو اسلام سے برگشتہ کرے۔ جناب رسالت مآب اس قسم کی روایتوں سے مبرا و منزہ ہیں۔ وَمَا ینطق عن الھوی ان ھوالا وحی یوحیٰ'' ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کے محبوب کے بارے اللہ تعالیٰ کی شہادت ہے جو ان دو آیات میں مذکور ہے۔ دوسری طرف یہ روایت ہے کہ معاذ اللہ حضورؐ نے ان بتوں کی شان میں یہ جملے کہے'' تلک الغرانیق الخ''۔ دوسری بات یہ کہ ان آیات پر نظر ڈالیے جو ان جملوں (تلک الغرانیق) کے بعد اس روایت کے مطابق تلاوت کی گئیں، کیا ان بتوں کی یہ مذمت جو ان آیات میں کی گئی ہے کفار کے لیے قابل قبول تھی۔ ترجمہ: نہیں نہیں یہ مگر محض نام رکھ لیے ہیں تم نے اور تمھارے باپ دادا نے نہیں نازل کی اللہ نے ان کے بارے کوئی سند نہیں پیروی کر رہے ہے یہ لوگ مگر گمان کی اور جیسے ان کے نفس چاہتے ہیں۔ (طہٰ ۵۳۔۲۳)

صاحب ضیاء النبی شیخ محمد عبدہ کے حوالہ سے لکھتے ہیں'' بے شک محمد عبدہ کی بڑی صائب رائے ہے کہ عصمت انبیاء کے عقیدے کو کوئی مرفوع روایت بھی مجروح نہیں کر سکتی، کجا یہ کہ کسی مرسل روایت کو مقام دیا جائے۔ (ضیاء النبی ج ۲۔ ۳۴۸۔۳۵۵)

۶: محمد حسین ہیکل مذکورہ آیات کے بارے میں لکھتے ہیں'' اگر ہم ان آیات میں غرانیق کا دخل تسلیم کر تے ہیں تو اس صورت میں اس آیت کے معنوں میں تضاد ہو گا کیوں کہ اس طرح تو ایک جملے میں ان کی تعریف ہو گی اور اس کے بعد مسلسل چار آیتوں میں مذمت۔ قرآن اس اضطراب تناقض اور آشفتہ بیانی کا کیا متحمل ہو سکتا ہے جس کی بلاغت کمال کی لا انتہا بلندیوں پر ہے؟ قرآن تو قرآن کوئی سمجھ دار آدمی بھی اس حرکت کا مرتکب نہیں ہو سکتا کہ ایک ہی سانس میں دو مختلف المعنی متضاد باتیں کہے۔ (حیات محمد۔ ۱۹۵) لہٰذا ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ تداخل غرانیق ملحدوں کا من گھڑت قصہ ہے اس سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں یہی وجہ ہے کہ جب ابن اسحٰق سے اس کی صحت کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا، یہ واقعہ زندیقوں کا گھڑا ہوا ہے۔ ص ۱۹۱ پر مصنف مذکور لکھتا ہے'' یہ واقعہ انبیاء کی عصمت کے منافی ہے۔ وہ جس کو قریش الصادق ولامین کہیں اور کوہ صفا پر آپ کے سوال کا جواب یوں دیں کہ اے محمدؐ! ہم آپ کی یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ آپ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا تو اب ان سے یہ منسوب کرنا دوغلی پالیسی ہے۔

مفسرین کی آراء: اس واقعہ غرانیق کو قاضی ابو بکر ابن العربی نے دس وجوہ سے اس روایت کو باطل کیا ہے۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب نبی کے پاس فرشتہ کو وحی دے کر بھیجا جاتا ہے تو اس میں علم

پیدا کرتا ہے جس سے وہ جان لیتا ہے کہ یہ فرشتہ ہے ورنہ نبی کو کیسے یقین ہوگا کہ یہ اللہ کی وحی ہے، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ شیطان اگر کچھ کلمات پڑھے اور آپ ﷺ کو پتہ نہ چلے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اہل اسلام کا اس پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو کفر وشرک سے معصوم رکھا ہے اور جو شخص ایک آن کے لیے بھی آپ ﷺ پر کفر کو جائز رکھے وہ خود دائرہ اسلام سے خارج ہے اسی طرح باقی وجوہات بیان کر کے آخر میں فرماتے ہیں کہ یہ تمام روایات باطل ہیں، ان کی کوئی اصل نہیں ہے۔ علامہ نسفی اس روایت کو رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگر آپ ﷺ نے یہ کلمات عمداً کہے تو یہ باطل ہے کیونکہ یہ کفر ہے اور اگر شیطان نے بزور آپ ﷺ کی زبان سے یہ کلمات جاری کرائے تو یہ بھی محال ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے " اِنَّ عِبَادِی لَیسَ لَكَ عَلَیهِم سُلطَانٌ" (اسرا۔۶۵) ترجمہ: بے شک شیطان تجھے میرے خاص بندوں پر تسلط نہیں ہوسکتا۔" تو حضور ﷺ پر بطریق اولیٰ تسلط نہیں ہوگا اور غفلت کی وجہ سے یہ کلمات نبی مکرم ﷺ کی زبان سے نکل گئے یہ بھی محال ہے کیونکہ وحی پہنچاتے ہوئے اس قسم کی غفلت آپ ﷺ پر جائز نہیں ہے ورنہ شریعت سے بالکلیہ اعتماد اٹھ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے" لَا یَاتِیهِ البَاطِلُ مِن بَینِ یَدَیهِ وَلَا مِن خَلفِهِ (السجدہ۔۴۲) ترجمہ" (قرآن میں) باطل نہ سامنے سے آسکتا ہے نہ پیچھے سے" یعنی غیر قرآن، قرآن میں شامل نہیں ہوسکتا اور اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔ اللہ فرماتا ہے "اِنَّا نَحنُ نَزَّلنَا الذِّکرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُونَ " (الحجر۔۹)" ترجمہ ہم نے قرآن مجید کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں"۔

امام رازی کہتے ہیں کہ شیطان آپ ﷺ کی زبان سے وہ کلمات کہلوا دے جو قرآن نہیں، تو شریعت سے بھروسہ اور اعتماد اٹھ جائے گا اور ہر آیت میں یہ احتمال ہوگا کہ یہ شائد غیر قرآن ہو اور یہ بداہتاً باطل ہے۔

علامہ احمد حسین بیہقی نے فرمایا کہ از روے روایت یہ قصہ درست نہیں ہے اور اس کے تمام راوی مطعون ہیں اور صحاح اور حدیث کی دیگر معتبر کتب میں یہ قصہ نہیں ہے اور اس قصہ کو پھینک دینا واجب ہے اس لیے میں نے اسے اپنی کتاب کو اس قصہ کے ذکر سے پاک رکھا ہے جن لوگوں نے اس قصہ کو نقل کیا ہے ان پر تعجب ہے کہ ایک طرف تو وہ قرآن مجید میں یہ آیت تلاوت کرتے ہیں' وَالنَّجمِ اِذَا هَوٰی ہ مَا ضَلَّ صَاحِبُکُم وَمَا غَوٰی ہ وَمَا یَنطِقُ عَنِ الهَوٰی ہ اِن هُوَ اِلَّا وَحیٌ یُّوحٰی (النجم۔۱تا۴) ترجمہ "قسم ہے روشن ستارے کی جب وہ زمین پر اترا۔ تمہارے آقا نہ کبھی گمراہ ہوئے اور نہ بے راہ چلے اور وہ اپنی خواہش سے کلام نہیں فرماتے، ان کا فرمان صرف اس وحی سے ہوتا ہے جو ان کی طرف کی جاتی ہے۔" اور یہ آیت بھی پڑھتے ہیں" قُل مَا یَکُونُ لِی اَن اُبَدِّلَهٗ مِن تِلقَاءِ نَفسِی اِن اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوحٰی

اِلَیَّ" (یونس۔۱۵) ترجمہ "مجھے حق نہیں کہ میں اپنی طرف سے قرآن کو بدل دوں میں صرف اس کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔" یہ پڑھتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی طرف یہ بھی منسوب کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے قرآن مجید پہنچاتے ہوئے کچھ اور کلمات ملا دیئے ہیں۔

اہم نکتہ: حافظ ابن حجر عسقلانی نے یہ تاویل کی کہ شیطان نے نبی ﷺ کی آواز کے مشابہ آواز میں کلمات کہے اور سننے والوں نے یہ سمجھا کہ آپ ﷺ نے یہ کلمات کہے، لیکن یہ تاویل درست نہیں کیونکہ جس طرح شیطان آپ ﷺ کی مثل نہیں بن سکتا اسی طرح آپ ﷺ کی آواز کی مثل بھی نہیں بنا سکتا کیونکہ مماثلت کی نفی یا اس وجہ سے ہے کہ ہدایت اور گمراہی میں اشتباہ نہ ہو یا تعظیم کی وجہ سے ہے اور اگر شیطان آپ ﷺ کی آواز کی مثل پر قادر ہو تو یہ تعظیم کے خلاف ہے اور اگر شیطان آپ کی آواز کی نقل اتار سکے اور لوگ شیطان کی آواز کو آپ ﷺ کی آواز سمجھ لیں تو ہدایت' گمراہی کے ساتھ مشتبہ ہو جائے گی۔

مقاطعہ قریش

رفتہ رفتہ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا چند نفوس قدسیہ حضرت عمرؓ اور حضرت حمزہؓ جیسے جری، نڈر، صائب الرائے اور پختہ عزم وعقیدہ کے مالک تھے۔ یہ نامور اور شہرت یافتہ لوگ تھے یہ بنیادی حیثیت رکھتے تھے۔ ہمالیہ پہاڑ کا اپنی جگہ سے ٹل جانا ممکن تھا لیکن ان کا اپنے موقف سے ہٹ جانا ناممکن تھا۔ صحابہ کرام کو جس قدر تشدد کا نشانہ بنایا کفار کو منہ کی کھانا پڑی اور جتنی شدت سے ناروا ظلم اور بہیمانہ سلوک روا رکھا گیا وہ اسی قدر ناکام اور نامراد ہوئے۔ کفار کے عزیز واقارب ایک ایک کر کے اسلام قبول کر رہے تھے۔ کلمہ حق کی صدا بلند کرنے اور اسلام کو سینے سے لگانے میں جو کچھ مسلمانوں پر بیتی اس کے تصور سے انسان لرزہ براندام ہو جاتا ہے۔ صحابہ کرام کے بجز حضور ﷺ بھی قریش کی ایذاء رسانیوں سے محفوظ نہ تھے کفار کے تیار شدہ (ready made) اور آموختہ بچے آپ ﷺ پر پتھر برساتے اور گالیاں بکتے، کبھی مجنون وساحر اور کبھی کاہن وشاعر کہہ کر تمسخر اڑاتے، آپ ﷺ پر کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا، اونٹ کی اوجھڑی آپ ﷺ کی پشت پر حالت نماز میں ڈال دیتے بعض دشمن راہ میں کانٹے بچھاتے حتی کہ طائف میں انسانیت سوز ظلم کیا آوارہ لڑکوں کو پیچھے لگایا وہ آوازیں کستے، پتھر پھینکتے جس سے آپ ﷺ لہولہان ہو گئے اور خون سے جوتے بھر گئے۔ کسی نے چادر گلے میں ڈال کر بل کس دیئے کہ آنکھیں باہر نکل آئیں۔ اسلام سے برگشتہ کرنے کے لیے دنیا بھر کے جتن کیے۔ جب ہر حربہ اور ظلم وستم میں بجھا ہر تیر آزما چکے اور دیکھ لیا کہ آپ ﷺ کی عزیمت واستقامت میں رتی برابر فرق نہ آیا تو سر جوڑ کر بیٹھے تا کہ اس کا حل تلاش کیا جا سکے اور سابقہ ناکامیوں کا بھی ازالہ ہو سکے۔ بالآخر وہ آپ ﷺ کے چچا ابو طالب کے پاس چلے آئے اور کھری کھری سنا دی کہ ہم تمہارے بھتیجے سے بہت کچھ سن چکے

ہیں۔ ہمارے آباؤ اجداد کی عزت و عظمت خاک بوس ہو چکی ہے۔ اب مزید سننے کی ہمت نہیں رہی اور کچھ بھی سہا نہیں جائے گا۔ پیمانہ صبر لبریز ہو چکا ہے۔ لہٰذا اب دو باتیں ہیں ان میں سے ایک کو، جو جی چاہے انتخاب کر لیں۔ پہلی یہ کہ محمد ﷺ کو ہمارے حوالے کر دو تا کہ ہم اس سے اپنی توہین و رسوائی کا بدلہ لے سکیں اور دوسری یہ کہ مقاطعہ کے لیے تیار ہو جاؤ، یہ ہمارا متفقہ فیصلہ ہے اور اس وقت تک صلح نہیں ہو گی جب تک آپ ﷺ کو ہمارے حوالے نہ کر دیں۔ معاہدہ میں یہ طے پایا کہ

۱۔ کوئی شخص بنو ہاشم کے خاندان سے شادی و بیاہ نہیں کرے گا۔

۲۔ کوئی شخص ان لوگوں کے ساتھ میل جول، سلام و کلام، ملاقات اور بات تک نہیں کرے گا

۳۔ کوئی شخص ان کے ہاتھ سے کسی قسم کا سامان خرید و فروخت نہیں کرے گا۔

۴۔ کوئی شخص ان کے پاس خورو نوش کا سامان نہیں جانے دے گا۔

۵۔ علامہ برہان الدینؒ نے سیرت میں لکھا کہ معاہدہ میں یہ طے پایا تھا کہ بنو ہاشم کو بازاروں میں آنے سے روکا جائے گا۔

۶۔ تاریخ ذہبی میں ہے کہ بنو ہاشم کو اپنے محلوں میں نہیں بٹھائیں گے۔

۷۔ اس مقاطعہ کی تحریر لکھ کر کعبہ کے دروازے پر آویزاں کر دی گئی۔ اس پر تمام روسائے قریش کے دستخط ثبت تھے گویا اس معاہدہ سے انحراف کی کوئی گنجائش نہ رہی۔ اس معاہدہ کو منصور بن عکرمہ نے لکھا اس بدنصیب کاتب کا ہاتھ شل ہو گیا جس ہاتھ سے اس نے تحریر کیا تھا۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

یار گو دوست بود جملہ جہاں دشمن باش
بخت گو پشت مدہ روئے زمین لشکر گیر

ترجمہ: (جب محبوب دوست ہو تو پرواہ نہیں خواہ جہان سارا دشمن بن جائے۔ اگر بخت مدد کرے تو پرواہ نہیں سارا زمانہ لشکر کشی کرے)

سید امیر علی (روح اسلام۔۱۲۱) لکھتے ہیں کہ اس معاہدہ سے بنی ہاشم والمطلب خوف زدہ ہوئے اور اس اندیشے سے کہ مبادا یہ کسی مزید حملے کا پیش خیمہ ہو، انہوں نے یہ مناسب سمجھا کہ اپنے گھروں کو چھوڑ کر جو شہر میں جا بجا بکھرے ہوئے تھے ایک جگہ جمع ہو کر رہیں۔ چنانچہ ابولہب کے سوا سارے شعب ابی طالب میں چلے گئے جو مکہ کی مشرقی مضافات میں ایک لمبی اور تنگ گھاٹی ہے جسے چٹانوں اور دیواروں نے شہر سے جدا کر رکھا ہے۔ اور جہاں سے شہر میں آمد و رفت کا ایک چھوٹے سے دروازے کے سوا کوئی راستہ نہیں۔ بنی ہاشم و بنی مطلب ابوطالب کے پاس آئے اور وہ ان لوگوں کو اور رسول اللہ ﷺ کو لے کر شعب ابی طالب چلے گئے اس شعب میں تقریباً تین سال گزارے۔

شعب ابی طالب میں آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے دیگر اہل خاندان کا تین سال تک محصور رہنا سیرت نبوی کا ایک اہم اور غور طلب واقعہ ہے۔ اس کی اہمیت تو اس لیے واضح ہے کہ کفار قریش اور مخالفین اسلام نے تحریک اسلامی کو دبانے، مٹانے اور ختم کرنے کے لیے جو حربے استعمال کیے اور نبی ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کو انتہائی سخت اذیتیں پہنچانے کی جو صورتیں اختیار کیں۔ ان میں سے ایک صورت یہ واقعہ بھی ہے۔ جس زمانے میں یہ واقعہ پیش آیا آپ ﷺ کو نبوت ملے چھ سال گزر چکے تھے لیکن اس سارے عرصے میں انتہائی ناروا سلوک کے باوجود قریش نے آنحضرت ﷺ کے خلاف کبھی اس سے زیادہ سخت اقدام نہیں کیے تھے۔ بلاشبہ مصائب و آلام کا دور ما قبل بھی قریش کی ظالمانہ تاریخ کا ایک حصہ ہے جس میں ترغیب و ترہیب کا ہر انداز ملتا ہے لیکن ایک حلف نامے کے ذریعے حضور ﷺ اور خاندان بنو ہاشم کا معاشی و معاشرتی مقاطع کرنا سخت الم انگیز اور کافرانہ سیاست کی انتہائی شاطرانہ چال تھی جس کے نتائج ان کی توقع کے مطابق تو نہ نکلے لیکن بہر حال اس کے ذریعے تین سال تک داعی اسلام ﷺ اور بنو ہاشم کو عذاب میں مبتلا رکھا گیا۔

اور یہ واقعہ غور طلب اس لیے ہے کہ اگرچہ اس کا ذکر کم و بیش ہر قدیم و جدید سیرت نگار نے کیا لیکن جس انداز سے کیا ہے اور جو تفصیلات فراہم کی ہیں ان سے بدیہی طور پر یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ جب قریش نے بنو ہاشم کا مقاطع کرایا تو اس کے بعد تین سال تک بنو ہاشم کو واقعی محصوری اور نظر بندی کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے بیانات سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ بنو ہاشم کی رہائش الگ کسی مقام پر تھی۔ (جیسا اوپر سید امیر علی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور محصوری کا واقعہ دوسرے مقام شعب ابی طالب میں پیش آیا جس کی صورت یہ ہوئی کہ بنو ہاشم اس اعلان مقاطعہ کے بعد مکہ سے نکلے اور سامان خور و نوش باندھ کر وہاں جا بیٹھے اور اپنے پر باہر نکلنے کے سارے دروازے بند کر لیے پھر جب تین سال بعد معاہدہ ختم ہوا تب یہ لوگ وہاں سے نکل کر دوبارہ اپنی رہائش گاہوں میں منتقل ہوئے حالانکہ کم و بیش کسی سیرت نگار نے یہ تصریح نہیں کی کہ بنو ہاشم کی رہائش کس جگہ تھی اور شعب ابی طالب کہاں اور ان کی اصل رہائش گاہ سے کتنے فاصلے پر واقع تھا۔ یہ صورت حال اس بات کا تقاضہ کرتی ہے کہ مندرجہ ذیل مسائل پر غور کیا جائے:

۱۔ شعب ابی طالب میں محصوری کیوں ہوئی بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں مقاطعہ کیوں کیا گیا؟

۲۔ مقاطعہ صرف بنو ہاشم کا کیوں کیا گیا۔؟

۳۔ شعب ابی طالب کیا ہے اور کہاں واقع ہے؟

۴۔ مقاطعہ کی نوعیت کیا تھی؟

۵۔ مقاطعہ کیسے ختم ہوا؟

ہم اسی ترتیب سے ان مسائل کا جائزہ لیں گے۔

جہاں تک مقاطع کا تعلق ہے، اس میں کوئی ابہام یا پیچیدگی نہیں پائی جاتی۔ سیرت کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ کفار قریش کی چھ سال سے زائد کی معاندانہ کوششیں آپ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کے پائے ثبات میں برائے نام بھی اضمحلال پیدا نہ کرسکی تھیں۔ دھمکی اور لالچ کا ہر وار ہدف سے دور اور سختی و نرمی کا ہر حربہ کند ہو چکا تھا بلکہ تماشہ یہ تھا کہ تحریک کو دبانے کی ہر کوشش الٹا اس کے فروغ کا باعث بن جاتی تھی یہاں تک کہ دعوت حق سے مکہ کے دشت وجبل گونج اٹھے اور حبشہ کے سرکار و دربار تک اعلان حق پہنچ گیا۔ پھر حضرت ابوبکرؓ و عثمانؓ و حضرت حمزہؓ اور بالآخر حضرت عمرؓ جیسے بااثر افراد مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے یہ سب حالات مشرکین و کفار کو برافروختہ کرنے کے لیے کافی تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ نبی ﷺ کے چچا ابو طالب صاحب ایمان نہ ہونے کے باوجود داعی اسلام ﷺ کی پشت پناہی کر رہے تھے اور ان کی موجودگی میں آپ ﷺ کا ہاتھ ڈالنا یقیناً ایک مشکل امر تھا غرض ان اسباب نے اہل قریش کو مقاطعہ کا سخت قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا جس سے ان کا اصل مقصد یہ تھا کہ انتہائی سختیوں سے گھبرا کر یا تو خود نبی اکرم ﷺ اپنی دعوت سے دست بردار ہو جائیں گے یا بصورت دیگر (مومن و کافر) اہل خاندان ان مصائب و آلام کو برداشت کرنے کے مقابلے میں آپ ﷺ کو قریش کے حوالے کرنے میں زیادہ عافیت محسوس کریں گے۔ چنانچہ قریش کے اس مقصد کی توضیح اس معاہدہ میں موجود ہے جس کے ذریعے انہوں نے بنو ہاشم کو یہ سزا دی تھی اور خاص طور پر یہ بات کہ یہ معاہدہ اس وقت تک رہے گا جب تک کہ (یسلموا الیھم النبی صل اللہ علیہ وسلم) یعنی بنو ہاشم نبی ﷺ کو قتل کے لیے قریش کے حوالے نہ کر دیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ:

الف۔ قریش نے یہ مقاطعہ صرف تین سال کے لیے نہیں کیا تھا بلکہ غیر معینہ مدت کے لیے اور اس وقت تک کے لیے تھا جب تک کہ بنو ہاشم نبی ﷺ کو قریش کے حوالے نہ کر دیں۔ یہ محض اتفاق ہے کہ خدا کی کرشمہ سازی سے دیمک اس معاہدہ کو چاٹ گئی یا کچھ لوگوں نے جرات و بہادری سے کام لے کر اس ظالمانہ معاہدے کو ختم کرانے کی سنجیدہ کوشش کی تھی ورنہ ایک غیر معینہ مدت تک مقاطعہ کا نتیجہ کچھ بھی نکل سکتا تھا۔ ممکن تھا کہ بنو ہاشم حضور ﷺ کو دشمنوں کے حوالے کر دیتے۔ ممکن تھا کہ سارے بنو ہاشم جوش حمیت میں مسلمان ہو جاتے اور یہ بھی ممکن تھا کہ خود قریش اس معاہدہ پر زیادہ دیر تک متحد و متفق نہ رہ سکتے بہر حال یہ بات طے ہے کہ مذکورہ بائیکاٹ غیر معینہ مدت کے لیے تھا۔

ب۔ قریش کا اصل مقصد یہ تھا کہ بنو ہاشم کی پشت پناہی سے دست بردار ہو کر آپ ﷺ کو ان کے حوالے کر دیں تاکہ وہ آپ ﷺ کے خلاف من مانی کارروائی کر سکیں۔

۲۔ اس مرحلے پر یہ سوچنا چاہیے کہ قریش نے ترک موالات کا معاملہ صرف بنو ہاشم کے ساتھ ہی

کیوں مخصوص رکھا دوسرے اہل ایمان جن کا تعلق عرب کے مختلف قبائل سے تھا اس سے مستثنیٰ اور کسی قسم کی پابندی سے آزاد کیوں تھے؟ دوسرے الفاظ میں مقاطعہ کے دائرے میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ دوسرے تمام مسلمانوں کو شامل کیوں نہ کیا گیا ہمارے خیال میں اس کی مندرجہ ذیل وجوہ ہیں:

الف۔ نبی رحمت ﷺ خاندان بنو ہاشم سے تعلق رکھتے تھے۔ قریش کی دشمنی کا ہدف اصل میں آپ ﷺ ہی کی ذات تھی پھر وہ خاندان ہی ان کی نگاہ میں مبغوض بن گیا جس سے آپ ﷺ کا تعلق تھا یہ ایک عام قاعدہ ہے کہ اگر کسی کے نزدیک کوئی شخصیت محبوب ہو تو اس سے متعلقہ دوسری اشیاء بھی محبوب ہو جاتی ہیں اور اس کے برعکس اگر نفرت ہو تو پھر اس سے تعلق رکھنے والی ہر چیز ناپسندیدہ اور مکروہ قرار پاتی ہے۔

ب۔ آپ ﷺ کے بعد دوسرے درجے میں دشمنی ابو طالب سے تھی جو اپنے بھتیجے کی (ان کے خیال میں) حمایت بے جا کر رہے تھے اور جنہوں نے آپ ﷺ کی حمایت کو ہاشمی وقار کا مترادف قرار دے کر بجز ابولہب کے تمام مومن و کافر بنو ہاشم کو اپنا ہمنوا بنالیا تھا۔

ج۔ آپ ﷺ کو کفار قریش کے حوالے کر لینے کی ذمہ داری قبائلی دستور کے مطابق بنو ہاشم کی تھی جس سے حضور ﷺ کے چچا اور بنو ہاشم کے سردار ابو طالب نے صاف انکار کر دیا تھا اور یہاں تک جواب دے دیا تھا کہ ''ہم محمد ﷺ کو اس وقت دشمن کے حوالے کریں گے جب ان کے گرد لڑ کر مر جائیں اور ہم اپنے بیٹوں اور بیویوں سے بھلا دیئے جائیں''۔ اس بناء پر آپ ﷺ تو ان کے براہ راست مجرم تھے ہی، بنو ہاشم اور ابو طالب بھی بالواسطہ طور پر مجرم بن گئے۔ اس لیے قریش چاہتے تھے کہ حضور ﷺ کی حمایت بے جا کا ان سب کو مزہ چکھائیں۔

د۔ چونکہ اہل ایمان کا تعلق عرب کے مختلف قبائل سے تھا اس لیے اگر قریش تمام مسلمانوں کا بیک وقت مقاطعہ کر دیتے تو معاملہ یہ ہوتا کہ وہ کس کس سے جنگ مول لیتے اور پھر کون کون ان کا شریک معاہدہ ہوتا۔ آخر عصبیت جاہلیت کا معاملہ تھا اس بناء پر مقاطعہ کو انہوں نے صرف بنو ہاشم تک محدود رکھا۔

ہ۔ اس مقاطعہ کے ذریعے وہ عام مسلمانوں کو بنو ہاشم (دراصل نبی ﷺ) سے کاٹ کر الگ کرنا چاہتے تھے تاکہ دوسرے مسلمان اور آپ ﷺ ممکن حد تک ایک دوسرے سے غیر متعلق رہیں، آزدانہ میل جول نہ رکھ سکیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ قریش کے خلاف متحدہ محاذ نہ بنا سکیں۔ اس میں ایک فائدہ ان کے لحاظ سے یہ بھی تھا کہ سب پر الگ الگ سختیاں کرنے میں آسانی ہو گی اور اس طرح اجتماعی مظلومیت میں جو ڈھارس بندھ جاتی ہے وہ باقی نہ رہے گی۔

و۔ قریش یہ گمان رکھتے تھے کہ اگر بنو ہاشم کے بارے میں مقاطعہ کا تجربہ کامیاب ہو گیا تو پھر دست تظلم رفتہ رفتہ دوسرے قبائل کے مسلمانوں تک دراز کر دیا جائے گا گویا یہ پہلا تجربہ تھا جسے اگلے

ظالمانہ تجربات کی بنیاد بنایا جاسکتا تھا بہرحال ان اسباب و مصالح کے پیش نظر قریش نے بنو ہاشم پر اس مقاطعہ کو نافذ کردیا جو اتفاقاً تین سال تک جاری رہ سکا۔

۳۔ لمحہ بھر کے لیے شعب ابی طالب پر نظر ڈالی جائے۔ شعب ابی طالب دراصل مکہ معظّمہ کے محلے کا نام تھا جس میں بنو ہاشم رہا کرتے تھے اور وہ ان کا موروثی تھا۔ شعب عربی زبان میں درہ یا گھاٹی کو کہتے ہیں چونکہ یہ محلّہ کوہ ابوقبیس کی گھاٹیوں میں سے ایک گھاٹی میں واقع تھا اور ابوطالب بنو ہاشم کے سردار تھے اس لیے اسے شعب ابی طالب کہا جاتا ہے۔ یہاں یہ وضاحت بے جا نہ ہوگی کہ شائد شعب کے لفظ سے لوگوں کو بالعموم یہ مغالطہ ہوا ہے کہ یہ اصل رہائش گاہ سے دور کوئی پہاڑی درہ ہوگا جہاں جا کر بنو ہاشم محصور و نظر بند ہو گئے، حالانکہ مکہ کے طبعی حالات جاننے والا ہر شخص اس حقیقت کا علم رکھتا ہے کہ مکہ بجائے خود ایک وادی ہے اور پورا شہر چاروں طرف سے پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ مکہ کا بیشتر علاقہ پہاڑی ہے اور میدانی حصہ بہت کم پایا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ کچھ عادتاً کچھ مجبوراً مکہ کی آبادی جن محلوں میں بٹی ہوئی تھی اس میں سے بیشتر پہاڑی دروں اور گھاٹیوں ہی میں واقع تھے۔ اس لیے تاریخ میں شعب ابی طالب کے علاوہ دوسرے بیسیوں شعب کے نام پائے جاتے ہیں مثلاً شعب آل الانفس یا شعب الخوارج، شعب المطلب، شعب ابی زیاد، شعب آل عمرو، شعب بنی کنانہ، شعب بنی اسد، شعب بنی عبداللہ شعب بنی عامر وغیرہ وغیرہ۔

علاوہ ازیں تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مکہ کی آبادی ابتداء میں حرم کعبہ سے دور ہی بسائی گئی تھی اور لوگ حرم سے متصل مکان یا عمارت بنانے سے (تقدس اور خوف کی بناپر) گریز کرتے تھے البتہ قصی بن کلاب کے زمانے تقریباً ۴۴۰ء کے قریب مکانات و عمارات بنانے کا رواج ہوا۔ ان ہی وجوہ سے مکہ کی پرانی آبادی حرم سے خاصے فاصلوں تک ممتد ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ زیر بحث مقام شعب ابی طالب بھی مضافات مکہ میں یا حرم سے دور واقع تھا اس کے برعکس صحیح صورت یہ ہے کہ جبل ابوقبیس کے دامن میں ایک کنارے پر شعب ابی طالب ایک ایسے مقام کا نام تھا جو مولد رسول ﷺ کی نسبت بیت اللہ سے زیادہ قریب اور شمال مشرق کی سمت حد سے ایک فرلانگ کی مسافت پر واقع تھا جس کی تصدیق آجکل کے آثار اور مقامی روایات سے باآسانی کی جاسکتی ہے۔

شعب ابی طالب کی یہ جائے وقوع اور کعبۃ اللہ سے قربت اس لیے بھی قابل فہم ہے کہ خانہ کعبہ سے متعلق سقایہ کی ایک اہم خدمت بنو ہاشم کے سپرد تھی اور اس کی بجا آوری میں ان کا حرم سے قریب سکونت رکھنا ہی زیادہ باعث سہولت ہو سکتا تھا۔

یہاں یہ بتا دینا بھی بے محل نہ ہوگا کہ مذکورہ مقاطعہ اور شعب ابی طالب نے ان کی روایتی محصوری

سے یہ بہر حال لازم نہیں آتا کہ نبی ﷺ اور آپ کے پہلے خاندان کو اس مدت میں لازمی طور پر حرم مکہ سے دور تصور کیا جائے اور ان کے مخالفین کی مستقل رہائش حرم میں یا اس سے متصل فرض کر دی جائے۔ مسلمانوں کی طرح دشمنان اسلام کا تعلق بھی مختلف قبائل سے تھا اور یہ قبائل متفرق مقامات پر سکونت پذیر تھے۔ اندازہ یہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں جو علاقہ شعب ابی طالب کہلاتا تھا اسے ایک ایسا بڑا محلّہ کہا جا سکتا ہے جس میں شعب مولد، شعب علی اور شعب عبدالمطلب سب شامل تھے اور اگر شعب ابی طالب کو ایک وسیع دائرہ مانا جائے تو شعب مولد، شعب علی وغیرہ سب مقامات آگے پیچھے اسی میں نظر آئیں گے۔

۴۔ بہر حال شعب ابی طالب کی جائے وقوع کا تعین بڑی حد تک مقاطعہ کی اس نوعیت کو واضح کر دیتا ہے کہ یہ مقاطعہ محض معاشی اور معاشرتی بائیکاٹ تھا اور ہمارے اس موقف کی تائید اس ظالمانہ معاہدے کے مضمون سے بھی ہوتی ہے جس کے تحت یہ مقاطعہ نافذ کیا گیا تھا معاہدہ میں بنو ہاشم پر جو پابندیاں عائد کی گئی تھیں ان میں جزوی فرق اور مضمون کی کمی بیشی مورخین کے یہاں پائی جاتی ہے مثلاً ابن ہشام نے شادی بیاہ، خرید وفروخت کی پابندی کا ذکر کیا ہے۔ ابن سید الناس کے بیان کے مطابق مقاطعہ میں شادی بیاہ، خرید وفروخت کے علاوہ قریش نے یہ بھی طے کیا کہ ان کی طرف سے کبھی صلح کو قبول نہیں کیا جائے گا اور نہ کسی قسم کی نرمی اور مہربانی کا سلوک بنو ہاشم سے روا رکھا جائے گا۔ علامہ برہان الدین الحلبی نے لکھا ہے کہ یہ بھی طے پایا کہ بنو ہاشم کو بازاروں میں آنے سے روکا جائے گا۔ روایات میں کہیں یہ ذکر نہیں ہوا کہ قریش نے بنو ہاشم کو مکہ سے نکل جانے اور رہائش گاہوں سے بے دخل ہو جانے کا کہا ہو اور یہ بھی کم مورخین نے لکھا کہ بنو ہاشم کو درہ میں قید و نظر بند کر دیا گیا ظاہر ہے اس قسم کی کوئی چیز طے نہیں کی گئی کیونکہ

الف۔ قید و نظر بندی اور وہ بھی پورے خاندان کی، عرب میں قطعاً ایک غیر معروف چیز تھی اور اس کی کوئی مثال پہلے موجود نہیں تھی۔

ب۔ مذکورہ الصدر پابندیوں میں معاشی اور معاشرتی دونوں اعتبار سے بنو ہاشم کو بے دست و پا سب سے الگ اور مجبور کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے معاہدہ میں محصوری یا نظر بندی کی کوئی قرارداد نہیں رکھی اور یہ بالکل سیدھی سی بات ہے کہ اگر واقعی نظر بندی اور محصوری ہی مقصود تھی جیسا کہ ہمارے اکثر مورخین بیان کرتے ہیں تو معاہدہ میں اتنا ہی ذکر کافی تھا ''بنو ہاشم کو فلاں جگہ محصور کیا جاتا۔'' آخر دوسری پابندیوں کو لگانے میں کیا تک تھی؟ اگر ایک شخص محصور و نظر بند ہو گا تو وہ خود شادی، بیاہ، خرید و فروخت، صلح و جنگ اور ملنے جلنے یا بازاروں میں حاضر ہونے کے راستے مسدود اور ہر قسم کے تعلقات دوسروں سے منقطع ہو جائیں گے۔

ج۔ قریش کو اپنی مذہبی سیادت کے باوجود (جس میں بنو ہاشم بھی برابر کے شریک تھے) کوئی

ایسی قوت قاہرہ حاصل نہ تھی اور نہ کوئی مکہ میں ایسی مرکزی قوت پائی جاتی تھی جو بنو ہاشم یا کسی بھی خاندان کو من حیث المجموع اپنی موروثی جگہ سے بے دخل کر سکے اس لیے قریش مکہ کی طرف سے بنو ہاشم کو جلا وطن کرنے، مکہ سے باہر نکالنے یا شعب میں محصور و نظر بند کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور شعب ابی طالب کی جائے وقوع کے تعین کے بعد تو یہ امر بالکل ضنی اور قیاسی بن جاتا۔ اب اس کا ایک دوسرا پہلو اور دیکھ لیجئے۔ وہ یہ کہ قریش نے تو بنو ہاشم کو شعب ابی طالب میں محصور نہ کیا اور نظر بند ہو جانے پر مجبور کیا لیکن بنو ہاشم نے ڈر کر مکہ کی سکونت خود ترک کر دی اور مع خاندان شعب میں جا کر محصور ہو گئے اس توجیہ کو بعض مورخین اور سیرت نگاروں نے اختیار کیا ہے چنانچہ بیان کیا ہے کہ اطلاق مقاطعہ کے بعد ابو طالب نے اپنے خاندان والوں کو جمع کیا اور ان کو ساتھ لے کر شعب میں چلے گئے۔ یہ مشکل بھی متعدد وجوہ سے سخت محل نظر ہے:

۱۔ اس معاہدہ کو جن حالات میں نافذ کیا گیا تھا وہ اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ نبی ﷺ اور ان کے ساتھیوں کے علاوہ ابو طالب بھی عزم و حوصلہ اور صبر و استقلال کا مظاہرہ کر رہے تھے اور آپ ﷺ کے دشمنوں سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گفتگو کرتے تھے چنانچہ مذکورہ مقاطعہ کے بعد انہوں نے ان صاف لفظوں میں قریش کا چیلنج قبول کیا تھا کہ ''ہاں ہم آپ ﷺ کو اس وقت تمہارے حوالے کر دیں گے جب ہم سب کٹ کر مر جائیں گے۔'' کیا یہ الفاظ اس کی بے خوفی، جرات و ہمت پر دلالت نہیں کرتے؟ یوں بھی ایک بزدل، ڈرپوک اور کم ہمت آدمی جانتے بوجھتے تمام قریش کی مخالفت مول نہیں لے سکتا تھا۔ ابو طالب اپنے خاندان کے خلاف دوسرے خاندانوں کے مخالفانہ اتحاد سے ذرا نہ گھبرائے اور اپنے بھتیجے کی خاطر پوری پامردی سے آفات و مصائب کے مقابلے میں سینہ سپر ہو گئے۔ ایسے نڈر، بے باک آدمی اور صاحب حمیت و غیرت سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ معاً ڈر کر اپنے مکانوں کو خیر باد کہہ کر مکے سے نکل جائے گا یا اپنے آپ کو ڈر کر از خود محصور کر لے گا۔ علاوہ ازیں اپنے جس بھتیجے کی حمایت و حفاظت علی الاعلان کرتا رہا ہے اب شدائد کا سامنا ہوتے ہی پست ہمتی کا شکار ہو جائے گا اور اپنے بھتیجے سمیت دشمنوں کی نظر سے دور چلا جائے گا۔ کیا یہ باتیں قرین قیاس ہیں؟

۲۔ ابو طالب کے علاوہ دوسرے اہل خاندان اور داعی اسلام ﷺ سب ہی مقاطعہ کا شکار تھے اب ذرا اس پر غور کیجئے کیا ایک برحق نبی اور پیغمبر آخر ﷺ ہوتے ہوئے ابتلاء اور آزمائش سے بچ کر شعب میں محصور ہونے کو گوارا کر سکتے تھے حالانکہ گزشتہ چھ سال سے آپ ﷺ برابر آزمائش کی بھٹی میں تپائے جا رہے تھے؟ لیکن ان تمام مخالفتوں کے سبب آپ ﷺ نے کسی قسم کی عافیت تلاش کرنے کی بجائے اپنے چچا ابو طالب کی حمایت کی بھی پروا نہیں کی تھی۔ ایسے صاحب عزیمت نبی سے یہ توقع ہرگز نہیں کی جا سکتی کہ

اپنے آپ کو قتل سے بچانے کے لیے شہر سے دور ایک گھاٹی میں جا کر محصور ہو جائیں گے۔

اور ایک انتہائی اہم پہلو یہ غور طلب ہے کہ اگر بالفرض ہم ان تمام حضرات کو شعب میں محصور مان لیں تو ایک اور الجھن یہ پیدا ہو جاتی ہے کہ کیا اس دوران کارِ نبوت موقوف رہا؟ ایک ایسے دور دراز مقام پر جہاں باہر نکلنے کا کوئی موقع نہ ہو اور جہاں اپنے خاندان والوں کے سوا کوئی اور آبادی نہ تھی، آپ دعوت و تبلیغ کا فریضہ کیونکر ادا کر سکتے تھے؟ حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ اس پورے عرصے میں آپ ﷺ مسلسل دعوت و تبلیغ میں منہمک رہے۔ ادھر وحی کا نزول بھی ہوتا رہا چنانچہ ابن ہشام کے بیان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کئی آیات کا نزول اسی عرصہ میں ہوا۔ مثلاً ابولہب، اس کی بیوی، امیہ بن خلف بن وہب، عاص بن وائل، ابوجہل، نضر بن الحارث اور ولید بن مغیرہ وغیرہ کفار و مشرکین کے کردار پر بطور خاص روشنی ڈالنے والی آیات جو سورت لہب، ہمزہ، مریم، کافرون، فرقان، انبیاء وغیرہ لائی ہیں، اسی دور کی ہیں۔ مزید برآں آپ ﷺ مختلف قبائل میں دعوت و تبلیغ کے لیے تشریف لے جاتے تھے اور خصوصاً دوران حج آپ اس فریضہ کو بڑے پیمانے پر انجام فرمایا کرتے تھے۔ حج کا موقع اس لحاظ سے بہت اہم تھا کہ بنو ہاشم کے افراد اسی موسم میں جو کچھ خرید و فروخت اور معاملت کر لیتے تھے ورنہ پھر دوسرے ایام ان کے باہر کے تاجر و خریدار آسانی سے نہیں مل سکتے تھے۔ ان حقائق کی روشنی میں ہم بڑے اطمینان سے یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ شعب ابی طالب میں آپ اور دیگر خاندان بنو ہاشم کی محصوری و نظر بندی کا واقعہ محض ظنی اور قیاسی ہے اصل نوعیت یہ ہے کہ یہ معاشی اور معاشرتی اعتبار سے ایک خاندانی مقاطعہ تھا، اس سے زیادہ نہیں اس مقاطعہ کی رو سے نہ تو محصوری لازم آتی ہے نہ نظر بندی اور نہ یہ بات کہ محصورین شعب سے باہر نہیں نکل سکتے تھے جیسا کہ مورخین کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ وہ تمام پابندیاں جن کا ذکر ہم اصحاب سیر کے واسطے سے کر چکے ہیں، عملاً دو قسم کے تعلق کا انقطاع ثابت کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک معاشرتی ہے جس میں شادی بیاہ، صلح، نرمی و مہربانی اور مجلس میں آنے جانے کی پابندیاں شامل ہیں اور دوسرا معاشی ہے جس کے ضمن میں خرید و فروخت اور بازاروں میں آنے جانے کی ممانعت آجاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں قسم کی پابندیاں اور معاشی و معاشرتی ترک تعلق بنو ہاشم کی سماجی و معاشی زندگی کو مفلوج کرنے کے لیے کافی تھا۔ ان میں سے بھی اول الذکر معاشرتی مقاطعہ کسی نہ کسی صورت میں قابل برداشت ہو سکتا تھا لیکن معاشی بائیکاٹ کی شکل میں زندگی گزارنا ناممکن سا تھا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مکہ کی آبادی تجارت پیشہ تھی اور اس کی ضروریات زندگی کی تکمیل لین دین اور تجارت ہی سے ممکن تھی۔ اس ذریعہ پر بھی پابندی لگ جانا سخت اذیت ناک تھا کیونکہ اس کا تعلق براہ راست زندگی کے قیام و بقاء سے ہے۔ اس لیے یہ پابندی بنو ہاشم پر انتہائی گراں گزری اور انہوں نے مجبور ہو کر

درخت کے پتے حتیٰ کہ چمڑا تک بھگو کر اور بھون کر کھایا۔ شدید بھوک کی بنیاد پر بھی بچے بلک بلک کر روتے تھے اس پورے عرصے میں صرف دو ذریعے ایسے رہ گئے تھے جن سے کچھ عرصہ کے لیے کام چل جاتا تھا۔ ایک تو موسم حج اور دوسرے خفیہ طور پر جو تھوڑا بہت سامان بعض لوگ پہنچا دیا کرتے تھے۔ کفار قریش اس بات پر کڑی نظر رکھتے تھے کہ شریک معاہدہ قبائل کا کوئی فرد معاہدہ کی خلاف ورزی نہ کرنے پائے اور سچی بات تو یہ ہے کہ معاہدہ سے زیادہ انہیں اس بات کا خیال تھا کہ جو تکلیف اور جس حد تک وہ خاندان بنو ہاشم کو مع رسول ﷺ کے پہنچانا چاہتے تھے اس میں کسی قسم کی کمی نہ ہونے پائے بلکہ اضافہ ہی ہوتا رہے اس لیے ان کے نزدیک اصل مسئلہ یہ نہیں تھا کہ معاہدہ کی خلاف ورزی ہو رہی ہے یا نہیں اصل مسئلہ یہ تھا کہ حضور ﷺ اور آپ کے صحابہ کو کسی طرف سے کوئی سہولت یا امداد تو نہیں مل رہی ہے جو اس کی تاب مقاومت کو دراز کر دے چنانچہ اس ضمن میں بعض بڑے دلچسپ واقعات بھی ملتے ہیں مثلاً ایک مرتبہ حکیم بن حزام اپنی پھوپھی حضرت خدیجہؓ (جن کا مکان حرم سے بہت قریب واقع تھا) کے پاس اونٹ پر غلہ لادے جا رہے تھے۔ ابو جہل نے روکا اتنے میں ابوالبختری وہاں آیا اور اس نے ابو جہل سے پوچھا کیا بات ہے ابوالبختری نے کہا اس کی پھوپھی کے گیہوں اس کے پاس رکھے تھے اس نے اپنے گیہوں منگائے ہیں یہ لیے جاتا ہوں تیرا کیا حرج ہے اس کو جانے دے ابو جہل نے انکار کیا یہاں تک کہ ابوالبختری اور ابو جہل میں سخت کلامی کے بعد زد و کوب کی نوبت پہنچی۔ ابوالبختری نے ابو جہل کے اونٹ کی گردن پکڑ کر مروڑ ڈالی اور ایسا جھٹکا دیا کہ اونٹ بیٹھ جائے پھر ابو جہل کی گدی پکڑ کر کھینچ لیا اور اس کے سر پر ایسی ضرب لگائی جس سے اس کا سر پھٹ گیا پھر اس کو اپنے پیروں اور لاتوں سے خوب روندا اور حمزہ بن عبدالمطلبؓ پاس کھڑے ہوئے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر اور بھی اندوہناک ہوا یہ واقعہ مندرجہ ذیل حقائق سے پردہ اٹھا دیتا ہے۔

۱۔ خاندان بنو ہاشم کے افراد پر قریش کی طرف سے کڑی نگرانی کی جاتی تھی۔

۲۔ کچھ ایسے لوگ موجود تھے جن کے دلوں میں ہمدردی انسانیت اور جذبہ موجود تھا اور جو حق کے لیے عملی اقدام کر سکتے تھے۔

۳۔ ان پابندیوں کو مکہ کے تمام شہری پسندیدہ نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔

۴۔ شعب مکہ سے باہر مقام نہ تھا، حضرت حمزہ کے پاس کھڑے ہونے کا کیا مطلب تھا؟

۵۔ اب ہم آخری مسئلہ کو لیں گے یعنی یہ مقاطعہ کیسے ختم ہوا؟ اس سلسلے میں عموماً دو صورتیں بتائی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ قدرت خداوندی سے اس تحریری معاہدہ کو دیمک چاٹ گئی اور دوسری یہ کہ مکہ کو چند بہادر اور غیرت مند افراد کی کوششوں سے یہ عہد نامہ چاک ہو کر ختم ہو گیا۔

عہد نامہ کو دیمک کا چاٹ لینا قدرت خداوندی کی دلیل اور نبی ﷺ کی صداقت کا کھلا ثبوت ہے ۔ابن ہشام نے لکھا ہے کہ اس کی اطلاع جب نبی ﷺ نے ابو طالب کو دی تو وہ قریش کے پاس آئے اور کہا ''اے گروہ قریش میرے بھتیجے نے ایسا ایسا کہا ہے پس تم اپنے عہد نامہ کو دیکھو۔اگر واقعی اس کی یہی صورت ہو (یعنی صحیفہ کو کیڑوں نے کھالیا اور صرف جہاں خدا کا نام ہے چھوڑ دیا ہے) تو لازم ہے کہ تم اپنے ظلم وستم سے جو تم نے ہم پر کر رکھا ہے باز آجاؤ اور اگر بھتیجے کا کہا غلط ہو تو میں اپنے بھتیجے کو تمہارے حوالے کردوں گا۔'' قریش اس بات پر راضی ہو گئے ۔جا کر دیکھا تو ویسا ہی پایا جیسا آپ ﷺ نے فرمایا تھا۔اس طرح یہ عہد نامہ ختم ہو گیا۔

اب دوسری روایت یہ ہے کہ قریش جو مظالم خاندان بنو ہاشم پر ڈھا رہے تھے ان کو دیکھ کر خود قریش میں سے بعض لوگوں کے دل آخر کار پسیج گئے ۔ان سے بنو ہاشم کی تکلیف نہ دیکھی گئی اور انہوں نے اس ظلم کے خلاف آواز بلند کرنا اپنے ضمیر کا تقاضہ سمجھا چنانچہ ابوالبختری ابو جہل کے پاس گیا اور اس سے مقاطعہ ختم کرنے کا مطالبہ کیا جن لوگوں نے اس ظلم وتشدد کے خلاف آواز بلند کی وہ مندرجہ ذیل پانچ آدمی تھے۔

۱۔ہشام بن عمرو (بنو عامر سے)

۲۔زہیر بن ابی امیہ (بنو مخزوم سے)

۳۔مطعم بن عدی (بنو نوفل سے)

۴۔ابوالبختری (بنو اسد سے)

۵۔ذمعہ بن الاسود (ایضاً)

ہشام کا باپ عمرو اور نضر بن ہشام دونوں ایک ماں سے تھے اس سبب سے اس کو بنی ہاشم سے محبت تھی اور اپنی قوم میں بڑی عزت و وقار رکھتا تھا۔یہ بعد میں مسلمان ہو گیا تھا۔حضرت حسان بن ثابت نے اس کی مدح بھی لکھی۔مقاطعہ مذکورہ واقعہ کے دوران اس نے یہ وطیرہ بنا لیا تھا کہ رات کے وقت اونٹ پر گیہوں لاد کے بنی ہاشم کو پہنچا دیتا تھا اور بنی ہاشم اونٹ پر سے گیہوں اتار کر اونٹ واپس کر دیتے تھے۔وہ پھر لاد کر بھیج دیتا تھا۔زہیر بن ابی امیہ کی ماں عاتکہ بنت عبد المطلب تھی اور ابو طالب اس کے ماموں تھے یہ بھی بعد میں اسلام لے آیا تھا۔

مطعم بن عدی مکہ کا مشہور و معزز آدمی تھا آپ ﷺ جب طائف سے واپس ہوئے ہیں تو اسی مطعم نے آپ ﷺ کو اپنی پناہ میں لیا تھا۔وہ کافر ہی مرا اس کی موت پر حضرت حسان بن ثابت نے مقاطعہ کو ختم کرانے میں اس کوشش اور دوسری خوبیوں پر ایک مرثیہ میں بہت تعریف کی ہے۔ابوالبختری اور ذمعہ بھی معاشرہ کے معزز افراد اور بنو اسد کے رؤسا میں سے تھے اس بارے میں اختلاف پایا جاتا

ہے کہ ان پانچوں میں سے کس شخص نے پہل کی اور نقض صحیفہ کے لیے دوسروں کو آمادہ کیا۔ بعض کہتے ہیں زہیر پہلا آدمی تھا لیکن زیادہ تر اصحاب اولیت ہشام بن عمرو کو دیتے ہیں چنانچہ ابن ہشام، ابن سید الناس اور صاحب الدار نے یہی لکھا ہے۔ ابن ہشام لکھتا ہے کہ پہلے ہشام زہیر کے پاس گیا اور اس سے کہا ''اے زہیر! کیا تو اس بات سے خوش ہے کہ تو ہر قسم کے کھانے کھائے، کپڑے پہنے اور شادی بیاہ کرے لیکن تیرے ماموں یعنی بنی مطلب کسی چیز کی نہ تو خرید و فروخت کر سکیں اور نہ شادی بیاہ''

غرض باری باری دوسرے لوگ بھی اس مہم کے لیے تیار ہو گئے اور اس طرح ان پانچوں آدمیوں نے نقض صحیفہ کے لیے جدو جہد کی۔ ممکن ہے بنو ہاشم کی محبت نے ہشام کو اس کار خیر کے لیے آمادہ کیا ہو اسی طرح زہیر کو خونی رشتہ میں آواز اٹھانے پر مجبور کیا ہو باقی دوسرے لوگ ممکن ہے اس نقطہ نظر سے شریک کار ہو گئے ہوں کہ قریش کو بنو ہاشم کے خلاف متحد ہو کر تجارتی اجارہ داری حاصل ہو گئی تھی اور یوں بعض خاندان مسلسل اپنی پوزیشن کو مستحکم کر رہے تھے جبکہ یہ افراد اپنے خاندانوں کو نظر انداز کیے جانے کا احساس رکھتے ہوں گے ورنہ کم از کم مظلوم سے ہمدردی اور احساس قومیت تو ان میں ضرور موجود تھی جس کی وجہ سے انہوں نے مقاطعہ سے برآت ظاہر کی۔ بہر حال پانچوں اشخاص مل کر دوسرے دن حرم میں گئے اور اپنے جذبات کا اظہار کیا چنانچہ زہیر نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا ''اے اہل مکہ! یہ کیا انصاف ہے کہ ہم آرام سے بسر کریں اور بنو ہاشم کو آب و دانہ نصیب نہ ہو؟ خدا کی قسم! جب تک یہ ظالمانہ معاہدہ چاک نہ کر دیا جائے گا میں باز نہ آوں گا'' ابو جہل قریب سے بولا ''اس معاہدہ کو ہر گز کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا'' ذمقہ نے کہا تو جھوٹ کہتا ہے جب یہ لکھا گیا تھا اس وقت بھی ہم راضی نہ تھے مطعم نے ہاتھ بڑھا کر دستاویز چاک کر دی۔

مختصر یہ کہ ان دونوں اسباب میں سے کسی ایک یا دونوں اسباب یعنی قدرت خداوندی سے اور چند جیالے بہادروں کی ہمدردانہ سعی کی بدولت اس معاہدہ نا مرضیہ کا خاتمہ ہو گیا اور یوں آپ ﷺ اور بنو ہاشم پر سے معاشی و معاشرتی ساری پابندیاں تار عنکبوت کی طرح ٹوٹ گئیں۔ اس طرح ایک مرتبہ بنو ہاشم مکہ کے مذہبی و سماجی زندگی میں تازہ خون بن کر دوڑنے لگے۔ تحریک اسلامی کو دبانے اور مٹانے کی یہ گہری سازش ناکام ہو گئی اور جن مقاصد کی خاطر قریش نے یہ مقاطعہ کیا تھا' پورے نہ ہو سکے خصوصاً ان کا یہ اندازہ قطعاً غلط ثابت ہوا کہ شدائد سے گھبرا کر بنو ہاشم آنحضرت ﷺ کو قتل کے لیے پیش کریں گے ۔غرض ساری کافرانہ سیاست اپنے تمام کروفر کے ساتھ باب شکست میں داخل ہوئی۔ خدا نے سچ کہا ہے

''ومکروا ومکر اللہ واللہ خیر الماکرین''

سید امیر علی (روح اسلام۔۱۲۱) پر رقم طراز ہیں کہ اس معاہدہ سے بنی ہاشم والمطلب خوف زدہ ہوئے اور اس اندیشے سے کہ مبادا یہ کسی مزید حملے کا پیش خیمہ ہو' انھوں نے یہ مناسب سمجھا کہ اپنے

گھروں کو چھوڑ کر جو شہر میں جا بجا بکھرے ہوئے تھے ایک جگہ جمع ہو کر رہیں۔ چناں چہ شعب ابی طالب میں چلے گئے جو مکہ کے مشرقی مضافات میں ایک لمبی اور تنگ گھاٹی ہے جسے چٹانوں اور دیواروں نے شہر سے جدا کر دیا ہے اور جہاں سے شہر میں آمد و رفت کا ایک چھوٹے دروازے کے سوا کوئی راستہ نہیں''۔ بنی ہاشم والمطلب ابوطالب کے پاس آئے وہ ان لوگوں کو اور رسول اللہ ﷺ کو لے کر شعب ابی طالب چلے گئے۔ اس شعب میں دو تین برس گزارے''۔ (اصح السیر)

شبہ کا ازالہ: شعب کے لفظ سے بالعموم یہ مغالطہ ہوا ہے کہ یہ اصل رہائش گاہ سے دور کوئی پہاڑی درہ ہوگا جہاں جا کر بنو ہاشم محصور و نظر بند ہو گئے۔ حال آں کہ مکہ کی بہ جائے خود ایک وادی ہے اور پورا شہر چاروں طرف سے پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ اس شہر کا بیش تر حصہ پہاڑی دروں اور گھاٹیوں ہی میں واقع ہے۔ اس لیے تاریخ میں شعب ابی طالب کے علاوہ کئی اور شعب کے نام پائے جاتے ہیں۔ مثلاً شعب آل الانفس، شعب الغوارخ، شعب ابی طالب، شعب ابی زیادہ، شعب ابن ابی ربیع، شعب آل عمرو، شعب بن کنانہ، شعب بنی عبد اللہ، شعب بنی اسد، شعب بنی عامر، شعب اخضارمہ، شعب الخوز، شعب الفتارت، شعب ابی دب وغیرہ (توسیع حرم کے سلسلہ میں آج کل یہاں پہاڑوں کو صاف کر دیا گیا ہے) مکہ کی آبادی شروع میں حرم کعبہ سے دور آباد تھی۔ تقدس حرم کی وجہ سے متصل کوئی مکان اور عمارت نہ بناتے تھے۔ یہ تو قصی بن کلاب کے عہد میں قریب قریب عمارات و مکانات بنائے جانے لگے۔ اس وجہ سے مکہ کی پرانی آبادی حرم سے خاصے فاصلے پر ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ شعب ابی طالب بھی مضافات مکہ میں یا حرم سے دور واقع تھا۔ جب کہ کوہ ابوقبیس کے دامن میں شعب ابی طالب ہے جسے مولد رسول کی نسبت بیت اللہ سے زیادہ قریب اور شمال مشرق کی سمت زیادہ سے زیادہ ایک فرلانگ کی مسافت پر واقع تھا۔ اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ بنو ہاشم سقایہ کی خدمت انجام دیتے تھے اس کی بجا آوری کے لیے ضروری تھا کہ ان کی حرم کے قریب سکونت ہو۔ (تفصیل کے لیے نقوش۔۹۔۲۶۳)

اعتراض نمبر ۲۱۷

اکثر مورخین کی رائے ہے کہ مقاطعہ میں بنو ہاشم والمطلب محصور و نظر بند رہے۔ سیرت نگاروں نے جیسے مقاطعہ کی تصویر کھینچی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بنو ہاشم کا مقاطعہ ہوا تو اس کے بعد تین برس تک بنو ہاشم کو محصوری اور نظر بندی کی مصیبت سے دو چار ہونا پڑا۔ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بنو ہاشم کی رہائش کسی الگ مقام پر تھی اور محصوری کا واقعہ شعب ابی طالب میں پیش آیا۔ تین سال وہاں گزار کر واپس اپنی رہائش گاہوں میں آ گئے۔ جب کہ کسی سیرت نگار نے بنو ہاشم کی رہائش کے مقام کا ذکر نہیں کیا۔ نیز اس

تحریری معاہدہ یعنی مقاطعہ میں صرف معاشی اور معاشرتی بائیکاٹ کا ذکر ہے مثلاً شادی، بیاہ، خرید وفروخت کے علاوہ ان کی طرف سے کبھی صلح قبول نہیں کی جائے گی اور ان سے نہ ہی کسی قسم کی نرمی برتی جائے گی۔ بنو ہاشم کو بازاروں میں آنے سے روکا جائے گا۔ بنو ہاشم کو اپنے محلوں میں نہ بٹھائیں گے۔ گویا کہیں اس تحریری معاہدہ میں ذکر نہیں کہ قریش نے بنو ہاشم کو مکہ سے نکل جانے اور رہائش گاہوں کو چھوڑنے اور بے دخل ہو جانے کا کہا ہو۔ کسی سیرت نگار نے یہ بھی نہیں لکھا کہ بنو ہاشم کو درہ میں نظر بند یا محصور کرنے کی بابت طے کیا گیا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ قید و نظر بندی اور وہ بھی پورے خاندان کی! عرب میں قطعاً اس کا رواج نہ تھا بلکہ غیر معروف چیز تھی۔

دوم: معاشی اور معاشرتی پابندیوں کے علاوہ معاہدہ میں محصوری و نظر بندی کا کوئی ذکر موجود نہیں۔ اگر واقعی محصوری و نظر بندی ہی تھی تو کم از کم معاہدہ میں یہی لکھا ہوتا کہ بنو ہاشم کو وہاں محصور کیا جاتا ہے۔ پھر معاشی و معاشرتی پابندیاں لگانے کی کیا ضرورت تھی؟ نیز محصور و نظر بند شخص از خود شادی بیاہ، خرید وفروخت، صلح اور ملنے جلنے یا بازاروں میں گھومنے پھرنے سے قاصر ہوتا ہے کیونکہ وہ آزادانہ اپنے حصار سے باہر آ جا نہیں سکتا۔

سوم: قریش اس قدر طاقت ور نہ تھے نہ انھیں ایسی طاقت حاصل تھی اور نہ ہی مکہ میں کوئی مرکزی حکومت موجود تھی البتہ قبائلی نظام تھا اور اس نظام میں اتنا دم خم نہیں تھا جو بنو ہاشم یا کسی خاندان کو اپنی موروثی جگہوں اور رہائش گاہوں سے محروم کر دے، اس لیے قریش مکہ کا بنو ہاشم کو جلاوطن کرنے، مکہ سے باہر دھکیلنے یا شعب میں محصور و نظر بند کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

چہارم: شعب ابی طالب کے جائے وقوع کے تعین سے یہ امر بعید از قیاس ہو جاتا ہے۔

اعتراض نمبر ۲۱۸

مسلمان از خود ڈر کے مارے شعب ابی طالب میں سکونت پذیر ہو گئے۔

قریش نے بنو ہاشم کو شعب ابی طالب میں محصور کیا نہ ہی نظر بند ہو جانے پر مجبور کیا لیکن بنو ہاشم از خود ڈر کے مارے مکہ کی سکونت ترک کر گئے اور خاندان سمیت شعب ابی طالب میں پناہ گزیں ہو گئے۔ جیسا کہ بعض نے لکھا کہ مقاطعہ کے بعد ابو طالب نے اپنے خاندان والوں کو جمع کیا اور ان کو ساتھ لے کر شعب ابی طالب میں چلے گئے جیسا پیچھے سید امیر علی کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ بات کہ قریش نے بنو ہاشم کو محصور کیا نہ ہی نظر بند ہو جانے پر مجبور کیا حکیم بن حزام اونٹ پر غلہ لاد کر اپنی پھوپھی خدیجہؓ کے ہاں بھیجنا چاہتے تھے۔ ابو جہل نے روکا۔ ابوالبختری آیا اور ابو جہل کو روکا کہ مزاحمت نہ کرے جانے دے۔ ان میں سخت کلامی ہوئی۔ بالآخر اس نے ابو جہل کو پکڑ کر سر پر ضرب لگائی۔ سر پھٹ

گیا۔ لاتوں سے خوب لتاڑا۔ حمزہ بن عبدالمطلب پاس ہی کھڑے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ انھیں دیکھ کر ابوجہل اور شرم سار ہوا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شعب ابی طالب مکہ سے باہر مقام نہ تھا۔ حضرت حمزہ کے پاس کھڑے ہونے کا مطلب یہی ہے کہ مسلمان نظر بند و محصور نہ تھے۔ نیز حکیم بن حزام کا مکان حرم کے قریب تھا۔

جواب: قریش کے مقاطعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نبی مکرم ﷺ اور ان کے ساتھیوں کے علاوہ ابو طالب نہایت صبر و استقامت اور بہادری و جرات کا مظاہرہ کر رہے تھے کیوں کہ انھوں نے کہا تھا کہ ''ہاں! ہم محمد ﷺ کو اس وقت تمھارے حوالے کر دیں گے جب ہم سب کٹ کر مر جائیں گے''۔ کیا یہ بیان جرات و بہادری اور بے خوفی کا اظہار نہیں ہے؟ جن حالات میں معاہدہ کو نافذ کیا گیا ان حالات میں ایک بزدل، کم زور اور کم ہمت آدمی کبھی دشمنی مول لینے کا ارادہ نہیں کرتا۔ ادھر ابو طالب ذرا برابر نہیں گھبراتے اور آنے والی مصیبتوں کے سامنے جرات و بہادری کا پہاڑ بنے ہوئے ہیں۔ ایسے بہادر عالی ہمت شخص کے بارے میں یہ کہنا کہ ڈر کی وجہ سے مکہ کو خیر باد کہہ کر نکل جائے یا ڈر کی وجہ سے خود کو محصور کر لے، زیادتی ہے۔ بنو ہاشم خاندان متحد تھا اور نبی مکرم ﷺ کو اپنی نظروں سے اوجھل کرنا لمحہ بھر گوارا نہ تھا۔ دوسری بات یہ کہ ایک برحق نبی آزمائش سے دل برداشتہ ہو کر مصائب سے بچ کر شعب میں محصور ہونے کو گوارا کر سکتا ہے؟ حالاں کہ گزشتہ چھ سال سے آپؐ اور آپؐ کے متبعین پر مصیبتوں کے پہاڑ ڈھائے گئے لیکن اللہ کے سوا کسی قسم کی دوسروں سے عافیت تلاش نہیں کرتے۔ ایسے صاحب عزم سے بھلا ایسی توقع کی جا سکتی ہے کہ اپنے آپ کو قتل سے بچانے کے لیے شہر سے دور ایک گھاٹی میں محصور ہو جائیں۔ محمد ولی رازی (ہادی عالم۔۱۰۶) بتاتے ہیں ''اس سارے عرصہ (مقاطعہ قریش) رسول اللہ ﷺ درہ کوہ سے آکر کلمہ اسلام کے ساعی رہے۔ اللہ کے رسول کو اللہ کے سوا کس کا ڈر۔ اہل مکہ کی ساری ہٹ دھرمی دھری کی دھری رہی اور رسول اللہ ﷺ امر الٰہی کو لے کر گھومے اور لوگوں کو اللہ کی راہ دکھائی''۔ حرمت والے مہینوں کے علاوہ یہ لوگ گھاٹی سے باہر نہیں نکلتے تھے وہ اگرچہ قافلوں سے سامان خرید سکتے تھے جو باہر سے مکہ میں آتے لیکن ان کے سامان کے دام بھی مکہ والوں نے اس قدر بڑھا دئے تھے کہ محصورین خرید نہ پاتے تھے۔ (رحیق المختوم۔۱۹۰)

مذکورہ عبارتوں میں سے پہلی عبارت میں ہے کہ آپ تبلیغ دین گھوم پھر کر کرتے رہے۔ کوئی ڈر اور خوف آڑے نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ ایک مثالی قوم کی صفات میں ایک صفت کا ذکر فرماتا ہے ''وَلَا یَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ یعنی وہ لوگ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے''۔ دوم عام لوگ جو مساجد کی تعمیر و آباد کاری کا ذوق رکھتے ہیں ان کی صفات میں یہ صفت بطور خاص پائی جاتی ہے ''وَلَمْ یَخْشَ اِلَّا اللّٰہَ یعنی اللہ

کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔'' جہاں تک اس صفت کا تعلق ہے یہ رسولوں میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ '' اَلَّذِینَ یُبَلِّغُونَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَیَخْشَوْنَهٗ وَلَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰه (جو اللہ کے پیغامات لوگوں تک پہنچاتے ہیں اور اللہ سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے)۔

یہ بات نا قابل قبول ہے کیونکہ ایک عام سا خوف خدا رکھنے والا جس چیز کو درست سمجھتا ہے اس کے کرنے میں پس و پیش نہیں کرتا بلکہ کر گزرتا ہے اسی طرح مساجد کی تعمیر اور آباد کرنے میں ذوق وشوق رکھتے ہیں وہ مسجدوں کے مسائل سے نہ بددل ہوتے ہیں نہ ڈرتے ہیں خواہ ملامت کرنے والے جو مرضی کہتے رہیں۔ تمام رسولوں کی یہ شان ہے کہ (لا یخشون احدا اللہ) اور انبیاء ورسل کے تاجدار مکی ومدنی آقا ڈر اور خوف زدہ ہو کر شعب ابی طالب میں چلے آئیں ایسا بالکل ناممکن ہے۔ جب کہ دوسری عبارت میں حرمت والے مہینوں میں تبلیغ کی قید لگائی گئی ہے۔ بہ ہر حال یہ تو معلوم ہوا کہ آپ نے تبلیغ کا کام جاری رکھا اور کسی قسم کے ڈر وخوف کو خاطر میں نہ لائے۔ اگر آپ محصور و نظر بند ہوتے تو یہ فریضہ تبلیغ کیسے انجام دیتے نیز جہاں محصور و نظر بند کیا جاتا ہے وہاں سے نکل نہیں سکتے۔ محصوری و نظر بندی میں یہ پیچیدگی بھی پائی جاتی ہے کہ کیا اس دوران کا رِسالت موقوف رہا؟ ایک ایسے دور دراز مقام پر جہاں باہر نکلنے کا کوئی موقع نہ ہو اور جہاں سوائے آپ کے خاندان کے کوئی اور آبادی نہ ہو آپ دعوت وتبلیغ کا فریضہ کیوں کر انجام دے سکتے تھے؟ حال آں کہ اس پورا عرصہ میں آپ مسلسل دعوت وتبلیغ میں مصروف رہے۔ ابن ہشام کے مطابق متعدد آیات کا نزول اسی عرصہ میں ہوا۔ سورہ لہب، ہمزہ، مریم، کافرون، فرقان اور انبیا کی آیات اسی دور کی ہیں جو مشرکین کے کردار کی عکاسی کرتی ہیں۔ لہٰذا یہ بات حقیقت پر مبنی ہے کہ شعب ابی طالب میں حضور اور دیگر خاندان ہاشم کی محصوری و نظر بندی کا واقعہ ظنی اور قیاسی ہے۔ کیوں کہ یہ معاشی و معاشرتی اعتبار سے ایک خاندانی مقاطعہ تھا۔ مقاطعہ میں دو قسم کی پابندیوں کا ذکر ہے۔ ایک معاشی اور دوسری معاشرتی۔ معاشرتی میں شادی، بیاہ، صلح، نرمی و مہربانی اور مجلس میں آنے جانے کی پابندیاں تھیں اور معاشی پابندیوں میں خرید وفروخت اور بازاروں میں آنے جانے کی ممانعت اور روک ٹوک آجاتی ہیں۔ معاشی بائیکاٹ زندگی کو مفلوج کرنے کا انتہائی خطرناک اور اذیت ناک اقدام تھا۔ یہ پابندی اس قدر گراں تھی کہ ایمان والوں نے درختوں کے پتے اور چمڑا تک پانی میں بھگو کر اور بھون کر کھایا۔ بھوک سے بچے بلکتے رہتے تھے۔ لیکن اس مقاطعہ میں آپ ﷺ اور آپ کے ساتھی کامیاب وسرخرو ہوئے جب کہ قریش اپنے برے عزائم میں ناکام ہوئے اور اپنا مقصد حاصل نہ کر سکے۔ اصح السیر میں بھی ان دو پابندیوں کا ذکر ہے بنی ہاشم ومطلب کی لڑکیوں سے نہ عقد کیا جائے گا نہ اپنی لڑکیاں ان کو دی جائیں۔ دوم نہ ان سے کوئی چیز خریدی جائے نہ ان کے

ہاتھ کوئی چیز بیچی جائے۔

حکیم بن حزام جن کا مکان حرم کے قریب تھا اپنی پھوپھی کے لیے گیہوں اونٹ پر لا د رہا تھا۔ ابو جہل نے روکا۔ ابوالبختری وہاں آ گیا۔ اس نے ابو جہل سے کہا تیرا کیا حرج ہے جانے دے۔ ابو جہل اور ابو البختری میں سخت کلامی ہوئی۔ ابو جہل کو اونٹ سے نیچے گرانے کی کوشش کی۔ آخر ابو جہل کو گدی سے پکڑ کر کھینچ لیا اس کے سر پر ضرب لگائی۔ اس کا سر پھٹ گیا۔ لاتوں اور گھونسوں سے خوب لتاڑا۔ حضرت حمزہ پاس کھڑے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ انھیں دیکھ کر ابو جہل کو اور دکھ ہوا۔ حضرت حمزہؓ پاس کھڑے ہو کر تماشا دیکھ رہے تھے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ بنو ہاشم کا خاندان محصور و نظر بند نہ تھا اور انہیں آنے جانے میں کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ اگر محصور و نظر بند ہوتا تو حضرت حمزہؓ کے پاس کھڑے ہونے کا کیا مطلب؟ نیز نہ ہی انھیں کوئی ڈر اور خوف تھا ورنہ حضرت حمزہ اکیلے نظر نہ آتے اور مزے سے وہ تماشا کبھی نہ دیکھ پاتے۔ اس بات کی تصدیق امام سہیلیؒ کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ امام سہیلی رقم طراز ہیں ''اگر بیرون ملک سے کوئی تجارتی کارواں وہاں آجاتا مسلمان ان سے کوئی چیز خریدنے کے لیے آجاتے تو ابولہب ان قافلہ والوں سے کہتا ''تم انھیں اتنے مہنگے دام بتاؤ کہ وہ کوئی چیز خرید نہ سکیں''۔ وہ انھیں ساتھ ہی یہ تسلی بھی دیتا کہ تم یہ فکر نہ کرنا کہ اگر تم نے بہت زیادہ قیمت مانگی تو اسے کوئی خریدے گا نہیں اور تمھیں خسارہ ہوگا۔ میں یہ خسارہ پورا کروں گا''۔ (السیرۃ النبوۃ۔ علامہ سید احمد بن زینی دحلان) مسلمان نظر بند یا قلعہ بند ہوتے تو باہر آ کر ضرورت کا سامان نہ خرید سکتے یہ الگ بات ہے کہ اشیاء کے نرخ مسلمان خریداروں کی پہنچ سے باہر تھے۔

۱: محصور و نظر بند ہوتے تو کہیں آ، جا نہ سکتے۔ ۲: محصوری اور نظر بندی کی خلاف ورزی پر کوئی تنازعہ پیش نہیں آیا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اگر وہ محصور تھے تو باہر آنے کی اجازت نہ ہوتی اور بغیر اجازت آتے تو لڑائی جھگڑا ہوتا مگر ایسا کچھ ہوا ہو نظر نہیں آتا۔

سفرِ طائف:

اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ '' وَاَنۡذِرۡ عَشِيۡرَتَكَ الۡاَقۡرَبِيۡنَ اپنے قریبی رشتہ داروں کو اسلام کی دعوت دو'' اور یہ بھی فرمایا وَتَوَكَّلۡ عَلَى الۡعَزِيۡزِ الرَّحِيۡمِ ''بھروسہ کرو خدا قادر و رحیم پر الَّذِىۡ يَرٰٮكَ حِيۡنَ تَقُوۡمُ جو تم کو دیکھتا رہتا ہے جب تم کھڑے ہوتے ہو وَتَقَلُّبَكَ فِى السّٰجِدِيۡنَ اور نمازیوں کے ساتھ تمھاری نشست و برخاست کو وہ دیکھتا رہتا ہے'' (الشعراء۔ ۲۱۷۔ ۲۱۸)۔ جب مکہ کی فضا مزید بگڑتی ہے۔ ظلم و ستم اور جبر و تشدد میں اضافہ ہوتا ہے تو آپ ؐ کارِ تبلیغ کو جاری رکھنے کے لیے طائف کو منتخب کرتے ہیں۔ طائف مکہ مکرمہ سے ساٹھ میل دور مشرق کی طرف واقع ہے۔ پہاڑی علاقہ مگر سر سبز و شاداب ہے۔ قدرتی چشمے اور قسم قسم کے پھلوں اور میووں کے باغات ہیں۔ سر ولیم میور یورپ کے متعدد سیاحوں کے

اقوال طائف اور اس کے میووں، پھلوں، خصوصاً انگوروں اور گلاب کے پھولوں کی تعریف میں نقل کرتا ہے۔ آپؐ مکہ سے طائف کا سفر پیدل کرتے ہیں۔ آپ ﷺ کے ساتھ آپ کا آزاد کردہ غلام سیدنا زید بن حارثہؓ ہیں۔ راستہ کٹھن ہے مگر راستے میں قبائل کو اسلام کی دعوت دیتے جاتے ہیں۔ قبیلہ بنو بکر کے ہاں جاتے ہیں لیکن وہ ٹھہرنے نہیں دیتے۔ قبیلہ قحطان والے بھی بدسلوکی سے پیش آتے ہیں۔ بالآخر آپؐ طائف کا عزم کرتے ہیں۔ دس روز قیام کیا۔ بنو ثقیف کے سرداروں نے ناروا سلوک کیا۔ آپؐ نے ایسے سڑے گلے اور روکھے پھیکے جواب ہی نہیں سنے بل کہ یہ سرداران اوباش اور آوارہ لڑکوں کو پیچھے لگا دیتے ہیں۔ وہ تالیاں بجاتے، گالیاں دیتے، آوازے کستے حتیٰ کہ پتھروں کی بارش کر دیتے ہیں۔ ان پتھروں سے آپ لہولہان ہو گئے۔ آپ ﷺ کے نعلین مبارک خون سے بھر گئے۔ آپ کا غلام پتھروں کو روکتا ہے۔ کبھی آگے سے کبھی پیچھے سے روکتا ہے۔ مگر وہ تنہا کیا کر سکتا تھا بل کہ آپ ﷺ کا بھی سر اقدس پھٹ گیا۔ آپؐ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ زیدؓ نے اٹھایا۔ ایک باغ میں پہنچے۔ وہ باغ امیر معاویہؓ کے نانا عتبہ بن ربیعہ اور ان کے بھائی شیبہ کا تھا۔ عتبہ و شیبہ موجود تھے۔ آپؐ نے یہاں پناہ لی۔ طبیعت سنبھلی، وضو کیا اور بارگاہ الٰہی میں مصروف ہو گئے۔ ادھر باغ کے مذکورہ مالکان نے اپنے غلام عداس کے ہاتھوں انگوروں کے چند خوشے آپؐ کی خدمت میں بھیجے۔ آپؐ نے انگوروں کو کھانے کا ارادہ فرمایا تو سب سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھی۔ عداس چونک پڑا اور بولا ''یہ جملہ تو اس شہر کے لوگ نہیں بولتے''۔ آپؐ نے پوچھا ''تم کہاں کے رہنے والے ہو''؟ اور تمھارا دین کیا ہے؟ اس نے جواب دیا ''میں عیسائی ہوں اور نینویٰ کا رہنے والا ہوں''۔ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا ''اچھا تم مرد صالح یونسؑ بن متی کے شہر کے رہنے والے ہو؟ عداس نے پوچھا آپؐ ان کو کیسے جانتے ہیں؟ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا وہ میرے بھائی تھے۔ میرے اور ان کے درمیان نبوت کا رشتہ ہے۔ وہ بھی نبی تھے اور میں بھی اللہ کا نبی ہوں''۔ عداس یہ سن کر فوراً جھک گیا۔ آپؐ کے سر اور ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ امام بیہقی (اردو ترجمہ دلائل نبوۃ۔ جلد دوم ص ۵۱۱) لکھتے ہیں کہ ''عداس رسول اللہ ﷺ کے سامنے گر گیا۔ آپؐ کے پیروں کو چومنے لگ گیا حال آں کہ پیروں سے خون بہہ رہا تھا''۔

اعتراض نمبر ۲۱۹

سفرِ طائف کا سفر سوء تدبیر تھا (نعوذ باللہ) [مارگولیس] اس کی دلیل یہ لاتا ہے کہ ''طائف مکہ سے بالکل قریب ہے اور مکہ والوں کے زیرِ اثر تھا اور وہاں رؤسائے مکہ کے باغ تھے جس کی وجہ سے ان کی آمد و رفت رہتی تھی۔ اس لیے جب مکہ کے تمام رؤسا سرکارِ دو عالمؐ کے خلاف تھے تو طائف کے لوگوں سے کیا امید ہو سکتی تھی؟

جواب: سفر طائف سوء تدبیر نہ تھا بل کہ ''فَاصدَعْ بِمَا تُؤمَرْ'' (پس تجھ کو حکم دیا گیا) واشگاف کہہ

دے) حکم خداوندی کی تعمیل تھی۔ یہ سوچی سمجھی تدبیر حکم الٰہی کے تحت تھی۔اس میں امید و نا امیدی کی ذرا برابر گنجائش نہیں بل کہ امید و یاسیت سے بالاتر ہو کر مژدہ جان فزا یعنی پیغام توحید پہنچانا مقصود تھا۔اس کے نتائج خواہ کچھ ہی برآمد ہوں۔ یہ بھی حقیقت سے بعید امر ہے کہ ایک ساتھ رہنے اور آمد و رفت کے ملاقاتی سلسلہ سے خوف زدہ یا کفار کے اہل مکہ سے تعلقات کی بناء پر توحید کا پیغام نہیں پہنچایا حال آں کہ ایک ساتھ رہنے والے اور ایک دوسرے سے میل ملاپ کے باوجود یہ انسانی فطرت ہے کہ سوچ، فکر کے زاویے جدا جدا ہوتے ہیں۔ ہاں کہیں رشتہ اکسیر بھی ہوتا ہے۔البتہ سوچ و فکر اور عمل سچائی پر مبنی ہو، مقصد میں کوئی ذاتی غرض چھپی نہ ہو اور نتیجہ کچھ بھی نکلے تو اسے سوء تدبیر سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔طائف تو پھر بھی مکہ سے کچھ فاصلہ پر ہے لیکن مکہ شہر میں ایک ساتھ رہنے والے مختلف مزاج اور جداگانہ سوچ کے حامل لوگ تھے۔کئی غلط اور کئی صحیح فکر کے مالک تھے جبھی تو صدیق اکبرؓ، عمرؓ و عثمانؓ و علیؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ مشرف با اسلام ہوئے۔قریش کے ساتھ تعلق داری بھی تھی مگر دعوت حق پر لبیک کہتے ہیں۔ جب مکہ کی یہ حالت تھی تو اور جگہوں اور مقامات پر تبلیغ توحید میں کون سا امر مانع تھا؟ کیسے یہ سوء تدبیر تھی کیا انھیں حق کی صراط مستقیم کی طرف نہ بلایا جاتا؟ بایں سبب آپ زید بن حارثہؓ کے ہمراہ عازم طائف ہوئے تا کہ منکرین و مشرکین کو دین اسلام کی دعوت دی جائے۔طائف سے واپسی پر وادی نخلہ میں جنوں نے آپؐ کا قرآن سنا یہاں تک کہ قرآنی آیات نازل ہوئیں۔۔ان آیات میں لفظ ''اذ'' سے آپؐ کے سفر طائف کے واقعہ کی طرف اشارہ کر کے یہ بتایا کہ اہل طائف انسان تھے اور آپؐ کے ہم جنس تھے۔آپؐ ارادتاً ان کو دعوت دینے کے لیے گئے تھے۔ان کی قریش مکہ کے ساتھ عزیز داری اور تعلق داری بھی تھی لیکن تمام علائق کو بالائے طاق رکھ کر انھوں نے آپؐ سے اخلاق سے گرا ہوا اور شرافت کا منہ چڑانے والا انسانیت سوز سلوک کیا۔نہ صرف طعن و تشنیع اور گالیوں کی بوچھاڑ کی بل کہ لہولہان کر دیا۔آپؐ کے نعلین مبارک خون سے لبالب بھر گئے۔ یہ سفر آپؐ کے مقام صبر و استقامت کے مدارج پورے کرانے کے لیے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔سورہ احقاف کے آخر میں '' فاصدع کما اولو العزم من الرسل'' سے عیاں ہے۔(خاتم النبین ۳۳۲۔۳۳۳) اتنی بڑی ذمہ داری کو نبھاتے ہوئے، تکلیفوں اور اذیتوں کو خاطر میں نہیں لایا جاتا شاید اس بنیاد پر کہ مخالفین آپؐ کی آواز پر اسلام نہ لائے اور تکلیفوں کے دہانے کھول دیئے اس کو دیکھ کر سفر کو سوء تدبیر کہتے ہوں۔کاش یہ لوگ اس سلسلے میں اپنے گھر کے فرد کی بات ہی پلے باندھ لیں یعنی ''سر ولیم میور'' کی بات۔ وہ اس امر کے اثبات میں کہتا ہے کہ ''محمد ﷺ کا زور اعتقاد اور اعتماد علی النفس تھا کہ باوجود تمام ناکامیوں کے وہ تنہا ایک مخالف شہر (طائف) میں آ گئے جہاں آپ کا کوئی خیر خواہ نہ تھا بلکہ سارے مخالف تھے اور تبلیغ اسلام کا فرض ادا کیا''۔سر ولیم میور کے اس

بیان پر حاشیہ چڑھاتا ہوں کہ اسلام مکہ میں آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا۔ قریش کی ایذا رسانیاں زوروں پر تھیں۔ اس کے باوجود لوگ حلقہ اسلام میں داخل ہو رہے تھے۔ اسلام کے آہستہ پھیلنے کو ناکامی سے تعبیر کرنا ناانصافی و زیادتی ہے۔ حضرت عمرؓ اسلام لائے تو مسلمانوں کی تعداد ۴۰ ہوگئی تھی۔ ظلم و ستم کے پہاڑ ڈھائے مگر آپؐ کے پیرو آپؐ کے ساتھ رہے اور دست بردار نہ ہوئے۔ وہ پیروکار نہ جھکے، نہ ہٹے نہ بکے بلکہ رہے ڈٹے۔ معاشرتی مقاطعہ قریش کا ناکام ہوا۔ مسلمان امتحان میں کامیاب ہوئے اور ساتھ ہی حج کے موقعہ پر تبلیغ جاری رکھی۔ پھر ملک حبش کو ہجرت ہوئی، ہر حال میں پیغمبر کا ساتھ نہ چھوڑا۔ کسی موقع پر ناکامی سے بچنے کے لیے کنارا کش نہ ہوئے۔ ہر بار حالات کا مقابلہ کیا آخر کار کامیابی نے بڑھ کر ان کے قدم چومے۔ ناکامی وہ ہوتی ہے جس کام کے کرنے کا ارادہ کریں، کچھ مدت اس پر عمل پیرا رہیں پھر تکلیفوں اور راستے میں حائل رکاوٹوں سے شکستہ دل ہو کر کام ترک کر دیں۔ لیکن یہاں ایسی بات نہیں۔ مسلسل دین آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ''سر ولیم میور'' کو کون سی ناکامیاں نظر آئیں؟ نیز آپؐ تنِ تنہا نہ تھے۔ آپؐ کے صحابہ کرام ساتھ ساتھ رہے خواہ وہ ایک تھا یا زیادہ۔ کسی موڑ پر آپؐ کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ ایک نصرانی مورخ نے خوب کہا ''عیسائی اس کو یاد رکھیں تو اچھا ہو'' ''محمد'' صل اللہ نے وہ درجہ نشّہ دینی کا آپؐ کے پیرووٴں میں پیدا کیا جس کو عیسیٰؑ کے ابتدائی پیرووٴں میں تلاش کرنا بے فائدہ ہے۔ جب عیسیٰؑ کو سولی پر لے گئے ان کے پیرو بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان کا نشّہ دینی ہرن ہو گیا اور اپنے مقتدا کو موت کے پنجہ میں گرفتار چھوڑ کر نو دو گیارہ ہو گئے۔ برعکس اس کے محمد ﷺ کے پیرو اپنے مظلوم پیغمبر کے گرد آئے اور بچاؤ میں اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر تمام دشمنوں پر آپ ﷺ کو غالب کر دیا''

کیا عجیب بات ہے کہ مارگولیس اور سر ولیم میور کو ایک ہی واقعہ کس طرح مختلف نظر آتا ہے۔ ایک نے اپنے تعصب و نفرت اور اسلام دشمنی میں سارا زور صرف کر دیا۔ دوسرے نے یعنی سر ولیم نے مارگولیس کے الزام کو رد کر دیا۔ حال آں کہ سر ولیم میور بھی اسلام دشمنی میں کسی سے کم نہیں لیکن سچی بات کبھی کبھار دشمن کی زبان سے بھی نکل جاتی ہے (راستی راہ خود گیرد)۔ اگرچہ اس کے اپنے بیان میں گڑ بڑ ہے۔ پھر بھی اس سے مارگولیس کا رد ہوتا ہے۔ کفار نے سخت مخالفت کی، راہ میں آنکھیں بچھاتے لیکن انہوں نے راہ میں کانٹے بچھائے۔ نماز کی حالت میں پشت پر اوجھڑ ڈالا، گلے میں چادر ڈال کر بل دے کر ایسا کس دیا کہ آنکھیں نکل آئیں۔ مجنوں، دیوانہ، شاعر، کاہن، جادوگر، ساحر زدہ کہا مگر نبوت کی روحانی طاقت اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ حوصلہ کی طاقت کے سامنے یہ سب اذیتیں اور تکلیفیں ہیچ تھیں اور آپؐ کی زبان سے کفار یہ بھی سن چکے تھے کہ اگر وہ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ دیں تب بھی اس کام سے باز نہیں آؤں گا۔ یہ سب کچھ فرائض نبوت کی ادائیگی میں سہنا پڑ رہا تھا۔ پیغامِ

توحید ہر ایک کو پہنچانا ہوتا ہے خواہ جان جائے کہ رہے، تو پھر کا ہے کو سفر طائف سوء تدبیر قرار پاتا ہے؟

آپؐ کے سفرِ طائف کی حکمت عملی رنگ لائی۔ نیز دعا نے اپنا رنگ جمایا۔ دعا بارگاہ الٰہی میں مستجاب ہوئی تو پھر کیا تھا کہ وہی عبد یا لیل ثقفی جس نے طائف میں غلاموں' لڑکوں کو پتھراؤ کرنے کے لیے آپؐ کے پیچھے لگایا تھا وہ مدینہ حاضر ہوتا ہے اور اسلام قبول کرتا ہے۔ آنے والی نسلیں تو دور کی بات ہے وہی نسل ایمان لاتی ہے۔ اگر یہ سفر سوء تدبیر ہوتا تو آپ دعا میں کہتے کہ مجھ سے بھول ہوئی ہے کہ میں ادھر آ نکلا۔ دعائیہ کلمات سے ادنیٰ سا اشارہ بھی نہیں ملتا جس سے ظاہر ہو کہ آپؐ سے خطا ہوئی (نعوذ باللہ)۔

عتبہ اور شیبہ جو باغ کے مالک تھے ان کے دل میں رحم آیا اور اپنے غلام عداس کے ہاتھ انگور بھیجے۔ غلام کے ساتھ مکالمت میں اس پر ایسا اثر ہوا کہ وہ آپؐ کے ہاتھوں اور سر کو بوسے دیتا ہے اور مسلمان ہو جاتا ہے۔ (مواہب۔ ا۔۱۸۳) عداس کے مسلمان ہونے کی تصدیق سید احمد بن زینی دھلان بھی کرتے ہیں۔ (السیرۃ النبویہ۔ا۔۲۴۲) یہ فوری اثر کہ عداس مسلمان ہو گیا۔ دوسرا یہ کہ اس نے سورہ یاد کر لی۔ داعی اسلام کے لیے ایک فرد کا مسلمان ہونا بڑی کامیابی ہے اور وہ بھی اس وقت جب ہر طرف دین اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے دشمن ہی دشمن ہیں۔ the faith of even one man in islam was to him for better than the greatest booty (محمد رسول اللہ۔۱۳۲) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''اے پیغمبر! آپ اس وقت کو یاد کریں جب ہم نے جنات کی ایک جماعت آپ کی طرف بھیجی تا کہ وہ آپ کا قرآن سنیں، پس جب وہ حاضر ہوئے تو آپس میں کہنے لگے کہ خاموش رہو۔ پس جب قرآن پڑھا جا چکا (یعنی نماز ختم ہوئی) تو یہ جن اپنی قوم کی طرف گئے تا کہ ان کو آگاہ کریں۔ انہوں نے جا کر یہ بتایا کہ ہم نے ایک عجیب و غریب کتاب سنی ہے جو موسیٰؑ کے بعد نازل ہوئی جو اپنی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور حق اور سیدھے راستے کی راہنمائی کرتی ہے۔ اے ہمارے لوگو! اللہ کے داعی کی دعوت قبول کرو اور اس پر ایمان لاؤ۔ اللہ تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا اور جو اللہ کے داعی کی دعوت قبول کرے گا وہ روئے زمین میں چھوٹ کر کہیں نہیں نکل سکتا اور نہ اس کا کوئی حامی ہوگا ایسے لوگ کھلی گمراہی میں ہیں''۔ (احقاف)

آپ سے انسانیت سوز سلوک کیا گیا نہ صرف طعن و تشنیع اور لام کاف بکتے تھے بلکہ پتھر مار کر لہو لہان کر دیا۔ رشتہ داری کے بندھن کو بالائے طاق رکھ کر شرافت سے گرا، اخلاق سے عاری سلوک روا رکھا لیکن یہ سب کچھ آپ ﷺ کے استقامت کے مدارج طے کرانے کے لیے تھا۔ ساتھ ہی یہ مژدہ سنایا کہ سفر رائیگاں اور بے ثمر نہیں ہے بلکہ اپنے حکم تکوینی سے جنات کی ایک جماعت بھیجی اگرچہ وہ مخالف جنس تھے اور انہیں تبلیغ کا قصد نہیں کیا تھا پھر بھی وہ قرائت سننے کے لیے ٹھہر گئے اور آپ ﷺ پر ایمان لائے۔

آپ ﷺ کی نیابت میں اپنی قوم کو دعوت تبلیغ دینے لگے یہ اللہ تعالیٰ کا خاص انعام ہے جب چاہے اور جسے چاہے اور ہدایت کے قابل سمجھے اسے نعمت سے متمتع کر دیتا ہے خواہ وہ خاکی ہو یا نوری۔ جنات کے علاوہ انسان بھی پیچھے نہ رہے۔ وہ یوں کہ عروہ بن مسعود ثقفی بھی فتح مکہ کے بعد حصار طائف سے واپسی کے وقت آپؐ کے پیچھے پیچھے مدینہ آتا ہے اور آپؐ کے مدینہ پہنچنے سے قبل آپؐ کو آملتا ہے اور مسلمان ہو جاتا ہے۔ گویا آپؐ کے سفر طائف سے تخم اسلام طائف میں ریز ہو گیا جو آگے بڑھ کر قد آور شجر اسلام بن جاتا ہے جس کی گھنی اسلامی چھاؤں میں ایمان والوں کے لیے راحت و آرام کا سامان میسر ہوتا ہے۔ لہٰذا اس سفر کو حصول اجر اور پیغام الٰہی کے پہنچانے کی نظر سے بے ثمر اور رائگاں نہیں کہہ سکتے۔

سر ولیم میور آپ ﷺ کی دعوت تبلیغ کے سلسلے میں سفر طائف میں دکھائی گئی استقامت اور بلند حوصلگی کو یوں خراج تحسین پیش کرتا ہے "ایک تنہا شخص جس کو اس کی قوم کے اپنے ہی لوگوں نے نہایت حقارت و نفرت سے مسترد کر دیا خدا کے نام سے نہایت جرائت و دلیری سے آگے بڑھتا ہے اور جس طرح یونس بن متی، نینویٰ میں گئے، اسی طرح وہ بھی ایک بت پرست شہر (طائف) کو توجہ اور اسلامی مشن کی معاونت کی دعوت دیتا ہے۔ یہ بات اس کے پختہ یقین پر کہ میری دعوت حقیقتاً الٰہی دعوت ہے، نہایت زبردست روشنی ڈالتی ہے۔" (خاتم النبیین ۔۳۳۲) اس سفر کی ایک منفرد حیثیت یہ بھی ہے کہ کسی نبی کا قدم اس سرزمین تک نہیں پہنچا تھا۔ یہ اولیت آنحضرتؐ کے حصے میں آئی اور آپؐ نے اہل طائف کو پیغام حق کی دعوت دی۔ "میں تیری ذات کے نور سے پناہ چاہتا ہوں جس سے ساری تاریکیاں روشن ہو جاتی ہیں۔۔ مجھے تیری ہی رضا مندی اور خوشنودی درکار ہے"۔ ان دعائیہ کلمات سے مترشح ہوتا ہے کہ صرف اور صرف یہ سفر رضائے الٰہی اور خوشنودی خداوندی کی خاطر تھا نہ کہ کوئی ذاتی غرض اور منفعت تھی اور نہ ہی اس سفر کو سوء تدبیر قرار دے سکتے ہیں کیوں کہ آپؐ کا ہر عمل حکم الٰہی کے تابع ہوتا ہے جیسے "فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ" (پس تجھ کو حکم دیا گیا' واشگاف کہہ دے) یہ سفر اسی فرمان الٰہی کا آئینہ دار ہے۔ آپؐ بولتے ہیں تو خواہش نفسانی سے نہیں بل کہ وحی الٰہی سے۔ "وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحیٰ"۔ آپؐ کا ہر فعل، عمل، بول حکمت الٰہی اور فرمان خداوندی کے تابع ہوتا ہے، سوء تدبیر نہیں ہوتا!

ٹامس کارلائل کہتا ہے ان کے منہ سے جو حکم بھی نکلتا ہے وہ حکمت عملی میں ڈوبا ہوا ہوتا' جہاں بولنے کا موقع نہ ہوتا تو بالکل ساکت رہتے اور جب بولتے تو عقل و اخلاص اور حکمت کے موتی جھڑتے"۔ (ن۔ ۱۴۷۔۴) الختصر آپؐ کا اسوہ حسنہ "لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنہ" نوع انسانی کے لیے کیسے نمونہ قرار پا سکتا ہے؟ تو اس آقا کریم ﷺ کے اسوہ حسنہ میں سوء تدبیر پوری انسانیت کے لیے کیسے نمونہ قرار پا سکتا ہے۔؟

انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں رہنمائی صرف آپؐ کے اسوہ حسنہ سے ملتی ہے تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ کسی ایک شعبہ میں رہنمائی میسر نہ آسکے۔ یہی وہ انسان کامل واکمل واجمل ہیں جس کا اسوہ حسنہ کائنات کے ہر شعبہ زندگی کے لیے عمل میں تقلید کا ایک بہترین اور افضل ترین نمونہ ہے۔ ''الفضل اشھدت بہ الاعداء'' بے شک بزرگی اور فضیلت وہی ہے جس پر دشمن اور اعداء بھی گواہی دیں۔ مقالہ نگار انسائکلو پیڈیا برٹانیکا میں لکھتا ہے ''تمام پیغمبروں اور مذہبی شخصیتوں میں محمد ﷺ سب سے زیادہ کامیاب ہیں''۔

اسراء اور معراج

قرآن کریم میں آیت اسراء میں من المسجد الحرام الی المسجد الاقصی کا ذکر ہے۔ اسراء میں کوئی اختلاف نہیں ہے یہ قرآن سے ثابت ہے۔ تقریباً تیس صحابہ کرام نے روایت کیا ہے۔ اختلاف روایات کی بنیاد پر بعض سیرت نگاروں نے اسراء کا ہونا کئی بار ہوا لکھا ہے۔ ایک دفعہ یہ سفر جسد مبارک اور روح مقدس کے ساتھ ہوا۔ بعثت کے گیارہویں سال یا ایک روایت کے مطابق ہجرت سے ایک سال قبل معراج ہوئی۔ ایک قول کے مطابق ربیع الاول اور دوسرے کے مطابق رمضان شریف اور تیسرے اور مشہور قول کے مطابق رجب میں معراج ہوئی۔ اسی قول پر لوگوں کا عمل ہے۔ مکہ سے بیت المقدس تک کے سفر کو اسراء کہتے ہیں اور وہاں سے آسمانوں کی سیر کو معراج کہتے ہیں۔ اس میں رب تعالیٰ نے آپ کو ملکوت کے عجائب دکھائے۔ ارشاد خداوندی ہے ''لِنُرِيَهُ مِنْ اٰيٰتِنَا (بنی اسرائیل۔۱) جب کہ اللہ تعالیٰ زمان ومکان سے پاک ہے۔ اس شب میں آقا کریم کو اللہ تعالیٰ نے اپنا دیدار کرایا اور بندہ خاص پر وحی کی۔

واقعہ معراج آپؐ نے اپنی چچازاد ام ہانی کو بتایا۔ انھوں نے آپؐ کی چادر کا دامن پکڑ لیا۔ عرض کی اے چچازاد! میں آپؐ کو رب کا واسطہ دیتی ہوں کہ آپؐ قریش کو یہ واقعہ نہ بتائیں ورنہ آپؐ کی تصدیق کرنے والے بھی آپؐ کو جھٹلا دیں گے۔ آپؐ نے چادر کو چھڑا لیا اور ام ہانی نے کہا میں نے آپؐ کے قلب انور کے پاس ایک نور دیکھا۔ قریب تھا کہ میری آنکھیں چندھیا جاتیں۔ میں فوراً سجدہ میں گر گئی۔ جب سر اٹھایا تو آپؐ جا چکے تھے۔ ام ہانی نے اپنی لونڈی سے کہا جا کر دیکھو! آنحضرت ﷺ ان سے کیا کہتے ہیں؟ اس نے بتایا کہ حضورؐ قریش کے اس گروہ کی طرف گئے ہیں جو حطیم میں موجود تھا۔ ابو جہل اور مطعم بن عدی بھی تھے۔ آپؐ نے انھیں واقعہ سنایا۔ ابو جہل نے ازراہِ مذاق کہا ''حضرت عیسیٰؑ کا حلیہ بیان کریں۔ آپؐ نے بتا دیا۔ قریش شور مچانے لگے۔ بعض تالیاں بجانے لگے۔ بعض نے ازراہِ تعجب اپنا ہاتھ اپنے سر پر رکھا۔ مطعم بن عدی نے کہا'' آج سے قبل آپ کا معاملہ اتنا عظیم نہ تھا جتنا کہ یہ امر عظیم ہے۔ آپؐ سچ نہیں بول رہے ہم ایک ماہ تک اپنے اونٹوں کے جگر پگھلا دیتے ہیں تب جا کر بیت المقدس آتا ہے پھر واپس آنے میں ایک ماہ لگتا ہے۔ لات وعزیٰ کی قسم! میں آپؐ کی تصدیق نہیں کروں گا۔ یہ واقعہ کبھی بھی رونما نہیں ہوسکتا۔

معراج پر مبنی اعتراضات!

اعتراض نمبر ۲۲۰

واقعہ معراج کی جمالیات کو جدلیات میں بدل ڈالا۔

جواب: برنارڈ لیوس نے پیش گوئی کی تھی کہ ایران، امریکہ اور اسرائیل پر ۲۲ اگست ۲۰۰۶ میں ایٹمی حملہ کر دے گا۔ یہ حملہ نہ صرف اسرائیل بل کہ پوری دنیا کے اختتام کا باعث ہوسکتا ہے۔اس بیان کے ذریعے سے مغربی طاقتوں کو اشارہ دیا بل کہ ایران پر پہلے ہی حملہ کرنے کی ترغیب دی۔خدا کی خدائی میں کسی کو دخل حاصل نہیں آخر یہ تاریخ خیر و عافیت سے گزر گئی لیکن مغربی میڈیا میں 'لیوس کی استنادی حیثیت میں بہت کم کمی دیکھنے میں آئی۔۲۲ اگست کی تاریخ کی لیوس نے اپنی پیشن گوئی کی وجہ بیان کی کہ" اسلامی کیلنڈر کے مطابق ۲۷ رجب ۱۴۲۷ ہجری بنتا ہے۔اس دن تمام عالم اسلام پیغمبر ﷺ کے واقعہ معراج کی یاد مناتے ہیں۔یہ تاریخ اسرائیل اور اگر ضروری سمجھا گیا تو دنیا کے قیامت خیز اختتام کی ایک موزوں تاریخ ہوسکتی ہے۔(محمد رسول اللہ۔۱۴۱) اس کے الفاظ یہ ہیں۔

" This might well be deemed an appropriate date for the apoealyptic ending of Israial and if necessary all not the world"

لیوس نے اپنی فن کارانہ چابکدستی سے واقعہ معراج کی جمالیات کو جدلیات میں بدل ڈالا جبکہ یہ خالص دینی معاملہ ہے۔اس کے اسرار و رموز اور حکمتیں بے بہا اور بے شمار ہیں۔ایک انسان کا آسمان کی رفعتوں کو تسخیر کرنا غیر معمولی اقدام ہے۔

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

اس واقعہ کی بہ دولت انسان کو رہنمائی ملی جس سے اس نے چاند اور ستاروں کی تسخیر کے لیے کمندیں ڈالی ہیں مگر "لیوس" نے معراج مصطفیٰ کے جمالیاتی پہلو کو جدلیاتی پہلو میں بدل ڈالنے کی فن کارانہ چال چلی ہے۔اور برنارڈ لیوس کی بات بعید از قیاس ہے۔

اعتراض نمبر ۲۲۱

اس واقعہ (واقعہ معراج) پر علوم طبعیات کی رو سے دو اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔" پہلا اعتراض رفتار کی سراعت کے متعلق ہے۔دوسرا یہ کہ کیا جسم خاکی کے لیے ممکن ہے کہ فضا میں روشنی کی

رفتار سے بھی تیز تر پرواز کر سکے۔ معراج کی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ کائنات کے افق اعلیٰ تک تشریف لے گئے، پھر واپس بھی تشریف لائے۔ حال آں کہ آئن سٹائن سائنس دان کے نزدیک کائنات کے دائرہ کے قطر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک اگر روشنی سفر کرے تو اس کو یہ مسافت طے کرنے کے لیے تین ہزار ملین نوری سال کا عرصہ درکار ہے جب کہ روشنی کی اپنی رفتار تین لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ ہے۔ (کونسٹانس جیور جیو۔ وزیر خارجہ رومانیہ)

جواب: وزیر خارجہ رومانیہ کونسٹانس لکھتا ہے کہ اگرچہ علم طبعیات کے نزدیک یہ امر ممکن نہیں کہ اتنی مسافت رات کے ایک قلیل حصہ میں طے ہوئی ہو لیکن مذہبی نقطہ نظر سے ہمیں اس پر اعتراض کا کوئی حق نہیں کہ ہم عیسائی بھی بہت سی ایسی چیزوں کو اپنے مذہبی عقائد میں شمار کرتے ہیں اور ان کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس لیے ہمیں مسلمانوں پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں۔ محمد کرم شاہ الازہری لکھتے ہیں اگرچہ انھوں (وزیر موصوف) نے عقائد کا ذکر نہیں کیا جن پر عیسائی کا ایمان لانا ضروری ہے۔ حال آں کہ وہ علم طبیعی کی رو سے ناممکن ہے۔ لیکن میں انجیل کے حوالہ سے ایک واقعہ کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ سب عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت مسیحؑ کو آسمان کی طرف اٹھایا گیا۔ مختلف انجیلوں کی آیات سے یہ عقیدہ ثابت ہوتا ہے۔ انجیل مرقس کے سولھویں باب کی ۱۹ ویں آیت ملاحظہ فرمائیں۔

''غرض خداوند یسوع ان سے کلام کرنے کے بعد آسمان پر اٹھایا گیا اور خدا کی داہنی طرف بیٹھ گیا''۔

انجیل لوقا میں ہے ''پھر وہ بیت عیناہ کے سامنے تک گیا اور اپنے ہاتھ اٹھا کر انھیں برکت دی جب وہ انھیں برکت دے رہا تھا تو ایسا ہوا کہ ان سے جدا ہو گیا اور آسمان پر اٹھایا گیا''۔

اگر یسوع مسیحؑ زمین سے آسمان کی ان بلندیوں تک پرواز فرما سکتے ہیں جہاں خداوند کے داہنے جانب بیٹھ سکتے ہیں تو وہ ہستی جس کے جوتوں کے تسمے کھولنے کی حسرت مسیحؑ کو عمر بھر بے چین کیے رہی (تو وہ ہستی) کیوں یہ سفر قلیل مدت میں طے نہیں کر سکتی۔ جدید علوم نے یہ ثابت کر دیا ہے وہ لوگ جو معراج کے منکر تھے کہ آپؐ ہزاروں میل کا فاصلہ مکہ سے بیت المقدس اور بیت المقدس سے آسمانوں تک کا فاصلہ چند لمحات میں طے کر لیا تھا۔ انھیں یہ جان لینا چاہیے جس طرح ہوائی جہاز سے چند گھنٹوں میں ہزاروں میل کا سفر طے کر سکتے ہیں، خلا میں آ سکتے ہیں تو وہ قادر مطلق سرکار دو عالم ﷺ کو مکہ سے سدرۃ المنتہیٰ تک لے جانے پر قادر نہیں ہے؟ اس خالق نے انسان کو دریافت کی طاقت بخشی اس طاقت سے انسان نے بہت سی ایجادات کیں جن کی مدد سے ایسے کام لیے جاتے ہیں جو پہلے ناممکن تھے اسی طرح جہاز کی ایجاد سے ہزاروں میلوں کا سفر چند گھنٹوں میں طے ہو رہا ہے تو معراج نے یہ مسافت بہت کم کی ہے کیونکہ اس کا ذریعہ لے جانے کا انسانی دسترس سے باہر ہے بلکہ وہ ذریعہ روحانی ہے جو

اپنے حبیب کو وہاں لے گیا جہاں کوئی نہ گیا تھا۔

دائرہ کائنات کے قطر کے دو کناروں میں بعد کا جو اندازہ آئن سٹائن نے لگایا ہے یا روشنی کی سراعت رفتار کا جو تخمینہ اس نے بیان کیا ہے ہمیں اس کی تردید کی ضرورت نہیں لیکن آئن سٹائن سے یہ پوچھنے کا حق تو رکھتے ہیں کہ اس کے پاس کوئی علمی دلیل ہے جس پر اعتماد کر کے وہ یقین سے یہ کہہ سکتا ہے کہ روشنی سے زیادہ تیز رفتار اور کوئی چیز نہیں ہوسکتی کیوں کہ سائنس جتنی بھی ترقی کر لے اس میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی اور چیز جو روشنی سے بھی کئی گنا تیز رفتار ہو۔ لیکن کیا یہ ممکن نہیں کہ کسی اور قوت سے اس کی تیز رفتاری میں مزید اضافہ کیا جا سکتا ہو۔ جب یہ سب امکانات موجود ہیں اور کسی سائنس دان نے ان کا انکار نہیں کیا' پھر جن کا عقیدہ یہ ہو کہ اس عبد کامل نے خود سیر کرنے کا دعویٰ نہیں کیا بل کہ کہا تو یہ کہا" سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ" ۔تو اس امر پر کیا اعتراض ہوسکتا ہے یا کیا کوئی علوم طبیعہ کا قاعدہ اس کی نفی کر سکتا ہے۔؟

اعتراض نمبر۲۲۲

اس واقعہ (واقعہ معراج) کو روحانی قرار دیا ہے۔ ورمنگھم (حیات محمد۔۱۸۶)

جواب: اسراء خانہ کعبہ سے بیت المقدس تک رات کے جانے کو کہتے ہیں اور معراج بیت المقدس آسمانوں کے اوپر تشریف لے جانے کا نام ہے۔ اسراء قرآن کریم کی آیت شریف سے ثابت ہے۔" سبحن الذی اسری بعبدہ لیلا من المسجد الاقصی الذی بر کنا حولہ لنریہ من ایتینا ان ھو السمیع البصیر"۔ ۔۔۔آخری حصہ "لنریہ من ایتینا' معراج کی طرف اشارا ہے جو مسجد اقصیٰ تک لے گیا تا کہ وہاں سے آسمانوں پر لے جا کر قدرت کی نشانیاں دکھائے۔ آیات کا دکھانا معجزات کا ظہور آسمانوں پر ہے۔ اس کا مبدا ہے اور فکان قاب قوسین اوادنیٰ فاوحی الی عبدہ ما اوحی میں بنا بر تحقیق منتہائے معراج کا ذکر ہے۔ اسراء اور معراج ہر دو حالت بے داری میں ہوئے اور ایک ہی رات میں وقوع پذیر ہوئے آیت پاک میں لفظ "عبد" ہے اور عبد جسم اور روح کا مجموعہ ہے۔ قرآن کریم میں مختلف جگہوں پر عبد کا ذکر ملتا ہے اور ہر مقام پر عبد سے مراد جسم اور روح مراد ہے۔" ذکر رحمۃ ربك عبدہ زکریا"۔(ترجمہ) یہ ذکر اس رحمت کا ہے جو پروردگار نے اپنے بندہ زکریاؑ پر کی تھی"۔

ایک اور سورہ جن میں ہے" وانہ لما قام عبد اللہ یدعوہ کادوا یکونون علیہ بعدا" "جب اللہ کے بندہ محمد ﷺ عبادت کے واسطے کھڑے ہوئے تو جن ان پر ٹوٹے پڑتے ہیں (تا کہ قرآن شریف سنیں) اس طرح آیت زیر بحث میں عبد سے مراد روح و جسم ہے۔ پس معراج جسمانی کا ثبوت اس آیت "سبحان الذی اسراء بعبد ہ،" سے ثابت ہوتا ہے۔

جسمانی یا روحانی: یونانی فلسفیوں کے باطل نظریات کرّوں کے متعلق انسانوں کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے۔ کرہ ہوا، کرہ نار، کرہ افلاک وغیرہ۔ کرہ نار سے گزرنا محال ہے جو شئے گزرے گی آگ میں جل کر بھسم ہوجائے گی۔ اس بناپر بعض روحانی معراج کے قائل ہوئے جب کہ آج کی سائنس نے چاند کو تسخیر کیا، دوسرے سیاروں کی تلاش اور ان میں چھپی چیزوں کے لیے محو سفر ہے اور چاند پر پہنچنے پر کسی کو حیرت نہ ہوئی۔ اب سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ "اگر کسی چیز کی رفتار روشنی کی رفتار سے تیز ہوجائے تو وہ چیز زمانے کی قید سے آزاد ہوجاتی ہے"۔ (سید الوریٰ ۲۵۵ جلد۳) روشنی سے تیز رفتار شے سے سفر کریں تو وقت منفی میں سفر کا شمار کرے گا۔ لہٰذا انسان چالیس پچاس سال بھی لگائے اور واپس اصل مقام سفر، جہاں سے آغاز کیا تھا' پر آئے تو وقت وہی ہوگا جو آغاز کے وقت تھا۔ سائنس دانوں نے آج اسے دریافت کیا لیکن واقعہ معراج نے اسے ۱۴۳۵ سال پہلے ظاہر کردیا تھا۔ آپؐ کی سواری کے لیے براق آیا۔ اس کی رفتار ایسے ہے کہ جہاں تک نگاہ کام کرتی ہے وہاں اس کا ایک قدم ہوتا ہے۔ انسانی آنکھ کروڑوں میل کی دوری پر ستاروں تک آناً فاناً پہنچ جاتی ہے مگر براق کی نگاہ کا عالم کیا ہوگا۔ اللہ جانے یا پھر اس کا رسول جانے۔ معراج سے متعلق کتب میں عجیب وغریب کہانیاں ہیں، معارج النبوہ میں ایسی کہانیاں درج ہیں۔ ایک کہانی یہ ہے کہ آپؐ جوتوں سمیت عرش پر گئے تھے۔ یہ باطل داستان ہے اس کے بارے میں علامہ زرقانی اور علامہ خفاجی کی عبارات یوں ہیں جن کا ترجمہ ہے۔ (سبیات ہمدانی میں ہے کہ حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول خدا نے فرمایا معراج کی رات میں نے جوتے اتارنے کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ندا سنائی دی کہ اے محمد! اپنے جوتے مت اتارو کہ آسمانوں کو بھی ان کا شرف حاصل ہوجائے۔ میں نے کہا اے میرے رب! تو نے موسیٰؑ کو کہا تھا کہ اپنے جوتے اتار دو کیوں کہ تم وادی مقدس میں ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ابوالقاسم! میرے نزدیک ہوجاؤ۔ تم میرے نزدیک موسیٰؑ کی طرح نہیں ہو وہ تو میرا کلیم تھا اور تم میرے حبیب ہو (ہمدانی کا کلام ختم ہوا)) اور ہمدانی کا تعاقب کرتے ہوئے کہا گیا کہ یہ باطل ہے کیوں کہ مکمل تلاش و تحقیق کے باوجود ایسی حدیث دستیاب نہیں ہوسکی جس میں مندرجہ بالا واقعہ مذکور ہو (زرقانی) سید الوریٰ جلد سوم۔ ۲۸۹۔ ۲۸۸ نماز کی بحث ص ۲۹۱۔ ۲۹۰

انشق القمر

اقتربت الساعۃ وانشق القمر (قیامت قریب آگئی اور چاند پھٹ گیا)

جمہور مفسرین کے نزدیک اس سے مراد وہی انشقاق القمر ہے جو جان دو عالم ﷺ کے عہد میں بطور معجزہ رونما ہوا۔ بعض مفسرین رائے کے مطابق اس انشقاق سے مراد وہ انشقاق ہے جو قیامت قائم ہونے کے وقت رونما ہوگا کیونکہ آیت کریمہ میں اس سے پہلے قیامت کے قریب ہونے کا ذکر ہے اس لیے ظاہر ہے کہ انشقاق بھی وہی مراد ہوگا جو قرب قیامت کی نشانی ہے۔ اس رائے پر یہ اعتراض وارد ہوتا

ہے کہ قیامت کے نزدیک جو انشقاق ہو گا وہ تو مستقبل میں ہوگا ، اگر وہ مراد ہوتا تو مستقبل پر دلالت کرنے والا کوئی صیغہ لایا جاتا یعنی چاند پھٹ جائے گا، جبکہ قرآن مجید میں اس انشقاق کا ذکر ماضی کے صیغہ سے کیا گیا ہے یعنی چاند پھٹ گیا، اس لیے اس سے مراد قرب قیامت والا انشقاق نہیں ہو سکتا۔ اس کا جواب ان مفسرین نے یہ دیا ہے کہ مستقبل میں جس چیز کا وقوع یقینی ہو، اس کو اللہ تعالیٰ کبھی کبھی ماضی کے صیغے سے ذکر کر دیتا ہے اور اس سے مقصود یہ بتانا ہوتا ہے کہ اس چیز کا واقع ہونا اتنا متیقن ہے کہ گویا واقع ہو چکی ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ قیامت کو ''امر اللہ'' سے تعبیر کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے اتی امر اللہ ط اللہ کا حکم، یعنی قیامت آ گئی ہے حالانکہ قیامت مستقبل میں آئے گی مگر متیقنا الوقوع ہونے کی وجہ صیغہ ماضی کے ساتھ اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہی صورت ۔۔۔ چاند پھٹ گیا ۔۔۔ میں بھی ہے۔ یہ جواب نہایت معقول ہے اور اگر مسئلہ صرف اسی آیت کا ہوتا تو یہی تفسیر درست ہوتی مگر درحقیقت اس آیت کا مفہوم متعین کرنے والی اس سے اگلی آیت ہے۔ (وان یروا ایۃً یعرضوا ویقولوا سحر مستمر) (اور اگر دیکھتے ہیں کوئی آیت تو اعراض کر جاتے ہیں اور کہتے ہیں یہ تو زبردست جادو ہے۔) ظاہر ہے کہ یہ بات اسی انشقاق کے بارے میں ہو سکتی ہے جو بطور معجزہ رونما ہوا تھا اور کفار ومشرکین نے اس کو سحر مستمر قرار دیا تھا ۔ قیامت کے قریب جو انشقاق ہو گا، اس وقت تو مکے والے کافر موجود ہی نہیں ہوں گے کہ اس کو سحر کہہ سکیں ، جبکہ روئے سخن کفار مکہ کی طرف ہے اور اگر سیاق کلام کے برعکس کفار مکہ کی تخصیص نہ کی جائے بلکہ بعد میں آنے والے کافروں کو بھی اس میں شامل سمجھا جائے تو پھر سوال یہ پیدا ہو گا کہ قیامت کے قریب جو کافر موجود ہوں گے وہ اس وقت واقع ہونے والے انشقاق کو کیوں سحر قرار دیں گے ۔۔۔؟ ساحر کس کو کہیں گے اور وجہ سحر کیا بیان کریں گے ۔۔۔؟ نیز علامات قیامت ظاہر ہونے کے بعد اعراض بھی ممکن نہیں ہوگا کیونکہ اس سمے نظام کائنات درہم برہم ہو رہا ہو گا اور ایک خوف ودہشت کے عالم میں لوگ سب کچھ دیکھ رہے ہوں گے ۔ اس گھڑی بھلا کیوں کر اعراض کر سکیں گے؟ غرض کہ اس آیت نے روز روشن کی طرح واضح کر دیا کہ سابقہ آیت میں وہی انشقاق مراد ہے جو بطور معجزہ ہوا تھا، نہ کہ قرب قیامت والا انشقاق۔

انشقاق قمر کا یہ واقعہ بخاری ومسلم سمیت حدیث وسیرت کی تقریبا ہر کتاب میں موجود ہے کسی میں اختصار کے ساتھ اور کسی میں تفصیل کے ساتھ۔ اس لیے اس کے واقع ہونے میں کسی مومن کو تو شک نہیں ہو سکتا، البتہ پہلے زمانے میں یونانی فلسفے کے زیر اثر بعض ملحدین نے اس کا انکار کیا ہے کیونکہ اس دور میں مشاہدے کے بجائے محض اٹکل پچو سے یہ ثابت کیا گیا تھا کہ آسمان اور اس کے ساتھ وابستہ کرات میں خرق و التیام اور شکست وریخت ناممکن ہے مگر آجکل ایسی باتیں کرنا اپنے آپ کو تماشہ بنانے والی بات ہے کیونکہ جدید تحقیقات ومشاہدات کی رو سے اس فضائے بیکراں میں کتنے ہی ستارے بنتے بگڑتے اور ٹوٹتے پھوٹتے رہتے

ہیں، اگر چاند بھی بطور معجزہ دو ٹکڑوں میں بٹ گیا ہو تو اس میں کونسی ناقابل فہم بات ہے! بعض لوگوں کو یہ الجھن محسوس ہوتی ہے کہ اگر کوئی ایسا واقعہ ہوا ہوتا تو سارے عالم میں اس کا چرچا ہوتا اور دنیا بھر کی رصد گاہیں اس کا ریکارڈ رکھتیں حالانکہ اسلامی روایات کے علاوہ کسی ملک کی حکایات میں اس کا تذکرہ نہیں ملتا۔

ہمیں یہ الجھن بے معنی معلوم ہوتی ہے کیونکہ جب یہ واقعہ پیش آیا، اس وقت کرہ ارض پر کہیں رات کا پچھلا پہر ہوگا اور لوگ محوخواب ہوں گے، کہیں دن ہوگا اور لوگ اپنے کام کاج میں مشغول ہوں گے اس لیے ان لوگوں کے مطلع ضروری نہیں اور جہاں پر تقریباً وہی وقت ہوگا جو شق قمر کے وقت مکہ میں تھا تو وہاں کے رہنے والوں میں سے بھی ہر آدمی اس گھڑی چاند کو تو نہیں دیکھ رہا ہوگا کہ اس کو چاند میں یہ تغیر فوراً محسوس ہو جاتا۔ عام لوگوں کو تو چاند گرہن کا بھی پتہ نہیں چلتا کہ کب لگا اور کب ختم ہوا، حالانکہ گرہن بعض دفعہ کئی گھنٹوں تک جاری رہتا ہے جبکہ شق قمر تو چند لمحوں کی بات تھی اس کا خصوصی توجہ کے بغیر کسی کو کیسے پتہ چل سکتا تھا۔ ہاں جو قافلے رات کو چاند کے رخ پر سفر کر رہے تھے اور چاند ان کو سامنے نظر آ رہا تھا انہوں نے یقیناً یہ منظر دیکھا ہوگا اور بعد میں باہر سے آنے والے قافلوں نے اس کی تصدیق بھی کر دی تھی۔ رہی رصد گاہوں کی بات تو اس زمانے میں اتنی ترقی یافتہ رصد گاہیں کہاں پائی جاتی تھی جو فلکیاتی اسباب وعلل کے بغیر اچانک چند لمحوں کے لیے پیش آ جانے والے واقعہ کا ادراک کرتیں اور ریکارڈ رکھتیں۔۔۔ نیز یہ کیسے ثابت ہوا کہ یہ واقعہ دنیا بھر کی کسی رصد گاہ میں نہیں دیکھا گیا؟ کیا اس وقت کی تمام رصد گاہوں کا ریکارڈ اب تک محفوظ ہے

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قرآن کریم میں انبیاء سابقین کے متعدد حسی معجزات مذکور ہیں مگر جان دو عالم ﷺ کا حسی معجزہ صرف ایک ہی بیان ہوا ہے (۱) یعنی انشقاق قمر۔۔۔ چاند کا دو ٹکڑوں میں بٹ جانا ۔۔۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نزول قرآن کے وقت انبیائے سابقین خود موجود نہیں تھے اس لیے ان کے حالات بیان کرنے کے ضمن میں ان کے معجزات کا ذکر بھی قرآن کریم میں آ گیا، جبکہ جان دو عالم ﷺ بنفس نفیس اس وقت موجود تھے اور آپ ﷺ سے دم بدم ظاہر ہونے والے معجزات کو لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اس لیے ان کے ذکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ شق القمر کو بھی قرآن کریم نے بطور معجزہ نہیں بلکہ واقعہ قیامت کی دلیل کے طور پر بیان کیا گیا ہے اور منکرین قیامت کو تلمیحاً بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارادے سے اگر چاند پھٹ سکتا ہے تو آسمان بھی پھٹ سکتا ہے اگر چاند دو ٹکڑوں میں بٹ سکتا ہے تو ستارے بھی جھڑ سکتے ہیں، اگر چاند کی تقسیم ہو سکتی ہے تو سورج کی بھی تکویر ہو سکتی ہے کیونکہ چاند بھی آسمانی کروں میں سے ایک کرہ ہے۔ اگر آج اس کی شکست وریخت ہو سکتی ہے تو کل اس سمیت دوسرے کروں کی بھی ہو سکتی ہے اس لیے انکار قیامت کی کوئی معقول وجہ نہیں پائی جاتی۔ مصنف سید

الوریٰ کا بیان ختم ہوا۔ مذکورہ بیان میں مصنف نے شق القمر کو معجزہ کی بجائے وقوع قیامت کی دلیل کے طور پر مانا ہے۔ لہٰذا معجزے کی تردید ہو گئی۔

اعتراض نمبر ۲۲۳

"مَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِیْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ" یہاں رویا کا لفظ خواب کے معنی میں ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے یہ خواب آپ کو صرف اس لیے دکھایا تاکہ لوگوں کی آزمائش کی جا سکے"۔

جواب: اگر واقعہ معراج خواب میں ہوتا تو اس قدر شور و غوغا نہ ہوتا۔ آئے دن لوگ خواب دیکھتے ہیں۔ کئی اپنے خوابوں میں ہزاروں میلوں کا سفر کرتے محسوس کرتے ہیں۔ ایک وقت کہیں دوسرے وقت کہیں۔ اس پر معترضین کے جملہ اعتراضات کا رد کلمہ "اسری بعبدہٖ" (اپنے بندے کو رات کے وقت لے گیا) سے ہوتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ لے جانے والی ذات ہر عیب و نقص سے پاک ہے۔ لے جانے والی ذات قادر مطلق ہے۔ اگر وہ اپنے کامل بندے کو جسم اطہر کے ساتھ لے جائے حالت بیداری میں رات کے ایک قلیل حصہ میں خانہ کعبہ سے بیت المقدس اور بیت المقدس سے آسمانوں کے اوپر جہاں تک چاہا لے گیا تو اس میں کون سا امر مانع ہے۔ جب قادر مطلق نے تصریح فرما دی تو انکار کیسا؟ اکثر مفسرین کہتے ہیں کہ اس آیت کا تعلق واقعہ معراج سے نہیں ہے۔ کسی دوسرے خواب سے ہے۔ نیز حضرت عباسؓ نے فرمایا" کہ رویا کا معنی ان آنکھوں سے دیکھنا ہے جس کا مشاہدہ رسول کریم ﷺ کو کرایا گیا۔ علامہ ابن عربی اندلسیؒ حضرت عباسؓ کا قول نقل کرتے ہیں "یعنی اگر معراج عالم خواب کا واقعہ ہوتا تو کوئی اس سے فتنہ میں مبتلا نہ ہوتا اور کوئی اس کا انکار نہ کرتا کیوں کہ اگر کوئی شخص خواب میں اپنے آپ کو دیکھے کہ وہ آسمان کو چیرتا ہوا اوپر جا رہا ہے یہاں تک کہ وہ کرسی پر جا کر بیٹھ گیا اور اللہ تعالیٰ نے اس سے گفت گو کی تو ایسے خواب کو کبھی مستبعد اور خلاف عقل قرار دے کر اس کا انکار نہیں کیا جاتا۔ حضرت انسؓ کی حدیث "پھر میں نیند سے بیدار ہوا اور اپنے آپ کو مسجد حرام میں پایا" اس سے متعلق علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ یہ الفاظ حضرت انسؓ سے شریک نے نقل کیے ہیں اور شریک۔۔ اہل حدیث کے نزدیک حافظ حدیث نہیں ہے۔ یہ الفاظ صرف شریک نے روایت کیے ہیں اور کسی نے نہیں اور آخر عمر میں ان کا حافظہ کم زور ہو گیا تھا۔ اس لیے ان کی روایت کی بجائے ان روایات پر بھروسہ کیا جائے جو باقی تمام راویوں نے بیان کی ہیں۔ علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں "یعنی ان الفاظ کا شمار شریک کی غلطیوں میں ہوتا ہے۔ حضرت امیر معاویہؓ اور بی بی عائشہؓ کے قول سے بھی استدلال کیا جاتا ہے۔ محدثین اس قول کو مشکوک سمجھتے ہیں۔ اگر روایت ثابت بھی ہو جائے تو ان کے قول پر جمہور کے قول کو ترجیح دی جائے گی۔ کیوں کہ اس وقت حضرت صدیقہؓ کم سن بچی تھیں اور امیر معاویہؓ بھی اسلام نہیں لائے تھے۔ لہٰذا یہ ان کی ذاتی رائے ہے۔

اعتراض نمبر ۲۲۴

سر سید نے بھی بڑے پرزور طریقے سے اس واقعہ کو خواب ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور مفصل بحث کی ہے۔

جواب: مستشرقین اور عیسائی مورخین کے اعتراضات سے گھبرا کر اور ان کے زہر میں بجھے ہوئے طعن و تشنیع کے تیروں سے اسلام کو ہر قیمت پر بچانا چاہتے ہیں خواہ اس کوشش میں اسلام کا حلیہ ہی کیوں نہ بگڑ جائے اور عظمت مصطفوی کا عقیدہ ہی کیوں نہ متزلزل ہو جائے اور اللہ کے قادر مطلق ہونے کے دلائل و براہین کو ہی کیوں نہ منہدم کرنا پڑے۔ سر سید واقعہ معراج میں احادیث کا ذکر کرتے ہیں۔ جو ایک دوسرے سے اس قدر متضاد و متناقض ہیں کہ صراحتاً ایک دوسرے کی تردید کرتی ہیں اور اپنی صحت و اعتبار کو کھودیتی ہیں۔ لیکن تناقض کے جو نمونے انھوں نے پیش کیے وہ عجیب ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ اس وقت حطیم میں تھے۔ دوسری میں ہے آپؐ حجر میں تھے۔ تیسری میں ہے کہ آپؐ مسجد حرام میں تھے۔ محمد کرم شاہ صاحب فرماتے ہیں "ذرا غور کریں ان روایات میں تضاد نام کی کوئی چیز ہے۔ حطیم اور حجر تو ایک جگہ کے دو نام ہیں یعنی وہ جگہ جو اصل میں کعبہ شریف کا حصہ تھی لیکن جب سیلاب کی وجہ سے خانہ کعبہ گر گیا تو قریش نے اسے دوبارہ تعمیر کرنا چاہا تو سرمایہ کی قلت کی وجہ سے اسے باہر چھوڑ دیا۔ یہ حصہ حطیم یا حجر مسجد حرام میں ہے۔ ان روایات میں قطعاً تضاد نہیں۔ تضاد کی ایک دوسری مثال کہ مختلف آسمانوں کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ چھٹے آسمان کے متعلق حدیث ہے "پھر مجھے چھٹے آسمان کی طرف لے جایا گیا تو وہاں موسیٰؑ کو پایا"۔ دوسری حدیث میں ہے "پھر ہمیں چھٹے آسمان کی طرف لایا گیا وہاں موسیٰؑ کو پایا۔ انھوں نے مجھے مرحبا کہا اور میرے لیے دعا کی"۔ تیسری حدیث میں ہے "جب میں آگے بڑھا تو موسیٰؑ رو پڑے"۔ تم خود کہو کہ احادیث میں کوئی تضاد ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ بعض روایات میں اختلاف پایا جاتا ہے لیکن اس اختلاف کے بارے میں خود علمائے کرام نے تصریح کی اور جو حدیث زیادہ صحیح اور قوی تھی اس کو ترجیح دی اور ضعیف کو ساقط الاعتبار قرار دے دیا۔ جو تضاد ممتنع ہے تو یہ ہے کہ دونوں روایتیں ایک ہی پایہ کی ہوں۔ کسی کو کسی پر ترجیح بھی نہیں دی جا سکتی ہو اور ان کو یک جا جمع بھی نہ کیا جا سکتا ہو۔

شیخ محی الدین ابن عربی نے جسمانی معراج کے اثبات میں دوسرے دلائل کے علاوہ ایک لطیف دلیل دی ہے کہ "اگر معراج نبوی محض روحانی اور کشفی ہوتی تو آپؐ کو پیاس نہ لگتی کیوں کہ مجرد روحوں پر بھوک پیاس کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ حال آں کہ سرکار دو عالم ﷺ کو شب معراج دو مرتبہ پیاس لگی اور آپؐ نے دونوں دفعہ دودھ نوش فرمایا۔ (خاتم النبیین۔ ۳۴۹)

ابن اسحاق نے کہا کہ سیدنا ابو بکرؓ کے خاندان کے ایک فرد نے مجھ سے ذکر کیا کہ سیدہ عائشہؓ

فرماتی تھیں کہ سرکار دو عالم ﷺ کا جسم مبارک گم نہیں پایا گیا بل کہ آپؐ کی روح کو سیر کرائی گئی۔(بخاری۔۳۵۰) اول ابن اسحاق نے راوی کا نام نہیں لیا۔ابوبکر کے خاندان کا ایک فرد جس نے سیدہ کا نام لیا۔دوم درمیان میں تین راوی غائب ہیں۔سوم سیدہ عائشہ اس وقت آپؐ کے عقد میں نہ تھیں لہذٰا وہ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ جسم گم پایا گیا۔اس کے برعکس سیدہ عائشہؓ کا صحیح مذہب یہ ہے کہ آپ ﷺ کی معراج جسمانی تھی چنانچہ قاضی عیاض نے لکھا ہے کہ یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچا ہے کہ سیدہ عائشہؓ کا قول صحیح ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ کی معراج جسم مبارک کے ساتھ ہوئی تھی۔

چہارم امام زرقانی نے لکھا کہ یہ روایت صحیح نہیں اس کی ایک وجہ تو محمد بن اسحٰق ہے کیوں کہ وہ اکثر محدثین کے نزدیک ضعیف ہے۔ابن عباس سے ان کے شاگرد عکرمہ نے عرض کیا کہ کیا یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد نہیں ”لَا تُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ وَھُوَ یُدْرِکُ الْاَبْصَارَ“ کہ آنکھیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں۔آپؐ نے فرمایا افسوس تم نہیں سمجھے یہ اس وقت ہے جب کہ وہ اس نور کے ساتھ تجلی فرمائے جو اس کا نور ہے۔حضورؐ نے اپنے رب کو دو مرتبہ دیکھا۔پیر کرم شاہ صاحب بہ حوالہ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ ابن عمر نے ابن عباسؓ سے اس مسئلے کے بارے میں رجوع کیا اور پوچھا کہ کیا حضورؐ نے رب کا دیدار کیا پس ابن عباسؓ نے جواب دیا کہ حضورؐ نے اپنے رب کا دیدار کیا۔ابن عمرؓ نے اسے قبول کیا(ضیاء النبی ج۔۲۔۵۳۳)

جمہور اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ پرواز اور اسراء کا یہ نہج جسمانی تھا ہمارے نزدیک اس باعث کا سارا الجھاؤ اس چیز سے پیدا ہوا ہے کہ یار لوگوں نے مدرسیت کے تتبع میں انسان کو جسم اور روح کے دو الگ خانوں میں تقسیم کر دیا ہے حالانکہ انسان محض ایک ”النا“ ہے جس میں جسم و روح کی دونوں سطحیں برابر شامل ہیں اس کے ظہور کی ایک خارجی سطح جسم کہلاتی ہے اور داخلی سطح روح۔انسان بہر حال ایک ہے اور اس کے کسی بھی فعل کو محض جسمانی یا روحانی قرار نہیں دے سکتے اس نقطہ نظر سے دیکھئے تو مثلاً بہت آسان ہو جاتا ہے۔معراج کے معنی یہ ہوں گے کہ حضور ﷺ کی ”انا“ کو جس میں جسم بھی داخل ہے اللہ تعالیٰ نے سیر و اسراء کے ذریعے ان تمام بہرہ مندیوں سے نوازا کہ جن کا تعلق اسرار دین اور رموز کائنات کے عجیب وغریب انکشافات سے تھا۔یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں واشگاف الفاظ میں اسراء کو اپنے ”عبد“ کی طرف منسوب ٹھہرایا۔۔۔مسند امام احمد میں بھی واقعہ معراج کے لیے اسی طرح کا پیرایہ بیان اختیار کیا گیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ معراج کا تعلق ایک بلندتر ”انا“ سے ہے۔گرامی قدر ذات اور شخصیت سے ہے صرف روح اور اس کے کوائف سے نہیں۔قابل غور بات یہ ہے کہ سورہ بنی اسرائیل میں قرآن مجید نے اس کو ایسا ہی قرار دیا ہے کہ جس نے لوگوں کو کفر و ایمان کی آزمائش میں ڈال

دیا۔ ظاہر ہے کہ رویا کے معنی محض خواب کے ہوتے تو اس میں انکار ہی کیا تھا اور اس کے ادراک کے لیے صرف حضرت صدیقؓ ہی کے ظرف عالی کو یہ توفیق کیوں نصیب ہوتی کہ وہ اس کو بلا تامل مان لیں۔ مزید برآں معراج کے بعد اختلاف کا جو طوفان اٹھا، اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تاریخ کا غیر معمولی واقعہ تھا محض خواب نہ تھا۔ عیسائی مزاج کی شدت و تلخی کا نتیجہ ہے کہ وہ پیغمبر اسلام ﷺ کی ذات میں جس طرح بن پڑے، نقص نکالتے ہیں۔ ''کیا ان کا یہ ایمان نہیں ہے کہ حضرت الیاسؑ آسمان پر انسانی جسم و شکل کے ساتھ موت کا ذائقہ چکھے بغیر ایک آتشیں گاڑی میں بذریعہ ایک آندھی کے اٹھا لیے گئے ہوں؟ اور کیا عیسائی اس بات کو دینی امر نہیں خیال کرتے کہ حضرت مسیحؑ مرنے کے بعد اٹھے اور آسمان پر چلے گئے اور خدا تعالیٰ کے دست راست کی طرف بیٹھے یعنی خود اپنی ہی دست راست کی طرف کیونکہ وہ خود خدا تھے'' (خطبات احمدیہ۔۴۰۵) تو نبی اکرم ﷺ کے معراج سے مفر و مکر کیوں؟ جبکہ حضرت الیاسؑ اور مسیحؑ کے جسمانی طور پر سفر کرنے کے معتقد ہیں لیکن محمد عربی ﷺ کے جسمانی معراج پر ایمان نہیں رکھتے اور چہ میگوئیاں کرتے ہیں کیوں؟

اعتراض نمبر ۲۲۵

منکرین معجزات کا انکار اس وجہ سے کرتے ہیں کہ یہ خلاف عقل ہیں۔ نظام کائنات قوانین کا پابند ہے جنھیں قوانین فطرت کہا جاتا ہے۔ فطرت کے ان قوانین میں رد و بدل ممکن نہیں کیوں کہ یہ قوانین اٹل اور آخری ہوتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو سارا نظام بگڑ جائے۔ بایں سبب عقل اسے نہیں مانتی کہ یہ قوانین فطرت کے خلاف ہوتے ہیں۔ معراج ایک عظیم معجزہ ہے اس لیے یہ بھی عقلاً ٹھیک قرار نہیں پاتا۔

جواب: معجزہ کی تعریف یہ کرنا کہ جو قوانین فطرت کے خلاف ہو اور قوانین قدرت سے برسر پیکار ہو درست نہیں بل کہ اہل علم نے معجزہ کی تعریف یوں کی ہے ''یعنی مدعی رسالت کی سچائی ثابت کرنے کے لیے کسی ایسے امر کا ظہور پذیر ہونا جو عادت کے خلاف ہو اسے معجزہ کہتے ہیں''۔ علامہ تفتازانی لکھتے ہیں ''معجزہ وہ کام ہے جو عادت کے خلاف ہو، یہ اس شخص کے ہاتھ سے ظاہر ہوتا ہے جو نبوت کا مدعی ہو، جب وہ منکرین کو اس کام کی مثل لانے کا چیلنج کرے اور وہ اس کی مثل لانے سے عاجز رہیں''، قرآن کا معجزہ ہونے کی دلیل ہے کہ قرآن کا دعویٰ ہے اس کی مثل کوئی نہیں لا سکتا (فاتوبسورۃ من مثلہ) ان لوگوں کا یہ اعتراض تو تب قابل التفات ہوتا جب معجزہ کو قوانین قدرت کے خلاف مانا جاتا۔ ہوسکتا ہے یہ معجزات قانون فطرت کے مطابق ہی نمو پذیر ہوئے ہوں لیکن ابھی تک وہ قانون فطرت ہمارے ادراک کی سرحد سے ماورا ہوں۔ یہ دعویٰ کرنا کہ فطرت کے تمام قوانین بے نقاب ہو چکے ہیں اور ذہن انسانی نے ان سب کا احاطہ کر لیا ہے انتہائی مضحکہ خیز اور غیر معقول بات ہے۔ آج تک کسی فلسفی یا سائنس دان نے اس بات کا دعویٰ نہیں کیا نیز قوانین فطرت کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ اٹل

اور غیر متغیر ہیں یہ بھی قابل تسلیم نہیں۔ یہ خیال تب قابل قبول ہوتا جب ان قوانین کو ہر قسم کے نقص وعیب سے مبرا سمجھا جائے اور ان کے بارے میں یہ عقیدہ اختیار کیا جائے کہ اس کائنات کی آرائش وزیبائش کے لیے یہی قوانین کفایت کرتے ہیں۔لیکن اہل خرد کے نزدیک یہ خیال محل نظر ہے۔ چناں چہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار نے معجزہ پر بحث کرتے ہوئے لکھا۔

"It is unwarrented idealism and optimism which finds the course of nature so wise so good and any change in it must be regarded as incredible"

ترجمہ: یعنی یہ نظریہ ایک غیر معقول تصور اور خوش فہمی ہے کہ فطرت کا طریقہ کار اتنا دانش مندانہ اور بہترین ہے کہ اس میں کسی قسم کی تبدیلی جائز نہیں۔(ضیاء النبی ج۔۲۔۴۹۶۔۴۹۵)

''ہیوم'' کہتا ہے کہ ہمارا تجربہ اور مشاہدہ یہ ہے کہ عالم ایک مخصوص نہج اور متعین انداز کے مطابق چل رہا ہے اور معجزات ہمارے تجربات اور مشاہدات کے خلاف رونما ہوتے ہیں۔اس لیے اگر معجزہ کو ثابت کرنے کے لیے ہمارے پاس جو دلائل ہیں وہ تجربہ اور مشاہدہ کے دلائل وبراہین سے جب تک زیادہ قوی اور مضبوط نہ ہوں اس وقت تک ہم معجزہ کو تسلیم نہیں کر سکتے۔کیوں کہ ثبوت معجزہ کے لیے ایسے وزنی دلائل موجود نہیں اس لیے عقلاً معجزہ کا امکان تسلیم کرنے کے باوجود ہم ان کے وقوع کو تسلیم نہیں کر سکتے۔

اس کے جواب میں انسائیکلو پیڈیا کا مقالہ نگار اس نظریہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ہم تمھارا یہ قاعدہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ معجزات تجربہ اور مشاہدہ کے خلاف ہوتے ہیں کیوں کہ تجربات سے تمھاری مراد کیا ہے۔کیا تم یہ کہتے ہو کہ معجزہ تمام تجربات کے خلاف ہوتا ہے تو آپ کا یہ عقیدہ کلیتاً محتاج دلیل ہے۔پہلے آپ یہ ثابت کریں کہ آپ نے تجربات کا احاطہ کر لیا ہے۔پھر آپ کو یہ ثابت کرنا ہوگا کہ یہ معجزہ ان تمام تجربات کے خلاف ہے۔ جب تک اپنی دلیل کی کلیت ثابت نہیں کر سکتے اس وقت تک آپ کی دلیل قابل قبول نہیں اور اگر آپ یہ کہیں کہ تجربات سے مراد تجربات عامہ ہیں یعنی معجزہ تجربات عامہ کے خلاف ہے تو پھر اس سے تو فقط اتنا ہی ثابت ہوتا ہے کہ معجزہ عام تجربات اور معمولات کے خلاف ہے۔تمام تجربات اور مشاہدات کے مخالف ہونا لازم نہ آیا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ معجزہ کسی تجربہ کے مطابق ہو لیکن وہ تجربہ آپ کے فہم کی رسائی سے ابھی بلند ہو۔(ضیاء النبی ۲۔ص ۴۹۸)

اس پر استاد احمد امین مصری کی تقریر ملاحظہ کریں۔استاد موصوف لکھتے ہیں کہ ہمیں یہ حق پہنچتا ہے کہ ہم ہیوم سے پوچھیں کہ ایک طرف تو تمھارا یہ دعویٰ کہ علت ومعلول اور سبب ومسبب کا حقیقت الامر سے کوئی تعلق نہیں کیوں کہ ہم بارہا مشاہدہ کرتے آئے ہیں کہ ایسا ہو تو یوں ہو جاتا ہے۔اس لیے ہم نے

ایک چیز کو دوسری چیز کی علت فرض کر لیا ہے حال آں کہ حقیقت میں اس کا علت ہونا ضروری نہیں اور دوسری طرف تم معجزہ کا انکار اس اساس پر کرتے ہو کہ یہ مشاہدہ اور تجربہ کے خلاف ہے۔ جب تمھارے نزدیک علیت اور معلولیت کا کوئی قانون ہی نہیں۔ ہر چیز بغیر تحقیق علت وقوع پذیر ہو رہی ہے اور کسی چیز کے ساتھ ربط نہیں تو پھر اگر معجزہ کا وقوع ہوا جس کی ہم تعلیل کرنے سے قاصر ہیں تو کون سی قباحت ہوگی۔ پہلے بھی جتنی چیزیں معرض وجود میں آئیں وہ علت حقیقیہ کے بغیر موجود تھیں اور یہ امر بھی بغیر علت کے ظاہر ہوا پھر اس کی وجہ کیا ہے کہ ایک کو تو تم تسلیم کرتے ہو اور دوسرے کے انکار میں تم اتنا غلو کرتے ہو کہ تمھیں اپنے فلسفہ کی بنیاد بھی سرے سے فراموش ہو گئی۔

اعتراض نمبر ۲۲۶

سر ولیم میور بھی معجزات نبی مکرمؐ کا منکر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ''جب آنحضرتؐ کھانے پر موجود نہ ہوتے تھے تو تمام خاندان اپنے کفایت شعار کھانے سے بھوکا اٹھتا تھا لیکن جب پیغمبر صاحب بھی کھانے میں شریک ہوتے تھے تو سب کا پیٹ بھر جاتا تھا اور یہ فرماتے ہیں کہ اس عروج سے نبی کی بڑائی مظنون ہوتی تھی مگر اہل اسلام تو ایسی روایتوں کو معتبر نہیں سمجھتے اور نہ ان کے معتبر ہونے کی کوئی سند موجود رکھتے ہیں''۔

جواب: عیسائی 'متی' کے باب ۲۴ ورس ۱۹۔۲۰ کے اس بیان پر اعتقاد رکھتے ہیں کہ ''اس نے (یعنی حضرت مسیحؑ) نے جماعت کو (جن کی تعداد ۵۰۰۰ تھی) گھاس پر بیٹھنے کا حکم دیا اور پانچوں روٹیاں اور دونوں مچھلیاں نکالیں اور آسمان کی جانب نظر اٹھا کر دعا کی اور ان کو توڑا اور روٹیاں اپنے حواریوں کو دیں اور حواریوں نے جماعت میں تقسیم کیں اور ان سب نے پیٹ بھر کر کھائیں اور بچے ہوئے ٹکڑوں کو جن سے بارہ ٹوکرے بھر گئے' اٹھالیا۔''

اہل اسلام اس قسم کی معتبر روایات کو مانتے ہیں۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی شرکت سے خاندان سیر ہو جاتا ہے۔ آپؐ کی شمولیت سے کھانے میں برکت ہوتی ہے تو اس میں کوئی پریشانی والی بات نہیں۔ نیز ولیم میور جو یہ کہتے ہیں کہ اہل اسلام ایسی روایات کو معتبر نہیں سمجھتے ہمارا اس سے پوچھنے کا حق بنتا ہے کہ انھوں نے ان اہل اسلام کے ناموں کی نشان دہی کیوں نہیں کی' ان کی فہرست کیوں درج نہیں کی۔ محض کہنے سے بات نہیں بنتی۔ اپنی پرانی روش پر چلتے ہوئے بس الزام دھر دیا جس میں ذرا بھر حقیقت نہیں اور باسی کڑھی میں ابال لانے کی سی بات کی ہے۔

آپ ﷺ کی تشریف آوری سے قبل کیا ہمیشہ آپؐ کے خاندان کے لوگ بھوکے رہتے تھے۔ اس معزز خاندان کے ذی وقار لوگ بھوکوں کو کھانا کھلاتے، حاجیوں کو کھلانے اور پلانے کا بندوبست کرتے تھے۔ اس خاندان کا وہ سخی مرد جو نہ صرف انسانوں بل کہ پرندوں' درندوں کے لیے پہاڑوں پر گوشت پھینک

دیتا تھا کہ وہ بھی کھانے سے محروم نہ رہیں۔کھانے میں اضافہ کیوں نہیں ہوسکتا،حضرت مسیحؑ کی برکت سے پانچ ہزار آدمیوں کے صرف پانچ روٹیوں اور دو مچھلیوں سے پیٹ بھر جاتے ہیں۔نہ جانے مسیحؑ کے معجزے کو ماننے والے رسول عربی ﷺ کے معجزہ سے انکار کیوں کرتے ہیں۔یہ ان کی دوغلی پالیسی ہے۔

معجزہ کے ثبوت میں اصل اشکال جو پیش آتا ہے وہ یہ ہے کہ عالم کائنات ایک خاص نظام پر قائم ہے ۔ہر شے کی ایک علت اور ہر حادثے کا ایک سبب ہے۔علت وسبب کے بغیر کوئی شے پیدا نہیں ہوتی۔علت و معلول کے سلسلے کا اس قدر باہم لزوم ہے کہ وہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوسکتے۔ہر ایک شے کی خاصیت ہے جو اس سے الگ نہیں ہوسکتی اور جس شے میں جس چیز کی خاصیت نہیں،اس کا اس سے صدور بھی نہیں ہو سکتا۔آگ جلاتی ہے،سمندر بہتا ہے،درخت ساکن ہے،پتھر چلتا نہیں،سورج میں حرارت،کنکر بولتے نہیں اور سنکھیا زہر قاتل ہے،انسان مرکر پھر جیتا نہیں،اب اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ آگ نے جلایا نہیں، سمندر دفعتاً تھم گیا،درخت چلنے لگا،پتھر حرکت کرنے لگا۔آفتاب میں سیاہی آگئی،زہر کھا کر آدمی مرا نہیں اور انسان مرکر ایک اشارہ سے پھر جی اٹھا تو درحقیقت وہ اس پورے نظام فطرت کو جس پر دنیا قائم ہے درہم برہم کرنا چاہتا ہے۔علل واسباب کے تار و پود کو بکھیرنا چاہتا ہے اور اشیاء کے ان طبائع اور خواص کے اعلانیہ انکار پر آمادہ ہے جو بار ہا کے تجربے سے ثابت ہو چکے ہیں اور جن میں کبھی تخلف نہیں ہوا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ نظام فطرت یہ سلسلہ علل واسباب، یہ طبائع اور خواص اس قدر نا قابل تنسیخ ہیں کہ ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہوسکتا۔فلاسفہ کا ایک گروہ جس میں فارابی،ابن سینا اور ابن مسکویہ ہیں،اس بات کا قائل ہے کہ یہ تو سچ ہے کہ اس نظام فطرت اور سلسلہ علل واسباب میں تغیر و تبدل نہیں ہوسکتا اور نہ دنیا میں کوئی شے بغیر علت عادیہ اور سبب طبعی کے پیدا ہوسکتی ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ معجزات اس نظام وسلسلہ سے الگ ہیں اور وہ فطرت کے قانون کو توڑتے ہیں بلکہ وہ بھی علل واسباب طبعی کے نتائج ہیں زیادہ سے زیادہ یہ کہ ان علل واسباب کے احاطہ سے اب قاصر ہیں اور وہ اب تک ہماری نگاہوں سے مخفی ہیں ممکن ہے کہ تحقیقات انسانی کا دائرہ اتنا وسیع ہو جائے کہ ان کے علل واسباب ہماری فہم میں آجائیں۔معتزلہ کہتے ہیں کہ ہم کو یہ تسلیم ہے کہ عالم میں ایک خاص نظام فطرت، موجودات میں سلسلہ علل ومعلومات اور اشیاء میں طبائع وخواص ہیں لیکن ہم ان کی اس درجہ ہمہ گیری کو تسلیم نہیں کرتے کہ یہ کسی حال میں کسی طریق سے شکست نہیں ہوسکتے۔۔۔۔۔۔فلاسفہ اور حکماء کی وہ جماعت جو قوانین فطرت کے نا قابل شکست ہونے پر ایمان رکھتی ہے اور اس بناء پر معجزات وخوارق کا انکار کرتی ہے امام رازی نے لکھا ہے کہ خود ان فلاسفہ کا اصل عقیدہ یہی ہے مگر وہ کئی ایسے اصول تسلیم کرتے ہیں جن کی بنا پر خوارق فطرت کا تسلیم کرنا ان کے لیے لازم ہو جاتا ہے مثلاً وہ توالد ذاتی کے قائل

ہیں یعنی یہ کہ جن جانداروں کی پیدائش ایک نظام خاص کے ساتھ ہوتی ہے ایک قطرہ آب سے خون، خون سے گوشت پھر بتدریج مدت حمل کے اندر وہ شکم مادر میں پرورش پاتے رہتے ہیں۔ ایک مقررہ زمانہ کے بعد وضع حمل ہوتا ہے پھر شیر خوارگی اور بچپن کے دور سے آہستہ آہستہ بڑھتے ہوئے ایک تنومند ذی روح صورت میں ظاہر ہوتے ہیں، وہ یکا یک ان بیچ کی منازل کو طے کیے بغیر اس ہیکل اور صورت میں نمودار ہو جائیں۔ فلاسفہ کہتے ہیں کہ قطرہ آب سے لے کر عالم شباب کے عہد تک اس مجموعہ عناصر کو جو سالہا سال صرف کرنے پر اس کی وجہ یہ تھی کہ ان عناصر میں حیات کی قابلیت پیدا ہونے کے لیے ایک خاص قسم کے اعتدال ترکیب کی ضرورت تھی جب ترکیب میں یہ اعتدال پیدا ہوا حیات پیدا ہوگئی اس بناء پر اگر کسی مجموعہ عناصر میں اس قسم کا اعتدال پیدا ہو جائے جس میں حیات انسانی کے قبول کی صلاحیت ہو تو بغیر نطفہ، حمل، خون، گوشت، وضع حمل، شیر خوارگی اور بچپن وغیرہ درمیانی وسائط طبعی کے اچھا خاصا ایک نوجوان مٹی کے پتلے سے بن کر کھڑا ہو سکتا ہے جیسا کہ برسات میں اکثر کیڑے مکوڑے سڑی گلی مٹی میں ایک خاص اعتدالی کیفیت پیدا ہو جانے سے جاندار ذی روح بن جاتے ہیں۔ اس تفصیل کی بناء پر ان کے نزدیک یہ ثابت ہو گیا کہ ذی روح کی پیدائش کے لیے دنیا میں جو سلسلہء اسباب عادتاً جاری ہے اس کے خلاف ہو سکتا ہے تو پھر عصا سانپ بھی ہو سکتا ہے مردے زندہ بھی ہو سکتے ہیں پہاڑ سونا بھی بن سکتا ہے۔ ایک عصا کے سانپ بن جانے کی فطری صورت یہ ہے کہ پہلے وہ سڑ گل کر مٹی ہو جاتا اور وہ مٹی غذا کی شکل میں ایک سانپ کے اندر جاتی ہے اور پھر وہ غذا دوسری شکل میں بن کر سانپ کا بچہ بن جاتی ہے۔ تو الذاتی کے اصول پر یہ ممکن ہے کہ بیچ کے وسائط کے بغیر عصا میں سانپ بننے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔

یہ بھی قابل غور ہے کہ ہم جن کو اصول فطرت، نوامیس قدرت اور لاز آف نیچر کہتے ہیں وہ صرف روزمرہ کے مشاہدات عادیہ کے نام ہیں۔ ہم دیکھتے چلے آ رہے ہیں کہ درخت کس طرح اگتے ہیں اور جاندار و موجودات کس طرح پیدا ہوتے ہیں۔ آفتاب کس طرح طلوع ہوتا ہے، پانی کس طرح برستا ہے ان کو دیکھتے دیکھتے ہم اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ ہم ان کا اسی طرح ہونا ضروری اور اس کے خلاف ہونا محال قطعی سمجھتے ہیں حالانکہ اس کے لیے ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ ہمارے مشاہدہ میں ہے کہ دانہ زمین میں ڈالا جاتا ہے کچھ دنوں کے بعد، پھوٹتا ہے اس میں کونپلیں نکل آتی ہیں پھر وہ پودے کی شکل اختیار کرتا ہے، شاخیں نکلتی ہیں اور بڑھ کر درخت بن جاتا ہے۔ اس طرز پیدائش کو دیکھتے دیکھتے حیرت زائی اور استیعاب و استعباد کی روح ہم سے بالکل فنا ہو گئی اور ہم کبھی ایک لمحہ کے لیے غور نہیں کرتے کہ ایک جامد دانہ درخت کی شکل میں کیونکر بدل گیا لیکن ہم سے کہا جاتا ہے کہ ایک بے جان لکڑی جاندار سانپ بن گئی اور عیسیٰؑ نام کا ایک بچہ بن باپ کے پیدا ہو گیا تو ہماری محدود عقل اور تجربے کا پُرغرور سر

انکار سے ملنے لگتا ہے یہ کیوں؟ اس لیے کہ کبھی ہم نے ایسے ہوتا دیکھا نہیں۔ سورج روز مشرق سے طلوع اور مغرب میں غروب ہوتا ہے ہم کو اس پر مطلق تعجب نہیں ہوتا اور نہ یہ مستبعد معلوم ہوتا ہے اور جب یہ سنتے ہیں کہ قیامت کے دن آفتاب مشرق کی بجائے مغرب سے طلوع ہوگا تو ہم اس کو خلاف عقل کہتے ہیں۔ کیا مشرق سے اس کا نکلنا عقل کے موافق تھا؟ اور تم آفتاب کو اگر مشرق سے نکلتے نہ دیکھتے تو خود بخود عقلاً فیصلہ کر لیتے کہ اس کو مشرق ہی سے نکلنا چاہیے اور مغرب میں ہی ڈوبنا چاہیے۔ عموماً انسان کے ایک سر، دو آنکھیں، دو کان، دو ہاتھ، دو پاؤں اور ہر ہاتھ میں پانچ انگلیاں ہوتی ہیں لیکن تاریخ طبع انسانی کی کوئی کتاب پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ قدرت کے مستثنیات کی بھی کوئی انتہا نہیں اور ہزاروں بچے اس کے خلاف پیدا ہوتے ہیں اب جس طرح تم اس پر اعتراض نہیں کر سکتے کہ اس طرح بچے کے چار ہاتھ اور چار پاؤں پر اعتراض نہیں کر سکتے اور جس طرح تمہیں اس پر حیرت نہیں ہوتی کہ آدمی جی کر مر کیوں جاتا ہے ایسے ہی اس پر حیرت نہ کیجئے کہ مر کر جی کیونکر جاتا ہے۔ ان دونوں میں فرق صرف یہ ہے کہ ایک واقعہ کو تم نے بار بار دیکھا ہے اور دوسرے کو کبھی نہیں دیکھا لیکن کسی چیز کا دیکھنا اور نہ دیکھنا کسی چیز کے فی نفسہ محال یا ممکن ہونے پر دلیل نہیں ہو سکتی۔

حاصل یہ کہ ہم کو معجزات کے متعلق جو استبعاد نظر آتا ہے اس کی صرف یہ وجہ ہے کہ وہ ہمارے گزشتہ تجربات و مشاہدات کے خلاف ہوتا ہے لیکن اس کا فیصلہ ہر شخص کر سکتا ہے کہ اس کے گذشتہ تجربات و مشاہدات میں غلطی کا ہونا ان میں انقلاب ہو جانا کچھ محال نہیں۔ طبعیات جدیدہ نے طبیعیات قدیم کی تحقیق کی دیوار ڈھا دی ہے۔ حکمائے جدید نے حکمائے قدیم کے سینکڑوں تجربات باطل کر دیئے۔ ہیئت قدیم اور جدید میں آسمان اور زمین کا اختلاف پیدا ہو گیا۔ اختراعات جدیدہ میں سیکڑوں قدیم مستبعدات اور ممتنعات کو ممکن بلکہ واقعہ بنا دیا جب کہ ہمارے گذشتہ تجربات اور تحقیقات کا یہ حال ہے تو انسانی تحقیقات و تجربات کی آئندہ صحت کی کون ضمانت دے سکتا ہے۔ فلسفہ یونان پڑھ کر ہم یقین کرتے تھے کہ زمین ساکن اور سورج متحرک ہے اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ آفتاب ساکن اور زمین متحرک ہے۔ الغرض یہ کہ بنی نوع انسان کا اصل سرمایہ علم علل و معلوم میں جو کچھ ہے وہ صرف ان کے تجربہ کی کمائی ہے اور وہ اسی کی بنیاد پر استدلال تمثیلی کے طور پر ایک چیز کو بار بار دیکھنے سے اپنے ذہن میں حکم کلی پیدا کر لیتے ہیں جیسے تین چار سیبوں کو دیکھا، سونگھا، مزہ چکھا تو ایک جیسا پایا پھر چند سیبوں کو دیکھ کر ہم یہ حکم کلی لگا دیتے ہیں کہ ہر سیب ایسا ہوتا ہے اور اس کا خاصہ اور اثر ہوتا ہے۔ غور کیجئے کہ تمہارے یہ قضایا جو محض استدلال تمثیلی کی بنیاد پر قائم ہیں عقلاً کیونکر نا قابل شکست یقین بننے کا دعویٰ کر سکتے ہیں یہ اور بات ہے کہ تمہارا عادتاً اپنی عملی اور کاروباری دنیا کے لیے ان پر یقین کر کے جلب منافع اور دفع مظا

میں ان سے کام لیں اور یہی علت عادیہ کی حقیقت و مصلحت ہے۔ اسباب خفیہ کی توجیہ بے کار ہے۔

ابن سینا، فارابی کے بقول معجزہ اسباب خفیہ کی بناء پر صادر ہوتا ہے اور اس کے اندرونی طبعی علل و اسباب ہوتے ہیں اس لیے خرق عادت لازم نہیں آتا اور معمولی نظام عالم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ حضرت موسیٰؑ مصر سے بنی اسرائیل کو لے کر چلے تو رستہ میں بحر قلزم (red sea) حائل تھا حکم ہوا کہ اپنی لکڑی سے دریا کو مارو، دفعتاً دریا خشک ہو گیا اور راستہ پیدا ہو گیا۔ حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو لے کر اتر گئے لیکن جب فرعون نے اپنے لشکر کے ساتھ دریا میں قدم رکھا تو دریا پھر اپنی اصلی حالت پر آ گیا اور فرعون لشکر سمیت غرقاب ہو گیا وہ اس کی توجیہ کرتے ہیں کہ دریا میں مدو جزر تھا جب حضرت موسیٰؑ پہنچے تو جزر تھا اور دریا پایاب ہو گیا تھا اور جس وقت فرعون دریا میں لشکر سمیت داخل ہوا، مد شروع ہو گیا اور وہ ڈوب گیا ہم ان اعتراضات کو جو نقلی حیثیت سے اس توجیہ پر وارد ہوتے ہیں کہ تورات اور قرآن مجید میں اس معجزہ کی جس طرح تشریح کی ہے اس کی یہ صحیح نقل نہیں ہے، نظر انداز کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جس وقت حضرت موسیٰؑ پہنچے تو جزر اور جب فرعون آیا تو مد ہو گیا، آیا یہ اتفاقی عمل تھا اور ممکن تھا کہ اس کے برعکس ہوتا کہ یعنی فرعون بچ جاتا اور حضرت موسیٰؑ (نعوذ باللہ) ڈوب جاتے اور یا یہ کہ حضرت موسیٰؑ کے لیے جزر اور فرعون کے لیے مد خاص طور سے پیدا کیا گیا تھا یا ایسے اسباب باہم پہنچائے گئے کہ حضرت موسیٰؑ جزر کے وقت پہنچیں اور فرعون مد کے وقت، اور اس کے دل میں یہ بات ڈالی گئی کہ وہ اس خطرناک دریا میں بے سمجھے بوجھے قدم رکھے۔ پہلی صورت میں تو معجزہ کیا، نبوت کی بھی تشکیک لازم آتی ہے اور دوسری صورت میں خرق عادت کی تسلیم سے چارہ نہیں اور خارق عادت کے تسلیم کر لینے کے بعد خدا کی قدرت مطلقہ پر بھی ایمان لازم ہوگا۔ (سیرت النبی ۳۔ ۴۹)

جملہ قرآن قطع است در قطع سبب　　　عز درویش و ہلاک بولہب

ترجمہ تمام قرآن قطع اسباب کے بیان سے بھرا ہے آپ کا غلبہ اور ابولہب ہلاک ہو گیا۔

ہم چنیں ز آغاز قرآں ناتمام　　　رفض اسباب است و علمت والسلام

ترجمہ اس طرح شروع سے آخر تک قرآن اسباب و علل کے موثر حقیقی ہونے کا منکر ہے۔

اعتراض نمبر ۲۲۷

ابتداء میں پیغام کو پیغمبر سے زیادہ اہم سمجھا جاتا تھا۔ اصل چیز فرد یا جماعت کا خدا کے ساتھ تعلق تھا۔ اس لیے کسی ایسے شخص کی ضرورت تھی جو متعلقہ شخص یا اشخاص تک پیغام پہنچا دے لیکن پیغام دینے سے آگے پیغمبر کا کوئی کام نہ تھا تاہم بعد میں پیغمبر کا کام اس سے زیادہ قرار دے دیا گیا۔ (ضیاء النبی۔ ۷ ص ۲۲۷)

جواب: ہجرت مدینہ کے بعد مدینہ کے قبائل بہ دستور قائم رہے۔ ان کے سردار بھی بہ دستور

رہے۔قومی امور میں ان سے مشورہ لیا جاتا رہا جیسے بیعت عقبہ کے موقعہ پر انصار سے یہ طے نہ ہوا تھا کہ حملہ آور کا مقابلہ مدینہ سے باہر نکل کر کرنے میں آپ کا ساتھ دیں گے۔آپ نے مہاجرین سے رائے لی اور انصار سے بھی۔ نبی صرف آلہ نشر و اشاعت نہیں۔اس کا کام ہے کہ رب العزت کی بارگاہ سے احکام وصول کر کے لوگوں تک پہنچائے۔ان احکام پر خود بھی اور اپنے پیروؤں کو بھی عمل کرنے کا پابند بنائے۔ یہ نہیں کہ رسی ڈھیلی چھوڑ دی جائے اور ایسا نہیں کہ کہہ دیا جائے کوئی اس کو مانے یا نہ مانے اس کی بلا سے۔اسلام عمل کا مذہب ہے۔اس کی اساس صرف علمی نظریات ہی نہیں بل کہ ضابطہ عمل بھی ہے۔ نجات کا دارومدار ماننے کے بعد عمل پر ہے۔نبوت کے منصب کی ذمہ داری کے بارے میں اللہ کا ارشاد ہے۔" هو الذی بعث فی الامیین رسولا منهم ۔۔۔ لفی ضلال مبین" (سورہ جمعہ) ترجمہ: وہی ذات تو ہے جس نے ان پڑھوں میں سے رسول بھیجا جو ان پر اللہ کی آیات پڑھتے ہیں اور ان کا تزکیہ کرتے ہیں اور کتاب وحکمت کی تعلیم دیتے ہیں اور اس سے پہلے یہ لوگ صریح گمراہی میں تھے۔

ایک شبہ کا ازالہ: اس سلسلے میں ہمیں ایک غلط فہمی کو دور کرنا ہے جو بعضوں کو حضور کی صفت تبلیغ کے سمجھنے میں پیش آئی۔قرآن مجید میں متعدد آیتیں اس معنی میں آئی ہیں کہ رسول کا فرض صرف پیغام پہنچا دینا ہے۔اس سے آج کل کے بعض کوتاہ بینوں کو یہ دھوکا ہوا ہے کہ رسول کا کام صرف وحی الٰہی کی تبلیغ ہے یعنی قرآن پاک کے الفاظ کو انسانوں تک بعینہٖ پہنچا دینا ان کا کام ہے۔اس کے معانی کی تشریح اور مطالب کی توضیح اس کا منصب ہے اور نہ اس کا اُس کو حق ہے۔ان کے نزدیک مبلغ رسول کی حیثیت پیغام بر کی ہے۔ شاید ان کو دھوکا اس آیت کے علاوہ لفظ رسول سے بھی ہوا ہے جس کے لفظی معنی پیغام بر کے ہیں۔لیکن وہ لوگ یہ خیال نہیں کرتے کہ جہاں رسول کہا گیا نبی بھی تو کہا گیا ہے۔مبشر، نذیر، سراج، منیر۔ مصطفیٰ، مبین، معلم، داعی الی اللہ، حاکم، آمر اور ناھی کہا گیا ہے۔اس کے پیغام کے مفہوم و معنی کی تشریح وتفسیر کا آج تو ہر عربی دان کو حق حاصل ہے اور اس تک پہنچنے کا ہر مدعی دعوے دار ہے مگر صاحب پیغام کو اپنی پیغام بری کے وقت نہ مفہوم و معنی کا علم تھا اور نہ اس کی تشریح کا حق تھا۔وہ ثابت کرنا چاہ رہا ہے کہ آپ ﷺ کا خاندان غریب تھا اور فاقوں کٹتی تھی اور کبھی سیر ہو کر کھانا نہ کھایا البتہ آپ ﷺ کی موجودگی میں ہر شخص سیر ہو جاتا تھا یہ تو آپ ﷺ کی ذات کی برکت ہے لیکن جس خاندان کا دسترخواں ہر ضرورت مند کے لیے وسیع تھا سینکڑوں اور ہزاروں حاجیوں کے لیے کھانے کا بندوبست کرتا تھا جس سے انسان تو کیا چرند پرند اور جانور بھی لطف اندوز ہوتے تھے۔

اشتباہ: ایک وجہ یہ ہے کہ اسلام میں شرع اور وضع قانون کا حق صرف اللہ تعالیٰ کے لیے تسلیم کیا گیا ہے کہ وہی اصلی شارع ہے۔اب اگر رسول کے لیے وحی کتابی سے الگ شرع بنانے کا حق تسلیم کیا

جائے تو خدا کے سوا ایک اور شارع تسلیم کرنا پڑے گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہم رسول کو شارع نہیں شارح قرار دیتے ہیں۔ کیا عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر جج جب حکومت کے قانون کی وضاحت کرتا ہے تو وہ اپنے عمل سے سلطان وقت بن کر واضح قانون کا منصب حاصل کرتا ہے یا صرف قانون کے مفہوم کا شارح ہوتا ہے؟ اسی طرح آسمانی عدالت کے قاضی کی حیثیت ہے جس کو ہم نبی اور رسول اور معلم اور مبین کہتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ صرف وحی کے طریقہ خاص کے ذریعہ سے اپنے پیغمبر کو مطلع نہیں فرماتا جس طرح قرآن مجید نازل ہوا ہے بلکہ وہ اپنی تینوں قسموں کے ذریعہ سے اپنے اغراض اس رسول پر واضح کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغام کو صرف وحی کے ذریعے سے نہیں پہنچاتا خواہ وہ وحی ہو یا الہام۔ قرآن مجید کی وہ آیتیں جن کے معنی یہ ہیں کہ ''ہمارے رسول پر صرف پیغام پہنچانا ہے'' ان کا منشاء یہ نہیں کہ وہ صرف پیغام پہنچانے والا ہے۔ خوش خبری سنانے والا نہیں، پیغام الٰہی سنانے کے بعد ان کی تعلیم و عمل بتانے والا نہیں، آیات کی تشریح کرنے والا نہیں، رہنما اور ہادی نہیں، تزکیہ کرنے والا نہیں۔ ایسا کہنا قرآن کا انکار اور عقل و فہم کا ماتم ہے۔ قرآن میں کئی جگہ ہے ''تُو تو صرف ڈرانے والا ہے'' اِنما انتَ منذر)۔ ایک جگہ ہے ''انما انا منذر'' میں تو صرف ڈر سنانے والا ہوں''۔ ان آیات کا تعلق نبوت کے منکروں سے ہے۔ جو لوگ ہنوز نبوت کے انکاری ہیں ان سے رسول کا تعلق صرف تبلیغ کا ہے لیکن ماننے والوں کے لیے اقرار نبوت کے ساتھ اتباع و اطاعت ضروری ہے۔

مصلح، لیڈر، فلسفی اپنے دعوؤں کو صرف استدلال اور عقل کی قوت سے ثابت کرنا چاہتا ہے تا کہ لوگ اس کی بات مانیں لیکن پیغمبر خدا اپنے پیروؤں کے قلب کو اس طرح بدل دینا چاہتا ہے کہ وہ از خود برائی کو چھوڑ کر نیکی اختیار کریں اور خدائے بلند و برتر پر پختہ یقین رکھیں نیز نبی جو کہتا ہے کر کے دکھاتا ہے اور دوسروں کو اس پر عمل کرنے کی ترغیب و تلقین کرتا ہے۔ کیوں کہ اس کا ظاہر و باطن یکساں طور پر صاف وشفاف ہوتا ہے۔ (علوم اسلامیہ اور مستشرقین۔ ص ۱۶۔۱۵)

انما علی رسولنا البلاغ المبین (ترجمہ: ہمارے رسول پر صرف پیغام پہنچا دینا ہے) اس قسم کی آیات کا مفہوم یہ نہیں کہ وہ صرف پیغام رساں ہے، مبین و شارح نہیں بلکہ یہ اس کا کام صرف خدا کا پیغام پہنچا دینا ہے زبردستی لوگوں کے دلوں میں اس کا پیغام اتار دینا نہیں لوگوں کو جبراً مسلمان بنا دینا نہیں ہے۔ قرآن مجید میں جہاں جہاں اس معنی کی آیات آئی ہیں ان کا منشاء یہی اور صرف یہی ہے۔ قرآن پاک میں تیرہ مختلف آیتوں میں یہ بات کہی گئی ہے اور ہر جگہ یہی مفہوم ہے۔ مفہوم بالکل واضح ہے کہ اسلام کی ہدایت قبول کرنے میں کوئی زبردستی نہیں ''لا اکراہ فی الدین'' اگر لوگ قبول کریں تو انہوں نے حق کی راہ پائی اور اگر انکار کریں تو رسول ﷺ کا کام صرف پیغام پہنچا دینا تھا وہ اس نے پہنچا دیا اس کا فرض ادا ہو چکا تھا اب خدا جانے اور اس کے

بندے جائیں۔ "فانما علیك البلاغ و علینا الحساب، ترجمہ: تو تیرا فرض صرف پیغام پہنچا دینا ہے اور ہمارا فرض ان سے حساب لینا ہے۔" (الرعد:۴۰)

بیت عقبہ (اول۔دوم۔سوم)

آپؐ توحید کا پیغام پہنچانے میں ہمہ تن مصروف تھے۔ جب موقع ہاتھ آتا اسے کام میں لاتے۔ حتیٰ کہ تبلیغی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے۔ حج کے موقعہ پر دور دراز سے آنے والوں سے ملتے اور انھیں دعوت حق دیتے۔ اسی طرح حج پر یثرب کے چھ آدمی آئے تھے وہ آپس میں محو گفت گو ہیں۔ آپؐ ان سے ملتے ہیں اور فرمایا "بیٹھ کر میری بات سنو"۔ آپؐ کی باتیں سن کر وہ مسلمان ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ جب بھی ان کی یہود سے تلخ کلامی پر نوبت آجاتی تو یہودی انھیں یہ کہہ کر ڈراتے "ذرا صبر کرو آنے والے نبی کا وقت قریب آ پہنچا ہے تم سے پہلے ہم اس کے مطیع و فرماں بردار بن کر اس کی پناہ میں تمھیں عاد اور ثمود کی طرح تہس نہس کر کے رکھ دیں گے"۔ اب یثرب والوں نے اپنی آنکھوں سے مکہ میں اس نبی ﷺ کو دیکھ لیا اور ایک دوسرے سے اشاروں میں کہہ دیتے ہیں "اللہ کی قسم یہ تو وہی نبی ﷺ ہے، یہود جس کی خبر سنایا کرتے ہیں۔ جلدی کرو کہیں ایسا نہ ہو کہ یہود تم پر سبقت لے جائیں"۔ یہ چھ سعادت مند آدمی ایمان سے مشرف ہو کر مدینہ واپس جاتے ہیں۔ یہ بیعت عقبہ اولیٰ ہے۔ اور نبی مکرم ﷺ کی باتیں لوگوں کو سناتے ہیں۔ ہر محفل میں آپ کا ذکر کرتے ہیں حتیٰ کہ مدینہ کے ہر گھر میں آپؐ کا ذکر ہوتا ہے۔ اگلے سال حج کے موقعہ پر یہ یثربی صحابی چھ یا سات آدمیوں کو مزید ساتھ لاتے ہیں جو اوس و خزرج کے نمائندے تھے۔ جس مقام پر پہلے چھ یثربی صحابی ایمان لائے تھے وہیں مذکور چھ یا سات نو واردوں نے اسلام قبول کیا یہ بیعت عقبہ ثانی ہے۔ نو واردوں نے اس عہد پر بیعت کی کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے ہم چوری نہیں کریں گے۔ اس پہاڑی کے نام پر جہاں یہ بیعت ہوئی اسے بیت عقبہ کہتے ہیں۔ (روح اسلام۔۱۲۶۔۱۲۵)

صاحب مدارج (مدارج النبوہ ج۔۲۔۶۷۔۵۷) لکھتے ہیں "نبوت کے گیارھویں سال حج کے موسم پر منیٰ میں عقبہ کے قریب تشریف فرما تھے کہ مدینہ کے قریب شہر سے خزرج کا ایک گروہ آپؐ کی خدمت میں آیا۔ آپؐ نے انھیں دعوت حق دی اور قرآن مجید سنایا۔ وہ سب مسلمان ہو گئے۔ یہ چھ اشخاص تھے وہ مدینہ لوٹ جاتے ہیں۔ اس کو بیعت عقبہ اولیٰ کہتے ہیں۔ کیوں کہ منیٰ کی ایک پہاڑی میں عقبہ کے قریب جسے جمرۃ العقبہ بھی کہتے ہیں پہلی مرتبہ بیعت واقع ہوئی۔ آئندہ سال حج کے موسم میں قبیلہ اوس و خزرج کے چھ اور شخص یا بہ قول ایک روایت ۵ شخص تھے اس عقبہ کے قریب شرف بیعت سے مشرف ہوئے۔ حضورؐ نے اس جماعت کی خواہش پر حضرت مصعب بن عمیرؓ کو ان کے ساتھ کر دیا تا کہ وہ ان کو قرآن کریم اور

دین کے مسائل سکھائیں آئندہ سال حضرت مصعب بن عمیرؓ انصاری کی ایک کثیر جماعت لے کر مشرکین حاجیوں کے قافلہ کے ساتھ حج کے زمانہ مکہ مکرمہ میں سید کائناتؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ یہ جماعت اوس وخزرج کے پانچ سو اور ایک روایت میں ۳۰۰ افراد پر مشتمل تھی۔ ایک قول کے مطابق ۷۰ مرد اور ایک عورت اور ایک روایت میں ۷۳ مرد اور دو عورتیں تھیں۔ انھوں نے ایام تشریق کی راتوں میں ''عقبہ'' میں جمع ہونے اور مل جل کر بیٹھنے کا اتفاق کیا۔ جب طے شدہ رات آئی تو یہ حضرات اپنے مشرکین حاجیوں سے خفیہ طور پر نکل کر عقبہ کے قریبی پہاڑ پر جمع ہو گئے۔ وہ آپؐ کا انتظار کرنے لگے اور حضورؐ اپنے چچا عباس بن عبدالمطلب کے ہم راہ (جو ابھی اسلام نہیں لائے تھے) تشریف لائے لیکن وہ حضورؐ سے محبت وشفقت اور اہتمام کی خاطر اس مقام پر آئے۔ ایک قول یہ ہے کہ جماعت انصار کے آنے سے پہلے حضورؐ وہاں تشریف لائے ہوئے تھے۔ پھر حضورؐ نے اس جماعت کو بیعت اسلام سے بامشرف فرمایا۔

ایک شبہ کا ازالہ: پہلی مرتبہ یثربی چھ اشخاص اسلام لائے اور دوسری مرتبہ مزید سات شخص مسلمان ہوئے۔ پہلی اور دوسری بیعت میں شامل افراد کی کل تعداد ۱۲ ہے۔ پہلے چھ میں سے جابر بن عبد اللہ دوسرے سال نہ آئے ان کے علاوہ پانچ شخص آئے اور نو وارد سات شخص تھے۔ ان سب نے بیعت کی اسے بیعت عقبہ ثانی کہتے ہیں۔ تیسری مرتبہ پانچ سو یا تین سو یا ستر مرد اور ایک عورت یا تہتر مرد اور دو عورتیں مشرف با اسلام ہوئیں۔ گویا بیعت تین بار وقوع پذیر ہوئی۔ جب کہ بعض سیرت کی کتب میں پہلے چھ یثربی اشخاص کی بیعت کی۔ بیعت کو بیعت عقبہ اولیٰ شمار نہیں کرتے بل کہ دوسری بیعت عقبہ کو بیعت اولیٰ اور تیسری بیعت عقبہ کو بیعت ثانی لکھتے ہیں۔ محمد حسین ہیکل (حیات محمد۔۲۰۴۔۲۰۳) میں بیعت عقبہ اول و دوم اور سوم کی جلی سرخی سے عنوان باندھتے ہیں۔ یعنی بیعت عقبہ اول و دوم اور بیعت عقبہ سوم کے عنوان کے تحت واقعات لکھتے ہیں۔ بعض نے بیعت اول و دوم اور سوم کا عنوان نہیں باندھا ۔صرف یہ لکھ دیا کہ چھ پہلی بار، دوسری بار ۱۲ اور تیسری مرتبہ ایک سو تہتر افراد، اور دو عورتوں نے بیعت کی۔ (سید الوریٰ ج۔۱۔۲۷۰)

مولانا شبلی کہتے ہیں کہ بیعت عقبہ اولیٰ میں جن خوش نصیب لوگوں نے اسلام قبول کیا ان کی تعداد چھ تھی اور سب بنی خزرج سے تھے ان کے نام یہ ہیں۔ ۱۔ ابو امامہ اسعد بن زرارۃ

۲۔ رافع بن مالک بن العجلان: ان کا تعلق بنی زریق سے تھا۔

۳۔ عوف بن حارث: ان کی والدہ کا نام عفراء ہے۔

۴۔ قطبہ بن عامر بن جدیدہ: یہ بنی سلمہ قبیلہ کے فرد تھے۔

۵۔ عقبہ بن عامر: ان کا تعلق قبیلہ بنی حزام سے تھا۔

۶۔ جابر بن عبداللہ بن رءیاب: یہ بنی عبید قبیلہ سے تھے۔

عقبہ پہاڑی کے پاس ان سے ملاقات ہوئی آپ ﷺ نے انہیں اسلام کی دعوت دی تو وہ آپس میں کہنے لگے کہ یہ وہی نبی معلوم ہوتا ہے جس کی آمد کی دھمکیاں یہود ہمیں آئے روز دیتے رہتے ہیں، جلدی سے ان پر ایمان لے آئیں ایسا نہ ہو کہ یہودی ان پر ایمان لانے میں سبقت لے جائیں چنانچہ سب نے اسلام قبول کر لیا یہ واقعہ گیارویں سال کا ہے اور اگلے سال پھر آپ ﷺ سے ملاقات کا وعدہ کر کے مدینہ واپس چل دیئے۔

دوم: اگلے سال یعنی بعثت کے بارھویں سال حج کے دنوں میں انصار کے بارہ آدمی مکہ آئے۔ ان کے نام درج ذیل ہیں۔

اسعد بن زرارہ: یہ پچھلے سال بھی حاضر ہوئے تھے۔(۲) عوف بن حارث اور ان کے بھائی معاذ بن حارث بھی پچھلے سال حاضر ہوئے تھے۔(۳) رافع بن مالک (۴) ذکوان بن عبد قیس (۵) عبادہ بن صامت (۶) عباس بن عبادہ بن فضلہ (۷) یزید بن ثعلبہ (۸) عقبہ بن عامر (۹) قتبہ بن عامر ان لوگوں میں پچھلے سال کے چھ میں سے پانچ افراد بھی شامل تھے۔

سوم: جب حج کا موسم قریب آ گیا تو حاجیوں کا قافلہ حضرت مصعب بن عمیر کی قیادت میں مکہ روانہ ہوا اس میں ستر انصار تھے جو مسلمان ہو چکے تھے انہوں نے عقبہ کی وادی میں ایام تشریق کی ایک رات پھر ملاقات کی اور اسلام سے مشرف ہوئے اسے بیعت عقبہ ثلاثہ کہتے ہیں۔

شبلی نعمانی کہتے ہیں کہ مدینہ منورہ کے چھ حضرات جو پہلے پہل اسلام لائے بعض مصنفین نے ان کے اس قبول اسلام کے واقعہ کا تذکرہ بیعت عقبہ اولیٰ کے عنوان سے کیا ہے۔ یہ عنوان کتب سیرت کے ناظرین کے لیے اس وقت پریشانی کا موجب بنتا ہے جب وہ دوسری کتب، مثلاً مستدرک حاکم و غیرہ میں دیکھتے ہیں کہ بیعت عقبہ اولیٰ میں بارہ آدمی تھے اس اختلاف روایت کے سبب سے بعض سیرت نگاروں نے بیعت عقبہ ثانی میں بارہ آدمی اور بعض تہتر آدمی بتاتے ہیں حالانکہ اصل صورت یہ ہے کہ چھ یا آٹھ آدمی جو شروع سے اسلام لائے ان کے واقعہ قبول اسلام بہ عنوان بیعت عقبہ اولیٰ نہیں بلکہ ابتدائے اسلام انصار ہونا چاہیے اور دوسرے سال جبکہ گیارہ یا بارہ آدمی حاضر خدمت ہوئے یہ بیعت عقبہ اولیٰ ہے۔(سیرت حلبیہ) حضرت عبادہ بن الصامت نے بصراحت فرمایا ہے" اس روایت میں عبادہ العام المقبل میں بیعت عقبہ اولیٰ ہونے کا ہونا فرماتے ہیں اور اس میں گیارہ آدمیوں کے حاضر ہونے کی صراحت فرماتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس سے پہلے جو لوگ آکر اسلام قبول کر چکے تھے اس کا تعلق بیعت عقبہ اولیٰ سے نہیں ہے۔ جن لوگوں نے انصار کے ابتدائے اسلام کے واقعہ کا نام بیعت عقبہ اولیٰ رکھا ہے وہ تین بیعت عقبہ کا عنوان

دیتے ہیں یعنی ایک یہ بیعت عقبہ اولیٰ جس میں چھ یثربی اسلام قبول کرتے ہیں دوسری وہ بیعت عقبہ جس میں گیارہ یا بارہ آدمی اسلام لائے اور تیسری وہ بیعت عقبہ جس میں تہتر افراد اسلام میں داخل ہوئے اور یہ تینوں واقعے ایک ایک سال کے فصل سے حج کے موقع پر پیش آئے اور جن لوگوں نے انصار کے ابتدائے اسلام کے واقعہ کو صرف ابتدائے اسلام انصار کے عنوان سے ذکر کیا ہے انہوں نے گیارہ آدمی والی بیعت کو بیعت عقبہ اولیٰ اور تہتر آدمیوں والی بیعت کو بیعت عقبہ ثانی کے عنوان سے ذکر کیا ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ پہلے چھ یثربی لوگوں کے اسلام لانے کو بعنوان ''انصار کے اسلام لانے کی ابتدا'' باندھا، اسے بیعت عقبہ اولیٰ نہ کہا حالانکہ ان چھ افراد نے اسلام قبول کیا عقبہ کی پہاڑی پر ہی آپ ﷺ سے بیعت کی اور انہی کے مدینہ واپس جانے پر گھر گھر میں اسلام کا چرچا ہونے لگتا ہے۔ ہر محفل میں یہ لوگ اسلام کا تذکرہ کرتے ہیں اسلام کا اثر ہونے لگتا ہے اور اگلے سال گیارہ آدمی عقبہ کی پہاڑی پر بیعت کرتے ہیں یہ بیعت عقبہ ثانی ہے۔ اس سے اگلے سال تہتر آدمی بیعت کرتے ہیں یہ بیعت عقبہ ثلاثہ ہے۔ تو نہ جانے سیرت نگاروں نے پہلے چھ یثربی لوگوں کو بیعت عقبہ اولیٰ کی بجائے ابتدائے اسلام انصار کا عنوان دے دیا جس سے قارئین کے لیے پریشانی کا باعث ہوا لہٰذا ان سیرت نگاروں جنہوں نے چھ آدمیوں کے اسلام لانے والی بیعت کو بیعت عقبہ اولیٰ اور جس میں گیارہ آدمی اسلام لائے اس کو بیعت عقبہ ثانی اور جس میں تہتر لوگ اسلام لائے اسے بیعت عقبہ ثلاثیہ کہا ہے، درست ہے اور اس میں وارد ہونے والی پریشانی کا شائبہ تک نہیں ہوتا ہے۔

اعتراض نمبر ۲۲۸

''منٹگمری واٹ'' نے بیعت عقبہ میں حضرت عباسؓ کی موجودگی کا انکار کیا ہے۔ بعد کے راویوں نے عباس کی موجودگی کا اضافہ کیا ہے اور مقصد یہ رہا کہ بنو ہاشم نے جو محمد ﷺ سے بدسلوکی کی تھی اس کو نگاہوں سے اوجھل کر دیا جائے۔ اس واقعہ کو نہ ماننے کی وجہ واٹ نے یہ بیان کی ہے کہ حضرت عباس اس وقت مشرک تھے۔ 'واٹ' اس کے بعد شرک کی سنگینی کو کم کرنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ پہلی صدی کے آخر میں عباس' محمد ﷺ کی تعریف کرتے تھے۔ پھر محمد ﷺ ایک شخص کو اجازت دیتے ہیں کہ مکہ کے باشندہ عباس کی ان قابل گرفت باتوں کی تردید کر دیں' عقبہ ثانیہ میں عباس کی غیر موجودگی کی داستان گھڑ کر عباس کے خلاف پروپیگنڈا میں فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس عبارت میں 'واٹ' نے کم از کم ایک ہی سانس میں چھ اعتراض کیے ہیں۔

جواب: بیعت عقبہ میں اوس وخزرج قبیلہ کے لوگ تھے۔ جب وفد کے ارکان نے بیعت کی حضرت عباس بن عبدالمطلب جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے اس کے باوجود وفد کے لوگوں سے خطاب کیا اور کہا ''اے گروہ خزرج! محمدؐ ہمارے اندر عزت وتوقیر رکھتے ہیں تم اس کو خوب جانتے ہو اور ہم ان کے مخالفین

سے ان کے محافظ اور بچانے والے ہیں مگر ان کا خود یہ ارادہ ہے کہ وہ اس شہر کو چھوڑ کر تمھارے شہر چلے جائیں اور تم سے مل جائیں۔ اگر تم اس بات کو دیکھتے ہو کہ تم جس بات کی طرف ان کو بلاتے ہو اس کو پورا کر سکو گے اور ان کے دشمنوں سے ان کو محفوظ رکھو گے تو تم اس کام کو کرو اور اگر تم سے یہ بات نہ ہو سکے تو بہتر ہے کہ تم اس وقت جواب دے دو کیوں کہ محمد ﷺ اس وقت ہماری حفاظت میں ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ تم یہاں سے ان کو لے جا کر پھر ان کو دشمنوں کے حوالے کر دو‘‘۔ (سیرت الرسول۔ طاہر القادری ص ۳۹۶)

اس موقع پر عباس بن عبادہؓ نے کہا ’’اے گروہ خزرج! کچھ جانتے ہو کہ کس بات پر ان سے بیعت کر رہے ہو؟ سب نے کہا! ہم جانتے ہیں۔ عباس بن عبادہ نے کہا یہ اس بات کی بیعت ہے کہ ہر ایک سرخ و سیاہ آدمی سے تم کو لڑنا ہوگا اگر تم یہ دیکھو کہ جب تمھارے مال برباد ہوں گے اور تمھارے اشراف قتل ہوں گے۔ اس وقت تم ان سے پھر جاؤ گے تو اس وقت بیعت کو ترک کر دو۔ ورنہ اگر اس وقت تم نے ایسا کیا تو تمھیں دنیا و آخرت کی ذلت نصیب ہو گی اور اگر تم اپنی بیعت پر قائم رہو گے تو پھر بیعت کر لو کیوں کہ اس میں تمھارے دین و دنیا کی خیر و خوبی ہے۔ سب نے کہا! ان سب باتوں پر بیعت کرتے ہیں۔ پھر انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! جب ہم اس عہد پر پورا اتریں تو ہمارے لیے کیا اجر ہے؟ فرمایا! جنت! انھوں نے عرض کی آپؐ اپنا ہاتھ دراز کیجیے۔ آپؐ نے ہاتھ دراز فرمایا اور انھوں نے بیعت کی۔ (حوالہ بالا۔ ۳۹۸)

حضرت اسعد بن زرارہؓ کا خطاب: انھوں نے بیعت میں شامل افراد سے کہا! ’’ذرا ٹھہریئے! آپ کو کچھ معلوم بھی ہے کہ آپ لوگ کس چیز پر عہد کر رہے ہیں جان لیجیے تمام عرب و عجم کی مخالفت مول لینے کا عہد ہے۔ اگر آپ یہ بوجھ اٹھا سکتے ہیں تو بہتر ہے ورنہ صاف انکار کر دیجیے‘‘۔ (محمد رسول اللہ۔ ۶۲)

اس پر سب نے کہا کہ ہم کسی صورت اس دعوت سے منہ نہ موڑیں گے۔ مدینہ کے لوگ سوچ سمجھ کر اسلام میں داخل ہوئے تھے انھیں علم تھا کہ اسلام کی سیاسی اور بین الاقوامی اہمیت کیا ہے؟ انھیں علم تھا کہ انھیں استحصالی قوتوں سے نبرد آزما ہونا ہے۔ انھیں علم تھا کہ اپنوں کے ساتھ پنجہ آزمائی ہوگی جو دائرہ اسلام سے خارج ہوں گے اور ہمہ دم اور ہمہ وقت ڈٹ کر اسلام کی مخالفت میں لڑنے کو تیار رہنا پڑے گا۔ یہ بیعت بڑی اہمیت کی حامل ہے اور یہ بیعت عقبہ ہجرت مدینہ کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

بیعت عقبہ کے متعلق ڈاکٹر محمد حمید اللہ (محمد رسول اللہ۔ ۶۲ میں) لکھتے ہیں ’’معاہدہ عمرانی کی بین الاقوامی اور واقعی مثال ہم کو بیعت عقبہ میں ملتی ہے جس میں مدینہ والوں نے آنحضرتؐ کو اپنا سردار مانا۔ اپنے ملک میں آنے کی دعوت دی اور آپؐ کے احکام کی تعمیل کا اقرار کیا۔ تمہیدی بیان کے بعد ’’واٹ‘‘ کے اعتراض کا جائزہ لیتے ہیں۔ عباس بن عبادہؓ اور عباس بن عبدالمطلب کے مذکورہ خطبات کا ذکر کیا تا کہ تیز طرار ذہنوں میں یہ غلط فہمی پیدا نہ ہو کہ وہ کہہ دیں عباس بن عبدالمطلبؓ کے بجائے عباس

بن عبادہؓ موجود تھے۔ان کے خطبات درج کیے گئے ہیں جس سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ وہ خطبات دو الگ الگ آدمیوں کے ہیں۔(یعنی عباس بن عبد المطلب اور عباس بن عبادہ) جس سے عباس بن عبد المطلب کی موجودگی ظاہر ہوتی ہے۔

۲: یہ واقعہ ابن اسحٰق، طبری اور مسند احمد میں موجود ہے۔ان کتب میں موجود باقی دوسرے واقعات کو الحاقی یا بعد میں اضافہ کیا گیا، کیوں نہیں کہتا صرف اس واقعہ پر نظر پڑی جسے اضافہ شدہ قرار دے دیا۔

دوسرا اعتراض: بنو ہاشم اپنی بدسلوکی کا بدلہ چکانا چاہتے تھے۔ بھلا ایک شخص کے سبب پورے خاندان کو الزام کی بساط میں لپیٹنا کہاں کی منصفی ہے۔ نیز ''واٹ'' کو چاہیے تھا کہ جن اشخاص نے آپؐ سے ناروا سلوک رکھا ان کی فہرست دیتا۔اس کے علاوہ اسے ثابت کرنا چاہیے تھا کہ کس مقام پر حضرت عباسؓ نے آنحضرتؐ سے کسی قسم کی زیادتی کی ہو یا سخت سست کہا ہو کہ ہمیں شرمندگی ہے کہ آپ ﷺ سے بہت زیادتیاں کی ہیں۔ مآخذ و مصادر اس کا رد کرتے ہیں۔

تیسرا اعتراض: ''واٹ'' کہتا ہے کہ عباس اس وقت مشرک تھے۔جبھی تو بیعت عقبہ کے وقت موجود نہ تھے۔سوال یہ ہے کہ کیا مشرک سے امداد لی جا سکتی ہے یا نہیں۔کیا مشرک اچھی بات کہے تو قابل قبول ہوگی یا نہیں۔کیا مشرکین سے آپؐ نے تعاون کی اپیل کی؟ ان سوالات کا جواب مستشرقین کے ذمے قرض ہے۔ذرا یہ بھی سن لیں۔حضرت حمزہؓ نے آپؐ کی مدد کی۔وہ ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ابو جہل کی حضورؐ سے زیادتی پر ان کی کمان دشمن اسلام کا سر پھاڑ دیتی ہے۔دوسری طرف ابو طالب ہیں جنھوں نے قریش مکہ کو صاف جواب دیا کہ وہ آنحضرت ﷺ کی حمایت سے دست بردار نہیں ہوں گے اور نبی محتشم سے کہا، آپؐ اپنے مشن کو جاری رکھیں۔صفوان بن امیہ مکہ کا رئیس تھا۔ابھی اسلام سے دور تھا۔اسلام میں داخل نہیں ہوا تھا۔آپؐ نے اس سے سو زرہیں طلب فرمائیں۔صفوان نے کہا جبراً یا طوعاً۔اگر جبراً مانگتے ہو تو نہیں دیتا۔آپؐ نے فرمایا طوعاً، جبراً نہیں۔ایک روایت میں ہے کہ غصب یا عاریۃً۔آپؐ نے فرمایا غصب نہیں بل کہ عاریتاً۔جتنی لی جائیں گی اتنی ہی واپس کی جائیں گی اور اگر کوئی ضائع ہو جاتی ہے تو اس کا معاوضہ دیا جائے گا۔اتفاق سے جنگ میں کچھ زرہیں ضائع ہو گئیں۔جب واپس کیں تو ضائع شدہ کا معاوضہ پیش کیا گیا لیکن صفوان نے عرض کی، وہ وقت اور تھا جب میں نے یہ کہا تھا۔اب تو اسلام رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔اب زرہیں کیا جان بھی حاضر ہے۔(خاتم النبیین ن۔۸۴۶)

یہ بھی واٹ جانتا ہوگا کہ اریقط کو مکہ سے مدینہ کے راستے سے باخبر تھا ہجرت مدینہ میں آپؐ کو مکہ سے مدینہ لے جاتا ہے اور اپنی اجرت لے لیتا ہے۔وہ بھی اس وقت مسلمان نہیں ہوا تھا۔

پنجم اعتراض: پہلی صدی کے آخر میں عباس بن عبد المطلب آنحضرتؐ کی تعریف کرتے

تھے۔ پھر حضورؐ ایک شخص کو اجازت دیتے ہیں کہ مکہ کے باشندہ عباس کی ان قابل گرفت باتوں کی تردید کر دیں''۔ واٹ کو خبر نہیں کہ حضرت عباس ۱۲ رجب بہ مطابق ۱۷ فروری ۶۵۳ ء میں فوت ہوئے۔ آدھی صدی سے تین سال اوپر جسے واٹ پہلی صدی کا آخری حصہ قرار دیتا ہے۔ آنحضرتؐ نے جنگ بدر میں فرمایا تھا کہ جو کوئی عباس کو دیکھے وہ انھیں قتل نہ کرے کیوں کہ وہ مشرکوں کے ساتھ مجبوراً آئے ہیں۔ حجاج بن عطاط کی حدیث میں اس کی وضاحت موجود ہے کہ حضرت عباس نے اپنا ایمان مخفی رکھا حتیٰ کہ اس کا اظہار فتح مکہ کے موقعہ پر کیا تھا۔ جنگ بدر ۲ھ میں ہوئی۔ اور حضرت عباسؓ کی وفات ۳۲ھ میں ہوتی ہے تو وہ تیس سال پہلے اسلام سے وابستہ تھے۔ (تفہیم البخاری جلد ۵۔ ص ۶۵۶)

اگر سن ۶۵۳ ء سے تیس سال منہا کر دیں تو سن ۶۲۳ ء بنتا ہے جو پہلی صدی کا آخیر نہیں بل کہ پہلی صدی کا ربع اول ہے۔ نہ جانے واٹ اس بات سے لاعلم کیوں رہا۔ نیز ریاضی کے مسلّمہ جمع تفریق کے قانون سے یہ غفلت کیسی؟

ششم اعتراض: حضرت عباس کی باتوں کی تردید کے لیے ایک شخص کو اجازت دی۔ وہ یہی اجازت تھی کہ عباس اسلام کی طرف مائل ہیں۔ اسلام مخفی رکھے ہوئے ہیں لہٰذا جو کوئی جنگ بدر میں انھیں دیکھے تو قتل نہ کرے۔ یہ نگاہ نبوت کا اعجاز ہے جہاں ایسوں ویسوں کی فکر کی پرواز کی رسائی ممکن نہیں تو ایسی فرضی داستانیں گھڑنے کا کیا فائدہ؟ سنین کے ادل بدل کرنے سے ان مستشرقین کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ واقعہ جو رونما ہوا اس سن کا واقعہ نہیں۔ سرے سے بے بنیاد یا بعد کا اضافہ شدہ ثابت کرتے ہیں۔ مگر یہ ان کی بھول ہے ایسا نہیں کہ ان کی گھڑی فرضی داستانوں کو مآخذ و مصادر رد نہ کرتے ہوں نیز مسلمان علما نے نہایت جان فشانی اور شبانہ روز سعی و محنت سے ہر واقعہ کو جانچ و پڑتال اور تحقیق و تفتیش کی بھٹی میں ڈال کر کھرا، صاف ستھرا اور کندن بنا کے تاریخ کے اوراق کی زینت بنا دیا ہے۔ یہ درست ہے کہ اب بھی تحقیق طلب واقعات ہیں۔ اللہ تعالیٰ توفیق بخشے ان مردان خدا کو جو اس تحقیق میں ہمہ وقت مصروف کار ہیں۔

ہجرت مدینہ

ہجرت مدینہ سے قبل کئی مسلمان اذیتوں اور تکلیفوں کے سبب حبشہ ہجرت کر چکے تھے۔ وہاں بھی قریش نے پل بھر سکھ کا سانس نہ لینے دیا۔ اپنا وفد بھیج کر شاہ حبش سے درخواست کی کہ انھیں اپنے ملک سے نکال دیں۔ شاہ حبش نے درخواست مسترد ہی نہیں کی بل کہ مسلمانوں سے کہا کہ میرے ملک میں جہاں چاہو رہو۔ اب ایک اور مقام کی طرف مسلمان بہ حکم رسول ﷺ مدینہ ہجرت کرنے لگے۔ ایک ایک دو دو موقع پا کر جانے لگے۔ دوسری طرف قریش کے ظلم و ستم کی وارداتیں بڑھتی گئیں۔ طرح طرح کی اذیتیں دیں۔ یہاں تک کہ قریشی بی بی کا شوہر جو غیر کفو ہوتا اس کی ہجرت کرنے کا پتہ چلتا، پکڑ لاتے اور ظلم

ڈھاتے نیز حفظ ماتقدم کے تحت اس کی بیوی کو ضمانت کے طور پر نظر بند کر دیتے۔ بعض شوہروں کو ہجرت سے روکتے' نہ رکتے تو قید کر دیتے۔ مسلمان بچارے پٹتے تھے لیکن آہ وزاری نہیں کرتے تھے تکلیفیں سہتے مگر حرف شکایت زبان پر نہیں لاتے تھے جو جو ظلم کر سکتے تھے قریش نے روا رکھا لیکن ظالم کو کیا خبر کہ مظلوموں پر کیسی قیامت گزر رہی ہے۔ ہر طرف دکھوں اور دردوں کے پہرے تھے پھر بھی وہ صبر کا پہاڑ تھے ڈٹے رہے اور زبان شکر گزاری کے ترانے الاپتی تھی۔ خدا کا نام لینا جرم تھا، نماز یا تلاوت قرآن کرنا موت کو دعوت دینا تھی۔ آفات وآلام ان کے تعاقب میں تھے اور بقول انوری جو بلا آسمان سے آتی ہے انوری کے گھر کا پتہ پوچھتی ہے گویا رات کی سنگینی کا عالم یہ تھا کہ خود حضور ﷺ (جن کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لیا تھا، خطرے سے باہر نہ تھے۔ غرض ہر ظلم سہتے رہے۔ بے چارے مسلمان تو یہ بھی نہیں کہہ سکتے تھے" کیوں اور کیا سوچ کر ظلم روا رکھا ہے؟ انھیں پوچھنے کی ضرورت ہی کیا تھی وہ بہ خوبی واقف تھے کہ کس جرم کی پاداش میں انھیں نشانہ بنایا جاتا ہے۔ صرف مسلمانوں کے قتل سے باز رہے کہ خانہ جنگی شروع نہ ہو جائے۔ آخر کار آپ ﷺ بھی ۱۲ ربیع الاول دوشنبہ کے دن ہجرت کر کے قبا پہنچ گئے۔

اعتراض نمبر ۲۲۹

شیری جونز (جیول آف مدینہ۔ ص۔۳۱) رقم طراز ہے کہ ہجرت کی رات حضرت علیؓ نے جب نبی کریم ﷺ کو بتایا کہ آج رات قریش کے ہر قبیلہ کے نوجوان آپ کو قتل کر دیں گے تو یہ سن کر نبی کریم ﷺ کے چہرے کا رنگ اس طرح اُڑ گیا جیسے وہ پہلے ہی مر چکے ہیں۔ (ماہنامہ ضیائے حرم لاہور۔ فروری۔ ۲۰۰۹)

جواب: اس اعتراض کی بنیادی غلطی تو یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے آپ ﷺ کو اس منصوبہ کے متعلق نہیں بتایا تھا بلکہ آپ ﷺ کو بذریعہ وحی علم ہوا، اور آپ ﷺ نے حضرت علیؓ کو خود بتایا تھا۔ کہ مجھے آج مکہ چھوڑ جانے کی اجازت مل چکی ہے، آج تو میری سرخ یا سبز چادر اوڑھ کر سو جائیں! بے شک تمہارے قریب ان کافروں کی طرف سے کوئی چیز ہرگز نہیں آسکے گی جو تمہیں ناپسند ہو۔ آپ ﷺ حضرت علیؓ کو باور کرا رہے ہیں کہ قریشی نوجوانوں کی تلواریں تمہارا بال بیکا نہیں کر سکیں گی۔ آرام سے بستر پر سو جاؤ تو بھلا سوچیے کہ آپ ﷺ کیسے گھبرائے ہوں گے۔

یہ مستشرقین کی ہرزہ سرائی کی دوسری غلطی اور تضاد دیکھئے کہ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ بڑے جنگ جو تھے، اور تلوار کے زور سے اسلام پھیلانے والے تھے پھر یک دم پینترہ بدلا اور کہا کہ وہ کافروں کی اس سازش سے خوف زدہ ہو گئے تھے اور نوجوانوں کی تلواروں سے ان کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا، سچ کہتے ہیں کہ "دروغ گو را حافظہ نباشد" (جھوٹے کا حافظہ کمزور ہوتا ہے۔ یہ بھی ان مستشرقین سے سوال کرنے کا حق بنتا ہے کہ آپ ﷺ ہجرت کی رات اپنے گھر کی چھت پھاڑ کر یا پچھلی جانب سے دیوار

توڑ کر باہر نکلے تھے یا آپ اسی دروازہ سے باہر تشریف لائے جہاں قریشی نوجوان تلواریں اٹھائے گھر کا محاصرہ کیے ہوئے تھے جب آپ ﷺ ان کے پاس سے گزر گئے انہوں نے آپ ﷺ کو نہ دیکھا کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی تھی اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کی حفاظت فرما رہا تھا اور اسی ذات نے آپ ﷺ کو ہجرت کرنے کا حکم فرمایا تھا۔ ایک اور زاویہ نگاہ سے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک گروہ آپ ﷺ کے سفر ہجرت کو دن کے وقت قرار دیتا ہے کہ آپ ﷺ رات کی بجائے دن کے وقت گھر سے روانہ ہوئے اگر ان کا خیال درست ہے تو پھر شیری جونز کا سارے کا سارا اعتراض ہی خاک بوس ہو جاتا ہے کیونکہ محاصرہ سے پہلے آپ ﷺ خانہ اقدس سے جا چکے تھے جبکہ نوجوان تلواریں لیے گھر کے باہر کھڑے رہے اس طرح سے نہ محاصرے ہوا نہ نوجوان تلواریں سونتے کھڑے ہوئے اور نہ ہی حضرت علیؓ آپ ﷺ کے بستر مبارک پر سوئے۔ بہر حال آپ ﷺ کی شجاعت و بہادری کی دو مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

سن چار ہجری میں بنی غطفان کے قبائل بنی محارب اور بنی ثعلبہ کے مقابلہ کی نیت سے خود حضور ﷺ نکلے۔ بنی غطفان کی ایک بڑی جمعیت مقابل ہوئی مگر جنگ نہ ہوئی۔ حضرت جابرؓ سے صحیح مسلم میں روایت ہے کہ آپ ﷺ کی جگہ ایک سایہ دار درخت کے نیچے تھی اور آپ ﷺ کی تلوار درخت کے ساتھ لٹک رہی تھی اس دوران ایک مشرک آیا اور وہی تلوار نکال کر آپ ﷺ سے کہنے لگا کہ آپ ہم سے ڈرتے نہیں ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، اس نے کہا کہ نہیں ڈرتے، میرے ہاتھ میں تلوار ہے آپ کو کون بچا سکتا ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ خدا بچانے والا ہے آخر اس نے تلوار پھر غلاف میں رکھ کر درخت سے لٹکا دی۔ ابن اسحٰق کہتے ہیں کہ اس مشرک کا نام غورث تھا اور اپنی قوم سے کہہ کر نکلا تھا کہ میں محمد ﷺ کو قتل کرتا ہوں۔ (نعوذ باللہ) آپ نے فرمایا مجھے تو میرے خدا نے بچا لیا اب تو بتا کہ تجھے کون بچائے گا؟ اس نے کہا مجھے کوئی نہیں بچا سکتا آپ ہی مجھے معاف فرما دیں آپ نے فرمایا: کیا تو اسلام قبول کرتا ہے؟ اس نے کہا یہ تو نہیں ہو سکتا مگر میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں آئندہ آپ ﷺ کے خلاف کسی جنگ میں شریک نہیں ہوں گا۔ اس گفتگو کو سن کر صحابہ بھی آپ ﷺ کے گرد جمع ہو گئے اس وقت آپ چاہتے تو قتل کرا سکتے تھے لیکن آپ ﷺ نے اسے معاف کر دیا اور جانے دیا اس نے واپس جا کر اپنے کافر ساتھیوں سے کہا کہ محمد ﷺ سب لوگوں سے بہتر انسان ہیں۔ اس واقعہ میں بہادری و شجاعت کی دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ اول یہ کہ آپ ﷺ کافر کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر اس کی للکار سے خوف زدہ نہیں ہوئے یہ بہادری کا اعلیٰ نمونہ ہے اور اس سے بڑھ کر جرات و شجاعت کا بے نظیر نمونہ یہ ہے کہ طاقت کے ہوتے ہوئے آپ ﷺ نے اسے معاف کر دیا اور انتقام نہ لیا۔ نیز آپ ﷺ نہ گھبرائے اور نہ آپ ﷺ کسی سے ڈرنے والے تھے۔

۲۔ غزوہ حنین میں جب مسلمان پیچھے رہ گئے تو پوری جرات اور ثابت قدمی سے دشمن کو للکارا اور بلند

آواز سے فرمایا ''انا النبی لاکذب   انا ابن عبدالمطلب (میں اللہ کا سچا نبی ہوں اس میں ذرا جھوٹ نہیں میں عبدالمطلب کا فرزند ہوں) لشکر پھر سے پلٹا اور پوری قوت سے حملہ کیا یہاں تک کہ دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے اور شکست کھا کر واپس لوٹے اس طرح آپ کی عدیم المثال شجاعت اور بے مثال ثابت قدمی نے مسلمانوں کی شکست کو فتح میں بدل دیا۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہجرت کی، اس کا سبب یہ بنا کہ انصار مدینہ نے آپ ﷺ کو اپنے شہر مدینہ آنے کی دعوت دی، آپ ﷺ ان کی دعوت پر وہاں تشریف لے گئے۔

اعتراض نمبر ۲۳۰

مؤرخ ''میتھیو'' متعدد الزامات عائد کرنے کے بعد تحریر کرتا ہے ''انھوں (محمدؐ) نے علی کا اونٹ لیا اور مدینہ چلے گئے، جب شہر کے باشندوں نے انھیں جلاوطن کردیا''۔ (حوالا بالا۔ ۱۹۷)

جواب: یہ بات یکسر غلط ہے کہ آپؐ نے علی کا اونٹ لیا تھا۔ بلکہ ابوبکرؓ کی دو اونٹنیوں سے ایک لی تھی۔ نہ جانے اسے ابوبکرؓ سے کیا چڑ ہے کہ ان کی بجائے علیؓ کا نام لیتا ہے اور یہ بھی جھوٹ بولتا ہے کہ علی کا اونٹ لیا تھا۔ دوم اہل مکہ نے انھیں جلاوطن نہیں کیا تھا بل کہ آپؐ خود انصار مدینہ کی دعوت پر ان کے ہاں تشریف لے گئے تھے۔ مدینہ کی ہوا اسلام کے پھیلنے میں نہایت سازگار تھی کیوں کہ اوس وخزرج ایک دوسرے سے جنگیں کر کے تھک چکے تھے۔ اب وہ کسی مسیحا کی تلاش میں تھے جس کی رہنمائی دونوں قبائل کو منظور ہو اور اس کے دم قدم سے امن ہو جائے۔ وہ مسیحا آقا کریم ﷺ تھے جس کی تعلیم وتربیت سے خون کے پیاسے اوس وخزرج ایک دوسرے کے بھائی، معاون ومددگار بن گئے۔ ایک جھوٹ کے سچے کرنے میں ہزار ہا جھوٹ بولے جائیں تو وہ سچ نہیں بن جاتا بلکہ جھوٹ ہی رہتا ہے۔ میتھیو نے ایک الزام کی جگہ کئی اور الزام لگا دیئے۔ ایک جھوٹ کو سچا کرنے کے لیے کئی اور جھوٹ بولتا ہے۔ مگر بے سود!

جب مشرکین مکہ نے دیکھا کہ مسلمان ایک ایک کر کے اپنے بال بچوں اور مال ودولت کو سمیٹ کر مدینہ جا رہے ہیں تو انھیں بہت قلق ہوا۔ انھیں روکنے کی سب تدبیریں ناکام ہوگئیں اور ان مہاجرین کے آقا ومولا ﷺ جو تیرہ سال مصائب وآلام اور جبر وتشدد کی چکی میں پستے رہے وہ مدینہ چلے جاتے ہیں تو کفار کی مذہبی ساکھ اور اقتصادی طاقت خاک بوس ہوتی دکھائی دیتی ہے جب کہ اہل مکہ شام سے سالانہ تجارت اڑھائی لاکھ دینار سونے کے تناسب سے ہوتی تھی۔ انھیں یہ بھی احساس تھا کہ مدینہ کے دو قبیلے اوس وخزرج طاقت ور ہیں۔ جنگی صلاحیتوں سے بھرپور ہیں اور یہ قبائل کئی سالہ خانہ جنگیوں سے تھک ہار کر صلح وآشتی کے خواہاں ہیں۔ مشرکین اس گھمبیر مسئلہ سے خائف تھے اور ان کے لیے زندگی اور موت کا سوال تھا۔ اس چیلنج سے نمٹنے کے لیے انھیں خیال آیا کہ اس کا کوئی مستقل علاج ڈھونڈا جائے اور وہ جانتے تھے کہ اس خطرہ کی بنیاد اسلام کے داعی پیغمبر اسلام ﷺ ہیں۔ بیعت عقبہ کے تقریباً اڑھائی ماہ

بعد جمعرات کو دار الندوہ میں اجلاس بلاتے ہیں۔ یہ سب سے خطرناک تاریخی اجتماع تھا۔سب سے پہلے اس اجتماع میں ابوالاسود نے یہ تجویز پیش کی کہ اس شخص (محمد ﷺ) کو اپنے درمیان سے نکال دیں اور اپنے اس مقدس شہر میں سے جلاوطن کر دیں۔ پھر ہمیں ان سے کوئی تعلق نہیں کہ وہ کہاں جاتا ہے اور کہاں رہتا ہے۔ ہمیں ہر طرح کا اطمینان اور چین نصیب ہو جائے گا اور جو لوگ باپ دادا کے دین کو چھوڑ کر دین اسلام میں داخل ہو چکے ہیں وہ جب خود کو بے سہارا اس کے بغیر پائیں گے تو وہ اس دین کو چھوڑ کر دوبارہ ہم سے آملیں گے اور ہم میں بھی پھر پہلے جیسی وحدت و یگانگت پیدا ہو جائے گی۔ فوراً کہا گیا کہ یہ تجویز ناقص ہے اس کی وجہ یہ کہ حضورؐ نہایت خوش اخلاق اور شیریں کلام ہیں۔ جو بھی ملاقات کرتا ہے آپ کی شخصیت اور نظریات سے دل و جان سے متاثر ہو جاتا ہے۔ اگر انھیں جلاوطن کر دیا گیا تو وہ اپنی ہمہ صفت و موصوف شخصیت سے عرب قبائل کو اپنا ہمنوا بنالیں گے اور مکہ پر حملہ آور ہوں گے۔ پھر اس شہر کی پائمالی گھوڑوں کے سموں سے ایسی ہوگی کہ تمھارا نام و نشان حرفِ مکرر کی طرح مٹ جائے گا۔ تجویز ایسی ہو جو ہر لحاظ سے کامیابی کی راہ دکھائے۔ میتھیو بے چارے کو اپنے بڑوں کی بات سے بھی اتفاق نہیں۔ انھوں نے جلاوطنی کی تجویز آنے والے خطرات کے پیشِ نظر مسترد کر دی مگر یہ کہتا ہے کہ کفار نے انھیں جلاوطن کر دیا۔ جسے اپنے بڑوں کی بات کا پاس و لحاظ نہیں وہ کسی اور کی کیا سنے اور مانے گا۔ بڑے چھوٹے ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ پھر بھی کسی کی عقل کی ترازو برابر ہوتی ہے مگر نہ مانوں کا علاج نہیں ہے۔ بڑوں نے سوچا کہ آپؐ اپنی مقناطیسی شخصیت، حقیقت بھری تعلیمات اور اعلیٰ اخلاق سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنالیں گے۔ جہاں بھی جائیں گے جان نثار کرنے والے پروانہ وار آئیں گے۔ اور لوگ جوق در جوق داخلِ اسلام ہوں گے اور ہو سکتا ہے کہ آنے والے وقت میں وہ ہم پر حملہ آور ہوں اور ہمارا نام و نشان تک نہ رہے۔ ان وجوہات کی بنا پر کفار کا اپنے شہر سے انھیں جلاوطن کرنا میتھیو کا محض الزام دھرنا مقصود ہے جبکہ حقیقت میں غلط ہے۔ کفار جانتے بھی ہیں کہ ان کے سارے منصوبے اور چالیں فضول اور بے کار ہیں مگر نفرت و تعصب کی لت نہیں چھوٹتی۔

اعتراض نمبر ۲۳۱

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں اسلام اور محمد ﷺ پر بہتانات میں سے ہجرت کو فرار قرار دیا گیا ہے۔ (محمد رسول اللہ۔ ۶۰۸)

جواب: انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں دین اسلام اور داعی اسلام پر بہتانات لگائے گئے ہیں اس میں لکھا ہے کہ پیغمبروں اور مذہبی شخصیتوں میں سب سے زیادہ کامیاب حضرت محمدؐ ہیں۔ پھر بھی اس میں حضورؐ اور اسلام پر کم از کم بائیس غلط بیانیاں موجود ہیں۔ جن میں سے ایک نمونہ کے طور پر یہ بیان کی جاتی ہے کہ ہجرت

مدینہ کو ''فرار'' قرار دیا گیا ہے۔ مغربی لٹریچر میں لفظی ہیر پھیر سے مغالطوں کے انبار لگا دیئے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر فرضی اضافہ کے نام ماہوئن۔ ماہوند اور مہامٹ وغیرہ کو داعی اسلام کے نام ٹھہرا دیا۔ اسپین کے ''الویرو'' نے اللہ اکبر کے جو معنی پیدا کیے ہیں اس کی ذہانت اور نرالی منطق کا جواب نہیں، ساتھ ہی اس کی اسلام دشمنی کا حدوحساب نہیں۔ اس کے خیال میں عرب ''زہرہ'' وینس ستارہ کو کَبر یا کُبر کہتے تھے۔ اس ستارے کی عزت و تکریم ہر صبح عبادت گاہ سے اللہ اکبر کا غلغلہ بلند ہوتا ہے۔ ''الویرو'' نے اللہ اکبر کا املا'' اللہ ھو کَبَر کیا ہے اور اس املاء کی مدد سے یہ معنی پیدا کیے ہیں کہ اللہ ہی کبر ہے۔ منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام کواکب پرستی کا نام ہے۔(اسلام اور مستشرقین مغرب کا انداز فکر۔۱۸۸) گولڈزیہر اسلام کو عرب جاہلیہ کا بدلہ ہوا نام قرار دیتا ہے۔

اسی طرح بہت سے اہل مغرب مستشرقین لفظ ہجرت کو انگریزی زبان میں HEJRA لکھتے ہیں۔ اور اس کا ترجمہ ''فرار'' قرار دیتے ہیں۔ مگر ان مستشرقین کے خلاف ''لیوس'' اس کا صحیح تلفظ hijra بتاتا ہے اور ترجمہ کے لیے انگریزی لفظ (move) استعمال کرتا ہے۔ گویا ان کے اپنے الزام کی اپنے ہمنوا مستشرق نے تردید کر دی۔ عربوں کے نزدیک ہجرت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی خانہ بدوش صحرانشین اپنے صحرا کو چھوڑ کر کسی شہر میں جا بسے۔ گویا ہجرت کسی نعم البدل کا حصول ہے۔(محمد رسول اللہ۔۴۰۸)'' گولڈزیہر'' اسلام کو عرب جاہلیہ کی مروۃ کا بدلا ہوا نام قرار دیتا ہے۔(مستشرقین مغرب کا انداز فکر۔۲۱۷) مستشرقین لفظ ہجرت کے معنی فرار کرتے ہیں جو کسی طرح عربوں کے نزدیک اس معنی میں مروج نہیں ہے۔ اسلامی اصطلاح میں اگر مسلمان کو ایک شہر یا ملک میں ان عقائد پر عمل کرنے سے روکا جائے اور انھیں شہر یا ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا جائے اور وہ مسلمان کسی اور شہر یا ملک میں جا بسیں اسے ہجرت کہتے ہیں۔ جیسے پاکستان ۱۴ اگست ۱۹۴۷ کو دنیا کے نقشے پر ظاہر ہوا۔ اس مملکت خداداد کے حصول میں مسلمانوں نے ہر دکھ سہا حتیٰ کہ گھر بار، مال، جائداد چھوڑی۔ بچوں کی قربانیاں دے کر، جوانوں کو قربان کر کے، ماؤں بہنوں کی ردائیں تار تار کروا کے، خون کی ندیاں بہا کر آخر ہجرت کر کے وہ اس خطہ میں چلے آئے جس کے حصول کے لیے انھوں نے سب کچھ پیش کر دیا تھا۔ مگر منکرین ہجرت کو عظیم قربانی کے بہ جائے محض پناہ گیری اور فرار تصور کرتے ہیں۔ عہد وسطیٰ میں ہجرت کا تصور یہ تھا کہ کسی جرم کی سزا میں ملک بدر کر دیا جاتا تھا۔ ہجرت اس نیت سے کی کہ اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے۔ مروی ہے ''انما الاعمال بالنیات'' اعمال کا ثواب نیت پر موقوف ہے جس کسی نے ہجرت دنیا یا عورت سے نکاح کرنے کی نیت سے کی تو اسے وہ کچھ ملے گا اور آخرت میں کچھ ثواب حاصل نہ ہوگا۔ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہجرت فرمائی اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر ہجرت کی اس کے اجر کا ضامن اللہ تعالیٰ ہے۔ اس سے معلوم ہوا ہجرت فرار نہیں ہے بلکہ اسلام کی سربلندی کی آئینہ دار ہے۔

شبہ کا ازالہ: یہودیوں کا یہ دعویٰ قطعی بے دلیل ہے کہ ان کے قدیم آباؤ اجداد نے مدینہ طیبہ کو آباد کیا تھا اور یہ ان کا آبائی اصل وطن ہے۔ کیوں کہ یہود کی مقدس کتاب تورات اور تاریخ سے ثابت ہے کہ موسیٰؑ بنی اسرائیل کے ساتھ حج بیت اللہ سے فارغ ہو کر جب مدینہ منورہ آئے تو ان میں ایک گروہ نے محض اس بناء پر مدینہ منورہ میں رہائش رکھ لی کہ تورات کی پیش گوئی کے مطابق اسی شہر میں حضرت محمد ﷺ تشریف لانے والے ہیں۔ یہ بنو قینقاع یہود کا معروف قبیلہ تھا جو یہود میں سب سے پہلے بازار قینقاع میں آباد ہوا۔ یہ مسجد نبوی کی جنوب مغربی سمت کی طرف بنو قینقاع کے نام سے معروف تھا۔ جہاں اب بڑا ڈاک خانہ ہے۔ اس کے ارد گرد کی جگہ یہ قبیلہ آباد ہوا تھا۔

بعد میں بنی نضیر یہود کا قبیلہ آباد ہوا۔ جو قبا اور اس کے ارد گرد وادی بطحا تک آباد ہوا۔ یہ کھیتی باڑی کے ماہر تھے۔ عمالقہ کے بعد انھوں نے ہی مدینہ طیبہ میں کنویں کھودے تھے۔ اس کے بعد یہود کا تیسرا قبیلہ بنو قریظہ آباد ہوا۔ ان کا مسکن موجودہ عوالی سے حارۃ شرقیہ کے بلند علاقے تھے۔ (انسائیکلو پیڈیا مدینۃ النبی۔ ۷۶)

خروج دن کو ہوا یا رات کو

حدیث مبارکہ: ام المومنین سے مروی ہے کہ ایک روز ہم سب گھر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ عین دو پہر کا وقت تھا۔ اس وقت سرکارِ دو عالمؐ ہمارے گھر تشریف لائے۔ گھر کے کسی شخص نے آپؐ کو آتے دیکھ کر کہا کہ آپؐ سر ڈھانپے تشریف لا رہے ہیں (یہ سر ڈھانپنا یا تو گرمی کے سبب تھا یا لوگوں کی شناخت سے بچنے کے لیے تھا) آپؐ اس سے پہلے اس وقت کبھی تشریف نہیں لائے تھے۔ سیدنا ابو بکرؓ نے کہا ''میرے ماں باپ آپؐ پر قربان آپ ضرور کسی اہم کام کے لیے تشریف لائے ہیں''۔ رسول اللہ نے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ اجازت پا کر آپؐ اندر تشریف لائے۔ سیدنا ابو بکرؓ سے فرمایا ''یہاں اس وقت جتنے لوگ ہیں انھیں یہاں سے ہٹا دو (کیوں کہ اہم بات کرنی ہے) سیدنا ابو بکرؓ نے عرض کیا ''یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان، یہ تو آپؐ ہی کے گھر والے ہیں''۔ اس پر سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''مجھے یہاں سے باہر جانے (ہجرت) کا حکم دیا گیا ہے''۔ سیدنا ابو بکرؓ نے کہا ''یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپؐ پر قربان مجھے بھی ساتھ لے لیجیے''۔ آپؐ نے فرمایا ''ٹھیک ہے''۔ سیدنا ابو بکر نے کہا ''یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپؐ پر قربان'' ان دو اونٹنیوں میں سے ایک آپ لے لیں''۔ آپؐ نے فرمایا: مفت نہیں قیمتاً لوں گا''۔

سیدہ عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ہم نے ان کے لیے جلدی جلدی سامان سفر اور زاد راہ تیار کیا۔ کچھ کھانا چمڑے کے ایک تھیلے میں رکھ دیا۔ سیدہ اسماء بنت ابو بکر نے اپنا ازار بند کاٹا اور اس سے تھیلے کا منھ باندھا۔ اس وجہ سے ان کا نام ذات النطاقین پڑ گیا۔ پھر رسول اللہؐ اور ابو بکرؓ اپنی سواریوں پر چل پڑے

اور غار ثور میں تین رات چھپے رہے۔ جب رات کا اندھیرا ہوتا تو دودھ والی بکریاں ان کے پاس لے جاتے اور وہ دودھ پی کر رات گزارتے حتیٰ کہ اندھیرے میں عامر بن فہیرہ بکریاں ہانک کر لے جاتا۔ تین راتیں ہر رات اسی طرح کرتے رہے۔ آپؐ اور ابوبکرؓ نے بنی دیل کے ایک آدمی کو جو بنی عبد بن عدی میں سے تھا ملازم رکھا ہوا تھا۔ وہ رہبر تھا۔ اس نے آل عاص بن ویل سہمی سے حلف باندھ رکھا تھا جب کہ وہ کفار قریش کے دین پر تھا اسے امین بنایا اور دونوں اونٹنیاں اس کے حوالے کر دیں اور اس سے (عبداللہ بن اریقط سے) تین راتوں کے بعد تیسری شب کی صبح کو دونوں اونٹنیاں غار ثور میں

سیریل نمبر	کتب کا نام/صفحہ نمبر	غار ثور میں قیام دن کو	غار ثور میں قیام رات کو	کیفیت
۱	بخاری شریف (کتاب الباس) ۲۔۳۵۲	----	۳ رات	تین رات غار میں رہے تین راتوں کے بعد تیسری رات کو دونوں اونٹنیاں غار ثور میں پہنچانے کا وعدہ لیا
۲	تفہیم البخاری۔۵۔۱۲۱۔۹۲۱		۳ رات	
۳	ابن ہشام۔۱۔۵۳۵	۳ روز قیام	۳ رات	پیغمبر اسلام اور ابوبکرؓ تین شبانہ روز غار میں رہے (ن ۱۵۴۔۲)
۴	الوفا ابن الجوزی۔۲۸۵		۳ رات	آپ غار ثور میں تین شب رہے
۵	مدارج النبوۃ۔۱۔۸۸	---	۳ رات	تیسری شب کی صبح روانگی۔ اریقط اونٹ لے کر آ گیا
۶	السیرۃ النبویہ زین دحلان۔۱۔۳۹۳۔۳۹۴		۳ رات	آپ نے اپنے یار غار کے ساتھ تین راتیں غار میں ٹھہرے تیسری شب صبح اریقط اونٹنیاں لے آیا غار کے قریب تیسری شب کی صبح اریقط اونٹنیاں لے آیا
۷	المواہب لدنیہ اردو ترجمہ۔ سیرت محمدیہ۔۱۔۲۰۴		۳ رات	تیسری شب کی صبح اریقط اونٹنیاں لے آیا
۸	رحمۃ اللعالمین۔۱۔۸۱	۳ دن		چوتھی شب ابوبکر کے گھر اونٹنیاں آ گئیں
۹	سیرت النبی۔۱۔۱۶۷	۳ دن	۳ رات	۳ دن یہی خوراک رہی اس طرح تین راتیں گزریں اور چوتھے روز آپ گھر سے نکلے
۱۰	ضیاالنبی۔۳۔۸۱	۳ دن		تیسرے روز اریقط اونٹنیاں لے کر پہنچ گیا
۹	حیات محمد ہیکل		۳ رات	تین راتیں گزار کے شب دوشنبہ یکم ربیع الاول کو مدینہ روانگی ۲: ابوبکرؓ کا بیان ہے کہ دوشنبہ کی رات کو روانہ ہو کر برابر چلتے رہے یہاں تک کہ دوپہر ہو گئی
۱۰	سیرت المصطفےٰ۔۱۲۳۔۱۲۴	۳ دن		بہ ہر حال چوتھے دن آپ یکم ربیع الاول دوشنبہ کے دن غار ثور سے باہر تشریف لائے۔ ۲: آپؐ غار میں اپنے یار غار کے ہم راہ تین دن قیام پذیر رہے
۱۱	الرحیق المختوم۔۲۷۷۔ بہ حوالہ فتح الباری		۳ رات	دونوں حضرات نے تین راتیں چھپ کر گزاریں
۱۲	مدینۃ النبی انسائیکلوپیڈیا۔۱۵۲	۳ دن		تین دن قیام کیا
۱۳	محمد عربی انسائیکلوپیڈیا۔۱۳۹	۳ دن	۳ رات	تین شبانہ روز قیام کیا اور پیر کو پہنچے

پہنچانے کا وعدہ لیا اور عامر بن فہیرہ اور راہبر ان کے ساتھ چلے۔ (بخاری شریف) کے اس جملہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ تین راتیں غار میں گزاریں اور اگلے دن (یعنی چوتھے دن) غار سے مدینہ منورہ کو روانہ ہوئے۔ اگلا دن یعنی چوتھا دن روانگی کا اس لیے پڑتا ہے کیوں کہ بعض سیرت کی کتب میں آپؐ اور ابوبکر کا غار ثور میں قیام تین دن کا ذکر بھی ہے۔ گویا یوں تین شبانہ روز غار میں رہے۔ دن میں ہجرت کرنے سے تمام امور میں مطابقتیں پائی جاتی ہیں۔ یعنی تین شبانہ روز غار ثور میں قیام اور چوتھے دن سوئے مدینہ شریف روانگی روایات کے مطابق ہیں۔ امکانی نقشہ جات کی امکانی صورتوں سے مذکورہ ممکنہ

صورت درست ٹھہرتی ہے۔ جو روایات کے موافق ہے۔ امکانی نقشہ جات کی امکانی صورتوں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ نے دن میں ہجرت فرمائی۔ نقشہ آگے آرہا ہے۔ مذکورہ طویل حدیث کے اس ٹکڑے سے چند امور ثابت ہوئے۔

۱: سفر ہجرت رات کو نہیں بل کہ دن کے وقت شروع ہوا لہٰذا جن روایات میں رات کے سفر کا ذکر ہے وہ بخاری کی اس حدیث کے مقابلہ میں کم زور ہیں۔

۲: ہجرت کا آپؐ کو جوں ہی حکم ملا آپؐ اسی وقت ابوبکرؓ کے مکان پر تشریف لائے۔ ابوبکر کو حکم سنایا۔ ابوبکر نے رفاقت کی درخواست کی جو آپؐ نے منظور فرمالی۔ (اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ آپ جس وقت ابوبکرؓ کے مکان پر تشریف لائے، اس وقت پہلے کبھی نہیں آیا کرتے تھے۔ لہٰذا جوں ہی حکم ملا آپؐ ابوبکرؓ کے ہاں چلے آئے)

۳: اس وقت ابوبکرؓ کے گھر ہی پر زادِ راہ سیدہ عائشہؓ اور سیدہ اسماءؓ دونوں بہنوں نے تیار کیا اور سیدہ اسماء نے اپنے ازار بند سے اس تھیلے کے منھ کو باندھا جس میں کھانا تھا۔

۴: ابوبکرؓ کے گھر ہی سے اسی وقت اور دوپہر کے وقت سیدنا ابوبکر اور رسول اللہ ہجرت کے لیے روانہ ہوگئے اور جبل ثور کے ایک غار میں تین رات چھپے رہے۔

یہ جو تاریخ وسیر کی کتب میں محمد ابن اسحاق وغیرہ کے حوالے سے روایات ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سیدنا علیؓ کو اپنے بستر پر سلایا اور فرمایا کہ یہ سبز چادر اوڑھ کر سو جاؤ، تمھیں کوئی گزند نہیں پہنچے گا اور آپؐ نے رات کے وقت ہجرت فرمائی، بخاری کی اس حدیث کے مقابلے میں ان روایات کی ایک افسانے سے زیادہ حیثیت نہیں اور ان روایات کے خدوخال سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ بنائی گئی ہیں۔ (خاتم النبیین۔ ۴۲۴۔۴۲۵) نیز اس میں یہ جملہ "رات کے وقت ہجرت فرمائی" محل نظر ہے اور روایات اس کے خلاف ہیں۔

جیسا کہ بخاری کی روایت میں ہے کہ سرکار دوعالم ﷺ دوپہر کے وقت سیدنا صدیق اکبرؓ کے گھر پہنچے وہیں زادِ راہ تیار کیا گیا اور پھر وہیں سے وہ سفرِ ہجرت کے لیے روانہ ہوگئے۔ دونوں حضرات (رسول اللہ ﷺ اور سیدنا صدیقؓ) مکان کی عقبی کھڑکی سے نکلے۔ (بہ حوالا بالا۔ ابن ہشام۔ البدایہ والنہایہ)

ابن اسحٰق کے حوالہ سے مارگولیس کہتا ہے کہ آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ دونوں اسی وقت (دن کو) عقبی دروازے سے نکل گئے اور غارِ ثور میں پناہ لی جو مکہ کے جنوب میں ہے۔ (ن۔۲۔۱۵۳)

ابن سعد کہتا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کو دارالندوہ کے اجلاس کی نیت اور ارادے کا علم ہوا تو آپ ﷺ نے دوپہر ہی سے اقامت گاہ خالی کردی۔ (ن۔۲۔۱۵۳)۔

حوالہ جات کتب

۱۲: ابن اسحاق کے بیان کے بہ موجب آنحضرتؐ اور ابو بکرؓ دونوں اسی وقت (دن کو) عقبی دروازے سے نکل گئے اور غار ثور میں پناہ لی جو مکہ کے جنوب میں ہے۔ (مارگولیس) (ن۔۲۔۱۵۳)

۱۳: پیغمبر اسلام کو دار الندوہ کے اجلاس کی نیت اور ارادے کا علم ہوا تو آپ نے دوپہر ہی سے اقامت گاہ خالی کر دی۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں: ہم دوپہر کو ابو بکر کے گھر بیٹھے تھے۔ کسی نے ان سے کہا کہ رسول اللہ ﷺ چہرے پر مقنع ڈالے تشریف لاتے ہیں حال آنکہ معمولاً آپ اس وقت کبھی تشریف نہ لاتے تھے۔ (ن۔۲۔۱۵۳۔ بہ حوالہ بخاری شریف)

کتب کے حوالہ جات درج کرنے کی غرض یہ ہے کہ

۱۔ ظاہر ہو سکے کہ آپ ﷺ نے غار ثور میں جتنے دن قیام فرمایا۔

۲۔ غار ثور میں جتنے دن یا راتیں یا کل جتنے دن اور راتیں گزاریں۔

۳۔ غار ثور میں قیام کے بعد کون سے دن مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔

۴۔ ان حوالہ جات سے مترشح ہوتا ہے کہ آپ ﷺ تین دن اور تین راتیں قیام فرما کر چوتھے دن عازم مدینہ منورہ ہوئے۔

۵۔ اگر روانگی غار ثور سے مدینہ منورہ کو چوتھے دن ہو تو دیکھنا یہ ہے کہ خروج دن کو ہوتا ہے یا رات کو۔ اس کے لیے درج ذیل امکانی صورتوں اور نقشہ پر نگاہ ڈال لی جائے جس سے حل طلب مسئلہ کے سمجھنے میں آسانی پیدا ہو جائے۔

مذکورہ نقشہ میں کہیں تین دن اور کہیں تین رات کے قیام کا ذکر ہے البتہ سیریل نمبر ۱۳ میں تین شبانہ روز کا ذکر موجود ہے۔ بل کہ صراحتاً غار ثور سے مدینہ شریف کو روانگی چوتھے روز ہوئی' کا ذکر بھی ہے۔ اسی طرح سیریل نمبر ۱۰ میں تین دن قیام اور چوتھے روز روانگی کا ذکر ہے۔

ان تمام میں تطبیق کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ آپؐ نے غار ثور میں تین شبانہ روز قیام کیا اور چوتھے روز غار سے نکل کر سوئے مدینہ روانہ ہوئے۔ اس کی وضاحت کے لیے دن یا رات کو ہجرت کرنے کے دو نقشے پیش کرتے ہیں۔

اگر سفر دن کو شروع ہو تو۔۔۔۔نقشہ اول

دن ۵   رات   دن۴   رات   دن۳   رات   دن ۲   رات   دن

امکانی صورتیں:

۱: پہلے دن گھر سے ہجرت، اسی دن مدینہ کو روانگی ہوئی

۲: ایک دن قیام، پہلی رات روانگی

۳: ایک دن ایک رات قیام، دوسرے دن روانگی

۴: دو دن ایک رات قیام، دوسری رات روانگی

۵: ۲ دن ۲ رات قیام، تیسرے دن روانگی

۶: ۳ دن اور ۲ رات قیام، تیسری رات روانگی

۷: ۳ دن اور ۳ رات قیام، چوتھے دن روانگی +

۸: ۴ دن اور ۳ رات قیام، چوتھی رات روانگی

۹: ۴ دن اور ۴ رات قیام، پانچویں دن روانگی

خروج دن میں ہوا: نقشہ اول میں بھی نو ممکنہ صورتیں ہیں۔ ان ممکنہ صورتوں میں ایک تا چھ اور آٹھ نو خارج از بحث ہیں۔ یہ روایات کے خلاف ہیں۔ ہاں مگر ایک ممکنہ صورت نمبر سات ہے جو روایات سے مطابقت رکھتی ہے۔

۱: تین دن کا قیام غار میں ۲: تین رات کا قیام غار میں

۳: چوتھے دن غار ثور سے مدینہ روانگی

اگر سفر رات کو شروع ہو تو۔۔۔۔ نقشہ دوم

رات دن ۴ دن رات دن۳ رات دن ۲ رات دن ۱ رات

امکانی صورتیں:

۱: پہلی رات گھر سے اور اسی رات روانگی

۲: ایک رات غار میں قیام، پہلے یا اگلے دن روانگی

۳: ایک رات اور ایک دن قیام، دوسری رات روانگی

۴: دو رات اور ایک دن قیام، دوسرے دن روانگی

۵: دو رات اور دو دن قیام، تیسری رات روانگی

۶: تین رات اور دو دن قیام، تیسرے دن روانگی

۷: تین رات اور تین دن قیام، چوتھی رات روانگی +

۸: چار رات اور تین دن قیام، چوتھے دن روانگی

۹: چار رات اور چار دن قیام، پانچویں رات روانگی

خروج رات کو نہیں ہوا: اگر آپ ؐ اپنے خانہ مبارک سے رات کو روانہ ہوں تو نقشہ دوم کے

مطابق نو ممکنہ صورتیں خروج کی بنتی ہیں۔ان ممکنہ صورتوں میں نمبر شمار ایک تا چھ اور آٹھ نو خارج از بحث ہیں کہ علاوہ دیگر وجوہ کے ان کی تائید میں کوئی روایت نہیں۔رہ گئی ساتویں نمبر کی ممکنہ صورت جس میں تین دن اور تین راتوں کا قیام ظاہر ہوتا ہے لیکن غار ثور سے مدینہ منورہ کو روانگی چوتھی رات کو ہوتی ہے جیسا کہ نمبر آٹھ کی ممکنہ صورت میں ہے۔یہ بھی روایات کے خلاف ہے۔اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نقشہ دوم کی تمام ممکنہ صورتوں میں کوئی بھی ممکنہ صورت روایات سے مطابقت نہیں کرتی ہے۔لہٰذا آپؐ کا اپنے خانہ اقدس سے خروج رات کو نہیں ہوتا اور نہ رات کو غار ثور میں تشریف لے جاتے ہیں۔

یہ غلطی کیسے در آئی؟ غار ثور میں تین شبانہ روز قیام کے بعد چوتھے روز روانگی مدینہ منورہ کو ہوتی ہے، یہ تب ممکن ہے جب خروج دن کے وقت ہو۔اب تین شبانہ روز قیام اور چوتھے دن روانگی تو لکھ دی لیکن خروج رات کو ہوا لکھ دیا جس سے معاملہ گڈمڈ ہو گیا۔رات کے خروج کے قائل حضرات نے یہ تحقیق نہ کی کہ اس طرح تو خروج دن کو ہوتا ہے مگر بے احتیاطی سے خروج رات کو ہوا لکھ دیا اور ان کی دیکھا دیکھی دوسروں نے بھی اچک لیا اور یہ غلطی چلتی رہی۔جس طرح ایک سیرت نگار لکھتے ہیں ''تین راتیں گزار کر اونٹنیاں غار پر لے آنا۔پھر لکھتے ہیں کہ سفر غار ثور سے مدینہ کی طرف چوتھے روز شروع ہوا۔اس حساب سے خانہ اقدس سے سفر رات کو شروع ہو تو تین راتیں گزارنے کے بعد اگلا دن روانگی کا آتا ہے' وہ تیسرا دن ہوتا ہے چوتھا روز نہیں۔یہ سیرت نگار رات کے خروج کا قائل ہے۔سیرت نگار کو سیرت کے واقعات میں نہایت حزم و احتیاط سے قلم اٹھانا چاہیے۔کسی بھی واقعہ کو بغیر تحقیق کے لکھ دینے سے اجتناب کرنا چاہیے ورنہ ایسی غلطیوں کے در آنے کا امکان ہوتا ہے۔نیز ایسی بے احتیاطی سے پیدا ہونے والی غلطیاں مستشرقین کے لیے نہایت خوب اور مرغوب ہوتی ہیں جو مزید نمک مرچ لگا کر اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں۔اور واقعہ کے وقوع کی تعریف اور وقت میں شکوک پیدا کر کے واقعہ کے ہونے کا سرے سے انکار کر دیتے ہیں۔

حکمتیں:

ہر ایک شے کو بے کار پیدا نہیں کیا گیا۔ہر شے کی اپنی حیثیت اور اہمیت ہے۔ایک بزرگ اپنے مریدوں کو الفاظ کے اسرار و رموز اور اشارات سے متعلق وعظ فرما رہے تھے۔اس دوران ایک شخص آیا کھڑے ہوئے سنتا رہا آخر بولا یہ بھی کوئی کرنے کی باتیں ہیں ان الفاظ میں اثر کہاں؟ بزرگ بولے! اے خر! تو چہ میدانی، (اے گدھے تو کیا جانے) وہ شخص غصے سے بھوت ہو گیا۔تو بزرگ بولے میاں! کیا ہوا؟ وہ کہنے لگا کہ تم نے مجھے ''خر کہا ہے''۔وہ فرمانے لگے دیکھا کہ خر کے دو حرف ہیں جنھوں نے تیرے تن بدن میں آگ لگا دی ہے۔بھلے مانس سمجھ لے کہ حرفوں اور لفظوں میں تاثیر ہوتی ہے جو اکسیر کا درجہ رکھتی ہے۔

اسی طرح اعداد کی اپنی حیثیت ہے اور کسی کام کے لیے اعداد کا تعین اور تعداد و گنتی کی اپنی اہمیت ہے جس طرح حضرت موسیٰؑ نے چالیس دن گزارے اور تورات کے صحیفے سے نوازے گئے۔ اللہ تعالیٰ ہی ان کے اندر چھپے سربستہ راز اور حکمتوں کو خوب جانتا ہے۔ نہ جانے تین دن اور تین راتیں غار ثور میں گزارنے کی کیا حکمتیں ہیں البتہ غار میں ہماری دانست کے مطابق چند حکمتیں یہ ہو سکتی ہیں۔

۱۔ ماحول کی شدت میں کمی آجائے۔

۲۔ آنے والوں کے لیے یہ اقدام مشعل راہ ہو سکے۔

۳۔ انبیاء سے موافقت۔

قرآن کریم کی سورت مریم میں ہے ”زکریا نے عرض کی میرے رب! کیسے ہو سکتا ہے میرے ہاں لڑکا، میری بیوی بانجھ ہے اور میں خود پہنچ گیا ہوں بڑھاپے کی انتہا کو۔ فرمایا یونہی ہے، تیرے رب نے فرمایا ہے کہ بچہ دینا میرے لیے آسان ہے اور (دیکھو) میں نے تمہیں بھی پیدا کیا تھا اس سے پیشتر حالانکہ تم کچھ بھی نہ تھے۔ زکریا نے عرض کی اے میرے رب! ٹھہراؤ میرے لیے کوئی علامت فرمایا تیری نشانی یہ ہے کہ تو تین رات دن لوگوں سے کلام نہ کرے بھلا چنگا ہو کر۔“ لہٰذا حضرت زکریاؑ کے تین رات تک بات نہ کرنے میں اشارہ تین رات تک کا ہے حالانکہ اس سے کم اور زیادہ راتوں کا ذکر بھی ہو سکتا تھا۔

حضرت یوسفؑ کو بھائیوں نے کنویں میں گرا دیا، ایک کارواں مدین سے بہ طرف مصر جا رہا تھا ۔ راستہ بھٹک کر اس جنگل میں آپڑے جہاں آبادی سے بہت دور ایک کنواں تھا جب قافلہ کنویں کے قریب اترا اور مالک بن ذعر خزاعی نے اس کنویں میں ڈول لٹکایا۔ حضرت یوسفؑ اس سے چمٹ گئے مالک نے ڈول باہر کھینچا تو دیکھا کہ ایک چاند سا چہرے والا نوجوان ہے اس کی اپنے ساتھیوں کو خبر دی حضرت یوسفؑ اس کنویں میں تین روز رہے۔

۳۔ حضرت یونسؑ تین دن مچھلی کے پیٹ میں رہے پھر اللہ نے کرم فرمایا اور مچھلی نے زندہ یونسؑ کو اگل دیا۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ غار ثور میں تین دن رہے۔ گویا یہ پیغمبروں کی موافقت ہے

قبا میں آمد:

آپؐ اور ابو بکرؓ نے ہجرت کی۔ آپؐ کی قبا اور مدینہ منورہ میں آمد کی تاریخ اور دن میں اختلاف ہے جب کہ مہینہ ربیع الاول پر اتفاق ہے۔ قدیم وجدید علماء کی رائے پیش کرتے ہیں۔

۱: آپؐ ۱۲ ربیع الاول دوشنبہ کو قبا میں وارد ہوئے۔ (ابن اسحاق۔ نقوش رسول نمبر۲۔۵۶)

۲: آپ ۱۲ ربیع الاول دوشنبہ کو مدینہ منورہ تشریف لائے۔ (ابن ہشام)

۳: اریقط بہ مقام قبا لایا۔ ماہ ربیع الاول کی بارہ راتیں گزر چکی تھیں۔ پیر کا دن تھا۔ (ابن

ہشام۔ا۔۵۴۱)

۴: آنحضرت ؐ کا خروج دو شنبہ کا ہے اور مدینہ میں آمد ۱۲ ربیع الاول دو شنبہ ہے۔(طبری۔ن۔۲۔۱۵۴)

۵: رسول اللہؐ دوشنبہ کو ۱۲ ربیع الاول سنہ ۱ ھ کو مدینہ پہنچے۔(واقدی)

مدینہ میں آمد:

۶: آنحضرت ﷺ نے جب مکہ سے ہجرت فرمائی تو آپؐ دوشنبہ ربیع الاول کو مدینہ پہنچے اور یہ تاریخ مجتمع علیہ ہے۔(ابن سعد)

۷: تمام متقدمین کا اس پر اتفاق ہے کہ آنحضرت ۱۲ ربیع الاول، ا۔ہجری کو دوشنبہ کو قبا میں وارد ہوئے۔

چنانچہ مسعودی، مقدسی وغیرہ نے ابن سعد کی رائے کو اختیار کیا ہے حتیٰ کہ مستشرقین اور علمائے یورپ بھی اس سے انکار نہ کر سکے، شیعہ اکابرین بھی اسی کو تسلیم کرتے ہیں۔البتہ البیرونی اور اس کے بعد چند نئے مصنفین سیرت نگار مثلاً مارگولیتھ، ایچ جی ویلز، مولانا شبلی نعمانی وغیرہ کے نزدیک یہ تاریخ ۸ ربیع الاول بہ مطابق ۲۰ ستمبر ۶۲۲ ء تھی جس کی وجہ بہ ظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ عام قمری حساب سے ۱۲ ربیع الاول ۱۰ ہجری کو دوشنبہ ممکن نہیں، خالص قمری تقویم کی جدولوں کے مطابق دوشنبہ کا دن صرف ۸ ربیع الاول کو پڑتا ہے۔اس لیے آج کل یہی تاریخ مقبول ہوتی جا رہی ہے۔

پر سیوال کے نظریہ کو سامنے رکھ کر سر ولیم میور نے کتاب لکھی کیوں کہ اس نظریہ کے بہ موجب بھی ۱۲ ربیع الاول ۱۰ ہجری کو دوشنبہ پڑتا ہے اور دھوکا ہوتا ہے کہ شاید یہ نظریہ درست ہے لیکن اس میں بڑی خرابی یہ ہے کہ اس نظریہ سے واقعات سیرت کے موسم بالکل الٹ ہو جاتے ہیں۔اسی واقعہ کو دیکھیے کہ یہ میور کے نزدیک ۲۸ جون ۶۲۲ ء کا ہے (It was Monday JUNE 28 AO.MUIR LIFE 168). یعنی انتہائی موسم گرما کا لیکن تمام کتب سیرت میں یہ روایت ملتی ہے کہ ہجرت کی شب حضرت علیؓ آنحضرتؐ کی اونی چادر (برد) اوڑھ کر سوئے تھے۔(ابن ہشام) اس روایت کو میور بھی بڑی آب و تاب سے بیان کرتا ہے حال آنکہ ماہ جون میں مکہ کا موسم اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کوئی شخص معمولاً اونی کپڑے یا چادر اوڑھ کر سو سکے۔روایات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت مدینہ میں داخل ہوئے تو فصل خریف سمیٹی جا رہی تھی۔گو میری دانست میں موسم آخری ہو چلا تھا۔فصل خریف مدینہ میں عام طور پر آخر ستمبر سے نومبر تک سمٹتی ہے۔مئی جون میں اور فصل خریف کا تصور کس قدر دل چسپ ہے؟ ایک اور مثال ملاحظہ کیجیے۔

بدر کا موسم روایتی اعتبار سے گرم تھا اور اتنا گرم تھا کہ مسلمان بارش کی دعائیں مانگنے لگے پھر جب بارش ہوئی تو خود قرآن کریم نے اسے احسان الٰہی کے طور پر پیش کیا۔ "اللہ نے ڈھانپ دیا تمھیں غنودگی

سے تاکہ تسکین ہو اس کی طرف سے اور اتارا تم پر آسمان سے پانی تاکہ پاک کر دے تمھیں اس سے اور دور کر دے تم سے شیطان کی نجاست اور مضبوط کر دے تمھارے دلوں کو اور جما دے اس میں تمھارے قدموں کو"۔ (سورۃ انفال) میور کے مطابق جب یہ بارش ہوئی تھی وہ جنوری کی ایک رات تھی اور مسلمانوں کے لیے اس درجہ لذت آفرین تھی کہ انھیں رات بھر گہری نیند آتی رہی۔ (میور) اس طرح تمام واقعات سیرت اس تقویم کی زد میں آنے پر الٹے ہو جاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

قبا میں قیام کی مدت سے متعلق روایات

ہجرت نبوی کا مختصر قافلہ یکم ربیع الاول پیر کے دن غار ثور سے مدینہ منورہ کو روانہ ہوتا اور ۸ ربیع الاول پیر کو وارد قبا ہوتا ہے۔ آپ نے قبا میں مسجد کی تعمیر کروانا شروع کی۔ آپؐ نے قبا میں چودہ دن قیام فرمایا مگر اس چودہ روز قیام کے دوران آپؐ مدینہ منورہ آتے جاتے رہے۔ ایسا نہیں کہ چودہ دن قیام میں آپؐ مدینہ تشریف نہیں لے جاتے رہے صرف قبا میں ہی مقیم رہے۔ جیسا کہ آپؐ قبا میں تین دن قیام فرما کر چوتھے روز جمعہ کو مدینہ منورہ جاتے ہیں۔ بنو سالم کے محلّہ میں جمعہ ادا کرتے ہیں اور پہلا جمعہ کا خطبہ دیتے ہیں۔

قبا میں قیام کی وجہ یہ تھی کہ مسجد کے کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانا تھا۔ اس سلسلے میں مسجد کے لیے زمین کا بندوبست کرنا ضروری تھا نیز مستری، مزدور (افرادی قوت) عمارتی سامان اور مسجد کے مکمل ہونے تک کچھ وقت درکار تھا جس کے لیے چودہ دن کا قیام مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اب آتے ہیں روایات کی تطبیق کی طرف۔ بخاری شریف میں ہے کہ "حضورؐ نے بنی عمرو بن عوف کے قبیلہ میں نزول اجلال فرمایا اور دس دن اور چند دن وہاں قیام فرمایا اور اس اثناء میں مسجد قبا تعمیر ہوئی"۔ (ضیاء النبی۔۲۔۱۸۷)

مسلم شریف میں ہے "آپؐ نے چودہ دن (قبا) میں قیام فرمایا۔ (حوالہ بالا)

یہ دونوں روایات قریب المعنی ہیں نیز بخاری کی روایت کے دس دن اور چند دن کا ذکر ہے اب چند دن کو چار شمار کر لیا جائے تو دونوں روایات کی مدت ۱۴ دن بنتی ہے جس سے قیام کے عرصہ میں مطابقت ہو جاتی ہے۔

۲: قافلہ ہجرت کی قبا میں آمد ۸ ربیع الاول پیر کو ہوتی ہے۔ تین دن یہاں قیام رہتا ہے۔ چوتھے دن یعنی جمعہ ۱۲ ربیع الاول کو مدینہ منورہ میں آپؐ تشریف لے جاتے ہیں۔ پھر واپس قبا میں تشریف لاتے ہیں جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے۔ اب ۸ ربیع الاول پیر کو قبا میں آمد ۱۴ دن قبا میں قیام کا عرصہ جمع کریں تو ۲۲ دن بنتے ہیں یعنی ۲۲ ربیع الاول تک قبا میں رہے اور اسی روز یعنی پیر ۲۲ ربیع الاول کو آپؐ نے مدینہ منورہ میں مستقل سکونت اختیار فرمائی۔ یہ تطبیق متاخرین علماء کی تاریخ قبا میں آمد ۱۲ ربیع الاول پیر کے دن کے مطابق لکھتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا کہ بخاری شریف کی روایت میں چند دن کو اگر چار دن شمار کر لیں تو دونوں روایات میں قیام کی خدمت ۱۴ دن بنتی ہے۔ یہ مدت مسلم شریف کی روایت کے مطابق ہو

جاتی ہے۔قبا میں آمد ۱۲ ربیع الاول پیر کے دن ہوتی ہے۔تین دن قبا میں قیام فرمایا اور چوتھے روز جمعہ ۱۶ ربیع الاول کو مدینہ منورہ تشریف لے جاتے ہیں۔بعد ازاں مسجد قبا کی تعمیر کی غرض سے قبا ہی میں قیام فرماتے ہیں۔یعنی اس دوران مدینہ میں آتے جاتے رہے۔ایسا نہیں کہ مکہ سے قبا پہنچ کر ۱۴ دن کے لیے یہیں مقیم رہے یا قبا ۱۲ ربیع الاول یا ۱۶ ربیع الاول جمعہ کو تشریف لے جاتے ہیں اور وہیں مستقل ٹھہر جاتے ہیں۔آپؐ کی قبا میں آمد ۱۲ ربیع الاول' اس میں ۱۴ دن جمع کریں تو ۲۶ دن بنتے ہیں۔یعنی آپؐ مدینہ میں ۲۶ ربیع الاول پیر کے دن دوبارہ تشریف لے گئے اور وہاں مستقل سکونت اختیار فرمالی۔

کتب کے حوالہ جات:

نام کتب	قبا میں قیام کی مدت	کیفیت
بخاری شریف	۲۴ رات	----
بخاری شریف	۱۰ دن جمع چند دن	----
بخاری شریف	۱۴ دن	بحوالہ رحیق المختوم۔ا۔۲۸۸
مسلم شریف	۱۴ دن	----
نسائی شریف	۱۴ دن	بحوالہ ضیا النبی۔ا۔۱۱۱
موسیٰ بن عقبہ	۲۲ شب	-----
واقدی	۱۴ دن	-----
حیات محمد (ہیکل)	۲۲ دن	جمعہ کے دن مدینہ روانہ ہوئے
السیرۃ النبویہ دحلانی۔ا۔۴۰۵	۴ دن	-----
رحمتہ اللعالمین۔ا۔۸۴	۴ دن	-----
سیرت النبی۔ا۔۱۶۹	۴ دن: ۱۴ دن	-----
خاتم النبیین۔۴۴۵	۴ دن	-----
محسن انسانیت۔۲۴۱	۱۴ دن	-----
انسائیکلوپیڈیا مدینہ النبی۔۱۲۰	۴ دن	-----

ایک نظر میں

متقدمین:

گھر سے غار ثور کو روانگی	جمعہ ۲ ربیع الاول	۱۲ نومبر ۶۲۲ء

غار ثور میں سہ روزہ قیام	جمعہ تا دوشنبہ ۲ تا ۵ ربیع الاول	۱۲ تا ۱۵ نومبر ۶۲۲ء
قبا میں آمد	دوشنبہ ۱۲ ربیع الاول ۱ھ	۲۲ نومبر ۶۲۲ء
مدینہ میں نماز جمعہ	جمعہ ۱۶ ربیع الاول	۲۶ نومبر ۶۲۲ء
مدینہ میں مستقل قیام	یک شنبہ ۲۶ ربیع الاول	۵ دسمبر ۶۲۲ء

متاخرین:

گھر سے غار ثور روانگی	جمعہ
غار ثور میں سہ روزہ قیام	جمعہ، ہفتہ، اتوار
غار ثور سے مدینہ روانگی	دوشنبہ یکم ربیع الاول
قبا میں آمد	آٹھ ربیع الاول
نماز جمعہ	۱۲ ربیع الاول
مدینہ میں مستقل سکونت	دوشنبہ ۲۲ ربیع الاول

قبا میں آمد کے متعلق روایات میں تطبیق

بعض اہل سیر نے قبا میں آپ ﷺ کا قیام چودہ دن لکھا ہے لیکن کئی ایک نے قبا میں قیام کا ذکر چار دن کیا ہے لہٰذا اہل سیر کی روایات میں محدثین کی روایتوں کو ترجیح دی گئی ہے نیز احادیث میں اس طرح مطابقت بھی پائی جاتی ہے اور تاریخی کڑیاں بھی متصل ہو جاتی ہیں اور واقعات میں تطابق بھی پایا جاتا ہے۔
بعض واقعات میں یہ صورت پیدا ہوتی ہے کہ تمام سیرت نگار ایک طرف ہوتے ہیں اور امام بخاری و مسلم دوسری طرف، ایسے موقع پر بعض لوگ امام بخاریؒ کی روایات کو اس بنیاد پر تسلیم نہیں کرتے کہ تمام اہل السیر کے خلاف ہے لیکن محققین کہتے ہیں کہ حدیث صحیح تمام ارباب اسیر کی متفقہ روایات کے مقابلہ میں بھی قابل ترجیح ہے ہم اس موقع پر دو واقعات کو بطور مثال پیش کرتے ہیں۔

غزوات میں ایک غزوہ ذی قرد کے نام سے مشہور ہے، اس کی نسبت ارباب السیر متفق ہیں کہ صلح حدیبیہ سے قبل واقع ہوا تھا لیکن صحیح مسلم نے سلمہ بن الاکوع سے جو روایت ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد خیبر سے تین دن قبل کا واقعہ ہے اس کی شرح میں قرطبی نے لکھا ہے۔ اہل السیر میں سے کسی کو اس امر میں اختلاف نہیں ہے کہ غزوہ ذی قرد معاہدہ حدیبیہ سے پہلے واقع ہوا تھا تو سلمہ کی حدیث میں جو مذکور ہے وہ کسی راوی کا وہم ہوگا۔ حافظ ابن حجر فتح الباری (ذکر غزوہ قرد) میں قرطبی کے اس قول پر بحث کر کے لکھتے ہیں ''تو اس بناء پر صحیح مسلم میں غزوہ ذی قرد کی جو تاریخ مذکور ہے وہ اس سے

زیادہ صحیح ہے جو سیرت نگاروں نے بیان کی ہے''۔

دمیاطی ایک مشہور محدث ہے انہوں نے سیرت پر ایک کتاب لکھی جو آج بھی موجود ہے اس میں انہوں نے اکثر موقعوں پر ارباب السیر کی روایات کو ترجیح دی تھی لیکن جب زیادہ تتبع کیا تو ان کو معلوم ہوا کہ احادیث صحیح کو سیرت کی روایتوں پر ترجیح ہے چنانچہ وہ اپنی کتاب میں ترمیم کرنا چاہتے تھے لیکن اس کے نسخے کثرت سے شائع ہو گئے تھے اس لیے وہ ترمیم نہ کر سکے۔

۲۔ایک غزوہ ذات الرقاع ہے اس کی نسبت اکثر ارباب السیر کا اتفاق ہے کہ جنگ خیبر سے قبل ہوا تھا لیکن امام بخاری نے تصریح کی ہے کہ خیبر کے بعد واقع ہوا، اس پر دمیاطی نے بخاری کی روایت کا خلاف کیا حافظ ابن حجر لکھتے ہیں'' باقی ان کے شیخ دمیاطی، تو انہوں نے حدیث کی نسبت غلطی کا دعویٰ کیا ہے اور یہ تمام اہل السیر بالاتفاق اس کے خلاف ہیں''۔ حافظ ابن حجر نے اس قول کو نقل کر کے اس کا رد کیا ۔۔ سیرت جداگانہ فن ہے اور بعینہ فن حدیث نہیں ہے اور اس بناء پر اس کی روایتوں میں اس درجہ کی شدت احتیاط ملفوظ نہیں رکھی جاتی جو فن صحاح ستہ کے ساتھ مخصوص ہے اس کی مثال یہ ہے کہ فقہ کا فن قرآن اور احادیث سے ماخوذ ہے۔ لیکن یہ کہہ نہیں سکتے کہ یہ معینہ قرآن یا حدیث ہے یا ان دونوں کے ہم پلہ۔

روایات میں تطبیق:

۱۔قبا میں مدت قیام سے متعلق روایات میں تضاد نہیں ہے۔ روایات میں تطابق پایا جاتا ہے۔ صرف شائبہ اس بات پر ہوا کہ بعض نے قبا میں آمد آٹھ ربیع الاول اور بعض نے بارہ ربیع الاول لکھا ہے اس کے علاوہ قبا میں قیام کی مدت چار دن لکھی اور کئی ایک نے قبا میں قیام کی مدت چودہ دن تحریر کی جبکہ ایسا نہیں ہے اگر ہم یہ کہیں کہ'' آپ ﷺ اس دوران مدینہ تشریف لے جاتے رہے اور واپس قبا میں آتے رہے اور قیام قبا میں ہی رہا اس کی تصدیق میں دیگر روایات موجود ہیں۔ اور تمام واقعات میں مطابقت پائی جاتی ہے مثلاً انسان جس کام کو اختیار کرے اس پر شدت اور استقلال اختیار کرے کام وہی سرانجام پاتا ہے۔

ہر دو صورتوں میں روایات میں تضاد نہیں ہے۔ روایات میں تطابق پایا جاتا ہے۔ صرف شائبہ اس بات پر ہوا کہ قبا میں آمد کے بعد آپ ؐ جب مدینہ تشریف لے گئے وہاں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ جب کہ ایسا نہیں ہے آپ ؐ اس دوران مدینہ میں آتے جاتے رہے اور قیام قبا میں ہی رہا۔ اس کی تصدیق روایات سے بھی ہوتی ہے۔ انسان جس کام کو اختیار کرے اس پر شدت اور استقلال اختیار کرے کام وہی سرانجام پاتا ہے جس میں مداومت ہو۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں'' وکان اذا عمل عملاً اثبتہ'' ترجمہ: جب آنحضرت کوئی کام کرتے تھے تو اس پر مداومت فرماتے تھے۔

آپ ؐ کا ارشاد گرامی ہے'' ان احب العمل الی اللہ ادومہ'' ترجمہ: خدا کے نزدیک سب سے محبوب

کام وہ ہے جس پر سب سے زیادہ انسان مداومت کرے‘‘۔

آپؐ نے مسجد قبا کی تعمیر کا بیڑا اٹھایا جب تک مسجد قبا کی تعمیر مکمل نہیں ہوئی آپؐ کا وہیں قیام کرنا آپ کے معمول کے عین مطابق تھا۔ چودہ دن کا قیام قبا میں ہی ہے کیوں کہ یہاں آ کر پہلے جو کام کیا وہ مسجد کی تعمیر تھی۔ اسے ادھورا چھوڑنا آپؐ کے معمول کے خلاف ہے۔

اول یہ الجھن ہے کہ آپ ﷺ کی آمد آٹھ ربیع الاول کو قبا میں ہوئی یا آپ ﷺ قبا میں بارہ ربیع الاول کو تشریف لائے یہ پیچیدگی اور الجھن یوں پیدا ہوئی کہ اہل السیر نے غار ثور کے قیام کی مدت تین دن اور مکہ سے قبا تک سفر کی مدت نو دن شمار کر لی جس سے قبا میں آمد بارہ ربیع الاول کو ہی ہوتی ہے اگر غار ثور کے قیام کی مدت مکہ سے قبا کے سفر کی مدت سے منہا کر دیں تو قبا میں آمد کی تاریخ آٹھ ربیع الاول کو ہی پڑتی ہے اس کی تفصیل متقدمین اور متاخرین کی آراء سے معلوم کر لیں جو اوپر مذکور ہوئی۔

۳۔ اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ آپ ﷺ قبا سے مدینہ تشریف لے گئے اور وہاں مستقل سکونت اختیار نہیں کی۔ قبا اور مدینہ میں آمد و رفت رہی اور چودہ دن کا قیام قبا میں ہی رہا۔ اس سے تمام واقعات کی کڑیاں متصل ہو جاتی ہیں اور بغیر کسی پیچیدگی کے ان میں مطابقتیں پائی جاتی ہیں

الف۔ خروج دن کو ہوا۔

ب۔ تین دن غار ثور میں مقیم رہے اور چوتھے دن غار ثور سے عازم مدینہ ہوئے۔

ج۔ قبا میں آمد آٹھ ربیع الاول کو ہوئی۔

د۔ بارہ ربیع الاول کو مدینہ تشریف لے گئے وہیں جمعہ ادا کیا بعد ازاں واپس قبا تشریف لے آئے۔

ر۔ ۲۲ ربیع الاول کو مدینہ منورہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

س۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کسی سے روایت میں لفظ ’’عشر‘‘ چھوٹ گیا ہو اور باقی صرف اربعہ رہ گیا جس سے یہ غلطی چلتی آئی۔ المختصر جن علماء نے چار یوم یا بائیس شب وغیرہ قبا میں قیام کا ذکر کیا، انہیں سہو ہوا ہے۔ اصح یہی ہے کہ قبا میں آپ کو قیام چودہ دن رہا۔ بعض حضرات قبا سے مدینہ تشریف لے جانے اور مدینہ سے واپس قبا آنے کو نظر انداز کر گئے اس صورت میں اگر آپ ﷺ کی قبا سے مدینہ منورہ کی آمد و رفت رہی اور چودہ دن کا قیام قبا ہی میں رہا، تسلیم کر لیں تو بخاری، مسلم اور نسائی کی روایات کے خلاف اور منافی ہوگا۔

ف۔ موسیٰ بن عقبہ قبا میں قیام کی مدت بائیس شب بتائی ہے بظاہر تو یہ روایات کے خلاف ہے کیونکہ چودہ اور بائیس میں بہت فرق ہے لیکن بغور دیکھا جائے تو یہ الجھن بھی سلجھن کا روپ دھار لیتی

ہے۔ وہ یوں کہ قبا میں قیام کی مدت چودہ دن ہے اور غار ثور سے قبا کے سفر کی مدت آٹھ دن ہے ان دونوں یعنی چودہ دن اور آٹھ دن کو جمع کیا جائے تو بائیس دن ہوتے ہیں۔ مصنف مذکور نے غار ثور سے مدینہ منورہ تک کے سفر کی مدت قبا میں قیام میں شامل کر دی ہے جس سے یہ پیچیدگی پیدا ہوئی لہذا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کا قبا میں قیام چودہ دن تھا۔ اسی طرح متقدمین نے آپ ﷺ کے مدینہ میں مستقل سکونت کی تاریخ ۲۶ ربیع الاول لکھی ہے یہ صورت بھی مذکورہ موسیٰ بن عقبہ کی روایت کی سی ہے یعنی قبا میں چودہ دن اور قبا میں آمد بارہ ربیع الاول ہے لہذا قبا میں قیام اور قبا میں آمد بالترتیب چودہ دن اور بارہ دن ہے ان دونوں کو جمع کرنے سے ۲۶ تاریخ حاصل ہوتی ہے ان سے بھی سہو ہوا کہ غار میں قیام کے دن بھی شمار کر لیے اور قبا میں آمد بارہ ربیع الاول تحریر کی اگر غار میں قیام کی مدت منہا کر دیں تو باقی ۲۲ دن رہتے ہیں جو آپ ﷺ کی مدینہ منورہ میں مستقل سکونت کی تاریخ ہے۔

اونٹنی کا قصہ:

اونٹنی والے واقعہ میں بھی التباس ہوا ہے وہ یوں کہ کیا اونٹنی کے بیٹھنے کی وجہ سے آپ ﷺ حضرت ابوایوب انصاریؓ کے ہاں قیام پذیر ہوئے یا پہلے ہی رشتہ داروں کے ہاں ٹھہرنے کا عزم فرما چکے تھے۔

قبا میں چند روزہ قیام کے بعد خاتم الانبیاء حضرت محمد ﷺ نے مزید آگے مدینہ منورہ کے شمال میں وادی جوف جانے کا فیصلہ کیا۔ کیا آپ ﷺ کا ارادہ اپنے خاندان (حضرت عبدالمطلب کی والدہ کی نسل و اولاد) میں جا کر قیام کرنے کا تھا؟ امام بخاری کہتے ہیں کہ سب سے پہلے آپ نے اپنی والدہ ماجدہ کے بھائیوں کے ہاں قیام کیا۔ قبا میں بنوعمرو ابن عوفؓ کے مکان میں چودہ راتوں کے قیام کے بعد آپ نے کسی کو بنوالنجار کے پاس بھیجا جنہوں نے اپنے کو مکمل طور پر مسلح پیش کیا لیکن اونٹنی کا واقعہ جو ہم بیان کرنے والے ہیں اور رشتہ داری کی بنیاد پر آپ ﷺ کے عمداً یا بالارادہ انتخاب کی مخالفت کرتا ہے جب تک ہم یہ نہ فرض کر لیں کہ آپ کی ذاتی خواہش اور تقدیر الٰہی دونوں کی موافقت تھی۔ (پیغمبر اسلام۔ص ۱۹۰)۔

آپ نے عارضی قیام کے لیے ننھیال کی آبادی میں ٹھہرنے کا فیصلہ قبا ہی میں کر لیا تھا۔ اس غرض سے النجار کو طلب فرمایا، وہ ہتھیا سجا کر معزز مہمان کو لینے کے لیے حاضر خدمت ہوئے۔ آپ ﷺ ان لوگوں کے جلوس میں بنی النجار کے محلے میں آئے اور حضرت ابوایوب انصاریؓ کے ہاں فروکش ہوئے البتہ النجار میں سے کس کے ہاں ٹھہریں اس کے لیے قرعہ اندازی کی گئی لیکن یہ ذہن نشین رہے کہ یہ قرعہ اندازی قریوں میں کسی ایک قریہ میں ٹھہرنے کے لیے نہیں تھی۔۔۔۔ النجار میں سکونت اختیار کرنے کے فیصلہ کی تائید آنجناب ﷺ کے اس قول سے بھی ہوتی ہے کہ "مسافر کسی دوسرے قریے میں جائے اور ٹھہرے تو اپنے قریب ترین

رشتہ دار کے ہاں ٹھہرے کیونکہ وہ اس پر زیادہ حق رکھتے ہیں''۔اس اعتبار سے واقعی النجار دیگر مسلمانوں کے مقابلے میں آپ ﷺ زیادہ حق رکھتے تھے۔

سیرت النبی (ج۔ا۔ص۔۱۷۱) کے حاشیہ میں صحیح مسلم باب الہجرت کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب لوگوں میں آپ ﷺ کی میزبانی کے متعلق جھگڑا ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا ''میں بنوالنجار کے ہاں اتروں گا جو عبدالمطلب کے ماموں ہیں۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے عمداً ایسا کیا تھا حضرت ابوایوبؓ اسی خاندان سے تھے۔امام بخاری نے تاریخ صغیر میں تصریح کی ہے کہ ابوایوبؓ کے گھر اترنا اسی قرابت کی وجہ سے تھا۔مسلم شریف و تاریخ صغیر کے مطابق آپ ﷺ نے النجار کے ہاں ٹھہرنے کا فیصلہ فرمایا تھا نہ کہ آپ ﷺ نے قیام اس لیے فرمایا تھا کہ وہاں ناقہ بیٹھ گئی تھی۔اس ضمن میں تضاد روایات کی وجہ سے اکثر مورخین کو مغالطہ ہوا ہے۔

ہجرت کا سفر چار حصوں پر مشتمل ہے۔(۱) گھر سے حضرت ابوبکرؓ کے گھر اور وہاں سے غار ثور تک (۲) غار ثور سے مدینہ کی بستی قبا تک (۳) بستی قبا سے ابوایوب انصاریؓ کے ہاں فروکش ہونے تک (۴) حضرت ابوایوبؓ کے گھر سے مدینہ کی مختلف آبادیوں اور جگہوں کا جائزہ لینے اور اونٹنی کا اس جگہ بیٹھنے تک کا سفر ہے جہاں مسجد نبوی اور ازواج مطہرات کے حجرے تعمیر کیے گیے مذکورہ تیسرے اور چوتھے سفر کو گڈ مڈ کر کے یہ مغالطہ پیدا ہوا ہے۔چوتھے سفر میں اونٹنی والا واقعہ پیش آتا ہے۔آپ ﷺ ناقہ پر سوار ہو کر یثرب کی مختلف آبادیوں، جگہوں اور قبیلوں کا جائزہ لینے کے لیے نکلے۔صحابہ کرامؓ کی پوری جمعیت آپ ﷺ کے ہم رکاب تھی اس طرح اپنی عسکری قوت کا مظاہرہ کر کے اہل یثرب پر اپنی دھاک بٹھا دی مگر اس سفر کی اہمیت ایک اور لحاظ سے بھی ہے ایک ماہر جنگ اور جرنیل، ایک سیاست دان اور مدبر اور ایک ماہر تعمیرات کی حیثیت میں آپ ﷺ یثرب کا معائنہ فرمارہے تھے۔آپ ﷺ کی دوررس نگاہوں سے یثرب کی زندگی کا کوئی پہلو پوشیدہ نہ رہ سکا۔ایک ماہر جنگ کی حیثیت سے آپ ﷺ نے وادی جوف کا دفاعی نقطہ نظر سے جائزہ لیا آگے چل کر جہاں آپ ﷺ کو اسلام کے دفاع کی جنگیں لڑنا تھیں۔بطور سیاست دان اور مدبر مختلف قبائل کی قوت اور اسلام کے متعلق ان کے رویوں کا اندازہ لگایا اور بحیثیت ماہر تعمیرات نوزائیدہ مملکت کا دارالخلافہ تعمیر کرنے کے لیے موزوں جگہ کا انتخاب کیا۔آپ ﷺ ناقہ پر سوار ہو کر جہاں جہاں سے گزرتے لوگ استدعا کرتے کہ یا رسول اللہ! ہمارے گھر حاضر ہیں، ہماری تعداد اور قوت زیادہ ہے، ہمارے ہاں قیام فرمایئے۔آپ ﷺ جواباً فرماتے: ''خلوسبیلھا فانھا ماموره'' یہاں تک کہ آپ بنی بیاضہ، بنی ساعدہ، بنی عدی بن النجار (یہ آپ کے ننھیال تھے) بنی مالک النجار سے گزرے اور آخر بنی مالک النجار کے ہاں قیام فرمایا کیونکہ اونٹنی اس جگہ بیٹھ گئی جہاں مسجد نبوی تعمیر کی گئی۔۔۔۔۔۔مگر راویوں نے آپ ﷺ کے اس

موخر الذکر سفر کو اس طرح خلط ملط کر دیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے آپ ﷺ اونٹنی پر سوار ہو کر عارضی قیام کے لیے جگہ کا انتخاب کرنے کے لیے نکلے تھے حالانکہ اس سفر کی نوعیت ہی مختلف تھی پھر جس جگہ اونٹنی بیٹھی وہ ویرانہ تھا اور وہاں سے حضرت ابوایوبؓ کا مکان بہت فاصلے پر تھا تو یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ اونٹنی تو اس جگہ بیٹھی ہو اور آپ ﷺ قیام کرنے کے لیے ڈیڑھ دو میل دور حضرت ابوایوبؓ کے ہاں گئے ہوں اور یہ بات ثابت ہے کہ زمین کے مالک النجار کے دو یتیم بچے سہل اور سہیل تھے۔

تاریخی تنقید کی کسوٹی پر کوئی روایت پوری نہیں اترتی۔ حضرت ابوایوبؓ کے ہاں قیام پذیر ہونے کے بعد آپ ﷺ نے دار الخلافہ تعمیر کرنے کے لیے اونٹنی پر سوار ہو کر جگہ کا انتخاب فرمایا تھا۔ اونٹنی مختلف محلوں سے گزرتی گئی اور محلوں کے لوگ بھی آپ ﷺ سے اپنے ہاں قیام کرنے کی درخوستیں کرتے رہے مگر آپ ﷺ نے فرمایا" دَعُوھَا فَاِنَّھَا مَامُوْرَۃ"اونٹنی کو جانے دو یہ حکم الٰہی کے ماتحت چل رہی ہے آخر اونٹنی جس جگہ بیٹھی وہ ویرانہ تھا۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ (پیغمبر اسلام۔۱۹۰) حضور ﷺ کے مستقل قیام کی جگہ سے متعلق چند امکانات پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کیا آپ قبا میں غیر مسلموں (یہودیوں) کی قریبی قربت کو ناپسند فرماتے تھے؟ کیا آپ کسی ایسی کھلی جگہ کی تلاش میں تھے جہاں آپ اپنا گھر بنا کر آزادی سے رہ سکیں؟ کیا آپ ﷺ معاشرتی و عسکری وجوہات کی بنا پر یہ ارادہ رکھتے تھے کہ آبادی کے گروہوں کے درمیان میں جا کر قیام کریں؟ (مذہبی بنیادوں پر مرکزی مسجد کو لازماً شہری سرگرمیوں کے مرکز میں ہونا چاہیے) ایک اور امکان بھی ہو سکتا ہے وہ یہ کہ مدینہ منورہ میں اشاعت اسلام سے قبل جب شہر خانہ جنگی کے نتیجے میں منتشر ہو گیا اس صورت حال سے ہر شخص رنجیدہ تھا اور خزرجی عبداللہ بن ابی کو اوس و خزرج کی باہمی رضامندی سے مدینہ منورہ کا بادشاہ بنانے کے لیے منتخب کیا جب کہ یہ منصوبہ آپ ﷺ کی آمد سے دھرے کا دھرا رہ گیا۔ ابن زبالہ (باحوالہ سمہودی۔ص۲۶۲) یہ کہتا ہے کہ آپ ﷺ تمام انصاریوں کے اکٹھ کے مرکز میں رہنا چاہتے تھے۔ دوسری بات یہ کہ ناقہ کی ناک کی رسی اس کی گردن پر ڈال دی وہ چلی جارہی تھی اور جب بھی آپ کسی قبیلے کے علاقے سے گزرتے تو وہ کہتے کہ قیام فرمائیے۔ اس پر آپ مسلسل یہ کہتے جا رہے تھے کہ اونٹنی کو چلنے دو یہ ہمیں وہی لے جائے گی جہاں رب تعالیٰ جلّ شانہ کی مرضی و خوشی ہوگی بالآخر اونٹنی ایک جگہ جا کر بیٹھ گئی آپ نے ایڑ لگائی وہ اٹھی لیکن چکر کاٹ کر پھر دوبارہ وہیں آ کر بیٹھ گئی جہاں پہلے بیٹھی تھی۔ اس سے بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس جگہ کا انتخاب مشیت ایزدی سے تھا جیسا کہ آپ ﷺ کے ارشاد مبارک مذکور سے ثابت ہوتا ہے۔

مولانا شبلی کا مغالطہ: وہ فرماتے ہیں کہ چودہ دن بعد (جمعہ کو) آپ ؐ شہر کی طرف تشریف فرما ہوئے۔ (سیرت النبی۔ا۔۱۷۰) لیکن صحیح روایات سے ثابت ہے کہ قبا میں آنحضرت ﷺ کا ورود مسعود دوشنبہ کو ہوا تھا۔ اس حساب سے تو چودہ دن کے بعد پندرھویں دن پر دوشنبہ کا دن ہوگا نہ کہ جمعہ۔ (۲)

اگر قبا میں آمد کی تاریخ ۲۰ ستمبر مان لی جائے جس کو مولانا نے اختیار کیا ہے تو بھی زائچہ ٹھیک نہیں بیٹھتا کیوں کہ ۲۰ ستمبر کو سورج برج میزان کے قریب ہوتا ہے نہ کہ برج سرطان میں' جیسا کہ اس زائچہ میں دکھایا گیا ہے۔(ن۔۲۔۱۵۶)

اعتراض نمبر ۲۳۲

روایات میں سند کے اعتبار سے بخاری و مسلم کی روایتیں قابل اعتماد ہیں۔حالات و واقعات قبا میں چودہ دن قیام کی تائید کرتے ہیں۔مسجد قبا کی تعمیر، جگہ کے تعین، عمارتی سامان اور اس کی تکمیل کے لیے افرادی قوت اور وقت درکار رہے۔لہٰذا اتنے دنوں کا صرف ہونا قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔(ضیاء النبی) اگرچہ سند کے لحاظ سے بخاری کی روایت زیادہ صحیح مانی جاتی ہے لیکن تاریخی واقعات کے اعتبار سے یہ بات ممکن نہیں ہے کیوں کہ قبا میں تشریف آوری کی تاریخ میں اگرچہ اختلاف ہے مگر اس بات پر تقریباً اتفاق ہے کہ آپؐ کی آمد سوموار کے دن ہوئی اور مدینہ روانگی جمعہ کے دن۔۔اور سوموار سے جمعہ تک کسی طرح بھی چودہ دن نہیں بنتے خواہ پہلا جمعہ لیا جائے یا دوسرا۔

جواب: بعض آپؐ کی قبا میں آمد ۸ ربیع الاول دوشنبہ کو تسلیم کرتے ہیں۔اس لحاظ سے ۸ ربیع الاول کے بعد ۱۲ ربیع الاول کو پہلا جمعہ پڑتا ہے جس کی وضاحت پیچھے آچکی ہے اور ثابت کیا ہے کہ ۱۲ ربیع الاول کو دوشنبہ ہی کا دن پڑتا ہے جو روایات کے عین مطابق ہے۔

ابوایوبؓ کے ہاں قیام پذیر ہونے کے بعد آپ نے دارالخلافہ تعمیر کرنے کے لیے اونٹنی پر سوار ہو کر جگہ کا انتخاب کیا تھا۔''(نقوش رسول نمبر۔ج۔۲۔ص۔۴۳۹ تا ۴۴۱)

ایک شبہ کا ازالہ: مولانا شبلی کا مغالطہ: وہ فرماتے ہیں کہ چودہ دن بعد (جمعہ کو) آپؐ شہر کی طرف تشریف فرما ہوئے۔(سیرت النبی۔۱۔۱۷۰) لیکن صحیح روایات سے ثابت ہے کہ قبا میں آنحضرت ﷺ کا ورود مسعود دوشنبہ کو ہوا تھا۔اس حساب سے تو چودہ دن کے بعد پندرھویں دن پر دوشنبہ کا دن ہوگا نہ کہ جمعہ۔(۲) اگر قبا میں آمد کی تاریخ ۲۰ ستمبر مان لی جائے جس کو مولانا نے اختیار کیا ہے تو بھی زائچہ ٹھیک نہیں بیٹھتا کیوں کہ ۲۰ ستمبر کو مورخ برج میزان کے قریب ہوتا ہے نہ کہ برج سرطان میں' جیسا کہ اس زائچہ میں دکھایا گیا ہے۔(ن۔۲۔۱۵۶)

اعتراض نمبر ۲۳۳

کریسٹ ویل اپنی کتاب (Early Muslam Architecture) میں لکھتے ہیں کہ بعثت نبوی کے وقت عربوں کی تعمیری روایات مفقود تھیں اور ان کے رہائشی مکانات پر بل کا گمان ہوتا

تھا۔(نقوش رسول نمبر۔۲۔ص۔۴۳۸)

جواب: اہل مکہ کے برعکس یثرب کے رہائشی مکانات پختہ پتھر کے بنے ہوئے اور عموماً دومنزلہ ہوتے تھے مکان اور باغ کی چاردیواری بھی پتھر کی بنی ہوتی تھی۔آپ ﷺ نے حضرت ابوایوب انصاریؓ کے گھر قیام فرمایا ان کا دومنزلہ مکان تھا۔حضرت ابوبکرؓ (جہاں عائشہ صدیقہؓ کی والدہ ام رومان رہتیں) عبید بن عتیک ،ابن ابی العقیق ،آنحضرت ﷺ اور ابن عمرؓ کے مکانات دو دو منزلہ تھے الصیجان کا آطم سہ منزلہ تھا جس کی اوپر کی دو منزلیں چاندی کی طرح سفید پتھر سے بنائی گئی تھیں اور نچلی منزل لاوا کے پتھر سے تعمیر کی گئی تھی۔ نچلی منزل آج تک موجود ہے۔زینہ عموماً کھجور کی لکڑی کا ہوتا جس سے اترنے چڑھنے میں خاصی دقت ہوتی عتیک زینہ سے گر پڑا اور اس کا ایک بازو ٹوٹ گیا۔آنحضرت ﷺ نے شائد کوئی جدت پیدا کی کیونکہ محدثین نے آپ ﷺ کے زینے کے بارے میں لکھا ہے کہ اترتے چڑھتے وقت ایسا معلوم ہوتا گویا زمین پر چل رہے ہوں۔ مدینہ میں تہہ خانوں کا رواج بھی تھا اسے نشست گاہ کے لیے یا جنگ میں مورچہ، پناہ گاہ کے لیے اور قید خانے کے بطور استعمال میں لاتے۔ یثرب میں مقبرے بنائے جانے کا رواج بھی تھا عام طور پر قبر پر کوئی نہ کوئی عمارت یا گنبد بنایا جاتا اور عبارت تحریر کی جاتی۔ ہر قبیلے کا اپنا قبرستان تھا اور بسا اوقات گھر میں میت کو دفن کر دیتے یہ غالباً یہودیوں میں رواج تھا۔قبروں، مقبروں اور روضوں کو گچ کیا جاتا ان شواہد کی روشنی میں کریسٹ ویل کا اعتراض باطل ہو جاتا ہے۔

قریش شروع میں سیاہ خیموں میں رہا کرتے تھے۔بعض کا خیال ہے کہ بعثت نبوی سے چند پشت پہلے تک مکہ خیموں کا شہر تھا۔۱۱۰۰ قبل مسیح میں بھی قیدار (آل اسمٰعیل) کا ذکر خیمے والے کہہ کر کیا گیا ہے اگر چہ مکہ میں اجالہ، اجیاد اور باقیقان جیسے قدیم مکانات بھی تھے۔۔۔اگر قصی کی بسائی ہوئی بستی پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ بستی منصوبہ بندی اور تعمیری نقشہ کی مدد سے بنائی گئی تھی۔۔اس جگہ ایک بڑا جنگل تھا جسے صاف کر دیا گیا پھر یہی لکڑی مکانوں کی تعمیر میں کام آئی۔۔۔شہر کے بیچ شمالاً جنوباً یمنی اور شامی کاروانوں کی آمد اور اخراج کے لیے کشادہ شاہراہ تھی۔خانہ کعبہ کے سامنے زائرین کے اکٹھ کے لیے ایک بڑا دالان چھوڑ دیا گیا تھا۔۔۔مرکز اور وسط شہر میں معزز قریش رہتے تھے یہ آبادی کا اندرونی حلقہ تھا بیرونی حلقہ میں عام لوگ رہتے تھے۔جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کہ قریش شروع میں خیموں میں رہتے تھے مگر یہ کہنا کہ عرب میں تعمیری خلا تھا اور عرب کے مکانوں پر چوہے کے بل کا گمان ہوتا ہے، غلط ہے۔تعمیرات کا سلسلہ جلد ہی شروع ہو گیا کیونکہ چھت ڈالنے کے لیے لکڑی اور شاخیں جنگل کے کاٹنے سے دستیاب ہو گئی تھی۔دیواروں کی چنائی کے لیے پتھر با آسانی دستیاب تھے۔اہل مکہ کے آبائی مکان قبیلہ وار فاصلے فاصلے پر تھے اکثر مکانات کے درمیان دالان تھا ایسا ہی دالان آپ ﷺ کے مکہ کے آبائی مکان کے سامنے بھی تھا۔مکہ کے

تعمیراتی میدان میں کمی بوجہ اقتصادی کمزوری تھی۔ آپ ﷺ کی ولادت سے ایک صدی پیشتر جب تجارت کو فروغ ہوا اور تاجران خوب دولت کمانے لگے اس کے نتیجہ میں معاشرتی معیار بلند ہونے لگا اور جدید مکانات تعمیر ہونے لگے اور خانہ خدا کی عمارت بھی از سر نو ڈیزائن سے تیار کی گئی (نقوش رسول نمبر۲۔۴۲۱)

اعتراض نمبر۲۳۴

یہ عین ممکن ہے کہ قریش کے سردار (محمد ﷺ کی ہجرت) آپس میں ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے ہوں کہ وہ خود بخود ایک تکلیف دہ ہم وطن سے بغیر خون خرابہ کے نجات پا گئے۔ (ن ۱۱۔۵۳۷) پھر کہتا ہے ''آنحضرت کی ہجرت سے قریش مکہ بڑے خوش تھے''۔ (مارگولیتھ)

جواب: کئی جتن کیے۔ کئی حربے آزمالیے، کئی لالچ اور طرح طرح کی پیش کشیں کیں، کئی چالیں ، کئی داؤ اور ہتھکنڈے استعمال کیے۔ مکر و فریب کے جال بچھائے۔ دھونس، دھمکی سے کام لیا۔ اذیتوں کے پہاڑ کھڑے کیے گویا ہر وہ ظلم روا رکھا گیا جو ان کے بس میں تھا مگر کسی طرح انھیں کامیابی نہ ہوئی تو ہادی اسلام ﷺ کو ٹھکانے لگانے کے لیے اجلاس بلا لیتے ہیں۔ مختلف تجاویز سامنے آتی ہیں ان میں سے ایک تجویز ابولاسود نے پیش کی جو ناقص اور کئی خرابیوں سے بھری ہوئی محسوس کر کے رد کر دی گئی۔ تجویز یہ تھی کہ آپؐ کو جلاوطن کر دیا جائے۔ انھیں اس میں نقص یہ لگا کہ اگر انھیں جلاوطن کریں گے تو وہ اپنے حسن اخلاق، شیریں بیانی، من موہنی صورت اور قابل رشک سیرت سے لوگوں کو اپنا مطیع و فرماں بردار بنا لیں گے۔ ان کی ساری منصوبہ بندیاں اور تجویزیں خاک بوس ہو جائیں گی۔

کفار مکہ جل بھن کر رہ گئے تھے۔ غصہ سے بالکل باؤلے ہوئے جا رہے تھے۔ غم سے نڈھال اور پچھتاوے کے الاؤ میں سرگرداں تھے کہ آپؐ بہ خیر و عافیت مدینہ ہجرت کر گئے۔ جب کچھ نہ بن پڑا تو حضرت علیؓ پر غصہ نکالا۔ انھیں گھسیٹ کر کعبہ میں لے آئے اور وہاں حبس بے جا میں رکھا مگر بے سود۔ پھر ابو بکرؓ کے گھر کا رخ کیا۔ دستک دی۔ ان کی صاحب زادی حضرت اسماء آئیں۔ ان سے پوچھا! تمہارے ابو کہاں ہیں؟ جواب ملا، معلوم نہیں۔ یہی سننا تھا کہ لعین ابوجہل نے گال پر اس زور سے تھپڑ مارا کہ ان کے کان کی بالی گر گئی۔ مارگولیتھ کے رد میں یہی بیان کافی ہے۔

مسٹر کونسٹن ورجیل اپنی کتاب ''سیرت محمد'' کے ایک طویل اقتباس کا ٹکڑا یہ ہے جس میں وہ کہتا ہے ''بعد ازاں ہجرت مدینہ کی طرف کی جس سے مسلمانوں کو اپنے دین کے پرچار اور خود اپنی زندگی میں رہنے کے لیے سکھ کا سانس نصیب ہوا مگر کفار کی بے چینی بڑھی اور محمد ﷺ سے توبہ کروانے والے بنو ہاشم کو آپؐ کی امداد سے دست بردار کرنے والوں کے خواب چکنا چور ہو گئے۔ مسلمانوں کی ہجرت کر جانے سے جل بھن کر کباب بن چکے تھے۔

جب تک سانس تب تک آس، پر عمل پیرا ہو کر قریش نے دوبارہ اجلاس بلایا جس میں طے پایا کہ مکہ سے باہر جانے والے تمام راستے بند کر دیئے جائیں اور پہرہ بٹھا دیا جائے۔ یہ بھی طے پایا کہ جو کوئی ان دونوں کو یا ان میں سے کسی ایک کو مردہ یا زندہ لائے اسے سو اونٹ بہ طور انعام دیئے جائیں گے۔ انفرادی اور اجتماعی طور پر تلاش شروع ہوئی۔ ایک گروہ تو غار ثور کے منہ تک جا پہنچا۔ غار کے منہ پر مکڑی نے جالا بن دیا اور کبوتروں نے وہاں انڈے دے دیئے۔ مکڑی کا جالا اور کبوتروں کے انڈے دیکھ کر آگے نہ بڑھے بل کہ گھر کی راہ لی۔ مکڑی کا نرم و نازک جالا قلعہ ثابت ہوا بہ فضل تعالیٰ۔

اس واقعہ سے متعلق ارشاد ربانی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے (تم نے اگر نبی کی مدد نہ کی تو کچھ پرواہ نہیں۔ اللہ اس کی مدد اس وقت کر چکا ہے جب کافروں نے اسے نکال دیا تھا کہ وہ دو میں سے تیسرا تھا جب وہ دونوں غار میں تھے۔ جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ اس وقت اللہ نے اس پر اپنی طرف سے سکون قلب نازل کیا، اس کی مدد ایسے لشکروں سے کی جو تم کو نظر نہیں آتے تھے اور کافروں کا بول نیچا کر دے اور اللہ تعالیٰ کا بول تو اونچا ہی ہے، اللہ زبردست اور دانا و بینا ہے۔

غار کے منہ پر کبوتروں نے انڈے دیئے۔ مکڑے نے غار کے منہ پر جالا بن دیا۔ قریش نے کہا غار کے اندر داخل ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ اگر محمد ﷺ غار میں داخل ہوتے تو یہ انڈے ٹوٹ جاتے اور مکڑے کا جالا بھی تار تار ہو جاتا۔ روایت میں ہے کہ مکہ مکرمہ کے کبوتر نے فتح مکہ کے روز آپ ﷺ پر سایہ کیا۔ آپ ﷺ نے اس کے لیے برکت کی دعا کی اور مکڑے مارنے سے روک دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کے لشکروں میں سے ایک لشکر ہے۔

اسی تلاش میں سراقہ بن جعشم گھوڑے پر سوار تعاقب میں چلا۔ قریب پہنچا۔ گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور گر پڑا۔ سراقہ نے فال نکالی۔ خلاف نکلی۔ پھر بھی ہوس کا مارا باؤلا پیچھے چل پڑا۔ وہ کہتا ہے کہ میرے کانوں میں تلاوت کی آواز آ رہی تھی میں جب بہت قریب پہنچا پھر سے میرے گھوڑے کے پاؤں گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئے۔ میں گر پڑا۔ گھوڑے کو ڈانٹ کر نکالا۔ اس کے پاؤں کی جگہ سے دھوئیں کی طرح کا غبار نکلا پھر فال نکالی مگر امیدوں پر پانی پھیر گئی۔ میں نے پکارا۔ وہ ٹھہرے میں نے وہاں پہنچ کر عرض کی کہ آپؐ کی قوم نے آپؐ کے بدلے سو اونٹ انعام قرار دیا ہے۔ ناشتہ کے لیے عرض کی۔ رد فرمائی۔ میں نے کہا راستے میں میرے اونٹ ملیں گے میرا تیر دکھا کر دودھ لے لینا۔ آپؐ نے یہ بھی قبول نہ فرمایا۔ آپؐ نے صرف یہ فرمایا کہ ہماری اطلاع نہ کرنا میں نے ہاں کر دی اور ساتھ ہی امان نامہ کی طلبی کی درخواست کی۔ عامر بن فہیرہ نے امان نامہ لکھ کر میرے سپرد کیا۔ آپؐ نے سراقہ کو مخاطب کر کے فرمایا ''وہ بھی کیا وقت ہو گا جب تم کسریٰ کے کنگن پہنو گے''۔ اسی راہ میں بریدہ بن الحصیب اسلمی بھی ستر سواروں سے آپؐ کے

تعاقب میں تھا۔انعام کا خواہاں آپؐ کی تلاش میں نکلتا ہے۔مقدر اس کی تلاش میں ہے۔جلدی چل کہیں دیر نہ ہو جائے۔اے علمبردار! تیری قسمت کا ستارا جگمگانے والا ہے۔آخر آپؐ سے ملتا ہے اور اسلام قبول کر لیتا ہے۔پرچم لیے قافلہ ہجرت کے آگے آگے چل پڑتا ہے۔واہ رے تیری قسمت! تو کس قسم کا انعام لینے چلا تھا قدرت نے کیسا انعام عطا فرما دیا کہ تیری عاقبت سنور گئی۔مذکورہ واقعات میں چند امور سامنے آتے ہیں جو مستشرقین کے اعتراض کے رد میں دلیل قاطع کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اول:اجلاس دوبارہ کیوں طلب کیا گیا؟ ٹھکانے لگانے کی منصوبہ بندی کا کیا جواز؟ سو اونٹوں کا انعام کس غرض کے لیے تھا؟ آپؐ کی تلاش میں غار ثور تک کیوں جاتے ہیں؟ سراقہ بن جعشم اور بریدہ اسلمی کی کوششیں کس مقصد کے لیے تھیں؟ حضرت علیؓ کو حبس بے جا میں کیوں رکھا گیا۔حضرت اسماء کے جواب پر ابو جہل کا تھپڑ مارنا اور اس سے ان کے کان کی بالی کا گرنا وغیرہ کس وجہ کے لیے تھا؟

نہ دیکھا چاند چہرہ ظالموں نے
ہیں لوٹی بالیاں پھر ظالموں نے

کیا کوئی ذی فہم، عقل مند ان اقدامات کو خوشی اور خوش ہونے سے منسوب کر سکتا ہے؟ کیا یہ کوششیں مبارک باد دینے کے لیے ہیں؟ بل کہ ہمارا دعویٰ ہے کہ کوئی عقل مند اسے خوشی سے منسوب نہیں کرے گا بل کہ بہ بانگ دہل یہی کہے گا کہ آنحضرتؐ کا بہ حفاظت مدینہ منورہ میں ورود قریش مکہ کے لیے ناقابل فراموش اور جان سوز صدمہ تھا۔ان کی تو ماں مر گئی۔ان کو نانی یاد آ گئی جب آپؐ ان کے ہاتھوں سے محفوظ و سلامت مدینہ جا پہنچے۔

مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے

ناکام ہونے پر ان کی چھاتی پر سانپ لہرا گیا۔کفار کو کچھ سجھائی نہ دیتا تھا کہ کیا کیا جائے؟ البتہ مرتا کیا نہ کرتا وہ ہاتھ پاؤں مارتے رہے۔آخر ایک اور کارروائی کی شاید رنگ لائے لیکن وہ بھی بری طرح ناکام ہوئی۔وہ کاروائی کیا تھی؟ ''خطوط تھے جو انھوں نے مدینہ کے باسیوں کو لکھے۔ان میں سے ایک تنبیہی خط عبداللہ بن ابی اور اس کے ہم مشرب ساتھیوں کے نام لکھا تھا۔اس میں لکھا'' تم نے ہمارے آدمی کو اپنے ہاں پناہ دے رکھی ہے۔ہم اللہ کی قسم کھا کر تم سے کہتے ہیں کہ یا تو تم اس کو قتل کر ڈالو یا اپنے شہر سے نکال باہر کرو ورنہ ہم سب مل کر تم پر چڑھ دوڑیں گے۔یہاں تک کہ تمھیں بری طرح موت کے گھاٹ اتار دیں گے اور تمھاری عورتوں کو اپنے لیے مباح سمجھیں گے۔(ن۔۵۔۱۱۴)

دوسرا خط: آپؐ کے مدینہ پہنچتے ہی انصار کو ابو سفیان اور ابی بن خلف الجمعی کی طرف سے لکھا گیا:

امابعد! ہمارے لیے اس سے زیادہ ناپسندیدہ بات کوئی اور نہیں کہ قبائل عرب میں کسی قبیلہ اور ہمارے درمیان تمھاری وجہ سے عداوت کی آگ بھڑک اٹھے۔ تم نے یہ جان بوجھ کر ہمارے آدمی کو رکھا ہے جو ہمارے درمیان نہایت معزز اور ہماری قوم میں ذی حیثیت و منصب تھا۔ تم نے اس کو اپنے یہاں ٹھکانا مہیا کیا اور اس کی حفاظت کا بیڑا اٹھایا۔ بلاشبہ یہ بات خود تمھارے لیے باعث ذلت ہے۔ اس لیے تم ہمارے درمیان سے ہٹ جاؤ۔ پس اگر وہ ٹھیک رہتا ہے تو ہم اس سے بہتر طریقے سے پیش آئیں گے اور اگر اس کے علاوہ دوسرا طرز عمل دکھایا تو ہم ہی اس کے والی ہونے کا زیادہ حق رکھتے ہیں، اس کے ساتھ جو چاہیں' کریں۔ (ن۔۵۔۱۱۴)

تیسرا خط: قریش مکہ نے یہود کو لکھا'' تم لوگوں کے پاس اسلحہ جنگ اور قلعہ جات ہیں۔ تم ہمارے حریف محمد (ﷺ) سے لڑو ورنہ ہم تمھارے ساتھ یہ کریں گے اور یہ کوئی چیز ہم کو تمھاری عورتوں کے کڑوں تک پہنچنے سے روک نہ سکے گی۔ یعنی ہمارے اور تمھاری عورتوں کو لونڈیاں بنانے میں کوئی چیز حائل نہ ہوگی۔ (ن ۵۔۱۱۵)

مذکورہ خطوط میں چند باتیں قابل غور ہیں۔

۱: ہمارے حریف کو پناہ دے رکھی ہے۔

۲: آپ ان سے لڑیں۔

۳: یہ معاملہ ہم پر چھوڑیں ہم اس کے ولی ہیں جو چاہیں کر لیں تم درمیان سے ہٹ جاؤ۔

۴: انھیں قتل کر دو یا شہر سے نکال دو۔

۵: عبداللہ بن ابی کو دھمکیاں دیں کہ ہم تم پر چڑھ دوڑیں گے۔ تمھیں قتل کریں گے اور تمھاری عورتوں کو لونڈیاں بنائیں گے۔

۶: ایک بندہ خدا کی خاطر اہل مدینہ کو ان کے خلاف کیا جا رہا ہے اس کے برعکس وہ خود اہل مدینہ سے دشمنی مول رہے ہیں۔

سوچیے! کفار مکہ ہجرت کی خوشی میں مدینہ والوں سے دشمنی مول لے رہے ہیں؟ کیا خوشی میں کہہ رہے ہیں کہ انھیں قتل کر دیں یا شہر سے نکال دیں؟ کیا ہجرت رسول کی خوشی میں کہہ رہے ہیں کہ محمد ﷺ سے لڑو۔ کیا ہجرت کی خوشی میں مدینہ والوں پر چڑھ دوڑنے کی دھمکی دی جا رہی ہے؟ بھلے مانسو! یہ ساری باتیں دشمنی کی ہیں۔ وہ دشمنی کی آگ میں جل رہے ہیں۔ کروٹ کروٹ بے چینی و بے قراری کا عالم ہے۔ ان کے قتل کے خواہاں ہیں مگر رسائی ممکن نہیں۔ بہ خیر و عافیت مدینہ منورہ پہنچنے پر ان کی نیندیں حرام ہو گئیں۔ پچھتاوے میں مرے جا رہے ہیں۔ لیکن اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔

یہ بھی سن لیں! خوشی تو تب تھی کہ رسول اللہ ﷺ کی ہجرت پر شادیانے بجائے جاتے' علم

لہراتے، جلوس نکالتے، رقص و سرود کی محفلیں سجتی، شراب و کباب کا دور چلتا، یکے بعد دیگرے ایک دوسرے کی دعوتیں کرتے، اپنے بڑوں کو تحفے تحائف بھیجتے اور کہتے نعوذ باللہ ''دردسر روز کا تھا، خوب ہوا دور ہوا''۔ لیکن خوشی منانے کے سب طریقوں کو خیر باد کہہ دیتے ہیں اور اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آتے ہیں جس سے ان کے دردسر، ناراضی، غم و غصہ اور پچھتاوے کا اظہار ہوتا ہے۔ ان کے ہاں صف ماتم بچھی ہے۔ ان کے چہروں سے ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ ان کے قلوب طرح طرح کے گھمبیر مسائل اور خطرات کے وسوسوں سے منقلب ہوئے جاتے ہیں۔ سکھ کا سانس نہیں لیتے گویا کسی کل آرام نہیں۔ لیکن مارگولیتھ کہتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ہجرت کرنے سے مکہ والے بڑے خوش تھے۔ شاید مارگولیتھ دکھ اور سکھ سے بے گانہ ہے۔ غمی کو خوشی سمجھتا ہے مگر یہ خوشی ذی شعور اور عقل مند شخص کے نزدیک بے عقلی اور حماقت ہے۔ بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ ''بایں عقل و دانش بباید گریست''۔ مردوں اور عورتوں کو قید میں رکھا جاتا ہے یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ وہ پریشان تھے۔ لقمہ ان کے حلق میں اٹکا ہوا تھا۔ پیٹ پھول چکا تھا۔ وہ خطرات میں گھر گئے تھے۔ انھیں یہ معلوم تھا کہ مسلمان مدینہ میں چین سے رہیں گے۔ اپنے مذہب کا بہ خوبی پرچار کریں گے۔ اسلام پھلے پھولے گا۔ مسلمان خوش حال ہوں گے۔ دوسرا یہ خطرہ سمجھتے تھے جو ان کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا کہ کہیں مدینہ میں مہاجرین اتنی قوت نہ حاصل کرلیں کہ کل کلاں مکہ پر چڑھ دوڑیں۔ تیسرا خطرہ یہ تھا کہ اہل مدینہ کی حمایت مسلمان حاصل کریں گے اور ہمارے خلاف میدان میں صف آراء ہو جائیں گے۔ یہ پریشانیاں خطرے کی گھنٹیاں تھیں نہ کہ ہجرت کر جانے سے قریش کو خوشیاں ملیں۔ کفار کی سازشوں، منصوبہ بندیوں اور مختلف تدابیر کا نقشہ قرآن کریم نے یوں کھینچا ہے۔ ترجمہ (جب کہ منکرین حق تیرے خلاف تدبیریں سوچ رہے تھے کہ تجھے قید کردیں یا قتل کر ڈالیں یا جلاوطن کردیں، وہ اپنی چالیں چل رہے تھے اور اللہ تعالیٰ اپنی ترکیب کر رہا تھا اور اللہ سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے)

مواخات مدینہ

مکہ سے مسلمان مہاجرین ہر شے تج کر خالی ہاتھ مدینہ منورہ چلے آئے تھے۔ لیکن ہر شے سے قیمتی اعلیٰ اور زندگی کا حاصل یعنی دین اسلام اپنے دامن میں سمیٹ لائے تھے۔ اس دولت بے پناہ کے ہوتے ہوئے انھیں کسی چیز کے چھوڑنے اور دوسروں کے قبضے میں چلے جانے کا دکھ تھا نہ غم۔ وہ اللہ کی اطاعت اور رسول کی پیروی میں سب وابستگیوں سے دور جا چکے تھے۔ بس رسول اللہ کا دامن مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے۔

ان کے دامن سے ہو کے وابستہ
سب سے دامن چھڑا لیا ہم نے

بے سروسامانی کے عالم میں آنحضرت ؐ نے انصار و مہاجرین کے درمیان رشتہ اخوت قائم فرمایا۔ حضرت انسؓ کے مکان پر لوگوں کو جمع کر کے انصار سے فرمایا! یہ تمھارے بھائی ہیں۔ پھر مہاجرین اور انصار میں سے ایک ایک شخص کو بلا کر آپؐ فرماتے گئے ''یہ اور تم بھائی ہو''۔ دو اجنبی بھائی بھائی بن گئے۔ ان میں سے چند کے نام حسب ذیل ہیں

۱۔ سیدنا ابوبکر صدیقؓ، سیدنا عمر فاروقؓ

۲۔ سیدنا حمزہؓ کو سیدنا زید بن حارثہؓ

۳۔ سیدنا عثمانؓ کو سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف

۴۔ سیدنا زبیر بن العوامؓ کو سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ

۵۔ سیدنا عبیدہ بن الحارثؓ کو سیدنا بلال بن رباح

۶۔ سیدنا مصعب بن عمیر کو سیدنا سعد بن ابی وقاص

۷۔ سیدنا ابوعبیدہ بن الجراح کو سیدنا سالم مولا ابی حزیفہ

۸۔ سیدنا سعید بن زید کو سیدنا طلحہ بن عبیداللہ

۹۔ سیدنا و مولانا محمد رسول ﷺ کو سیدنا علی بن ابی طالب۔ حضرت ابوبکرؓ کو خارجہ بن عرید، عمر کو عتبہ بن مالک اور زبیر کو سلمہ بن سلامہ کا بھائی بنایا۔

مواخات مکی:

شبہ کا ازالہ: بعض روایات میں ہے کہ مدینہ میں رسول اللہ ﷺ نے علی ابن ابو طالبؓ کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا یہ میرا بھائی ہے۔ حکیم محمود احمد ظفر (امیر المومنین سیدنا علی) ابن سعد کے حوالہ سے لکھتا ہے کہ رسول اللہ نے علی ابن طالب اور سھل بن حنیف کے درمیان اخوت کا رشتہ قائم کیا تھا۔ جن روایات میں ایسا آتا ہے کہ آپؐ نے حضرت علیؓ کو مدینہ مواخات میں اپنا بھائی بنایا تھا وہ روایات، روایت و درایت کے لحاظ سے صحیح نہیں ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ مدنی مواخات مہاجرین و انصار کے درمیان کی گئی تھی تا کہ مہاجرین کی گزر بسر کا انتظام ہو سکے۔ مہاجرین ان کے ساتھ کام کریں گے۔ انصار اپنے بھائیوں کا ہاتھ بٹائیں گے۔ لیکن آپؐ اور حضرت علی دونوں مہاجر ہیں اور اخوت کا رشتہ مہاجرین و انصار کے درمیان تھا۔ مہاجر کا مہاجر سے رشتہ اخوت جوڑنا روح مواخات مدینہ کے خلاف ہے۔ مکی مواخات میں بھائی بنانا درست بنتا ہے۔ مواخات مدینہ میں ارباب اسیر نے نوے یعنی ۴۵ انصار اور ۴۵ مہاجرین تعداد لکھی ہے مگر ابن سعد اس تعداد کو بتا کر یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کی تعداد سو تھی یعنی پچاس مہاجرین اور پچاس انصار، مگر محمد ابن حبیب کتاب المجر میں ۵۵ کے نام بڑی وضاحت سے لکھے ہیں اس سلسلہ میں

چند وضاحتیں کر دینا ضروری ہیں۔

ا۔ مکہ سے ہجرت کر آنے والے صحابہ کرامؓ کی کل تعداد تقریباً ڈیڑھ سو ہے لیکن مواخات ۴۵ یا پچاس کے درمیان ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے۔

(الف) مواخات ان لوگوں کے درمیان کرائی گئی جو مکہ سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ اتفاق سے ان کے نام وغیرہ کو مورخین نے نقل و محفوظ نہ کیا۔

(ب) مواخات صرف انہی مہاجرین و انصار کے درمیان ہوئی جو حضرت انس بن مالکؓ کے گھر میں موجود تھے اور جو وہاں موجود نہیں تھے ان کی مواخات نہیں کرائی گئی۔

(ج) یہ مواخات کا پہلا مرحلہ تھا ممکن ہے بعد میں باقی بچے کھچے مہاجرین و انصار کے درمیان بھی مواخات کرا دی جاتی مگر شاید پھر مسجد نبوی کی تکمیل اور میثاق مدینہ کی تسوید کے بعد ضرورت نہ سمجھی گئی ہو اس لیے کہ مسجد نبوی میں۔۔۔۔ مرکزیت پیدا کرنے کے سلسلہ میں انتہائی اہم اور موثر کردار ادا کیا۔ اسی طرح میثاق مدینہ میں رہنے والے تمام عناصر کے درمیان حقوق و فرائض کا تعین ہو گیا یا پھر یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ حضور ﷺ اور صحابہؓ کی غزوات و سرایا میں مصروفیات نے اس کا موقعہ نہ دیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ انما المومنون الخوۃ کی اصولی ہدایت کے بعد نام بنام رشتہ اخوت استوار کرنے کی حاجت باقی نہ رہ گئی ہو۔

(۲) دوسری وضاحت یہ کرنا ہے کہ حضور ﷺ کے ہاتھوں اس رشتہ میں منسلک ہونے والے مہاجرین و انصار کے ناموں میں اختلافات اور رشتوں میں فرق بھی پایا جاتا ہے مگر تاریخ اسلامی کے بیشتر ماخذوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم نہ صرف یہ کہ بعض ناموں کا اضافہ کر سکتے ہیں بلکہ مہاجرین و انصار کی فہرست کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں یعنی! پہلے حصہ میں ان صحابہ کے نام آتے ہیں جن کی مواخات کے بارے میں اتفاق ہے۔ اس فہرست میں انچاس مہاجرین اور انچاس انصار کے نام ہیں۔

(ب) دوسرے حصہ میں ایسے صحابہؓ شامل ہیں جن کے بارے میں اختلافات پائے جاتے ہیں یہ کل چودہ صحابہ ہیں۔ اب سب سے پہلے ہمیں پہلے حصہ کو دیکھنا ہے جس سے ہماری بحث مقصود ہے۔ پہلے حصہ میں ان صحابہ کرامؓ کے مکمل اسماء درج ذیل ہیں۔

نمبر شمار	مہاجرین	مواخاۃ ہمراہ انصار
ا۔	حضرت ابو سلمہ بن عبد الاسد	حضرت سعد بن خیثمہؓ
۲۔	عامر بن ربیعہ	یزید بن المنذر بن سرحؓ
۳۔	عبداللہ بن جحش الاسدی	عاصم بن ثابت بن ابی الافلحؓ
۴۔	محرز بن نضلہؓ	عمارہ بن حزمؓ

۵۔	زید بن خطابؓ	معن بن عدیؓ
۶۔	خنیس بن حزافہؓ	ابو عبس بن جبیرؓ
۷۔	واقد بن عبداللہ التمیمی	بشر بن براء بن معرورؓ
۸۔	ایاس بن ابی البکیر	حارث بن خزیمہؓ
۹۔	عاقل بن ابی البکیر	مجذز بن زیادؓ
۱۰۔	خالد بن ابی البکیرؓ	یزید بن دثنہؓ
۱۱۔	عامر بن ابی البکیرؓ	ثابت بن قیس بن شماسؓ
۱۲۔	ابو مرثد الغنویؓ	عبادہ بن صامتؓ
۱۳۔	مرثد بن الغنویؓ	اوس بن الصامتؓ
۱۴۔	عبیدہ بن حارثؓ	عمیر بن الحمام السلمیؓ
۱۵۔	حصین بن حارث بن المطلب	رافع بن عنجدہؓ
۱۶۔	طلیب بن عمیر بن وہبؓ	منذر بن عمرو خزرجیؓ
۱۷۔	ابو سبرۃ بن ابی رہم	سلمہ بن سلامہ بن وقشؓ
۱۸۔	مصعب بن عمیرؓ	ابو ایوب انصاریؓ
۱۹۔	ابو حزیفہ بن عتبہؓ	عباد بن بشرؓ
۲۰۔	سالم بن مولیٰ ابی حزیفہؓ	معاذ بن ماعص انصاریؓ
۲۱۔	عتبہ بن غزوان بن جابرؓ	ابو دجانہ سماک بن خرشہؓ
۲۲۔	عثمان بن عفانؓ	اوس بن ثابتؓ
۲۳۔	ابو بکر صدیقؓ	خارجہ بن زید بن ابی زہیرؓ
۲۴۔	زید بن حارثہؓ	اُسید بن حضیرؓ
۲۵۔	عبدالرحمٰن بن عوفؓ	سعد بن ربیعؓ
۲۶۔	عمار بن یاسر	حزیفہ بن الیمانؓ
۲۷۔	بلال حبشی مکیؓ	ابو رویحہ عبداللہ بن عبدالرحمٰن
۲۸۔	شجاع بن واہب اسدیؓ	اوس بن خولیؓ
۲۹۔	سعد مولیٰ عتبہؓ	تمیم مولیٰ خراشؓ
۳۰۔	عبداللہ بن مسعودؓ	معاذ بن جبلؓ

۳۱۔	عمیر بن عمرو بن نضلہ	یزید بن حارثؓ
۳۲۔	مقداد بن عمرو کندیؓ	جبیر بن عتیکؓ
۳۳۔	عمیر بن ابی وقاصؓ	عمرو بن معاذؓ
۳۴۔	مسعود بن ربیع القاریؓ	عبید بن التیحانؓ
۳۵۔	عامر بن فہیرہؓ	حارث بن اوس بن معاذؓ
۳۶۔	شماس بن عثمانؓ	حنظلہ بن ابی عامرؓ
۳۷۔	ارقم بن ابی الارقم مخزومیؓ	ابوطلحہ زید بن سہل انصاریؓ
۳۸۔	معتب بن حمراء الخزاعیؓ	ثعلبہ بن حاطبؓ
۳۹۔	عبداللہ بن مظعونؓ	سہل بن عبید بن المعلیؓ
۴۰۔	سائب بن عثمان جمحیؓ	حارثہ بن سراقہؓ
۴۱۔	معمر بن الحارثؓ	معاذ بن عفراءؓ
۴۲۔	عبداللہ بن مخرمہ بن عبدالعزی	فروۃ بن عمرو بیاضیؓ
۴۳۔	وہب بن سعد بن ابی سرحؓ	سوید بن عمروؓ
۴۴۔	صفوان بن بیضاءؓ	رافع بن المعلیؓ
۴۵۔	حویصہ	ابوسعید خدریؓ
۴۶۔	مقداد بن اسد کندی	عبداللہ بن رواحہؓ
۴۷۔	مسطح بن اثاثہؓ	زید بن المزینؓ
۴۸۔	مہجع مولیٰ عمرؓ	سراقہ بن عمرو بن عطیہؓ
۴۹۔	صہیب بن سنان رومیؓ	حارث بن القمہؓ

مذکورہ فہرست میں ایک نام شامل نہیں ہے جس سے تشویش پیدا ہوتی ہے کیونکہ اس نام کو عام طور پر شامل کیا جاتا ہے یعنی خود حضورﷺ کی ذات مبارکہ، جن کا عقد مواخات مشہور روایات کے مطابق آپﷺ نے حضرت علیؓ سے قائم فرمایا تھا۔ ابن ہشام نے یہی لکھا ہے لیکن ابن سعد اور دوسرے مورخین اس رشتہ کو تسلیم نہیں کرتے اور وہ حضرت علیؓ کی مواخات بجائے نبیﷺ کے حضرت سہل بن حنیف سے قرار دیتے ہیں۔ علامہ ابن کثیر اور بقول امام زرقانی، علامہ ابن تیمیہ نے بھی اس مواخات کا انکار کیا ہے اور یہاں تک دعویٰ کر دیا ہے کہ۔ انذلك من الاكا ذيب وانه لم يواخ بين مهاجرى ومهاجرى ، اسی طرح سے بعض دوسروں نے مواخات کی اغراض ومقاصد، مصلحتوں اور خواص کے پیش

نظرا سے رد کر دیا ہے اور علامہ ابن قیم نے بطرز مناظرہ یہ بحث اصولی طور پر کی ہے کہ اول تو ایک مہاجر سے دوسرے مہاجر کی مواخات ہی نہ قابل قبول ہے اور دوسرا یہ کہ اگر نبی ﷺ مہاجرین میں سے بھی کسی کو اپنا بھائی بناتے تو تمام لوگوں سے زیادہ تو اس کے مستحق حضرت ابو بکرؓ تھے۔ حضورؐ کے محبوب ترین ساتھی، رفیق ہجرت، انیس غار دیگر تمام صحابہ سے افضل و اکرم ہے اور جن کے بارے میں آپ ﷺ یہ فرما چکے تھے کہ ''دنیا والوں میں سے اگر کسی کو اپنا دوست بناتا تو ابو بکرؓ کو بناتا مگر یہ کہ اسلامی اخوت سب سے بہتر ہے'' غرض ان دلائل کے پیش نظر جو خاصے وزنی اور قوی ہیں۔ مدینہ میں حضور ﷺ اور حضرت علیؓ کی مواخات نا قابل فہم معلوم ہوتی ہے۔ اصل میں مورخین کو اس رشتہ مواخات میں التباس ہو گیا ہے اس کی اصل حقیقت یہ ہے کہ حضور اور حضرت علیؓ کے درمیان مواخات یقیناً ہوئی ہے مگر مکہ میں نہ کہ مدینہ میں۔ یہ بات درست ہے کہ حضرت علیؓ کی مواخات حضور ﷺ سے نہیں بلکہ حضرت سہل بن حنیفؓ سے قائم کی گئی تھی اور حضرت علیؓ کی یہ مواخات اس عمل کو مستلزم نہیں ہے کہ اب نبی ﷺ کا بھی رشتہ مواخات متعین طور پر کسی نہ کسی انصاری سے ضرور جوڑا جائے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ دوسرے بہت سے مہاجرین کی طرح (اگر مواخات میں شرکاء کی تعداد اور کیفیت روایتی طور پر ۴۵ یا ۵۰ تسلیم کر لی جائے) حضور ﷺ کی بھی کسی سے مواخات نہیں ہوئی۔ دوسرا یہ کہ حضور ﷺ تمام انصار سے بحیثیت مجموعی بیعت عقبہ کبیرہ یہ کہہ چکے تھے کہ تمہارا خون میرا خون، تمہاری جان میری جان ہے تم اطمینان رکھو جس سے تم لڑو گے اس سے میں لڑوں گا اور جس سے تم صلح کرو گے اس سے میں بھی صلح کروں گا، تمہارا ذمہ میرا ذمہ ہے اور تمہاری حرمت میری حرمت، میرا جینا اور مرنا تمہارے ساتھ ہوگا۔ تو پھر ظاہر ہے کہ دوبارہ انفرادی طور پر کسی انصاری سے رشتہ اخوت قائم کرنا محض ایک تکلف اور غیر ضروری امر ہوتا نیز اگر حضور ﷺ کسی ایک انصاری سے بھی مواخات کر لیتے تو شائد یہ عقد دوسرے انصار کی دل شکنی کا باعث بنتا علاوہ ازیں آپ ﷺ کی نبوت کی انفرادیت کا تقاضہ یہی تھا کہ آپ ﷺ کسی ایک سے وابستہ ہونے کی بجائے سب سے وابستہ رہیں۔

غلطی کیسے درآئی؟ وہ یوں کہ مکی مواخات میں آپؐ نے حضرت علیؓ کو اپنا بھائی بنایا تھا جس کو کئی سیرت نگاروں نے تحقیق کے بغیر مواخات مدینہ پر محمول کر دیا جو غلط ہے اور مقصد مواخات مدینہ کے بالکل خلاف ہے جس کے تحت یہ بھائی چارہ قائم ہوا تھا۔ (تفصیل کے لیے بدایہ والنہایہ کا مطالعہ فرمائیں)

صاحب مدارج النبوۃ کی تقریر: مواخات مدینہ کا رشتہ ۴۵-۴۵ اور ایک قول ۵۰-۵۰ انصار و مہاجرین کے درمیان جوڑا گیا تھا۔ عقد مواخات باہمی یگانگت اور حق توارث میں مربوط کرنا تھا۔ یہ سب آیت کریمہ ''أُولُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ'' (انفال-۷۵) (رحمی رشتے والے، اللہ کے فرائض میں ایک دوسرے کے زیادہ قریب ہیں) کے نازل ہونے سے پہلے تھا۔ اس

آیت کریمہ کے نازل ہونے کے بعد عقد مواخات منسوخ ہوگئی۔ سابق ذکر کردہ روایت کہ مدینہ میں آپؐ نے علیؓ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا" یہ میرا بھائی ہے" کے متعلق مدارج النبوۃ ص۔۱۰۳۔ا پر روضۃ الاحباب میں شیخ ابن حجر سے اور فتح الباری میں ابن عبدالبر سے منقول ہے کہ ایک مواخات اور ہے جو مہاجرین کے درمیان ایک دوسرے کے ساتھ عقد باندھتے ہیں مخصوص ہے۔ چنانچہ ابوبکرؓ، عمرؓ اور حضرت طلحہؓ وزبیرؓ اور عثمانؓ وعبدالرحمٰن بن عوفؓ کے درمیان عقد مواخات باندھا گیا تھا۔ اس پر حضرت علیؓ نے عرض کی یا رسول اللہ! آپؐ نے صحابہ کے درمیان تو برادری کا رشتہ باندھ دیا اور مجھے تنہا چھوڑ دیا۔ میرا بھائی کون ہے؟ حضورؐ نے فرمایا! تمھارا بھائی میں ہوں اور فرمایا "اَنتَ اَخِیْ فِی الدُّنیاَ وَالآ خِرَۃِ"۔ (تم دنیا اور آخرت میں میرے بھائی ہو) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مدینہ مواخات میں علیؓ کو بھائی نہیں بنایا تھا بلکہ اس سے پہلے مواخات جو مواخات مکہ ہوا تھا اس میں علی کو بھائی بنایا تھا۔

اخوت کی حکمت اور منسوخی: علامہ سید احمد دھلان (السیرۃ النبویہ۔ا۔۴۱۷) بہ حوالہ امام سہیلی لکھتے ہیں کہ "اس اخوت کا مقصد یہ تھا تا کہ مہاجرین کی اجنبیت دور ہو سکے۔ اہل وعیال کی جدائی اور فراق برداشت کرنا آسان ہو سکے اور مہاجرین وانصار ایک دوسرے کے کام آسکیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو عزت وعطیہ فرمایا اور اجنبیت ختم ہوگئی اور وراثت کے قوانین سے مواخات منسوخ ہوگیا تو سارے اہل ایمان آپس میں بھائی بھائی بن گئے اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔" اِنَّمَا الْمُومِنُونَ اِخوَۃٌ" (الحجرات۔۱۰) ترجمہ: بے شک اہل ایمان بھائی بھائی ہیں۔ کچھ مہاجرین کا بھائی چارہ بھی قائم کیا گیا تھا جس طرح حضرت حمزہ اور حضرت زید بن حارث کے درمیان قائم کیا تھا۔ یہ دونوں مہاجر تھے اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے مہاجرین جن کی مالی حالت خوب تھی ان کے ساتھ غریب مہاجرین کو جوڑ دیا اور ہوسکتا ہے کہ اب انصار میں مہاجرین کو سنبھالا دینے والے نہ رہے ہوں۔ تب یہ نوبت آئی۔

آپؐ نے حضرت علی کو بھائی کیوں بنایا: اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ حضرت علیؓ آپؐ کے رشتہ میں بھائی لگتے تھے (یعنی چچازاد بھائی) دوسری وجہ یہ کہ آپؐ اگر کسی اور مسلمان کو بھائی بناتے جو رشتہ دار نہ ہوتا یعنی رشتہ داری کے ناطے سے تو آئندہ طرح طرح کی مشکلات جدیدہ پیدا ہونے کا احتمال تھا۔ (رحمۃ اللعالمین جلد اول۔۱۹۸)

اُم معبد کے ہاں

ہجرت کا مختصر قافلہ قدید کے مقام سے گزرا۔ اس جگہ حضرت ام معبد عاتکہ بنت خالد خزاعیہ کا خیمہ تھا۔ یہ خاتون بڑی مہمان نواز تھی۔ ان کی قوم قحط کا شکار تھی۔ ہجرت کی مقدس ہستیوں نے ان سے گوشت، دودھ یا کھجور طلب کی تا کہ قیمتاً خرید لیں لیکن ام معبد کے پاس کچھ نہ تھا۔ ایک بکری ریوڑ کے

ساتھ چرنے سے رہ گئی تھی کیوں کہ وہ لاغر کم زور تھی۔ اس کی کھیری میں دودھ نہ تھا۔ آپؐ نے فرمایا تم اجازت دیتی ہو کہ ہم اس کا دودھ نکال لیں؟ ام معبد نے کہا نکال سکتے ہیں تو نکال لیجئے۔ اللہ تعالیٰ کا نام لیا تھنوں کو دست مبارک سے مس کیا تو تھنوں میں دودھ اتر آیا۔ آپؐ نے برتن طلب فرمایا۔ آپؐ نے اس میں دودھ نکالا تو سب سے پہلے ام معبد کو پلایا۔ پھر دیگر مسافروں کو حتیٰ کہ سارے سیراب ہو گئے' سب سے آخر میں خود نوش فرمایا اور فرمایا'' قوم کو پلانے والا سب سے آخر میں پیتا ہے''۔ (السیرۃ النبویہ۔ علامہ دھلان۔ ۳۹۵) پھر دوسری مرتبہ بکری کو دوہا اور دوسری مرتبہ پلایا۔ پھر تیسری مرتبہ دوہا اور وہ ام معبد کے خاندان کے لیے چھوڑ دیا۔

اعتراض نمبر ۲۳۵

ماہر حیوانات اسے نہیں مانتے کہ ایک لاغر و کم زور بکری اتنا دودھ دے کہ چار آدمی سیر ہوں اور پھر دوہا اور برتن بھر کر ام معبد کو دیا''۔

جواب: ہجرت مدینہ کے دوران ام معبد کے خیمہ میں ستانے لگے۔ خیمہ کے ایک کونے میں لاغر اور کم زور سی بکری تھی جو ریوڑ کے ساتھ چرنے سے لاغری کی وجہ سے رہ گئی تھی۔ آپؐ نے ام معبد سے اس کا دودھ نکالنے کی اجازت طلب کی۔ اجازت لے کر دوہا۔ اپنے میزبان کو پلایا (ام معبد) پھر ساتھیوں کو پلایا بعد میں خود نوش فرمایا۔ تمام لوگ سیر ہو گئے۔ پھر دوہا اور برتن بھر کر ام معبد کے خاندان کے لیے دے دیا۔ یہ اعجاز نبوت ہے اور ایسے معجزات انبیاء سے وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ماہرین کی عقل میں یہ آنے والی بات نہیں بل کہ اکثریت اہل علم کی دیگر ہستیوں کے ایسے محیر العقول واقعات تسلیم کرتے ہیں۔ نیز ایسے واقعات کا قرآنی آیات شہادت دیتی ہیں مثلاً من وسلویٰ جو صحرا میں قوم بنی اسرائیل کی خورونوش کا سامان بنا۔ من وسلویٰ کا ذکر قرآن میں آتا ہے۔'' وَاَنزَلنَا عَلَیکُمُ المَنَّ وَالسَّلوٰی'' ''اور ہم نے اتارا من وسلویٰ'' اور عصائے کلیمی کی ضرب سے پتھر سے بارہ چشمے پھوٹے جس سے ایک مدت تک بنی اسرائیل کی قوم سیراب ہوتی رہی۔'' وَاِذِاستَسقٰی مُوسٰی لِقَومِہٖ فَقُلنَا اضرِب بِعَصَاکَ الحَجَرَ فَانفَجَرَت مِنہُ اثنَتَا عِشرَۃَ عَیناً'' (البقرہ۔ ۶۰)

ترجمہ: اور یاد کرو جب پانی کی دعا مانگی موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے تو ہم نے فرمایا، مارو اپنا عصا فلاں چٹان پر تو فوراً بہہ نکلے اس چٹان سے بارہ چشمے''۔

حضرت عیسیٰؑ مادر زاد اندھوں اور کوڑھیوں کو تن درست کر دیتے تھے بہ فضل تعالیٰ۔ ہم مانتے ہیں۔ ہمارا ایمان ہے۔ یہ واقعات سچے اور سُچے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ بندوں کو ایسے انعامات سے سرفراز فرماتا ہے۔ سب سے حیران کن بات یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ اپنے پیغمبروں کے معجزات کو تسلیم

کرتے ہیں اور ببانگ دہل ان کا اعلان اور تذکرہ کرتے ہیں لیکن رسول مقبولؐ کے معجزات کی بات ہوتی ہے تو علم و عقل، تجربات و مشاہدات کو آڑ بنا کر صاف مکر جاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ انبیاء سے ایسے معجزات کا صادر ہونے میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ یہ معجزات مبنی بر حق ہیں۔ ماہر حیوانات روشن خیال عقل کے پجاری لوگوں کی بات نا قابل تسلیم ہے۔

حضرت حلیمہ سعدیہؓ کی اونٹنی اور بکریاں بھی دودھ کا قطرہ تک نہیں رکھتیں مگر حضورؐ کے نزول اجلال سے ایسی برکتیں نازل ہوئیں کہ دوسرے لوگوں کو کہنا پڑا کہ اپنے مال مویشی وہاں چرایا کرو جہاں سعدیہؓ کی بکریاں چرتی ہیں۔ مگر اس جگہ چرانے سے کیا فائدہ؟ ایمان والے سمجھتے ہیں کہ یہ سب برکتیں تو سرکار دو عالم ﷺ کے دم قدم سے تھیں۔

تم جہاں پیار سے قدم رکھ دو
وہ زمیں آسمان ہوتی ہے

ماہر حیوانات تسلیم نہیں کرتے کہ لاغر اور کمزور بکری کیسے چار آدمیوں کو سیر ہونے کا دودھ مہیا کر سکتی ہے اور دوسری بار دوہنے سے برتن بھر گیا ہو؟ وہ کم از کم چار پانچ افراد کی شہادت تھی کہ بکری کا دودھ اتنا دوہا گیا کہ مہمان و میزبان سیر ہو گئے لیکن اس کی گواہی تو ان گنت افراد نے دی ہو گی کیونکہ بکری کافی عرصہ بعد تک زندہ رہی۔ ابن الجوزی (الوفا۔۲۹۶) لکھتے ہیں کہ ''وہ بکری جس کے تھنوں کو رسول اللہ ﷺ نے دست مبارک سے مس کیا تھا اس کی عمر میں وہ برکت پیدا ہوئی کہ وہ حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں رونما ہونے والے قحط جس کو ''عام افادہ'' کہا جاتا تھا یعنی ہجرت کے بعد اٹھارہ سال تک صحیح و سالم رہی اور ہم اس زمانہ میں بھی اس کو صبح و شام دوہا کرتے اور اس کے دودھ سے سیراب ہوا کرتے تھے جبکہ زمین میں جانوروں کو کوئی شے کھانے کی ملتی ہی نہیں تھی اس سے بھی شائد ماہرین حیوانات انکار کریں اور اتنا ہی کہہ دیں کہ جانوروں کی اتنی طویل عمر کیسے ہو سکتی ہے؟ اور درج ذیل واقعہ سے بھی مکر جائیں وہ یہ ہے کہ ایک درخت جو راہب کے صومعہ کے پاس تھا اس کے نیچے سوائے نبی کے کوئی نہیں بیٹھے گا، صدیوں تک وہ درخت موجود رہا اگرچہ اس کی شاخیں خشک ہو گئیں اور پتے جھڑ گئے آخر کار جب نبی آخر الزماں ﷺ تشریف لائے اس شجر تلے تشریف فرما ہوئے تو وہ از سر نو برگ و بار سے لہلا اٹھا تو کیا ایک بکری جسے آپ ﷺ کے دست مبارک نے مس کیا تھا وہ اتنا دودھ دے سکتی ہے اور نہ ہی اتنی طویل عمر پا سکتی ہے؟

اعتراض نمبر ۲۳۶

بعض کہتے ہیں کہ مکی دور میں ایمان و کفر کی واضح اجتماعیت سامنے نہیں آئی تھی۔ (نقوش ۵۔۳۔۷۳)

جواب: قرآن مجید میں ہجرت سے قبل جو سورتیں مکہ میں نازل ہوئیں ان میں دو گروہوں کی واضح نشان دہی موجود ہے۔ اس لیے یہ کہنا غلط ہے کہ مکی دور میں ایمان و کفر کی واضح اجتماعیت سامنے نہیں آئی تھی۔ مکی سورتوں میں متعدد فقرے اور الفاظ سے اہل ایمان اور کفر میں امتیاز موجود ہے۔ بل کہ ان ہر دو کی خصوصیات بھی بتائی گئی ہیں۔ حضرت جعفرؓ کی شاہ حبش کے دربار میں تقریر سے بھی صاف نظر آتا ہے کہ صاحبان ایمان کا ایک گروہ جاہلی معاشرہ میں پیدا ہو گیا تھا۔

اجتماعیت کی دلیل میں نیا معاشرہ حسب ونسب، نسل و وطن، زبان ولسان اور جاہلی عزت و وقار اور دیگر امتیازات وتعصّبات سے پاک بنیادوں پر قائم ہوا جس کی اساس ایمان پر قائم ہے۔ اس سلسلہ میں ایک اور اہم قدم اٹھایا کہ بالکل ابتدائی مکی دور میں ایمان والوں کے درمیان ایک عقد مواخات قائم کیا جو اس وقت ایمان لا چکے تھے۔ یہ پہلی مواخات ہے۔ چند ایک نام یہ ہیں

۱: رسول اللہ اور حضرت علیؓ کے درمیان۔

۲: حضرت حمزہؓ اور زید بن حارثؓ۔

۳: حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ۔

۴: حضرت عثمانؓ اور عبدالرحمٰن بن عوفؓ۔

۵: حضرت زبیرؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ۔

۶: معصب بن عمیرؓ اور سعد ابی وقاصؓ۔

۷: ابوعبیدہ بن الجراحؓ اور سالم بن ابی حذیفہؓ۔

۸: حضرت سعید بن زیدؓ اور حضرت طلحہ بن عبیداللہؓ۔ یہی فہرست ابن سید الناسؒ نے بھی نقل کی ہے۔ البتہ زرقانی المواہب میں ہے کہ زبیرؓ اور طلحہؓ کے درمیان مواخات ہوئی اور بھی مسلمان تھے جن کے درمیان عقد مواخات ہوئی تھی۔

کہاں مواخات ہوئی: اس کا ذکر مورخین نے نہیں کیا لیکن یہ بالکل واضح ہے کہ اس کا انعقاد یقیناً دارارقم میں ہوا ہوگا۔ اس لیے کہ مذکور ہے کہ صحابہ میں سے عمرؓ، حمزہؓ، معصب بن عمیرؓ اس وقت ایمان لائے جب آپ دارارقم میں موجود تھے۔ اس مواخات سے اجتماعیت کو فروغ حاصل ہوا۔

فوائد: ۱: اس مواخات کے ذریعے ایک آدمی کو دوسرے کا بھائی محض دین وایمان کی بنیاد پر اور بغیر کسی ذاتی یا نفسیاتی غرض وغایت کے، صرف اللہ کی خاطر بنایا گیا۔ ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ ایک نسل اور دوسری نسل اور ایک رنگ دوسرے رنگ پر اللہ کا رنگ غالب آ گیا اور اللہ کے رنگ سے بہتر بھلا کون سا رنگ ہے۔

۲: اس مواخات کے ذریعے رسول اللہ ﷺ نے اپنے تمام دعوؤں کو قانونی شکل دے دی اور

عملاً اس بات کا ثبوت ہے کہ ایمان کی اساس پر بننے والا معاشرہ سب سے الگ ہے اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ جاہلی معاشرہ کی تمام اقدار کو پامال کرتے ہوئے حضرت حمزہؓ کا بھائی آزاد کردہ غلام زید بن حارثؓ، ابوعبیدہ کو سالم مولیؓ اور عبیدہ بن حارثؓ کو بلالؓ کا بھائی بنایا جاتا ہے۔اس کے معنی ہیں کہ پستی و بلندی، شرافت و ذلت اور خوب ناخوب کے پیمانے بدل گئے۔سب نے دیکھا کہ دین کے رشتہ میں بندھنے والے افراد متضاد معاشرتی منصب کے مالک تھے۔مگر اخوت کے نظم میں مساوی طور پر پرو دیے گئے۔مواخات نے سب کو ایک سطح پر لا کھڑا کیا۔

۳: اس اخوت و مساوات کے نتیجہ میں اصولی طور پر ایک جدید سیاسی مجتمع ممتاز و ممیّز ہو گیا۔

۴: مواخات نے مکہ کے ہمت شکن حالات میں اہلِ ایمان کو ایک دوسرے کے نفع و نقصان رنج و غم اور خوشی و مسرت میں برابر کا شریک قرار دیا اور حالات کے مقابلہ کا انفرادی اور اجتماعی حوصلہ بخشا۔

مختصر یہ کہ مندرجہ بالا اقدامات کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ نے اولاً مکہ میں تمام صاحبان ایمان کی ایک وحدت بنائی۔(نقوش۔۵۔۴۷۔۷۳)

میثاق مدینہ

مکی دور میں عرب کے مختلف قبائل کے لوگوں اور برادریوں نے آپؐ کو رسول تسلیم کر لیا تھا۔ یہی نہیں بل کہ انصار مدینہ اسلام سے مشرف ہوئے جس سے اُمہّ کے تصور کو فروغ حاصل ہوا۔ہجرت مدینہ ایک عظیم واقعہ ہے جو سکونتی تبدیلی کے ساتھ ساتھ مذہبی اور روحانی تبدیلی بھی تھی۔ہجرت کا مطلب ذات، برادری، قوم قبیلہ، رنگ و نسل و علاقہ جیسی عصبیتوں سے باہر ہو کر آفاقی، عالمی، دینی اور اخلاقی اصولوں کو اپنا کر، اُمہَّ سے وابستہ ہونے' کے مترادف تھا۔رسول اللہ ﷺ اُمہ کے سربراہ تھے۔کسی شخص کے قبول اسلام میں اس کے رسول کی مذہبی و سیاسی قیادت کا اقرار شامل تھا۔قرآن مجید میں آتا ہے۔" قل اطیعوا اللہ والرسول" (۳۳۔۳۱) ترجمہ: کہہ دو خدا اور رسول کی اطاعت کرو۔ من یطع الرسول فقد اطاع اللہ (۴۔۱۰) "جو رسول اللہ کی اطاعت کرتا ہے وہ بلا شبہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے"۔

گویا امہ اپنے سربراہ سمیت معرض وجود میں آ چکی تھی دوسری طرف مکہ کی فضا اسلام کے تصورات کے نفاذ کے لیے ناسازگار تھی۔ان کے اطلاق کے لیے ایک خوش گوار سماجی و سیاسی ماحول کی ضرورت تھی۔آپؐ نے اپنی نبوت کے تقریباً ۱۳ سال بعد مدینہ کے مسلمان سرداروں اوس و خزرج کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جنھوں نے آپؐ کو اپنے شہر آنے کی دعوت دی تھی اور وعدہ کیا کہ وہ اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہوں گے اور آپ ﷺ کو دشمنوں خصوصاً قریش سے محفوظ رکھیں گے۔آپؐ مدینہ تشریف لے گئے۔آپؐ کے مدینہ ہجرت کے پہلے ہی سال کی ابتداء میں یہ دستور مرتب کیا گیا۔اس

دستاویز کی رو سے کسی فریق کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ جب چاہے علیحدگی اختیار کر لے یا اس کی خلاف ورزی کر ڈالے اور دشمنوں سے جا ملے۔ ایسا کرنا اپنے حق شہریت سے ہاتھ دھو بیٹھنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جن یہودی قبائل نے اس دستور کو پامال کیا، معاہدہ کو توڑ ڈالا ان کے خلاف کاروائی کی گئی جو غداروں کے ساتھ اور باغیوں کے خلاف کی جاتی ہے۔

اعتراض نمبر ۲۳۷

میثاق مدینہ کی دستاویز غزوہ بدر کے بعد لکھی گئی (گرم) بعض مسلمان لکھتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ یہ دستاویز کا دوسرا حصہ جنگ بدر کے بعد مرتب کیا گیا ہو اور حصہ اول کے ساتھ شامل کر دیا گیا ہو؟

جواب: منشور کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک مکمل دستاویز اور جامع فرمان کی حیثیت رکھتا ہے اور اسے ایک ہی دفعہ، ا۔ہجری میں جاری کیا گیا جیسا کہ ماخذ اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ کیتانی اور ولہازن بھی اسے ایک مکمل دستاویز مانتے ہیں۔ نیز صحیح بخاری میں ایک روایت حضرت انس ؓ سے مروی ہے کہ یہ دستاویز ان کے والدین کے گھر پر لکھی گئی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ دستاویز مسجد نبوی کی تعمیر سے پہلے مرتب ہوئی تھی۔ ویلہازن اور کیتانی بہت سی شہادتیں اور دلائل پیش کرنے کے بعد اس دستاویز کو غزوہ بدر سے پہلے کی تسلیم کرتے ہیں کیتانی نے مستشرق گرم کے دلائل کا جواب دیا ہے۔ جو مصنفین دوسرے حصہ کو بدر کے بعد کی دستاویز ٹھہراتے ہیں ان کا استدلال یہ ہے کہ ''یہودیوں کا بھی اسی ابتدائی زمانہ میں آنحضرتؐ کے سیاسی اقتدار کو مان لینا قرین قیاس نہیں۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ دستور کا حصہ دوم یعنی یہودیوں کا دستور العمل جنگ بدر کے بعد کا ہے جب کہ ایک زبردست فتح سے مسلمانوں کی دھاک ہر طرف بیٹھ گئی تھی۔

اہل مدینہ نے یہودیوں سے معاہدات منسوخ کر دیئے تھے۔ آنحضرتؐ نے نزدیکی قبائل مثلاً بنی ضمرہ، جہینہ وغیرہ سے معاہدے کیے جن سے مسلمانوں کو مضبوطی اور استحکام ملا۔ یہودیوں کے دو بڑے گروہ آپس میں حریف تھے۔ ان کا مل کر رہنا اور الگ رہ کر محفوظ رہنا ممکن نہ تھا۔ ان حالات میں انھوں نے آنحضرتؐ سے ماتحتانہ تعاون کرنے کا سوچا۔ میرے خیال میں یہ جنگ بدر کے بعد کا واقعہ ہوسکتا ہے اس سے پہلے کا قرین قیاس نہیں۔

اس طرح مستشرق ''منٹگمری واٹ'' بھی کیتانی اور ویلہازن کی مطابقت میں ایک طرف تو اسے ایک ہی مکمل دستاویز قرار دیتا ہے اور دوسری طرف یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ چوں کہ اس کی کئی دفعات میں ضمائر وتخاطب کا اختلاف ہے مثلاً کہیں مومنین کا لفظ استعمال ہوا ہے اور کہیں مسلمین کا۔ اس لیے ممکن ہے کہ یہ دو یا اس سے زائد مواقع پر طے کی گئی ہوں لیکن پھر یک جا کر دی گئی ہوں۔ مزید برآں اس میں مشہور

قبائل کا نام نہیں ہے اس لیے ممکن ہے کہ یہ اخراج بنو قریظہ کے بعد کا واقعہ ہو۔

ڈاکٹر حمید اللہ اور واٹ کے خیالات دستاویز کے مندرجات اور تاریخی واقعات کی روشنی میں کچھ زیادہ قابل قبول قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ہم درج ذیل نکات کی وضاحت مناسب سمجھتے ہیں۔

ا: قدیم وجدید مورخین اور ارباب سیر عام طور پر یہی بیان کرتے ہیں کہ یہ دستاویز ۱ھ سے تعلق رکھتی ہیں۔ڈاکٹر حمید اللہ اور واٹ اس دستاویز کو اس کی داخلی وخارجی شہادتوں کی بنا پر ایک ''کل'' تصور کرتے ہیں۔اس لحاظ سے جب اس کے ایک جزو کا زمانہ متعین ہے تو دوسرے جز کا زمانہ بھی منطقی طور پر متعین ہو جاتا ہے اور (قرآن کی سورتوں کی طرح) سیرت کے واقعات میں غالباً اس کی نظیر نہیں ملتی کہ ایک ہی مکمل دستاویز کو دو مختلف زمانوں میں مکمل کر کے بغیر کسی تصریح کے یک جا کر دیا گیا ہو۔

ب: جہاں تک اس بیان کا تعلق ہے کہ بیرون مدینہ قبائل سے معاہدات کر کے رسول اللہ ﷺ ایک مستحکم حیثیت حاصل کر چکے تھے اور جنگ بدر سے یہود پر دھاک بیٹھ گئی اس لیے انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی سیاست کو قبول کرتے ہوئے ماتحتانہ تعاون پیش کیا۔اس سلسلہ میں درج ذیل پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ا: سوال یہ ہے کہ بیرون مدینہ قبائل نے رسول اللہ ﷺ کی سیاست کو کیوں قبول کیا؟ یہود مدینہ نے آپؐ کی سیاست کو تسلیم نہ کیا ہوتا تو اس صورت میں قبائل سے رسول اللہ ﷺ کے حلیفانہ معاہدات موثر نہ ہو سکتے تھے کیوں کہ وہ قبائل کہہ سکتے تھے کہ مدینہ کا ایک قابل ذکر عنصر تو آپ کی گرفت سے بالکل باہر ہے پہلے ان کو زیرِ اطاعت لایئے اس کے بعد ہم سے مطالبہ کیجیے۔علاوہ ازیں بیرون مدینہ قبائل سے اس وقت یا بعد میں معاہدات ہوئے ان کے مضامین سے ظاہر ہوتا ہے کہ چند کے سوا تمام فرامین اور امان نامے ہیں اور فرامین و امان ناموں کا اجراء بجائے خود رسول اللہ ﷺ کی قیادت اور اندرونی سیاسی خود مختاری کو مزید موکد کرتا ہے۔

۲: اس دستاویز کے دوسرے حصہ کو بدر کے بعد فرض کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ بنی قینقاع کے اخراج سے پہلے تک مدینہ کے تمام مشترک و متفرق عناصر میں اتحاد پیدا نہ ہو سکا تھا جب کہ واقعہ اس کے برعکس ہے یعنی یہ کہ اس سے پہلے تمام مدنی عناصر میں اتحاد ہو چکا تھا اور مدنی معاشرہ کے بعض عناصر منافقین اور یہود کے جملہ سرگرمیوں کا اولین ہدف ہی یہ تھا کہ کسی طرح مدنی معاشرہ کے اتحاد پر کاری ضرب لگائی جائے اور انتشار و تشت کو ہوا دی جائے۔

۳: ڈاکٹر حمید اللہ کے موقف کو تسلیم کیا جائے تو پھر غزوہ بدر کے بعد محض بنی قینقاع کا اخراج اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ حد سے حد بنی قینقاع پر رسول اللہ ﷺ کے اقتدار کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔باقی یہودی

قبائل بنی نظیر اور بنی قریظہ پر اس کا کوئی اثر نہ تھا اور اس صورت میں واٹ کی یہ بات صحیح ہوگی کہ دستاویز کو بنی قریظہ کے استحصال کے بعد ۵ھ کا واقعہ مانا جائے۔ حال آنکہ تاریخ سے ان باتوں کی تائید نہیں ہوتی۔

۴: اگر ہم اس تحریر کا زمانہ بدر کے بعد کا مان لیں تو غالباً بنی قینقاع کے اخراج کو کچھ اور بڑھانا پڑے گا اور وہ ناممکن ہے کیوں کہ غزوہ بدر کے لیے رسول مقبول ﷺ بہ قول ابن ہشام ۸ رمضان ۲ھ اور بہ روایت ابن سعد ۱۲ رمضان ۲ھ روانہ ہوئے اور آخر رمضان ۲ھ یا اس کے بعد مراجعت فرمائی اور پھر غزوہ بنی قینقاع کے لیے ۱۵ شوال کو نکلے اور ۱۵ دن محاصرہ کے بعد یعنی ۳۰ شوال ۲ھ کو فارغ ہوئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ غزوہ بدر اور غزوہ قینقاع کی درمیانی مدت ۱۵ دن ہے۔ اس قلیل مدت میں تمام یہود کا بدر کے اثرات کو قبول کر کے آمادہ اطاعت ہو جانے سے اس دستاویز کی تحریر نا قابل فہم معلوم ہوتی ہے۔

۵: اگر یہ مان لیا جائے کہ جنگ بدر کی دھاک یہود پر بیٹھ گئی اور انھوں نے یہ محسوس کیا کہ وہ بے یار و مددگار ہو گئے ہیں تو پھر انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے خلاف جارحانہ اقدام کی جرات کیوں کی؟ اور نہایت گستاخی سے یہ کہہ کر دعوت مبارزت کیوں دی کہ ''اے محمد! تم سمجھتے ہو کہ ہم بھی تمھاری قوم کی طرح ہیں تم کہیں گھمنڈ میں مبتلا نہ ہو جانا۔ تم نے تو ایسے لوگوں سے مقابلہ کیا تھا جو جنگ سے واقف نہ تھے اس لیے ان پر غلبہ پا لیا لیکن ہم ایسے نہیں ہیں۔ واللہ ہمیں تم سے لڑنے کی نوبت آئے گی تو تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ ہم کون لوگ ہیں!۔

تمام مورخین اسے منشور کی بہ جائے معاہدہ سمجھتے ہیں۔ اس بات پر بھی متفق ہیں کہ بنی قینقاع نے یہ گستاخی کر کے دراصل عہد شکنی کا ارتکاب کیا تھا۔ اس منشور کو پس پشت ڈال دیا تھا جسے انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی آمد مدینہ کے بعد خود تسلیم کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ بنی قینقاع کے خلاف بدعہدی اور دستور شکنی وغیرہ کا الزام اسی صورت میں قابل فہم ہو سکتا ہے جب کہ بدر سے پہلے وہ کسی عہد کے پابند ہوئے ہوں۔ اگر بدر سے پہلے وہ کسی تحریر کے پابند نہیں ہیں تو پھر بدعہدی کا الزام کس بات پر ہے؟ حال آنکہ ان پر یہ الزام غزوہ بدر کی وجہ سے عائد کیا گیا کیوں کہ اس جنگ میں منشور مدینہ کی رو سے یہود نے مسلمانوں سے نہ تعاون کیا اور نہ ہی خیر خواہی برتی اور اس پر متنبہ کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ کا صحابہؓ کے ساتھ جب ان کے محلّہ میں تشریف لے گئے تو انھوں نے وہ گستاخانہ جواب دیا جس کا ذکر اوپر ہوا ہے پھر معاً ایک مسلمان عورت کی بے حرمتی ان کے خلاف چارہ جوئی کا فوری سبب بن گئی۔ اپنوں کی سن لیں شاید سمجھ آجائے۔

سر ولیم میور کی رائے: وہ کہتا ہے کہ ''یہ تحریر ہجرت مدینہ کے زیادہ دنوں بعد کی نہیں ہو سکتی کیوں کہ بہت تھوڑے سے ابتدائی عرصہ کے لیے یہود مدینہ اور رسول اللہ ﷺ کے تعلقات دوستانہ رہے لیکن کچھ ہی مدت کے بعد یہ ظاہر ہو گیا کہ یہودیت اور اسلام میں کوئی مطابقت نہیں ہو سکتی۔ اس لیے یہود نے جانتے

بوجھتے اپنی ضد، ہٹ دھرمی اور اپنے مذہب کی اندھی تقلید میں رسول اللہ ﷺ کو مسترد کر دیا''۔(ن ۵۔۱۰۲۔۱۰۳) قرآن کے وہ حصہ جو اس زمانہ میں نازل ہوئے ان میں بھی اسی کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ یہود نے جانتے بوجھتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے دین سے اعراض کیا تھا۔ چناں چہ اس کے بعد صرف یہودیت اور اسلام کا تصادم صاف ظاہر ہو گیا بل کہ اس سے یہودیوں کو اپنی بے جا توقعات کا انجام بھی معلوم ہو گیا۔ اسی لیے وقت گزرنے کے ساتھ یہود کا طرزِ عمل مخالفانہ اور معاندانہ و مخاصمانہ ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ پھر یہ خلیج اتنی بڑھی جس کا پر کرنا ممکن نہ تھا۔ بہ ہر حال ان دلائل کی روشنی میں یہ کہنا صحیح معلوم نہیں ہوتا کہ یہ تحریر جنگ بدر کے بعد کی ہے۔

اعتراض نمبر ۲۳۸

''واٹ'' کہتا ہے کہ ''چوں کہ اس منشور میں یہودیوں کے تین قبائل کا نام مذکور نہیں اس لیے اس کا زمانہ تحریر بنو قریظہ کے استحصال کے بعد ہوگا۔

جواب: یہ بات مندرجہ ذیل وجوہ سے قابل قبول نہیں ہو سکتی۔

۱: اگر یہود کے بعض قبائل کا ذکر نہیں ہے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ یہودی بہ حیثیت جماعت کے اس منشور کے مخاطب نہیں ہیں کیوں کہ پھر اس صورت میں تو مہاجرین کے قبائل کا بھی انفرادی اعتبار سے ذکر نہیں ہے۔ اور انصار کے جن قبائل کا ذکر کیا گیا ہے وہ اوس و خزرج کی بعض شاخیں ہیں۔ اس کے معنی یہ استدلال صحیح ہے تو ظاہر ہے کہ جس طرح انصار کے چند قبائل گنا کر تمام مراد لیے گئے ہیں اسی طرح یہود کے چند قبائل کا تذکرہ کیا پوری جماعت یہود کا قائم مقام نہیں بن سکتا؟

۲: اس دستاویز کا سرنامہ اصولی طور پر تین جماعتوں پر رسول اللہ ﷺ کے سیاسی، قانونی اور معاشرتی اقتدار کو ثابت کرتا ہے اس کے الفاظ میں اتنی عمومیت موجود ہے کہ بغیر نام لیے اس میں وہ تمام افراد شامل ہو جاتے ہیں جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ: ''ومن تبعھم فلحق بھم و جاھد معھم''۔ اس صریح کنایہ کے علاوہ اس دستاویز کی ایک دفعہ ۲۸ دلالت کرتی ہے کہ یہود کو ملی جماعت کی حیثیت سمجھا گیا جو ظلم و عہد شکنی کا ارتکاب کرے گا تو اس کے تمام نتائج کی ذمہ داری اور وبال خود اس کے اور اس کے خاندان کے علاوہ کسی دوسرے پر نہ ہوگا۔ چناں چہ آئندہ پیش آنے والے تاریخی واقعات اس کی تصدیق کرتے ہیں مثلاً جب کسی بھی ایک یہودی قبیلہ یعنی بنی قینقاع یا بنو قریظہ کے خلاف رسول اللہ ﷺ کی طرف سے کارروائی کی گئی تو دوسرا قبیلہ خاموش رہا اور اس نے کسی قسم کا احتجاج نہ کیا۔ یہ واقعات اس بات کا ثبوت ہیں کہ خود یہودی بجا طور پر اس دستاویز کا اپنے آپ کو پابند سمجھتے تھے۔ اس لیے ان میں کسی بھی متاثرہ قبیلہ نے رسول اللہ ﷺ سے یہ اعتراض نہیں کیا کہ وہ ان کے خلاف کس ضابطہ اور اختیار کی رو

سے اقدام کر رہے ہیں، نہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ ''ہم تو آپؐ کے حکم کے پابند نہیں ہیں'' حال آنکہ اگر واٹ کا قیاس درست مانا جائے تو اس صورت میں ایک طرف اس قسم کا اعتراض یہود کی طرف سے لامحالہ پیش کیا جاسکتا تھا اور دوسری طرف یہ تینوں مشہور قبائل یہود رسول اللہ ﷺ کے خلاف مشترکہ محاذ بنا کر پیش قدمی یا کارروائی کر سکتے تھے اور ایک دوسرے سے مل کر اقدام کی صورت میں مدد بھی طلب کر سکتے تھے لیکن چوں کہ اس قسم کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا اس لیے واٹ کا قیاس تاریخی اعتبار سے ناقابل قبول ٹھہرتا ہے۔ اس دستاویز کی شق ۱۷ ہے کہ ''یہودیوں میں سے جو بھی ہمارا اتباع کرے گا تو اسے مدد اور مساوات حاصل ہوگی۔ ان پر نہ تو ظلم کیا جائے گا اور نہ ان کے خلاف کسی دشمن کو مدد دی جائے گی نیز دفعہ ۴۴ میں ہے کہ مومنین جب تک جنگ میں مصروف رہیں گے جنگی اخراجات میں یہودی ان کے شریک رہیں گے''۔ یہ سوال بھی غور طلب ہے کہ یہ منشور بالفرض محال اگر استیصال بنی قریظہ کے بعد منعقد ہوا تو بنو قینقاع خود بنی نضیر کے مدینہ سے نکالے جانے کی بنیاد کیا ہے، نیز بجائے اس کے کہ تمام یہود کا اخراج ایک ہی بار ہو اس طرح دو یا تین وقفوں کے ساتھ ان کے خلاف کارروائی کیوں کی گئی۔ یہ بنیاد ظاہر ہے کہ منشور مدینہ ہی ہوسکتی ہے جو یقیناً ان سب واقعات پر تقدم زمانی رکھتا ہے۔ (ن۔۱۰۵۔۱۰۳)

آپؐ نے نہ صرف مدینہ کی تمام جماعتوں سے قریش کے خلاف یہ مخالفت حاصل کی بل کہ مدینہ سے لے کر ینبوع کی بندرگاہ تک کے علاقے میں رہنے والے قبائل کو معاہدات کے ذریعے اپنے ساتھ ملا لیا یا امان نامے دے کر اپنے اختیار کو منوا لیا یا پھر انھیں قریش کی حمایت سے کنارہ کش رہنے پر آمادہ کر لیا، یہ کارنامہ آپؐ نے صفر تا جمادی الآخر ۲ھ کی قلیل مدت میں انجام دیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ قریش کی پہلی باقاعدہ جنگ غزوہ بدر سے تقریباً اڑھائی ماہ پہلے اور منشور مدینہ کی تحریر و تصوید کے چھ ماہ بعد کے دوران یہ تمام کام انجام طے پایا گیا۔ ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دستاویز جنگ بدر سے پہلے اور ہجرت مدینہ کے بعد ابتداء ہی میں مرتب کی گئی تھی۔ حضرت انسؓ کے ایک بیان کے مطابق یہ دستاویز ان کے والدین کے گھر لکھی گئی تھی جس کا مطلب یہ ہے کہ مدینہ میں مسجد نبوی کی تعمیر سے پہلے مرتب ہوئی تھی۔

منٹگمری واٹ کا ایک اور شوشہ چھوڑنا: کہتا ہے کہ یہ دستور غزوہ خندق اور بنو قریظہ کے اخراج کے بعد مرتب ہوا۔

جواب: یہ نظریہ سراسر باطل ہے اور تاریخی اعتبار سے خلاف حقیقت ہے کیوں کہ غزوہ بدر کے بعد بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ کے یہود مدینہ چھوڑ چکے تھے اور یہودیوں کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ایسی صورت میں یہود سے متعلق دستور میں دفعات کی ضرورت کیا تھی؟ واٹ نے اپنے نظریہ کی بنیاد دستور کی لسانی نوعیت اور دفعات کے اعادے پر رکھی۔ جو دلائل دیئے وہ بے بنیاد پائے گئے ہیں۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ: ان کے نزدیک بدر کی شان دار فتح رسول اللہ ﷺ کا قرب و جوار کے قبائل بنو

ضمرہ اور جہینہ سے اتحاد، یہودی قبائل کی رقابت ایسی وجوہ تھیں جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کا تعاون حاصل کرنے پر مجبور کیا حال آنکہ یہ بات بھی درست نہیں کیوں کہ یہود نے غزوہ بدر کے بعد تو نقص عہد کرنا شروع کر دیا تھا جس کی پاداش میں وہ جلا وطن ہوئے تھے۔ مذکورہ مصنفین نے اپنے نظریات کی بنیاد کسی مستند تاریخی شہادت سے نہیں کی۔ اس کے برعکس متذکرہ دور کے حالات یقیناً ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ بدر سے پہلے زمانہ ہی یہود کے لیے بدر کے بعد کے زمانہ سے بہتر تھا کہ وہ اس دستور میں حصہ لیں اور اس کے متن کی پابندی کریں۔

قرآن پاک سے ثابت ہے کہ یہود کو توقع تھی کہ جب پیغمبر آئے گا جس کا ذکر DEUT۱۸۔۱۸ میں ہے تو وہ ان کو کفار پر فتح مند کرے گا۔" ولما جاء هم كتب من عند الله مصدق لما معهم و كانوا من قبل يستفتحون على الذين كفروا" ۔(البقرہ۔۸۹) "اور ان کے پاس اللہ سے ایک کتاب آئی اس کی تصدیق کرتی ہوئی جو ان کے پاس موجود ہے اور اس سے پیش تر وہ دعا کرتے تھے کافروں پر فتح کے لیے"۔ ان توقعات پر یہودیوں نے رسول اللہ ﷺ کی مدینہ آمد پر اپنی امداد پیش کی۔

صحت متن: دستور مدینہ ایک مکمل دستاویز ہے۔ ابن اسحاق کے علاوہ معتبر راویوں نے اس کا پورا متن بیان کیا ہے۔ اس دستور کی خاص دفعات صحاح میں روایت کی گئی ہیں۔ امام احمد بن حنبل کی مُسند، سنن دارمی اور عبد الرزاق کی المصنف میں اس کا حوالہ ملتا ہے۔ مورخین میں ابن سعد، المقریزی، الرازی، الخطیب، المقدسی، زرقانی اور المقریزی نے روایت کیا ہے۔

مستشرقین کی نظر میں میثاق مدینہ: میثاق مدینہ کی صحت کے متن کے حوالہ سے ویلہازن نے اس دستاویز کا مطالعہ کر کے اس کے مستند ہونے کے دلائل پیش کیے ہیں۔ واٹ بھی اس کی صحت کو تسلیم کرتا ہے۔

اعتراض نمبر ۲۳۹

حافظ ابن حجر ایک محتاط نقاد نے بغیر وجوہ بیان کیے اس کی صحت کے متعلق استثناء کا اظہار کیا ہے۔ وہ دستور کی دفعہ ۲۶ کو قبول نہیں کرتے جس میں یہود مومنین کے ساتھ ایک امت کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے۔ (وان یھود بنی عوف امۃ مع المومنین)

جواب: یہاں امت سے مراد ایک سیاسی وحدت ہے۔ یہود توحید الٰہی کے قائل تھے ایک خدا پر ایمان رکھتے تھے۔ ان کے مقابلے میں مشرکین اور کفار مدینہ تھے جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ دستور مدینہ کے مطالعہ سے اور اس کی داخلی خارجی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دستور ایک مستند دستاویز ہے۔ اس میں اسلام کے بنیادی اصولوں کا اقرار ہے، خلاف نہیں۔ قدیم ترین تین براعظموں کے غیر مسلموں سے مسلمان حکمران ویسا ہی سلوک روا رکھتے تھے جو دستور مدینہ کی دفعات میں ذکر کیا گیا ہے۔ (ن۔۱۱۔۶۳۰)

ویلہازن کہتا ہے کہ ''مکمل حاکمانہ اختیارات کے ساتھ پہلا عربی معاشرہ حضرت محمدؐ کے ہاتھوں شہر مدینہ میں قائم ہوا لیکن خون کی بنیاد پر نہیں جو لامحالہ اختلافات کو جنم دیتا ہے بل کہ دین کی بنیاد پر جس کا اطلاق ہر فرد پر یکساں ہوتا ہے۔ (ن ۵۔۱۰۸)

" THE first Arabic community with sovereign-power was established in the city of Madina, no up on the basis of blood with naturally tends to diversity, but upon that of religion which is actually binding on all"

Hell میثاق مدینہ کو سیاست نبوی کا اعجاز قرار دیتے ہوئے لکھتا ہے ''ایک عرب باشندہ کو پہلے اپنے خاندان یا سرپرست کے علاوہ کسی اور کی پناہ یا تحفظ حاصل نہ تھا لیکن (حضرت) محمدؐ نے یہ یک جنبش اپنے آپ کو اس دائرہ سے نکال لیا اور اس قدیم جاہلی تصور سے بھی نجات پائی جس کے زیر اثر اہل مکہ ان کے خلاف جبر و تشدد کی انتہائی پالیسی اختیار کرنے سے ہچکچاتے رہے اور اس طرح انھوں نے پرانے رشتوں کو معطل کر دیا، قدیم خلیجوں کو پاٹ دیا اور ہر مسلمان کو پوری امت مسلمہ کا اجتماعی تحفظ عطا کیا''۔ (حوالا بالا)

''نکلسن'' میثاق مدینہ کے متعلق کہتا ہے کہ ''مبینہ طور پر یہ ایک محتاط اور ماہرانہ اصلاح بل کہ در حقیقت ایک انقلاب تھا۔ حضرت محمدؐ نے قبائل کی خود مختاری پر نہ صرف یہ کہ کھلم کھلا ضرب لگائی بل کہ اس کو ختم کر دیا اور انجام کار مرکزِ قوت قبیلہ سے معاشرہ کو منتقل کر دیا۔ معاشرہ میں اگرچہ مسلمان، یہود اور مشرک سبھی شامل تھے اور وہ اسے اچھی طرح جانتے تھے اور جسے ان کے دشمن نہ دیکھ سکے مگر ان کی نگاہ دور رس نے دیکھ لیا تھا کہ نئی بننے والی ریاست میں مسلمان ہی نہ صرف فعال بل کہ اس کا غالب حصہ ہوں گے۔

''وان کریمر'' کہتا ہے ''آنحضرتؐ کی یہ خواہش تھی کہ ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالیں اور اس میں وہ کامیاب ہوئے لیکن اس کے ساتھ ہی ایک ملکی انتظام بھی انھوں نے پیدا کیا جو بالکل جدید اور خالص صورت رکھتا تھا۔ پہلے ان کی صرف یہ خواہش تھی کہ اپنے ملک والوں کو ایک خدا یعنی اللہ کے اوپر ایمان لائیں لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے اپنے وطن کی قدیم طرز حکومت کو بدل دیا اور ایسی عمل داری کی جگہ جس میں قبیلوں کے امیر سردار حکومت کا کام کریں اور با اختیار خاندان پبلک کاموں میں حصہ لیں۔ انھوں نے ایک خالص خود مختار بادشاہی کو قائم کر دیا اور خود ہی اس کے بادشاہ بہ طور زمین پر خدا کے نائب ہو گئے۔ اگرچہ اس بیان کے ہر حصہ سے کلی اتفاق نہیں ہے مگر اس کا مدعا یہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہر حال ایک ریاست کو بالفعل قائم فرما دیا اور وہ منشور مدینہ کے اجراء سے ایک صحیح اور متعین خطوط پر گامزن ہو گئی''

ایک شبہ کا ازالہ: دستور مدینہ کی دفعات کی تعداد کتنی ہے؟ ویلہازون نے کچھ لکھی ہیں ڈاکٹر حمید اللہ نے کچھ۔ حقیقت کیا ہے؟ دستور میں پچاس دفعات ہیں۔ مستشرقین نے ویلہازون کی پیروی کرتے ہوئے انھیں سنتالیس شمار کیا ہے۔ بعض دفعات کو دوسری دفعات کا حصہ قرار دیا گیا ہے۔ حال آنکہ وہ بالکل جدا اور علیحدہ ہیں۔ اس لیے انھیں الگ گنا گیا ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے باون شقیں تسلیم کی ہیں مگر یورپی مصنفین کے ساتھ مطابقت کی خاطر انھوں نے بعض شقوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا اور الف، ب سے نشان زد کر دیا۔

مذکور اختلاف سے ہٹ کر اس کی پچاس دفعات ہیں۔ ان میں سے کئی کو جدید دستور سازی اور قانونی ضابطوں کے مطابق پیروں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔

ا: دستور کی سب سے پہلی شق ''یہ ایک دستور ہے'' کو دفعہ نمبر ایک شمار کیا گیا ہے۔ جب کہ واٹ اسے چھوڑ دیتا ہے اور اسے کوئی نمبر الاٹ نہیں کرتا۔ وہ اسے ابتدائیہ تصور کرتا ہے حال آنکہ ایسا نہیں ہے کیوں کہ دستور کے اجزاء دستاویز کا ناگزیر حصہ ہیں۔

دستور کی شق ''کوئی مومن کسی دوسرے مومن ۔۔۔ اپنا حلیف نہیں بنائے گا۔۔۔۔'' دفعہ نمبر ۱۳ ہے۔ یہ مکمل دفعہ ہے۔ محمد حمید اللہ مستشرقین کی گنتی کے خلاف اسے دفعہ نمبر ۱۲ کہتا ہے۔

دستور کی شق ''مومنین، متقین، احسن اور اقوام ہدایت پر ہیں''۔ دفعہ نمبر ۲۰ کا پیرا (۲) ہے کیوں کہ اس کے اصل موضوع مومنین کا ذکر اسی دفعہ کے پیرا (۱) میں موجود ہے۔ واٹ نے بھی اسے یوں ہی پڑھا ہے مگر محمد حمید اللہ نے اسے اگلی جداگانہ دفعہ کو اس کا پیرا (ب) شمار کرتے ہوئے الگ ایک دفعہ شمار کیا ہے۔

دستور کی شق ''! ''اگر کوئی شخص خون ریزی کرے گا تو وہ اپنے آپ کو۔۔۔'' دفعہ ۳۸ ہے۔ حمید اللہ نے اور واٹ نے اسے قبل ازیں دفعہ کے حصہ کے طور پر پڑھا ہے حال آنکہ یہ ایک مکمل دفعہ ہے۔

دستور کی شق ''ہر گز وہ اپنے حصہ کا ذمہ دار ہوگا جو اس کی جانب ہوگا'' دفعہ نمبر ۴۸ ہے''۔ یہ ایک الگ دفعہ ہے کیوں کہ یہ اپنی جگہ بالذات اور مکمل ہے۔ اس کو اس سے پہلی دفعہ کا حصہ نہیں مانا جا سکتا کیوں کہ وہ تمام فریقین کے ایک صلح نامہ میں شرکت کا ذکر کرتی ہے۔ (ن۔۱۱۔۶۳۳)

اعتراض نمبر ۲۴۰

ا: منشور مدینہ میں آپؐ کا مقام و مرتبہ متعین نہ تھا۔

۲: میثاق مدینہ کے تحت آپؐ کے اختیارات اتنے معمولی تھے کہ آپؐ کی مدنی زندگی کے ابتدائی ایام میں اس سے کم اختیارات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ (ضیاء النبی۔۷۔۲۲۶)

۳: میثاق مدینہ میں مہاجرین کو مدینہ کے قبائل کے برابر ایک قبیلہ ظاہر کیا گیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپؐ مدنی قبائل کے سرداروں کے برابر سردار تھے۔ (حوالہ بالا)

جواب: سربراہ ریاست:۔ دستور مدینہ کی شق نمبر ۴۴ میں ہے کہ ''جب کبھی کسی کو صحیفہ والوں کے درمیان کوئی حادثہ پیش آئے یا کوئی تنازعہ اٹھ کھڑا ہو جس سے فساد کا اندیشہ ہو تو اس کا حوالہ اللہ عزوجل کی طرف اور اس کے رسول کی طرف کرنا ہوگا۔ مذکور شق کے تحت آپؐ سربراہ مملکت ہیں۔ سب وفاقی وحدتوں کو پابند بنایا گیا کہ کوئی حادثہ یا کوئی تنازعہ اٹھ کھڑا ہو اور فساد کا خطرہ لاحق ہو تو ان تمام اختلافات میں ریاست کے سربراہ یعنی رسول مقبول ﷺ کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ اس طرح اندرونی امن وامان کے مسائل اور بیرونی حرب وجنگ، صلح وآشتی کے مقدمات آپؐ کو پیش کیے جائیں گے۔ شق نمبر ۱ میں ''ھذا کتاب من محمد النبی'' سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپؐ کو برابر فریق کے نہیں بل کہ دستور ساز اتھارٹی کے طور پر قبول کیا گیا ہے۔ نیز فریقین نے انھیں نبی بھی تسلیم کیا۔

منتظم اعلیٰ: منشور کی دفعہ ۳۷ میں ہے کہ ''ان میں کوئی بھی محمد رسول اللہ ﷺ کی اجازت کے بغیر جنگ کے لیے نہیں نکلے گا۔ ۲: کسی کو زخم کا بدلہ لینے سے روکا نہیں جائے گا۔ آپؐ جنگ کے معاملات میں مختار کل ہیں۔ کسی فرد یا گروہ کو جنگ چھیڑنے کی قطعاً اجازت نہیں۔ کسی بھی شخص یا جماعت کے خلاف کارروائی آپ کے حکم وفرمان کے بغیر نہیں کی جاسکے گی۔ آپ کو یہ اختیار سربراہ ریاست کی حیثیت سے حاصل ہیں۔ آپؐ آخری اتھارٹی ہیں۔

چیف جسٹس: دستور کی دفعہ ۲۴ میں یہ الفاظ ہیں'' مھما اخلفتم فیہ من شی'' اور ''اشتجار'' (دفعہ ۴۴)۔ جامع قانونی اصلاحات میں ان کے دائرہ کار میں سیاسی، معاشرتی، انتظامی، قانونی اور عدالتی تنازعات ومعاملات آتے ہیں۔ ان دفعات کی رو سے آپ ریاست کے منصف اعلیٰ قرار پاتے ہیں۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ دستوری دفعات کی پابندی سب پر حتیٰ کہ حاکم ریاست پر بھی مساوی طور پر لازمی تھی۔ گویا کوئی بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھا۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ آپؐ مختار کل تھے جو چاہتے کرتے تھے کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ یہ خیال محض باطل ہے۔

اہم نکتہ: یہ بات قابل غور ہے اور نہایت اہمیت کی حامل ہے کہ یہودیوں اور مشرکین نے اس دستور میں شامل ہو کر آپؐ کی آئینی حیثیت کو تسلیم کرلیا اور دستور مدینہ میں آپؐ کی رسالت کے ذکر پر بھی کسی نے اعتراض نہیں کیا ہے۔ جب کہ دوسری طرف تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ دستور مدینہ کی تدوین کے چھ سال بعد حدیبیہ کے معاہدہ کی تحریر کے وقت قریش مکہ نے آپؐ کی رسالت سے انکار کر دیا اور معاہدہ حدیبیہ میں محمد رسول اللہ ﷺ کی جگہ محمد بن عبداللہ لکھا گیا۔ گویا ابھی تک قریش آس لگائے بیٹھے تھے کہ یہ نیا دین پنپ نہیں پائے گا۔ آخر ان کے پیروکار ان کے دین کی طرف لوٹ آئیں گے۔ یہ ان کی بھول تھی کیوں کہ معاملہ اس کے برعکس برآمد ہوا۔

قبائلی لوگوں کے اسلام میں داخل ہونے سے قبائلی نظام توڑ پھوڑ کا شکار ہو چکا تھا۔اس کا شیرازہ بکھر گیا تھا۔اس نظام کے درہم برہم ہونے پر غیر مسلم اور مشرکین کو اپنے معاملات و تنازعات کے فیصلوں میں مشکل پیش آئی۔دوسری طرف دستور کی شق نمبر ۴۴ میں واضح کر دیا کہ اپنے تمام تنازعات اور مسائل کا حل مرکزی نظام عدل اور مرکزی حکومت سے حل کیا جا سکتا ہے۔صرف اس شرط پر کہ وہ ریاست کے سیاسی میدان میں کوئی مداخلت نہ کریں گے اور نہ کوئی رکاوٹ کھڑی کریں گے۔اس سے امن وامان قائم ہو گیا اور قبائلی نظام کا خاتمہ ہو گا۔اب مرکزی نظام عدل اور مرکزی حکومت کے سربراہ سرکار دو عالمؐ تھے۔اس طرح واٹ کا یہ کہنا کہ ''میثاق مدینہ میں مہاجرین کو مدینہ کے قبائل کے برابر ایک قبیلہ ظاہر کیا گیا ہے'اس سے پتہ چلتا ہے کہ محمدؐ مدنی قبائل کے سرداروں کے برابر کے ایک سردار تھے' غلط ہے کیوں کہ آپؐ تمام قبائل کی وحدت کے سردار تھے اور برابر قبیلہ ظاہر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی فرد واحد' گروہ' جماعت' قبیلہ قانون سے بالاتر نہیں تھا۔قانون کے آگے سب برابر تھے۔کسی کو استثناء حاصل نہ تھا۔واٹ نے صرف آپؐ کی عزت گھٹانے کی خاطر یہ الزام دھرے ہیں اور جس طرح ''واٹ'' تقابل کر کے آپؐ کی شان کم کرنے کی کوشش کرتا ہے یہ اس کی نہایت بھونڈی تاویل اور مکارانہ چال ہے۔

سرداری نظام تو چل بسا اس کی بساط لپیٹ دی گئی مگر یہ الگ بات ہے کہ آپؐ نے تنازعات اور اہم معاملات میں دستور میں شامل گروہوں سے مشاورت کی۔بنی قریظہ کی قسمت کا فیصلہ ان کے حلیف قبیلہ کے ایک ثالث سے کرانے کی اجازت دی۔قانون کی بالادستی قائم کی اور ساتھ ہی ساتھ لوگوں کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات کے مطابق فیصلے کرنے کی ترغیب بھی دی اور سختی سے اس پر خود بھی کاربند رہے اور دوسروں کو بھی پابند بنایا۔آپؐ کی حیثیت مرکزی تھی جو تمام پر محیط تھی۔واٹ جیسے طرف دار کی یہ بات برمبنی حق نہیں جسے قبول کیا جا سکے۔

اعتراض نمبر ۲۴۱

''البتہ آپ خود مختار حکمران ہونے سے کوسوں دور تھے۔آپ متعدد اہم آدمیوں میں سے ایک تھے۔مدنی زندگی کے پہلے سال میں غالباً کئی دوسرے آدمی آپؐ سے زیادہ با اثر تھے۔میثاق مدینہ کی یہ شق کہ تنازعات کی شکل میں آپ کی طرف رجوع کیا جائے گا بذات خود آپ کے زیادہ با اختیار ہونے کا ثبوت نہیں جب تک کہ آپ تنازعات کا فیصلہ اپنی بصیرت اور عقل مندی سے اس طرح نہ کرتے کہ وہ عام لوگوں میں مقبولیت حاصل کر لیتا''۔

جواب:اس بات پر مسلمان یقین رکھتے ہیں کہ آپؐ ایسے خود مختار حکمران نہ تھے کہ کسی فرد کی جائز رائے قبول نہ کرتے تھے یا کسی کو رائے دینے کا حق حاصل نہ تھا' یا تمام فیصلوں کو خود ہی اپنی مرضی

سے انجام فرماتے تھے اور کسی کے مشورہ کی ضرورت محسوس نہ کرتے تھے۔آپؐ ڈکٹیٹر (Dictator) نہیں تھے بل کہ اللہ کے نبی تھے اور وہی کیا جو انصاف کا تقاضا تھا۔آپؐ نے فرمایا کہ میں بادشاہ نہیں ہوں ڈرو نہیں میں تو اس ماں کا بیٹا ہوں جو خشک گوشت کھایا کرتی تھی۔

حضور ﷺ کا معمول تھا کہ آپؐ اہم مسائل صحابہ کرام کی مشاورت سے کرتے تھے۔مثلاً بنو قریظہ کا فیصلہ آپؐ نے خود نہیں فرمایا بل کہ ان کے حلیف قبیلہ کے سردار نے کیا اور اپنے پیروؤں کے جذبات کو مدنظر رکھا تھا۔آپؐ ڈکٹیٹر نہ تھے اللہ کے نبی تھے یہاں واٹ ایک اور اعتراض کی طرف اشارہ کرتا ہے وہ یہ کہ واٹ کو جابر حکمرانوں جیسی سختی نظر نہیں آتی تو اسے آپ کی کم زوری قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ "یہ اس حقیقت کی واضح مثالیں ہیں کہ کس طرح مدینہ کے قبائل کے سرداروں نے اپنے اکثر اختیارات اپنے پاس رکھے تھے اور اس طرح محمدؐ کے اختیارات کو کم کر دیا تھا۔اس حقیقت کی مثالیں صرف یہی نہیں ہیں بل کہ یہودیوں پر آپ کے جسمانی حملوں کی ساری کہانی قبائل کے باہمی تعلقات کے پس منظر کا پتہ دیتی ہے اور بتاتی ہے کہ کس طرح نمائندے چننے سے پہلے ان تعلقات کو پیش نظر رکھنا پڑتا تھا۔محمدؐ بہت سارے اتحادی گروہوں میں سے ایک گروہ کے سردار نظر آتے ہیں اور کوئی چیز ایسی نظر آتی نہیں جو انھیں دوسرے سرداروں سے ممتاز کر دے"۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہجرت کے بعد مدینہ کے قبائل بھی قائم رہے اور ان قبائل کے سردار بھی سردار رہے اور آپ قومی امور سے متعلق ان کا مشورہ بھی لیتے تھے۔ یہ باتیں مستشرق بڑی آب و تاب سے بیان کرتے ہیں۔مقصد ان کا یہ ہوتا ہے کہ کھینچ تان کر کوئی نہ کوئی آپؐ کی تنقیص کا پہلو نکالیں لیکن ان تاریخی واقعات و حقائق سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں کہ وہ مشیر آپؐ کو کیا جواب دیتے تھے۔بیعت عقبہ کے موقعہ پر اوس و خزرج کے آدمیوں نے کہا "ہم ان لوگوں کی طرح نہیں ہوں گے جنھوں نے حضرت موسیٰؑ سے کہا تھا "تم اور تمھارا خدا جاؤ اور لڑو ہم تو یہاں بیٹھے ہیں" بل کہ خدا اور خدا کا رسول چلیں اور ہم آپ کے ساتھ چلیں گے۔ ہماری بات آپؐ کے تابع ہوگی۔یہ کلمات اوس و خزرج کے سرداروں کی زبان سے اپنے آقا کریم کی شان و عزت میں کہے گئے تھے۔

بنو قینقاع اور بنو نضیر کی جلا وطنی کے فیصلے میں آپؐ کی نمایاں حیثیت تھی۔اور یہ بھی درست ہے مخالفت کی کہ یہود کے خلاف یہ فیصلہ مناسب نہیں۔اس پر نبی مکرمؐ کی عدل گستری اور غیر جانب دارانہ انصاف کا یہ عالم کہ بنو قریظہ کی قسمت کا فیصلہ ان کے اپنی مرضی کے ثالث سے کرواتے ہیں۔ثالث پر اعتراض نہیں کرتے۔آپؐ اگر ثالثی قبول نہ فرماتے تو کوئی امر مانع نہ تھا لیکن آپؐ نے ان کے منتخب کردہ جج کے فیصلہ پر اتفاق فرمایا۔ایسی بھی دنیا بھر میں کہیں روشن مثال ملتی ہے؟ ارشاد خداوندی ہے "پس اگر وہ آپ کے پاس

آئیں ان کے درمیان فیصلہ کیجئے یا ان سے منہ موڑ لیجئے‘ اگر آپ ان سے منہ موڑ لیں تو وہ آپ کو قطعاً نقصان پہنچا نہیں سکیں گے اور اگر آپ فیصلہ کریں تو ان کے درمیان انصاف سے فیصلہ کیجئے‘ بے شک اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے‘‘۔(۵۔۴۲)

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ قبائلی سرداروں کے پاس اختیارات تھے اور آپؐ کے محدود اختیارات تھے یا تنازعات کی شکل میں رجوع (مشورہ) کرنے سے آپ کے با اختیار ہونے کا ثبوت نہیں‘ جب آپ خود تنازعات کا فیصلہ اپنی بصیرت و عقل مندی سے اس طرح نہ کریں کہ عوام میں مقبولیت ہو تو اس کے جواب میں مندرجہ ذیل چند واقعات کو بہ غور پڑھ لینا چاہیے۔

مسلم اور یہودی کا جھگڑا: ایک مرتبہ ایک یہودی انصاری (مسلمان) پیغمبروں میں افضلیت پر بحث کر رہے تھے۔ دوران بحث یہودی نے حضرت موسیٰؑ کو اس انداز میں پیش کیا جیسے وہ محمدؐ سے افضل ہوں۔ انصاری یہ برداشت نہ کر سکے اسے تھپڑ دے مارا۔ یہودی نے اس کے خلاف اللہ کے رسول کی عدالت میں اپنا مقدمہ پیش کیا۔ فریقین کی باتیں سن کر رسول اللہ ﷺ نے مقدمہ کا فیصلہ یہودی کے حق میں دیا اور نصیحت کی ’’دوسرے پیغمبروں میں میری فوقیت میں مبالغہ نہ کرو۔ روز قیامت سب لوگ بے ہوش ہو جائیں گے۔ میں جاگنے والوں میں سب سے پہلا ہوں گا اور دیکھوں گا کہ حضرت موسیٰؑ اللہ تعالیٰ کے تخت کے برابر کھڑے ہیں‘‘۔

نوجوانوں کا یہودیت قبول کرنے کا تنازع: بنو نضیر کی جلاوطنی پر یہود و نصاریٰ میں اس بات پر اختلاف اور تنازعہ ہوا کہ آیا انصار کے وہ نوجوان جنھوں نے یہودیت اختیار کر لی تھی یہودیوں کے ساتھ جائیں گے یا اپنے والدین کے ساتھ رہیں گے؟ مقدمہ ریاست مدینہ کے سربراہ اور عدالتی منتظم اعلیٰ رسول اللہ ﷺ کی عدالت میں پیش ہوا۔ یہ سیاسی سماجی مسئلہ تو تھا نہیں بل کہ سراسر مذہبی مسئلہ تھا جس پر وحی الٰہی کی ہدایت کی ضرورت پیش آئی۔ اس پر قرآن پاک کی یہ آیت نازل ہوئی۔ ’’لا اکراہ فی دین‘‘ (دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں) آپؐ نے اس کے مطابق فیصلہ فرما دیا۔ اگر ان قبائلی سرداروں کے پاس اختیارات تھے تو آپ محدود اختیارات کے مالک تھے تو آپؐ کی عدالت میں مقدمہ کیوں لایا گیا اور آپ سے فیصلہ کے متمنی کیوں کر ہوئے؟ مستشرقین اس سے بڑھ کر آپؐ کے اختیارات اور کس قسم کے چاہتے ہیں؟ بالفرض قبائلی سرداروں کے پاس اختیارات مان لیں تو ایسے فیصلوں پر وہ کیا کرتے جن کا حل سوائے وحی کے ممکن نہیں تھا۔ باقی رہا واٹ کا یہ کہنا کہ اپنی بصیرت و عقل مندی سے کریں جو عام میں قبول ہوں۔ یہاں بھی واٹ نے ڈنڈی ماری ہے اور نبی مکرم پر وحی کے نزول کا منکر ہو جاتا ہے۔ اس نے صرف بصیرت و عقل مندی کا تنازعات کے حل اور فیصلہ کے لیے ذکر کرتا ہے جب کہ آپؐ تو وہ ہیں ’’وما ینطق۔۔۔یوحیٰ‘‘۔ لہٰذا اپنی بصیرت و عقل مندی کے ساتھ وحی الٰہی کو بھی تسلیم کرنا ناگزیر ہے۔ جسے واٹ گول کر جاتا ہے۔

یہ بھی یاد رہے کہ دستور مدینہ میں یہودیوں کو مذہبی آزادی کی ضمانت حاصل تھی۔ دفعہ ۲۶ میں ہے ''یہود کے لیے اپنا دین ہوگا'' اس کے تحت وہ اپنے مذہبی فیصلے خود بھی کر سکتے ہیں۔ یہ آزادی ان کے اختیارات مذہبی کی کلی نشان دہی نہیں کرتی بل کہ مذہبی آزادی کے بہ جز ریاست مدینہ کے تحت رہیں گے اور دستور کی خلاف ورزی نہیں کریں گے کیونکہ دستور کی خلاف ورزی حکومتی رٹ کو چیلنج کرنا ہے جسے ہم ریاست سے غداری کہتے ہیں یا قوم وملک سے بغاوت کہتے ہیں۔

اعتراض نمبر۲۴۲

بعض مصنفین نے خیال ظاہر کیا ہے کہ یہود کے تین بڑے قبیلے بنوقینقاع، بنونضیر اور بنوقریظہ کا ذکر دستور مدینہ میں نہیں۔ اس لیے وہ دستور کی ترتیب میں شامل نہیں تھے۔ (ان ۱۱۔۶۳۳)

جواب: اگر یہود دستور مدینہ میں شامل نہیں تھے تو ان کی عہد شکنی چہ معنی دارد؟ نیز ان کے خلاف کارروائی کرنے کا جواز نہیں بنتا۔ معاہدہ میں شرکت کی بنیاد پر ہی ان کے خلاف اقدام کیا گیا کہ معاہدہ کے رکن کی حیثیت سے انھوں نے معاہدہ توڑا۔ تاریخی شہادت یہ ہے۔ ابن ہشام اور طبری نے بہ حوالہ ابن اسحاق روایت کی ہے کہ ''بنوقینقاع پہلے یہود تھے جنھوں نے اپنے اور رسول کریم ﷺ کے مابین معاہدہ توڑا اور بدر واحد کی درمیانی مدت میں جنگ کی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہود معاہدہ میں برابر کے شریک تھے۔ اور معاہدہ کا پاس ولحاظ نہ رکھا اور جنگ میں مدمقابل ہوئے۔

دوم: یہود کے بعض قبائل کا ذکر نہیں ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہودی بہ حیثیت مجموعی جماعت کے اس دستور کے رکن نہیں ہیں۔ کیوں کہ پھر اس صورت میں مہاجرین کے قبائل کا ذکر بھی انفرادی اعتبار سے نہیں اور انصار کے جن قبائل کا ذکر ہے وہ اوس وخزرج کے چند قبائل ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انصار کے دیگر خاندان رسول اللہ کے دائرہ اطاعت میں نہیں تھے۔ یہ درست نہیں ہے۔ گروہوں کا ذکر ہوا ان میں مہاجرین وانصار کے مختلف قبائل ان کے موالی حلیف شامل ہیں اور انصار کے مختلف قبائل کی ذیل میں بہ حیثیت مجموعی ان کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ قبائل انصار کے بڑے بڑے قبیلوں اوس وخزرج کے حلیف تھے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ بنوقینقاع نے دستور کی خلاف ورزی کی۔ غداری کی تو قبیلہ خزرج کے سردار عبداللہ بن ابی نے ثالثی کی اور جب بنوقریظہ نے غداری کی تو بنو اوس کے سردار سعد بن معاذؓ نے ثالثی کے فرائض انجام دیئے۔ یہ ثالثیاں دستور مدینہ کی خلاف ورزی کرنے کے سبب تھیں۔ اگر وہ معاہدہ میں شامل تھے تو ان پر عہد شکنی اور غداری کے سبب مقدمہ چلایا گیا اور ثالث مقرر ہوئے۔ مسلمانوں نے انھیں قبول کیا۔ اعتراض نہ کیا۔ چاہتے تو وہ اس ثالثی کو رد کر سکتے تھے کیوں کہ ان پر یہ ثالثی قبول کرنا لازم نہ تھا۔

سوم: بنونضیر اور بنوقریظہ کا ذکر بنواوس اور ثعلبہ کے یہودیوں کے طور پر دستور کی شق ۳۲۔۳۱ میں ہے کیوں کہ وہ اوس اور ثعلبہ عمرو بن عوف کے درمیان رہتے تھے اور بنوقینقاع بنوخزرج میں سے بنو حارث کے حلیف تھے ان کا ذکر دستور کی دفعہ ۲۸ میں ہوا۔

چہارم: علامہ یعقوبی کہتا ہے کہ بنونضیر اور بنوقریظہ اصل میں یہودی نہ تھے وہ عربوں کی شاخ جذم سے تھے جنھوں نے بعد میں یہودیت اختیار کر لی تھی اور المسعودی نے بھی اس بات کا ذکر کیا ہے بایں امر یہ قرین قیاس ہے کہ مدینہ کے تینوں بڑے یہودی قبائل کو مدینہ کے عرب خاندانوں کے ساتھ حلف اور نسب کی بناء پر گروہ بند کر لیا گیا تھا۔اس معاشرتی حیثیت کے سبب انھیں عرب قبیلوں کی ذیل میں بیان کیا گیا۔(ن ۱۱۔۶۳۴۔۶۳۳)

پنجم: یہودی قبائل کو مذہبی آزادی حاصل تھی۔ جو ظلم و تشدد یا عہد شکنی کرے گا اس کے تمام نتائج کی ذمہ داری اور وبال اس کے ذمہ ہوگا اور اس کے خاندان کے لیے علاوہ کسی پر نہ ہوگا۔اس دفعہ کے تحت مسلمانوں نے جن قبائل کے خلاف ان کے جرم کی پاداش میں یہودی قبائل کے خلاف کاروائی کی تو دوسرے قبائل خاموش رہے۔ان میں سے ہر قبیلہ مداخلت سے دور رہا۔اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہر قبیلہ کے نزدیک سزا کا مستحق قبیلہ واقعی مستحق سزا تھا جس کا اعتراف کیا اور خاموش رہے اور حمایت سے دست بردار رہے۔

ششم: کوئی منچلا یہ نہ کہہ دے کہ دستور مدینہ کی صحت معتبر نہیں تو اس اعتراض کا رد مستشرقین کے بڑوں سے پوچھ لیتے ہیں۔ ویلہازون نے اس دستاویز کا تفصیلی مطالعہ کیا اور دلائل سے ثابت کیا کہ یہ دستور بہ لحاظ صحت درست ہے۔منٹگمری واٹ بھی اس کی صحت کا قائل ہے وغیرہ

ہفتم: یہ قبائل عربوں کے علاقوں اور حملوں کی نسبت سے مشہور تھے۔دستور میں صرف انصار کے چند قبائل کا گنا کر سارے مراد لیے ہیں اسی طرح یہود کے چند قبائل کا ذکر کر کے یہود کی پوری جماعت مراد ہے اور شامل دستور ہے۔

اعتراض نمبر ۲۴۳

سر ولیم میور کہتا ہے کہ بنوقریظہ نے اس جنگ (خندق) میں کوئی عملی حصہ نہ لیا تھا۔ان کا استدلال یہ تھا کہ اگر ایسا ہوتا تو قرآن مجید میں جہاں احزاب کا ذکر ہے وہاں اس کا ذکر ضرور ہوتا۔(شبلی سیرت النبی۔ج ا۔۲۵۲)

جواب: اول اگر بنوقریظہ نے جنگ میں حصہ نہ لیا تو کن وجوہ پر معاہدہ سے انحراف کیا۔دوم حی بن اخطب خیبر چھوڑ کر ان کے پاس چلا آیا تھا۔ولیم موصوف جانتا ہے کہ حی بن اخطب قریش کی مدد کے لیے بنوقریظہ کو مسلمانوں سے الگ کرنا چاہتا تھا۔آخر اس کی کوشش رنگ لائی اور بنوقریظہ عہد شکنی کر بیٹھے حال

آنکہ غزوہ احد کے بعد بنی قریظہ نے مسلمانوں سے تجدید معاہدہ کیا تھا وہ بھلا بیٹھے اور دوبارہ مخالفت پر اتر آئے۔ سعد بن معاذؓ کے ذریعے بات چیت کی گئی جس سے ان کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ ان پر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ اس عہد شکنی کے باعث جنگ احزاب کے بعد ان کی سرکوبی کرنا ناگزیر تھی اور اللہ تعالیٰ نے بھی مسلمانوں کو اجازت جہاد دے دی۔" اُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ"۔ ''جن مسلمانوں سے کافر جنگ کر رہے ہیں انھیں بھی مقابلہ کی اجازت دی جاتی ہے کیوں کہ وہ مظلوم ہیں اور یقیناً اللہ تعالیٰ ان کی مدد پر قادر ہے''۔

کیا مستشرق میور اس بات سے انکار کر سکتا ہے کہ آپؐ کی پھوپھی حضرت صفیہؓ نے ایک یہودی کا سر کاٹ کر قلعہ سے نیچے پھینک دیا تھا۔ بنو قریظہ کے یہود خواتین کی پناہ گاہ پر حملہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اپنے یہودی کا سر کٹا دیکھا تو اس ارادے سے باز آ گئے۔ انھوں نے جانا کہ یہاں مسلمانوں کا فوجی دستہ مقرر ہے۔ کیا یہودی اپنے مقتول سے مکر جائیں گے کہ وہ ان میں سے نہ تھا یا ان کا کچھ نہ لگتا تھا؟ میور کا الزام بے بنیاد اور نامعقول ہے کیوں کہ مدعی اقرار کرتا ہے اور گواہ (میور) ماننے سے انکاری ہے۔ وہ مدعی حی بن اخطب ہے اس کا کہنا ہے کہ بنو قریظہ نے نئے سرے سے جو معاہدہ کیا تھا سازشی چال تھی۔ وہ اس لیے معاہدہ کر بیٹھے کہ موقع پا کر کفار کے ساتھ مل کر مسلمانوں پر حملہ کر دیں گے (ش۔۲۵۲) کیا اب بھی ان کی جنگ میں شرکت نہ کرنے کی کوئی کسر باقی رہتی ہے؟ انھوں نے معاہدہ توڑا اور قریش کے ساتھ مل کر حملہ کرنے کی ٹھانی' کیا ایسا نہیں؟ کیا وہ کفار کے حامی نہ تھے؟ البتہ وہ موقع کی تلاش میں تھے جو انھیں احزاب میں ہاتھ آیا۔

ولیم میور کا استدلال کہ بنو قریظہ نے جنگ میں عملی حصہ نہ لیا کیوں کہ جہاں قرآن کریم میں احزاب کا ذکر ہے وہاں بنو قریظہ کا ذکر ضرور ہوتا۔ مولانا شبلی (سیرت النبی ۲۵۲) لکھتے ہیں کہ قرآن کریم میں صاف الفاظ یہ ہیں۔" وَأَنزَلَ الَّذِينَ ظَاهَرُوهُم مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مِن صَيَاصِيهِمْ وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيقًا تَقْتُلُونَ وَتَأْسِرُونَ فَرِيقًا وَأَوْرَثَكُمْ أَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ وَأَرْضًا لَّمْ تَطَئُوهَا وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا"۔ (سورۃ الاحزاب ۲۷۔۲۶) ترجمہ: ''اور جن لوگوں نے (جنگ احزاب میں) کفار کی مدد کی تھی اللہ نے انھیں ان کے قلعوں سے نیچے اتار دیا۔ ان کے دلوں میں تمھارا رعب ڈال دیا اور تم نے ان میں سے ایک فریق کو قتل کر دیا اور ایک کو گرفتار کر لیا اور اللہ نے تمھیں ان کی زمین' ان کے گھروں' ان کے اموال اور اس زمین کا جس پر تم نے قدم بھی نہیں رکھا تھا وارث بنا دیا اور اللہ تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے''۔ قرآن میں صاف الفاظ ہیں ''وانزل الذین ظاہروھم من اھل الکتاب'' اس میں مظاہرۃ (امداد) سے بڑھ کر کون سا لفظ درکار ہے۔ پھر ان کے قتل کا ذکر ہے اگر وہ حصہ نہ لیتے تو قتل کیوں کیے جاتے؟

اعتراض نمبر ۲۴۴

مستشرقین یہ بھی کہتے ہیں کہ جن یہودی قبائل کے خلاف کاروائی کی گئی ان کا حضور کے ساتھ کسی قسم کا معاہدہ نہ تھا اور کبھی وہ کہتے ہیں کہ ان قبائل سے مسلمانوں کا جنگ بدر کے بعد معاہدہ ہوا تھا۔

جواب: ان کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ یہود نے نہ عہد شکنی کی اور نہ ان کے خلاف کاروائی جائز تھی۔ چونکہ معاہدہ ہوا ہی نہیں تھا اس سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ جب معاہدہ ہی نہیں تھا تو عہد شکنی چہ معنی دارد؟ جب عہد شکنی نہ ہوئی تو سزا کیسی؟ حالانکہ میثاق مدینہ کا مقصد ہی یہود کو فریق بنا کر امن قائم کرنا تھا اگر ان کی شرکت نہ ہوتی تو امت واحدہ کیسے بنتی کیونکہ مسلمان تو پہلے ہی دین اسلام میں داخل ہو چکے تھے اور ان کے درمیان کسی اور معاہدہ کی ضرورت نہیں تھی۔

۲۔ Hell، Hauson well اور نکلسن وغیرہ نے اس معاہدہ کو آپ کی سیاسی بصیرت کا بہت بڑا ثبوت قرار دیا ہے ڈاکٹر حمید اللہ لکھتے ہیں ''ایک چھوٹی سی بستی کو جو بیس ایک محلوں پر مشتمل تھی، شہری مملکت کی صورت میں منظّم کیا گیا اور اس کی قلیل لیکن بوقلموں اور کثیر الاجناس آبادی کو ایک لچکدار اور قابل عمل دستور کے ماتحت ایک مرکز پر متحد کیا گیا اور ان کے تعاون سے شہر مدینہ میں ایک ایسا سیاسی نظام قائم کر کے چلایا گیا جو بعد میں ایشیاء، یورپ اور افریقہ کے تین براعظموں پر پھیلی ہوئی ایک وسیع اور زبردست شہنشاہیت کا بلا کسی دقت کے صدر مقام بھی بن گئے۔ ۳۔ منٹگمری واٹ کا موقف ہے کہ جنگ بدر کے بعد معاہدہ میں یہود کو فریق بنایا گیا اس کے باوجود دبے دبے الفاظ سے ان کو فریق بھی تسلیم کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ ''عرب قبائل کا حلیف ہونے کی وجہ سے یہودی ایک لحاظ سے مدنی معاشرہ کا حصہ تھے ممکن ہے ان میں سے بعض کے محمد ﷺ کے ساتھ براہ راست معاہدے بھی ہوں۔

ولیم میور کی بھی سن لیں وہ لکھتا ہے ''یہودیوں کی حمایت اور وفاداری حاصل کرنے کی خاطر انہیں کوئی سہولت دینا بھی خسارے کا سودا نہ تھا اس لیے محمد ﷺ جب مدینہ پہنچنے کے بعد جلد ہی ان سے دفاع اور جنگ کا ایک معاہدہ کیا جس کے مطابق ان کی آزادی اور سلامتی کی ضمانت دی گئی۔ واٹ لکھتا ہے ''محمد ﷺ جب مدینہ تشریف لے گئے تو آپ کو کسی نہ کسی سبب سے مدینہ کے تمام با اثر افراد کی حمایت حاصل تھی اور سعد بن معاذ اور ابن ابی کے سوا سب نے عقبہ کے عظیم اجتماع میں شرکت کی تھی۔ (ضیا النبی۔ ۷۔ ۲۰۶)

مدینہ کے انصار نے حضور نبی اکرم ﷺ کو ریاست مدینہ کا سربراہ بنانے کا فیصلہ کیا تھا جب آپ مدینہ تشریف لے گئے تو با اثر افراد نے آپ کی حمایت کی اور اس حمایت کا مطلب یہ تھا کہ ان افراد کے قبائل کی بھی آپ کو حمایت اور مکمل تعاون حاصل تھا کیونکہ عربوں میں رواج تھا کہ قبیلے کی رائے وہی ہوتی جو ان کے سردار کی ہوتی تھی۔ اب اکثریت آپ کو سیاسی اور انتظامی سربراہ مان گئی جس سے آپ مقرر

کردہ حکمران بن گئے اور اب کسی شہری کو حق حاصل نہ تھا کہ آپ ﷺ کی اتھارٹی کو چیلنج کرتا بصورت دیگر اب ریاست یا سربراہ ریاست سے غداری حکومت کی Writt کو چیلنج کرنا تھا اس لحاظ سے غداروں کے خلاف کاروائی کرنا ناگزیر تھا لہذا عصماء بن مروان اور ابو عفک جو ریاست کے باغی تھے اور یہود کے دیگر تینوں قبائل بنی قینقاع، بنی نضیر اور بنو قریظہ کو ان کے جرم کے مطابق سزا دی گئی۔ یہ سزا مناسب وضروری تھی کیونکہ یہ ان کے اپنے کیے کرائے کا نتیجہ تھی۔

اعتراض نمبر ۲۴۵

سر ولیم میور اور اسپرنگر نے معاملہ کے اس پہلو کو ایک عجیب طرح سے مسخ کیا ہے۔ موسیو کوسین دی پرسیوال کے اس قول کے لیے کہ یہودی دیت ادا کرنے کے ذمہ دار تھے۔ سر ولیم میور کو کوئی سند نہیں ملی۔ (روح اسلام حاشیہ ۱۶۴)

جواب: بیر معونہ کے قریب دغا بازی سے ستر مسلمان قتل کر دیئے گئے ان میں صرف دو بچے۔ ابن اسحاق نے عبداللہ بن ابی بکر بن حزم سے روایت کی ہے کہ عامر بن طفیل نے عمرو بن امیہ کو بیر معونہ کے بعد اپنی والدہ کی طرف سے آزاد کیا تھا۔ عمرو مدینہ کی طرف چلا۔ راستے میں اسے قبیلہ بنی عامر کے غیر مسلح دو شخص ملے جن کے پاس نبیؐ کا عقد وعہد تھا جس کی خبر عمرو بن امیہ کو نہ تھی۔ عمرو نے ان دونوں کو قتل کر دیا تھا۔ آنحضرتؐ کو اس واقعہ کی خبر ملی تو بہت دکھ ہوا۔ اگر چہ ایک آدمی کی لاعلمی ہی سے یہ واقعہ پیش آیا لیکن ہوا تو سہی۔ ان مقتول کے ورثاء خون بہا کے مستحق تھے۔ چناں چہ مسلمانوں اور دوسرے معاہد قبائل سے دیت جمع کرنے کا حکم ہوا۔ بنی نضیر اور بنی قریظہ اور دوسرے یہودی قبائل پر دیت مسلمانوں کے برابر ادا کرنے کی ذمہ داری تھی۔ آپ بنی نظیر کے پاس تشریف لے گئے، انھوں نے بجائے تعاون کے اونچی جگہ سے پتھر گرا کر آپؐ کو ٹھکانے لگانے کی کوشش کی اور سازش کی منصوبہ بندی کی۔ لیکن آپؐ کو بہ ذریعہ وحی علم ہوا تو آپؐ وہاں سے واپس چلے آئے۔ انہیں حکم دیا کہ دس دن کے اندر مدینہ سے نکل جائیں انہوں نے انکار کیا اس پر ان کا محاصرہ کیا گیا۔ چھ دن کے بعد انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور انہیں جلا وطن کر دیا گیا۔ یہودی قانون کے مطابق وہ واجب القتل تھے۔ تورات کتاب استثناء باب ۷ آیت نمبر ۲ میں یہ حکم درج ہے کہ فتح کے بعد مردوں کو قتل کرو، عورتوں اور بچوں کو قیدی بنالو۔ بنو نضیر کے تمام لوگ گھروں کا تمام ساز وسامان حتیٰ کہ اپنے گھروں کے دروازے اور شہتیر تک اٹھا کر لے گئے، بڑی ٹھاٹھ باٹھ سے نکلے بارات کا گماں ہوتا تھا کیونکہ شہنایاں بج رہی تھیں، گانے گائے جا رہے تھے، ان کے چہروں پر حزن وملال کا اثر نہ تھا۔ ان کی لونڈیوں اشتعال انگیز شعر گا رہی تھی۔

ولیم میور کو دیت کی سند نہیں ملی کا مطلب یہ ہے کہ وہ کہنا چاہتا ہے کہ دیت کے لیے کسی قسم کا معاہدہ نہیں تھا۔ جس طرح مستشرقین یہودی تین بڑے قبائل کے ساتھ معاہدہ میثاق مدینہ کو نہیں مانتے۔

جہاں تک دستور مدینہ میں یہود کے ذکر (قریظہ ،نضیر، قینقاع) کا تعلق ہے اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔ یہاں صرف اتنا کہہ دینا ضروری ہے کہ بنونضیر اور بنو قریظہ کا ذکر بنو اوس اور ثعلبہ کے یہودیوں کے طور دستور کی دفعات ۳۱، ۳۲ میں ہے کیوں کہ وہ اوس اور ثعلبہ بنی عوف کے درمیان میں رہتے تھے اور بنو قینقاع، بنوخزرج میں سے بنو حارث کے حلیف تھے کا ذکر دستور کی دفعہ ۲۸ میں ہے جب وہ دستور میں شامل ہیں تو یہودیوں کو دیت ادا کرنے اور معاہدہ کی پابندی کی تعمیل کرنا لازم اور ضروری ہے۔اس وجہ سے کہ یہود دیت ادا کرنے میں برابر کے شریک ہیں۔

ولیم میور اگر طبری کی تاریخ کی ورق گردانی کرتا تو انھیں ذیل کا بیان ملتا ’’بعد میں حکم دیا گیا کہ رقم جمع کی جائے یا مدینہ کے لوگوں سے وصول کی جائے اور یہ حکم بھی دیا کہ ان یہودی قبائل مثلاً بنی نضیر، بنی قریظہ اور وہ جو فدک میں رہتے تھے ان سب پر معاہدہ کی رو سے دیت کی ادائیگی کی ذمہ داری پڑتی تھی کہ برابر کا حصہ ادا کریں۔ (حوالہ بالا)

اس سے بڑھ کر ولیم کو کس سند کی تلاش ہے جو اسے درکار تھی۔فکر میں پاؤں دھرتا تو سند ہاتھ آتی اگر میور کو سند نہیں ملی تو اس کا مطلب ہر گز یہ نہیں کہ یہود دیت ادا کرنے کے ذمہ دار نہ تھے۔درحقیقت اشاروں کنایوں میں وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ مسلمانوں کا یہود کے ساتھ کوئی معاہدہ نہیں تھا جب معاہدہ نہیں تھا تو دیت ادا کرنے کی ذمہ داری کیسے ٹھہری؟ دیت کی ذمہ داری یہود پر ڈالنا مسلمانوں کی زیادتی اور ناانصافی ہے۔دوسرے لفظوں میں سربراہ مملکت اور مسلمان مصنف عادل نہیں ہیں (نعوذ باللہ) وہ ہستی جو دین اسلام کی ہدایت دے رہا ہے اور ہر شعبہ سے متعلق رہنمائی فراہم کر رہا ہے اس نے دین اسلام کی تعلیم کا بر اعلان بھی کیا تھا۔

’’ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ ‘‘ (سورۃ المائدہ ۔ ۸) ترجمہ: اور تم کو کسی قوم کی عداوت اس پر نہ ابھارے کہ انصاف نہ کرو وہ تقوی سے زیادہ قریب ہے‘‘۔

ویلہاؤزن کہتا ہے۔

"Therefor the first time Talio becomes effective, There it can be enforced , The community, at the head of which God stands and the prophet as Gods representative, has power to deliver the shedder of blood over to avenger, and it is the duty of the commonunity to see that is done"

قصاص و دیت کا ضابطہ وہاں پہلی مرتبہ اتنا موثر ہوا کہ اسے نافذ کیا جا سکے۔وہ سیاسی جماعت

جس کی سربراہی اللہ کے ذمہ تھی اور جہاں رسول اللہ ﷺ کی اللہ کے نمائندے کی حیثیت تھی یہ اختیار رکھتی تھی کہ قاتل کو منتقم کے حوالے کر سکے اور اس بات کی نگرانی بھی پوری جماعت کا کام تھا کہ ضابطہ کی تعمیل کر دی گئی ہے۔ دستور کی شق ۴۳ میں ہے ''ہر مظلوم کی بہر حال مدد کی جائے گی''۔ اس شق کا تقاضا بھی یہی ہے کہ مظلوم کی مدد کے لیے اقدام کیا جائے۔ اب دو آدمی قتل ہوئے اس کے ورثا کو خون بہا ادا کرنا مظلوم کی امداد ہے لہٰذا دیت کو معاہدہ قبائل سے جمع کر کے ورثاء کو دینا دستور کے عین مطابق تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر نا انصافی شمار ہوتی جس کے نتائج خطرناک ثابت ہوتے۔ جب کہ ویلہاؤزن کہتا ہے کہ مکمل حاکمانہ اختیارات کے ساتھ پہلا عربی معاشرہ محمدؐ کے ہاتھوں شہر مدینہ میں قائم ہوا لیکن خون کی بنیاد پر نہیں جو لامحالہ اختلاف کو جنم دیتا ہے بل کہ دین کی بنیاد پر جس کا اطلاق ہر فرد پر یکساں طور پر ہوتا ہے تو ایسے اختیارات اور قائم شدہ حکومت کی موجودگی میں کیونکر انصاف فراہم نہیں کیا جاتا؟

اعتراض نمبر ۲۴۶

اسرائیل ولفنسن کا خیال ہے کہ عرب مورخ یہودی قبیلہ بنو نضیر پر فوج کشی کی ایک دوسری وجہ بیان کرتے ہیں ''وہ یہ کہ ان لوگوں نے شب خون مار کر رسول اللہ ﷺ کا کام تمام کرنے کی کوشش کی تھی (نعوذ باللہ) مگر مستشرقین اس روایت کو درست نہیں سمجھتے اور اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ اس قسم کے کسی واقعہ کا ذکر سورہ حشر میں نہیں ہے۔

جواب: پیچھے واقعہ بیان ہوا ہے کہ یہود کی سازش تھی کہ اونچی جگہ بٹھا کر اوپر سے پتھر گرا کر آپ ﷺ کو ٹھکانے لگا دیا جائے لیکن بہ ذریعہ وحی مطلع ہوئے اور آپ واپس چلے آئے۔ اب ایک مستشرق اس کو شب خون سے جوڑتا ہے دوسرا سرے سے واقعہ کا انکار کرتا ہے کہ واقعہ ہوا ہی نہیں۔ اگر ہوتا تو سورہ حشر میں اس کا ذکر ہوتا۔ یہ مستشرقین آیات اور سورتوں کے شان نزول سے بے خبر ہیں یا جان بوجھ کر بات کو گول مول کر جاتے ہیں اور شکوک پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انھیں یہ معلوم نہیں کہ سورہ حشر بنو نضیر کی جلاوطنی کے بعد نازل ہوئی۔ جب سورہ حشر کا نزول ہی بنو نضیر کی جلاوطنی کے بعد کا ہے اور جلاوطنی کا واقعہ پہلے کا ہے تو بھلا اس واقعہ کا ذکر سورہ حشر میں کیسے ہو سکتا ہے؟

یہ بات بھی قارئین کرام ذہن نشین رہے کہ شان نزول کے اعتبار سے سورہ کا نمبر اور ہے اور ترتیب کے لحاظ سے اور ہے۔ نیز قرآن کی ترتیب بہ حکم ربی رسول اللہ ﷺ نے فرمائی اگرچہ کسی آیت کا نزول مکہ میں ہوا مگر اسے مدنی سورت میں جگہ دے دی مثلاً المائدہ قرآن کا بہ لحاظ ترتیب پانچواں سورہ ہے اور آیت پاک ''الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام'' (آج میں نے تمھارے لیے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمھارے لیے دین کو پسند کیا) کا نزول مکہ

میں ہوا لیکن اسے مدنی سورہ کا جز بنایا گیا۔

اعتراض نمبر ۲۴۷

مسلمان اصلاح فی الارض کے مدعی ہیں اور فساد فی الارض پھیلا رہے ہیں۔(محمد رسول اللہ۔۱۸۸)

جواب: بنونضیر کی عہد شکنی اور ان کی سازش کی بناء پر مسلمان ان پر حملہ آور ہوئے۔سازش وہی تھی کہ آپ ﷺ کو اپنے پاس بلا کر اونچی جگہ سے پتھر گرا کر کام تمام کر دیں (نعوذ باللہ) وہ اپنے باغات میں چھپے ہوئے تھے۔ان کی اس پناہ گاہ کو صاف کیے بغیر دشمن کے خلاف کارروائی مشکل اور غیر موثر تھی۔لہٰذا باغات میں سے بعض درختوں کو کاٹ دیا گیا جس پر منافقین نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔شور برپا کیا کہ مسلمان اصلاح فی الارض کے مدعی ہیں اور فساد فی الارض پھیلا رہے ہیں کا طعنہ دیا لیکن لوگوں کو بتانا مقصود تھا کہ مسلمان اقتدار کے حصول کے لیے مذہب کو آڑ بنا ڈالتے ہیں۔لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ایسا کرنا حکومت کی رٹ کو قائم کرنے کی خاطر تھا اور ضروری تھا کہ آج کے عہد میں کوئی حکومت اپنے خلاف بغاوت برداشت نہیں کرتی اور نہ ہی یہ برداشت کرتی ہے کہ حکومت کی رٹ کو چیلنج کیا جائے۔ حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ اپنی رٹ قائم کرے۔باغیوں کو قرار واقعی سزائیں دے تا کہ معاشرہ کا امن وسکون بحال رہے اور آئندہ کے لیے باغیوں کی سزا دوسروں کے لیے باعث عبرت ہو۔یہ سزا،ان کے اپنے کیے کرائے کی ہوتی ہے نہ کہ حکومت کسی اور مقصد کے لیے یا مذہبی آڑ میں حصول اقتدار کی خواہاں ہوتی ہے۔ایسی صورت میں کارروائی جائز ہوتی ہے۔خود خدائے علیم وخبیر نے مسلمانوں کی بریت فرما دی اور انھیں تسکین عطا کی۔فرمایا''کھجوروں کے جو درخت تم نے کاٹ ڈالے یا جو سلامت چھوڑ دیئے تو یہ اللہ کے حکم سے ہوا تا کہ وہ نافرمانوں کو رسوا کرے''۔(الحشر۔۵) اس آیت سے ثابت ہے کہ اول سارے درخت نہیں کاٹے گئے جن کی ضرورت تھی یعنی ان کی پناہ گاہ کو صاف کرنے کے لیے وغیرہ۔دوم اگر فساد فی الارض ہوتا تو باقی کے درخت بھی کاٹ دیئے جاتے۔باقی کے درخت چھوڑنا چہ معنی دارد؟ فساد کرنے والے تو ہر خشک وتر کو ملیا میٹ کرتے ہیں۔یہاں صرف ان درختوں کو کاٹا جن میں دشمن چھپا تھا۔اس آیت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا نزول بنی نضیر کی جلاوطنی کے بعد ہوا۔اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ فساد پھیلانے والے جلاوطن ہوئے اور امن قائم ہوا۔اور وہ یہودی تھے نہ کہ مسلمان جو فساد فی الارض کے مرتکب ہو رہے تھے۔

اعتراض نمبر ۲۴۸

آپؐ دیت کے معاملہ میں بنونضیر کے ہاں تشریف لے گئے۔انھوں نے سوچا خوب موقع ہاتھ آیا ہے

انھیں کہیں اونچی جگہ بٹھا دیتے ہیں اور اوپر سے پتھر گرا کر ان کا کام تمام کر دیتے ہیں۔(نعوذ باللہ) آپؐ کو بہ ذریعہ وحی خبر ہوئی۔ بنو قریظہ نے جنگ (خندق) میں عملی حصہ نہیں لیا۔ یہ ایک سخت اور خونیں فیصلہ تھا۔ جوالبی پر حملہ کرنے والی کلیسائی افواج کے جرنیلوں کو زیب دیتا تھا یا اس کی مثال آگسٹن دور کے پیوریٹینوں (puritans) کے ہاں ملتی ہے۔(لین پول بہ حوالہ روح اسلام ا۔۱۷۳)

جواب: جواب دینے سے پہلے تینوں قبائل کی معاہدہ شکنی کو بیان کرتے ہیں۔ بنو قینقاع نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی۔ غزوہ بدر کے بعد اس کا محاصرہ کیا گیا۔ پندرہ دن بعد قینقاع کے یہودیوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور جلاوطن کر دیئے گئے۔ آپؐ دیت کے معاملہ میں بنو نضیر کے ہاں تشریف لے گئے۔ انھوں نے سوچا خوب موقع ہاتھ آیا ہے انھیں کہیں اونچی جگہ بٹھا دیتے ہیں اور اوپر سے پتھر گرا کر ان کا کام تمام کر دیتے ہیں۔ (نعوذ باللہ) آپؐ کو بہ ذریعہ وحی خبر ہوئی اور آپؐ واپس چلے آئے۔ انھیں حکم دیا گیا کہ دس دن کے اندر مدینہ سے نکل جائیں۔ انھوں نے انکار کیا۔ اس پر ان کا محاصرہ کیا گیا۔ چھ دن کے بعد انھوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ انھیں بھی جلاوطن کر دیا گیا۔ یہودی قانون کے مطابق واجب القتل تھے۔ توراۃ کتاب استثناء باب ۷ آیت نمبر ۲ میں یہ حکم درج ہے کہ فتح کے بعد مردوں کو قتل کر دو۔ عورتوں کو اور بچوں کو قیدی بنا لو۔ بنو نظیر کے تمام لوگ گھروں کا ساز و سامان حتیٰ کہ اپنے گھروں کے دروازے اور شہتیر تک اٹھا کر لے گئے۔ بڑی ٹھاٹھ باٹھ سے نکلے۔ برات کا گماں ہوتا تھا کیوں کہ شہنائیاں بج رہی تھیں۔ گانے گائے جا رہے تھے۔ ان کے چہروں پر حزن و ملال کا اثر نہ تھا۔ ان کی لونڈیاں اشتعال انگیز شعر گا رہی تھیں۔(اسلام رواداری کا علم بردار۔۵۵)

اس پس منظر کے بعد تیسرا گروہ بنو قریظہ تھا جس پر مستشرقین نے بہت واویلا مچایا ہوا ہے۔ انھوں نے معاہدہ توڑا پھر جنگ احد کے بعد تجدید معاہدہ کیا۔ پھر معاہدہ شکنی کی اور جنگ احزاب میں قریش کا ساتھ دینے کی کھلم کھلا حمایت کی۔ اس وقت مسلمانوں کے لیے یہ بہت بڑا خطرہ تھا۔ نبی مکرمؐ نے حضرت سعد بن عبادہؓ اور سعد بن معاذؓ کو بہ طور سفیر بنو قریظہ کے ہاں بھیجا کہ وہ انھیں دستور کی پاس داری یاد دلائیں چوں کہ وہ آئین سے غداری اور قریش کی فوج سے مل جانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ انھوں نے جواب دیا "ہم نہیں مانتے محمد ﷺ کون ہے؟ اور معاہدہ کیا ہے؟ (ن۔۱۱۔۶۴۲)

مصنف (اسلام رواداری کا علم بردار۔۴۱) بتاتا ہے بہ حوالا مصنف میزان الحق کہ حضرت مسیحؑ امن پسند تھا اور نیکی کرتا پھرتا تھا لیکن موجودہ انجیل میں ہے کہ حضرت مسیحؑ نے تین سال کے بعد تلوار اٹھانے کی اجازت دی "کیا تم گمان کرتے ہو کہ میں صلح کرنے آیا ہوں نہیں بل کہ تلوار چلانے آیا ہوں"۔(بہ حوالا متی باب ۱۱۔ آیت نمبر ۳۵۔۳۴) اب جس کے پاس بٹوہ ہے وہ اسے لے اور اس طرح سے جس کے پاس جھولی بھی نہ ہو وہ پوشاک بیچ کر تلوار خریدے۔(بہ حوالا لوقا باب ۲۱ ورس ۱۳۱ ص ۴۱) یہود

کیونکر بھول جاتے ہیں کہ قبل از اسلام غیر یہود حکومتوں نے ان کا قتل عام کیا۔ بخت نصر نے ۵۸۶ قبل مسیح بیت المقدس پر حملہ کر کے تباہ و برباد کر دیا۔ تین سردار اور دس ہزار یہودی قید ہوئے۔ انھیں بابل بھیجا گیا۔ پچاس سال تک یہودی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے زندگی کے دن گن گن کر گزارتے رہے۔ شام کے حکمران اینٹوکس نے ۱۶۸ قبل مسیح چالیس ہزار یہودیوں کا خون کیا۔ دوسری طرف عہد نبوی میں یہود کو ہر طرح کی آزادی حاصل تھی۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ لکھتا ہے کہ میثاق مدینہ کے تحت یہودیوں کو مکمل آزادی دی گئی۔ مختلف عقائد لوگوں کو ایک کر کے امت واحدہ بنائی گئی۔ ان کے مذہبی امور میں کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔ مسلمان اور یہود دوستانہ رکھیں گے۔ مدینہ پر حملہ کی صورت میں مشترکہ طور پر اس کا دفاع کریں گے۔ کوئی فریق قریش کو امان نہیں دے گا۔ (اسلام رواداری کا علم بردار۔ ۵۴۔۵۳)

اب بنو قریظہ سے نمٹنے اور نبرد آزما ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ یہود کو یہ بھولنا نہیں چاہیے کہ ولنگٹن کی فوج جس راستے سے گذری اس کی نشان دہی مفرور سپاہیوں اور لوٹ مار کرنے والوں کی لاشیں کرتی تھیں جو درختوں پر لٹکی ہوئی تھیں۔ انھیں ایک غدار چھوٹے قبیلہ کے قتل اور پھر ان کے اپنے مقرر کردہ ثالث کے فیصلہ پر متعجب نہیں ہونا چاہیے۔ (روح اسلام۔ ۱۷۳)

سٹینلے پول: سٹینلے پول کہتا ہے کہ ''ان کا جرم مملکت سے غداری تھا اور وہ بھی ایک غدار قبیلہ کے سرسری فیصلے کی رو سے قتل کیے جانے پر متعجب نہیں ہونا چاہیے۔ (اسلام رواداری کا علم بردار ص ۵۶)

سٹینلے پول کے پہلے اعتراض کو پڑھ کر مذکورہ بیان پڑھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کھلم کھلا تضاد ہے۔ کبھی کچھ اور کبھی کچھ کہتا ہے اپنے بیان کی تردید کر کے اپنے الزام کو خاک بوس کر دیتا ہے۔ اس سے بڑھ کر مذکورہ اعتراض کا جواب اور کیا ہو سکتا ہے؟

آر وی سی بھاؤ: کہتا ہے کہ ''محمد ﷺ بنو قریظہ کو بغیر سزا چھوڑ دیتے تو جزیرہ نمائے عرب میں اسلام کی بقا مشکل ہو جاتی۔ اس میں شک نہیں کہ یہود کے قتل کا معاملہ سخت تھا لیکن یہ انوکھا نرالا واقعہ نہ تھا''۔ بھلا مسلمان انصاف کا دامن کیوں ہاتھ سے جانے دیتے؟ اور ان کے کیے کی سزا کیوں نہ دیتے؟ ملک سے بغاوت اور غداری کے جرم میں ان کی سزا اور پھر ان کی کتاب کے مطابق سزا بالکل جائز تھی۔ اسے یہود کے قتل کا سخت معاملہ کہنا کسی طور جائز نہیں۔ جیسا آر سی بھاؤ نے کہا۔ بنو قریظہ نے اعلانیہ کھلم کھلا جنگ احزاب میں شرکت کی۔ احزاب ناکام ہو گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا ہتھیار نہ کھولیں۔ بنو قریظہ کی طرف بڑھیں۔ تین ہزار صحابہ کے ہم راہ محاصرہ کیا پندرہ دن کے بعد سعد بن معاذؓ کی ثالثی کو مان کر کہا کہ وہ جو فیصلہ کریں، ہمیں منظور ہے۔ آپؐ نے اس پر اتفاق کیا اور ان کی استدعا قبول فرمائی۔ سعد بن معاذ کی ثالثی میں یہود کو اپنی خیر خواہی اور بھلائی نظر آئی۔ وہ اس طرح کہ وہ قبیلہ اوس سے تعلق رکھتے

تھے اور اوس بنو قریظہ کے حلیف تھے۔ یہود نے سمجھا کہ سعد کو حکم مقرر کرنے سے ان کے ساتھ رعایت برتی جائے گی لیکن وہ بھول گئے کہ اللہ تعالیٰ کے مجاہدوں اور آنحضرت ﷺ کے جان نثاروں کا ہر فعل اللہ کے فضل سے اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات کی پیروی پر مبنی ہوتا ہے خلاف نہیں ہوتا۔ وہ اصولوں پر سودا بازی اور سمجھوتا نہیں کرتے نہ کسی تعلق، رشتہ داری اور قرابت داری کو خاطر میں لاتے ہیں۔ سعد بن معاذؓ نے یہود کی مقدس کتاب تورات کے احکامات کے مطابق فیصلہ کیا۔ تورات میں ہے ''جب کسی شہر پر حملہ کرنے کے لیے تُو جائے تو پہلے صلح کا پیغام دے اگر وہ صلح کر لیں اور تیرے لیے دروازے کھول دیں تو جتنے لوگ وہاں ہوں سب تیرے غلام ہو جائیں گے۔ اگر وہ صلح نہ کریں تو ان کا محاصرہ کر اور جب تیرا خدا تجھ کو ان پر قبضہ دلا دے تو مردوں کو قتل کر دو اور خواتین واطفال کو قیدی بنا لے۔ (سیرت النبی۔۲۵۳)

باقی جانور اور جو چیزیں موجود ہوں سب تیرے لیے غنیمت ہوں گے۔ تورات کے اس حکم کے مطابق سعد بن معاذؓ نے مردوں کو قتل کرنے عورتوں اور بچوں کو قیدی بنانے کا حکم دیا۔ یہ تھی سخت سزا، یہ تھا خونیں فیصلہ جو الہی پر حملہ کرنے والے کلیسائی افواج کے جرنیلوں سے جوڑ دیا۔ ہرگز ایسا نہیں بل کہ یکسر غلط ہے کیوں کہ ان کے جرم کی سزا ان کی کتاب کے مطابق تھی اور پھر ان کے مقرر کردہ ثالث کا فیصلہ تھا اور یہود کے مذہب کے عین مطابق تھا۔

مستشرقین اس واقعہ کی حقیقت کو طاق پر دھرے ہوئے ہیں جب کہ شریک جنگ حی بن اخطب جو فتنہ پرور اور فساد کی جڑ تھا۔ مقتل میں لایا گیا اس نے آنحضرتؐ کی طرف دیکھا اور کہا ''ہاں خدا کی قسم! مجھ کو افسوس نہیں کہ میں نے کیوں تیری عداوت کی، لیکن یہ بات ہے کہ جو شخص خدا کو چھوڑ دیتا ہے خدا بھی اسے چھوڑ دیتا ہے''۔ پھر لوگوں کی طرف مخاطب ہوا اور کہنے لگا لوگو! خدا کے حکم کی تعمیل میں کچھ مضائقہ نہیں یہ ایک حکم الٰہی تھا، یہ لکھا ہوا تھا، ایک سزا تھی جو خدا نے بنی اسرائیل پر لکھی تھی''۔ (ابن ہشام۔غزوہ بنی قریظہ)

مدعی سست گواہ چست والی بات ہے کہ جنھیں سزا دی گئی وہ سزا کے فیصلہ کو حکم الٰہی سمجھتے ہیں حال آنکہ یہ ان کے کرتوتوں کے سبب تھا۔ مگر جیالے مستشرقین اسے بے رحمانہ، غدارانہ اور سفاکانہ عمل گردانتے ہیں۔ ان کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ یہود جو پاک یہوہ کے پرستار تھے کفار عرب کو بت پرستی کی رسم جاری رکھنے کی ترغیب دیتے تھے اور جب ان سے پوچھا جاتا کہ ان میں سے کون سا مذہب بہتر ہے تو عیسائی مبلغین کی طرح وہ بھی کہہ دیتے کہ وہ بت پرستی کو تمام برائیوں کے باوجود دین اسلام سے بہتر سمجھتے ہیں۔ (روح اسلام ۱۴۸)

آنحضرتؐ مدینہ تشریف لائے۔ یہود سے معاہدہ کیا بنو قریظہ اور بنو نضیر کا ذکر دستور کی دفعہ ۳۲۔۳۱ میں ہے کہ ان کے لیے وہی شرائط ہیں جو بنی عوف کے یہود کے لیے ہیں۔ بنو عوف کے لیے

جن شرائط کا ذکر شق نمبر ۲۶ میں ہے یہ تھیں۔ ''بنوعوف کے یہود مومنین کے ساتھ ایک امت ہوں گے۔ یہود کے لیے اپنا دین ہوگا اور مسلمانوں کے لیے اپنا دین ہوگا۔ اس میں ان کے موالی اور وہ خود شامل ہوں گے۔ وہ خود کو اور خاندان کے سوا کسی کی ہلاکت میں نہ ڈالے گا''۔ سوال یہ ہے کہ مستشرقین بتائیں کہ کیا مذکور شق دستور میں شامل نہ تھی؟ کیا یہود کے تینوں قبائل کو اس کا علم نہ تھا؟ کیا اس دستور میں ان کی رضا مندی نہ تھی؟ کیا مستشرقین دستور کی صحت کے انکاری ہیں؟ یہ سب سوالات ایسے ہیں کہ مستشرقین سے جواب نہیں بن پائے گا بل کہ ان کی بولتی بند ہو جائے گی۔ ان سولات میں مفر ممکن نہیں تو اس شق میں غداری کی سزا کیا مقرر ہے وہ بہ خوبی جانتے ہیں۔ اس شق میں یہودی اور مسلمان ایک امت ہیں یہ ایک انتہا کا تاریخی اعزاز ہے جو میثاق مدینہ کی رو سے انھیں حاصل تھا۔ آج کی متمدن دنیا میں گورے کالے کی اصطلاح سیاسی اور معاشرتی امتیازات کی آئینہ دار ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں نسلی، مذہبی منافرتیں اور تعصّبات ہیں۔ صرف اقوام متحدہ کے دستور میں انسانی مساوات کو تسلیم کیا گیا ہے مگر عمل مفقود ہے۔ یہ حالت عہد حاضر اور ترقی یافتہ دور کی ہے تو کیا دستور مدینہ جو ساتویں صدی عیسوی میں مرتب ہوا تھا اس میں ہر سیاسی وحدت کو مساوی دینی، سیاسی اور معاشرتی حقوق حاصل نہ تھے؟ کیا رنگ و نسل مذہب اور جغرافیائی حد بندیوں کی بنیاد پر اختلاف و امتیاز کو ختم کرنے کی تاریخ میں یہ عظیم دستاویز نہیں تھی؟

امریکہ کا چارٹر ظاہر کرتا ہے کہ کسی فرد یا قوم نے اس دستور کی خلاف ورزی کی یا کسی دفعہ کے ساتھ غداری کی تو اس کے ساتھ چارٹر کے مطابق سلوک کیا جائے گا۔ اگر چارٹر کسی کے ساتھ رتی بھر انصاف کرتا ہے تو اس کی تعریف و تحسین میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے جاتے ہیں۔ یہ چارٹر دستور مدینہ کا ایک معمولی ترین عکس ہے۔ واہ رے واہ! کہ نقل پر عمل تو انصاف کہلائے اور اصل پر عمل ظلم کہلائے۔ بے رحمانہ، غدارانہ اور سفاکانہ عمل قرار پائے۔ اے مستشرق! تیری سوچ، فکر اور خیال کی پرواز پر افسوس صد افسوس!

اب سوال یہ ہے کہ ریاست مدینہ کا کوئی شہری یا سیاسی وحدت، ریاست یا سربراہ ریاست کے خلاف غداری کرے تو حکومت وقت کو اس کے خلاف کاروائی کرنے کا حق ہے یا نہیں؟ اور کس ضابطہ اور قانون کے تحت فیصلہ کیا جائے تو یہودی اس کا جواب دیں گے کہ جو دستور کہتا ہے جب کہ دستور یہ کہتا ہے کہ ''وہ خود کو اور اپنے خاندان کے سوا کسی کو ہلاکت میں نہیں ڈالے گا''۔ (فانہ لا یوفع لانفسہ اہل بیتہ) لہٰذا اسے اب اپنے کیے کا بھگتنا پڑے گا۔

۲: بنوقریظہ کو کم سمجھا جاتا تھا۔ بنونضیر کے مقتول کے لیے بنوقریظہ پوری دیت ادا کرتے اور بنوقریظہ کے مقتول کی دیت بنونضیر کے مقابلے آدھی ادا کرتے تھے۔ آنحضرتؐ نے بنوقریظہ پر احسان فرمایا اور ان

کا درجہ بنو نضیر کے برابر کر دیا اور ان کے مقتول کی دیت بنو نضیر کے مقتول کے برابر کر دی۔ پیغمبر اسلام ﷺ کے رحم و کرم اور عدل و انصاف کی معجز نمائیاں اور ضوفشانیاں بلا تفریق ہر ایک پر جلوہ فگن ہیں۔

۳: آنحضرتؐ نے بنو نضیر کی جلاوطنی کے وقت بنو قریظہ سے تجدید معاہدہ کی۔ انھیں امان بخشی مگر بنو قریظہ نے معاہدہ توڑ دیا اور کھلم کھلا بغاوت کی اور جنگ احزاب میں قریش کا ساتھ دیا جس کی ایک واضح مثال یہ ہے کہ مسلمان خواتین کے قلعہ پر حملہ کرنا چاہا ایک یہودی جاسوسی کے لیے آتا ہے۔ قلعہ کے دروازے پر پہنچا ہی تھا کہ نبی محتشم ﷺ کی پھوپھی حضرت صفیہؓ نے اس کا کام تمام کر دیا اور سر اتار کر نیچے پھینک دیا۔ اگر یہ عمل بروقت نہ ہوتا تو نہ جانے مسلمانوں کے ساتھ کیا کچھ ہو جاتا۔ یہ گھناؤنا اور خطرناک جرم قابل معافی نہ تھا۔ دستور مدینہ کی دفعہ ۱۴ کا متن ہے۔ (ترجمہ): مومنین متقین اپنے میں سے ہر اس شخص کے خلاف ہوں گے جو بغاوت کرے گا یا جو مومنین کے درمیان ظلم یا غدوان یا فساد کا ارتکاب کرے گا۔ ایسے شخص کے خلاف مومنین کے ہاتھ ایک ساتھ اٹھیں گے خواہ وہ ان میں سے کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ اس میں ظلم، غداری غدوان اور فساد جیسے جرائم کا ذکر ہے اور ساتھ یہ کہ جو کوئی بھی ان جرائم کا مرتکب ہوگا غدار ہوگا خواہ کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو خواہ کوئی شہری ہی کیوں نہ ہو۔ ایسے غدار کے خاتمہ کے لیے مومنین کے ہاتھ ایک ساتھ اٹھیں گے یعنی حکومت پوری طاقت کے ساتھ اس غدار کا قلع قمع کرے گی گویا غداری کی سزا موت ہے اور یہ سزا دینی چاہیے تھی کیوں کہ انھوں نے حکومتی رٹ کو چیلنج کیا تھا۔ اس وقت تو کیا آج بھی غدار کی یہی سزا ہے۔

۴: بنو قینقاع نے غداری کی انھیں جلاوطن کیا گیا جب کہ ان کے لیے ہلاکت اور موت کی سزا بنتی تھی۔ حضور ﷺ نے امان عطا فرمائی۔ دوسرا قبیلہ بنو نضیر غداری کا مرتکب ہوتا ہے دستور کے مطابق اور ان کی مقدس کتاب کے مطابق جو ان کی سزا تھی، یعنی سزائے موت تھی لیکن حکومت وقت نے نہ صرف ان کی جلاوطنی پر اکتفا کیا بل کہ انھیں اپنا مال وغیرہ لے جانے کی اجازت بھی دے دی۔ وہ اپنا مال اسباب لیے گاتے بجاتے چل دیئے۔ تیسرا قبیلہ بنو قریظہ تھا جس نے معاہدہ دوبارہ توڑا، کھلم کھلا مسلمانوں کے خلاف قریش کے ساتھ جنگ میں شرکت کی۔ مسلمانوں کے دشمن کا ساتھ دیا۔ قلعہ پر حملہ کرنے کی سوچی مگر ایک خاتون کی بروقت کاروائی سے مسلمان خطرناک خطروں سے بال بال بچ گئے۔ یہ ایسے جرائم ہیں جن کی سزا موت ہے پھر بھی ان کی درخواست قبول کی گئی اور ان کے تجویز کردہ ثالث سعد بن معاذؓ کو حکم تسلیم کیا گیا۔ اس سے چند امور سامنے آتے ہیں۔

الف: بنو قریظہ نے غداری کی۔ اپنے اس جرم کو تسلیم کرتے ہوئے اس جرم کے فیصلے کے لیے اپنی مرضی کا ثالث مقرر کیا۔

ب: حکومت کو اختیار تھا کہ بنو قریظہ کی درخواست ثالثی رد کر دیتی لیکن حکومت نے ایسا نہیں کیا۔ یہودیوں کی مرضی کا ثالث ہی رہنے دیا۔ اس الزام سے بھی حکومت کی بریت ظاہر ہو جاتی ہے کہ حکومت نے اپنی طرف سے ثالث مقرر نہیں کیا اور نہ اپنی طاقت سے اپنی مرضی کا فیصلہ کروایا جو کسی طور پر بھی قابل قبول نہ ہوتا اور اعتراضات کی بھینٹ چڑھ جاتا۔

اعتراض نمبر ۲۴۹

آپؐ نے سعد بن معاذ کو حکم مقرر کیا تھا کہ مسلمانوں کے حق میں فیصلہ دیں گے۔

جواب:۱: بالفرض ایسا تھا تو بنو قریظہ اس حکم کو نامنظور کر کے کسی اور ثالث کی پیش کش کر سکتے تھے۔ وہ اس پر احتجاج کر سکتے تھے ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انھوں نے خود سعد بن معاذؓ کو ثالث مقرر کروانے کی درخواست کی تھی کیوں کہ انھیں امید تھی کہ سعد قبیلہ اوس سے تعلق رکھتے ہیں اور اوس قبیلہ بنو قریظہ کا حلیف ہے۔ اس اعتبار سے ثالث ان کے ساتھ رعایت سے کام لے گا اور ان کے حق میں فیصلہ ہوگا۔ فیصلہ ان کی مرضی کے خلاف آیا گویا انہوں نے محسوس کیا کہ وہ کھٹی چھاچھ سے بھی گئے تو دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے انہوں نے وہ الزام الٹا آنحضرت ﷺ پر لگانے میں عافیت سمجھی۔

۲: صلح حدیبیہ کے بعد مسلمانوں نے آپ کے حکم سے قربانی میں پس و پیش کی۔ آپؐ کو کوفت ہوئی۔ ایک غزوہ میں مولفۃ القلوب کو مال دینے پر انصار نے جو طرزِ عمل اپنایا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوگوں کو ایسے معاملات جو واقعی طور پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی جانب سے تھے احتجاج کرتے نظر آتے ہیں۔ یہودیوں نے ایسا نہ کیا کیوں کہ وہ سمجھتے تھے کہ فیصلہ درست ہے اور اس کا سامنا انھیں کرنا ہے۔

۳: حکم نے یہودیوں کی کتاب مقدس تورات کے قانون کے مطابق فیصلہ کیا حکومت نے اسے تسلیم کیا اور یہ بھی ثابت کر دیا کہ انھوں نے تورات کے مطابق ثالث کے فیصلہ کو ہی صرف نہیں مانا بل کہ دستور مدینہ کی شق ۲۶ کی پاس داری بھی کی تھی جس میں یہودیوں کو مذہبی آزادی دی گئی تھی۔ اس مذہبی آزادی کے تحت ان کی مقدس کتاب تورات کے قانون کے مطابق فیصلہ کیا گیا۔

۴: یہودیوں نے اپنی مرضی کا حکم چنا۔ یہ ثالث ان کا منتخب کردہ تھا کسی اور کی مرضی کا نہ تھا۔ اب اس کے فیصلہ پر عمل ضروری تھا گویا انھوں نے ایک طرح سے اپنے کرتوتوں کی سزا خود مقرر کر لی تھی۔

۵: ایسی کوئی سند نہیں ملتی کوئی روایت نہیں ملتی کہ ثالث کے مقرر کیے جانے کے بعد فیصلے کے اعلان تک آنحضرتؐ نے سعد بن معاذؓ سے ملاقات کی ہو۔ (روح اسلام۔۳۳۴) یہی نہیں بل کہ کسی ایک مسلمان کے متعلق یہ گواہی ہی نہیں ملتی کہ کسی نے ثالث سے ملاقات کر کے حکومت کے حق میں فیصلہ دینے کی درخواست کی ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو یہود بھلا کب چپ کر کے بیٹھنے والے تھے۔ آسمان سر پر اٹھا

لیتے۔ سچ تو یہ ہے کہ بے تعصب طبائع تسلیم کریں گی کہ بنو قریظہ کے قتل کے لیے پیغمبر اسلام ﷺ کو کسی طرح موردالزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

اعتراض نمبر ۲۵۰

مغربی اہل قلم نے یہ تہمت دھری کہ سعد بن معاذ کا انتخاب محض مطلق العنانی چھپانے کی غرض سے تھا۔ فیصلہ آزادانہ نہ تھا۔ دباؤ کے تحت تھا۔ (مغرب کا انداز فکر۔۳۳۴)

جواب: اول: اگر سعد بن معاذ کا انتخاب مطلق العنانی کے چھپانے کی طرف سے ہوتا تو چاہیے یہ تھا کہ سعدؓ کو مسلمان مقرر کرتے حالانکہ یہودیوں نے سعد بن معاذ کو حکم منتخب کیا اور اس کے فیصلے کو قبول کرنے پر آمادگی اور رضامندی ظاہر کی۔ میثاق مدینہ دفعہ ۴۴ میں ہے کہ جب کبھی اس صحیفہ والوں کے درمیان کوئی حادثہ پیش آئے یا کوئی تنازعہ اٹھ کھڑا ہو جس سے فساد برپا ہونے کا اندیشہ ہو تو اس کا حوالہ اللہ تعالیٰ کی طرف اور اس کے رسول کی طرف کرنا ہوگا۔ یعنی آپ آخری مجاز اتھارٹی ہیں۔ آپ ﷺ خود اس کا فیصلہ فرما سکتے تھے لیکن یہود کے منتخب ثالث کو تسلیم کیا۔ کیا اسے مطلق العنانی کو چھپانا کہتے ہیں۔ جن کا قصور تھا وہ چھوٹ گئے اور بے قصور بھینٹ چڑھ گئے۔

۲: سعد بن معاذؓ نے وہی فیصلہ کیا جو انصاف پر مبنی تھا۔ وہ فیصلہ یہود کی کتاب مقدس کے مطابق تھا۔ نیز دستور مدینہ کے مطابق بھی۔ کوئی دباؤ نہ تھا۔ آزادانہ فیصلہ تھا۔ نیز قابل غور بات یہ ہے کہ سعدؓ کے ثالث مقرر ہونے سے لے کر فیصلہ سنانے تک آنحضرت ﷺ کی سعدؓ سے ملاقات نہیں ہوئی اور نہ ہی کسی حکومت کے کارندہ نے سعدؓ پر دباؤ ڈال کر حکومت کی مرضی کا فیصلہ کرا لیا۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے جب کہ ابن ہشام کے برخلاف دوسرے مورخین و محدثین نے (ابن سعد۔ امام بخاری) تحریر کیا ہے کہ حضرت سعدؓ کو خود بنو قریظہ نے حکم بنایا تھا۔ (مغرب کا انداز فکر۔۳۳۴) اپنے مرضی کے مقرر کردہ حَکَم کے فیصلہ کو وحشیانہ، غیر انسانی اور دباؤ والا فیصلہ قرار دینا دانشمندانہ اور مخلصانہ فعل نہیں ہے۔ منصف کو نہ ٹھہراؤ کبھی موردالزام۔۔۔۔ سچے ہو تو زنداں کو جلا کیوں نہیں دیتے۔

زبان آج کھلی ہے کل بند ہے مگر اس کی مستشرقین کو پروا نہیں ہے کل اور آج کے نام نہاد حکمران دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن ان کے دلوں میں قانون ربانی کے لیے احترام اور لحاظ نہیں پایا جاتا وہ جب چاہتے ہیں اس کے احکام کو پس پشت ڈال دیتے ہیں اور من مرضی و من مانی کرنے لگتے ہیں اس میں انہیں ذرہ بھر باک نہیں۔ اپنے معاملات زندگی کو اس قانون کی روشنی اور ہدایت میں ڈھالنے کی کوشش تو نہیں کرتے بلکہ ان کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ وہ حسب مرضی کسی چیز کو اپناتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں فوراً ترک کر دیتے ہیں۔ یورپ کے کسی ملک کے انسانی قوانین ہوں یا شریعت کے احکام اگر ان کی

خواہشات وہ مصلحتوں کے خلاف پڑتے ہوں اس کو اٹھا کر پھینک دیتے ہیں ایسا نہ کریں تو پیٹ اپھر جائے۔ یہ جابر و ظالم حکمران نہ انسانیت کے دوست اور خیر خواہ ہیں اور نہ خدا کے تابع فرمان اور وفادار ہیں۔ ان کی شمع عقل گل ہو چکی ہے کیونکہ ان کا معیار رد ہرا ہے قبول بر مبنی حق نہیں بلکہ اپنی ذاتی خواہشات ہیں۔ اسلام مغرور اور خود سر حکمرانوں کو برداشت ہی نہیں کرتا بلکہ ان کو بھی اسی طرح خدائی قانون کے شکنجے میں کس کر رکھتا ہے جس طرح قانون کی عمل داری معاشرے کے ایک عام فرد پر۔ اگر وہ اس کے خلاف ہوں تو اسلام انہیں ہمیشہ کے لیے نیست و نابود کر دیتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے (ترجمہ) ''جو جھاگ ہے وہ اڑ جایا کرتا ہے اور جو چیز انسانوں کے لیے نافع ہے، وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے''۔

ایک مطلق العنان بادشاہ کا واقعہ سنئے۔! شاہ نے ایک روز اپنے وزیر دربار امیر عباس ہویدا سے وقت پوچھا۔ اس نے جواب دیا ''چھ بجے ہیں'' شاہ نے مجلس شوریٰ کے صدر مہندس ریاضی سے پوچھا اس نے بھی چھ بجے بتایا۔ شاہ غصے سے بھر گیا اور غصے سے بولا! یہ بدبخت پانچ بجا رہی ہے۔ شاہ نے ٹائم درست کرنے لیے ناب کو چٹکی میں دبایا تو امیر عباس ہویدا چلایا ''قربانت شوم!'' یہ تم کیا کر رہے ہو، تمہارے غلام یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ حضور کو گھڑی درست کرنے کی زحمت اٹھانا پڑے۔ اسے یہی رہنے دیں، ہم ۳۵ ملین عوام اپنی اپنی گھڑیاں ایک گھنٹہ پیچھے کر لیتے ہیں۔ یہ شہنشاہ ایران محمد رضا شاہ پہلوی تھا۔ جسے اپنے اقتدار پر مان تھا جو سورج کو بجھ جانے اور ہواؤں کو ٹھہرنے کا حکم دیتا تھا۔ وہ خود کو مقدر ساز سمجھتا تھا اور جو لوگوں کو سانسیں بھی گن گن کر دیتا تھا۔ اس کے اشارے سے دنیا ادھر سے ادھر ہو جاتی تھی۔ ایک روز ایرانی شہنشاہیت کا اڑھائی ہزار سالہ جشن منانے کا فیصلہ کیا۔ ماہرین نے تاریخ کی کتابیں کھنگالیں تو معلوم ہوا ایران میں بادشاہت کو ابھی فقط ایک ہزار چار سو پندرہ سال گزرے ہیں جب محمد رضا شاہ پہلوی کو اس صورت حال سے مطلع کیا گیا تو اس نے کیلنڈر کو ایک ہزار پینتیس سال آگے کرنے کا حکم جاری کر دیا اور دلچسپ بات یہ ہے کہ کلینڈر کو واقعی ہی آگے کر دیا گیا۔

اب دوسری طرف دیکھئے۔ ایک بار حضرت عمرؓ آپ ﷺ کے حجرہ میں آئے تو دیکھا کہ آپ ایک چمڑے کے تکیہ سے جس میں کھجور کے پتے اور چھال بھری تھی ٹیک لگائے ایک کھردری چٹائی پر لیٹے ہوئے ہیں اور جسم مبارک پر چٹائی کے نشان پڑ گئے ہیں حضرت عمرؓ متاثر ہوئے اور آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ آپ ﷺ نے رونے کی وجہ پوچھی، عرض کی اے اللہ کے نبی! میں کیوں نہ روؤں جب میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ چٹائی کے نشان پشت مبارک پر پڑ گئے ہیں اور آپ ﷺ کا سارا اثاثہ البیت میرے سامنے ہے، ادھر قیصر و کسریٰ ہیں جو باغ و بہار اور عیش و آرام کے مزے لوٹ رہے ہیں اور حضور ﷺ اللہ کے رسول ﷺ ہیں اور ان سے بے نیاز ہیں'' ارشاد ہوا کہ اے ابن خطاب! کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ

ہم آخرت میں اور وہ دنیا۔ حضرت عمرؓ نے عرض کی، ہاں!

جابر حکمرانوں کے محلات ہوتے ہیں طرح طرح سے سجے ہوتے ہیں۔ نوکر چاکر ہر وقت آگے پیچھے رہتے ہیں زرق برق لباس پہنتے ہیں اور طرح طرح کے خورونوش کا سامان میسر ہوتا ہے لیکن آپ ﷺ کی کل کائنات تھوڑے سے جو، چمڑے کا چھال بھرا تکیہ اور چٹائی ہے تو اس ذات کو جابر مطلق العنان بادشاہ کہنا تنگ نظری اور تعصب کا نتیجہ ہے۔

اعتراض نمبر ۲۵۱

جس طرح بنوقینقاع اور بنونضیر کو ہلکی سزا دی گئی وہ سزا نہ دی گئی جس کے وہ مستحق تھے مگر بنوقریظہ کو ان کی نسبت سخت سزا دی گئی۔ (میور۔ اسپرنگر۔ ویل۔ اوسبرن)

جواب: انسانی فطرت کی ترکیب کچھ اس طرح واقع ہوئی ہے کہ کسی شخص کا جرم خواہ کتنا ہی سنگین کیوں نہ ہو مگر جب اسے سزا دی جاتی ہے تو وہ سزا بے رحمانہ، ظالمانہ معلوم ہوتی ہے۔ ہمارے جذبات کا دھارا انصاف و عدل کی بجائے رحم کی طرف بہہ نکلتا ہے۔ بعینہ اگر یہ مان لیں کہ بنوقریظہ کی سزا نہایت سخت تھی اور ان بے چاروں کی قسمت پر جس قدر روئیں اور جس قدر افسوس کریں کم ہے کہ جنہوں نے اپنے مقدر کا فیصلہ سعد بن معاذؓ کے ہاتھ میں دے دیا کیونکہ انہیں ان سے رعایت کی توقع تھی اور جس بات کی انہیں توقع تھی نتیجہ اس کے برعکس نکلا، کیوں مری غم خوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال۔۔۔ دشمنی اپنی تھی ،میری دوست داری ہائے ہائے۔

تمام ہمدردیوں اور محبتوں کے باوجود جذبات کی رو میں بہہ کر ان تمام واقعات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے بلکہ جرائم کو سامنے رکھا جانا چاہیے محض نرمی و التفات کے سبب عدل و انصاف کو بھینٹ نہیں چڑھانا چاہیے بلکہ ان کی اسلام دشمنی اور عہد شکنی بھی پیش نظر رہنی چاہیے جس کے وہ مرتکب ہوئے ہیں۔ وہ دشمنی اسلام میں اس قدر بڑھ گئے تھے کہ یہ یہوداہ کے پرستار بت پرستی کو قائم رکھنے کے لیے کفار و مشرکین مکہ کو ہلا شیری دیتے تھے حالانکہ یہ اہل کتاب تھے انہیں کسی طرح بھی عربوں کا ساتھ نہیں دینا چاہیے تھا۔ ''آرنلڈ'' کی طرح کچھ مسلمان بھی یہ کہنے کا حق رکھتے ہیں کہ ظالم و مفسد کا فنا کرنا اس سے سو درجہ بہتر ہے کہ وہ اپنی ناپاک صحبت سے بے گناہوں کو بھی آلودہ کرے۔ یہ مسلمان صرف ایک لفظ کے تغیر سے اس طرح کہہ سکتے ہیں ''آؤ ہم غور کریں کہ ہمارا اور ان تمام دوسری اقوام کا جو اس آسمان کے تلے آباد ہیں کیا حشر ہوا ہوتا اگر عربوں (دراصل اسرائیلوں) کی تلوار اپنا کام کفایت سے انجام دیتی، عربوں (دراصل اسرائیلوں) کی تلوار اپنے خونیں کارناموں کے ساتھ تمام ممالک عالم کے لیے دنیا کے دوسرے سرے تک رحم و کرم کے بیج بوگئی''۔ اگر عیسائیوں کی دلیل صحیح ہے اور ظالمانہ نہیں تو یقیناً

مسلمانوں کی دلیل اس کے خلاف نہیں ہو سکتی۔ دوسرے مسلمان بنی قریظہ کے اس خوفناک فیصلے کو اسی نظر سے دیکھ سکتے ہیں جس نظر سے کارلائل باشندگان ڈروغیڈہ کے قتل عام کے متعلق کرامویل کے وحشیانہ حکم کو دیکھتا ہے۔ ایک مسلح سپاہی ان جذبات کے ساتھ کہ وہ خدائے عادل کا سپاہی ہے ایک ایسا جذبہ ہے جو ہر سپاہی کے دل میں ہوتا ہے، کا احساس رکھنا چاہیے۔ موت کی طرح غضب ناک تقدیر کی طرح بے رحم، خدائی انصاف کو اس کے دشمنوں پر ظاہر کر رہا تھا۔

لیکن یہودیوں کو جو سزا دی گئی ہم اسے ان دونوں میں سے کسی ایک نقطہ نظر سے بھی نہیں دیکھتے۔ ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ اس وقت کے قوانین جنگ کے مطابق انہیں نہایت منصفانہ سزا دی گئی۔'' اس زمانہ کے رسوم جنگ کے مطابق قوانین کا پوری طرح اطلاق کیا گیا ان لوگوں نے اپنی بد قسمتی کو خود دعوت دی اور اپنی پسند و مرضی کا ثالث مقرر کروایا۔ ثالث کے فیصلہ کے سامنے سرِخم تسلیم کیا اور کوئی عذر یا بہانہ پیش نہیں کیا، چہ میگوئیوں سے کام نہ لیا کیونکہ انہیں بخوبی علم تھا کہ اگر وہ کامیاب ہو جاتے تو اپنے دشمنوں کو بغیر کسی افسوس کے ذبح کر ڈالتے۔ لوگ حضرت داوٗدؑ کی خون ریزیوں کو اس زمانہ کی روشنی میں دیکھتے ، قدیم عیسائیوں کی خوفناک خون ریزیاں خاص ''روشنیوں'' میں دیکھی جاتی ہیں۔ قدیم مسلمانوں کی دفاعی لڑائیاں کیوں نہ اس نقطہ نظر سے دیکھی جائیں لیکن نقطہ نظر خواہ کوئی ہو، بے تعصب دل جانتے ہیں کہ بنو قریظہ کی سزا میں آپ ﷺ پر کوئی الزام عائد نہیں ہو سکتا۔ حضرت سعد بن معاذؓ کے فیصلے کے بغیر بھی بنی قریظہ اگر قتل کر دیئے جاتے تو یہ اس زمانہ کے قوانین کے بالکل مطابق ہوتا لیکن انہوں نے اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے سعد بن معاذؓ کا خود ہی انتخاب کیا اور اپنے گناہوں کی سزا پالی۔ بنو قریظہ سزا کے مستحق تھے مگر انھوں نے اپنا فیصلہ اپنا ثالث مقرر کر کے کروایا۔ اس میں ہلکی یا زیادہ سزا کا نظریہ ملیامیٹ ہو جاتا ہے۔ اگر بنو قریظہ خود حکم مقرر کرنے کی درخواست نہ کرتے اور ثالث سے فیصلہ کروانے پر رضامند نہ ہوتے تو امید کی جاسکتی ہے کہ حکومت باقی دو قبائل (قینقاع اور بنو نضیر) کی طرح، ان کی سزا میں بھی رعایت برتتی۔ مگر یہ سزا ان کے اپنے مقرر کردہ اور منتخب کردہ ثالث کے کیے گئے فیصلہ کے مطابق تھی۔

۲: اس قبیلہ سے ذاتی عناد، رنگ و نسل کے امتیاز کے سبب دشمنی نہ تھی بل کہ ان کے اپنے گھناؤنے، کریہہ اور قبیح جرائم تھے ورنہ کئی یہود مدینہ میں تھے۔ وہ پر امن شہری تھے انھیں کچھ نہیں کہا گیا۔ سعد بن معاذؓ کے فیصلے کے بغیر بھی قتل کر دیا جاتا تو یہ اس زمانے کے قوانین کے بالکل مطابق ہوتا۔ لیکن انھوں نے اپنی قسمت کا فیصلہ سعدؓ سے کروانا بہتر سمجھا جب فیصلہ آ گیا تو انہوں نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ سعدؓ کا فیصلہ مسلمہ قوانین کے منافی نہیں ہے۔ جسے انہوں نے بلا چوں و چرا قبول کیا۔

اہم نکتہ: سزا کم تھی یا زیادہ: بنو قینقاع اور بنو قریظہ کو جو سزا دی گئی بہ قول مستشرقین ہلکی تھی۔ صرف

بنوقریظہ سے سختی برتی گئی؟ بنوقینقاع اور بنونظیر کی سزا حکومت نے دی تھی۔ان دوقبیلوں نے اپنی مرضی سے سزا کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔ یہ دوقبائل بھی موت کے مستحق تھے مگر حکومت مدینہ نے انھیں موت کی بہ جائے جلاوطنی کا حکم دے دیا۔ جہاں تک بنوقریظہ کی سزا کا تعلق ہے انھوں نے سزا کا فیصلہ اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنی مرضی کا حکم مقرر کر کے حکومت سے درخواست کی۔اب فریقین ثالث کے فیصلے کے پابند ہیں۔لہذٰا حکومت وقت کی طرف سے بنوقریظہ کو یہ سزا انھیں دی گئی۔تو پھر مذکور دوقبائل کی سزا کو کم اور بنو قریظہ کی سزا کو زیادہ وسخت کہنا بے جا ہے۔

۲: ثالث کا فیصلہ مبنی بر انصاف تھا۔بنوقریظہ کو سزا کتاب مقدس کے مطابق دی گئی تھی نیز دستور مدینہ کے مطابق بھی۔اس قبیلہ کی سزا تورات و دستور مدینہ کے مطابق ہے۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ سزا نہ کم تھی نہ زیادہ بل کہ تورات مقدس کے قانون اور دستور مدینہ کے مطابق تھی۔جو سزا دی گئی وہ اس کے مستحق تھے۔

محض ایسے بے بنیاد وضعی بیان اور مفروضوں سے ثابت کرتے ہیں کہ اسلام، پیغمبر اسلام ﷺ اور مسلمان (نعوذ باللہ) ظلم و بربریت کے داعی ہیں۔اگر مسلمانوں کو غلبہ نصیب ہوا تو وہی کریں گے جو جو ان کے پیغمبر نے مدینہ کے یہودیوں کے ساتھ کیا۔

ایسا ہرگز نہیں اور نہ ہی یہ اسلامی تعلیمات کے مطابق ہے۔ارشاد خداوندی ہے۔(ترجمہ): کہہ دو اے اہل کتاب! آؤ ایک کلمہ کی طرف جو تمھارے اور ہمارے درمیان مشترکہ ہے وہ یہ ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور ہم ایک دوسرے کو اللہ کے سوا کسی کو رب نہ بنائیں اور اگر وہ پھر جائیں تو انھیں کہو ہم مسلمان ہیں"۔اسلام میں جبر نہیں۔تاریخ شاہد ہے کہ اسلام میں کسی فرد واحد کو مجبوراً مسلمان نہیں بنایا جاتا۔

اعتراض نمبر ۲۵۲

قبیلہ اوس کے ضحاک بن خلیفہ، سلمہ بن سلامہ، مختب بن قشیر اور حاطب بن امیہ سرگرم تھے کہ کسی نہ کسی طرح بنوقریظہ کو بچایا جا سکے لیکن سعدؓ بن معاذ نے یہ سمجھا کہ جاہلی عصبیت کے طوفان کو روکا نہ گیا تو ان کا مدنی معاشرہ میں قبیلہ عبداللہ بن ابی کی سطح پر پہنچ جائے گا۔ چناں چہ فیصلہ پر عمل درآمد کے وقت حضرت سعدؓ نے بنواوس کے ہر ذیلی قبیلہ کو دو دو قیدی قتل کرنے کے لیے دیے تا کہ اسلام سے وابستگی کا عملی مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے دامن خلوص سے یہود نوازی کے داغ کو مٹا دیں۔(سیرت طیبہ: پروفیسر غلام ربانی۔۱۷۶)

۲: چبائے ہوئے نوالوں کو دوبارہ چبانے کی کوشش کی ہے یعنی مذکور اعتراض سے ملتی جلتی بات "واٹ" بھی کہتا ہے کہ سعد بن معاذ کے فیصلہ کے پس منظر یہ ہے چوں کہ زمانہ جاہلیت کی رفاقتوں کا زور ٹوٹنے میں نہیں آتا تھا اور اس قبیلے کی اکثریت ان ناروا تعصّبات سے تا حال دامن چھڑا نہیں سکی تھی اور بنو

قریظہ کی حمایت میں جائز و ناجائز کو پھلانگ گئے تھے۔ اِس لیے اب چارہ کار صرف یہ رہ گیا تھا کہ اس فاسد عقیدے کی بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے اور اوس وخزرج کے پرانے جھگڑے انگڑائی لے کر پھر سے جاگ اٹھیں اور اسلامی تعلیمات دفتر گاؤ خورد قرار پائیں گی۔ (حوالہ بالا)

جواب: جاہلی عصبیت کے طوفان کا دوبارہ اٹھنے کا خدشہ یا اوس وخزرج کے پرانے جھگڑے اٹھ کھڑے ہونے کا ڈر اور خوف ہوتا تو فیصلہ ہی ان کی مرضی کا کر دیا ہوتا جس سے سارے خدشات ہی مٹ جاتے لیکن ان خطرات کی اہمیت پر کاہ کی بھی نہیں کیوں کہ فیصلہ یہودیوں کی کتاب مقدس کے مطابق اور ان کے منتخب کردہ حکم نے کیا تھا۔ اور جن لوگوں نے بنوقریظہ کو بچانے کی کوشش کی انھوں نے احتجاج کیا نہ ہنگامہ برپا کیا۔ کوئی دھونس، دھمکی یا علیحدہ جماعت بنانے کا اعلان کیا اور نہ ہی فیصلے کے ماننے اور اس پر عمل کرنے سے انکار کیا۔ ہوسکتا ہے کہ بنوقینقاع اور بنونضیر کے مدمقابل بنوقریظہ کی اس سزا کو سخت سمجھتے ہوں اور معافی کے طلب گار ہوئے ہوں مگر اس کا وقت گزر چکا تھا سر سے پانی اونچا ہو چکا تھا۔ اس وقت سب سے بڑھ کر خرابی یہ ہوتی کہ ثالث کے فیصلے کو حتمی قرار نہ دیا جاتا اور آئندہ ہر فیصلہ میں تبدیلی ہوتی رہتی یا تبدیلی کا امکان موجود ہوتا جس سے ثالث کی حیثیت کم زور پڑ جاتی اور انصاف کی جگہ بے انصافی عود کر آتی۔ نیز اس فیصلہ پر عمل درآمد نہ ہونے کی صورت میں کتاب مقدس کا انکار تھا۔ فیصلہ الہامی کتب کے مطابق نہ ہونے سے لوگوں کی اپنی اپنی مرضی کا فیصلہ ہونے لگتا گویا دین الٰہی نہ رہتا' اپنی اپنی مرضی کا دین بن جاتا۔ مسلمان جو شروع دن سے جس دین کو اپنا اوڑھنا بچھونا سمجھے ہوئے تھے وہ کسی موڑ پر کسی مصلحت پر اس سے کنارا کش اور روگرداں نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ کبھی بھی اس بات کے مصداق نہیں ہو سکتے تھے۔

زباں پر مصلحت دل ڈرنے والا
بڑا آیا محبت کرنے والا

لہٰذا دو دو قیدی بنو اوس کے ہر ذیلی قبیلہ کو قتل کرنے کے لیے دیئے جو موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے کسی نے چوں و چرا نہ کی۔ ایسے ایمان افروز واقعات سے اسلامی تاریخ بھری پڑی ہے۔ جنگ بدر میں ابوبکرؓ اپنے صاحب زادے کی تلوار کی زد میں آ گئے انھوں نے باپ سمجھ کر وار نہ کیا۔ اس بات کا ذکر اپنے باپ سے کیا تو انھوں نے فرمایا بیٹا! اگر تم میری تلوار کی زد میں ہوتے تو بچ نہ پاتے۔ دین اسلام میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے فرمان کو دیکھا جاتا ہے۔ رشتہ داریوں اور قرابتوں کو نہیں دیکھا جاتا۔ مستشرقین بھول جاتے ہیں کہ دانش مند ''سولن'' نے اپنے چھوٹے سے قصبے یا شہر کے تحفظ کے لیے ایتھنیز کے باشندوں کے لیے لازمی قرار دیا تھا کہ وہ مفسدوں کا تعاقب کریں اور فساد اور شورش کی صورت میں دو مخالف گروہوں میں سے ایک کے ساتھ شامل ہو جائیں اور یوں حکومت کی طرف سے سزا

دینے والے بن جائیں ۔ وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ عیسائی انگلستان کا قانون بھی ہر شخص کو اجازت دیتا ہے کہ وہ کسی راندہ قانون کا پیچھا کرے اور اسے قتل کر دے۔ (روح اسلام ۔حاشیہ۔۱۶۶۔۱۶۷)۔ یہ معاہدہ شکن تھے۔مسلمانوں کے مخالفین کی مدد کرنے والے تھے بلکہ مسلمانوں کے خلاف لڑے۔یہی مملکت سے غداری ہے۔

اعتراض نمبر۲۵۳

''مارگولیس کہتا ہے کہ چوں کہ سعد بن معاذ (رضی اللہ عنھہ) کو اس جنگ میں قریظی نے تیر سے زخمی کیا تھا جس سے بالآخر ہلاک ہو گئے۔اس لیے انھوں نے بنو قریظہ کی نسبت ایسا بے رحمانہ فیصلہ کیا''۔(سیرت النبی۔۲۵۳)

جواب:اس مذکورہ بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ بنو قریظہ کا قبیلہ جنگ خندق میں شامل تھا کیوں کہ مارگولیس کہتا ہے کہ قریظی نے سعد بن معاذؓ کو تیر مارا تھا۔اس سے ولیم میور کا استدلال کہ بنو قریظہ جنگ خندق میں شریک نہ تھے باطل ٹھہرا۔مستشرقین کا ایک ہی واقعہ کے متعلق مختلف رائے کا اظہار ان کے دھرے الزام کا رد ہے وہاں اس واقعہ کی حقیقت اور سچائی سامنے آجاتی ہے۔مذکورہ اعتراض کے رد میں کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے خود ہی ایک دوسرے کا رد کرتے ہیں۔نہ جانے ان میں جھوٹا کون؟ بل کہ دونوں ہی کے اعتراض جھوٹ پر مبنی ہیں۔ان دو مستشرقین کی تضاد بیانی سے الزامات باطل ٹھہرتے ہیں۔ آیئے حقیقت کو پانے کی کوشش کرتے ہیں۔

''ایک عالم کی رائے ہے کہ مارگولیس کی کتاب آنحضرتؐ کی سوانح عمری پر لکھی گئی کذب و افترا ٗنفرت و تعصب کا نمونہ ہے۔اس کا کوئی کمال ہے تو یہ کہ سادہ سے سادہ اور معمولی واقعہ کو جس میں برائی کا کوئی پہلو نہیں نکل سکتا ہے صرف اپنی طباعی کے زور پر بلا کا منظر بنا دیتا ہے۔مسند احمد بن حنبل کی ضخیم کتاب کا ایک ایک لفظ پڑھنے والا بخاری و مسلم کی اس روایت سے کیونکر بے خبر رہا؟ یا اس کو اہمیت نہ دی یا اس کو اپنے مقصد کے مخالف جان کر توجہ نہ دی کیوں کہ وہ ہر بات کو ہیر پھیر سے مشکوک بنانے میں طاق ہیں۔یہاں بھی چالاکی اور ہوشیاری سے کام لے کر سعد بن معاذؓ کو تیر لگا کہہ کر قریظی کے ذمہ ڈال دیا اور اس کا نام بھی نہیں بتاتا۔سچ ہے کہ دروغ گو را حافظہ نباشد۔ بخاری کی کتاب المغازی باب مرجع النبیؐ من الاحزاب وخروجہ الی بنی قریظہ ومحاصرہ ایاھم کی حدیث میں تصریح ہے''ہم سے زکریا بن یحیی نے بیان کیا' کہا ہم سے عبداللہ بن عمرؓ نے کہا ہم سے ہشام بن عروہ نے انھوں نے اپنے والد عروہ بن زبیر سے انھوں نے حضرت عائشہؓ سے انھوں نے کہا کہ سعد بن معاذؓ کو جنگ خندق میں حبان بن عرقہ قریش کے ایک آدمی نے تیر مارا۔وہ ہفت اندام کی رگ میں لگا۔(جس کا خون مشکل سے بند ہوتا ہے) آنحضرتؐ نے ان کے لیے

مسجد کے قریب یا مسجد نبوی میں ایک خیمہ لگا دیا تا کہ نزدیک سے ان سے پوچھ لیا کریں۔ آخر وہ انتقال کر گئے۔ اللہ ان سے راضی ہو۔ (بخاری جلد ۶۔ ۲۱۴) یہ تھا الزام جس سے مار گولیس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ثالث (نعوذ باللہ) نے انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے جانب داری اور طرف داری سے کام لے کر فیصلہ کیا۔ اپنی انتقامی دشمنی کی بنا پر ان کے قتل کا حکم دیا۔ سوال یہ ہے کہ سعد بن معاذؓ کی دشمنی اور جانب داری کا علم بنو قریظہ کو تھا تو انھوں نے جان بوجھ کر اپنے دشمن کو ثالث مقرر کیوں کیا؟ انھوں نے خود کو ہلاک کرنے کا اختیار انھیں کیوں سونپ دیا؟ حال آنکہ وہ خوب جانتے تھے اور وہ (بنو قریظہ) سعدؓ کو خیر خواہ سمجھتے تھے۔ قابل اعتبار جان کر بنو قریظہ نے انھیں ثالث مقرر کیا تھا۔ وہ کبھی بھی اعتبار نہ کرتے اگر کسی قریظی نے انھیں تیر مارا ہوتا۔ یہ سب ان کے اپنے بہانے ہیں۔ مسلمانوں کو نشانہ تنقید بنانے کے منصوبے ہیں اور پھر مستند حوالے سے قریظی کے ہاتھوں تیر نہ لگنے کا ثبوت میسر ہے تو پھر ایک طرف دار عیسائی کی بات کیونکر قابل قبول ہو سکتی ہے اور یہ کہنا کہ؟ سعدؓ تو موقع کی تلاش میں تھے کہ ایسا وقت آئے کہ میں بنو قریظہ سے انتقام لوں اور ان کی انتقامی آگ ٹھنڈی ہو سکے۔ یہ سب تصنع اور بناوٹ ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ تیر ایک قریش کے آدمی سے لگا لیکن مار گولیس سفید جھوٹ بول کر قریظی (آدمی) کا نام لیتا ہے۔ یہ اس کی علمی خیانت ہے کہ کام کسی نے کیا اور کھاتے میں کسی کے نام ڈال دیا۔

اعتراض نمبر ۲۵۴

بعض مستشرقین نے یہ لکھا ہے کہ ہجرت کے بعد ابتدائی سالوں میں حضورؐ کو اہل مدینہ میں حاکمانہ اقتدار میسر نہ تھا۔ (ضیاء النبی ۳۔ ۲۰۱)

جواب: بیعت عقبہ ثانیہ میں اہل یثرب کے ستر سے زائد افراد نے اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد آپ ﷺ کو مدینہ آنے کی دعوت دی تو اس وقت جن امور پر اہل یثرب نے بیعت کی تھی وہ ایسے امور ہیں جن سے مذکور اعتراض خاک بوس ہو جاتا ہے۔ صاحب ضیا النبی کہتے ہیں کہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ بہ حوالہ موفق الدین ابن قدامہ لکھتے ہیں ''تم اس بات کی میرے ساتھ بیعت کرو کہ ہر حالت میں میرا ہر فرمان سنو گے اور اس کو بجالاؤ گے اور تنگی و خوش حالی میں اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے۔ لوگوں کو اچھی باتوں کا حکم دو گے اور بری باتوں سے روکو گے اور اللہ کی رضا کے لیے حق کہو گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا اندیشہ نہ ہو گا نیز جب میں تمھارے پاس آؤں گا تو تم میری مدد کرو گے اور حملہ آور دشمنوں سے جس طرح تم اپنی جانوں کی اپنی ازواج کی اور اپنی اولاد کی حفاظت کرتے ہو اس طرح میری بھی حفاظت کرو گے۔ اس کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ تمھیں جنت عطا فرمائے گا''۔ اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کا مدینہ تشریف لانا ایک حاکم اعلیٰ کی حیثیت سے تھا۔

اس روایت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آپ کے فرمان کی تعمیل اوس وخزرج کے آدمیوں پر لازمی تھی اور وقت نے ثابت کیا کہ انھوں نے کسی مرحلہ اور کسی موڑ پر لمحہ بھر کے لیے آپ کا ساتھ نہیں چھوڑا بل کہ آپؐ کے معمولی اشارہ پر جان و مال، عزت وآبرو یعنی ہر شے تج کر کے آپؐ کے دامن سے وابستہ رہے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کے دامن سے وابستگی فلاح دارین ہے۔ اسی کو انھوں نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔

دوم: مستشرقین کو یہ بھی نظر نہیں آتا کہ دستور مدینہ میں آپؐ کی آئینی حیثیت کے ساتھ ساتھ آپؐ کی رسالت کو نہ صرف اوس وخزرج بل کہ یہودیوں کے قبائل اور ان کے حلیف قبائل نے تسلیم کیا۔ اس کی شق نمبر ا سے ظاہر ہے اس سے بڑھ کر انھیں اقتدار کی اور کون سی سند درکار ہے نیز میثاق مدینہ کی متعدد دفعات میں اس امر کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ اہل یثرب میں کسی قسم کا نزاع پیدا ہوگا تو اس کے حل کے لیے وہ بارگاہ نبوت سے رجوع کریں گے اور آپ ﷺ جو فیصلہ فرمائیں گے وہ آخری ہوگا۔ ہر شخص پر اس فیصلہ کی پابندی لازمی ہوگی اس میں مدینہ طیبہ کے سارے باشندے شامل تھے۔ مسلمان، یہودی اور مشرکین کوئی بھی مستثنیٰ نہ تھا اس سے بڑھ کر حاکمانہ اقتدار کس کو کہتے ہیں؟ ان وضاحتوں کے بعد یہ خیال کرنا کہ مدنی زندگی کے ابتدائی سالوں میں آپ ﷺ کو اقتدار اعلیٰ حاصل نہ تھا، حد درجہ کوتاہ فہمی ہے۔ ابتدائی مدنی زندگی کے زمانہ میں آپؐ کو محض ایک قبیلہ کے سردار کی حد تک محدود کرنا باطل ہے۔

میثاق مدینہ کی متعدد دفعات میں اس امر کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ اگر اہل یثرب میں کسی قسم کا نزاع پیدا ہوگا تو اس کے حل کے لیے وہ بارگاہ نبوت سے رجوع کریں گے اور آپ ﷺ جو فیصلہ فرمائیں گے وہ آخری ہوگا ہر شخص پر اس فیصلہ کی پابندی لازمی ہوگی اس میں مدینہ طیبہ کے سارے باشندے شامل تھے۔ مسلمان، یہودی اور عیسائی کوئی بھی مستثنیٰ نہ تھا اس سے بڑھ کر حاکمانہ اقتدار کس کو کہتے ہیں ان وضاحتوں کے بعد پھر بھی یہ خیال کرنا کہ مدنی زندگی کے ابتدائی سالوں میں آپ ﷺ کو اقتدار حاصل نہ تھا، حد درجہ کوتاہ فہمی ہے۔

اعتراض نمبر ۲۵۵

مستشرقین کہتے ہیں کہ ''ابتداء ہی سے مطمع نظر دنیاوی اقتدار تھا اور جب یہ اقتدار میسر آ گیا تو نعوذ باللہ ممکنہ داد عیش دی۔

جواب: اولاً یہ اعتراض مذکورہ اعتراض کی ضد ہے۔ ایک میں اقتدار میسر نہیں تھا جب کہ دوسرے میں اقتدار ہاتھ آ گیا کا ذکر ہے۔ مستشرقین کی تضاد بیانیاں ایک دوسرے کے اعتراض کا رد ہیں۔ آپؐ کا کار رسالت چالیس سال کی عمر میں شروع ہوتا ہے جب کہ عیش وعشرت کا زمانہ اس عمر

سے پہلے کا ہوتا ہے۔اس کے بعد عام شخص میں بھی پختگی اور جذبات میں مضبوطی آ جاتی ہے۔ بدکردار آدمی کے کردار میں بھی ٹھہراؤ آ جاتا ہے۔آپؐ کی تیرہ سالہ مکی دور روشن ترین نظر آتا ہے۔ہجرت کے بعد چھ سال تک یعنی صلح حدیبیہ تک دشمنوں کی طرف سے طرح طرح کے برے وار' اور انتہائی گھٹیا درجے کے حربے استعمال کیے جاتے ہیں۔صلح حدیبیہ کے وقت آپؐ کی عمر ۵۹ سال کے لگ بھگ تھی۔ اب عیش وعشرت کا امکان صرف باقی کے تین چار سال کا رہ جاتا ہے۔اس دوران انھیں یہ حالات کیوں نظر نہیں آتے یعنی فتح خیبر' فتح مکہ' جنگ حنین' محاصرہ طائف اور جعرانہ کی مصروفیات کے علاوہ غزوہ تبوک اور کئی چھوٹی مہمات' وفود کی آمد، حجۃ الوداع، جیش اسامہ کی روانگی وغیرہ سب آخری چار سال کی کاروائیاں ہیں۔نہ جانے انھیں ان ایام میں عیش کوشی کے کون سے آثار نظر آتے ہیں اور یہ الزام دھر کر شرم سار نہیں ہوتے۔اس پر مورخین ومحدثین متفق ہیں کہ آپؐ کی زندگی نہایت سادہ اور مصروف تھی۔ گھر کے کام کاج خود کر لیتے تھے بل کہ دوسروں کے کام بھی کر دیا کرتے تھے۔اپنا جوتا خود گانٹھ لیتے اور لباس کو پیوند لگا لیتے تھے۔آپؐ کا بستر کھردرا، کھجور کی چھال کا تکیہ، کھجور کی چٹائی سامان راحت تھا۔شاہانہ لباس نہ پہنا بل کہ ریشم کو تمام مرد مسلمانوں کے لیے ممنوع قرار دیا۔اوڑھنے کے لیے کالی کمبل تھی۔سفری خیمہ، غسل خانےِ ایک پتھر کا برتن اور ایک لکڑی کا ٹب تھا۔ وصال کے وقت ترکہ میں ایک درہم نہ چھوڑا۔گھر میں روشنی کے لیے چراغ میں تیل نہ تھا۔ورثے میں چند زرہیں' تلواریں، نیزے، خود، ڈھال اور چند مویشی چھوڑے نہ کوئی ذاتی جائیداد نہ مکان نہ دکان صرف چھوڑا تو ورثاء کے لیے صرف ایک اللہ تعالیٰ کی ذات جو ان اللہ علی کل شی قدیر ہے۔

کارلائل کہتا ہے''ہم بڑی غلطی کریں گے اگر ہم ان صاحب ﷺ کو ایک ایسا لذت پسند شخص گردانیں گے جو بنیادی طور پر گھٹیا عیش کوشی کی طرف مائل ہو (جب کہ) وہ کسی بھی قسم کی لطف اندوزی سے گریز کرتے تھے۔(مغرب کا انداز فکر۔۳۳۷)

شہر مدینہ کی ریاست کا ایسا سیاسی نظام قائم کیا کہ ایک لچکدار قابل عمل کے ماتحت ایک مرکز پر متحد تھا جس کی بنیاد خون پر نہیں جس سے ہر طرف بدامنی اور لاقانونیت پھیلتی ہے۔طاقت ور کا راج ہوتا ہے اور غریب کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا لیکن آپ ﷺ معاشرے کی بنیاد خون پر نہیں دین پر رکھی جس کی نظر میں تمام افراد یکساں تھے۔''ویلہازن'' لکھتا ہے''مکمل حاکمانہ اختیار کے ساتھ پہلا عربی معاشرہ حضرت محمد ﷺ کے ہاتھوں شہر مدینہ میں قائم ہوا لیکن خون کی بنیاد پر نہیں جو لامحالہ اختلافات کو جنم دیتا ہے بلکہ دین کی بنیاد پر جس کا اطلاق ہر فرد پر یکساں طور ہوتا ہے۔''اس منشور نے ساری انفرادیتوں کو زندہ درگور کر دیا، نیا معاشرہ وجود میں آیا جس میں مرکزی قیادت قائم ہوئی اس سے جان ومال اور آبرو کا تحفظ ہو گیا بدامنی کا دور دورہ ختم ہو گیا، تمام افراد

مذہبی واحدت میں پر دیئے گئے ۔تمام برادری اور مساویانہ حقوق کے حق دار بن گئے ڈاکٹر حمید اللہ لکھتا ہے'' ایک چھوٹی سی بستی کو جو چوبیس ایک محلوں پر مشتمل تھی شہری ملکیت کی صورت میں منظّم کیا گیا اور اس کی قلیل لیکن بوقلموں اور کثیر الاجناس آبادی کو ایک لچکدار اور قابل عمل دستور کے تحت ایک مرکز پر متحد کیا گیا اور ان کے تعاون سے مدینہ میں ایک ایسا سیاسی نظام چلایا گیا جو بعد میں ایشیاء، یورپ اور افریقہ کے تینوں براعظموں پر پھیلی ایک وسیع اور زبردست شہنشاہیت کا بغیر کسی دقت کے صدر مقام بھی بن گیا۔''

اعتراض نمبر ۲۵۶

''واٹ'' کہتا ہے کہ جوں جوں محمد ﷺ کی طاقت میں اضافہ ہوتا گیا اسی طور ان کے مال و دولت میں اضافہ ہوتا گیا''۔

جواب: مسٹر جان گلب رقم طراز ہے'' نبی نے کبھی دولت اکٹھی نہ کی حتیٰ کہ سہولت سے بھی استفادہ نہ کرتے تھے۔آپ ؐ کی خوراک اور لباس از حد سادہ اور گھریلو سامان بھی مختصر تھا۔فراوانی کے ایام میں بھی انھوں نے ذاتی ضرورتوں کو انتہائی محدود رکھا۔(امہات المومنین اور مستشرقین۔۱۸۲)

حضرت عفان بن مسلمؓ جناب ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا'' وفات کے وقت آپ ؐ نے اپنے پیچھے نہ کوئی دینار و درہم چھوڑا نہ ہی کوئی غلام یا کنیز چھوڑی''۔ (حوالا بالا۔۱۷۷) ہاشم بن قاسم جناب ابو ہریرہ سے روایت کرتے ہیں'' مہینوں پر مہینے گزر جاتے مگر پیغمبر اسلام ﷺ کے گھر روٹی پکانے یا کھانا تیار کرنے کے لیے چولہا نہ جلتا تھا۔(۱۷۸)

''برٹرام تھامس'' کہتا ہے'' ان میں غرور اور تکبر نام کو بھی نہ تھا۔ریا کاری اور بناوٹ بالکل نہ آتی۔ آپ ؐ چرب زبان نہ تھے اور فضول بات نہ کرتے تھے۔وہ قول کے پکے دیانت دار شخص تھے۔صورت حال یہ تھی کہ بہ وقت وفات بھی آپ ﷺ کی کئی ملکیتی اشیاء ایک یہودی کے پاس گروی تھیں اور ان میں وہ ڈھال بھی شامل تھی جس کی رقم سے آپ ؐ نے تین وقت کی خوردنی اشیاء خریدی تھیں۔ جناب محمد ﷺ کو شان و شوکت سے نفرت تھی اور وہ انتہائی سادہ زندگی گزارتے تھے۔انتہائی عجز و انکسار آپ ؐ کی زندگی کا خاصا تھا۔ چولہا خود جلاتے۔فرش پر جھاڑو دیتے بھیڑوں کا دودھ خود نکالتے۔اپنے کپڑوں پر پیوند خود لگاتے اور اپنے جوتوں کی خود مرمت کرتے۔آپ ؐ کی ذات میں سادگی بہ درجہ اتم موجود تھی۔(امہات المومنین۔۱۸۳)

''جے جے سانڈرز'' لکھتا ہے'' آپ کی عادات اتنی سادہ تھیں کہ آخری ایام میں جب مدینہ منورہ میں بیٹھ کر پورے عرب کی حکمرانی کر رہے تھے تب بھی اپنے کپڑے اور اپنے جوتے بھی خود مرمت کرتے تھے۔آپ ؐ کا زہد و اتقاء خلوص پر مبنی تھا جس میں کسی قسم کا دکھاوا نہ تھا۔

(امہات المومنین۔۱۸۳)

یہ درست ہے کہ فتوحات سے بہت سا غنیمت اور عشر خزانہ ریاست میں جمع ہونے لگا جسے نبیؐ مسلمانوں میں بالعموم غربا اور حاجت مندوں میں بالخصوص تقسیم فرما دیتے۔ اپنے یا اپنے خاندان کے استعمال کے لیے کچھ بچا نہ رکھتے تھے۔ یہی وہ دھوکہ جسے شاید واٹ بھی نہ سمجھ سکا مال تو آیا مگر اپنی ذات کے لیے جوڑ کر نہیں رکھا، ضرورت مندوں، غریبوں میں تقسیم فرما دیا۔ مگر واٹ کو مال کی تقسیم نظر نہیں آتی اور نہ ہی اپنی ذات پر خرچ نہ کرنے کی تاریخی اوراق سے آگاہی ہوتی ہے۔ محض تعصب ہے جو ایسی باتوں سے عیاں ہوتا ہے۔ واٹ کو چاہیے تھا کہ بتاتا کہ مال میں اضافہ ہوتا گیا وہ آپ نے کس بنک یا کس جگہ چھپا کر رکھا ہوا تھا؟ مال کے آجانے سے گھر کا چولہا کیا خوب جلنے لگا تھا؟ کیا مال کے اضافہ سے امہات المومنین کا مطالبہ پورا کرنے کے لیے وسائل موجود تھے؟ مطالبات پورا نہ کرنے کی صورت میں کیا آپؐ نے ایک مہینے تک ایلاء نہیں فرمایا تھا؟ سورہ احزاب آیات ۲۹۔۲۸ میں ہے۔

''اے نبی اپنی بیویوں سے فرما دیجئے کہ اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی آرائش چاہتی ہو تو آؤ میں تمھیں مال دوں اور مناسب طور پر فارغ کر دوں اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور آخرت کا گھر چاہتی ہو تو بے شک اللہ نے تمھاری نیکیوں کے عوض بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔ یہ حکم خداوندی امہات المومنینؓ کو سنایا کہ یا تو تم پیغمبر خدا ﷺ کا انتخاب کر کے آخرت کی زندگی لے لو یا دنیا کی آسائش لے لو۔ ساتھ یہ بھی تاکید کی کہ جواب میں جلدی نہ کرنا والدین سے مشورہ کر لو۔ سیدہ عائشہؓ نے جواب دیا میں اپنی ذات کے لیے اپنے والدین سے مشورہ نہ کروں گی۔ میں پیغمبر اور آخرت کی زندگی کو پسند کرتی ہوں باقی ازوج مطہراتؓ نے بھی ایسا ہی کیا کیا یہی مال میں اضافہ ہے کہ گھر کا خرچہ نہیں چل پاتا؟

جنگ حنین میں چھ ہزار قیدی چوبیس ہزار اونٹ چالیس ہزار بکریاں چار ہزار اوقیہ (چھٹانک) چاندی غنیمت میں حاصل ہوئی۔ آپؐ نے ان میں سے ایک چیز کو اپنے لیے روانہ رکھا۔ گھر سے جس خیرو برکت سے تشریف لائے تھے ویسے ہی واپس چلے آئے۔ معلیٰ بن زیاد نے حسن سے روایت کی ہے کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک سوالی آیا۔ فرمایا بیٹھو خدا دے گا۔ پھر دوسرا آیا پھر تیسرا آیا۔ حضور ﷺ کے پاس اس وقت انھیں عطا کرنے کو نہیں تھا۔ اتنے میں ایک شخص آیا اور اس نے چار اوقیہ چاندی آپؐ کے حضور پیش کی۔ حضور نے ایک ایک اوقیہ تو ان کو دے دی اور ایک اوقیہ کی بابت پکار بھی دیا مگر کوئی لینے والا نہ اٹھا۔ رات ہوئی تو حضور ﷺ کو نیند نہیں آتی۔ اٹھتے ہیں نماز پڑھنے لگتے ہیں۔ پھر ذرا لیٹ جاتے ہیں ۔ پھر اٹھ جاتے ہیں اور نماز پڑھنے لگتے ہیں۔ ام المومنینؓ نے پوچھا: حضور ﷺ کو آج کچھ تکلیف ہے؟ فرمایا نہیں۔ انھوں نے پوچھا تب کوئی خاص حکم خداوندی آیا ہے جس کی وجہ سے یہ بے قراری ہے فرمایا نہیں۔ ام المومنین نے کہا پھر حضور آرام کیوں نہیں کرتے؟ اس وقت حضورؐ نے وہ چاندی نکال کر دکھا

دی۔ فرمایا یہ ہے جس نے مجھے بے قرار کر رکھا ہے۔ مجھے ڈر لگا کہ مبادا یہ میرے پاس ہو اور میری موت آ جائے۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے ''نبی ﷺ نے اپنی وفات کے بعد کوئی سکہ چاندی یا سونے کا یا بکری یا اونٹ دنیا میں نہیں چھوڑا اور نہ کسی شے کی بابت کوئی وصیت فرمائی۔ (رحمت للعالمین ۲۔۳۳)

فتح خیبر کے بعد اہل خیبر کی درخواست پر ان کی زمینیں انھیں کے پاس رہنے دیں اور انھیں بے دخل نہ کیا۔ وہ ان زمینوں پر بہ طور کاشت کار کام کریں گے۔ آدھی پیداوار خود کو اور نصف مسلمانوں کو دیں گے۔ ہر سال انصاری صحابی حضرت عبداللہ بن رواحہ پیداوار کی وصول کے لیے بھیجے جاتے تھے۔ آپؐ کے جان نثار کا واقعہ سنئے۔ حمص کی فتح کے موقعہ پر پہلے مرحلہ پر مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی اور اہل حمص سے جزیہ وصول کیا گیا۔ چند روز بعد جنگی مصلحت کی بنیاد پر حمص چھوڑ کر شام جانے کا فیصلہ کیا۔ مسلمان سپہ سالار حضرت ابوعبیدہ بن الجراح نے تمام شہریوں کو اکٹھا کر کے خطاب کیا کہ اہل شہر سے جزیہ ان کے دفاع کی ذمہ داری کرنے کے لیے وصول کیا گیا تھا۔ اب ہم آپ کا دفاع نہیں کر سکتے تو اس جزیہ پر ہمارا کوئی حق نہیں۔ تمام جمع شدہ رقم انھیں واپس کر دی۔

ایک اور ایمان افروز واقعہ سنئے۔ حضرت صہیبؓ رومی بہ غرض ہجرت اپنا زادِ سفر لیے مدینہ کو روانہ ہوئے تو مشرکین مکہ نے ان کا راستا روکا اور کہا یہاں فقیر اور محتاج ہو کر آئے تھے اب غنی اور صاحب مال ہو گئے ہو اس مال و متاع کے ساتھ ہم تمھیں مدینہ ہرگز نہ جانے دیں گے۔ انھوں نے سارا مال ان کے حوالے کر دیا اور ذرا برابر تامل نہ کیا اور مدینہ چلے آئے۔ (محمد رسول اللہ۔۱۶۲) ان کے پیروکار مفاد پرست، لالچی، حریص اور دولت کا ذخیرہ کرنے والے نہ تھے اور نہ ہی کالا دھن کماتے تھے۔ وہ دیانت و امانت اور سچائی کے پیکر ہی تو تھے وہ اللہ اور اس کے رسول کے سچے پکے فرماں بردار بھی تھے۔ مال و دولت، جائیداد، مکان جو اپنا سب کچھ مکہ چھوڑ کر مدینہ چلے آئے تھے۔ کوئی شے بھی ان کا راستا نہ روک سکی۔ حتیٰ کہ رشتہ داریاں تک تج کر کے اسلام کے نام لیواؤں میں سے ہو گئے۔ تو بھلا ان کے آقا و مولا کب مفاد پرست ہو سکتے ہیں۔ فتح مکہ کے موقعہ پر آپ ﷺ نے مہاجرین سے کہا کہ وہ اپنے اپنے مکانوں اور املاک سے دست بردار ہو جائیں۔ (پیغمبر امن۔۱۰۸) کوئی اور ہوتا تو اپنی جائیداد و مال و منال سے دست برادری تو کجا وہ اپنے دشمنوں کو ہر قسم کی جائیداد سے بے دخل کر کے جلاوطنی پر مجبور کر دیتا یا سب کو تہہ تیغ کر کے کھوپڑیوں کے مینار تعمیر کرتا اور جشن مناتا مگر رحیم و کریم آقا ﷺ کی دریا دلی، رحمت و شفقت کہ کسی سے تعارض نہ کیا۔

مَاتَرَكَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ دِينَاراً وَّلَا دِرهَماً وَّلَا شَاةً وَّلَا بَعِيراً وَّلَا أَوصٰى بِشَيءٍ''۔ ترجمہ: (نبی مکرم نے اپنی وفات کے بعد کوئی سکہ چاندی یا سونے کا یا بکری یا اونٹ دنیا میں نہیں چھوڑا اور نہ کسی شے کی بابت کوئی وصیت فرمائی)

فرانس کا وزیر اور مورخ لا مارٹن کہتا ہے کہ ''دور حاضر کی عظیم ترین تاریخی شخصیات میں سے کون سی ایسی شخصیت ہے جسے انسانی نقطہ نظر سے آنحضرت ﷺ کا ہم پلہ قرار دیا جا سکے۔ کیوں کہ مشاہیر میں سے مشہور ترین ہستیوں نے صرف افواج کو حرکت دی۔ قوانین میں ردوبدل کیا اور حدود مملکت میں توسیع کی تحریکیں چلائیں اور اکثر اوقات یہ تحریکیں ان کی اپنی زندگی ہی میں زوال پذیر ہو گئیں۔ انھوں نے کوئی ایسی تحریک نہیں چلائی جس کی بنیاد مادی اقتدار کے حصول کے علاوہ کسی بالاتر اخلاقی و انسانی اقدار پر ہو۔ برعکس دیگر حضور ﷺ نے افواج، قوانین، مملکت ملکی پیداوار اور کرہ ارض کے لاکھوں کروڑوں انسانوں کی اصلاح کی تحریک چلائی۔ علاوہ ازیں آنحضرتؐ نے اپنی تحریک سے بادشاہوں کے مصاحبین، جھوٹے خداؤں، ادیان باطلہ، افکار و معتقدات اور ارواح کو متاثر کیا۔ پھر ایک کتاب کی اساس پر ہے ہر حرف کو قانون کا درجہ حاصل ہے۔ ایسی روحانیت کی بنیاد رکھی جس کے آگے جملہ لسانی و نسلی قومیتوں کی چکا چوند ماند پڑ گئی اور باطل معبودوں کے خلاف بغض اور غیر مادی اکلوتے خدا کی محبت اس اسلامی قومیت کی ایک لافانی حیثیت و خصوصیت قرار پائی۔ (محمد رسول اللہ۔ ۳۱)

اعتراض نمبر ۲۵۷

۱۔ مکی زندگی سے مدنی زندگی مختلف تھی اور نبوت کا تسلسل برقرار نہ رہا۔ واٹ اس کی دلیل یہ لاتا ہے کہ مدنی زندگی کے ابتدائی زمانہ میں کچھ عرصہ کے لیے یہود مدینہ سے یہ مطالبہ نہیں کیا تھا کہ وہ ان کو نبی و رسول کی حیثیت سے تسلیم کر لیں۔ (ن۔ ۱۱۔ ۵۳۵)

۲۔ ایک عام وزنی الزام یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی زندگی مکہ تک تو پیغمبرانہ رہی، مدینہ جا کر بادشاہی میں بدل گئی اور وہاں لشکر، انتقام اور خون ریزی کا بازار گرم رہا۔

۳۔ حضور ﷺ کے لیے (خاکم بدہن) ''ڈکٹیٹر'' کا لفظ استعمال کیا۔ (مائیکل ہارٹ) (۱)

جواب: ''واٹ'' مکی مدنی زندگی کا موازنہ کرتے ہوئے راہ اعتدال سے ہٹ جاتا ہے لیکن ہملٹن گبن نے اس حقیقت کو عیاں کر دیا۔ وہ مکی و مدنی زندگی کا موازنہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ''ان دونوں ادوار میں کوئی تفاوت نہیں ہے۔ مکی زندگی میں جو بات مضمر ہے Implicit تھی۔ مدنی دور میں وہ ظاہر یعنی Explicite ہو کر سامنے آ گئی۔'' ''واٹ'' گومگو کی حالت میں ہے اور کھل کر مدلل جواب نہیں دیتا کہ آپؐ کی مدنی زندگی میں کیا تغیر پیدا ہوا تھا؟ مدنی دور کے وہ کون سے اقدامات ہیں جو شان نبوت کے منافی اسے نظر آتے ہیں؟ ''واٹ'' کے اس اعتراض کے لیے آر باسورتھ سمتھ کی رائے قارئین کے زیر نظر لانا چاہوں گا۔ وہ کہتا ہے ''مجموعی طور پر میرے لیے حیران کن بات یہ نہیں کہ محمدؐ مختلف حالات میں کس قدر بدل گئے۔ اصل حیرانی کی بات یہ ہے کہ آپ کس قدر کم بدلے۔ صحرا میں ایک گلہ

بان کے طور پر، شام کی طرف جانے والے ایک تاجر کے طور پر، مدینہ میں ایک جلاوطن کے طور پر، ایک مسلم فاتح کے طور پر، شاہانِ کسریٰ وقیاصرہ روم کے مدمقابل، غرض جس حیثیت سے بھی دیکھیں ہمیں آپ کی شخصیت کے اندر ایک بامعنی وحدت نظر آتی ہے۔ مجھے اس امر میں شبہ ہے کہ کسی بھی دوسرے انسان کے خارجی حالات اس قدر تبدیل ہوئے ہوں اور پھر بھی ان حالات کا سامنا کرتے ہوئے بہ ذات خود وہ اس قدر کم تبدیل ہوا ہو۔ یہاں واقعات وحوادث تبدیل ہو گئے ہیں۔ شخصیت کا جوہر بہ ہر صورت یکساں رہا''۔ گبن کے بیان میں بھی ''کس قدر کم بدلے'' کے الفاظ محل نظر ہیں اور تعجب خیز ہیں۔ مسئلہ تو آپ کی زندگی میں تغیر کا ہے کم یا زیادہ بدلنے کا نہیں۔

کم یا زیادہ تبدیلی وتغیر کو مان لیں تو گویا یہ تسلیم کر لیا کہ آپ کی حیات طیبہ میں تغیر رونما ہوا تھا جو کسی بھی صورت میں صداقت پر مبنی نہیں۔ آپؐ کے مکی اور مدنی عہد ہمایوں کی زندگی میں کسی قسم کا تغیر رونما ہوا ہی نہیں۔ وہی ہوتا رہا، وہی کرتے رہے جو ودیعت ہوتا رہا۔ آپؐ بغیر رضائے الٰہی کے کچھ نہیں کہتے تھے۔ " وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ" آیت اس پر دال ہے اور یہ عمل ہمیشہ رہا۔

''واٹ'' اپنے بیان کی تردید کرتے ہوئے کہتا ہے ''پیغمبر اسلام ﷺ نے جو کچھ کہا اور کیا وہ غیر معمولی سنجیدگی کا مظہر ہے۔ اگر آپ کو کسی طور بھی غیر سنجیدہ کہا جائے تو آپ ﷺ کے دور میں اور بعد ازاں بھی اسلام کی تیز رفتار اشاعت وترقی ایک لاینحل امر ہے۔(محمد رسول اللہ۔۳۵۶)

جواب: آنحضرتؐ سے قبل دین میں تحریف سے دین ایک ذاتی میراث بن چکا تھا۔ عوام کی اپنی مرضی اور انسان کی ذہنی پیداوار کا مرقع تھا۔ اس کی کوئی ریاستی حیثیت نہ تھی۔ مختلف ادیان کے لوگ ایک ہی گھر میں گزر بسر کرتے تھے۔ مدینہ پہنچنے کے بعد مندرجہ ذیل فوری مسائل حل طلب تھے۔(۱) مقامی باشندوں کے اور اہل اسلام کے حقوق وفرائض کی وضاحت۔

(۲) بحالی مہاجرین کے انتظامات۔

(۳) غیر مسلموں سے تعلقات اور مفاہمت۔

(۴) شہر کے سیاسی اداروں کا قیام اور اس کا تحفظ۔

(۵) قریش مکہ سے مہاجرین کے جان و مال اور آبرو کا تحفظ اور نقصان کی تلافی وغیرہ۔ ان مسائل کے علاوہ ہر وقت قریش کی طرف سے مدینہ پر لشکر کشی کا خطرہ رہتا تھا۔ مدینہ کے دس سالہ قیام میں ان کی زندگی کے آخری دن تک مسلمانوں نے تقریباً ۸۳ جنگیں لڑیں۔ اس طرح اوسطاً ایک سال میں آٹھ سے زیادہ جنگیں بنتی ہیں۔ آپ کی مدنی زندگی نہایت مصروفیات سے بھری ہوئی تھی۔ اس سے مستشرقین کے اس اعتراض کہ آنحضرتؐ کی مدنی زندگی کشائش سے بھرپور تھی' خاک بوس ہو جاتا ہے۔ نیز

نبوت کا تسلسل نہ رہا کا اعتراض بھی ختم ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ اپنی مصروف زندگی میں تمام کام بہ خوبی سرانجام دیتے رہے۔ کسی میں بھی کمی نہ آئی۔ خواہ وہ مذہبی یا دینی ہوں۔ سیاسی و معاشرتی ہوں۔ ملکی یا غیر ملکی ہوں۔

ڈی ایس مارگولیتھ (محمد اینڈ رائٹر آف اسلام) میں رقم طراز ہے۔ ''مکہ سے ہجرت کے بعد پیغمبرؐ نے ایک محنتی خود مختار، فرماں روا کی طرح جو فوجی مہمات کو بھی منظّم کیا، ملاقاتیوں کو شرف باریابی بخشا، سفارت کار بھیجے، دعوت اسلام کے خطوط بھی دیگر بادشاہوں کے نام لکھوائے۔ ان کے علاوہ شکایات اور عرض داشتیں سن کر انصاف بھی بہم پہنچایا اور قانون کی تشریحات اور توضیحات بھی بتائیں۔ ایک دن کا آرام بھی اپنے لیے روا نہ رکھتے ہوئے انھوں نے مسلسل کام کیا۔ ہمہ وقت لوگوں کو سنتے اور مشاورت کے لیے تیار رہتے اور کوئی بھی موضوع ہو عنان فیصلہ اپنے ہاتھوں میں رکھتے اور اس دنیا سے رحلت فرمانے تک ہر لحظہ پھلتی پھولتی اور وسعت پذیر اہل ایمان کی جماعت جس کی بنیاد خود انھوں نے رکھی اور جس کے وہ خود دینی و دنیاوی منتظم تھے اور جملہ خارجی و داخلی امور کی خود نگرانی کرتے رہے مگر آخری دور میں ایک مکمل مذہبی نظام مرتب و تشکیل دے کر جملہ امور ریاست کو مختلف نمایندوں کے سپرد کر دیا تاکہ وہ ان امور کو سرانجام دیتے رہیں''۔ وہ مزید لکھتے ہیں'' ایک سپہ سالار، مقنن، منصف اور سفارت کار کی حیثیت سے فرائض کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ پیغمبر اسلام ﷺ نے بہ طور مبلغ و معلم اپنے فرائض کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ تمام ممکنہ مسائل کے حل کے لیے ہمیشہ ان کی رائے طلب کی جاتی اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انھوں نے اپنی صائب رائے سے انھیں حل نہ کر دیا ہو''۔ (امہات المومنین۔ ۱۰۵)

اوپر مارگولیتھ کے بیان میں ہے کہ تمام مناصب کے فرائض کی ادائیگی کے ساتھ پیغمبر اسلام ﷺ نے مبلغ و معلم کے فرائض انجام دیئے۔ یہی کارِ نبوت کا تسلسل ہے۔ دیگر مسائل میں گھر کر اس کام سے کنارا کش نہیں ہو گئے تھے اور کارِ پیغمبرانہ سے لاتعلقی اختیار نہیں کی تھی۔ (۲)

جواب: حج کے موقعہ پر مدینہ کے چند آدمیوں نے جو بنو خزرج قبیلہ سے تھے عقبہ کے نواح میں ملاقات کی اور قرآن کریم کی آیات کی تلاوت فرمائی اور اسلام کی دعوت دی۔ ان میں سے چھ سات آدمی مسلمان ہو گئے۔ ابو امامہ، سعد بن زرارہ، عوف بن حارث، رافع بن مالک، قطبہ بن عامر و عقبہ بن عامر اور جابر بن عبداللہ۔ (۲،۳ حیات محمد) آئندہ سال پھر حج کے موقع پر بہتر آدمی اسلام لائے۔ اور اقرار کیا کہ ''ہم نے آپؐ کے ہاتھوں پر بیعت کی ہے آرام ہو یا دکھ، تنگی ہو یا فراخی، خوف ہو یا امید، کامیابی ہو یا ناکامی ہم ہر حال میں آپ کی صداقت کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ ہم کسی کی ملامت سے متاثر نہیں ہوں گے۔ ان حضرات نے آپ ﷺ کو مدینہ آنے کی دعوت دی۔ آپ مطمئن تھے کہ جو اللہ تعالیٰ نے فرض نبوت تفویض کیا تھا اس کی ادائیگی میں سرگرم عمل تھے۔ جس طرح مکہ اور اس کے گرد و نواح پیغام

توحید پہنچایا جاتا تھا اس طرح مدینہ میں بھی کلمۃ الحق کی تعلیم دی جارہی تھی خود بھی عمل پیرا تھے اور اوروں کو بھی عمل پیرا ہونے سے استثنیٰ یا کھلی چھٹی نہیں دے رکھی تھی کہ عمل کریں یا نہ کریں۔ یہ چھوٹ ہرگز نہ تھی۔

مکہ میں اور اس کے گردونواح کے قبائل کو اسلام کی دعوت جس طرح دی جاتی تھی مدینہ آکر بھی اس کے اطراف واکناف کے قبائل سے معاہدے بھی کیے اور دعوت حق بھی دی۔ جس سے اسلام پھیلنے لگا۔ مکی دور میں اسلام کا پرچار نہایت مشکل اور کٹھن تھا۔ اس کے باوجود تمام ابتلا و آزمائش، ظلم وستم اور جبر وتشدد کو مشیت ایزدی کے تحت برداشت کرتے رہے۔ اسی طرح مدینہ میں آکر تمام حائل رکاوٹوں کو صبر و تحمل اور حوصلہ و جرات سے برداشت کرتے رہے۔ صرف دشمنان دین کی سازشوں اور مسلمانوں کو مٹانے کی کاروائیوں کی روک تھام کے لیے مدافعاتی حکمت عملی کے تحت تلوار اٹھانا پڑی۔ تلوار کا نیام سے باہر آنا صرف اور صرف دشمنوں سے اپنا دفاع کرنے کے لیے تھا یہ نہیں کہ مدینہ میں طاقت ملی تو بال و پر نکل آئے تو انتقام لینے کے لیے تلوار لہرادی۔ ایسا کچھ بھی نہیں تھا بل کہ مکہ میں مدافعاتی طور پر بھی تلوار نہ اٹھائی جس کی وجہ یہ تھی کہ بارگاہ خداوندی سے اذن جہاد نہ ملا تھا۔ اب اذن جہاد مل چکا تھا، پھر بھی مدافعاتی حکمت عملی پر اکتفا کیا۔ کسی کو زبردستی اسلام کا پیرو نہیں بنایا گیا اور نہ ہی بہ زور شمشیر اسلام پھیلانے کی منصوبہ بندی کی۔ ”لا اکراہ فی الدین“ اس صریح ممانعت کے ہوتے ہوئے مسلمان خلاف ورزی نہیں کر سکتے تھے۔

مدینہ آکر زندگی پیغمبرانہ نہ رہی بل کہ شاہی میں بدل گئی۔ وہ زندگی شاہانہ کیسی تھی؟ ایک نظر اس بادشاہ عالم کے زندگی کے شب وروز اور رہن سہن پر ڈالتے ہیں۔

”مسجد نبوی کے پہلو میں آپ کا گھر، اللہ کے گھر کی طرح ناپختہ تھا جس کی چھت بھی مسجد کی چھت کی طرح کھجور کی ٹہنیوں سے بنی ہوئی تھی۔ گھر کے دروازے کے کواڑ نہ تھے۔ دروازہ پر کمبل کا پردہ پڑا رہتا تھا۔ حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ ”لڑکپن میں بلوغ سے پہلے حضورؐ کے گھروں میں گیا ہوں۔ چھتیں اتنی نیچی تھیں کہ میں ہاتھ اٹھا کر ان کو چھوسکتا تھا“۔ حافظ ابویعلیٰ نے اپنی مسند میں لکھا کہ ”حضورؐ کے دروازوں کو انگلیوں کے ناخن سے ٹھونکا جاتا تھا کیوں کہ ان میں کنڈیاں نہ تھیں۔ یہ تھا مدینہ میں بادشاہ کے شاہی محل کا نقشہ۔ کیا اقوام عالم کے بادشاہوں کے محلات ایسے ہی ہوتے ہیں۔ لیکن کسی کو شاید یہ خیال آئے کہ مسجد میں کھلنے والا نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کا دروازہ پورے کا پورا چاندی کی چادر سے منڈھا ہے اور قفل بھی چاندی کا ہے۔ اور در اقدس سنگ مرمر کا ہے۔ جس مکان کے کواڑ چاندی کے اور چبوترا (دروازے کا وہ حصہ جس پر پاؤں رکھ کر داخل ہوا جاتا ہے) سنگ مرمر کا ہے۔ تو اندر سے کس قدر عالی شان ہوگا۔ آپ کے حجرے کی نوعیت تو اوپر بیان ہوئی۔ یہ چاندی کے کواڑ والا بی بی عائشہؓ کا حجرہ ہے جس کا چبوترا جس میں آپ کا

وصال ہوا' آج بھی اسی حالت میں ہے جیسے پہلے تھا۔ البتہ اس کے اردگرد ایک پختہ چاردیواری بنی ہوئی ہے۔ یہ تھی دس لاکھ مربع میل کے شاہ دوجہاں کی رہائش گاہ۔ کیا یہ پیغمبرانہ رہائش گاہ کا نظارہ ہے یا کسی بادشاہ کے محل کا منظر؛ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس بستر پر لیٹنے کی جو آخری رات تھی اس کے روشن کرنے والے نے چراغ میں تیل کسی پڑوسی سے قرض لے کر کیا تھا اور جو چادر اس وقت مریض واپسیں پر پڑی تھی جب بعد میں دیکھا گیا تو صرف پھٹا ہوا ایک سیاہ کمبل تھا جس کے اوپر تلے پیوند لگے تھے۔ اس کی زرہ تیس صاع پر جو ایک یہودی کے ہاں گروی رکھی ہوئی تھی۔ جاننے کے بعد نہ ماننے والو! جھوٹ کے خول میں پناہ پکڑنے والو! سوجھ رہا ہے کچھ، دیکھ رہے ہو جو اس بستر پر لیٹا ہوا ہے۔ انصاف کے خونیو کیا یہی مکہ کا درویش ہے جس کے متعلق تمھاری غلیظ زبانوں نے واویلا اور غل مچایا ہے کہ وہ مدینہ کا بادشاہ بن بیٹھا تھا۔ اور کیا آج اس کا یہ حال ہے کہ دس سال کی مدت میں کسی نے اس کے گھر سے روز دھواں اٹھتے نہیں دیکھا؟

تین مہینے تک صرف پانی اور خشک کھجوروں پر گزر بسر ہو رہی ہے۔ فاقہ مستوں نے بھی کبھی بھوک کی شدت میں پیٹ پر دو دو پتھر باندھے ہیں؟ بادشاہوں کی لڑکیوں کے ہاتھ میں آٹا پیسنے کا گٹھا اور پانی والی مشک کے نشان گردن پر ہوتے ہیں؟ ایسی بادشاہی دنیا کے کس خطہ میں پائی گئی ہے جس کے بچوں کو دو دو تین تین دن بھوک کی شدت میں دن کو رات اور رات کو دن کرنا پڑا ہو؟

بادشاہوں کا قصر اسی کو کہتے ہیں جن کے کھجور کے پتوں کی چھت اتنی اونچی تھی کہ آدمی کا ہاتھ لگتا ہو؟ مدینہ کے بادشاہ کا شاہی محل تو اس وقت بھی موجود ہے۔ اس کے طول وعرض کو ناپ سکتے ہو؟ کتنے ایکڑ پر محیط ہے۔ کیسے کیسے پتھروں سے بنا ہے؟ کیا اس محل کی چھت بارش سے ٹپکتی ہے؟ باہر میں اس کے کچھ بھی ہو لیکن اندر تو اس کا وہی ہے جو پہلے تھا۔ (باہر والے حصہ کو بعد میں بنایا جیسے بھی بنایا)

مختصر یہ کہ ترپن سال یا تیرہ سال تک دل کا اسی طرح مشاہدہ کرایا گیا جس طرح دس سال تک مدینہ میں دماغ کا بھی کھلی روشنی میں تجربہ کرایا گیا۔ (ن۲۔۴۹۸)

آپؐ کی زندگی سادہ تھی۔ گھریلو کام بھی کر لیتے تھے۔ اپنے لباس کو پیوند لگاتے اور نعلین مبارک ٹھیک کر لیتے۔ رہائش گاہ ناپختہ، کھردرا سخت بستر، کھجور کی چھال سے بھرا تکیہ وغیرہ سامان استراحت تھا۔ کھجور کی چٹائی، اوڑھنے کو کالی کمبل، سفر کے لیے ایک خیمہ عام اور سادہ لباس زیب تن کرتے۔ دربار میں زیب وزینت کی کوئی چیز نہ تھی۔ امتیازی تخت وتاج نہ تھا۔ مسجد کے کچے فرش پر دربار سجتا تھا۔ کھجور کے خشک تنے سے ٹیک لگاتے۔ مسجد اور حجروں کی چھت کھجور کے پتوں کی بنی ہوئی۔ حجروں کی چھت اتنی بلند کہ کھڑے آدمی کا ہاتھ لگ جاتا۔ بیت المال میں کوڑی نہ تھی۔ دولت جو آتی صحن مسجد نبوی میں ڈھیر کر دی جاتی اور مستحقین میں فوراً تقسیم کر دی جاتی۔ وصال کے وقت ترکہ میں ایک درہم ودینار نہ چھوڑا۔

گھر میں سوائے کم مقدار جو کے اور خورونوش کے لیے کچھ نہ تھا۔ کل جہاں ملک اور جو کی روٹی غذا۔

سامان حرب میں تلواریں، زرہیں، خود، ڈھال کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ کوئی ذاتی جائیداد اور مال نہ تھا۔ صرف ایک شے اپنے ورثاء کے لیے اور رہتی دنیا تک انسانیت کے لیے چھوڑی۔ وہ چیز تھی ''اللہ''۔ یہ تمام نک نقشہ مدنی دور کا ہے جس کو معترضین بادشاہی کہتے ہیں۔ جسے معترضین نبوت کا تسلسل برقرار نہ رہا کہتے ہیں۔ جسے مستشرقین نبوت بادشاہی میں بدل گئی کہتے ہیں۔ بھلا اوپر کی جزئیات پر نظر ڈال کر آپ کی زندگی کی کل کائنات کا جائزہ لیں تو کیا کہیں بادشاہت کا شائبہ ہوتا ہے؟ ظاہر ہے کہ جس طرح کارِ نبوت شروع کیا تھا آخر دم تک اسی طرح جاری و ساری رہا۔ کبھی اور کسی موقع پر بھی کارِ نبوت کے تسلسل میں فرق نہ آیا اور نہ ہی نبوت بادشاہی میں ڈھلی بل کہ دنیائے عالم کی بادشاہیاں نبوت میں آ کر ڈھل گئیں۔

اعتراض نمبر کا دوسرا جز

جواب: اس اعتراض کا جواب دیا گیا ہے لیکن ایک اور زاویہ نگاہ سے اس اعتراض کا دوبارہ جواب ملاحظہ کیجئے۔ آنحضرت نے جتنی لڑائیاں لڑیں ان میں سے اکثر صرف ایک ہی قبیلے کی مختلف شاخوں سے ہوئی ہیں۔ یعنی بنوالیاس بن فہر، یہ وہ قبیلہ ہے جس سے خود حضورؐ ہیں۔ یہ لڑائیاں عصبی وجوہات کی بناء پر واقع ہوئیں جو عموماً بھائی بند اپنے کسی معزز اور نامور بھائی سے کرتے ہیں مگر یہ اعلائے کلمۃ الحق کے سبب تھیں۔ آپ ﷺ کی پوری زندگی مبارک میں جو سرایا یا غزوات ہوئے ان میں زخمی، مقتولین اور قیدیوں کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

نام فریق	اسیر	زخمی	مقتول	کل
مسلمان	۱	۱۲۷	۲۵۹	۳۸۷
کفار	۶۵۶۴	۰	۷۵۹	۷۳۲۳
میزان	۶۵۶۵	۱۲۷	۱۰۱۸	۷۷۱۰

قیدی، زخمی اور مقتول کی کل تعداد ۷۷۱۰ ہے جس میں صرف مقتول ۱۰۱۸ اور زخمی ۱۶۷ ہیں جب کہ جنگ عظیم ۱۹۱۴ تا ۱۹۱۸ کے مقتولین کی تعداد روس ۱۷ لاکھ، جرمنی ۱۶ لاکھ، فرانس ۱۲ لاکھ ستر ہزار، اٹلی ۴ لاکھ ساٹھ ہزار، آسٹریا ۸ لاکھ چھ ہزار، ترکی ۲ لاکھ پچاس ہزار، بیلجئیم ایک لاکھ ۲ ہزار، بلغاریہ ایک لاکھ، رومانیہ ایک لاکھ، امریکہ پچاس ہزار، میزان ۷۲ لاکھ چھتیس ہزار (اس میں زخمی، اسیر اور گم شدہ کی تعداد شامل نہیں ہے۔ (سلسبیل سیرت مصطفیٰ نمبر ماہ نامہ لاہور۔ ص ۱۹۴، ۱۹۳)

مستشرقین کس منہ سے کہتے ہیں کہ مدینہ میں آ کر خون ریزی کا بازار گرم رہا۔ ۸۶، ۸۸ یا اس

سے اوپر سرایا اور غزوات میں مسلمانوں اور مخالف کے اسیر، زخمی اور مقتول کی تعداد ۱۱۴۶ ہے۔ یہی معرکہ خون ریزی تھا؟ وہ خون ریزی کا بازار گرم تھا، کہتے ہیں ان کے بارے یہی کہا جا سکتا ہے کہ ''بایں عقل و دانش بباید گریست''۔

آپ پر خون ریزی کا الزام دھرا جاتا ہے جو حق اور ناحق کی تمیز مٹا ڈالتا ہے۔ اس میں معاہدہ شکنی، دھوکہ دہی اور سفاکیت جیسی تہمتیں بھی لگائی جاتی ہیں۔ ان الزامات کا محرک عیسائیت اور عیسائیت کی ثنویت کارفرما ہے۔ عیسائیت نے عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید دونوں کو اپنا رکھا ہے۔ ان کی تعلیمات میں تضاد ہے۔ عہد نامہ قدیم کا خدا ''رب الافواج ہے اس کے تمام احکامات جنگی قسم کے ہیں۔ وہ اپنے اسرائیلی دشمنوں کا قلع قمع کرنا چاہتا ہے۔ ان کو زندہ رہنا ناقابل برداشت دیکھتا ہے۔ لوٹ مار، آتش زنی اور قتل عام کا حکم جاری کرتا ہے۔ اس کے برعکس عہد نامہ جدید کو خون ریزی اور آدم کشی سے کوئی سروکار نہیں۔ اس کا خدا امن کا سلامتی کا خدا ہے۔ مسکنت اور مظلومیت کی تعلیم دیتا ہے۔ ایک رخسار پر تھپڑ کھانے والا اپنا دوسرا رخسار پیش کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس تضاد سے عیسائیت نے بے انتہا فائدہ اٹھایا۔ مغرب کی ہر قوم جنگوں میں غالب آنے کے لیے عہد نامہ قدیم کے احکامات پر عمل کر کے خون کی ندیاں بہا دیتی ہے اور اگر مغلوب ہو جائے تو عہد نامہ جدید کی تعلیم امن و سلامتی یاد آتی ہے۔ اپنی جنگ کو عہد نامہ قدیم کے حکم کی تعمیل جانا اور دوسری اقوام کی جنگوں کو عہد نامہ جدید کی تعلیم کے خلاف خون ریزی سے منسوب کیا۔ مغربی خون ریزی پر خوشی کا اظہار کیا اور اسے یسوع کی فتح مندی سے تعبیر کیا۔ عیسائیت کی نصرت اور سربلندی کا نام لیا اور اپنی جنگوں میں کی گئی خون ریزی کو مقدس جنگ کہا لیکن دوسروں کی مقدس جنگ کو عہد نام جدید کی رو سے سنگین جرم قرار دیا یعنی انہیں خون خوار اور قاتل کہا گیا۔ یہی حربہ اور یہی الزام مستشرقین نے اسلام کے سر دھرا۔ جو ان کی تضاد بیانی اور دوغلا پن کی تعلیم کا نتیجہ ہے جس کا حقیقت سے دور تک کا واسطہ نہیں۔ (مستشرقین مغرب کا انداز فکر۔۳۲۳) (۳)

مائیکل ہارٹ نے حضور ﷺ کے لیے جو لفظ استعمال کیا وہ تعصب اور نفرت کا آئینہ دار ہے جبکہ ارشاد خداوندی ہے ''مَن يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللهَ (النساء۔۸۰) (ترجمہ) جس نے رسول کی اطاعت کی پس یقیناً اس نے اللہ کی اطاعت کی''۔ آپ ﷺ قانون الٰہی کی پیروی کا مطالبہ مومنین سے کرتے تھے اس پر آپ ﷺ خود بھی پیروکاروں سے بڑھ کر عمل کرتے تھے۔ آپ ﷺ عفو و درگزر کی تعلیم دیتے تھے اور خود اس کا نمونہ پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ ہر وقت آپ ﷺ کا ہر عمل ایک نمونہ ہے اور اس کا نقطہ کمال آپ ﷺ کی پوری زندگی پر محیط ہے اس نمونہ کی ایک بے نظیر جھلک فتح مکہ کی دیکھیے جہاں آپ ﷺ نے عظیم الشان نمونہ پیش کیا اور اپنے دشمنوں اور مخالفین کو خطاب کیا اور فرمایا جاؤ آج تم سب آزاد ہو کسی سے کوئی باز پرس نہیں ہو گی۔

آپ ﷺ کئی موقعوں پر اپنے صحابہؓ سے مشاورت فرماتے تھے اپنی ذاتی رائے کو کسی موقعہ پر بھی دوسروں پر نہیں ٹھونسا بلکہ ان کے مشورہ کو پذیرائی بخشی ۔ جنگ بدر میں آپ ﷺ نے پڑاؤ کیا اس پر حضرت خباب بن منذرؓ کو تحفظات تھے انہیں جب معلوم ہوا کہ جگہ کا فیصلہ وحی الٰہی سے نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ کی ذاتی رائے سے ہے تو انہوں نے ایک دوسرے مناسب مقام پر ڈیرہ ڈالنے کی تجویز پیش کی جسے آپ ﷺ نے شرف قبولیت بخشا۔ یہ بات بدیہی درست ہے کہ عہد رسالت میں اسلامی نظم حکومت قرآن وسنت کی بنیادی اور غیر متبدل ہدایات کے ساتھ اصول شورائیت پر مبنی تھا اس کا کسی قسم کی ڈکٹیٹر شپ کے ساتھ دور دور کا تعلق نہیں تھا۔

جابر و مطلق العنان بادشاہ نہ کسی کی سنتا ہے نہ مانتا ہے نہ ہی کسی سے مشورہ لینے کی زحمت گوراہ کرتا ہے اور نہ ہی کوئی اسے مشورہ دینے کی جرات کرتا ہے۔ وہ اپنی سوچ کو حتمی سمجھتا ہے اپنی ہی سوچ سے حکمرانی کی شان امتیازی اور نشہ اقتدار کے جابرانہ طمطراق اور ٹھاٹھ باٹھ، ظالمانہ طریقے، لوٹ مار اور خون ریزیوں سے اپنی عظمت کو برقرار رکھتا ہے لیکن ڈھائے گئے ظلم وستم سے پیدا شدہ نفرت وتعصب اور انتقام کی آگ بھڑک اٹھتی ہے جو سرد ہونے کا نام نہیں لیتی۔ جابرانہ دھونس اور دھمکی سے قائم کردہ حکومت تباہی کے گڑھے گرتی ہے محلات زمین پر دھڑام سے آگرتے ہیں۔ فتح مندیوں اور کامیابوں کے فلک بوس مینار، زمین بوس ہوجاتے ہیں اور ان کی کامرانیوں اور عظمتوں کا پرچم تار تار ہوجاتا ہے عروج وزوال کی داستانیں شاہد ہیں۔ دارائے ایران، سکندر اعظم خاقان چین کی کامیابیاں دیکھے نہیں ملتیں ان الم ناک شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ حجاج عراقی، چنگیز و ہلاکو، ہونوں، کشاں اور داہریوں کے انتہا درناک مظالم کے ساتھ ساتھ رچرڈ، لوئی اور ولیم کے جور وظلم اور استبدادی کے باعث ان کی متعلق العنانیوں کے نام ونشان تک مٹ گئے مختصر یہ کہ ظالم، جابر اور مطلق العنان بادشاہوں کی عزت وعظمت اور کامیابی وکامرانی تہس نہس ہوجاتی ہے۔

آپ ﷺ صادق وامین تھے انسانی ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی انسانیت کی خیر وبھلائی کے دلدادہ تھے صلح وآشتی کے علمبردار اور بے غرض و بے لوث انسان تھے آپ ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ﷺ ہیں۔

فتح مکہ کے موقع پر بڑے بڑے ظالم وخوانخوار بھیڑیئے گردنیں جھکائے کھڑے ہیں ان میں وہ بھی تھے جو آپ ﷺ کے خون کے پیاسے تھے، ان میں وہ بھی تھے جنہوں نے آپ ﷺ کی صاحبزادی کو ہلاک کیا۔ وہ بھی تھے جنہوں نے آپ ﷺ کے چچا حمزہؓ کی لاش کا مثلہ کیا اور کچا کلیجہ چبا ڈالا۔ وہ سارے لوگ بھی تھے جنہوں نے بہ دل وجان ہر قسم کے داؤ لگائے کہ شجر اسلام کی بیخ کنی ہوسکے۔ آپ ﷺ نے انتقام لیے بغیر سب کو معاف فرمادیا۔ ان کی جگہ کوئی مطلق العنان بادشاہ ہوتا تو انسانی سروں

کی کھوپڑیوں سے منیار بنواتا اور کچھ کھوپڑیوں کو بطور جام شراب استعمال کرتا۔ ہر قسم کی جائداد اور مال و متاع سے بے دخل کر کے اپنے قبضے میں لے لیتا اس پر ہی بس نہیں بلکہ انہیں جلا وطنی کی سزا دی جاتی دوسری طرف دیکھئے کہ عام معافی کا اعلان ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ انعام و اکرام " وما ارسلنك الا رحمة للعالمين " کی شان ہے۔

اعتراض نمبر ۲۵۸

کارِ نبوت کی ابتداء تو ایمان داری سے یہودی، عیسائی طور طریقوں اور نظام کو اپنایا اور اپنے مذہب کی بنیاد انھیں بنایا لیکن جب مطلب حل ہو گیا اور اقتدار مل گیا تو ان سے برات کا اظہار کر دیا اور پھر انھیں بالکل باطل مردود قرار دے دیا۔ (سرولیم میور)

جواب: اللہ ایک ہے۔ ہر شے کو اسی نے پیدا کیا ہے۔ غریبوں کی مدد کریں۔ یتیموں سے نرمی اور ان کا مال ہڑپ نہ کیا جائے۔ بیواؤں کو ٹھکانہ دیا جائے، عورتوں کے ساتھ حسن سلوک روا رکھا جائے۔ مسافروں کی مدد اور محتاجوں کی دست گیری کی جائے۔ کسی کو بے جا تنگ نہ کیا جائے وغیرہ وغیرہ۔ یہ ایسے امور ہیں کہ دنیا کے کسی بھی مذہب میں پائے جاتے ہیں۔ یہ اچھی باتیں اور اس قسم کی دیگر باتیں اگر آنے والا دین بیان کرے تو یہ نہ کہا جائے گا کہ یہود نے عیسائیوں کے طور طریقوں کو اپنایا اور اپنے مذہب کی بنیاد رکھی۔ کیوں کہ اس قسم کی اچھی باتیں ہر مذہب میں موجود ہیں۔ اقتدار ملنے سے برات کا اظہار کیا ایسا نہیں ہے۔ سرولیم میور کے بزرگ ورقہ بن نوفل نے اقرار کیا۔ یہ وہی ناموس ہے جو حضرت موسیٰؑ پر آیا تھا۔ آپؐ کی نبوت کا اقرار کرتے ہوئے اپنی امداد کی پیش کش بھی کی کہ اگر زندہ رہا تو مدد کروں گا۔ اسی بزرگ کی مان لو جو کہتا ہے کہ یہ وہی نبی تھا جس کا سبھی کو انتظار تھا۔ وہ آ گیا اور ساتھ جو دین لایا یہود و نصاریٰ کے طور طریقوں سے اخذ شدہ نہ تھا بل کہ یہ وہی دین تھا جو حضرت ابراہیمؑ اور ان کی اولاد کا تھا۔ ارشاد ربانی ہے۔

" قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرَاهِيمَ حَنِيفاً وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ "۔ (البقرہ۔۱۳۵) ترجمہ: (آپ فرمائیں (اے نبی) بل کہ ہم تو ابراھیم کا دین لیتے ہیں جو ہر باطل سے جدا تھے اور مشرکوں میں سے نہ تھے)

اصل دین ایک ہی ہے، ایک ہی رہا ہے اور ازل سے ابد تک ایک ہی رہے گا اور وہ ہے دین اسلام۔ " اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ " ترجمہ (خدا کے نزدیک دین اسلام ہے) اس دین کی جامعیت کی تشریح کئی پہلوؤں سے ہو سکتی ہے ان میں سے ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ سلطنت دین کا معتدل مجموعہ ہے۔ وہ ایسی سلطنت ہے جو ہمہ تن دین ہے یا ایسا دین ہے جو سر تا پا سلطنت ہے مگر سلطنت الٰہی۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس سلطنت الٰہیہ میں قیصر کا وجود نہیں اس میں ایک ہی حاکم اعلیٰ ہے، وہ حاکم علی الاطلاق اور شہنشاہ قادر مطلق اللہ تعالیٰ ہے۔ بادشاہی اسی کی ہے حکم اسی کا ہے فرمان

صرف اسی کا صادر ہوتا ہے۔ دوسرے مجازی حاکموں اور آمروں کا حکم اسی وقت مانا جاتا ہے جب وہ عین حکم الٰہی ہو یا اس پر مبنی کم از کم یہ کہ اس کے خلاف نہ ہو۔ آنحضرت ﷺ اس دین کے سب سے آخری نبی اور پیغمبر تھے اور وہی اس سلطنت کے سب سے پہلے امیر، حاکم اور فرمان روا تھے۔ آپ ﷺ کے احکام کی بجا آوری عین احکام خدا کی بجا آوری ہے ''وَمَن يُّطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ اَطَاعَ اللهَ'' آپ ﷺ کی وفات کے یکے بعد دیگرے خلفاء جانشین ہوئے ان میں بھی دین و دنیا جامعیت تھی جس طرح وہ مسلمانوں کے امیر و حاکم تھے اسی طرح وہ دین کے پیشوا بھی تھے اور ان کے احکام کی تعمیل بھی عین خدا اور رسول ﷺ کے احکام کی تعمیل تھی۔ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں ''جس نے میرے امیر کا کہا مانا، اس نے میرا کہا مانا جس نے میرے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی''۔۔۔ سردار مکہ عتبہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے کئی طرح کی پیش کشیں کیں اس پر آپ ﷺ نے فرمایا ''ان میں سے کسی بات کی بھی خواہش نہیں مجھے نہ تمہاری دولت چاہیے نہ تم سردار بننا چاہتا ہوں اور نہ تم پر حکومت کرنا میرا مقصد ہے مجھے تو خدا نے رسول بنا کر تمہارے پاس بھیجا ہے اور ایک کتاب مجھ پر اتاری ہے اور مجھے خدا سے حکم ملا ہے کہ تم کو اپنے رب کا پیغام سناؤں اور تمہاری خیر خواہی کا حق ادا کروں۔ اگر تم اس کو مان لو گے تو دنیا اور دین دونوں میں تمہارا بھلا ہوگا اور اگر تم نے نہ مانا تو صبر کروں گا یہاں تک کہ میرے اور تمہارے درمیان خدا کا فیصلہ آ جائے۔'' ایک طرف دار عیسائی مستشرق کے کہنے پر یہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ آپ ﷺ نے یہود و نصاریٰ کے طریقوں سے اخذ کر کے مذہب بنایا حالانکہ یہ وہ دین ہے جسے اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ ﷺ کو عطا کیا اور یہ وہی دین ہے جو آپ کے آبا و اجداد کا تھا۔

اعتراض نمبر ۲۵۹

ٹوئن بی: ''بلا شبہ جب انھوں نے مدینہ میں حکومت قائم کرنے کی دعوت قبول کی تو انھوں نے اپنے ضمیر کو یہی کہہ کر مطمئن کیا کہ وہ ہمیشہ کی طرح خدا کے راستا میں ہی یک سوئی سے کام کر رہے ہیں۔ کیا خدا نے ان لوگوں تک اس کا پیغام (سچا کلام) پہنچانے کی ذمہ داری عائد نہیں کی تھی؟ اور کیا وہ اس خداداد موقع کا استعمال کر کے اس نئے مذہب کو پھیلانے کی ذمہ داری کو پورا نہیں کر رہے ہیں جسے دس سال تک انسانی جبری طاقتوں نے اپنی راہ سے ہٹا رکھا تھا۔ بلا شبہ انھوں نے اپنے ضمیر کو ایسے ہی مطمئن کیا اور بلا شبہ وہ اپنے دلائل سے مطمئن ہو کر اپنے آپ کو ہی دھوکہ دے رہے تھے''۔

جواب: جواب ملاحظہ فرمایئے:۔ ''هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْاُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ''۔ (سورہ جمعہ۔۲)

''وہی خدا جس نے بے پڑھوں میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں سناتا

اور ان کو پاک کرتا اور ان کو کتاب اور دانائی سکھاتا ہے اور اس سے پہلے وہ کھلی گم راہی میں تھے''۔

اسلام عمل کا مذہب ہے۔اس کی تعلیمات نظری کے ساتھ عملی کارکردگی سے وابستہ ہیں۔''انما الاعمال بالنیات'' عمل کا دارومدار نیتوں پر ہے۔عمل سے نجات ملتی ہے۔کوئی بھی معاشرہ محض نظریات کی بنیاد پر مثالی نہیں بن پاتا جب کہ نظریات کے ساتھ آزادی عمل نہ ہو۔اسلام معاشرے کو ساتھ لے کر چلتا ہے اور ترک دنیا سے جوڑ کر فرد کو معاشرے سے الگ تھلگ نہیں کرتا۔ٹوئن یہ سمجھتا ہے کہ داعی نبوت کا فرض منصبی پیغام خداوندی پہنچانا ہے اس پر خود عمل کرنا اور دوسروں کو اس پر عمل کروانا کار نبوت میں شامل نہیں ہے۔یہی بات واٹ بھی کہتا ہے کہ''ابتداء میں پیغام پیغمبر سے زیادہ اہم تھا۔اصل چیز فرد یا جماعت کا خدا کے ساتھ تعلق تھا۔اس لیے کسی ایسے شخص کی ضرورت تھی جو متعلقہ شخص یا اشخاص تک پیغام پہنچا دے لیکن پیغام پہنچا دینے سے آگے پیغمبر کا کوئی کام نہ تھا تاہم بعد میں پیغمبر کا کام اس سے زیادہ قرار دے دیا گیا''۔(ضیاالنبی ج ۷۔۲۲۹) جب کہ سابقہ آیات قرآنی میں نبوت کے فرائض کی وضاحت کر دی گئی ہے۔

۱: آیتیں پڑھ کر سنانا۔ ۲: پاک اور پاکیزہ بنانا۔ ۳: کتاب کی تعلیم۔

۴: اور حکمت و دانائی سکھانا۔ گویا نبی کا کام صرف پیغام خداوندی پہنچانا ہی نہیں بل کہ قرآنی آیات پڑھ کر سنانا، ان کی زندگی کو پاکیزہ بنانا اور کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ٹوئن کے نظریہ طبع زاد درست نہیں۔صرف ایک جز کو مان کر باقی اجزا کو نظر انداز کر دینے سے کار نبوت کے فرائض میں کمی واقع ہوتی ہے جو کسی طرح بھی ٹھیک نہیں۔ نبی کو صرف ایک آلہ نشر واشاعت سمجھنا خام خیالی اور نادانی ہے۔ اس کا کام نہ صرف اعلان کرنا ہے بل کہ اس پر خود عمل پیرا ہو کر لوگوں کو پیغام حق کی دعوت دے کر ان پر کاربند رہنے کی ہدایت و تلقین بھی کرنی ہے۔اگر خود عمل پیرا ہو اور پیغام حق کو رائج کرنے کے وسائل کو اختیار کرنا حدود نبوت سے متجاوز سمجھا جائے تو یہ ادھورا تصور ہے کہ پیغام حق پہنچا دیا جائے۔اب اس سے اسے کوئی غرض نہیں کہ کسی نے سنا یا نہیں سنا، کسی نے اس پر عمل کیا یا نہیں۔جس نے عمل کیا اسے کیا دقتیں پیش آئیں؟ اور ان دقتوں کو کیسے دور کیا؟ اس طور معاشرہ کی نہ تو تنظیم ہوگی اور نہ مستحکم انتظامیہ۔

اعتراض نمبر ۲۶۰

ٹوئن بی: مزید کہتا ہے''سچ تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ مدینہ سے ملنے والی دعوت نے محمد ﷺ کو ایک ایسی آزمائش میں ڈال دیا تھا جس میں ان کی ذات پوری نہیں اتر سکی۔اس دعوت کو قبول کر کے انھوں نے پیغمبر کے کریمانہ کردار کو ترک کر دیا اور خود کو ایک عام سے کامیاب باجبروت حکمران کے روپ میں ڈھال کر مطمئن ہو گئے۔موثر عملی اقدامات کی کشش نے جو مدینہ کی دعوت نے ان کی طویل مدت سے رکی ہوئی اور مسدود عملی کاروائیوں کے لیے بے تاب فطرت کے لیے پیدا کر دی تھی، ان کے پیغمبرانہ نصب العین کو

دھندلا دیا۔ محمد ﷺ (اس سے پہلے) ایک پیغمبر کی سچی ذمہ داریوں کو ادا کرتے ہوئے مطمئن تھے جیسا کہ ان کے بت پرستوں کو للکارنے سے واضح ہے یعنی سیدھی سادھی پیغام رسانی جو ایک نبی کا فرض ہوتا ہے۔ پیغمبرانہ نصب العین کا یہ احساس اور اس کا خیال اس وقت پس پشت ڈال دیا گیا جب انھیں ایک نیا کردار ادا کرنے کی دعوت دی گئی۔ (نعوذ باللہ)

جواب: سوال یہ ہے کہ نبی مکرم ﷺ کا مکہ سے مدینہ آنے پر نبوت کیسے متاثر ہوئی؟ ۲: ناکامی کے کون سے آثار نظر آئے۔ ۳: ناکامی کے ان آثار کی نشان دہی کیوں نہیں کی؟ ۴: کارِ نبوت میں کون سی کمی کوتاہی ہوئی؟ ۵: مسدود عملی کاروائیوں کے لیے آپ کو کب بے قراری تھی؟ ۶: کیا بت پرستوں کو مکہ میں للکارا اور مدینہ میں آکر ان سے رعایت برتی؟ ۷: کیا یہ ٹوئن بی کا طبع زاد مفروضہ نہیں کہ نبی کا فرض پیغام پہنچانا ہے۔ ان تمام الزامات کی بنیاد یہ ہے کہ عیسائی ثنویت کی نگاہ میں ایسا کرنا گناہ تھا۔ لیکن ایک دہرا اصول دیکھئے کہ کلیسائے مقدس خود جب تک سیاست پر مسلط رہا اس میں کوئی عیب نہ تھا۔ عیسائیت میں سیاست اور مذہب دو الگ چیزیں ہیں۔ لیکن اسلام میں ان کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں جیسے اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ تمام شعبہ ہائے زندگی سے متعلق ادارے دین کے تابع ہیں۔ یہ تمام ادارے اکائیاں ہیں جو مجتمع ہو کر کل بناتی ہیں اور وہ کل ہے دین۔ تو پھر واٹ کا کہنا کہ ''آپ دین اور سیاست کے فرق سے ناواقف تھے'' مجذوب کی بڑ کے مترادف ہے۔ جب سیاست معاشرت غرض کہ زندگی کا ہر شعبہ دین کے تابع ہے تو پھر دین اور سیاست سے ناواقفیت کیسی؟

عیسائیت کا یہ عقیدہ اس دور کی پیداوار ہے جب عیسائیت اپنا پرچار رومن ایمپائر میں کر رہی تھی۔ رومن معاشرہ مضبوط تھا۔ عیسائیت میں سکت نہ تھی کہ اس معاشرہ کا سامنا کرتی۔ حکومت سے بچنے اور اپنے دفاع کی خاطر اپنے کو محفوظ بنانے کے لیے اسے عقیدتاً یہ اعلان کرنا پڑا کہ سیاست اور معاشرتی قدروں سے اسے کوئی سروکار نہیں اور عیسائیت کی دعوت محض روحانی تسکین کا بے ضرر ذریعہ ہے۔ قدرت خدا کی دیکھئے جب عیسائیت نے اپنے پنجے گاڑ دیئے اور رومن معاشرہ سے اقتدار چھین لیا اس کے برعکس اسلام اپنے اصولوں پر سودا بازی نہیں کرتا نہ ہی اس قسم کی سودا بازی کا حامی ہے۔

اسلام مصلحت کیشی کا نتیجہ نہیں۔ اس نے اپنے معاشرہ کو ان خطوط پر استوار کیا جو خالص نیکی اور بھلائی پر مبنی تھے۔ اس نے اپنی تہذیب کو منت کش غیر نہ ہونے دیا۔ اس میں خدا اور کسریٰ و قیصر کے حصہ کی تقسیم نہیں۔ کسریٰ و قیصر بھی خدا کے تابع ہیں اور ماتحت بھی۔ ٹوئن بی کہتا ہے کہ ''ایسی آزمائش میں ڈال دیا تھا کہ اس پر آپ کی ذات پوری نہ اتر سکی۔ اس دعوت کو قبول کر کے انھوں نے۔۔۔ کریمانہ کردار ترک کر دیا اور ایک عام کامیاب باجبروت حکمران کے روپ میں ڈھال کر مطمئن ہو گئے۔

۱: کیا آپ نے دین کو خیر باد کہہ دیا تھا؟ ۲: کیا دین کی تبلیغ جاری نہ تھی؟ ۳: کیا وہ دین پھیل نہیں رہا تھا؟ ۴: کریمانہ کردار ترک کیا اس کا ثبوت کیا ہے؟ ۵: کیا قرآئن اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ با جبروت حکمران کے روپ میں ڈھل کر مطمئن ہو گئے۔

کفار نے مہاجرین مدینہ کے مکان، دکان، مال، مویشی، جائیداد وغیرہ اپنے قبضہ میں لے لیے تھے۔ فتح مکہ کے دن آپ بہ حیثیت فاتح اعظم مکہ میں داخل ہوئے۔ چاہیے یہ تھا کہ ان تمام متروکات کو واپس لیا جاتا جو کفار نے ناجائز قبضہ کر کے اپنی ملکیت بنا رکھی تھیں۔ لیکن تاریخ عالم ایسے کسی فاتح کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے جسے ساتھیوں سمیت شہر سے جلاوطن کیا گیا ہو۔ جہاں بھی گئے سکھ کا سانس لینے نہ دیا۔ ہر وقت جان کے دشمن درپے آزار ہوں۔ خون کے پیاسے کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے ہوں۔ اب وہ وقت آن پہنچا کہ مسیحاء عالم ﷺ مکہ میں بہ طور فاتح داخل ہوتا ہے۔ اس آبائی شہر کو فتح کرنے کے بعد دشمنوں سے انتقام نہیں لیتا اور ان (اہل مکہ) کے تصرف میں اپنی اور مہاجرین کی جائیدادوں سے دست بردار ہو جاتا ہے بل کہ انھیں جان فزا مژدہ سنایا جاتا ہے کہ "تم پر کچھ الزام نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو"۔ "لا تثریب علیکم الیوم لا یغفر لکم و ھو ارحم الرحمین"

مکہ فتح ہوتا ہے روم کی طرح جل کر کھنڈر نہیں بنتا، بغداد کی طرح انسانی کھوپڑیوں کے مینار نہیں بنائے جاتے۔ نہ ہی یروشلم کی طرح اس کی اینٹ سے اینٹ بجتی ہے نہ دہلی کی طرح قتل عام ہوتا ہے نہ ہیرو شیما اور ناگاساکی کی طرح طاقت کا اور انسانی نفرت کا اظہار ہوتا ہے بل کہ رحمت عالم ﷺ کی رحمت کا یہ عالم ہے فرمایا کہ "تم پر کچھ الزام نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو"۔ اسے باجبروت حکمران کہتے ہو؟ کیا اسی آزمائش جس میں ٹوئن کے بہ قول ڈالے گئے کامیاب نہیں ہوئے؟ کیا اسلام کا پیغام لوگوں تک پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا رکھی گئی؟ کیا آپ نے اپنے آپ کو دھوکہ میں رکھا تھا؟ کیا ان کا پیغمبرانہ نصب العین دھندلا گیا تھا؟ کیا صرف نبی کا فرض پیغام رسانی ہی ہے تو آپ نے فرض کی تکمیل کے تمام مراحل جو طے کیے ان میں کسی قسم کی کمی واقع ہوئی؟ اگر کمی واقع نہیں ہوئی تو یہ امر درست نہیں کہ نبی کا کام صرف پیغام پہنچانا ہے۔ کیا ایسا ہی ہے؟

مدینہ تشریف لانے کی دعوت نے آپ کو آزمائش میں نہیں ڈالا تھا۔ آزمائش وابتلاء کا دور مکی اور مدنی دونوں ادوار پر مشتمل ہے۔ یہ آزمائش مکی دور میں بھی انتہاء پر تھی۔ طائف والوں کو پیغام توحید پہنچایا انھوں نے وہ جوابی ہتھکنڈے اپنائے کہ آسمان لرز اٹھتا ہے زمین کانپ جاتی ہے۔ حضرت عائشہؓ نے نبی مکرم ﷺ سے پوچھا کیا آپ پر احد کے معرکہ سے بھی زیادہ سخت وقت آیا ہے؟ آپ نے جواب میں طائف کے واقعہ کا ذکر فرمایا اور فرمایا کہ "غم زدہ حالت میں جدھر منہ اٹھا ادھر چل پڑا"۔ راستا میں کانٹے

بچھائے جاتے، نماز کی حالت میں اوجھری آپ کی پشت پر رکھ دی جاتی۔ گلے میں چادر ڈال کر بل کس دیا کہ آنکھیں نکل آتی ہیں۔ معاشرتی مقاطعہ نے رہی سہی کسر نکال دی۔ حتیٰ کہ آپ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا گیا اور آپ نے ہجرت فرمائی۔ آپ کے اعلائے کلمۃ الحق کی سربلندی میں پائے استقلال میں ذرا برابر جنبش نہ ہوئی۔ اب مدنی دور پر نظر ڈالتے ہیں کہیں آپ کی اونٹنیوں کو لوٹ کر ہانک لے جاتے ہیں۔ کہیں کفار یہود و نصاریٰ کو لکھتے ہیں کہ ان مہاجرین کو مدینہ سے نکال دیں۔ کہیں یہود کی آپ کو ٹھکانے لگانے کی سازشیں (نعوذ باللہ) برپا ہیں۔ کہیں منافقین کہ عین جنگ کے موقع پر ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ کہیں تمام گروہ جمع ہو کر اسلام پر کاری ضرب لگانے چڑھ دوڑتے ہیں۔ الغرض ہر حربہ استعمال کیا جاتا ہے لیکن آقا کریم ﷺ کے مشن میں دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی ہوتی ہی چلی گئی۔

آپ نے مدینہ کے لوگوں سے معاہدہ کیا (میثاق النبی) مدینہ کے اطراف و اکناف کے بدوی قبائل سے معاہدے کیے جو قبیلے دشمنی پر آمادہ تھے اور انھوں نے سوائے جنگ کے کوئی چارہ نہ چھوڑا تو مدافعاتی عمل کو اپناتے ہوئے ان کا ڈٹ کر سامنا کیا۔ کہیں آپ کے مشن کی مسدودیت نظر آتی ہے؟ دونوں مکی اور مدنی ادوار میں موقع و محل کے مطابق عمل جاری رہا۔ مکہ میں حج پر آنے والے لوگوں کو دعوت حق کی طرف بلایا تو مدینہ میں ہر طرف دعوت حق کی ترغیب دی۔

مکہ کے قرب و جوار کے قبائل کو اسلام کی دعوت دی تو مدینہ میں آکر بادشاہان عالم کو خطوط لکھ کر اسلام کی حقانیت سے آگاہ کیا۔ کہیں بھی کار
نبوت کے تسلسل میں خلل نہیں رہا اور کہیں انجماد نظر نہیں آتا۔

اعتراض نمبر ۲۶۱

مستشرقین یہ غلط بیانی سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مدنی زندگی لڑائیوں کی نذر ہو گئی اور ان لڑائیوں کے باعث اسلام کو غیر معمولی پیش رفت ہوئی اور برق رفتاری سے اسلام پھیلا

جواب: یہ بات اصولاً غلط ہے کسی کو بذریعہ تلوار اپنا بنالیں، وقتی طور پر ہو سکتا ہے کہ ڈر کی وجہ سے کوئی اپنا مذہب تبدیل کر لے اور اس کا پیرو بن جائے لیکن وہ کبھی بھی بجان و دل قبول نہیں کرتا جب بھی موقع ہاتھ آئے گا وہ اپنے پہلے مقام کی طرف لوٹ جائے گا۔ ''تلوار کے زور'' کے نظریہ میں معمولی سی طاقت نہیں، اگر ذرا برابر جان ہوتی تو حضرت بلالؓ اور حضرت یاسرؓ ایسے لوگ کفار کے ظلم و ستم کی چکی میں پس رہے تھے بھاری اور طرح طرح کی اذیتیں برداشت کر رہے تھے انہوں نے کیوں اسلام کو خیر باد نہ کہا اور خوشی سے ان مصائب و آلام سے چھٹکارا حاصل نہ کیا لیکن ان بے یارو مددگار حضرات کا اپنے مذہب اور ایمان پر ڈٹے رہنا اس امر کی واضح شہادت ہے کہ عقیدہ کی پختگی اور ایمان کی گہرائی و گیرائی

تک تلوار کی رسائی ممکن نہیں۔

فرڈنینڈ نے ۱۴۹۲ء میں گرناطہ قبضہ کر کے مسلمانان ہسپانیہ کے خاتمہ کے ارادے سے لاکھوں مسلمانوں کو جلاوطنی کی سزائیں دیں۔کئی بے گناہوں کو سمندر میں غرقاب کر دیا، کسی کو نذرِ آتش کیا گیا اور تلوار گھاٹ اترنے والے بھی لاکھوں کی تعداد سے کم نہ تھے، اگر ان کے باپ دادا بزورِ شمشیر مسلمان ہوئے تھے تو اب وہ عیسائیت قبول کرنے سے عاری کیوں ہیں؟ انسان، مال و دولت، اہل و عیال مکان و کان، کاروبار اور جائداد حتیٰ کہ اپنی متاعِ عزیز یعنی جان کو بھی قربان کرنے سے دریغ نہیں کرتا لیکن اپنے عقیدے سے تو برابر اعراض وانحراف نہیں کرتا اور اپنے عقیدے کو محفوظ بنا کر اس پر آنچ نہیں آنے دیتا۔ ''برق'' نے کہا تھا کہ اگر تلوار سے عقیدہ بدلا جاتا تو ایسے لوگ آئیں جو اس عقیدہ کے حامی ہیں، پٹھانوں کے عقیدہ کو تلوار سے بدل کر دکھادیں۔ اسلام جبر و تشدد کا سرے سے مخالف ہے ارشاد ربانی ہے ''لا اکرہ فی الدین۔۔۔۔ان لم یومنوا'' قرآن کریم کی ایسی آیات کی تعداد درجن سے زیادہ ہوگی علاوہ ازیں آپ ﷺ کی حیات مقدس پر ہزاروں کتب لکھی گئی ہیں۔ سیرت نگاروں میں اپنوں کے علاوہ ایک خاصی تعداد مخالفین کی بھی ہے لیکن کوئی مخالف اور نکتہ چیں تا حال کوئی ٹھوس مثال پیش کرنے سے قاصر رہا ہے۔ جس نے یہ ثابت کیا ہو کہ آپ ﷺ کے زمانے یا خلافت راشدہ کے دور میں کسی کو جبراً مسلمان بنایا گیا ہو۔ اگر بعد میں کسی سے کوئی بے انصافی ہوئی تو یہ ان کا اپنا فعل ہے اور اس کی ذمہ داری اسلام پر عائد نہیں کی جاسکتی۔

دنیا میں ظالم اور جابر لوگ گزرے ہیں جنھوں نے زندگی بھر ظلم کرنے سے کنارا نہ کیا بلکہ ان سے بھولے ہوئے بھی کوئی اچھا کام نہ ہوسکا۔ چنگیز، ہلاکو اور حجاج جنھوں نے لاکھوں بے گناہوں کا خون کیا انہیں تو خون کی ہولی کھیلنے کے سوا کسی شے نے مزہ نہیں آتا ایسے ظالم جن کی سرشت میں خون ہو ان سے خیر کی توقع نہیں کیا جاسکتی۔ دوسری جنگ عظیم میں امریکی صدر کے حکم سے ہیروشیما اور ناگاساکی پر بم گرائے گئے۔ کروڑوں کی تعداد میں لوگ اس دنیا سے رخصت ہو گئے کسی نے ان ظالموں سے پوچھا تک نہیں لیکن جس مبارک ہستی نے بے راہ بھٹکی انسانیت کو ہدایت کا راستہ دکھایا، زندگی بھر ایک دن بھی سیر ہو کر کھانا نہیں کھایا، غریبوں اور بیواؤں کے غم میں بے قرار رہے، یتیموں اور غلاموں کی حالت زار کے دکھ میں گھلتے رہے اپنے کام خود کر لیتے، عبادت میں کھڑے ہوتے تو پاؤں سوج جاتے۔ دینا کی نعمتیں میسر ہونے کے باوجود ستو اور چند کھجوروں پر گزران ہوتی ہے۔ کھردرے کپڑے زیب تن ہیں بکریاں چراتے ہیں، جوتے خود گانٹھے بلکہ بے سہارا دوسرے لوگوں کی خدمت اور ان کا کام کاج کرتے تھے ایسے ہمدرد اور خیر خواہ مسیحا کی شان میں الزام تراشی کرنا اور گالیاں بکنا نا انصافی ہے۔ ایسا تو عام آدمی کے لیے بھی ہفوات نہیں بکی جاتیں ان کے بارے میں جیسے پیغمبر اسلام ﷺ کی شان میں بکتے ہیں۔ ان کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ ان کی اپنے اچھے سوچ و فکر سے عاری ہیں اور آنکھیں علم کے نور سے محروم ہو چکی ہیں۔

اعتراض نمبر ۲۶۲

ٹوئن بی اور واٹ اور بہت سے مستشرقین کہتے ہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ شروع میں تو ایک اخلاقی و روحانی مصلح تھے لیکن ہجرت مدینہ کے بعد آپ سیاسی انقلاب کے داعی بن گئے۔(محمد رسول اللہ ص ۵۱)

جواب:اس غلط فہمی کی بناء پر مکی دور کو اخلاقی و تبلیغی اور مدنی دور کو سیاسی و توسیعی کہا گیا۔اس تقسیم کے سبب حضور ﷺ کی سیاسی زندگی کی شروعات مدنی دور سے جوڑی جاتی ہیں۔مسلمان مورخین نے بھی مکی دور کو جمال مصطفی ﷺ اور مدنی دور کی زندگی کو جلال نبوی ٹھہرایا۔یعنی مکی زندگی میں آپ پیغمبر ﷺ تھے اور مدنی زندگی میں آپؐ سیاست دان اور بادشاہ بن بیٹھے۔پیغمبری منصب پر سیاست چھا گئی یہ بات یکسر غلط ہے۔ آپؐ کی زندگی ایک مکمل وحدت ہے۔اس قسم کی تقسیم کہیں نظر نہیں آتی۔تبلیغی دور میں سیاسی امور دکھائی دیتے ہیں اور سیاسی دور میں اخلاقی سرگرمیاں اپنے عروج پر نظر آتی ہیں۔آپ مکہ کے قحط زدہ افراد کی اقتصادی مدد کرتے ہیں۔یہ پیغمبرانہ اخلاق کا اعلیٰ نمونہ ہے کہ دشمن کو بھی تکلیف میں دیکھنا منظور نہیں۔بدر کے قیدیوں کی رات کو گریہ وزاری سنی تو ان کی مشکیں ڈھیلی کر دینے کا حکم صادر فرمایا۔اسیروں سے یہ سلوک کوئی سیاسی یا جنگی چال نہیں تھی۔کیا بادشاہ بھی ایسا کرتے ہیں؟انھیں تو خبر تک نہیں ہوتی جبکہ ادھر آپ ﷺ کو ان کی تکلیف کا احساس ہے۔احترام انسانیت ہے۔حد تو یہ ہے کہ منافقین مدینہ کی سازشوں اور ناروا کاروائیوں سے درگزر نہ کیا جاتا تو دشمن کہہ اٹھتے کہ اپنوں کو قتل کیے جا رہے ہیں۔اس کا ایک خطرناک اور بھیانک پہلو یہ بھی ہے کہ ظاہری شواہد کے بغیر ان کی باطنی عداوت و خباثت کو بنیاد بنا کر سزا دی جاتی تو مستقبل میں یہ ایک قانون بن جاتا۔منافقت کا الزام دھر کے مخالف افراد و قوم کو قتل کرنا جائز قرار پاتا۔اس سے رواداری کی وہ مثال قائم کی کہ تاریخ میں نہیں ملتی۔فتح مکہ میں عام معافی کا اعلان آپ کے جمال کا بے نظیر نمونہ ہے جب کہ آپ فاتح کی حیثیت سے مکہ میں داخل ہو چکے تھے۔نہ قتل عام کیا۔نہ کھوپڑیوں کے مینار تعمیر ہوئے۔کہیں پر مڈھ بھیڑ ہوئی تو یہ ان کی اپنی انا اور عداوت تھی اور عام معافی کے اعلان کی خلاف ورزی تھی۔یعنی چند لوگوں نے تلواریں اٹھائیں جب کہ اعلان میں کہا گیا تھا کہ ہتھیار ڈال دے،لڑائی نہ کرے اسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔اسے امان ہے۔یہ ہے بادشاہت یہ ہے وہ اقتدار اعلیٰ جس سے مستشرقین طعنہ دیتے ہیں۔ان کی یہ بھول ہے کہ پیغمبر کا کام محض پیغام پہنچانا ہے جب کہ پیغام پہنچانے کے ساتھ ساتھ اس پر خود عمل کر کے دوسروں کو بھی اس کا پیروکار بنانا ہے۔مکی عہد میں ہجرت حبشہ سنگ میل ثابت ہوئی جس سے عربوں کے اندر فکر و عمل کا انقلاب آیا۔مردوں عورتوں نے دین کی خاطر وطن،عزیز،رشتہ دار،جائے داد و مال سب چھوڑ دیا۔اللہ کے دین کو نہ چھوڑا۔

فتح مکہ کے موقعہ پر آپ نے خطبہ فرمایا''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ تنہا ہے۔اس کا کوئی شریک نہیں۔اس نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا۔اپنے بندے کی مدد کی اور تنہا سارے جتھوں کو شکست دی''۔خطبہ حجۃ

الوداع آج بھی رنگ ونسل، ذات اور برادری اور علاقوں میں بٹی انسانیت کے لیے عظیم روحانی مقام یعنی کعبہ کے کلید بردار عثمان بن طلحہ سے در کعبہ کھولنے کا تا کہ آپ ﷺ نماز ادا کر سکیں اس نے صاف انکار کر دیا اس پر آپ ﷺ نے مکمل یقین کے ساتھ فرمایا ''ایک وقت آئے گا جب یہ کنجی میرے اختیار میں ہو گی اور میں جسے چاہو گا عطا کروں گا'' عثمان نے کہا پھر وہ دن قریش کی تباہی کا ہو گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''نہیں! اس دن وہ آباد اور باعزت ہونگے'' مستشرقین کے سوال کا اگر مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ کی عملی سیاست واضح طور پر مدینہ میں ہوتی ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں، اگر اس سے مراد یہ ہو کہ مکی زندگی پیغمبرانہ تھی اور مدنی صرف سیاست دان کی تھی یعنی سیاسی حیثیت غالب آ گئی تو یکسر غلط ہے کیونکہ آپ ﷺ کی زندگی ایک وحدت ہے جو دین الٰہی کے تابع ہے اور اس میں سیاسی وروحانی تقسیم کا تصور نہیں پایا جاتا۔

تحویل قبلہ:

تحویل کعبہ کی وجہ: آنحضرتؐ نے سولہ یا سترہ ماہ بیت المقدس کی طرف نماز ادا کی لیکن جب اسلام پھیلا تو اب کوئی وجہ جواز نہ تھی کہ اصل قبلہ کو چھوڑ کر دوسری طرف رخ کر کے نماز پڑھی جاتی۔ اس پر یہ آیت اتری۔ '' فَوَلِّ وَجۡهَكَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ۚ وَحَيۡثُ مَا كُنۡتُمۡ فَوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ شَطۡرَهٗ '' (البقرہ۔ ۱۴۴) ''تو اپنا منہ مسجد الحرام کی طرف پھیرو اور جہاں کہیں رہو اسی طرح منہ پھیرو''۔ اس پر یہودیوں کو دکھ ہوا اور غصہ میں لال ہو رہے تھے۔ اب تک قبلہ بیت المقدس تھا وہ فخر کرتے تھے۔ اب وہ فخر زمین بوس ہو گیا۔ اس پر انھوں نے طعن شروع کیا کہ پیغمبر اسلام ﷺ ہر بات میں ہمارا مخالف ہے اس لیے قبلہ بدل لیا یا ان کو اس سے پھیر دیا؟ اس قسم کے دیگر اٹھنے والے سوالات کا جواب قرآن کریم نے فرمایا (بقرہ۔ ۱۴۲) ترجمہ: سفہا یہ اعتراض کریں گے کہ مسلمانوں کا جو قبلہ تھا اس سے ان کو کس نے پھیر دیا۔ کہہ دو کہ مشرق ومغرب سب خدا ہی کا ہے'' ''قل للہ المشرق والمغرب'' قرآن کریم نے ایک اور وجہ بتائی ''تیرا جو قبلہ پہلے تھا اس کو جو ہم نے پھر قبلہ کر دیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ پیغمبر کا پیرو کون ہے اور پیچھے پھر جانے والا کون ہے؟ اور بے شبہ یہ قبلہ نہایت گراں اور ناگوار ہے بہ جز ان لوگوں کے جن کو خدا نے ہدایت کی ہے''۔ بہت سے یہودی منافقانہ انداز اپنائے ہوئے تھے۔ وہ مسلمانوں کے ساتھ نماز بھی پڑھتے لیکن اندر سے مسلمانوں کے دشمن تھے۔ جب تحویل قبلہ ہوا تو منافقت طشت ازبام ہو گئی۔ کوئی یہودی کسی طرح گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ جو چیز اس کی قومیت، مذہب بلکہ اس کی ہستی کی بنیاد ہے (یعنی بیت المقدس) سے رشتہ توڑ کر مسلمانوں کے قبلہ کو قبول کر لے۔

ایک اور وجہ کی نشان دہی یوں ہے ارشاد ربانی ہے ''پورب پچھم رخ کرنا یہ کوئی ثواب کی بات نہیں ثواب تو یہ ہے کہ آدمی خدا پر، قیامت پر، ملائکہ پر، خدا کی کتابوں پر اور پیغمبروں پر ایمان لائے اور خدا کی

محبت میں عزیزوں، یتیموں، مسافروں اور غلاموں کو (آزاد کرانے میں) اپنی دولت دے''۔ بہ قول شبلی نعمانی ان آیات سے خدا نے بتایا کہ قبلہ خود کوئی مقصود بالذات چیز نہیں۔ خدا کی عبادت کے لیے پورب پچھم سب برابر ہیں۔ خدا ہر جگہ ہے ہر سمت ہے ہر طرف ہے پھر قبلہ کے تعین کی ضرورت بتائی کہ وہ اختصاصی شعار ہے اور اصلی نمایشی مسلمانوں کو الگ کر دیتا ہے۔ (ش۔۱۸۳)

حکمتیں: اول: یہ کہ لوگوں کو معلوم ہوگا کہ مسلمان اصول کے پابند ہیں دنیا میں جہاں بھی جاتے ہیں اپنے ہی قبلہ کی طرف منہ کر کے عبادت کرتے ہیں۔

دوم: یہ کہ نیا قبلہ سے مسلمانوں کو امتیازی حیثیت حاصل ہوگی اور یہود و نصاریٰ جان لیں گے کہ مسلمان دین ابراہیمی کے پیروکار ہیں۔

سوم: مسلمانوں کے دل سے خوف دور ہوگا اور ان کے مظالم کا عہد انجام پذیر ہو جائے گا بلکہ ظالموں کو مقابلے کی ہمت نہ ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کی ذات پر کامل اعتماد پیدا ہوگا جس سے غیر اللہ کے خوف و خطر سے بے نیاز ہو جائیں گے۔

چہارم: تحویل قبلہ سے مسلمانوں پر نعمت الٰہی کا دروازہ کھل جائے گا اور وہ ہدایت و کامرانی سے سرفراز ہوں گے۔

پنجم: بنی اسرائیل سے منصب رسالت و نبوت آل اسماعیل کی طرف منتقل ہوگئی۔ اقوام عالم کی تعلیم و ہدایت کا منصب رہتی دنیا تک اس کے سپرد ہوگا قدرتی طور پر امت کا ایک مرکز ہدایت ہونا چاہیے تھا جو کعبۃ اللہ ہی ہو سکتا تھا چنانچہ تحویل قبلہ نے اس مرکزیت اعلان کر دیا جو سورہ بقرہ آیت نمبر ۱۴۳۔۱۴۴ سے صاف ظاہر ہے۔

ششم: ہر معاملہ میں امت وسط بنایا۔ وسط یعنی ہر چیز کا درمیانی حصہ ہی اس کا عمدہ ترین حصہ ہوا کرتا ہے اور انسان کی زندگی کا درمیانی حصہ ''عہد شباب'' اس کی زندگی کا بہترین وقت ہے۔ دن کے درمیانی حصہ دوپہر میں روشنی اپنے عروج پر ہوتی ہے اسی طرح اخلاق میں درمیانی راہ قابل تعریف ہوتی ہے۔ بخل اور فضول خرچی کی درمیانی حالت کو سخاوت بزدلی اور طیش کے درمیانی حال کو شجاعت کہتے ہیں ۔اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ کو اس عظیم کتاب سے سرفراز فرمایا۔

ہفتم: ایک حکمت یہ ہے کہ میرے نبی ﷺ کی بے چوں و چرا، اطاعت کرتے ہیں ان لوگوں سے ممتاز اور علیحدہ ہو جائیں جو بات بات پر اعتراض کرنے اور اپنی عقل کی سند حاصل کرنے کے خوگر ہیں۔

آنحضرتؐ کا معمول تھا کہ جس بارے میں حکم الٰہی نازل نہ ہوا ہوتا اس پر اہل کتاب سے موافقت فرماتے تھے۔ آغاز نبوت میں ہی نماز فرض ہو چکی تھی لیکن قبلہ کے متعلق حکم تا ہنوز نازل نہیں ہوا

تھا۔اس طرح مکہ کے تیرہ سال اور مدینہ میں ۱۶۔۱۷ماہ تک بیت المقدس کو قبلہ بنائے رکھا۔حال آنکہ آپ ؐ کا منشاء یہ تھا کہ مسلمانوں کے لیے قبلہ وہ مسجد بنائی جائے جس کے بانی آپ ؐ کے جدامجد ابراھیم ؑ تھے۔ جسے مکعب شکل کی عمارت ہونے کی وجہ سے کعبہ اور صرف عبادت کے لیے بنائے جانے کی وجہ سے بیت اللہ اور عزت وعظمت کی وجہ سے مسجد الحرام کہا جاتا ہے۔جب کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمام جہات یکساں ہیں " و للہ المشرق و المغرب فأینما تولو فثم وجہ اللہ " اورعبادت کے لیے کسی نہ کسی طرف کا مقرر کرلینا آدمیوں میں رہا ہے۔کسی طرف منہ کرنا اصل عبادت سے کچھ تعلق نہیں رکھتا۔" لیس البر ا ان تولوا وجوھکم قبل المشرق و المغرب ' ۔اصل تعین قبلہ کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے لیے ایک امتیازی علامت قرار دی جائے اور اللہ تعالیٰ نے قبلہ قرار دینے کی وجہ خود بیان فرمادی۔" ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبارکاً وھوء للعالمین "۔ترجمہ:یہ مسجد دنیا کی پہلی عمارت ہے جو عبادت الٰہی کی غرض سے مکہ میں بنائی گئی اور تمام عالموں کے لیے ہدایت ہے۔''یسعیاہ نبی کی کتاب باب ۶۰ ورس ۵ میں ہے،'' سمندر کی فراوانی تیری طرف پھرے گی اور قوموں کی دولت تیرے پاس فراہم ہوگی۔''

ورس ۶: اونٹنیاں کثرت سے تجھے آکے چھپالیں گی۔مدیان،عیفہ کے اونٹ وے سب جو سبا کے ہیں' آویں گے۔وے سونا اور لوبان لاویں گے اور خداوند کی بشارت دیں گے''۔

ورس ۷: قیدار کی بھیڑیں تیرے پاس جمع ہوں گی۔نبط کے مینڈھے تیری خدمت میں حاضر ہوں گے۔میری منظوری کے واسطے میرے مذبح پر چڑھائے جائیں گے اور میں اپنے شوکت کے گھر کو بزرگی دوں گا''۔(رحمت للعالمین۔ج اول۔۲۰۱)واضح ہو کہ شوکت کا گھر ٹھیک لفظی ترجمہ بیت الحرام کا ہے اور خانہ کعبہ کا یہی نام قرآن مجید میں مذکور ہے جس سے پہلے نوشتوں کی تصدیق ہوتی ہے۔اس گھر کو بزرگی دینے کا مطلب اسے قبلہ قرار دینا ہے۔یہ بات کہ اس مقام پر شوکت کو گھر سے مراد کعبہ ہے، نا کوئی اور مقام،اس دلیل سے صاف اور واضح ہو جاتی ہے کہ ورس ۶۔۷ میں مدیان،عیفہ،سبا،قیدار اور نبیط کے لوگوں کا جمع ہونا،قربانیاں کرنا بتایا گیا ہے۔یہ پانچوں حضرت ابراھیم ؑ کے بیٹے یا پوتے ہیں جو عرب میں آباد ہوئے اور جن کی نسل کے قبیلے صرف محمد ﷺ کے دین میں داخل ہوئے۔نہ عیسائی تھے نہ یہودی تھے اور ان سب نے مل کر صرف مذبح منیٰ ہی پر قربانیاں پیش کی تھی۔قوموں کے نام منیٰ کا پتہ عرب کا قاطبتا مسلمان ہو جانا۔حجۃ الوداع میں سب کا نبی ﷺ خدمت میں حاضر ہوتا ہے ایسے تاریخی واقعات ہیں جو مندرجہ بالا آیات کے معنی کو بالکل یقینی بنادیتے ہیں۔

دوم:حجی نبی (ق۔۵۲سال) کی کتاب میں ہے،اس پچھلے گھر کا جلال پہلے گھر سے زیادہ ہوگا۔رب الافواج فرماتا ہے اور میں اس مکان کو سلام یا سلامتی بخشوں گا۔رب الافواج فرماتا ہے،باب ۲،ورس۔۶

سوم: مکاشفات یوحنا باب ۳ ورس ۱۲ میں ہے۔ میں اسے جو غالب ہوتا ہے اپنے خدا کی ہیکل کا ستون بناؤں گا اور اپنے خدا کے شہر یعنی نئے یروشلم کا نام جو میرے خدا کے حضور سے آسمان سے اترتی ہے اور اپنا نیا نام اس پر لکھوں گا جس کا کان ہے سنے کہ روح کلیساؤں سے کیا کہتی ہے۔" یوحنا نے یروشلم اور نئے نام کا ذکر کیا ہے۔ نیا یروشلم کعبہ ہے اور خدا کا نیا نام جس سے اہل عرب کی باوجود اہل زبان ہونے کے ناواقف تھے اسم پاک رحمان ہے جسے اسلام ہی نے ظاہر کیا۔ نیا یروشلم کا آسمان سے اترنا یہ معنی رکھتا ہے کہ کعبہ کو قبلہ بنائے جانے کا حکم آسمان سے نازل ہوگا قرآن مجید میں بھی اسی طرف اشارہ ہے۔ "قد نریٰ تقلب۔۔۔ ترضھا ترجمہ: ہم نے دیکھا کہ تم آسمان کی طرف اپنا چہرہ کر کے دیکھ رہے ہو اس لیے حکم ہے جو قبلہ تمہیں پسند ہے اس کی طرف پھر جاؤ۔

زبور ۸۴ میں ہے: عربی

۴" طُوبٰى لِلسَّاكِنِينَ فِي بَيْتِكَ أَبَداً يُسَبِّحُونَكَ"۔

۵: " طُوبٰى لِأُنَاسٍ عِزُّهُم بِكَ طُرُقُ بَيْتِكَ فِي قُلُوبِهِم"۔

۶: " عَابِرِينَ فِي وَادِي الْبَكَّا يُصَيِّرُونَهُ يَنْبُوعاً" " أَيْضاً بِبَرَكَاتٍ يُغَطُّونَ مَوْرَةَ"۔

اردو میں:

۴: مبارک با دوے ہیں جو تیرے گھر میں جو تیرے گھر میں بستے ہیں۔ وے سدا تیری ستائش کریں گے۔

۵: مبارک وہ انسان جس میں قوت تجھ سے ہے ان کے دل میں تیری راہیں ہیں۔

۶: دے بکا کی وادی میں گزرتے ہیں، اسے ایک کنواں بناتے"

۷"یہی برسات اسے برکتوں سے ڈھانپ لیتی"

انگریزی میں:

4: pleased are they that dwell in thy house, they will be still praising thee"

5: Blessed is the man whose strength is in thee. in whose heart are the ways ofthem"

6: Who passing through the valley of Beca, make it a well, the rain also filleth the pools"

ان ہرسہ زبانوں کی عبارات سے جو ایک ہی مشن سوسائٹی نے شائع کی ہیں، متفق طور پر درج

ذیل باتیں حاصل ہوتی ہیں۔

۱: ورس چہارم کی رو سے یہ کہ خدا کا ایک گھر ہے اور وہاں کے باشندوں کو مبارک بتایا گیا ہے اور ان کی علامت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ ہمیشہ خدا کی تسبیح وستائش کرتے ہوں گے۔

۲: ورس پنجم میں ہے کہ ان لوگوں کی عزت وقوت کا باعث اللہ تعالیٰ ہی ہوگا اور اسباب دینوی ان کی عزت وتوقیر کا باعث نہ ہوں گے۔

۳: ورس ششم کی رو سے لفظ بکا عربی، اردو، انگریزی تینوں زبانوں میں موجود ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ بکا وہ اسم معرفہ ہے جو کسی زبان میں بھی نہیں بدلا گیا۔ اور انگریزی میں اسمائے معرفہ کا پہلا حرف بڑے حرف سے لکھے جانے کا جو قاعدہ ہے اسی کے مطابق بائبل میں لفظ ''بکا'' کا پہلا حرف بی بھی بڑی B کے ساتھ لکھا ہے۔

۴: لفظ وادی عربی وار دو میں اور لفظ Valley جو بہ معنی وادی ہے، انگریزی میں لفظ بکا سے پہلے موجود ہے۔

۵: ہر سہ زبان میں ہے کہ وہاں بسنے والے وادی بکا میں ایک کنواں بنائیں گے۔ ان کا ثبوت ملاحظہ کیجئے:۔

الف: ساکنین بیت جس کا ذکر ورس ۴ میں ہے وہ اسمٰعیلؑ اور ان کی اولاد ہے۔ حضرت ابراھیمؑ کی دعا قرآن مجید میں ہے'' ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی زرع عند بیتک المحرم'' ترجمہ: اے خدا میں نے اپنی ذریت کو اس وادی غیر ذی زرع میں تیرے عزت والے گھر کے پاس آباد کیا ہے''۔

ب: یہ وادی جس کی صفت آیت بالا میں غیر ذی زرع ہے اسی کا نام ایک دوسری آیت میں بکہ ہے''ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ'' (پہلا گھر جو لوگوں کی عبادت کے لیے بنایا گیا ہے وہ ہے جو بکا میں ہے)۔ اب قرآن وزبور میں پورا اتفاق ہو گیا کہ مکہ کا نام خدا کے ہاں بکہ ہے۔

ج: ایک کنواں بنانے کا ثبوت باقی رہا جو وادی بکا میں ہے۔ بخاری کی حدیث (کتاب الانبیاء) عن ابن عباس میں اسمٰعیل اور ان کی والدہ کے یہاں آنے، آباد ہونے کی بابت ایک طویل حدیث ہے۔ اس کے فقرہ ۲۰ میں یہ عبارت ہے'' فَلَمَّا بَلَغَتَ الوَادِی سَعَت''۔ جب ہاجرہ اس وادی میں پہنچی تو وہاں (پانی کے لیے) دوڑی۔ پھر فقرہ نمبر ۲۹ ہے'' وغمز عقبیه علی الارض قال فا نتبق الماء فدهشت ام اسمعیل فجعلت تحفر (اسمٰعیلؑ) نے ایڑیاں زمین پر ماری۔ پانی ابل پڑا۔ اسمٰعیلؑ کی ماں حیران ہو گئی۔ پھر اسے کھود کر کنواں بنانے لگی۔ ناظرین! آپ نے دیکھا زبور کے اس مقام میں بکہ کا نام بھی نکل

آیا۔ وہاں کی مسجد کا نام بیت اللہ بھی ثابت ہو گیا۔ وہاں ایک کنواں کا ہونا بھی تحقیق ہو گیا اور وہاں کے رہنے والوں کا مبارک ہونا، ہمیشہ یادِ خدا میں رہنا ثابت ہو گیا۔ ہمارے مضمون تحویل کعبہ کی مناسبت سے یہ کافی دلیل ہمارے مدعا کی ہے''۔ (حوالا بالا ۲۰۲ تا ۲۰۴) اس کے بعد اس قدر اور بھی گزارش کر دینا چاہتا ہوں کہ ورس ۵ میں عربی کا مفہوم اردو اور انگریزی زبور کی عبارت اور مفہوم سے زیادہ صاف ہے۔

چند اہم نکات: عربی کی عبارت میں ''طرق بیتک فی قلوبھم'' اس کا لفظی ترجمہ ہے ''ان کے دلوں میں تیرے گھر کی راہیں ہیں'' لیکن اردو زبور میں ہے ''ان کے دل میں تیری راہیں ہیں'' اور انگریزی میں "In whose heart are the ways of them" اردو اور انگریزی نے لفظ بیت کا ترجمہ صاف حذف کر دیا۔ اردو میں ''تیری راہیں'' اور انگریزی میں ''them'' ان کی راہیں لکھا۔ قرآن کریم صاف بیان کرتا ہے۔'' ربنا انی اسکنت۔۔۔۔ یشکرون '' (۱۴۔۳۷) ترجمہ: ''اے میرے خدا! میں نے اپنی اولاد کو اس وادی غیر ذی زرع میں تیرے شوکت والے گھر کے پاس بسایا ہے ۔اے خدایا! اس لیے کیا کہ یہ سب (بسنے والے) نمازوں کا قیام کریں اب تو لوگوں کے دلوں میں ان بسنے والوں کی محبت ڈال دے اور ان کو ہر طرح کے میووں کی روزی دیا کر کہ یہ شکر گزار رہیں''۔

۲: ورس ۵ کا پہلا جزو عربی میں یوں ہے'' طوبی لاناس عزھم بك'' اس میں لفظ اناس یہ صیغہ جمع ہے اور عزوھم میں بھی ضمیر جمع ہے لیکن اردو میں یہ الفاظ ہیں ''مبارک وہ انسان جس میں قوت تجھ سے ہے اور انگریزی میں یہ الفاظ ہیں " Blessed is the man whose strength is in thee" ۔اردو میں لفظ انسان اور ''جس''، انگریزی میں Man اور Whose واحد کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔ عربی ترجمہ کی صحت اور اردو انگریزی ترجمہ کی غلطی اس طرح ثابت ہوتی ہے کہ اسی ورس کے دوسرے جزو میں اردو میں ''ان کے'' اور انگریزی میں "Them" جمع کے لیے موجود تھے۔ عربی تورات کا فقرہ'' طوبیٰ لاناسِ عزھم بك'' دراصل فقرہ نمبر ۴'' طُوبیٰ لِلسَّاکِینِینَ فِی بَیْتَكَ'' ہی کی صفت ہے۔ (حوالا بالا۔۲۰۵)

الغرض تورات کے اس مقام سے بکہ بیت اللہ، زم زم، اولاد اسمٰعیلؑ صاف طور پر ثابت ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ احسان ہے جس نے مسلمانوں کے لیے ان کے جد امجد کے قبلہ کو مقرر فرمایا جو وادی بکہ میں ہے نہ کہ یروشلم کو۔ نیز وہ دین اسلام جس کو سب ادیان پر غلبہ حاصل ہونا تھا۔'' لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّینِ کُلِّہٖ'' اسی گھر کو قبلہ ہونا چاہیے تھا نہ کہ ایسا قبلہ جسے ہر کافر فاتح نے اجاڑا اور بالآخر سنڈ اس کی جگہ بنایا اور وہاں کے باشندوں کو کئی دفعہ غلامی کی زنجیروں میں بہ طور قیدی رہنا پڑا یا انھیں جلاوطنی کی سزا کاٹنا پڑی۔

ایک الجھن: قد نری تقلب وجهك فی السماءِ فلنو لینك قبله ترضا ھا قول وجهك شطر

المسجد الحرام ۔(سورہ۲۔آیت۱۴۴)ترجمہ:''ہم دیکھ رہے ہیں (اے حبیب) تمھارے چہرے کا بار بار اٹھنا آسمان کی طرف، اس لیے تمھیں پھیر دیتے ہیں اس قبلہ کی جانب جو تمھیں پسند ہے،تو اب اپنا منہ مسجد حرام کی طرف کرلو)۔اس حکم خداوندی کے بعد رہتی دنیا تک کے لیے کعبہ مکرمہ قبلہ بن گیا نیز آیت کا ابتدائی حصہ۔قد نریٰ۔۔۔۔ترضاھا تک صرف رضائے مصطفیٰ کی شان عالی شان کا اظہار ہے ورنہ تحویل قبلہ کے لیے حکم تو آیت کا آخری حصہ کافی تھا۔''فول وجھک شطرالمسجد الحرام''

الجھن یہ ہے۔

۱:تحویل کعبہ کا حکم دوران نماز ہوا تھا۔

۲:کس مسجد میں یہ حکم نازل ہوا تھا؟

۳:وحی کا نزول کس حالت میں ہوا تھا۔

۴:وہ پہلی مسجد کون سی تھی جہاں پہلی نماز قبلہ ابراھیمی کی طرف پڑھی گئی۔

۵:ظہر کی نماز تھی یا عصر کی نماز۔

زیادہ تر انحصار ابن سعد کی روایت پر ہے جو انھوں نے واقدی کے حوالے سے بیان کی ہے اگرچہ وہ مختصر ہے مگر دیگر راویوں نے اس میں اضافہ کر دیا۔روایت یہ ہے۔''ایک روز جان دو عالم ﷺ حضرت بشر بن البراؓء بن معرور کی والدہ سے ملاقات کے لیے ان کے گھر محلّہ بنی سلمہ میں تشریف لے گئے تو بشر کی والدہ نے دوپہر کے کھانے کا انتظام کیا۔اسی اثناء میں نمازِ ظہر کا وقت ہوگیا۔چناں چہ آپؐ نے قبیلہ بنی سلمہ کی مسجد میں حسب معمول بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنی شروع کی۔جب دو رکعتیں پڑھا چکے تو جبرئیل امین حاضر ہوئے اور اشارہ کیا کہ کعبہ کی طرف منھ پھیر کر بقیہ نماز مکمل کریں۔حکم الٰہی ملتے ہی آپؐ نے نماز کی حالت میں اپنا رخ کعبہ کی طرف پھیرلیا اور آپؐ کی اقتداء میں تمام نمازیوں نے بھی بلا تامل اپنے منھ بیت المقدس سے پھیر کر کعبہ کی طرف کر لیے۔چوں کہ مدینہ طیبہ سے بیت المقدس شمال کی جانب ہے اور کعبہ اس کے مقابل جنوب میں ہے اس لیے اس تبدیلی کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیچھے جہاں مستورات نماز ادا کر رہی تھیں وہاں مرد آکر کھڑے ہو گئے اور ان کی جگہ مستورات کھڑی ہو گئیں۔اس وقت مذکورہ آیات نازل ہوئیں۔اس روایت میں تین باتیں معلوم ہوتی ہیں۔۱:وحی کا نزول دوران نماز ہوا۔۲:وہ نماز ظہر کی تھی۔۳:وہ مسجد بنوسلمہ کی تھی۔لیکن اس سلسلہ میں حضرت براء بن عازبؓ سے منقول چار روایتیں ہیں جو بخاری شریف میں کتاب الایمان باب الصلوۃ من الایمان ،۲:کتاب الصلوۃ باب التوجہ نحو القبلۃ ،۳:کتاب التفسیر باب ولکل وجھۃ ،۴:کتاب الاخبار الاحاد باب ماجاء فی اجازۃ خبر الواحد۔

علامہ ابن کثیر قد نری تقلب وجھک۔۔۔الآیہ کی تفسیر میں سنن نسائی کی یہ روایت لائے ہیں۔''

حضرت ابوسعید بن المعلی بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ہر روز مسجد (نبوی) میں جایا کرتے تھے اور وہاں نماز پڑھا کرتے تھے۔ایک دن حسب معمول ہم مسجد کے پاس سے گزرتے ہوئے اندر گئے تو ہم نے دیکھا کہ آپ ؐ منبر پر تشریف فرما ہیں۔میں نے کہا کہ آج ضرور کوئی واقعہ پیش آیا ہے جب ہم بیٹھ گئے تو رسول اللہ ﷺ نے یہ آیات تلاوت فرمائی قد نری۔۔۔۔الآیۃ تو میں نے اپنے ساتھی سے کہا ’’آؤ! ہم دو رکعت پڑھ لیں پہلے اس سے کہ رسول اللہ ﷺ منبر سے اتریں۔اس طرح ہم وہ پہلے انسان ہوں گے جنھوں نے (اس آیت کے نازل ہونے کے بعد) کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی۔چناں چہ ہم نے اوٹ میں ہو کر دو رکعتیں پڑھ لیں۔پھر رسول اللہ ﷺ منبر سے اترے اور لوگوں کو نماز ظہر پڑھائی۔

اوپر بخاری کی چار روایتوں میں یہ ذکر نہیں کہ یہ واقعہ کس مسجد میں پیش آیا تھا اور نہ ہی یہ ذکر ہے کہ وحی کا نزول کس حالت میں ہوا تھا۔ہاں یہ ضرور ہے ’’کتاب الایمان باب الصلوۃ من الایمان‘‘ والی روایت میں ہے کہ نماز ظہر کی تھی۔اسی طرح سنن نسائی کی روایت میں ظہر کی نماز کا ذکر ہے اور ابن سعد والی روایت میں صرف نماز ظہر کا ذکر ہے باقی تمام چیزوں میں اختلاف ہے۔کیونکہ اس روایت کے مطابق یہ واقعہ مسجد نبوی کا ہے نہ کہ مسجد بنی سلمہ کا، کیونکہ ممبر صرف مسجد نبوی میں تھا اس میں یہ بھی واضح طور پر مذکور ہے کہ وحی کا نزول نماز کے دوران نہیں ہوا تھا اس سے خاصا پہلے ہو چکا تھا اس کے بعد آپ ﷺ نے باقاعدہ منبر پر بیٹھ کر یہ آیات حاضرین کو سنائیں پھر اتنی دیر تک منبر پر جلوہ افروز رہے کہ ابو سعیدؓ اور ان کو دوست دو رکعتیں پڑھ کر فارغ ہو گئے تب آپ ﷺ ممبر سے اترے اور نماز پڑھائی۔

سنن نسائی کی روایت عقل و نقل کے مطابق ہے۔آپ ؐ کو تحویل قبلہ کے حکم کا انتظار تھا۔آخر آپ کی پسند اور مرضی پر قبلہ کعبہ بنا دیا۔

خدا کی رضا چاہتے ہیں دو عالم
خدا چاہتا ہے رضائے محمد ؐ

نماز کے دوران وحی نازل ہوئی حال آنکہ اس موقعہ پر ضرورت نہ تھی کیوں کہ اس سے قبل حالت نماز میں وحی نہیں اتری۔ نیز نزول وحی کے وقت آپ ؐ پر جو کیفیت طاری ہوتی تھی وہ عام حالت سے بالکل مختلف ہوتی تھی اور پاس بیٹھنے والے محسوس کر لیتے تھے۔نزول وحی کے وقت ایک گونہ دنیاوی اور مادی عالم سے الگ ہو جاتے تھے اور عالم قدس کے ساتھ ہمہ تن گوش ہو جاتے تھے۔لہٰذا ایسی حالت نماز میں ہونا بعید از قیاس ہے۔اگر ایسا کبھی ہوا ہوتا تو صحابہ کرامؓ ضرور بیان کرتے کہ فلاں وقت اور فلاں مقام پر عین دوران نماز وحی کا نزول ہوا تھا۔اہل علم جانتے ہیں کہ ایسا کوئی واقعہ منقول نہیں ہے تو پھر صرف تحویل قبلہ کے لیے تخصیص کیوں؟

دوم: قبلہ بیت المقدس مدینہ سے شمال کی طرف ہے اور کعبہ جنوب کی طرف۔ نماز میں منہ پھیر لیا جائے تو مرد، خواتین کو شمال سے جنوب کی طرف رخ کرنا ہوگا جس سے نمازیوں کی نماز کی کیفیت عجیب اور انوکھی ہوگی۔ امام سے متعلق نمازی بے خبر ہیں کہ وہ کدھر جا رہا ہے، کدھر جانا چاہتا ہے اور یہ سارے کام نماز کے اندر کر رہا ہے۔ ایسی صورت میں اقتداء ختم کر دیں گے اور امام کو دیکھنے لگیں گے۔ اس کی وضاحت امکانی نقشہ کی مدد سے لی جاسکتی ہے جو رسالہ تحویل قبلہ میں ہے۔

سوم: روایت کے بارے میں محدثانہ نقطہ نظر سے: سنن نسائی اور ابن سعد کی اس روایت میں صرف ایک چیز مشترک ہے کہ دونوں میں نماز ظہر کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ تمام چیزیں مختلف ہیں کیوں کہ ابوسعید والی روایت کے مطابق یہ واقعہ مسجد نبوی کا ہے نہ کہ مسجد بنوسلمہ کا، کیوں کہ منبر صرف مسجد نبوی میں تھا۔

۱: امام شافعی نے فرمایا کہ '' (محمد بن عمر الواقدی الاسلمی متوفی ۲۰۷ھ) کی تمام تصانیف جھوٹ کا انبار ہیں کتب سیرت میں اکثر بے ہودہ روایتوں کا سرچشمہ ان کی ہی تصانیف ہیں۔

۲: ایک ظریف محدث نے خوب کہا ہے کہ اگر واقدی سچا ہے تو دنیا میں کوئی اس کا ثانی نہیں اور اگر جھوٹا ہے تب بھی دنیا میں اس کا جواب نہیں۔ (سیرت النبی۔ ج اول۔ ۴۱)

۳: جناب عبدالدائم لکھتے ہیں کہ حافظ عبدالرحمٰن احمد بن شعیب النسائی عظیم الشان محدث ہیں۔ ان کی سنن نسائی صحاح ستہ کی کتب میں شامل ہے جب کہ محمد ابن سعد نہ خود امام نسائی کے ہم مرتبہ ہیں نہ ان کی کتاب طبقات کبریٰ کی وہ حیثیت ہے جو سنن نسائی کی ہے۔

۴: پھر ابن سعد نے بشر کی والدہ والا قصہ یُقالُ کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اور صیغہ مجہول سے بیان کردہ تعلیقات مردود ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ طبقات ابن سعد میں ایک اور بے سند تعلیق پائی جاتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ جان دو عالم ﷺ کی اپنی مسجد یعنی مسجد نبوی کا ہے۔ ویقال رکعتین من الظهر فی مسجدِہٖ بالمسلمین الخ ' (اور کہا جاتا ہے کہ رسول اللہؐ نے اپنی مسجد میں لوگوں کو ظہر کی نماز کی دو رکعتیں پڑھائیں۔۔ الخ۔ ایسی متضاد اور متعارض تعلیقات پر بھلا کس طرح اعتبار کیا جاسکتا ہے؟۔ اس لیے ہمارے خیال میں صحیح بات وہی ہے اور اتنی ہی جتنی کہ نسائی کی روایت میں مذکور ہے۔ (رسالہ تحویل قبلہ۔ قاضی عبدالدائم دائم سے ماخوذ)

علامہ غلام رسول رضوی (تفہیم البخاری۔ ج ا۔ ص ۱۷۱) لکھتے ہیں کہ یہ کہنا صحیح نہیں کہ ظہر کی کچھ نماز پڑھنے کے بعد سید عالمؐ کعبہ کی طرف متوجہ ہوئے (یعنی منہ پھیر لیا تھا) کیوں کہ یہ صحیح روایات کے خلاف ہے۔ تحویل قبلہ ظہر اور عصر کے درمیان ہوئی تھی اور آپؐ نے سب سے پہلی نماز جو کعبہ شریف کی طرف پڑھی وہ عصر کی نماز تھی۔

ایک شبہ کا ازالہ: زُہیر نے کہا ہمیں ابواسحاق نے خبر دی کہ انھوں نے اپنی حدیث میں کہا کہ تحویل قبلہ سے پہلے کچھ لوگ فوت ہو گئے یا شہید ہو گئے۔ہم نے نہ جانا کہ ان کے حق میں کیا کہیں تو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا کہ" وَمَا كَانَ اللهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُم "(اللہ تمھارا ایمان ضائع نہیں کرے گا) یعنی جنھوں نے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نمازیں پڑھتے رہے پھر فوت ہوئے یا شہید ہوئے تو ان کی نمازیں مقبول ہیں کیوں کہ وہ بیت المقدس کی طرف نمازیں اللہ کے حکم سے پڑھتے تھے۔اللہ تعالیٰ نے انھیں ضائع نہیں کیا۔(تفہیم البخاری ا۔۱۷۱) ایک روایت میں ہے کہ عبادہ بن بشرؓ نے ظہر کی نماز آپؐ کی اقتداء میں ادا کی۔پھر وہ انصار کے محلّہ بنی حارثہ میں گئے۔عصر کا وقت ہو گیا تھا وہاں انصار نماز پڑھ رہے تھے کہ عبادہ نے کہا" میں اللہ کے نام کی شہادت دیتا ہوں کہ میں نے حضور کی اقتداء میں بیت اللہ کی طرف منھ کر کے نماز پڑھی ہے یہ سنتے ہی سب نمازی بلا تامل جس حالت میں تھے اسی حالت میں کعبہ شریف کی طرف منھ کر کے نماز ادا کرنے لگے۔

ایک اور شبہ کا ازالہ: براء بن عازبؓ سے روایت کی کہ ایک شخص نے آنحضرتؐ کے ساتھ نماز پڑھی۔پھر وہ انصار کے پاس سے گزرا جب کہ وہ عصر کی نماز بیت المقدس کی طرف منھ کر کے پڑھ رہے تھے۔جب ان سے ذکر کیا گیا کہ قبلہ تبدیل ہو گیا ہے تو وہ کعبہ کی طرف پھر گئے۔۲:بخاری،نسائی اور مسلم میں بھی کتاب الصلوۃ میں ابن عمر سے روایت کی کہ انھوں نے کہا ایک وقت لوگ قبا میں صبح کی نماز پڑھ رہے تھے کہ کوئی شخص آیا جب کہ ان کے چہرے شام کی طرف تھے۔اس نے تحویل کعبہ کی خبر دی تو وہ نماز میں کعبہ کی طرف پھر گئے۔۳:ان میں تعارض نہیں۔عصر اور صبح کی روایات میں جمع اور اتفاق کا یہ طریقہ ہے کہ اس شخص نے نبی کریمؐ کے ساتھ عصر کی نماز پڑھی تھی پھر وہ شخص انصار کے پاس سے عصر کی نماز کے وقت گزرا۔یہ براء کی روایت کے مطابق جمع ہے اور حضرت انس اور ابن عمر کی روایت کے مطابق وہ صبح کی نماز تھی' وہ دوسرے روز اہل قباء کی نماز ہے۔ اس طرح ان روایات میں اتفاق ظاہر ہے۔(تفہیم البخاری۔ج ا۔ص ۱۷۱)ان دونوں مساجد(بنوسلمہ،قبا) میں نمازیوں کی تعداد کم ہوتی تھی جس کی وجہ سے ان کا دوران نماز کعبہ کی طرف رخ کر لینا آسان ہے۔پہلی مسجد سے متعلق قاضی عبدالدائم دائم (رسالہ تحویل قبلہ) لکھتے ہیں" واضح رہے کہ یہ ایک چھوٹی سی مسجد تھی اور زیادہ تر لوگ چوں کہ مسجد نبوی میں نماز پڑھتے تھے اس لیے اس مسجد میں گنے چنے چند نمازی ہوں گے اتنی مختصر سی جماعت کے مخالف سمت میں منھ پھیر لینے سے وہ الجھنیں پیدا نہیں ہوتیں جو مردوں،بچوں اور عورتوں کی کثیر تعداد کے رخ بدلنے سے آتی ہیں۔

ایک اور شبہ کا ازالہ: شارح بخاری بدرالدین عینی لکھتے ہیں" هُوَ مَسجِدُ بَنِي سَلَمَةَ وَيُعرَفُ بِمَسجِدِ القِبلَتَين "(وہ مسجد بنی سلمہ تھی جو قبلتین کے نام سے مشہور ہے) اس سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔ایک تو یہ کہ تحویل قبلہ کا حکم مسجد بنی سلمہ میں نماز ظہر کے دوران ہرگز نازل نہیں ہوا تھا اگر ایسا ہوا ہوتا تو وہ لوگ عصر کی نماز

لازماً کعبہ کی طرف منہ کر کے پڑھتے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ تحویل قبلہ کا حکم ظہر کی نماز کے دوران بنی سلمہ ہی کی مسجد میں نازل ہوا اور آدھی نماز ظہر کعبہ کے رخ پر پڑھی بھی جا چکی ہو مگر عصر کے وقت مسجد بنی سلمہ کے نمازی پھر بیت المقدس کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جائیں۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ مسجد قبلتین کا یہ نام اس لیے نہیں پڑا کہ اس میں جان دو عالم ﷺ نے ایک ہی نماز دو قبلوں کی طرف منہ کر کے پڑھی تھی۔ نماز کے دوران ہی اپنا رخ کعبہ کی طرف کر لیا تھا اگر چہ ایسے واقعات چند اور مسجدوں میں بھی پیش آئے تھے مگر سب سے پہلا واقعہ چوں کہ اسی مسجد میں ظہور پذیر ہوا تھا اس لیے اس کا نام مسجد قبلتین پڑ گیا۔ (حوالا بالا۔۱۲۔۱۱)

بنی سلمہ کی مسجد ہو یا قبا کی مسجد ہر دو مساجد میں نمازیوں کو ایک آدمی نے آواز دے کر کہا کہ آپؐ نے بیت المقدس کے بہ جائے بیت اللہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی ہے تو انھوں نے دوران نماز اپنا رخ بیت اللہ شریف کی طرف کر لیا۔ نیز ان دونوں مساجد میں مسجد نبوی کی نسبت نمازیوں کی تعداد کم تھی اس لیے انھیں اپنا رخ بدلنے میں کسی الجھن کا سامنا نہیں تھا۔ اس کے علاوہ مسجد نبوی میں نمازیوں کو اطلاع بہ ذریعہ وحی دی جاتی ہے۔ اس صورت میں صرف وحی آپؐ پر نازل ہوتی ہے۔ اطلاع عام نہیں دی جاتی۔ اگر آپؐ بغیر مطلع کیے رخ بدل لیتے ہیں تو نماز ٹوٹ جاتی ہے کیوں کہ عورتوں کی جگہ مرد اور مردوں کی جگہ عورتوں نے لینی ہے اور پھر بغیر اطلاع کے ایسا ممکن ہی نہیں۔

ایک اور شبہ کا ازالہ: بخاری شریف کی صلاۃ العصر والی روایت کی جو توجیہہ بعض محدثین نے کی ہے وہ درست نہیں ہے کیونکہ اس کی بنیاد اس پر ہے کہ اس سے پہلے جو نماز ظہر کی پڑھی گئی تھی وہ آدھی بیت المقدس اور آدھی خانہ کعبہ کی طرف۔۔۔ حالانکہ ایسا کوئی واقعہ سرے سے ہوا ہی نہیں تھا بلکہ حکم تحویل کعبہ نماز سے پہلے نازل ہو چکا تھا اور وہ پوری نماز کعبہ کی طرف رخ کر کے ادا کی گئی تھی، لہذا اس صورت میں کہا جا سکتا ہے کہ صلاۃ العصر میں ''عصر'' کا لفظ کسی روای کی بھول چوک ہے اور صحیح صلاۃ الظہر ہے یعنی حکم تحویل کے بعد سب سے پہلی نماز جو آپ ﷺ نے ادا فرمائی وہ ظہر کی تھی، لیکن اس میں الجھن یہ ہے کہ صلاۃ العصر میں امام بخاری منفرد نہیں ہیں بلکہ ترمذی کی روایت میں بھی صلاۃ العصر ہی مذکور ہے۔ اگر کثرت روایات کی بنیاد پر صلاۃ العصر کو ترجیح دی جائے تو پھر یہ کہنا پڑے گا کہ سنن نسائی میں جو نماز ظہر کا ذکر ہے وہ کسی راوی کا اشتباہ یا تساہل ہے اور منبر پر سے اتر کر جان دو عالم ﷺ نے جو نماز پڑھائی تھی وہ درحقیقت ظہر کی نہیں، بلکہ عصر کی تھی۔'' (رسالہ تحویل قبلہ۔۱۱)

قبلہ پر اعتراضات:

اعتراض نمبر ۲۶۳

مستشرقین کہتے ہیں کہ آپؐ نے ابتداء میں یہودیوں کی دل جوئی کے لیے بیت المقدس کو اپنا

قبلہ قرار دیا جو یہودیوں کا مقدس مقام تھا اور جب وہ ایمان نہ لائے تو آپ نے ان کی مخالفت میں اپنا قبلہ بدل دیا۔

۲: دوسرا الزام یہ ہے کہ یہودیوں کے کاروبار کا دارومدار سود پر تھا آپؐ نے ان کے کاروبار کو تباہ کرنے کے لیے سود کو حرام قرار دیا۔

جواب اول: آپؐ ہر کام میں سابقہ شریعتوں کے احکام کی پیروی کرتے تھے جب تک کہ وحی نہ آتی اس پر کاربند رہتے۔ سابقہ نبیوں کا قبلہ بیت المقدس تھا بایں سبب آپ نے بھی حکم خداوندی کے نازل ہونے تک قبلہ اول ہی کو قبلہ قرار دیا۔ اس میں یہودیوں کی دل جوئی کا معاملہ نہ تھا۔ صرف اور صرف وحی الٰہی کا انتظار تھا اور ہوا بھی ایسے جب حکم قبلہ کی تبدیلی کا نازل ہوا تو اسے قبلہ قرار دے دیا گیا۔

دوم: دوستی دشمنی کی بات نہیں کہ یہود کی مخالفت کے لیے ہی قبلہ کو ہی کافی دیر تک قبلہ بنائے رکھا بل کہ ایسے بہت سے امور ہیں جو یہودیوں میں مروج ہیں آپؐ نے ان پر عمل کیا اور ان کی تبلیغ کی۔ جیسے خدا کا اقرار، عقیدہ رسالت و نبوت، جنت دوزخ، ثواب عذاب وغیرہ عقائد کی اسلام نے تبلیغ کی، اور پرچار کیا۔ نیز جو ہستیاں یہودیوں کے ہاں معزز و محترم تسلیم کی جاتی ہیں آپؐ نے یہودیوں سے بڑھ کر ان کا احترام کیا۔

سوم: اگر آپؐ نے یہودیوں کی مخالفت کی وجہ سے قبلہ بدل لیا ہوتا تو پھر چاہیے تو یہ تھا کہ آپؐ تمام یہود کے انبیاء کی مخالفت کرتے مگر آپ نے ایسا نہیں کیا۔ اسلامی تعلیمات سے آشنا شخص بہ خوبی اس بات کو جان لیتا ہے کہ قبلہ کی تبدیلی کا سبب یہود کی مخالفت نہ تھی بل کہ حکم خداوندی تھا جس کو آپ ﷺ اور آپ کے پیروکاروں نے بہ دل و جان تسلیم کیا۔ حضرت ابراھیمؑ یہود کے لیے قابل عزت شخصیت تھے۔ آپؐ نے ان سے بڑھ کر عزت واحترام کیا۔ یہودیوں کو ثابت کیا کہ وہ تمھارے ہی نبی نہیں ہمارے بزرگ بل کہ جدامجد ہیں۔ دیگر بنی اسرائیل کے اجداد کا بھی آپؐ نے احترام کیا اور اپنے پیرووں پر ان کے ادب واحترام کو فرض قرار دیا۔ ان کا احترام ایمان کی اساس ہے۔ اگر یہود سے مخاصمت ہی کرنا تھی تو ان سے ایسا نہ کرتے۔ ایسا ادب واحترام ہی نہیں بلکہ جزایمان سمجھتے ہیں۔ " امنت باللہ و ملائکۃ و کتبہ ورسلہ و الیوم الاخر والقدر خیرہ و شرہ من اللہ تعالیٰ والبعث بعد الموت"

الزام دوم: سود کا ذکر ضمناً آ گیا اس پر مختصر بحث کرتے ہیں۔ سود کی حرمت کا حکم بھی حکم خداوندی تھی کسی دشمنی کا نتیجہ نہ تھا۔ یہودیوں کے کاروبار کو نقصان پہنچانے یا ان کا کاروبار ٹھپ کرنے کے لیے نہ تھا۔ بل کہ اس حرمت سے معاشی تباہیوں سے بچنے کے لیے اقدام کیا تھا اور اسلام کے احکام کی بجا آوری کے اول مخاطبین مسلمان تھے نہ کہ یہودی۔ یہ خوئے بدرا بہانہ بسیار والی بات ہے کہ یہودی خود

بھی باہمی لین دین میں سود کو حرام جانتے تھے۔اسلام نے یہود کی دوغلا چال اور پالیسی کو یک سر ختم کر کے سود کی حرمت کا اعلان فرما کر حکم نافذ فرما دیا۔عیسائی بہت سے مذہبی احکام سے اپنی زندگی کو بے دخل کیے ہوئے ہیں۔ان کے ہاں جو چیزیں حلال ہیں ان کے مذہب میں وہ حرام ہیں۔یہود بھی اپنی مجموعی زندگی میں مکمل مذہبی تعلیمات پر عمل نہیں کرتے ہیں۔اپنی خود ساختہ پالیسیوں کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہندوؤں کے ہاں بھی ایسا ہی ہے۔ برہمن اور شودر برابر نہیں لیکن ایک برہمن کا ووٹ اور شودر کے ووٹ کو برابر کا درجہ قرار دیا جاتا ہے۔ادھر اسلام ہر قسم کے تضاد سے پاک ہے۔یہ الگ بات کہ عمل میں کوتاہی ہو سکتی ہے لیکن اسلامی اٹل اصولوں میں تضاد اور تبدیلی کی گنجائش نہیں اور نہ ہی اسلام اصولوں پر سودا بازی کرتا ہے۔

ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ! سود کے بارے میں آپ ﷺ کیا فرماتے ہیں؟ یہ تو بالکل ہمارا ہی مال ہوتا ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا ''تم اپنا اصل مال لے سکتے ہو'' دیکھو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے یا ایھا الذین امنو اتقو اللہ و ذرو اما یقی من الربوا (بقرہ۔) ترجمہ: اے ایمان والوں خدا سے ڈرو اور سود میں سے جو لینا رہ گیا ہے وہ چھوڑ دو''

اعتراض نمبر ۲۶۴

یہود یہ بھی کہتے ہیں کہ محمد ﷺ ہماری ہر بات میں مخالفت کرتا ہے اس لیے قبلہ بھی مخالفت کے سبب بدل دیا۔

جواب: یہود و نصاریٰ کا تحویل قبلہ پر اعتراض محض گروہ پرستی، تعصب اور حسد کا نتیجہ ہے اگر وہ حق پر ہوتے تو ایک دوسرے سے اختلاف کیوں کرتے۔ یہودی عیسائیوں کو قبلہ نہیں مانتے اور عیسائی یہودیوں کا قبلہ نہیں مانتے جب ان فریقین نے اتباع حق کا راستہ ترک کر دیا تو پھر حق پرستوں کو کبھی بھی ان لوگوں سے اتفاق نہیں ہو سکتا کیونکہ کسی بات کا حق ہونا بھی اس کے حق ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

آپ ﷺ کے اشتیاق میں اضافہ ہوا کہ بیت اللہ کی طرف رخ پھیرنے کے بارے وحی کا نزول ہو۔اس بات پر آپ ﷺ پر امید تھے کیونکہ یہ بیت اللہ دونوں قبلوں میں سب سے پہلا قبلہ تھا نیز آپ ﷺ کے جد امجد حضرت ابراہیمؑ کا قبلہ تھا اور تمام عرب میں قابل قدر مقام تھا جہاں لوگ دور دراز سے حج کرتے اور زیارت کو آتے، اس سے اہل عرب کا اسلام کی طرف متوجہ ہونا ممکن ہو سکتا تھا۔ارشاد ربانی ہے: ترجمہ اے نبی! یہ تمہارے چہرے کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا دیکھ رہے ہیں، تو ہم اسی قبلہ کی طرف تمہیں پھیرے دیتے ہیں جیسے تم پسند کرتے ہو۔ مسجد حرام کی طرف رخ پھیر لو، اب جہاں کہیں تم ہو اسی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرو، یہ لوگ جنہیں کتاب دی گئی تھی خوب جانتے ہیں کہ (تحویل

قبلہ) کا یہ حکم ان کے رب ہی کی طرف سے ہے اور برحق ہے مگر اس کے باوجود جو کچھ یہ کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ اس سے غافل نہیں ہے''۔

یہود و نصاریٰ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ قبلہ کی تحویل برحق ہے مگر اپنی ہٹ دھرمی کے ڈگر پر گامزن ہیں حالانکہ ان کے پیغمبروں پر نازل شدہ کتابوں میں درج ہے کہ یقیناً حضرت محمد ﷺ دو قبلوں کی طرف منہ کر کے نماز پڑھیں گے اسو یہ آپ ﷺ اختراع نہیں ہے اور نہ ہی یہود و نصاری سے دشمنی کی بنیاد پر ہے۔ ارشاد ربانی (وان الدین اوتوا الکتاب یعلمون انہ الحق من ربھم) ''اور یہ لوگ جنہیں کتاب دی گئی تھی خوب جانتے ہیں کہ (تحویل قبلہ کا) حکم ان کے رب ہی کی طرف سے ہے اور برحق ہے مگر اس کے باوجود جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔'' کعبہ کی طرف منہ پھیرنے کی تاکید مزید کی۔ قرآن شریف میں ہے تمہارا گزر جس مقام سے بھی ہو وہی سے اپنا رخ (نماز کے وقت) مسجد حرام کی طرف پھیر دو کیونکہ یہ تمہارے رب کا بالکل برحق فیصلہ ہے اور اللہ تعالیٰ تم لوگوں کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔ اس میں یہ بھی بتایا جا رہا ہے کہ مسجد حرام کی طرف رخ کرنا ہی برحق ہے پھر ایک دوسری آیت میں حکم فرمایا اور اس میں یہ حکمت و دانائی واضح ہو کر سامنے آئی جو اللہ نے اس حکم میں رکھی تھی اس معاملہ میں ضعیف الایمان لوگوں کی سوچ غلط راہ پر چل نکلی تھی ارشاد خداوندی ہے'' اور جہاں سے بھی تمہارا گزر ہو اپنا رخ مسجد حرام کی طرف پھیرا کرو اور جہاں بھی تم ہو اسی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھو تا کہ لوگوں کو تمہارے خلاف کوئی حجت نہ ہو۔ ہاں ان میں سے جو ظالم ہیں ان کی زبان کسی حال میں بند نہ ہوگی تو ان سے تم نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو اور اس لیے کہ میں تم پر اپنی نعمت پوری کر دوں اور اس توقع پر کہ میرے اس حکم کی پیروی سے تم اس طرح فلاں کا راستہ پاؤ گے)۔ اس آیت کریمہ میں صریحا بیان کیا گیا ہے کہ لوگوں کی ان پر حجت کا خاتمہ کیا جا سکے اور یہ لوگ وہی تھے جن پر آسمانی کتب نازل ہوئیں یعنی یہود و نصاریٰ تھے۔ بلاشبہ یہودی تورات میں مذکور اوصاف رسول اللہ ﷺ کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کعبہ کی طرف تحویل کریں گے۔ یہ اس دور کی بات ہے جب آپ ﷺ بیت لمقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے لہذا رسول کریم ﷺ کا کعبہ کی طرف رخ پھیرنا اس بات کی تائید کرتا تھا جو ان کی کتابوں میں لکھی ہوئی تھی اور بیت المقدس کی طرف کرنے کے دور میں عیسائی، محمد ﷺ کے بارے کہتے تھے کہ محمد ﷺ کو کیا ہو گیا ہے یہ عجیب ہیں کہ ملت ابراہیمی کا دعویٰ کرتے ہیں اور اس کے قبلہ کو چھوڑے ہوئے ہیں لہذا کعبہ کی طرف رخ کرنا لوگوں کی حجت کے خاتمہ کرنے کا باعث تھا اور اس کا تقاضا تھا کہ وہ آپ ﷺ کی تصدیق کریں اور نبوت کو مان لیں لیکن انہوں نے حق کا انکار کیا اور اپنی سرکشی و بغاوت اور گمراہی میں سرگرداں رہے۔ اسلام نے یہود کے خودساختہ مذہب کی مخالفت کی لیکن ۱۶۔۱۷ ماہ تک یہودیوں کے قبلہ بیت المقدس ہی کو قبلہ

بنایا۔ اسی طرف منہ کر کے نمازیں پڑھتے رہے لیکن آپؐ اپنے جد امجد ابراھیمؑ کے قبلہ کعبہ کو قبلہ بنائے جانے کے خواہاں تھے۔ نیز ہر گروہ، ہر قوم اور ہر مذہب کے لیے ایک امتیازی شعار ہوتا ہے جس کے بغیر اس قوم کی مستقل ہستی قائم نہیں ہو سکتی۔ اسلام نے یہ شعار قبلہ قرار دیا۔ جو اصل مقصد کے لیے اور بہت سے حکم و اسرار کا جامع ہے۔ مساوات اسلام کا نمایاں وصف ہے جس کے لیے مسلمانوں کا یک جہت قبلہ پر متحد ہونا ہے۔ اس قبلہ کی تبدیلی پر نہ صرف یہودی ناراض تھے بل کہ کچھ ضعیف الایمان مسلمانوں کو بھی یہ بات کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی۔ قبلہ بدلنے سے اعتقاد میں تزلزل اور بے یقینی کا اظہار ہوتا ہے۔ ایسی تمام الجھنوں کا جواب قرآن کریم نے بیان فرما دیا۔

" سیقول السفهاء مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُم عَن قِبلَتِهِمُ الَّتِی کَانُوا عَلَیهَا قل لله المشرق و المغرب"۔ ترجمہ: (سفہا یہ اعتراض کریں گے کہ مسلمانوں کا جو قبلہ تھا اس سے ان کو کس نے پھیر دیا ۔ کہہ دو کہ مشرق و مغرب سب خدا ہی کا ہے۔ (البقرۃ۔۱۴۲)

" وما جعلنا القبلة التی۔۔۔ الا علی الذین هدی الله" (البقرہ۔۱۴۳) ترجمہ: "تیرا جو پہلے قبلہ تھا (کعبہ) اس کو جو ہم نے پھر قبلہ کر دیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ پیغمبر کا پیرو کون ہے اور پیچھے پھر جانے والا کون ہے؟ اور بے شبہ یہ قبلہ نہایت گراں اور ناگوار ہے بہ جز ان لوگوں کے جن کو خدا نے ہدایت کی ہے"۔

" لیس البر ان تولوا۔۔۔ والسایلین وفی الرقاب" ۔(البقرہ۔۱۷۷) ترجمہ: "پورب پچھّم رخ کرنا ہی کوئی ثواب کی بات نہیں۔ ثواب تو یہ ہے کہ آدمی خدا پر، قیامت پر، ملائکہ پر، خدا کی کتابوں پر، پیغمبروں پر ایمان لائے اور خدا کی محبت میں عزیزوں کو، یتیموں کو، مسکینوں کو، مسافروں کو، سائلوں کو، غلاموں کو (آزاد کرانے میں) اپنی دولت دے"۔

ان آیات میں ممکنہ اعتراضات کے جوابات موجود ہیں۔ نیز بہت سے یہودی جو منافق تھے اور مسلمان بنے ہوئے تھے ان کا راز فاش ہو گیا اور روح عبادت کو محض قبلہ کی طرف رخ کرنا نہیں ٹھہرایا بل کہ حقیقت ایمان اور اعمال صالحہ قرار دیا۔

اعتراض نمبر ۲۶۵

تم نے تحویل قبلہ والی آیت اور اس کا ترجمہ یوں لکھا ہے: وما جعلنا القبله التی کنت علیها الله ۔۔۔ علی عقبیه (البقرہ:۱۴۳) اور ہم نے وہ قبلہ جس پر اب تک تم تھے اس لیے مقرر کیا تھا تا کہ دیکھیں کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون الٹے پاؤں پھر جاتا ہے۔

اس کے متعلق تم لکھتے ہو کہ: مسجد حرام کو قبلہ قرار دینے سے پہلے مسلمانوں کا جو قبلہ تھا اسے قبلہ

بنانے کا کوئی حکم قرآن میں نہیں آیا۔ اگر آیا ہوتو تم اس کا حوالہ دے دیں۔ اگراس کے متعلق خدا کی طرف سے کوئی حکم آیا ہوتا تو ضرور قرآن میں ہوتا لیکن جب حکم آیا ہی نہیں تھا تو بحث کا حوالہ قرآن سے کیسے دوں؟ تم نے پہلے یہ فرض کرلیا ہے کہ پہلے قبلے کوخدا نے مقرر کیا تھا اوراس کے بعد تم اس آیت کا ترجمہ اسی مفروضے کے مطابق کرتے ہیں۔ اس آیت میں ''کنت'' کے معنی ''تو تھا'' نہیں اس کے معنی ہیں ''تو ہے''، یعنی ہم نے وہ قبلہ جس پرتو ہے اس لیے مقرر کیا تاکہ یہ دیکھیں کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون الٹے پاؤں پھر جاتا ہے، ان معانی کی تائید خود قرآن سے ہوتی ہے۔

جواب: اس آیت میں کنت کے معنی تو ہے صرف اس بنیاد پر کرڈالے گئے ہیں کہ عربی زبان میں ''کان'' کبھی کبھی ''تھا'' کے بجائے ''ہے'' کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے لیکن جس شخص نے بھی سورہ بقرہ کا وہ پورا رکوع کبھی سمجھ کر پڑھا ہو جس میں یہ آیت وارد ہوئی ہے، وہ یہاں کنت کے معنی ''تو ہے'' ہرگز نہیں لے سکتا کیونکہ مضمون ماسبق و مابعد یہ معنی لینے میں مانع ہے رکوع کی ابتدا اس آیت سے ہوتی ہے: سیقول السفھاء۔۔۔ کانوا علیھا ''نادان لوگ ضرور کہیں گے کہ کس چیز نے پھیر دیا ان کو ان کے اس قبلے سے جس پر یہ تھے'' یہاں کانوا کا ترجمہ یہ ہیں، کسی طرح بھی نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ''کس چیز نے پھیر دیا'' کے الفاظ صاف بتارہے ہیں کہ پہلے مسلمان کسی اور قبلے کی طرف رخ کرتے تھے اب اسے چھوڑ کر دوسرے قبلے کی طرف رخ پھیرنے والے ہیں اور اسی بنا پر مخالفین کی طرف سے اس اعتراض کا موقع پیدا ہورہا ہے کہ اپنے پہلے قبلے سے کیوں پھر گئے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ بتاتا ہے کہ اگر یہ مخالفین اعتراض کریں تو اس کا جواب کیا ہے۔ اس سلسلے میں دوسری باتوں کے ساتھ یہ فقرہ ارشاد فرمایا جاتا ہے: وما جعلنا القبلتہ التی کنت علیھا الا۔۔۔ ''اور ہم نے وہ قبلہ جس تم تھے نہیں مقرر کیا گیا مگراس لیے کہ:'' یہاں کنت علیھا سے مراد بعینہ وہی چیز ہے جس کے متعلق اوپر کی آیت میں کانوا علیھا فرمایا گیا ہے۔ اس کے معنی ''تو ہے'' کسی طرح بھی نہیں لیے جاسکتے سابقہ آیت قطعی طور پر اس کے معنی ''تو تھا'' متعین کردیتی ہے۔ اس کے بعد تیسری آیت میں تحویل قبلہ کا حکم اس طرح دیا جاتا ہے: قد نری تقلب۔۔۔ شطر المسجد الحرام '' ہم دیکھ رہے ہیں تمہارے چہرے پر بار بار آسمان کی طرف اٹھنا۔ پس ہم پھیر دیتے ہیں تم کو اس قبلہ کی طرف جسے تم چاہتے ہو، اب موڑ دو اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف۔'' ان الفاظ سے صاف نقشہ نگاہ کے سامنے یہ آتا ہے کہ پہلے مسجد حرام کے سوا کسی اور قبلہ کی طرف رخ کرنے کا حکم تھا۔ رسول اللہ ﷺ یہ چاہتے تھے کہ اب وہ قبلہ بدل دیا جائے۔ اس لیے آپ ﷺ بار بار آسمان کی طرف منہ اٹھاتے تھے کہ کب تبدیلی قبلہ کا حکم آتا ہے۔ اس حالت میں فرمان آگیا کہ لو اب ہم اس قبلہ کی طرف تمہیں پھیرے دیتے ہیں جسے تم قبلہ بنانا چاہتے ہو۔ پھیر دو اپنا رخ مسجد حرام کی طرف۔ اس سیاق وسباق میں آیت وماجعلنا

القبلہ الخ کو رکھ کر دیکھا جائے تو ان الٹی سیدھی تاویلات کی کوئی گنجائش نہیں رہتی جو ڈاکٹر صاحب نے یہاں پیش فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ صاف فرما رہا ہے کہ مسجد حرام سے پہلے جو قبلہ تھا وہ بھی ہمارا مقرر کیا ہوا تھا اور ہم نے اسے اس لیے مقرر کیا تھا کہ یہ دیکھیں کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون اس سے روگردانی کرتا ہے۔ یہ اعتراض منکر حدیث ڈاکٹر عبدالودود صاحب کا ہے جن کا مکالمہ مولانا مودودی سے سنت کی آئینی حیثیت کے بارے میں ہوا تھا۔ اس کا جواب اوپر دیا گیا ہے جو مولانا صاحب نے دیا ہے۔

اعتراض نمبر ۲۶۶

قبلے کے معاملہ میں رسول اللہ ﷺ کی پیروی کرنے یا نہ کرنے کا سوال کیسے پیدا ہوتا تھا؟

اگر تسلیم کیا جائے کہ پہلا قبلہ خدا نے مقرر کیا تھا تو اس ٹکڑے کے کچھ معنی بھی نہیں بنتے کہ ''ہم نے یہ اس لیے کیا تھا تا کہ یہ دیکھیں کون رسول کی پیروی کرتا اور کون الٹے پاؤں پھر جاتا ہے۔'' اس لیے کہ پہلے قبلے کو تعین کے وقت الٹے پاؤں پھر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ حضور ﷺ ایک قبلے کی طرف رخ کرتے تھے جو شخص حضور ﷺ کے ساتھ شریک ہوتا تھا وہ بھی اسی طرف رخ کر لیتا تھا۔ ''الٹے پاؤں پھرنے'' کا سوال اس وقت پیدا ہوا جب اس قبلے میں تبدیلی کی گئی۔ اس وقت اس کے پرکھنے کا موقع آیا کہ کون اسی پہلے قبلے کو زیادہ عزیز رکھتا ہے اور کون رسول کے اتباع میں (جس نے بحکم خداوندی یہ تبدیلی کی ہے) نئے قبلے کی طرف رخ کرتا ہے۔

جواب: یہ محض قلت فہم اور قلت علم کا کرشمہ ہے۔ منکرین حدیث کو یہ معلوم نہیں ہے کہ زمانہ جاہلیت میں کعبہ تمام اہل عرب کے لیے مقدس ترین تیرتھ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اسلام کی ابتدا جب اس کی بجائے بیت المقدس کو قبلہ بنایا گیا تھا تو یہ عربوں کے لیے سخت آزمائش کا موقع تھا۔ ان کے لیے اپنے مرکزی معبد کو چھوڑ کر یہودیوں کے معبد کو قبلہ بنانا کوئی آسان کام نہ تھا اسی کی طرف آیت زیر بحث ہے یہ فقرہ اشارہ کرتا ہے کہ وان کانت ۔۔۔ لیضیع ایمانکم (بقرہ ۱۴۳) ''اگرچہ وہ قبلہ سخت گراں تھا مگر ان پر نہیں، جنہیں اللہ نے ہدایت بخشی تھی، اور اللہ تمہارے اس ایمان کو ضائع کرنے والا نہیں ہے۔'' ان الفاظ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس قبلے کے معاملہ میں الٹے پھر جانے کا سوال کیوں پیدا ہوتا تھا۔ مزید برآں یہی الفاظ اس حقیقت کو بھی ظاہر کرتے ہیں کہ جو حکم قرآن میں نہیں آیا تھا بلکہ رسول پاک ﷺ کے ذریعے سے پہنچایا گیا تھا، اسی کے ذریعے سے لوگوں کی ایمان کی آزمائش کی گئی تھی۔ اس حکم کی پیروی جن لوگوں نے کی، انہی کے متعلق اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ ہم تمہارے اس ایمان کو ضائع کرنے والے نہیں ہیں۔ کیا اب بھی اس امر میں شک کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ غیر از قرآن بھی رسول کے پاس کوئی حکم بذریعہ وحی آسکتا ہے اور اس پر بھی ایمان کا مطالبہ ہے۔؟

نبی ﷺ پر خود ساختہ قبلہ بنانے کا الزام

اعتراض نمبر ۲۶۷

کہ یہ بات کے اس نئے قبلے کا حکم بھی خدا کی طرف سے آیا تھا، پہلے قبلے کا نہیں، دو ہی آیات کے بعد قرآن نے واضح کر دیا، جہاں کہا ہے کہ: لئن اتبعت اھواء ۔۔۔ اضالمین (۱۴۵:۲) یعنی اگر تم العلم آ جانے کے بعد ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع کرے گا تو اس وقت بے شک ظالموں میں سے ہو جائے گا ۔اس سے صاف واضح ہے کہ العلم (وحی خداوندی) نئے قبلے کے لیے آئی تھی ۔اگر پہلا قبلہ بھی العلم کے مطابق مقرر ہوتا تو یہاں یہ کبھی نہ کہا جاتا کہ العلم کے آنے کے بعد تم پہلے قبلے کی رخ نہ کرنا۔

جواب: مجھے شکایت تھی کہ منکرین حدیث میری عبارتوں کو توڑ مروڑ کر میرے ہی سامنے پیش فرماتے ہیں، مگر اب کیا اس کی شکایت کی جائے جو لوگ اللہ تعالیٰ کی آیت کو توڑ مروڑ کر ان کے من مانے مطلب نکالنے میں اس قدر بے باک ہوں ان کے سامنے ماوشما کی کیا ہستی ہے۔جس آیت کا آخری ٹکڑ انقل کر کے اس سے یہ مطلب نچوڑا جا رہا ہے اس پوری آیت اور اس سے پہلے کی آیت کے آخری فقرے کو ملا کر پڑھیئے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ منکرین حدیث قرآن مجید کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں۔ بیت المقدس کو چھوڑ کر جب مسجد حرام کو قبلہ بنایا گیا تو یہودیوں کے لیے اسی طرح طعن و تشنیع کا موقع پیدا ہو گیا جس طرح قبلہ سابق پر اہل عرب کے لیے پیدا ہوا تھا۔اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: و ان الـذین اوتو ا الکتب ۔۔۔ الذا لمن الظالمین (بقرہ۔۱۴۴۔۱۴۵) ''اہل کتاب خوب جانتے ہیں کہ یہ (یعنی مسجد حرام کو قبلہ بنانا) حق ہے، ان کے رب کی طرف سے، اور جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔تم خواہ کوئی نشانی ان اہل کتاب کے پاس لے آؤ، یہ تمہارے قبلے کی پیروی نہ کریں گے اور تم ان کے قبلے کی پیروی کرنے والے نہیں ہو، اور نہ ان میں سے کوئی کسی کے قبلے کی پیروی کرنے والا ہے اور اگر تم نے وہ علم آ جانے کے بعد جو تمہارے پاس آیا ہے ان کی خواہشات کا اتباع کیا تو تم ظالموں میں سے ہوں گے۔'' اس سیاق وسباق میں جو بات کہی گئی ہے اس سے یہ مطلب آخر کیسے نکل آیا کہ پہلا قبلہ ''العلم'' کے مطابق مقرر نہیں کیا گیا تھا اور صرف یہ دوسرا قبلہ ہی اس کے مطابق مقرر کیا گیا ہے اس میں تو صرف یہ کہا گیا ہے کہ جب خدا کا حکم بیت المقدس کو چھوڑ کر مسجد حرام کو قبلہ بنانے کے لیے آ گیا ہے تو اب اس العلم کے آ جانے کے بعد محض یہودیوں کے پر پیگنڈے سے متاثر ہو کر سابق قبلے کی طرف رخ کرنا ظلم ہوگا۔کسی منطق کی رو سے بھی اس کا یہ معنی نہیں پہنائے جا سکتے کہ پہلے جس قبلے کی طرف رخ کیا تھا وہ حضور ﷺ کا خود ساختہ تھا۔خصوصاً جبکہ اس سے پہلے کی آیتوں میں وہ کچھ تصریحات موجود

ہیں جو آیت نمبر ۱۴۳، ۱۴۴ میں بھی نقل کی جا چکی ہیں۔ نبی اکرم ﷺ پر خود ساختہ قبلہ بنانے کا الزام رکھنا ایک بدترین قسم کی جسارت ہے۔

اعتراض نمبر ۲۶۸

دوران نماز تحویل قبلہ کے لیے وحی کا نزول ہوا تھا۔

جواب: مصنف سیرت طیبہ (۱۔۲۱۶) یوں بیان کرتے ہیں کہ " قد نریٰ تقلب ۔۔۔ شطر المسجد الحرام "۔

ترجمہ: ہمیں معلوم ہے کہ آپ ﷺ بار بار منہ اٹھا کر آسمان کو دیکھ رہے ہیں۔ لیجئے آپ کو اپنے پسندیدہ قبلہ کی اجازت دیتے ہیں آپ ﷺ اپنا رخ مسجد الحرام کی طرف پھیر لیجئے۔

یہ حکم رجب یا شعبان دو ہجری میں نازل ہوا، حضور اکرم ﷺ حضرت بشر بن براء بن معرور کے یہاں دعوت پر تھے، ظہر کی نماز میں جب دو رکعتیں پڑھی جا چکی تھیں یہ آیت نازل ہوئی، چنانچہ اثنائے نماز ہی میں حضور ﷺ نے رخ بدل لیا، بعدہ شہر میں منادی کرا دی اور اس طرح مسلمانوں نے شمال سے جنوب کو رخ پھیر لیا کیونکہ بیت المقدس مدینے سے شمال کو ہے اور مکہ مکرمہ جنوب کو۔ (دوران نماز وحی کے نزول کی دلیل یہ دیتے ہیں) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب سے حضور اکرم ﷺ کے دل میں تحویل قبلہ کی خواہش پیدا ہوئی ہوگی آپ ﷺ نے بارہا صحابہ سے اس کا ذکر کیا ہوگا کہ تحویل قبلہ کا حکم آنے والا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوران نماز میں حکم نازل ہوا اور حضور ﷺ شمال سے چل کر جنوب کی طرف آ گئے اور باقی دو رکعتیں کعبے کی سمت منہ کر ادا کیں، تو نماز میں کوئی گڑبڑ نہ ہوئی۔ اگر آپ ﷺ نے صحابہ کو اس بارے میں نہ بتایا ہوتا اور ذہنی طور پر اس کے لیے تیار نہ ہوتے، تو نماز میں حضور ﷺ کے چلنے اور خاموشی سے کعبے کی طرف منہ کر لینے سے صحابہ کیسے سمجھ سکتے کہ یہ تحویل قبلہ ہے۔

مصنف مذکور کی یہ دلیل مفروضے پر قائم ہے آپ ﷺ کی زندگی کا بغور مطالعہ کرنے سے مترشح ہوتا ہے کہ آپ ﷺ پر جب سے وحی کا نزول ہوا تب سے مدت العمر کبھی بھی ایک موقع ایسا نہیں آیا کہ دوران نماز وحی کا نزول ہوا ہو۔ نزول وحی کے وقت آپ ﷺ کی کیفیت بدل جاتی تھی اور صحابہؓ بھانپ لیتے تھے کہ وحی کا نزول ہو رہا ہے۔ وحی کے نزول کی کیفیات کے شواہد دوران نماز نہیں دیکھے گئے جو اس سے قبل وحی کی کیفیات کا ذکر صحابہ کرامؓ کرتے ہیں۔ اگر قبلے کی تبدیلی کا ذکر کیا بھی ہوتا تب بھی وحی کی وہ کیفیات اس وقت دیکھنے میں نہیں آئیں جن سے صحابہ کرامؓ جان گئے ہوں گے کہ واقعی وحی کا حکم آ گیا ہے اور رخ پھیر لیا جائے۔ صحابہ کرامؓ کو اس دن اور اس نماز کے متعلق نہیں بتایا گیا تھا تو وہ کیسے بھانپ گئے کہ واقعی اس نماز کے دوران اپنا رخ کعبے کی طرف موڑ دینا ہے۔

۱۔اس کے علاوہ یہ دلیل صحیح احادیث کے خلاف ہے۔ایسی دلیل لانے کی ضرورت ہی کیا۔

۲۔ذرا اس منظر کو دیکھئے اگر کوئی اور امام نماز پڑھا رہا ہے تو۔۔۔۔۔کیا امام اور مقتدی اپنی اپنی جگہوں پر کھڑے ہوتے ہوئے جنوب کی طرف منہ کر لیں گے یا کوئی اور طریقہ اپنائیں گے؟ پہلی صورت تو ممکن نہیں ہے کیونکہ اس طرح امام پیچھے ہو جائے گا اور مقتدی آگے۔بصورت دیگر امام کو شمال سے جنوب کی سمت جانا پڑے گا،تو کیا وہ صفوں کو درمیان سے چیرتا ہوا دوسری طرف جائے گا یا پہلی صف کے آگے سے گھوم کر صفوں کے کنارے کنارے چلتا ہوا عورتوں کی آخری صف سے بھی پیچھے کھڑا ہو گا اور مرد عورتوں اور عورتیں مردوں کی جگہ جائیں گی۔۔۔لہذا یہ درست نہیں ہے کہ دوران نماز وحی کا نزول ہوا تھا بلکہ خاصا وقت پہلے نزول ہو چکا تھا۔

مولانا شبلی کا مغالطہ: وہ لکھتے ہیں کہ ہجرت سے پہلے حضور اکرم ﷺ مقام ابراہیم پر کھڑے ہو کر نماز پڑھتے ،اور کیونکہ بیت المقدس مکے سے بہ جانب شمال واقع ہے۔اس مقام پر قیام کرنے سے کعبہ اور بیت المقدس دونوں سامنے آجاتے اور اس طرح حضور ﷺ بیک وقت دونوں قبلوں کی طرف منہ کر لیا کرتے تھے۔لیکن یہ خیال محل نظر ہے کیونکہ وہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ حضور ﷺ ہر نماز مقام ابراہیم پر کھڑے ہو کر ادا کرتے ،لیکن اگر کعبے سے شمال،مشرق یا مغرب کی سمت میں ہوتے تو پھر یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔اس میں مصنف سیرت طیبہ کو بھی سہو ہوا ہے کیونکہ مقام ابراہیم خانہ کعبہ کے مشرق میں ہے،اس صورت میں آپ ﷺ جنوب کی طرف قیام فرمائیں تو دونوں کعبے سامنے آجاتے ہیں۔

۳۔اسی طرح مولانا شبلی کا یہ خیال بھی درست نہیں معلوم ہوتا کہ حضور ﷺ کعبے کو بعد از بعثت ہی قبلہ قرار دینا چاہتے تھے،لیکن چونکہ کفار مکہ کا قبلہ بھی کعبہ ہی تھا اور امتیاز کی گنجائش نہیں نکل سکتی تھی اس لیے اس خیال سے دست بردار ہو گئے۔دراصل حضور اکرم ﷺ قبل از نبوت ہی اپنے رجحان طبع کی بنا پر یہود و نصاریٰ سے زیادہ مانوس تھے کیونکہ بت پرستوں میں جو اخلاقی برائیاں پائی جاتی تھیں،حضور ﷺ ان سے سخت متنفر تھے اور آپ ﷺ کا خیال تھا کہ دختر کشی،شراب نوشی اور قمار بازی وغیرہ کا اصلی سرچشمہ صنم پرستی اور خدا نا شناسی ہی تھی اور یہی وجہ ہے کہ قبل از بعثت حضور ﷺ نے کافی عرصہ یا تو تنہائی میں بسر کیا اور یا عبادت الٰہی میں۔۔۔۔اگر حضور ﷺ آغاز کار ہی سے کعبۃ اللہ الحرام کو قبلہ قرار دے دیتے تو اسلام اور اہل کتاب میں کس چیز کو قدر مشترک قرار دیتے،اس اقدام سے اہل کتاب بلک جاتے،اور حضور اکرم ﷺ کی سکیم پروان نہ چڑھ سکتی کیونکہ وہ ایک ایسے نبی ﷺ سے اشتراک عمل پر کیسے آمادہ ہوتے جس نے پہلے دن ہی سے اپنا راستہ علیحدہ کر لیا تھا اگرچہ اہل کتاب نے حضور اکرم ﷺ کی مکی زندگی کے دوران میں خلاف توقع،اسلام کی کوئی امداد نہیں کی،لیکن اشتراک قبلہ سے اتنا فائدہ ضرور ہوا،

کہ اگروہ کفار قریش کے منہ نہیں آئے ،تو حضور اکرم ﷺ کا مدمقابل بننے سے بھی گریز کیا۔

اعتراض نمبر ۲۶۹

حضورؐ کے لیے یہ قطعاً زیبا نہ تھا کہ نبوت کے دعویٰ کے باوجود وہ کعب بن اشرف کو ناگہانی قتل کروادیتے ہیں ان کو تو چاہیے تھا کہ اگر واقعی کوئی غلطی کی تھی عفو درگزر سے کام لیتے ہوئے اس کو معاف کردیتے اور حضرت عیسیٰؑ کے اسوہ پر کاربند رہتے اور ان کے ارشاد پر عمل پیرا ہوتے۔" من ضربك علیٰ خدك الایمن فادر له الایسفر" (ضیاء النبی جلد سوم۔ ۴۴۸) ترجمہ:''جو تیرے دائیں رخسار پر طمانچہ مارے تم اپنا بایاں رخسار اس کے سامنے کردو'۔

جواب: کعب بن اشرف ایک فتنہ فساد پھیلانے والا شخص تھا۔ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی دشمنی میں بہت آگے تھا۔ یہ بدبخت حضورؐ کی ہجو کیا کرتا تھا اور اپنے غلیظ اشعار سے قریش مکہ کو حضورؐ کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے آگ بھڑکائے رکھتا تھا۔ بدر کی جنگ میں ۷۰ کافر کام آئے ان میں بڑے بڑے سردار موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ یہ سن کر وہ بولا! اگر سردار واقعی مارے گئے ہیں تو زمین کی پشت پر زندہ رہنے سے بہتر ہے کہ ہمیں زمین کے شکم میں داخل کردیا جائے۔

کعب اگر شریف اور امن خواہ شہری ہوتا تو جو اس نے معاہدہ کیا تھا اسے نہ توڑتا اور دیانت داری سے اس پر عمل پیرا رہتا۔ یہی نہیں پھر مسلمانوں کے خلاف ان کے دشمن قریش مکہ کے ہاں جا کر آگ نہ بھڑکاتا اور انھیں اپنے مقتولوں کا بدلہ لینے کے لیے مدینہ پر لشکرکشی کی راہ نہ سجھاتا اور انھیں اپنے تعاون کی پیش کش نہ کرتا۔ ایک طرف معاہدہ شکنی کرتا ہے اور دوسری طرف حکومت وقت کے مخالف قوتوں کو ان پر حملہ کرنے کی دعوت دیتا ہے گویا یہ ریاست سے بغاوت ہے اور حکومتی رٹ کو چیلنج کرنا ہے۔ ایسے میں ریاست کی نمائندہ حکومت اس کا سدباب نہ کرتی تو یہ فتنہ کم ہونے کے بجائے بڑھتا اور نہ جانے کس کس کو اپنی لپیٹ میں لیتا' نیز ہر طرف بدامنی و خلفشار پھیل جاتا۔ لہٰذا عوام کو امن وامان، ان کی جان و مال اور عزت کی حفاظت کرنا حکومت کی اولین ترجیح ہوتی ہے۔ یہی نہیں کہ وہ آپؐ اور آپ کے صحابہ کی ہجو کر کے دل آزاری اور دکھ دیتا بل کہ پاکیزہ و پارسا اور عصمت سے بھرپور خواتین خانہ کی طرف عشق بازی کی جھوٹ موٹ کی تہمتیں لگاتا رہتا ہے۔ ایسی صورت میں اس شخص کو ٹھکانے لگانا عین عدل وانصاف ہے۔ اس کو ڈھیل دے کر فتنہ وفساد کے مزید مواقع فراہم کرنا بڑی غلطی ہے۔ کیوں کہ " الفتنة اشد من القتل"(فتنہ قتل سے بھی سخت ہے)

حضرت موسیٰؑ اللہ تعالیٰ کے اولوالعزم رسولوں میں سے ہیں۔ ان پر تورات نازل ہوئی۔ انھوں نے اہل باطل سے جہاد کیا اور اس جلیل القدر کتاب میں دشمنان خدا کے خلاف جہاد کا حکم نہیں ہے۔ اگر دشمنان حق، معاشرہ کے ناسور اور فتنہ پروروں کو موت کے گھاٹ اتارنا جائز نہ ہوتا تو حضرت موسیٰؑ کبھی جہاد

نہ کرتے نیز جہاد شان رسالت کے منافی نہیں لہذا کعب بن اشرف جیسے بدطینت اور فسادی کو قتل کرنا، حضور ﷺ کی شان رحمۃ اللعالمینی کے منافی نہیں ہوسکتا بلکہ یہ تو رحمۃ للعالمینی کی شان ہے کہ اس بد بخت کو موت کے گھاٹ اتارا گیا ورنہ اگر وہ زندہ رہتا تو مزید فتنہ پھیلانے کا باعث بنتا اور انسانیت کی تباہی کرنے یا کروانے سے ایک لمحہ بھی نہ چوکتا اچھا ہوا کہ وہ اس جہاں سے چل بسا اور اپنے لیے مزید آگ کا ایندھن اکٹھا نہ کیا۔ کعب بن اشرف کے قتل کے بعد دوسرے شر پسند یہودی ابورافع بن ابوالحقیق کو ہلاک کر ڈالا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب یہودیوں نے سارے معاہدے توڑ ڈالے تو آنحضرتؐ نے حکم فرمایا "مَن ظَفَر ثُمّ بِهٖ رِجَالِ یَهُودِ فَاقتُلُوهُ" (جب کوئی یہودی تمھارے قابو میں آئے تو اسے زندہ نہ چھوڑنا)

غداری کی سزا: غداری کے جرم کی سزا رومی قانون سے لے کر برطانوی قانون تک ہر دور میں موت رہی ہے۔ برطانیہ کے مرڈر ایکٹ (Murder Act) ۱۹۶۵ کے تحت موت کی سزا منسوخ کر دی گئی لیکن غداری کے جرم پر سزائے موت میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی

ہے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں مختلف ادوار میں غداری کی جو تعریفیں بیان کی گئی ہیں ان کی رو سے درج ذیل افعال غداری متصور ہوتے ہیں۔

۱: کسی قوم یا حکمران سے ایسے فعل کے ذریعے دغا کرنا جو اس کی سلامتی کے لیے خطرناک ہو۔

۲: کسی آئینی حکومت کے خلاف بغاوت کی تنظیم کرنا یا ترغیب دینا۔ اپنے فعل، تحریر و تقریر کے ذریعے لوگوں کو مشتعل کرنا۔

۳: نویں صدی کے قانون کی رو سے ہر وہ فرد سزائے موت کا مستحق ہے جو سربراہ کی جان کے خلاف کسی کاروائی میں ملوث ہو۔

۴: غداری کی صحیح تعریف ۱۴ ویں صدی سے پہلے متعین نہ تھی اس لیے اس کا انحصار بادشاہ اور اس کے منصفین کے فیصلہ پر تھا۔

صلح حدیبیہ

ذوالقعدہ سن ۶ ہجری میں آنحضرت ﷺ ۱۴۰۰ صحابہ کرام کے ساتھ عمرے کی نیت سے مکہ کو روانہ ہوئے۔ آپؐ نے اس خیال سے کہ قریش مسلمانوں کو عمرہ کرنے سے روک نہ دیں، ایک شخص کو مکہ بھیجا تا کہ وہ حالات کا جائزہ لے۔ پتہ چلا کہ کفار مکہ نے تمام عرب قبائل کو جمع کر کے یہ طے کیا ہے کہ مسلمانوں کو ہرگز مکہ میں داخل نہ ہونے دیں گے۔ کفار قریش نے ایک دستہ فوج لے کر مسلمانوں کا راستا روکنے کے لیے مکہ سے نکل کر مقام "بلاح" میں ڈیرے ڈال دیئے۔ خالد بن ولید اور عکرمہ بن ابو جہل دوسو سواروں کا دستہ لے کر مقام غنیم تک پہنچ گئے۔ آپؐ نے شاہراہ سے ہٹ کر سفر کرنا شروع کر دیا اور

عام راستے سے کٹ کر کے مقام حدیبیہ پر پڑاؤ کیا۔ حدیبیہ کے مقام پر آپ ﷺ کی ناقہ قصویٰ بیٹھ گئی لوگوں نے خیال کیا کہ تھکاوٹ کے سبب بیٹھ گئی ہے لیکن آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا "حسبها حابس الفیل عن مکة" آپؐ نے مناسب سمجھا کہ مصالحت ہو جائے۔ بدیل بن ورتاء آپؐ کا پیغام لے کر کفار قریش کے پاس گیا۔ اس پر عروہ بن مسعود ثقفی نے قریش سے کہا کہ آپؐ نے نہایت بھلائی کی بات کی ہے۔ لہٰذا اجازت دو تاکہ میں ان سے معاملات طے کروں۔ قریش نے یہ بات مان لی۔

معاہدہ کی کاروائی

آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ لکھو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، اس پر قریش کا نامزد سفیر سہیل بن عمرو سیخ پا ہو گیا اور کہنے لگا کہ ہم رحمٰن کو نہیں جانتے، وہ لکھو جو ہم لکھا کرتے ہیں یعنی باسمک اللھم، مسلمانوں کو یہ بات سخت ناگوار گزری، انہوں نے کہا بے شک اللہ تعالیٰ رحمٰن ہے اور ہم یہی لکھیں گے، اس نے کہا اگر تم اس بات پر غصے ہو تو ہم اس بات چیت کو یہی ختم کرتے ہیں۔ حضور ﷺ نے حکم دیا کہ لکھ: باسمک اللھم۔ حضرت علیؓ نے فرمان رسالت کے مطابق لکھا باسمک اللھم۔ آپ ﷺ نے فرمایا لکھو! محمد رسول اللہ ﷺ نے صلح کی، یہ وہ معاہدہ ہے، رسول اللہ ﷺ کا لفظ سن کر سفیر پھر تڑپ اٹھا اور کہا، جھگڑا تو یہی ہے، اگر ہم آپ کو رسول اللہ ﷺ مانتے تو آپ ﷺ کی مخالفت کیوں کرتے؟ تم لکھو! کہ محمد بن عبداللہ! مسلمان، سہیل کی پہلی تجویز پر غضب ناک تھے اب اس بات نے جلتی آگ پر تیل چھڑک دیا اور مسلمان سراپا احتجاج ہو گئے، سب نے کہا، محمد رسول اللہ ﷺ ہی لکھا جائے۔ فریقین کی تلخ کلامی اور سخت جملوں کا تبادلہ ہو رہا تھا آوازیں آسمان کو چھو رہی تھیں، حضور ﷺ فریقین کو خاموش ہونے کی ترغیب دے رہے تھے اور دست مبارک سے خاموش ہونے کا اشارہ کر رہے تھے۔ سہیل کا ایک ساتھی حویطب اس منظر پر تصویر حیرت بنا ہوا تھا اور اپنے تیسرے ساتھی سے کہہ رہا تھا: میں نے کسی قوم کو اپنے دین کے بارے میں اس شدت سے احتیاط کرے والا نہیں پایا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا: اے علیؓ! میں محمد بن عبداللہ ہوں، تم یہی لفظ لکھو۔

مسلمانوں پر صلح حدیبیہ کی شرائط سخت ناگوار گزریں حتیٰ کہ حضرت عمرؓ اپنے جذبات کی رو میں بہہ گئے اور اپنے جذبات کو قابو میں نہ رکھ سکے جب سہیل کے ساتھ شرائط طے ہو گئیں اور معاہدہ تحریر کر دیا اس وقت حضرت عمرؓ آپ ﷺ کے پاس آئے اور کہنے لگے۔ یا رسول اللہ ﷺ، کیا آپ اللہ کے رسول نہیں ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: بے شک میں اللہ کا سچا نبی اور رسول ہوں۔ حضرت عمرؓ نے کہا، کیا ہمارے مقتول جنت میں نہیں اور کیا ان کے مقتول دوزخ میں نہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا بے شک ایسا ہی ہے۔ پھر عمرؓ بولے کہ ہم دین کے معاملہ میں یہ ذلت کیوں گوارہ کریں اور عمرہ کیے بغیر لوٹ جائیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے بھی ہمارے درمیان اور ان کے درمیان فیصلہ نہیں کیا؟ آپ ﷺ نے فرمایا بے

شک میں اللہ کا رسول اور اس کا بندہ ہوں میں اس کی نافرمانی نہیں کرتا، وہ مجھے ہرگز ضائع نہیں کرے گا اور وہ میرا مددگار ہے۔ عمرؓ بولے کیا آپ ﷺ نے نہیں فرمایا تھا کہ ہم بیت اللہ کی زیارت کریں گے اور اس کا طواف کریں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کیوں نہیں ایسا ہی کہا تھا مگر میں نے تمہیں یہ نہیں کہا تھا کہ تم اس بار خانہ کعبہ کا طواف کرو گے تو آپ ﷺ نے فرمایا: یقیناً کعبہ شریف کے پاس جانے والے ہو اور اس کا طواف کرنے والے ہو۔

یہ کلمات جو حضرت عمرؓ کی زبان سے نکلے، وہ کہتے ہیں کہ ان کی تلافی کے لیے صدقے کرتا رہا، روزے رکھتا رہا، نوافل پڑھتا رہا اور غلام آزاد کرتا رہا تا کہ جو لغزش مجھ سے اس دن سرزد ہوئی تھی وہ معاف کر دی جائے۔ یہ سلسلہ میں نے جاری رکھا یہاں تک کہ مجھے اللہ تعالیٰ سے رحمت و بھلائی کی قوی امید ہو گئی۔

معاہدہ کی شرائط

۱: فریقین کے درمیان دس سال تک لڑائی موقوف رہے گی۔

۲: مسلمان اس سال بغیر عمرہ ادا کیے واپس چلے جائیں۔

۳: آئندہ سال عمرہ کے لیے آئیں اور صرف تین دن مکہ میں ٹھہر کر لوٹ جائیں۔

۴: تلوار کے سوا کوئی دوسرا ہتھیار لے کر نہ آئیں۔ تلوار بھی نیام کے اندر رکھ کر، تھیلے وغیرہ میں بند ہو۔

۵: مکہ میں جو مسلمان پہلے سے مقیم ہیں ان میں سے کسی کو اپنے ساتھ نہ لے جائیں اور مسلمانوں میں سے اگر کوئی مکہ میں رہنا چاہے تو اس کو نہ روکیں۔

۶: کافروں یا مسلمانوں میں سے کوئی شخص اگر مدینہ چلا جائے تو واپس کر دیا جائے لیکن اگر کوئی مسلمان مدینہ سے مکہ میں چلا جائے تو وہ واپس نہیں کیا جائے گا۔

۷: قبائل عرب کو اختیار ہو گا کہ وہ فریقین میں سے جس کے ساتھ چاہیں دوستی کا معاہدہ کر لیں۔

۸: بدعہدی اور خیانت نہ کی جائے گی۔

اعتراض نمبر ۲۷۰

اس واقعہ سے بعض یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ آپ لکھنا پڑھنا جانتے تھے کیوں کہ آپ ؐ نے رسول اللہ ﷺ کا لفظ مٹا کر محمد بن عبداللہ لکھ دیا۔

جواب: زبان کے آگے خندق نہیں لیکن کوئی جتنا شور برپا کرے، حقائق کو بدلا نہیں جا سکتا۔ اولاً تو آپ ؐ کا یہ معجزہ ہے کہ لکھنا پڑھنا نہ جاننے کے باوجود یہ الفاظ تحریر فرمائے۔ دوسرا یہ کہ بے شبہ اُمی ہونا

آپ ﷺ کا شرف وفخر ہے اور خود قرآن میں یہ وصف عزت وشرف کے موقع پر استعمال ہوا ہے۔ ''اَلَّذِینَ یَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِیَّ الاُمِّیَّ'' (الاعراف۔۱۵۷) تیسرا مولانا شبلی فرماتے ہیں، حقیقت یہ کہ لکھنے پڑھنے کا کام روزمرہ جب نظر سے گزرتا ہے تو ناخواندہ شخص بھی اپنے نام سے آشنا ہو جاتا ہے۔ اس سے امیت میں فرق نہیں آتا۔ واقعی آج کل ایسے اشخاص دیکھنے میں آتے ہیں جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے لیکن اپنا نام لکھ لیتے ہیں۔ اپنے نام سے چیک پر دستخط کر کے بنک سے رقم نکلواتے ہیں۔ شناختی کارڈ فارم پر دستخط کر کے شناختی کارڈ بنواتے ہیں۔ اس قسم کی اور دستاویزات پر بھی اپنا نام ثبت کرتے ہیں۔ یہ کوئی ان ہونی یا اچنبھے کی بات نہیں۔ ابن منظور ''بعثت فی الامیین رسولا منھم'' کی تفسیر میں لکھتے ہیں ''اللہ تعالیٰ نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا اور آپ بھی لکھ پڑھ نہیں سکتے تھے۔ قرآن کی تلاوت کرنا ان کا معجزہ تھا۔ امام ابن جریر طبری'' الذین لایکتبون ولا یقرءون'' یعنی وہ لوگ جو لکھ نہ سکیں اور پڑھ نہ سکیں'' زمخشری بھی ''امی'' کے مفہوم میں لکھتے ہیں کہ امی کی نسبت عربوں کی طرف ہے جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ امام قرطبی کہتے ہیں کہ امی کا لفظ ان پڑھ لوگوں کی طرف منسوب ہے اور امی وہ لوگ ہیں جو اسی حالت پر ہوں جس حالت میں ماؤں نے انھیں جنم دیا۔ امام بیضاوی۔ امام شوقانی، شیخ علی المہائمی، مفتی محمد عبدہ، علامہ مراغی مرحوم، عصر حاضر کے محمود حمزہ، حسن علوان اور احمد برانق، استاد ابوزہرہ اور احادیث کی کتب میں امی کا مفہوم ایسا ہے جیسا اوپر مذکور ہوا۔ سیرت نگار ابن حبان، حزام اندلسی، علامہ سہیلی، ابن خلدون وغیرہ بھی وہی مفہوم لیتے ہیں۔ امام سہیلی نے صاف لکھ دیا کہ آپ نے رسول اللہ کا لفظ اپنے ہاتھ سے مٹا کر محمد بن عبداللہ لکھنے کا حکم دیا۔ (تفصیل دیکھئے۔ن۴۔۲۰۸تا۲۱۳)

جب صلح نامہ لکھا جا رہا تھا تو اس میں یہ لکھا کہ ''اس پر محمد رسول اللہ ﷺ'' نے صلح کی۔ کافروں نے کہا ہم اس پر اقرار نہیں کرتے۔ اگر ہم مانتے کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں تو آپ کو کسی شے سے منع نہ کرتے لیکن آپ محمد بن عبداللہ ہیں۔ آپ نے فرمایا میں اللہ کا رسول اور محمد بن عبداللہ ہوں۔ پھر حضرت علیؓ سے فرمایا ''لفظ رسول اللہ مٹا دو'' انھوں نے کہا بہ خدا! میں آپ کو کبھی بھی نہیں مٹاؤں گا۔ آپؐ نے مکتوب کو پکڑا حالانکہ آپ اچھی طرح نہ لکھتے تھے۔ چناں چہ آپؐ نے لکھا یہ وہ ہے جس پر محمد بن عبداللہ نے صلح کی ہے۔ (بخاری کتاب المغازی باب عمرۃ القضاہ۔۳)

صحیح مسلم میں ہے جب صلح نامہ لکھا جانا شروع ہوا (حضرت علیؓ کاتب تھے) انھوں نے یہ لکھا یہ صلح نامہ ہے جس پر اللہ کے رسول محمد ﷺ نے یہ فیصلہ کیا ہے مکہ کے کافروں نے کہا اس کو ہم نہیں مانتے۔ اگر ہم آپ کو اللہ کا رسول سمجھتے ہوتے تو آپ کو روکتے ہی کاہے کو۔ یوں لکھو جس پر محمد عبداللہ کے بیٹے نے فیصلہ کیا۔ آپ نے یہ سن کر فرمایا میں اللہ کا رسول ہوں اور محمد بن عبداللہ ہوں۔ آپ نے حضرت علیؓ سے

فرمایا رسول کا لفظ مٹا دیں۔ انھوں نے کہا خدا کی قسم کبھی بھی اس کو نہیں مٹاؤں گا۔ آخر آپ نے ان سے کاغذ لے لیا۔ آپ اچھی طرح لکھنا نہیں
جانتے تھے لیکن آپ نے (معجزے کے طور پر) یوں لکھ دیا یہ وہ صلح نامہ ہے جس پر محمد بن عبداللہ نے فیصلہ کیا ہے۔ (صحیح مسلم۔ ج ۲ کتاب الجہاد باب عمرہ قضتاص۔ ۶۷۲)

اَلَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِندَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ۔ (الاعراف۔ ۱۵۷)

ترجمہ: ''یعنی وہ لوگ جو حضرت محمد ﷺ کو جو امی نبی ہیں، پیروی کرتے ہیں جن کے اوصاف کو وہ اپنے ہاں تورات و انجیل میں لکھا پاتے ہیں''۔ علامہ زرقانی شرح مواہب لدنیہ میں لکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ امی تھے۔ آپ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت علیؓ کے بتانے پر آپ ﷺ نے ''رسول اللہ'' کے الفاظ مٹا کر ابن عبداللہ لکھنے کا حکم دیا چناں چہ حضرت علیؓ نے عبارت یوں بنا لی محمد بن عبداللہ۔ پھر ایک دلچسپ واقعہ لکھتے ہیں کہ امام بخاریؒ کی ایک روایت کے ظاہر الفاظ کی بناء پر اندلس کے ایک عالم ابوالولید باجی (۴۰۳۔۴۷۴ھ) نے اس بات کا اظہار کیا کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے ہاتھ سے ابن عبداللہ تحریر فرمایا تھا، بس اتنا کہنا تھا کہ اندلس میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور علمائے اندلس نے اس پر زندیق کا فتویٰ لگایا اس کے اس عقیدے کو قرآن کے خلاف قرار دیا، چنانچہ ابوالولید باجی نے اس موضوع پر ایک خط کے ذریعے شام، مصر اور عراق کے علماء سے فتوی پوچھا: اس کے جواب میں جو، اور علماء نے یہ فتویٰ دیا کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے ہاتھ سے قطعاً نہیں لکھا تھا بلکہ بخاری کے الفاظ بطریق مجاز ہیں یعنی لکھنے کا حکم دیا۔ امام ابن حزم نے بھی یہی لکھا کہ آپ ﷺ نے ''محمد رسول اللہ ﷺ'' اپنے ہاتھ سے مٹا دیا اور کاتب کو حکم دیا کہ وہ محمد بن عبداللہ لکھیں اسی پر سیرت نگاروں اور مورخین کا اتفاق ہے۔

اعتراض نمبر ۱۷۲

''واٹ'' (ضیاء النبی ۴۱۲۔۴۱۳) ''کہتا ہے کہ حضور (ﷺ) نے کفار مکہ کے ساتھ کیے جانے والے حدیبیہ معاہدے کو بھی توڑا تھا اور یہودیوں سے آپؐ نے جو معاہدے کیے تھے ان کو توڑنے کے بھی آپ ذمہ دار ہیں۔ نعوذ باللہ

جواب: کفار نے معاہدہ حدیبیہ کو توڑا جس کی وجہ یہ تھی کہ بنوخزاعہ مسلمانوں کا حلیف تھا۔ بنوبکر نے شب خون مارا اور حدود حرم میں ان کا قتل عام کیا اور قریش کا حلیف ہونے کا اعلان کیا۔ صلح نامہ حدیبیہ دس سال کے لیے تھا اسے توڑ دیا اور معاہدہ شکنی کا الزام مسلمانوں کے سر تھوپ دیا۔ حال آنکہ یہ معاہدہ اہل مکہ نے توڑا تھا۔ بنوخزاعہ نے مدینہ پہنچ کر تمام صورت حال آنحضرتؐ سے بیان کر دی۔ اب

صورت حال یہ رہ گئی تھی کہ ا: مقتولین کا خون بہا ادا کیا جاتا بہ شرطیکہ قریش کا غرور اس کی اجازت دیتا اور بنوخزاعہ بھی قبول کرتے۔

۲: قریش بنوبکر کی حمایت سے کنارہ کش ہو جائیں تاکہ بنوبکر سے بدلہ لیا جاسکے۔

۳: پہلی دو شرطیں قریش کو منظور نہ تھیں اور تیسری یعنی جنگ کی قریش میں طاقت نہ تھی۔ صرف وہ یہ کر سکتے تھے کہ مسلمانوں سے تجدید معاہدہ کیا جائے۔ ابوسفیان تجدید معاہدہ کے لیے مدینہ جاتا ہے اس کا جانا اس امر کا ثبوت ہے کہ قریش نے جارحیت کی ہے اور انھوں نے معاہدہ شکنی کی ہے۔ تو معاہدہ شکنی کا الزام مسلمانوں پر لگانا غیر اخلاقی اور ناانصافی ہے۔

کفار جو چاہے کرتے رہیں وہ آزاد ہیں اور ان پر کسی قسم کی قانونی، اخلاقی پابندی لاگو نہیں ہوتی اور نہ ہی کوئی اعتراض وہ اپنے سر ڈالتے ہیں۔ ان کا اپنا قصور بھی مسلمانوں کے کھاتے ڈالا جاتا ہے۔ واٹ نے بھی یہی طرز اپنائی ہے حال آنکہ وہ بہ خوبی جانتا ہے کہ معاہدہ حدیبیہ کفار نے توڑا تھا۔ اگر معاہدہ نہ توڑتے تو اس کی تجدید کے لیے ابوسفیان مدینہ کیوں جاتا؟ ابوسفیان مایوس لوٹا اور تجدید معاہدہ نہ ہوسکی۔ کفار کی یہی معاہدہ شکنی فتح مکہ کا باعث بنی۔

جہاں تک یہودیوں کے ساتھ معاہدات کا تعلق ہے۔ یہودیوں نے بار بار عہد شکنی کی۔ کفار نے مدینے والوں پر جتنے حملے کیے ان میں یہودیوں کا کسی نہ کسی طرح حصہ تھا۔ یہودی مسلمانوں کے مخالف گروہوں کے ساتھ ساز باز کرتے رہتے تھے۔ مسلمانوں کو ٹھکانے لگانے کی ہر ممکن کوشش بھی کی لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ان کی تدبیر پر تقدیر خنداں کناں تھی (تدبیر کند بندہ تقدیر زند خندہ)۔ اگر واٹ کو نظر نہ آئے تو یہ جانب داری ہے اور تاریخی حقائق کے ساتھ اس سے بڑا مذاق کیا ہوسکتا ہے؟ معاہدہ کی تما دفعات بقول مخالفین مسلمانوں کے حق میں نہ تھیں لیکن چار و ناچار، کفار سے ڈر کر معاہدہ کیا کمزور بے بس لوگ معاہدہ شکنی نہیں کرتے، طاقت ور ہی ایسے عہد و پیمان سے منحرف ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ کفار نے مسلمانوں کے ساتھ کئے گئے معاہدے کو توڑ دیا۔

اعتراض نمبر ۲۷

بعض کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے یہ معاہدہ قریش سے دب کر کیا تھا، کیوں کہ صلح حدیبیہ کی شرائط ان کے حق میں نہ تھیں۔ (مستشرقین کا انداز فکر۔ ۳۱۱)۔ ۲: بنی غطفان اور اہل خیبر نے صلح حدیبیہ کی نرم شرائط سے یہ مطلب اخذ کیا کہ حضورؐ نے قریش کے آگے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔

جواب: صلح حدیبیہ کا پس منظر یہ ہے کہ سید المرسلین ﷺ چودہ سو صحابہ کرامؓ کے ساتھ عمرہ کی ادائیگی کے لیے، قربانی کے جانور لیے روانہ ہوئے۔ حدیبیہ کے مقام پر ٹھہرے۔ قریش کو اپنے نمائندوں کے

ذریعے یقین دہانی کرائی کہ ہم بہ غرض جنگ نہیں آئے، عمرہ ادا کرنے آئے ہیں۔ قریش حرمت والے مہینوں میں کسی دشمن کو بھی خانہ کعبہ میں مراسم عبادت ادا کرنے سے روک نہیں سکتے تھے۔ جنگ کرتے تو بدنام ہو جاتے بل کہ عوام الناس میں منفی ردعمل اور پراپیگنڈہ شروع ہوتا نیز اگر وہ عمرہ ادا کرنے دیتے تو ان کے نام نہاد عزت و وقار کو ٹھیس لگتی۔ ان کی ناک کٹ جاتی اور عزت دو کوڑی کی نہ رہتی۔ اس خیال سے انھوں نے مسلمانوں کو ہر ممکن اشتعال دلایا۔ غصہ دلانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تا کہ ماہ حرام کا الزام مسلمانوں کے سر تھوپ سکیں۔ کفار کے ایک دستہ نے حملہ کیا مسلمانوں نے پکڑ لیا۔ کچھ بھی نہیں کہا بل کہ سید المرسلین ﷺ نے انھیں رہا کر دیا۔ خالد بن ولید کی قیادت میں ایک اور دستہ مسلمانوں پر حملہ کرنے آیا تھا مگر آپ ﷺ نے راستا بدل لیا قریش معاہدہ کو سبوتاژ کرنے کے خواہش مند تھے۔ اب کفار کے پاس سوائے معاہدہ کرنے کے اور کچھ نہ بچا تھا۔ کفار نے معاہدہ کے وقت بھی حالات کو بگاڑنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ مثلاً بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھنے کی بہ جائے باسمک اللّٰھم کے الفاظ لکھوائے۔ محمد رسول اللہ کی بہ جائے محمد بن عبداللہ لکھوایا۔ مسلمانوں کو اس معاہدہ میں اپنی بے بسی، سبکی اور کم زوری محسوس ہوئی لیکن چشم نبوت بہ ظاہر پسپائی کے بڑی کامیابی دیکھ رہی تھی جب کہ کفار کو اتنا فائدہ رہا کہ تجارت کرنے میں کوئی خطرہ باقی نہ رہا نیز مسلمانوں کو عمرہ کیے بغیر واپسی سے ان کی جھوٹی انا اور عزت خاک میں ملنے سے بہ ظاہر بچ گئی اور ان کے تعصب و نفرت کو تسکین ملی اور یہی وجہ ہے کہ بنی غطفان اور اہل خیبر نے صلح حدیبیہ کی شرائط سے یہ مطلب اخذ کیا کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے قریش کے آگے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ ان کی یہ بھول ہے جب کہ مستقبل کے واقعات و حالات اس کے برعکس مسلمانوں کی کامیابی کے گواہ ہیں۔

اول: ایک صحابی کو شہید کیا اور چلتے بنے۔ یہ غزوہ ذی قرد کے نام سے مشہور ہے۔ غزوہ ذی قرد میں آپ ﷺ چودہ سو صحابہؓ کے ہمراہ رجیع جا پہنچے۔ بنو غطفان و خیبر کے رابطہ کو کاٹ دیا۔ غطفان یہ سمجھے کہ مسلمانوں کی کاروائی ہماری طرف ہے اس طرح اہل خیبر، قریش اور غطفان سمیت سب حلیفوں سے کٹ کر رہ گئے۔ ڈیڑھ دو ماہ میں خیبر کے سارے قلعے فتح ہو گئے۔

دوم: صلح کے بعد صرف دو سال میں اتنے آدمی مسلمان ہوئے جتنے ۱۹ سال میں دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ فتح مکہ کے موقع پر بھی آپ ؐ کا لشکر دس ہزار صحابہ پر مشتمل تھا۔ گھروں میں موجود مسلمان ملا کر بہت تعداد بن جاتی ہے۔

سوم: چند مسلمان جو معاہدہ کو اپنی کم زوری اور کفار کی جیت سمجھتے تھے اپنی اس کمی کا اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت جابر بن عبداللہؓ اور حضرت براء بن عازبؓ نے یوں اعتراف کیا "لوگ فتح مکہ کو فتح سمجھتے ہیں حال آنکہ ہم اصل فتح حدیبیہ کو سمجھتے ہیں۔ قرآن کریم نے اسے

فتح مبین کہا اور یہ سورت نازل ہوئی ''اِنَّـآ فَتَحنَا لَكَ فَتحاً مُبِيناً''۔(بے شک ہم نے آپ کو فتح مبین عطا کی) حضرت عمرؓ جن کے دل میں یہ خلش تھی کہ یہ معاہدہ دب کر کیا گیا ہے اس لیے انھوں نے عرض کی یارسول اللہ! کیا یہ فتح ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ ''ہاں یہ فتح ہے''۔

چہارم: دس سالہ جنگ بندی کے معاہدہ سے اسلام کو پھلنے پھولنے کا موقعہ ہاتھ لگا۔ اس دوران آپؐ نے اندرون و بیرون عرب میں تبلیغی خطوط اپنے سفیروں کے ذریعہ بھیجے۔ حاکم مصر، شاہ عمان، والی بحرین، امیر شام، یمامہ کے حاکم، بادشاہ ایران اور ہرقل روم کو دعوتی خطوط روانہ کیے۔ بعض نے اسلام کی طرف نرمی دکھائی اور بعض نے معاندانہ رویہ اپنایا۔ یہ بات طے شدہ ہے کہ عرب میں اسلام کے نفاذ کو عالمی طاقتیں برداشت نہیں کریں گی اور یہ بھی ظاہر تھا کہ مسلمانوں کی یہ تحریک صرف عرب تک محدود نہیں رہی بل کہ بین الاقوامی تحریک بن گئی ہے۔ ان تبلیغی خطوط سے بیرون ملک غزوات و سرایا میں مسلمانوں کے لیے بالخصوص اور دوسروں کے لیے بالعموم یہ ہدایت موجود تھی کہ اسلام کوئی علاقائی یا قومی مذہب نہیں بل کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخری عالمی پیغام ہے۔

پنجم: اگر دب کر معاہدہ کیا گیا تھا تو عورتوں کو بھی کفار کے حوالے کر دیتے کیونکہ چند عورتیں مکہ سے مدینہ آئی تھیں لیکن آپ ﷺ نے انہیں اہل مکہ کے سپرد نہ کیا اور نہ ہی انہیں کفار مکہ کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا۔ ایسا نہیں ہوا لہٰذا ان کا الزام باطل ہے۔ مکہ سے فرار ہو کر مسلمان عیص کے مقام پر جمع ہوتے رہے کیوں کہ مدینہ جاتے تو انھیں کفار کے حوالے کر دیا جاتا۔ ان کے اکٹھ سے قریش کی تجارت کو خطرہ لاحق ہوا بل کہ اجتماع نے بے بس کر دیا اور مدینہ والوں سے کہا کہ انھیں اپنے پاس بلائیں ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ قریش نے اس شق کو منسوخ کرنے کی درخواست کی۔ وہ معاہدہ جسے مخالفین مسلمانوں کی کمزوری کا نام دیتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ معاہدہ دب کر کیا لیکن مستقبل میں خود قریش نے اس معاہدہ کی شق ''اگر مسلمانوں یا کافروں میں سے کوئی فرد مکہ آئے تو اسے واپس نہیں کیا جائے گا مگر مدینہ آئے تو واپس کیا جائے گا'' کو منسوخ کرنے کی بارگاہ نبوی میں درخواست پیش کی۔ اندھا کیا جانے بسنت کی بہار، واقعی کفار معاہدہ میں چھپی حکمتوں سے بے خبر تھے۔

معاہدے کی ایک شق یہ ہے کہ ''مسلمان اس سال واپس چلے جائیں'' قریش اس کشمکش میں مبتلا تھے کہ اگر مسلمانوں نے مکہ میں داخلے کا عزم کیا تو انہیں جان پر کھیل جانے کے بغیر اور کوئی چارہ کار نہیں رہے گا۔ دوسری بات یہ کہ بدر، احد اور خندق کے غزوات میں اپنی بھاری اکثریت کے باوجود منہ کی کھائی اور مسلمانوں کو اپنے موقف سے ہٹا نہ سکے تھے۔ اب مسلمان ان کے گھروں کے دروازوں پر پہنچ آئے ہیں اگر یہ کامیاب ہو جاتے ہیں تو پورے عرب میں وہ منہ دکھانے قابل نہیں رہیں گے لہٰذا اس توہین اور

بے عزتی اور نام کو بٹہ لگنے سے بچنے کے لیے یہی ترکیب سوجھی کہ صلح کے پہلو کو اختیار کیا جائے، چنانچہ اپنے آدمیوں کو بطور سفیر' بارگاہ نبوی ﷺ میں بھیجا اس کے مقابلے میں بارگاہ نبوت نے صلح و آشتی کی راہ اپنائی اور یہ فرمایا'' کہ ہم کسی سے لڑنے نہیں آئے بلکہ ہمارا مقصد صرف عمرہ کرنا ہے قریش کو جنگوں نے نہایت کمزور کر دیا ہے اور انہیں تھکا کر رکھ دیا ہے لہذا وہ اگر چاہیں تو ان کے لیے مدت صلح مقید کر دوں کہ اس مدت میں کوئی ایک دوسرے سے تعرض نہ کرے اور مجھ کو اور عرب کو چھوڑ دیں، اگر اللہ کے فضل سے میں غالب ہو گیا تو وہ چاہیں تو اس دین میں شامل ہو جائیں اور فی الحال وہ آرام کر لیں اور اگر بالفرض عرب غالب آ گئے تو تمہاری تمنا پوری ہو جائے گی، لیکن میں تم سے کہہ دیتا ہوں اللہ تعالیٰ ضرور اپنے اس دین کو غالب کر کے رہے گا اور اس دین کے غلبہ اور نصرت کا جو وعدہ اس نے کیا ہے وہ ضرور پورا ہو کر رہے گا اور اگر انہیں لڑائی کے سوا کچھ منظور نہیں تو قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، میں ضرور ان سے جنگ کروں گا یہاں تک کہ میری گردن الگ ہو جائے یا جب تک اللہ تعالیٰ اپنا امر نافذ نہ کر دے۔ ارشاد ربانی ہے'' اے رسول جو کچھ بھی تمہاری طرف آپ کے رب کی طرف نازل ہوا ہے اس کو لوگوں تک پہنچا دو اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے اپنا حق رسالت ادا نہیں کیا اور اللہ تعالیٰ آپ کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا''۔

۲۔ آپ نے ہر قیمت پر جنگ و جدل سے کنارہ کشی اختیار فرمائی اور پر امن ماحول میں اپنے مشن کو جاری رکھنے کی حکمت عملی اپنائی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صلح حدیبیہ کے بعد دو سال کے اندر مسلمانوں کی تعداد میں کثیر اضافہ ہوا، ایک اندازہ کے مطابق چار گناہ سے بھی زیادہ اضافہ ہوا۔ اسلام کو اس قدر طاقت ملی کہ قریش نے لڑے بغیر ہتھیار ڈال دیئے آپ نے ان شرائط'' اس سال واپس چلے جائیں اور اگلے سال عمرکی ادائیگی کے لیے آئیں، سوا تلوار کے اور آلات حرب نہ ہوں اور تلوار بھی نیام میں اور نیام جلبان میں، مان کر کفار کو پیغام دیا کہ وہ اس سال بھی عمرہ کی نیت سے آئے۔ مخالفین ان شرائط کے بارے کہتے ہیں کہ کفار سے دب کر قبول کیں جبکہ ان کے دور رس نتائج برآمد ہوئے۔ ایک تو مسلمانوں کو دین اسلام کی اشاعت اور دوسروں تک پہنچانے کا موقع ملا دوسرا مدینہ کے اطراف و اکناف کے قبائل اور بادشاہوں کو خطوط لکھے اور دین اسلام کی حقانیت کا اظہار کیا نیز اس معاہدہ کی وجہ سے فریقین میں آمد و رفت کا سلسلہ چل نکلا کفار مکہ تجارتی اور خاندانی تعلق کے سبب مدینہ آتے اور کئی کئی دنوں تک قیام کرتے مسلمانوں سے میل جول رکھتے ان کے اخلاق، اخلاص اور اعلیٰ درجہ کی خوبیوں سے متاثر ہوئے اور اسلام کی طرف کھچے چلے آئے۔

۳۔ یہ شق کہ'' قریش کا جو آدمی مسلمانوں کے ہاں آ جائے مسلمان اسے واپس کریں گے، لیکن مسلمانوں میں سے جو شخص پناہ کی غرض سے بھاگ کر قریش کے پاس آئے گا قریش اسے واپس نہیں کریں

گے۔ بظاہر مسلمانوں کے لیے یہ تکلیف دہ تھی مگر مستقبل میں یہ نعمت ثابت ہوئی اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی مسلمان مدینہ میں رہتے ہوئے راہ فرار اختیار نہیں کر سکتا تھا، اس لیے کہ مدینہ مرکز ایمان ہے اور ایماندار ہوتے ہوئے کوئی بھی شخص مرکز ایمان سے دور نہیں رہ سکتا اگر بھاگے گا تو صرف مرتد ہو کر۔ فرمان رسول ہے ''بے شک جو ہیں چھوڑ مشرکین کی طرف بھاگا، اللہ نے اسے دور کر دیا یعنی تباہ و برباد کر دیا۔'' (مسلم شریف جلد۲۔ص ۱۰۵) ابوجندل بھاگ کر معاہدہ کی جگہ پر پہنچا تو قریش نے اسے واپس کرنے کا مطالبہ کیا آپ نے ابوجندل کو قریش کے حوالے کر دیا انہوں نے مسلمانوں کے کیمپ میں مشکیں باندھیں، پاؤں میں بیڑیاں ڈالیں اور کشاں کشاں واپس مکہ لے گئے۔ جاتے وقت آپ ﷺ نے فرمایا: ابوجندل! خدا تیری کشائش کے لیے کوئی سبیل نکال دے گا'' ابوجندل نے مکہ پہنچ کر قید خانہ میں ہی تبلیغ شروع کر دی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک سال میں قریباً تین سو شخص مسلمان ہو گئے اب قریش پچھتائے اور بہ دست افسوس ملے کہ انہوں نے عہد نامے میں ان ایمان والوں کو واپس دینے کی شرط درج کرائی؟

خدا خدا کر کے ابوبصیر بھاگ کر مکہ سے مدینہ آیا۔ معاہدہ کی رو سے آپ ﷺ نے مکہ سے آنے والے دو آدمیوں کو ابوبصیر واپس کر دیا، معاہدہ کی پاس داری کی۔ ابوبصیر نے راستے میں ایک کو قتل کر دیا دوسرا شخص بھاگ نکلا، ابوبصیر مدینہ سے نکلا اور ساحل سمندر پر قیام کر لیا۔ اس راستے پر ٹھہرے جس راستے سے قریش کے تجارتی قافلے آتے رہتے تھے۔ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا، مکہ کے لاچار اور غریب لوگوں کو ابوبصیر کی سکونت کا پتہ چلا تو وہ بھی اکا دکا پہنچنے لگے ان کی تعداد ستر اور ایک روایت کے مطابق تین سو تک پہنچ گئی۔ انہوں نے قریشی قافلوں کو لوٹنا شروع کر دیا قریشی قافلوں کا آنا جانا مشکل ہو گیا، ان کی تجارت خطرے میں پڑ گئی تو قریش آپ ﷺ کی خدمت میں آئے اور کہا کہ ہم آپ کو اللہ اور قرابت کا واسطہ دیتے ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ آپ ان لوگوں کو مدینہ بلا لیں، اس کے علاوہ اب جو بھی آپ کے پاس مدینہ آئے گا ہم اس کو ہرگز واپس نہیں لیں گے گویا یہ شق جو بظاہر نہایت کمزور تھی اور آج بھی نام نہاد روشن خیال اس شق کی بنیاد پر خاص طور پر یہ کہتے ہیں کہ یہ معاہدہ دب کر کیا تھا حالانکہ چاند چڑھا کُل عالم دیکھے' واقعی سب نے دیکھا کہ کفار نے اس شق کی منسوخی کے لیے مدینہ آ کر بارگاہ نبوی میں درخواست پیش کی۔ یہی شرطیں مسلمانوں کے لیے فائدہ مند ثابت ہوئیں اور کفار کے لیے گلے کا پھندا۔

دس سال جنگ نہیں کریں گے، اس شک سے مسلمانوں کو اپنی اقدار اور مذہبی روایات پر عمل کرنے کی آزادی نصیب ہوئی مسلمان آزادانہ نماز نہیں پڑھ سکتے تھے، تلاوت قرآن مجید پر سزا ملتی، اسلام اختیار کرنے کا مسلمان پر عرصہ حیات تنگ کر دیا جاتا تھا اب اس معاہدہ سے وہ سزائیں اور تکلفیں ایک مدت معین تک ختم ہو گئیں۔

اعتراض نمبر ۲۷۳

ام کلثوم بنت عقبہ نے ہجرت کی۔ اس کے بھائیوں نے اس کا تعاقب کیا۔ ان کے بھائیوں کو ام کلثوم واپس کرنے سے انکار کر دیا گیا جو کہ معاہدہ کی رو سے درست نہیں۔ (مستشرقین کا انداز فکر۔۳۱۲)

جواب: اس خاتون کے دو بھائی اس کے تعاقب میں مدینہ پہنچے۔ وہ ہجرت کر کے مدینہ چلی آئی تھی۔ کفار کے حوالے نہ کرنے پر انھیں دوٹوک جواب دیا گیا کہ ام کلثوم کو واپس نہیں کریں گے۔ قریش نے اس کو معاہدہ کی خلاف ورزی سمجھا جو محض تعصب یا عربی نافہمی اور کم علمی کا باعث تھا اور معاہدہ کو اچھی طرح نہ سمجھنے کا نتیجہ تھا۔ متن معاہدہ میں صرف مردوں کا ہی ذکر ہے۔ عربی متن حسب ذیل ہے ” وعلی انہ من الی محمد من قریش بغیر اذن ولیہ ردہ علیھم ‘ (ترجمہ: اور یہ کہ جو کوئی (مرد) محمدؐ کے پاس اپنے ولی کی اجازت کے بغیر آئے گا اس (مرد) کو انھیں لوٹایا جائے گا) اس شق کی تمام ضمیریں مذکر کے لیے استعمال ہوئی ہیں اور خواتین پر ان کا اطلاق نہیں ہوتا۔ ان کی شمولیت کے لیے لازمی مونث ضمیریں استعمال ہونی چاہیے تھیں جس سے صراحت ہوتی۔ نیز قریش نے اس پر اصرار نہ کیا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ سمجھتے تھے کہ عورتیں اس معاہدے سے مستثنیٰ ہیں۔

پروفیسر محمد اکرم طاہر (محمد رسول اللہ۔۷۵) فرماتے ہیں کہ اگر یہ بات درست ہے کہ سیاسی مدبر اپنی لچک دار انگلیوں سے ایک پرندہ کی آغوش سے ایک ایک کر کے سارے انڈے یوں نکال لیتا ہے کہ پرندے کو خبر تک نہیں ہوتی تو صلح حدیبیہ اس لحاظ سے ایک بے مثال دستاویز ہے۔ صلح حدیبیہ کے بعد کچھ مسلمان عورتیں مدینہ پہنچ گئیں۔ کفار نے مطالبہ کیا کہ معاہدے کے مطابق انھیں واپس کر دیا جائے۔ حضور ﷺ نے ایسی عورتوں کو یہ کہہ کر واپس کرنے سے انکار کر دیا کہ معاہدے میں ”رجل“ یعنی مرد کا ذکر ہے عورت کا نہیں۔ معاہدے کا متن دیکھا گیا تو اس کے صریح الفاظ کفار کی ذہنی افلاس کی چغلی کھا رہے تھے یعنی: ” وعلی ان لایاتیک منا رجل وان دینك الا رددتہ علینا“ (ترجمہ آپ ﷺ کے پاس جائے گا آپ اسے لازماً واپس کریں گے خواہ وہ آپ ہی کے دین پر ہی کیوں نہ ہو) اسی اثناء میں سورہ الممتحنہ کے ذریعے بھی مومن عورتوں کو دارالکفر میں واپس بھیجنے سے منع کر دیا گیا۔

واٹ اس شق کہ ” مکہ کا کوئی فرد مدینہ جائے تو اسے مکہ والوں کو واپس کرنا ہوگا اور مدینہ والوں کا مکہ آئے تو واپس نہیں کیا جائے گا“ کے متعلق کہتا ہے ” یہ بات کہ معاہدہ کی مذکور شرط سراسر یک طرفہ تھی ۔محمد ﷺ کے اسلام کی برتر جاذبیت کے بارے یقین کامل کی مظہر ہے۔ مزید کہتا ہے کہ ”صلح حدیبیہ کو سیرت طیبہ اور اسلامی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ عسکری مہمات کے بل پر مسلمانوں کو جھکانے کی کوششیں دم توڑ چکی تھیں۔ پس منظر میں مسلمانوں اور کفار مکہ کے مابین جنگ

بندی کا دس سالہ معاہدہ طے ہوا تھا۔ اس کی اصل آفرینی مقناطیسی کشش کی طرح ہے کہ کوئی مسلمان مدینہ چھوڑ کر مکہ کی راہ نہیں لے گا ہاں مگر مکہ سے کوئی بھی اور کسی وقت بھی کفار کو چھوڑ کر مدینہ آ سکتا تھا، اور یہی ہوا، عورتیں مدینہ آئیں، کفار نے اپنے بندے بھیج کر خواتین کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ آپ ﷺ نے واپس کرنے سے انکار کر دیا، انہیں آگاہ کیا کہ معاہدہ میں مردوں کی واپسی کا ذکر ہے، عورتوں کا نہیں، وہ منہ اپنا سا لے کر پھر گئے، طوفان شیطان اللہ نگہبان!

اعتراض نمبر ۴۷

عمرہ محض بہانہ تھا۔ دراصل مقصد مکہ پر چڑھائی تھا نیز بدوی قبائل کو اس مہم میں لوٹ مار کی توقع نہ تھی۔ فتح تو درکنار زندگی کی بقا بھی خطرے میں تھی۔ اس لیے شرکت نہ کی۔ اگر جنگ ہی کرنا مقصود تھا تو مسلمانوں نے حملہ آور دشمن کے ایک دستہ کو گرفتار کر کے بارگاہ نبوی میں پیش کیا، چاہیے تھا کہ ان کو موت کے گھاٹ اتار دیتے سامان چھین لیتے اور مکہ پر بغیر تاخیر کے چڑھ دوڑتے لیکن مسلمانوں نے حملہ آوار دستے کو بحکم نبوی رہا کر دیا۔

جواب: دونوں مفروضے غلط اور ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اگر جنگ مقصد تھا تو ایک کے حصہ میں فتح اور دوسرے کے حصہ میں شکست آتی ہے۔ لوٹ مار کی امید بھی لازماً ہوتی ہے اور اگر بدوی قبائل کی شرکت لوٹ مار کی توقع نہ ہونے کے سبب تھی تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قبائل جانتے تھے کہ یہ سفر بہ غرض عمرہ ہے نہ کہ بہ غرض جنگ۔ انھوں نے جنگ بدر، احد میں اپنا حال دیکھ نہیں لیا تھا۔ مسلمان موت سے نہیں ڈرتا اسے ڈر ہے تو اللہ تعالیٰ سے کہ اس کے احکام کی بجا آوری میں کہیں کوئی کوتاہی نہ ہو جائے اور فتح و شکست بھی اللہ کی طرف سے سمجھتے ہیں نہ کہ اپنی طرف سے اندازہ کر کے اپنے ذمے لے لیتے ہیں۔ مسلمان کو غنیمت کا لالچ اور نہ ہی سلطنت کی وسعت پسندی کا چسکا ہوتا ہے بلکہ وہ تو اعلیٰ وارفع کردار کا مالک ہوتا ہے، اس کا مطمع نظر سوائے شہادت کے اور کچھ نہیں ہوتا۔

مسلمان، کفار کا ایک دستہ گرفتار کر لیتے ہیں انہیں بارگاہ نبوی ﷺ میں پیش کیا جاتا ہے آپ ﷺ انہیں رہا کر دیتے ہیں، اگر عمرہ کی ادائیگی مقصد نہ ہوتا تو اس دستہ کو قیدی بناتے یا کہتے کہ رخت سفر باندھ لو۔ اگر عمرہ بہانہ تھا تو معاہدہ کیوں کیا گیا؟ یہی وجہ ہے کہ عمرہ کرنے سے مسلمانوں کو روک دیا گیا اور معاہدہ کی نوبت آئی۔ معاہدہ میں یہ بھی طے پایا تھا کہ اس سال مسلمان عمرہ کیے بغیر لوٹ جائیں اگر مکہ پر حملہ کرنا ہی مقصد تھا تو اس شرط کو مسلمان قبول نہ کرتے اور ان کی کوئی شرط نہ مانتے بلکہ لڑائی کرتے۔ اگر جنگ کے خواہش مند تھے تو دشمن کے حملہ آور دستے کو قیدی بنا لیتے یا سب کو تہ تیغ کر دیتے انہیں تو جنگ کرنے سے غرض تھی نیز ان کا سارا سامان چھین لیتے یا انہیں قیدی بناتے۔ ان کی رہائی جنگی حکمت عملی

کے خلاف نظر آتی ہے دشمن کے دستے کی گرفتاری سے کئی ایک مطالبے منوائے جا سکتے تھے، جس غرض یعنی عمرہ کی ادائیگی کے لیے آئے تھے وہ پوری کرتے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا، اس کے برعکس مسلمان اگر ان کے ہتھے چڑھ جاتے تو ان کی خیر نہ تھی۔ لڑائی کرنے والوں کو صرف بہانہ چاہیے لیکن مسلمان اس سے بھی بے پروا ہیں مثال کے طور پر ابو جندل مسلمانوں کے پاس آتا ہے اور آپ ﷺ ابو جندل کو کفار کے حوالے کر دیتے ہیں اور معاہدہ کی اس شق " مکہ میں جو مسلمان پہلے سے مقیم ہیں ان میں سے کسی کو اپنے ساتھ نہ لے جائیں" پر عمل کر کے جہاں معاہدہ کی پابندی کی وہاں بجائے آگ پر تیل ڈالنے کے آگ پر پانی ٹپکایا اور صلح و آشتی کو ترجیح دی لیکن دوسری طرف مسلمانوں میں اضطراب و بے چینی اور بے قراری بڑھی لیکن معاہدہ کی پاسداری کی گئی۔ مختصر یہ کہ اگر مان لیا جائے کہ مسلمان بغرض جنگ آئے تھے، تو کیا کوئی حملہ آوار دستہ یا فوج ہتھیاروں کے بغیر نہتے آتی ہے حالانکہ ہمیشہ اپنے دشمن پر کاری ضرب لگانے کے لیے مسلح اور اسلحہ سے لیس ہو کر آتی ہے تاکہ اپنے مخالف کا قلع قمع کر دے مگر مسلمانوں کے پاس آلات حرب میں سوائے تلوار کے اور کچھ نہیں البتہ قربانی کے اونٹ جن گلے میں قلاوے جو عمرہ کی ادائیگی کا اظہار ہے۔

اعتراض نمبر ۲۷۵

۶۲۸ء کے موسم بہار میں محمدؐ نے اپنے آپ کو قوی سمجھتے ہوئے مکہ پر حملہ کرنے کی کوشش کی۔ راستے ہی میں یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ کوشش قبل از وقت ہے چناں چہ اس مہم کو ایک پر امن عمرے کا نام دے دیا گیا۔

'In the early spring of 628 Muhammad felt strong enough to attempt an attack on Meeca. On the way however, it became clear that the attempt was premature and the expedition was converted in to a peaceful pilgramage"

جواب: بہ قول برنارڈ لیوس اپنے آپ کو قوی سمجھتے ہوئے مکہ پر حملہ کی کوشش کی۔ راستے میں ہی معلوم ہو گیا کہ یہ کوشش قبل از وقت ہے۔ کیا یہ مستشرق بتا سکتے ہیں کہ ہدی (قربانی کے جانور) کے جانور لڑائی کے لیے لے گئے تھے۔ اگر وہ کھانے کے لیے انتظام کر کے لے گئے تھے تو ان کے گلے میں ہدی کے جانوروں کی طرح قلاوے وغیرہ کیوں تھے؟

دوم: اگر مسلمان حملہ آور تھے تو مسلمانوں کو حملہ کرنا چاہیے تھا نہ کہ قریش کو۔ پھر قریش کے حملہ آور دستہ کو پکڑا گیا اور رہا کر دیا گیا۔ اگر جنگ کے لیے آئے تھے تو انھیں تہ تیغ کر دیتے یا قریش سے اپنی

مرضی کا کوئی مطالبہ منوا لیتے۔ مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ کیا مسلمان مکہ پر چڑھ دوڑنے کے لیے سامان حرب سے لیس تھے؟ کیا ان کے پاس صرف ایک ہی تلوار نہ تھی؟ یہی جنگ لڑنے کا طریقہ ہوتا ہے کہ نہتے چلے آئیں۔ دراصل مسلمان عمرہ کی ادائیگی کے لیے آئے تھے۔ قریش کی بے جا مزاحمت نے انھیں عمرہ کرنے سے روک دیا۔ فریقین کے درمیان معاہدہ طے پایا۔ حملہ کی ناکام کوشش پر معاہدہ نہیں ہوا تھا۔ قریش کہہ سکتے تھے کہ تم مکہ پر چڑھ دوڑے اب عمرہ کا بہانہ بنا لیا مگر معاہدہ میں اس قسم کی کسی عبارت یا الفاظ کا ذکر نہیں ملتا۔ معاہدہ میں یہ شق ہے کہ اس سال مسلمان عمرہ کیے بغیر چلے جائیں۔ مدعی تو سمجھتا ہے کہ بہ غرض عمرہ مسلمان آئے تھے لیکن گواہ چست یعنی لیوس مسلمانوں کو حملہ آور سمجھتا ہے۔ معاہدہ کے بعد جانِ دو عالم ﷺ نے قریش پر سے تجارتی پابندیاں ہٹا دیں۔ حال آنکہ معاہدہ میں اس امر کا ذکر نہیں ملتا۔

شبہ کا ازالہ: اگر مسلمانوں نے یہ دب کر معاہدہ کیا تھا تو معاہدہ کے علاوہ قریش کو رعایتیں کیوں دیں جیسے تجارتی پابندیاں ختم کر دیں۔ گویا جس چیز کا قریش نے دعویٰ ہی نہیں کیا وہ بھی عطا کر دیا جاتا ہے۔

واہ کیا جود و کرم ہے شہ بطحا تیرا
نہیں سنتا ہی نہیں مانگنے والا تیرا

دوم: اگر حضرت عثمان غنیؓ ایک فردِ واحد کے لیے بیعتِ رضوان ہو سکتی ہے جب ان کے قتل کی افوہ اڑی تو ان کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے بیعت لی گئی تو کیا دینی مفادات کی خاطر تلواریں نیام میں رہتیں؟ معترض کی بھول ہے کیوں کہ مسلمانوں کا اوڑھنا بچھونا سب کچھ دین اسلام ہے۔ جو اللہ کے ہاں پسندیدہ دین تھا اور اسے تمام ادیان پر غالب کرنا مقصود تھا۔

اعتراض نمبر ۲۷۶

اہل مغرب یہ بھی کہتے ہیں کہ حج اور عمرہ کا ذکر قرآنی تعلیمات میں اس واقعہ سے قبل نہیں ملتا۔

جواب: خانہ کعبہ کو ابتداء ہی سے بیت اللہ کی حیثیت حاصل تھی۔ سورہ قریش میں اسے بیت اللہ کہا گیا ہے۔ یہاں لوگ آکر مناسک حج ادا کرتے تھے۔ قربانی کی رسم بھی ادا کرتے تھے جس کا ذکر قرآن پاک میں ہے۔" انا اعطینك الكوثر۔ فصل لربك و انحر۔ ان شائنك هو الابتر"۔

دوم: مکی دور میں سید المرسلین ﷺ اور آپؐ کے اصحاب کے طواف کے تذکرے موجود ہیں۔ انصار سے بیت عقبہ اولیٰ وثانی وثلاثہ ہوئیں۔ یہ منیٰ کی ایک گھاٹی ہے جو حج کے دنوں میں آباد ہوتی ہے۔ اگر آپؐ اور آپؐ کے صحابہؓ عقبہ میں موجود تھے تو کیسے یہ مان لیا جائے کہ انصار کو مناسک حج مقصود نہ تھا۔ جب کہ حج کے واضح احکامات نہ ہونے کے باوجود ہجرت سے پہلے حج کو اسلامی عبادت کا مرتبہ ومقام حاصل تھا۔

اعتراض نمبر ۲۷۶ کا دوسرا جز

آپ صرف عرب کے لیے مبعوث ہوئے تھے۔

اسلام کو بیرونی مذہب کہا جاتا ہے۔

جواب: آپ ﷺ سے پہلے تمام انبیاء اپنی اپنی قوم کے لیے مبعوث ہوتے رہے، اس لحاظ سے ان کی نبوت کا دائرہ کار محدود تھا، وسیع نہ تھا۔ بدھ مت اور عیسائیت ایسے دین تھے جن کی تبلیغ کا سلسلہ بہت دیر بعد ہوا، بدھ مت تبلیغی دین نہ رہا وہ جمود کی تہوں میں دب گیا البتہ عیسائیت دین تبلیغ ہے اگر چہ اس کا دائرہ بھی بنی اسرائیل تک محدود تھا۔ اسلام کی خوبی باقی ادیان سے بالاتر ہے، یہ عالمگیر، زمان ومکان سے آزاد اور جملہ انسانی نسل کے لیے ہے۔ اس کی ایک دوسری شہکار خوبی یہ ہے کہ دنیا کے تمام سچے ادیان کی تصدیق کرتا ہے، ان کی الہامی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے اور ان پر ایمان لانے کو ناگزیر سمجھتا ہے مسلمانوں کا عقیدہ یہی ہے" امنت باللہ و ملائکتہ و کتبہ و رسولہ ۔۔۔ ' دین اسلام کے پیغمبر تمام انسانیت کے لیے نبی ورسول ہیں۔ ارشاد خداوندی (سورہ النساء۔۷۹)" (اے محمد ﷺ ہم نے تجھے بنی نوع انسان کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے اور اللہ ہی گواہ کافی ہے۔" چونکہ آپ پر سلسلہ نبوت ورسالت اور نزول وحی ختم ہونا تھا اس لیے آپ ہی نبوت کے فیضان کو ہمہ گیر اور عالم گیر بنایا گیا۔ قرآن کریم میں ہے" وما ارسلنک الا رحمۃ للعالمین" اور سورہ صبا میں اس کی مزید صراحت فرمادی کہ آپ جملہ بنی نوع انسان کے لیے مبعوث ہوئے ہیں، اس لحاظ سے کوئی قوم کوئی گروہ یا جماعت آپ کے حلقہ نبوت ورسالت سے باہر نہیں ہے۔ ارشاد ربانی ہے، ترجمہ: اے محمد! ہم نے تمہیں جملہ بنی نوع انسان کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے"۔ (سورۃ سبا۔۲۸)

اللہ تعالیٰ علیم وخبیر ہے اسے غیر مسلموں کے مذموم عزائم کی خبر تھی کہ مستشرقین لوگوں کو یہ غلط تاثر اور شکوک وشبہات پیدا کرنے کی کوشش ناتمام اور سعی ناکام کریں گے، کہ پیغمبر آخر ﷺ صرف عرب کے لیے مبعوث ہوئے تھے جبکہ اوپر ذکر ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو تمام بنی نوع انسان کے لیے مبعوث فرمایا اور دین اسلام زمان ومکان کے لحاظ سے محدود وعلاقائی نہیں ہے۔ اسلام کو بیرونی مذہب قرار دیا، حقیقت عظمیٰ کا وجود، عزت وتوقیر، ہدایت پر عمل، عبادت، تزکیہ نفس نیکی، ہمدردی ثابت قدمی اور صبر ورضا وغیرہ وہ مشترک اقدار ہیں جو تمام مذاہب میں موجود ہیں اس لحاظ سے مذاہب میں ایک قسم کی مماثلت ہے، ایک اصل میں مماثلت فطری ہے اور کسی ایک کو دوسرے کی عاریت قرار دینا مضحکہ خیز ہے

اسلام عالمگیر مذہب ہے اور وہی دین جو آدمؑ سے شروع ہوتا ہے اور آپ پر اس کی تکمیل ہوئی۔ نسلی، وطنی، رنگ برادری حسب ونسب، اور قوت واقتدار کے امتیازات کو ملیامیٹ کر دیا اور اعلان کیا" اِنَّ اَکرَمَکُم عِندَ اللہِ اَتقٰکُم" بے شک تم سب سے زیادہ قابل تکریم وعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ عالم اسلام میں مختلف اقوام نے ہمیشہ ایک ملت کی حیثیت سے گزران کی،

اس سے بین الاقوامی برادری کا قیام اور اس کا استحکام ثابت ہوتا ہے، اسلام ایک بین الاقوامی مذہب ہے، یہ تمام امتیازات سے بالاتر اور ہر ایک کے لیے قابل عمل نظام ہے نیز اس میں جابریت اور مطلق العنانی کی گنجائش نہیں ہے بلکہ قادر مطلق کے آگے جواب دہ ہونا ہے۔

پچھلی صدی میں عالمی جنگیں ہوئیں جس پر اقوام عالم نے جنگوں کی تباہی سے بچنے کے لیے ایک عالمی برادری کے قیام کا سوچا جہاں عالمی مسائل پر گفتگو کر کے مسائل کا حل تلاش کیا جا سکے۔ یہ حل اسلام نے چودہ سو سال پہلے بتا دیا تھا اور اس برادری کو ایک اعلیٰ منشور اور ضابطہ اخلاق عطا کیا لہٰذا اسلام ایک عالمی اور اس کی فکر بین الاقوامی ہے جو عالمی معاشرہ پیدا کرنے کی اساس ہے، دیگر مذاہب میں عالمگیریت نہیں پائی جاتی جس کے سبب وہ صرف ایک مخصوص نسل اور علاقے کی ترجمانی کرتے ہیں، اس کے نتیجہ میں یہ مذاہب تمام نسلوں کے لیے قابل قبول نہیں ہیں اور اپنے دائرہ کار کو محدود کر کے انسانیت کو طبقات میں منقسم کرتے ہیں جس سے نفرت و تعصب پھیلتا ہے، اس لحاظ سے صرف اسلام ہی وہ مذہب ہے جو انسانیت کو ایک مکمل نظام عطا کرتا ہے۔ یہ تمام مذاہب سے الگ ایک اعلیٰ نظام فراہم کرتا ہے، ایک عالمگیر برادری کے قیام اور عالمی قوانین کی بنیادیں فراہم کرتا ہے اس لیے اسے بیرونی مذہب کہنا درست نہیں۔ بیرونی کہہ کر معترض یہ کہنا چاہ رہا ہے کہ یہ کسی اور مذہب سے اخذ شدہ ہے جبکہ یہ سچے مذاہب کی تصدیق کرتا ہے اور خود ساختہ کی نفی کرتا ہے یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ دین ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ دین اسلام ہے اور چاند چڑھے اور کل عالم دیکھے، واقعی سب نے دیکھ لیا کہ اسلام ہی سچا دین، اور عالمی دین ہے اور بیرونی نہیں ہے۔ اسلام کوئی نیا یا بیرونی مذہب نہ تھا بلکہ اصل میں عرب کا مذہب تھا جس میں خرافات شامل ہوگئیں۔ گویا جسم تو تھا روح پرواز کر چکی تھی۔ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کفار جان جائیں کہ اسلام مکہ کی عظمت کا نشان ہے، دشمن نہیں۔ یہ بات تب قابل تسلیم ہوتی جب اسلام کو کسی مرحلہ پر بیرونی مذہب کہا ہوتا یہ Imported نہیں تھا۔ اسلام میں داخل ہونے والے عرب تھے کسی نے یہ نہیں کہا کہ یہ مذہب غیر ملکی ہے؟ اسلام اللہ کا دیا ہوا پسندیدہ دین ہے اسے دین ابراہیمی کہتے ہیں جب کہ ابراہیمؑ تو باہر سے آئے تھے پھر بھی کسی نے اعتراض نہیں کیا کہ یہ بیرونی مذہب ہے۔ یہ ایک عالمی مذہب ہے نہ عربی ہے نہ عجمی۔ اس کا تعلق کسی خطے، نسل سے نہیں یہ عربوں کے آباؤ اجداد کا مذہب تھا۔ یعنی آدمؑ سے لے کر ختمی المرتبت محمد ﷺ تک ایک ہی مذہب رہا ہے۔

اعتراض نمبر ۲۷

مکہ سے فرار ہونے والے افراد کو مدینہ والوں کی پشت پناہی حاصل تھی۔ (انداز فکر ۳۱۴)

جواب: مکہ میں جو لوگ اسلام قبول کر چکے تھے معاہدہ حدیبیہ کی رو سے مدینہ میں پناہ نہیں لے

سکتے تھے۔ کفار نے ان کے لیے مدینہ جانے کے دروازے بند کرر کھے تھے۔ انھوں نے کفار کے ظلم وستم سے تنگ آکر ہجرت کی راہ لی اور مدینہ میں نہیں بل کہ مقام عیص کو اپنی پناہ گاہ بنایا جہاں سے قریش کے تجارتی قافلے گزرتے تھے۔ ان پر حملے کیے۔ ان کو بے بس کر دیا اور تجارت کو مسدود کر دیا۔ ان حالات میں قریش نے خود درخواست کی کہ اس شق کو منسوخ کیا جائے اور انھیں واپس مدینہ بلا لیا جائے عیص سے یہ گروہ مدینہ آیا۔ اس گروہ کی کاروائیوں میں معترضین کو اہل مدینہ کی شہ نظر آتی ہے جب کہ یہ گروہ مکہ سے تھا اور کفار کے ظلم سے تنگ آکر عیص میں جا گزیں ہوا۔ مدینہ والوں کی اس گروہ کی پشت پناہی کا جہاں تک تعلق ہے تو کیا ان لوگوں کو مسلمانوں نے عیص میں اکٹھے ہونے کی راہ دکھائی تھی؟ کیا وہ مسلمانوں کے کہنے پر مکہ چھوڑ آئے تھے یا کہ کفار کے ظلم وستم نے ان کا جینا حرام کر دیا تو وہ اپنے وطن کو خیر باد کہ چکے تھے؟ کیا مسلمانوں نے اس گروہ کو قریش کے تجارتی قافلوں پر حملے کرنے کو کہا تھا؟۔ کفار نے مکہ میں رہنے والے مسلمانوں کا عرصہ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ مدینہ میں معاہدہ حدیبیہ کی رو سے جا نہیں سکتے ،اگر جاتے تو مسلمان انہیں اہل مکہ کو واپس کرنے کے ذمہ دار تھے۔ ابو بصیر مدینہ آیا انہیں کفار کے دو آدمیوں کے سپرد کر دیا ،راستے میں ابو بصیر نے ایک کو قتل کر دیا، دوسرا بھاگ نکلا، ابو بصیر نے خود اپنی پناہ گاہ مقام عیص کو بنایا۔ جب مکہ میں مسلمانوں کو یہ بھنک پڑی تو وہ بھی وقتاً فوقتاً عیص جانے لگے۔ خاصی تعداد ہوگئی، اب انہوں نے اپنے دشمن سے بدلہ لینے کے لیے انتقامی کاروائیاں شروع کیں اور ان کے تجارتی قافلوں پر حملے کرنے لگے جس سے کفار کو اپنی تجارت کے ٹھپ ہونے کا خطرہ لاحق ہوا۔ اس صورت کی شدت اور سنگینی کو بھانپ کر اہل مکہ نے حضور ﷺ کی بارگاہ میں حاضری دے کر عرض کی کہ عیص میں موجود مسلمانوں کو مدینہ بلا لیں، ہمیں اعتراض نہیں ہے اور ہم از خود اس شق کو منسوخ کرتے ہیں۔ کفار نے ہی مکہ کے مسلمانوں کو تنگ کیا اور وہ عیص چلے گئے یعنی وہ خود بھیجنے والے تھے اور پھر ان کی مدینہ واپسی پر رضا مندی ظاہر کرنے والے بھی خود کفار تھے، اس میں مسلمانوں کا ذرا عمل دخل نہیں ہے خواہ مخواہ الزام مسلمانوں کے سر کرتے ہیں۔ اس قسم کے سوالات کے جوابات مستشرقین کے پاس نہیں ہیں۔ لہٰذا یہ الزام باطل ہے

اعتراض نمبر ۲۷۸

یہ الزام بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جان دو عالم ﷺ کے عمرہ کرنے کا خواب اگر صحیح تھا تو اس خواب کی تعبیر غلط نکلی۔ (مغرب کا انداز فکر۔ ۳۱۱)

جواب: اس سے نتیجہ یہ نکالا جا رہا ہے کہ انبیاء کے خواب الہامی نہیں ہوتے ہیں اور اس خواب کے پورا نہ ہونے سے نبوت پر حرف آتا ہے

کسی کے خواب کی تکذیب کرنا درست نہیں۔ اس کا مشاہدہ کرنے والے سوائے دیکھنے والے

کے اور کوئی نہیں ہوتا۔ خواب اس کے دیکھنے والے کے بیان پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس طرح یہ کہنا کہ خواب واقعی دیکھا گیا بھی یا نہیں۔ سوائے دماغی فتور کے اور کچھ نہیں۔ خواب کی تعبیر اگر غلط نکلی تو یہ بات اس وقت درست مانی جاتی جب اس خواب میں عمرہ کی کسی مدت کا تعین ہوتا اس کی بھی یہی صورت ہے کہ مدت معین نہیں تھی۔ انبیاء کرامؑ کے بہت سے خواب اور پیشگوئیاں مدتوں بعد پوری ہوئیں۔ جیسے حضرت یوسفؑ نے خواب میں دیکھا کہ چاند سورج اور گیارہ ستارے انھیں سجدہ کر رہے ہیں۔ یہ خواب پورا تو ہوا لیکن تقریباً پچیس سال کے بعد۔ جب خواب دیکھا اسی دن اسی ماہ اسی سال پورا نہ ہوا تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ حضرت دانیالؑ نبی نے جو خواب دیکھے وہ کب پورے ہوئے، کیا اس میں شک ہے کہ ان خوابوں کی تعبیر صدیوں بعد ملی، یوحنا کے مکاشفات کا یہ عالم ہے کہ ہزاروں سال گزر گئے اور وہ اب تک پورے نہیں ہوئے تو آپ ﷺ پر تو آپ پر انگشت نمائی چہ معنی دارد۔ دراصل اعتراض تو تب کیا جاتا یا اعتراض تب صحیح ہوتا اگر یہ خواب مدت مقررہ میں پورا نہ ہوتا یا کبھی بھی پورا نہ ہوتا۔ قرآن کریم نے اس خواب کا ذکر روایت صادقہ برحق کے طور پر کیا اور عمرہ کی ادائیگی کا مژدہ پرامن طور پر ہونے کا اشارہ بھی دے دیا۔

ڈاکٹر ودود کہتے ہیں ''جب اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو پہلے ہی بتا رکھا تھا کہ یہ معاملہ آخر تک یوں ہوگا تو پھر صحابہ کرامؓ کے دریافت کرنے پر اللہ تعالیٰ کو یہ کہنے کی ضرورت کیا پڑی تھی کہ اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا تھا، تو مسجد حرام میں ان شاء اللہ ضرور داخل ہوں گے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ (معاذ اللہ) خود حضور ﷺ کو تردد ہو گیا تھا کہ معلوم نہیں خدا نے مجھے سچا خواب دکھایا تھا یا یوں ہی کہہ دیا تھا کہ مکہ چلے جاؤ، تم مسجد حرام میں داخل ہو جاؤ گے اس تردد کو دور کرنے کے لیے خدا کو بارے دیگر یہ یقین دلانا پڑا کہ آپ ﷺ متردد ہو جایئے۔ ہم نے سچا خواب دیکھا تھا آپ ﷺ ضرور مسجد حرام میں داخل ہوں گے''۔ اس کا جواب مولانا مودودی صاحب دیتے ہیں کہ اعتراض کے شوق میں ڈاکٹر صاحب کو یہ ہوش بھی نہ رہا کہ ''تو مسجد حرام میں ضرور داخل ہوں گے کا خطاب رسول اللہ ﷺ نے نہیں بلکہ مسلمانوں سے ہے''۔ ''لقد صدق الله رسوله الرويا بالحق لتدخلن المسجد الحرام ۔۔۔ ذالك فتحاً قريباً'' اس میں ''لتدخلن'' صیغہ جمع ہے، صلح حدیبیہ کے موقع پر جو صحابہؓ حضور ﷺ کے ساتھ آئے تھے ان کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے کہ ہم نے اپنے رسول ﷺ کو سچا خواب دکھایا تھا، تم لوگ ضرور مسجد حرام میں داخل ہوں گے۔ اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مقبول کو سچا خواب دکھایا تھا کہ وہ مسجد حرام میں داخل ہوں گے مگر یہ نہیں فرمایا تھا کہ اسی سال عمرہ ادا کریں گے۔ اس میں مدت مقرر نہ تھی مدت مقرر نہ ہونا خواب کے سچا ہونے کی قطعی دلیل ہے۔ خواب میں اس سال عمرہ کی ادائیگی کا ذکر نہیں ہے تو از خود اسی سال کا تعین کر کے سچے خواب کو جھٹلانا محض غیر واضح تعصب نفرت اور دشمنی محض ہے۔

اعتراض نمبر ۲۷۹

رسول اللہ ﷺ مدینے میں خواب دیکھتے ہیں کہ آپ ﷺ مکہ میں داخل ہوئے ہیں اور بیت اللہ کا طواف کیا ہے۔ آپ ﷺ یہ خبر صحابہ کرامؓ کو دیتے ہیں اور پھر عمرہ ادا کرنے کے لیے مکہ روانہ ہو جاتے ہیں۔ کفار مکہ آپ ﷺ کو حدیبیہ کے مقام پر روک لیتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں صلح حدیبیہ ہوتی ہے، بعض صحابہ اس خلجان میں پڑ جاتے ہیں اور حضرت عمرؓ ان کی ترجمانی کرتے ہوئے پوچھتے ہیں کہ یا رسول اللہ! کیا آپ ﷺ نے ہمیں خبر نہ دی تھی کہ ہم مکہ میں داخل ہوں گے اور طواف کریں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا میں نے یہ کہا تھا کہ اس سفر میں ایسا ہوگا؟ اس تشریح پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ (معاذ اللہ) خود حضور ﷺ کو اپنی وحی کا مفہوم سمجھنے میں غلطی لگ گئی تھی۔

جواب: مسلمان مکہ سے جبراً نکالے گئے تھے۔ ان کفار کی ظلم وستم کی انتہا نہ رہی اس لیے وہ ہجرت کر کے مکہ سے مدینہ چلے آئے تھے لیکن ان کے دل و دماغ میں اپنے محبوب وطن کی یاد ہمیشہ انگڑائیاں لیتی رہتی تھی، اس کے علاوہ وہ اپنے اس حق سے بھی بخوبی واقف تھے، وہ حق یہ تھا کہ کعبہ پر ان کا بھی کم از کم اس قدر حق ہے جس قدر دیگر قبائل کا ہے۔ وہ اپنے فرائض سے بھی واقف تھے، وہ فرض اسلام کے ایک رکن اعظم حج سے باخبر تھے۔ آپ ﷺ نے ارادہ عمرہ فرمایا، عمرہ کا احرام باندھا اور قربانی کے اونٹ ساتھ لیے، یہ بھی حکم دیا کہ کوئی شخص ہتھیار باندھ کر نہ آئے، صرف تلوار پاس ہو مگر وہ بھی نیام میں بند ہو۔ یہ تمام باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ مسلمان ارادہ عمرہ سے مکہ کی طرف روانہ ہوئے تھے۔ یہ نہیں کہ مکہ پر چڑھائی کرنے کے ارادے سے آئے تھے لیکن ایک معاہدہ ہوتا ہے جس کی دفعہ اول کے مطابق ''مسلمان اس سال واپس چلے جائیں'' کے سبب مسلمانوں میں اس قدر بے چینی پھیلی کہ حضرت عمرؓ نے آپ ﷺ سے پوچھ ہی لیا ''کیا آپ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ ہم لوگ کعبہ کا طواف کریں گے؟ آپ ﷺ کے فرمان کو سمجھنے میں کوتاہی ہوئی۔ آپ ﷺ کا بیان کردہ خواب برمبنی سچ اور حق ہے اور ان خواب کی باتوں کے استفسار پر حضرت عمرؓ کے سامنے اعتراف کیا۔ آپ ﷺ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا: ''لیکن یہ تو نہیں کہا تھا کہ اسی سال (طواف) کریں گے۔ مذکورہ اعتراض کی عبارت سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ خود حضور ﷺ کو وحی کا مفہوم سمجھنے میں غلطی لگ گئی تھی (معاذ اللہ) بلکہ آپ ﷺ کے فرمان ''یہ تو نہیں کہا تھا کہ اسی سال (طواف) کریں گے'' سے اعتراض ختم ہو جاتا ہے، مگر آپ ﷺ اسی سفر میں مکہ میں داخلہ اور کعبہ کے طواف کے متعلق فرماتے تو اور بات تھی مگر آپ ﷺ نے یہ فرما کر کہ ''یہ تو نہیں کہا تھا کہ اسی سال طواف کریں گے'' صحابہؓ کے خلجان کو دور فرما دیا نیز بعد میں آنے والے مخالفین کے اعتراض کو پیوند کاک کر دیا۔

نیز حضور ﷺ کا خواب سن کر یہ سمجھا تھا کہ اسی سفر میں عمرہ ہوگا اور جب نہ ہو سکا تو خلجان میں پڑ گئے۔

اعتراض نمبر ۲۸۰

معترض ایک بھونڈی سی تاویل کر کے نبی مکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ پر الزام لگاتے ہوئے کہتا ہے کہ ''رسول اللہ ﷺ کو شروع ہی سے اللہ کی طرف سے اطلاع مل گئی تھی کہ آپ ﷺ اس سال روکے جائیں گے اور اگلے سال مکہ میں داخلہ ہوگا۔

۲۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی اطلاع صحابہؓ میں سے کسی کو نہ دی بلکہ انہیں یہ غلط تاثر دیا کہ مکہ میں داخلہ اسی سفر میں ہوگا، جبھی تو صحابہؓ خلجان میں پڑ گئے اور حضرت عمرؓ جیسے قریبی صحابی کو یہ کہنا پڑا کہ آپ ﷺ نے تو ہم سے کہا تھا کہ ہم مکہ میں داخل ہوں گے اور طواف کریں گے۔ کیا اس سے حضور ﷺ پر یہ الزام نہیں آتا کہ آپ ﷺ نے صحابہؓ کو دھوکا دیا (معاذ اللہ)

جواب: جزیرہ نمائے عرب جو جہالت کی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا، کوئی ایسی برائی نہ تھی جو اس معاشرہ میں نہ پائی جاتی تھی۔ اخلاق سے عاری اور شرم وحیا سے محروم تھے۔ اس دور میں بھی آپ ﷺ نے اپنے دامن کو تمام آلائشوں سے بچائے رکھا۔ وہ عرب جو قعر مذلت میں گھرے ہوئے تھے، آپ ﷺ کو ''الصادق اور الامین'' کے القابات سے نوازتے تھے۔ وہ ہستی جسے اپنے تو کیا، غیر بھی سچا اور ایماندار کہیں، اس کی زبان مقدس صحابہ کو غلط تاثر دے سکتی ہے؟ نہیں۔۔۔ ہرگز نہیں! وہ تو بعض صحابہؓ نے ازخود سمجھ لیا تھا کہ عمرہ اسی سال ہو جائے گا حالانکہ جب حضور ﷺ کی بارگاہ میں عرض کیا گیا کہ آپ ﷺ نے ہمیں خبر نہ دی تھی کہ ہم مکہ میں داخل ہوں گے اور طواف کریں گے تو حضور ﷺ نے جواب میں فرمایا ''کیا میں نے یہ کہا تھا کہ اسی سفر میں ایسا ہوگا۔'' ظاہر ہے کہ اگر حضور ﷺ نے واقعی لوگوں کو یہ کو تاثر دیا ہوتا کہ اسی سفر میں عمرہ ہوگا تو حضور ﷺ ان کے جواب میں یہ بات کیسے فرما سکتے تھے؟

رسول اللہ ﷺ خواب میں دیکھتے ہیں کہ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے ہیں اور بیت اللہ کا طواف کیا ہے، یہ خواب آپ ﷺ ہو بہو صحابہ کرامؓ کو سنا دیتے ہیں اور صحابہؓ کے ہمراہ بغرض عمرہ مکہ روانہ ہو جاتے ہیں اس موقع پر آپ ﷺ نے یہ تصریح نہیں فرمائی کہ عمرہ اس سال ہوگا یا نہیں ہوگا۔ اس پر غلط تاثر دینے کا الزام عائد نہیں ہو سکتا ہے۔ مولانا مودودی اس کی وضاحت میں ایک مثال دیتے ہیں، وہ کہتے ہیں، فرض کیجئے کہ ایک سپہ سالار کو حکومت بالا دست ایک مہم پر فوج لے جانے کا حکم دیتی ہے، سپہ سالار کو معلوم ہے کہ یہ مہم اس سفر میں پوری نہیں ہوگی اور سپہ سالار فوج پر یہ ظاہر نہیں کرتا، وہ صرف اتنا بتاتا ہے کہ مجھے یہ مہم سر کرنے کا حکم ہوا، کیا اس کو یہ معنی پہنائے جا سکتے ہیں کہ اس نے فوج کو دھوکا دیا؟ کیا ایک سپہ سالار کے لیے واقعی یہ ضروری ہے کہ حکومت عالیہ کے پیش نظر جو اسکیم ہے وہ پوری کی پوری فوج پر پہلے ہی کھول دے، اور اس بات کی پرواہ نہ کرے کہ اس کے ظاہر ہو جانے سے فوج کے عزم پر کیا اثر پڑے گا؟

اگر سپہ سالار فوج سے یہ نہ کہے کہ یہ مہم اسی سفر میں پوری کی جائے گی اور نہ یہ کہے کہ اس سفر میں پوری نہیں کی جائے گی، تو اسے آخر کس قانون کی رو سے جھوٹ قرار دیا جائے گا۔

ایک شبہ کا ازالہ: عمرۃ القضاء: کفار مکہ نے مشہور کر دیا کہ مدینہ کی آب وہوا مسلمانوں کو راس نہیں آئی مسلمان عام طور پر بیمار ہیں اور طواف کعبہ کے قابل نہیں ہیں۔ (محمد رسول اللہ)

جواب: سن چھ ہجری میں کفار نے مسلمانوں کو عمرہ کرنے سے روک دیا تھا۔ ایک معاہدہ ہوا جو صلح حدیبیہ کے نام سے تاریخی کتب میں مشہور ہے۔ اس میں یہ طے پایا تھا کہ اس سال عمرہ کیے بغیر مسلمان واپس چلے جائیں گے۔ اگلے سال عمرہ ادا کرنے آئیں گے۔ اس لحاظ سے ســـہ ۷ ہجری کو عمرۃ القضا کی ادائیگی کے لیے مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے۔ اس موقع پر آپ ﷺ نے جانثاروں سے فرمایا اللہ تعالیٰ تم پر رحم کرے گا جو آج اپنی قوت و جرات کا مظاہرہ کرے گا۔ اس لیے آپ صحابہ کے ساتھ تیز تیز اور لپک لپک کر چلنے لگے تا کہ مشرکین کو بتایا جا سکے کہ کوئی کمزوری آب وہوا سے پیدا نہیں ہوئی۔ یہ تیز رفتاری اس وقت مشرکوں کو نظر آئی جب تک آپ بیت اللہ کی آڑ میں نہ پہنچ گئے۔ اس عمل کو اصطلاح میں رمل کہتے ہیں اور یہ مناسک حج میں آپ کی سنت کے طور پر شامل ہے۔

عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں لوگوں کا خیال تھا کہ یہ (ہرولہ) یعنی لپک لپک کر تیز رفتار سے چلنا واجب نہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ اقدام قریش کے طعنہ کی وجہ سے جو آپ کو معلوم ہو گیا تھا، کیا تھا لیکن آپ نے حجۃ الوداع میں اسی طرح طواف کیا تو یہ لازم ہو گیا اور اسی پر سنت قائم ہو گئی۔ (ابن ہشام ج۲ ص ۴۳۴)

شاہانِ عالم کے نام خطوط

ایک شبہ کا ازالہ: صلح حدیبیہ کے بعد آنحضرت ﷺ نے عالمی بادشاہوں کو تبلیغی خطوط لکھے اور سفیر ان کو ان کے پاس بھیجا گیا۔ مگر مستشرقین ان خطوط کو نہیں مانتے۔ وہ اسے ایک کہانی سمجھتے ہیں۔ اس کی دلیل وہ یہ لاتے ہیں کہ ایک چھوٹی سی ریاست مدینہ کا حکمران، ہرقل اور کسریٰ جیسے بادشاہوں کو خط کیسے لکھ سکتا ہے؟ ان بادشاہوں نے ان خطوط کو کوئی اہمیت نہیں دی ہوگی اور جواب تک نہ دیا ہوگا۔ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ جو خط کسریٰ کو لکھا گیا وہ اس تک پہنچ بھی نہیں پایا کیوں کہ ۶۲۸ء میں اس کا انتقال ہو گیا تھا۔

ایک اور گروہ کے نزدیک ان خطوط کی روانگی تسلیم شدہ ہے لیکن وہ ان خطوط کے متن کے بارے تحفظات رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ تبلیغی نہیں تھے سیاسی تھے۔ ان میں مختصر ریاست مدینہ کو متعارف کرایا گیا ہوگا یا ان حکومتوں کو قریش کی مدد سے باز رکھنا مقصود ہوگا۔

جواب: چھوٹی ریاست کا حکمران کیسے خط لکھ سکتا ہے؟ بادشاہوں نے خطوط کو اہمیت نہ دی ہوگی اور جواب تک نہ دیا ہوگا، ریاست مدینہ کا تعارف کرایا گیا ہوگا وغیرہ وغیرہ سارے مفروضات ہیں۔

فرضی باتیں نا قابل یقین ہوتی ہیں۔ شاہانِ عالم اس قدر بے خبر رہے ہوں اور ۶۲۸ء تک انھیں یہ خبر موصول نہ ہوئی ہو کہ ان کے ملحقہ ملک عرب میں گزشتہ ۱۹۔۱۸ سال سے عظیم انقلاب بر پا ہو رہا ہے۔ قیصر ہرقل رومی جب ایرانی بادشاہ کے ہاتھوں شکست سے دوچار ہو رہا تھا۔ مقدس صلیب ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ اس وقت سورہ روم کا نزول ہوتا ہے ''غُلِبَتِ الرُّومُ o فِي اَدنَی الاَ رضِ وَهُم مِّن بَعدِ غَلَبِهِم سَيَغلِبُونَ'' o ''رومی مغلوب ہوئے پاس کی زمین میں اور اپنی مغلوبی کے بعد عنقریب غالب ہوں گے ''، جس میں بشارت دی گئی کہ روم کو فتح آخر کار ہوگی۔ ہرقل کو اس خبر سے بڑی خوشی ہوئی ہوگی۔ کوئی وجہ نہیں کہ نو یا دس سال بعد یہ خبر ہرقل کو پہنچی ہو۔ ۶۲۲ میں ایران کو شکست در شکست ہوئی۔ اس بشارت دینے والے کی طرف ہرقل کو خط ملے تو اس کا ردعمل کیا ہوگا۔ صرف تعظیم ہی تعظیم کا اظہار ہوگا۔

اسی طرح کسریٰ کو بھی ایسی ہی خبر مل سکتی تھی کہ اس کے مخالف کو فتح کی بشارت دی گئی ہے۔ کیا وہ شکست سے پہلے افواہ سمجھتا رہا ہوگا لیکن شکست کے بعد اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی ہوں گی۔ شکستوں کے بعد حقیقت سامنے آئی ہوگی تو زہر کے گھونٹ نگلنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا ہوگا، یقیناً ایسے میں اگر کوئی خط ملتا ہے تو سوائے تلخی کے اظہار کے اس کے پاس کچھ نہیں بچا تھا۔ اگر نامہ مبارک کسریٰ تک نہیں پہنچا تو خط کی توہین کی کہانی کم از کم کوئی مسلمان تو نہیں گھڑ سکتا۔ زہر کے پتلوں یعنی مستشرقین کا کام ہے، تاریخ شاہد ہے کہ خطوط لکھے گئے۔ ان خطوط میں سے ایک خط مصر کے والی شاہ مقوقس کو لکھا گیا جس نے ایک دستہ مدینہ بھیجا، تحفے تحائف کے علاوہ دو معزز خواتین سرین اور ماریہ قبطیہ بھی بھیجیں۔ اس ایک خط کی تاریخی حیثیت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا تو دیگر خطوط کی سچائی بہ درجہ اولیٰ ثابت ہو جاتی ہے۔ ان خطوط کے متن میں مستشرقین شک پیدا کرتے ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ یہ ایک سچائی ہے کہ حضور کا مشن اسلام کی تبلیغ تھا۔ قرآن کریم نے بعثت کے مقصد و مدعا کو یوں بیان کیا ہے۔

''لِتُنذِرَ مَن كَانَ حَيًّا وَيَحِقَّ القَولُ عَلَى الكَافِرِين'' (تا کہ متنبہ کرو ہر اس شخص کو جو زندہ ہو اور ثابت ہو بات منکروں پر) (سورہ یٰسین۔۷۰)

لہٰذا اگر عالمی بادشاہوں کو دعوت تبلیغ بہ ذریعہ خطوط نہ دی جاتی تو تبلیغ کا حق ادا نہ ہوتا۔ جلال شاہی، فاصلے، معاشرتی امتیاز، بدردعمل کا خدشہ وغیرہ مانع ہو سکتے ہیں لیکن اللہ کے بھیجے ہوئے رسول نے پیغام توحید عام کرنا ہوتا ہے اور ہر شخص تک پہنچانا ہوتا ہے۔ یہ آپؐ کے منصب کی اہم ذمہ داری ہے، آپ ﷺ نے اس فرض کو خوب نبھایا۔ ہمیشہ سے حق و باطل میں معرکہ آراء تفاوت رہا ہے اور جنگ وجدل کا باعث رہا ہے لیکن ابراھیمؑ و نمرود، موسیٰؑ و فرعون، دانیالؑ اور بخت نصر، حضرت یحییٰؑ اور ہیروڈ، حضرت عیسیٰؑ اور پیلاطیس کے مقابل سینہ سپر رہتے ہیں اور کلمۃ الحق سے باز نہیں رہتے۔ مال و دولت اور حسیناؤں کی پیش کشیں ہوتی ہیں

مگر اللہ کے آخری نبی ﷺ خاطر میں نہیں لاتے اور آیات قرآنی سے ان تمام پیش کشوں کو ٹھکرا دیا تھا۔ یہ آیات سورہ حم السجدہ کی تھیں جس کا ترجمہ یہ ہے" یہ کلام خدائے رحمان کی طرف سے نازل کیا گیا ہے یہ ایک کتاب ہے جس کی آیات واضح اور صاف ہیں، ایسا قرآن ہے جو عربی زبان میں اتارا گیا"

اعتراض نمبر ۲۸۲

فتح مکہ، غزوہ حنین اور محاصرہ طائف کے بعد بارگاہ نبوی میں وفود حاضر ہونے لگے۔ یہ وفود زیادہ تر غیر مسلم تھے یعنی انھوں نے ابھی اسلام

قبول نہیں کیا تھا۔ اگر چہ ان کا مقصد اسلام میں داخل ہونے کا تھا لیکن قبول اسلام سے قبل کچھ مراعات اور خصوصی تحفظات چاہتے تھے۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی بنوثقیف کا وفد تھا جو آپ کے پاس آیا۔ اسپرنگر کہتا ہے کہ" طائف کے بنوثقیف نے اسلام لانے کے لیے چند شرائط پیش کیں۔ اول یہ کہ ان کا بت لات تین سال تک باقی رہنے دیا جائے اور اس مدت میں انھیں نماز کے لیے مجبور نہ کیا جائے۔ محمدؐ نے جواب دیا کہ یہ مدت بہت طویل ہے۔ مزید برآں نماز کے بغیر دین ہی کیا ہے۔ اس پر نمائندوں نے اپنے مطالبات میں نرمی پیدا کی اور آخر کافی ردوقدح کے بعد فریقین میں یہ شرائط طے ہوئیں کہ

۱: بنوثقیف عشر ادا نہیں کریں گے۔
۲: جہاد میں حصہ لینے سے مبرا ہوں گے۔
۳: نماز میں سجدہ نہیں کریں گے۔
۴: ان کا بت لات ایک سال تک باقی رہنے دیا جائے گا۔
۵: اس مدت کے بعد انھیں مجبور نہ کیا جائے کہ خود اپنے ہاتھوں سے اسے تباہ کریں۔

لیکن آپ ﷺ کو اب تذبذب تھا۔ وہ رائے عامہ سے خوف زدہ تھے۔ اس پر وفد کے نمائندوں نے کہا کہ اس خیال کو آپ اپنے فیصلے میں رکاوٹ نہ بننے دیجیے۔ اگر عرب آپ سے پوچھیں گے کہ آپ نے اس قسم کا معاہدہ کیسے کیا تو آپ کو تو صرف یہ کہنا ہے کہ ایسا اللہ کے حکم کی تعمیل میں کیا گیا ہے۔ یہ استدلال اس نبی کو قابل قبول نظر آیا اور انھوں نے حسب ذیل رسمی معاہدہ املا کرانا شروع کیا۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، رسول اللہ اور بنوثقیف کے درمیان یہ معاہدہ طے ہوا ہے کہ موخر الذکر عشر، زکوۃ ادا کرنے کے پابند نہ ہوں گے۔ نہ ہی جہاد میں حصہ لیں گے اور نہ۔۔۔۔لیکن جب یہ الفاظ ادا کر رہے تھے تو شرم وندامت نے سلسلہ کلام منقطع کر دیا۔ ثقیف کے ایک نمائندے نے کاتب سے کہا کہ جو کچھ کہہ رہا ہوں لکھو۔ کیوں کہ یہ بات طے ہو چکی ہے۔ کاتب نے نبی کی طرف دیکھ کر ان کا حکم جاننا چاہا لیکن اس درمیان عمرؓ جواب تک خاموش تماشائی بنے ہوئے تھے، غیض وغضب میں اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنی

تلوار بے نیام کر کے چلائے تو نے رسول اللہ ﷺ کے دل کو مکدر کر دیا۔ اللہ تم لوگوں کو واصل جہنم کرے۔ بنو ثقیف کے نمائندے جزبز ہو کر بولے ہمارا خطاب تم سے نہیں، ہم محمدؐ سے مخاطب ہیں۔

نہیں۔۔۔ نے آخر کار کہا" میں اس قسم کا کوئی معاہدہ نہیں کروں گا تمھیں یا تو بلا کسی شرط و رخصت اسلام قبول کرنا ہو گا یا پھر جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ بنو ثقیف نے درخواست کی کہ اچھا ہمیں صرف چھ مہینے کی مہلت دیجیے کہ لات کو باقی رکھیں۔ نہیں! صرف ایک ماہ اور اس کے بعد ایک گھنٹے کے لیے بھی نہیں۔ یہ وفد اپنے قبیلے میں اس عالم میں پہنچا کہ اس کے ساتھ مسلمان سپاہی تھے جنھوں نے خواتین کی آہ و بکا کی فضا میں لات کو تباہ کر ڈالا۔ (مستشرقین مغرب کا انداز فکر۔ ۳۱۸)

جواب: اسپرنگر نے نہایت ڈرامائی انداز میں قصے کو گھڑ کر عہد وسطیٰ کی خرافات کو اکٹھا کر دیا ہے۔ اس مکالمہ میں ایسی کیفیت بے ادبانہ اور گستاخانہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ نعوذ باللہ ایک نبی گفت گو نہیں کر رہا بل کہ ایک سوداگر ہے جو سودے بازی کر رہا ہے۔ ایک سیاست دان ہے جو اپنے مقصد کے لیے deal کر رہا ہے۔ ایک حکمران ہے جو اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے compromise کر رہا ہے۔ جس کے نزدیک دین کی کوئی اہمیت نہیں۔ اپنے اقتدار کی خاطر دین میں تغیر و تبدل اور رد و بدل کے لیے بھی تیار ہے اور وحی ایک حیلہ و بہانہ ہے۔ جب کوئی ایسی مشکل پیش آئے اور اس کا حل نظر نہ آتا ہو تب یہ کہہ دیا جائے کہ یہ مجھے حکم اللہ کی طرف سے ملا ہے جس کی تعمیل ضروری ہے۔ گویا مستشرق وحی کو بازیچہ اطفال سمجھتا ہے۔ مسلمانوں کے لیے دین اسلام اوڑھنا بچھونا ہے وہ اس میں ذرہ برابر تبدیلی برداشت نہیں کر سکتے۔ چہ جائے کہ پیغمبر اسلام ﷺ جنہیں اللہ کی طرف سے دین عطا ہوا ہے اور اس کو تمام ادیان پر غالب کرنا منشائے ایزدی ہے وہ بھلا کیسے اس قسم کی رعایتیں دینے کو تیار ہو سکتا تھا۔ ہر گز ہر گز نہیں!

سب سے انوکھی منطق یہ کہ یہ ساری کارروائی مجمع عام اور بھری محفل میں ہو رہی تھی گویا عام لوگ بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ اسلام اور رسالت کی حقیقت کیا ہے؟ اس کے باوجود سب منسلک ہیں گویا نعوذ باللہ اس پورے اجتماع میں کوئی ایک بھی مخلص نہیں ہے۔ مذہب ایک آڑ ہے جس میں حرص و ہوس کے مارے لوگ گرفتار ہیں جنھیں محض مجبور اور بے بس کر دیا ہے کہ وہ اطاعت کریں۔ حضرت عمرؓ سے متعلق جو اس کہانی میں بیان کیا گیا ہے اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ اس جماعت کو خائف اور ڈرائے ہوئے تھے۔ رسالت نعوذ باللہ اس جماعت کی رہنمائی نہیں کرتی بل کہ جماعت کے سرکردہ اور طاقت ور لوگ رسالت کی رہنمائی کرتے تھے۔

تعجب ہے کہ اسلام کی تعلیمات جن امور کی مخالفت کرتی ہیں اور انھیں مٹانے کی ہدایت و تلقین کرتی ہیں۔ معاہدہ کی صورت میں انھیں ماننا یا تخفیفی عمل روا رکھنا یا خصوصی رعایات دینا وغیرہ ظاہر کرتا

ہے کہ جب پیغمبر اسلام ﷺ اور مسلمان چاہیں اپنے مفاد کی خاطر اسلام میں تبدیلی کر لیں۔ گویا دین اسلام خود ساختہ ہے جب کہ عجیب بات ہے کہ بنو ثقیف اسلام کو بغیر جبر کے قبول کرتے ہیں۔ اور موقع ملنے پر بھی اسلام کا دامن نہیں چھوڑتے۔ ان کی نس نس میں اور خون کے ہر ہر قطرے میں اسلام سرایت کر چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وصال نبوی کے بعد جب عرب قبائل منحرف ہوئے لیکن بنو ثقیف اسلام پر استقامت کے ساتھ قائم رہے کیوں؟ اسپرنگر کے بیان کردہ واقعات میں ذرا برابر صداقت بھی ہوتی تو ثقیف انحراف کرنے والوں میں سرِ فہرست ہوتے۔

واقعہ غرانیق کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ ناکامیوں اور مظالم و مصائب کے عناصر نے صلح کرنے پر مجبور کیا تھا۔ ان تقاضوں سے صلح کرنے کی خواہش تھی۔ جس طرح غرانیق کی آڑ میں یہ کہا گیا کہ کفر کی حالت کی طرف لوٹ جانے کی خواہش تھی۔ اسی طرح یہاں الفاظ استعمال کیے بغیر وہی دعویٰ دہرایا جا رہا ہے لیکن دین اسلام مصلحت کیش، مقصد براری، حرص و ہوس اور خوف و ڈر کا مذہب نہیں۔ اس کے ماننے والے اللہ اور اس کے رسول کے جان نثار اور وفادار ہیں۔ وہ کسی قدر و قیمت پر سودا بازی نہیں کر سکتے۔ اس کہانی کا ایک ایک جملہ تنقیص پر مبنی ہے۔ مسلمانوں کی رسالت و نبوت کی اور دین اسلام کی عزت و عظمت گھٹانے کی سر توڑ کوشش کی گئی ہے۔ لیکن وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے۔ نیز فتح مکہ کے بعد جب اقتدار و اختیار آپ ﷺ کے در اقدس پر جبیں سائی کر رہا تھا، اس قسم کی مصلحت کا کیا جواز ہو سکتا ہے؟

اسلام:

اسلام جسے تمام انبیاء بہ شمول آنحضرت ؐ اپنے خالق و مالک کی جانب سے لائے' امن و سلامتی کا دین ہے۔ اس کا مصدر س، ل، م ہے۔ اس کی تعریف میں علامہ ابوالفضل جمال الدین محمد بن مکرم ابن منظور الافریقی اپنی کتاب لسان العرب میں لکھتے ہیں "سلم سے اسلام اور السلامہ ہے جس کا معنی بری ہونا ہے۔ ابن اعرابی کہتے ہیں السلامہ کا معنی عافیت ہے۔ ابوالہیثم کہتے ہیں کہ اسلام اور تحیۃ ہم معنی ہیں اور السلام کا معنی تمام آفتوں سے محفوظ رہنا ہے۔ اسلام اور استسلام کا معنی اللہ تعالیٰ کے احکامات کے آگے سر تسلیم خم کرنا ہے"۔

دوم: قرآن کریم "هُدًى لِّلنَّاس" (لوگوں کی ہدایت کے لیے) ہے اور جس رات اس کا نزول ہوا وہ بھی سلامتی والی ہزار مہینوں سے بہتر رات ہے۔ "خیر من الف شهر"۔ کمال تو یہ ہے کہ خود قرآن کریم کے نازل کرنے والے خالق و مالک کا صفاتی نام بھی "السلام" ہے جس کے معنی "سلامتی دینے والا"۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ سلامتی دینے والے کی طرف سے نازل ہونے والی کتاب ہدایت و سلامتی کی کتاب قرآن کریم کبھی بھی خون ریزی، تشدد و جبر کی تعلیم کا درس نہیں دیتی ہے اور آگ پانی میں نہیں لگاتی۔ ارشاد

ربانی ہے" تَنزِيلٌ مِّنَ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيمِ " (یہ کتاب بے حد رحم کرنے والے مہربان کی طرف سے اتاری ہوئی ہے) قرآن مجید نے جنت کو دار السلام کہا ہے۔

علامہ بیضاوی اپنی تفسیر میں اس کا مفہوم" دار السلام من المکارہ" لکھتے ہیں یعنی ناپسندیدہ اور مکروہ باتوں سے مامون ومحفوظ گھر۔اسی طرح آیت " والله يدعوا الى دار الاسلام " اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے"۔گویا دین اسلام سراسر خیر و بھلائی اور صلح وآشتی کا دین ہے۔ برطانوی مصنفہ کیرن آرمسٹرانگ لفظ اسلام کا معنی یوں بیان کرتی ہیں۔

" The word "ISLAM" comes from the same Arabic root as the word Peace"

"لفظ اسلام عربی کے مصدر سلم بہ معنی امن سے ماخوذ ہے"۔اس تمام مضمون سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ لفظ اسلام امن وسلامتی کا آئینہ دار ہے۔دین اسلام انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے آیا ہے جس سے بنی نوع انسان کو اخلاقیات سے آراستہ کرنا ہے تاکہ امن وامان اطراف عالم میں عام ہو جائے۔کیوں کہ اسلام میں داخل ہونے سے تحفظ انسانی ہے۔جیسا کہ ارشاد ربانی ہے۔" يـأيهـا الذين آمنوا ادخلوا في السلم كافة ولا تتبعـوا خطوٰت الشيطن انه لكم عدو مبين "۔(البقرہ۔۲۰۸)"اے اہل ایمان! پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو یقیناً وہ تمھارا کھلا دشمن ہے"۔

اسلام رنگ ونسل، جغرافیائی حدود، ذات، برادری، لسانی، قومی وملکی امتیازات سے ہٹ کر سب لوگوں سے انصاف وعدل کا درس دیتا ہے۔غریبوں محتاجوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے ساتھ معاشرہ میں جبر وتشدد، شر وفساد اور حقوق کی پائمالی سے روکنے کی ذمہ داری انسانوں پر ڈالتا ہے۔جبھی تو یہ معاشرہ امن وامان کا گہوارا بن سکے گا۔

اعتراض نمبر ۲۸۳

جنگ کو جہاد کا نام دے دیا گیا اور داعی اسلام ایک امن کا حامی ہے اور دوسری طرف جنگیں کرتا ہے یہ تضاد درست نہیں۔

جہاد ناگزیر کیوں ہے؟: انسان تنہا الگ تھلگ پرسکون زندگی بسر نہیں کر سکتا۔مل جل کر رہنا زیست کا حسن اور معاشرہ کی ترقی کا ضامن ہے۔مل جل کر رہنے میں تعلقات بڑھتے ہیں۔معاشرہ کے لوگوں کی بڑھتی تعداد سے تعلقات میں اضافہ ہوتا ہے جس کا لازمی یہ نتیجہ ہے کہ وسائل بڑھتے ہیں۔ مسائل کے حل میں مشکلات پیش آتی ہیں۔اختلاف پیدا ہوتا ہے جس سے خطا ہونے کا امکان موجود ہے۔ معاشرہ بدکردار اور شرپسند لوگوں سے پاک نہیں رہا ہے۔یہ لوگ تمام حدیں پھلانگ جاتے ہیں محض

اپنے مفاد کی خاطر دوسروں کا امن وسکون تہ و بالا کرتے ہیں۔ دوسروں کے حقوق غصب کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ یہ اپنے حق کی خاطر دیگر افراد کو اپنے ظلم وستم کا نشانہ بناتے ہیں مگر سوچتے نہیں کہ ہم بھی تو ان کا حق کھائے جا رہے ہیں۔ انھیں بھی تو جینے کا حق ہے۔ مگر جیو اور جینے دو کے فارمولا پر عمل کرنے سے گریزاں ہوتے ہیں۔ ان حالات میں ایسے شر پسند عناصر اور سر پھروں کی عقل اور سوچ کو ٹھکانے لگانا ضروری ہو جاتا ہے بل کہ مسلمان کے لیے فرض ہو جاتا ہے کہ اپنے حقوق کے تحفظ اور سکون و امن کی زندگی بسر کرنے کے لیے دفاعی اقدام کرے۔ تا کہ معاشرہ کی بقا اور ارتقاء کو اچھی طرح پروان چڑھایا جا سکے۔ اسی لیے جنگ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ایک غیر مسلم کہتا ہے۔

’’ " War is a costituent element of history of mankind"

جنگ تاریخ انسانی کا عنصر ترکیبی ہے‘‘ اسی طرح جیمز جول کہتا ہے’’ جنگ ایک حیاتیاتی ضرورت ہے اور اتنی ہی ضروری جتنی کہ عناصر فطرت میں تنازع للبقاء۔ یہ تنازع للبقاء حیاتیاتی طور پر عناصر کی موزونیت خود عناصر کی طبعی حالت پر منحصر ہے۔ شر پسند عناصر کا قلع قمع معاشرہ کے امن وسکون کے لیے ضروری ہے۔

ارشاد ربانی ہے’ وقتلوا هم حتی لاتکون فتنة‘‘ (ان (کفار) سے اس وقت تک لڑتے رہو یہاں تک کہ فساد نابود ہو جائے)۔

یہ الزام بھی دھرا کہ ایک طرف پیغمبر ﷺ امن کا حامی اور داعی ہے لیکن دوسری طرف جنگیں بھی لڑتا ہے جن میں قتل و غارت اور جانی و مالی نقصان بدیہی امور ہیں۔ جیسا کہ پیچھے ذکر ہوا کہ دین اسلام سلامتی کا دین ہے۔ دینے والا اور لانے والا سلامتی چاہتا ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ پیغمبر ﷺ نے از خود جنگوں کا آغاز کیا تھا اور انھوں نے کسی مفاد کی خاطر تلوار اٹھائی تھی حال آنکہ قتال ان پر فرض کر دیا گیا حکم خداوندی ہے’’ کتب علیکم القتال وھو کرہ لکم‘‘ (البقرہ۔۲۱۶)’’ قتال ان پر فرض کر دیا گیا ہے حال آنکہ تمھیں پسند نہیں ہے‘‘۔ آپؐ نے کبھی بھی قتال کی پہل نہیں کی مگر دشمن کے مذموم عزائم کو خاک بوس کرنے اور معاشرے میں امن وسکون برپا کرنے کے لیے اور اپنے دین کے تحفظ کے لیے ایسے اقدامات کیے جو ضروری تھے۔ چوں کہ ذاتی تحفظ ہر انسان کا بنیادی حق ہے۔ پیغمبر اولاً مخالفین کی سختیاں برداشت کرتا ہے جیسے پیغمبر اسلام ﷺ کبھی دار ارقم اور کبھی شعب ابی طالب کی تنگیاں سہتا ہے۔ طائف والوں کی سنگ باری، نماز کی حالت میں غلاظت بھری اوجھڑی ڈالنا، راستے میں کانٹے بچھانا، آوازے کسنا غرضیکہ آپؐ کو ٹھکانے لگانے کا منصوبہ بنایا جاتا ہے۔ آپ سب کچھ جواں مردی سے برداشت کرتے رہے لیکن یہیں بات ختم نہیں ہوتی پھر آپ کو میدان داری کرنے میدان کارزار میں لے آئے۔ بدر، احد، حنین، خندق و خیبر کے غزوات میں تلوار اٹھانے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اس لیے انھیں حکم ہوتا ہے’’ جو لوگ ایمان لائے وہ اللہ کی

راہ میں لڑتے ہیں اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ ہی طاغوت (باطل معبود) کی راہ میں لڑتے ہیں چنانچہ تم شیطان کے دوستوں سے لڑو، بے شک شیطان کی چال ہمیشہ بڑی کمزور رہی ہے"۔ (النساء۔۷۶)

کیرن آرمسٹرنگ لکھتی ہے "اسلام ایسی جارحانہ جنگ کی اجازت نہیں دیتا جس میں انسانیت کی تباہی ہو۔ اسلام جنگ کے ناگزیر ہونے کو تسلیم کرتا ہے۔ بعض اوقات ظلم و ستم کے سدِ باب کے لیے جہاد فرض عین بن جاتا ہے۔ قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے جنگ اپنی حدود میں رہ کر لڑی جائے اور جہاں تک ممکن ہو اخلاقی اور انسانی اقدار کا پاس کیا جائے۔ محمد ﷺ کو نہ صرف کفار مکہ سے لڑنا مقصود تھا بلکہ اپنے علاقہ کے یہودی قبائل اور ملک شام کے ان عیسائی قبائل سے بھی برسرِ پیکار ہونا تھا جو یہود سے ساز باز کر کے آپؐ کے خلاف جارحانہ تدابیر کرتے تھے۔ لیکن اس صورت حال میں بھی محمدؐ نے ان اہل کتاب سے اغماض نہیں برتا (بلکہ ان پر پوری نگاہ رکھی) جب آپؐ نے اپنے آزاد کردہ غلام زیدؓ کو عیسائیوں کے خلاف مسلمانوں کا امیر لشکر بنا کر بھیجا تو آپ ﷺ نے انھیں فی سبیل اللہ مردانہ وار لڑنے کے ساتھ انسانی اقدار کی پاسداری کا حکم دیا۔ انھیں نہ تو پادریوں، راہبوں اور راہبات پر ہاتھ اٹھانے کی اجازت تھی اور نہ ان ناتواں اور بے چاروں پر جو لڑنے کے قابل نہ ہوں۔ نہ تو امن پسند شہریوں کا قتل ہوگا اور نہ وہ کسی درخت یا عمارت ہی کو نقصان پہنچائیں گے"۔ پیغمبر سراپا خیر و صلح کا پیغمبر ہوتا ہے۔ اسے انسانیت کو اعلیٰ اخلاق سے مزین کرنا ہوتا ہے۔ امن و سکون اور معاشرہ کو خوش حال بنانا ہوتا ہے۔ وہ انسانیت پر توسیع ملک، قومی افتخار، اقتصادی تفوق، دوسروں پر برتری بنانے، جاہ پسندی، لالچ، مفاد دنیاوی وغیرہ کے لیے تلوار نہیں اٹھاتا۔ اسلام رنگ و نسل، ملک و قوم، خاندان و قبیلہ کے امتیازات کو ختم کرتا ہے اور تم میں سے بہترین وہ ہے جو پرہیزگار رہے کا درس دیتا ہے۔ تو کیسے کہہ دیتے ہیں کہ داعی اسلام جو امن کا مدعی ہے جنگیں کرتا ہے؟

پروفیسر آرنلڈ کہتا ہے "قرآن میں کہیں کوئی ایسی آیت نہیں جس میں کسی بھی طرح جبری تبدیلی مذہب کا حکم پایا جائے"۔ وہ مزید کہتا ہے کہ

"روئے زمین کے اس قدر وسیع حصے میں اسلام کی اشاعت کی گئی معاشرتی، سیاسی اور مذہبی وجوہ ہیں مگر اس کامیابی کی سب سے ٹھوس وجہ مسلمان مبلغین کی حد درجہ کوششیں ہیں، چنانچہ انھوں نے کفار اور مشرکین کو دائرہ اسلام میں لانے میں اپنی توانائیوں کو بے دریغ صرف کیا"

وہ مزید کہتا ہے "غرض کہ اسلام ابتداء ہی سے ایک تبلیغی دین رہا ہے جس کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کے دلوں کو مسخر کر کے ان کو اپنا حلقہ بہ گوش بنایا جائے اور اسلامی برادری میں شامل کیا جائے۔ اسلام کا جو طریق کار شروع میں تھا اس طریق کار پر وہ اب بھی قائم ہے"۔ (پیغمبر امن۔۲۱۴۔۲۱۳)

وہ یہ بھی کہتے ہیں "اس مذہبی آزادی کے پیش نظر جو مسلمان حکام نے عیسائی رعایا کو اپنی حکومت

کے ابتدائی دور (بلکہ ہر دور) میں عطا کر رکھی تھی‘ اس عام خیال کو قبول کرنا دشوار ہے کہ اسلام بہ زور شمشیر پھیلا ہے اور ہمہ جبر و اکراہ کی بجائے ان اسباب کو تلاش کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جو ان کے تبدیلی مذہب کا موجب بنے۔ مہاتما گاندھی کہتے ہیں ”میں کسی ایسی ہستی کی سوانح کی تلاش میں تھا جس نے بنی نوع انسان کے کروڑوں دلوں پر غیر متنازعہ مشفقانہ قبضہ کر رکھا ہو اور بالآخر میں اس حقیقت کا قائل ہو گیا کہ یہ تلوار نہیں تھی جس نے اس زمانے میں کارزار حیات میں اسلام کے لیے جگہ بنائی ہو بلکہ یہ پیغمبر اسلام ﷺ کی انتہائی سادگی، جان نثاری، ایثار، معاہدوں کی پابندی، امانت و دیانت، خدا خوفی، بے باکی، اپنے خدا پر مکمل بھروسہ اور اپنے مشن کی صداقت پر یقین جیسی حقیقتیں تھیں۔ انھی تابندہ حقیقتوں نے اپنے سامنے ہر رکاوٹ کو تسخیر کر لیا نہ کہ تلوار نے۔

R.V.C BODLAY لکھتا ہے ”ان سیرت نگاروں نے جو آپ ﷺ کو معاذ اللہ جھوٹا نبی سمجھتے ہیں یہ ظاہر کیا کہ مذہبی جنگ کا پرچار آپ ہی نے کیا ہے۔ ایسا کرنے میں وہ بھول جاتے ہیں کہ ازمنہ قدیم سے جنگوں کا اصل یا ثانوی محرک زیادہ تر مذہب ہی رہا ہے اگر تم نے زبور اور توریت کا مطالعہ کیا ہوتا تو تم کو معلوم ہو جاتا کہ دو ہزار سال قبل حضرت موسیٰؑ نے بھی جنگیں لڑی تھیں اور وہ علاقے قریش سے ہونے والی جنگ کے علاقے سے کچھ زیادہ دور نہ تھے۔ اگر اور آگے آ جاتے ہیں تو تمہیں پتہ چلتا کہ اسرائیلی بادشاہوں نے مذہب کے نام پر جنگیں لڑنے کے سوا اور کوئی کام ہی نہیں کیا۔ تم کو یہ بھی معلوم ہوتا کہ ان جنگوں میں کس قدر قتل عام ہوا تھا۔ آپ کی اپنی جنگوں میں زخمیوں اور مقتولین کی تعداد ان کے مقابلے میں اتنی ہی لگتی ہے جیسا کہ فٹ بال کے میدان میں ایک دو حادثے ہو جائیں“۔

جان بیگٹ گلب نے لکھا ہے کہ ”مسلمانوں کا قریش کے تجارتی قافلوں کو ان پر سیاسی دباؤ ڈالنے کی غرض سے روکنا ایک غیر حقیقی بات ہے لہٰذا یہ کہا کہ محمدؐ اپنے زمانے کے بدوؤں کی طرح (معاذ اللہ) خون خواری اور لوٹ مار کے قائل تھے اور اسی وجہ سے انھوں نے خون خوار عربوں کے طور طریقوں کو رواج دیا محض اختراع ہے۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ پیغمبرؐ کے متعارف کردہ طریقے ان کے اپنے تھے اور بدوی طریقہ ہائے جنگ سے ان کا ذرہ بھر بھی تعلق نہ تھا“۔

کیرن آرمسٹرانگ لکھتی ہے ”اسلام کو تلوار کے دین کا لیبل لگا کر بدنام کیا گیا ہے۔ ایک ایسا دین جس نے تشدد اور عدم رواداری کو مقدس بنا کر روحانیت حقیقی کو ترک کر دیا ہو یہ ایک ایسا مفروضہ ہے جس نے قرون وسطیٰ سے مغربی عیسائی دنیا میں اسلام کو ذلیل قرار دیا ہے اگرچہ اس زمانے میں عیسائی مشرق وسطیٰ میں اپنی جنگوں میں مصروف تھے جنھیں وہ ”مقدس جنگوں“ کا نام دیتے تھے آج عام پڑھی جانے والی کتابوں اور ٹیلی ویژن پروگراموں میں اسلام عموماً Rage of Islam, Sacred

Rage, Holy Terror کے القابات سے متعارف کرایا جاتا ہے جب کہ یہ حقیقت سے راہ فرار ہے اور اسے توڑ مروڑ کر پیش کرنا ہے۔ مغرب میں ہم لوگ محمد ﷺ کو آقائے حرب و جنگ کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ ایسا آقا جس نے دنیا پر اس کے نہ چاہنے کے باوجود اسلام کو بہ زور شمشیر مسلط کرنے کے لیے اپنی تلوار چمکا رکھی ہو، حقیقت اس کے برعکس ہے۔ محمدؐ اور شروع دور کے مسلمان اپنی حیات کی بقا کی جنگ لڑ رہے تھے اور انھوں نے دنیا کو ایسا نظام عطا کرنا تھا جس کے حصول میں (مناسب) تشدد ناگزیر تھا۔ اس لیے اصلاح پر مبنی کوئی بھی کاج اور سیاسی انقلاب خون ریزی کے بغیر برپا نہیں ہو سکتا۔ چوں کہ محمدؐ افراتفری اور لاقانونیت کے دور میں رہ رہے تھے۔ لہٰذا امن و آشتی کو بہ زور شمشیر ہی حاصل کیا جا سکتا تھا۔ امت مسلمہ اب اس قابل ہو گئی تھی کہ اہل عرب کے جبر و تشدد کا بے جگری سے مقابلہ کر کے اس کا استحصال کر دے''۔

مزید لکھتی ہے ''قرآن نے مدنی مسلمانوں کو جہاد پر برانگیختہ کیا جس کا مطلب لڑنا اور مرنا اور خون بہانا ہو سکتا تھا۔ ج۔ ہ۔ د کے مادے میں ''مقدس جنگ'' سے بھی وسیع مفہوم و معنی ہیں اور جسمانی، اخلاقی، روحانی اور ذہنی ہر طرح کی جدوجہد کا نام ہے۔ عربی زبان میں حرب، سریہ، معرکہ اور قتال جیسے بہت سے الفاظ مسلح جنگ کے لیے مستعمل ہیں اور اگر مقصود خون ریزی ہوتا تو قرآن ان الفاظ کو با آسانی استعمال کر سکتا تھا۔ جہاد دین اسلام کے پانچ ستونوں میں سے نہیں ہے جیسا کہ مغرب میں سمجھا گیا ہے بل کہ یہ مسلمانوں پر ایک ایسے فریضے کے طور پر عائد کیا گیا ہے کہ وہ کارزار حیات کے تمام محاذوں پر بالکل چوکس رہیں تا کہ ایک منصفانہ، فلاحی اور خوش گوار معاشرے کی تشکیل کی جا سکے جس میں بے سہارا اور مفلوک الحال لوگوں کا استحصال نہ ہو سکے'' (پیغمبر امن۔ ۲۱۷)

اے ایس ٹریس: مسلمان مجاہدین کو ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں تلوار تھامے ہوئے دکھانے کی تصویر بالکل غلط اور حقائق کے خلاف ہے۔

ڈنکن گرنیلیس کہتا ہے ''اس مذہب کی احترام آدمیت اور فیاضانہ رواداری جو اسے منزل من اللہ ہونے کے ناطے سے تمام مذاہب عالم پر فوقیت بخشتی ہیں۔ انسانیت کے لیے ہمیشہ عظیم الشان میراث رہیں گی اور انہی اساس پر ایک مکمل و اکمل مذہب کی عالم کی بنیاد تعمیر کی جا سکتی ہے''۔

آرنلڈ کہتا ہے ''۔۔۔ مسلم مجاہد کی وہ خیالی تصویر بھی خالی از حقیقت ہے جس کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے ہاتھ میں قرآن دکھایا گیا ہے، اسلام کی روح کا مظہر وہ مسلمان مبلغ تاجر ہیں جنہوں نے نہایت خاموشی کے ساتھ اپنے دین کو روئے زمین کے ہر خطے میں پہنچایا۔ تبلیغ دین کے یہ پر امن طریقے صرف اس زمانے میں اختیار نہیں کیے گئے جبکہ سیاسی حالات میں جبر و اکراہ کے استعمال کو ناممکن

یا خلاف مصلحت بنا دیا تھا بلکہ قرآن کی متعدد آیات میں ایسے پر امن طریقوں کی سخت تاکید کی گئی ہے۔''

ایڈورڈ گبن کہتا ہے ''تمام مذاہب کو بہ زور شمشیر صفحہ ہستی سے مٹانے کا انتہائی نقصان دہ مفروضہ مسلمانوں کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔ضد،تعصب اور جہالت پر مبنی اس نظریے کا بطلان قرآن مجید، مسلم فاتحین کی تاریخ اور عیسائیوں کو ان کی کھلی مذہبی آزادی دینے اور علم رواداری سے ہوتا ہے''۔

اخبار ''تیج ویلی'' کے مدیر لالہ رام ورمانے لکھا ''ہم نے تلوار کا چرچا بہت سنا ہے اور مثال کے طور پر جہاد کا مسئلہ ہمارے سامنے پیش کیا جاتا ہے گویا اسلام کی نشر و اشاعت اور اس کی بقا و ترقی کا انحصار تلوار پر ہے۔ایسا کہنا اسلام کی تردید کرنا ہے۔اس غلط اور شر انگیز عقیدے کے حامیوں نے حضرت محمدؐ کی زندگی کے واقعات کو بالائے طاق رکھ دیا ہے اور صداقت سے اغماض کیا ہے۔اسلام میں تلوار کی وہ جگہ ہے جو کسی مذہب میں بھی ہوسکتی ہے۔اسلام میں تلوار کا استعمال جائز ہے مگر صرف وہیں تک جہاں تک صداقت اور سچائی کی حفاظت کا تقاضا ہو۔اسلام میں امن و آشتی اور صلح و راستی کی جگہ تلوار سے کہیں بڑھ کر ہے۔اسلام تلوار کا نہیں امن کا پیغام ہے''۔

جان بیگٹ گلب لکھتا ہے ''ہم اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ عربوں کی ابتدائی فتوحات میں مسلمانوں نے یہودیوں اور عیسائیوں کو بہ زور شمشیر مسلمان بنانے کی قطعاً کوئی کوشش نہیں کی اور نہ ہی یہودیوں اور عیسائیوں ہی نے تلوار کے زور سے اپنا مذہب تبدیل کیا۔شام فتح ہو جانے کے بعد کئی نسلوں تک شام کے عیسائی اپنے مذہب پر قائم رہے۔لبنان میں آج تک عیسائی بستے آرہے ہیں صرف یہی نہیں بل کہ یہود و نصاریٰ کو اس بات تک کی اجازت دی گئی ہے کہ وہ اپنے اوپر اپنے مذہبی قانون کا اطلاق کریں اور اپنے تنازعات کے فیصلوں کے لیے حاکمانہ عدالت کا اپنی برادری میں سے انتخاب کریں''۔

تلوار کے زور سے وقتی طور کم زور لوگوں کو کلمہ پڑھوایا جاسکتا ہے۔مسلمان بنایا جاسکتا ہے اور لوگ خوف و ڈر کے سبب مسلمان بننے پر راضی ہو سکتے ہیں لیکن دل میں توحید و رسالت کی پختگی پیدا نہیں ہو سکتی۔کیوں کہ بہ رضا و رغبت قبول نہیں کیا جاتا۔دوسری طرف مسلمان حکم الٰہی کے پابند ہیں اور پیغمبر کے لائے ہوئے دین کے پیروکار ہیں۔وہ ذرا برابر احکامات خداوندی سے پیچھے نہیں ہٹ سکتے۔جنھیں یہ ہدایت پہنچی ہو'' لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ''۔(البقرہ۔۲۵۶) ''کوئی زبردستی نہیں دین میں بے شک واضح ہوگئی ہدایت گم راہی سے''سورہ البنات میں ہے ''پس آپ ﷺ انھیں سمجھاتے رہا کریں آپ کا کام سمجھانا ہے آپ ان کو جبر سے منوانے والے تو نہیں ہیں''۔سورہ ق میں ہے ''ہم خوب جانتے ہیں جو وہ کہتے ہیں اور آپ ان پر جبر کرنے والے نہیں ہیں پس آپ نصیحت کرتے رہیے اس قرآن سے ہر اس شخص کو جو (میرے) عذاب سے ڈرتا ہے''۔ابوزہرہ لکھتے ہیں کہ ''یہ بات ثابت نہیں کہ حضور

نے کسی شخص کو زبردستی اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا ہو بلکہ یہ بات ثابت ہے کہ بعض انصار نے اپنے بچوں کو زبردستی حلقہ اسلام میں داخل کرنے کا ارادہ کیا تو حضورؐ نے ایسا کرنے سے منع کر دیا''۔ بہ زور شمشیر اور جبر و تشدد کا الزام تب تو لگایا جا سکتا تھا اگر دین اسلام جبراً کسی شخص کو مسلمان بنانے کی اجازت دیتا جب حکم یہ ہے کہ دین میں جبر نہیں تو پیغمبر اسلام ﷺ اور متبعین اسلام اس حکم خداوندی کو تسلیم نہ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں! وہ تو وہی کرتے ہیں جو اللہ اور اس کا رسول ﷺ حکم دیتا ہے۔

شاید یہ خیال پیدا ہو کہ اگر جنگ بری چیز ہے اور واقعی بری چیز ہے تو پھر اسلام جہاد کرنے کی اجازت کیوں دیتا ہے۔ حالانکہ جہاد بھی جنگ ہی کی ایک شکل ہے جس کا نتیجہ ہلاکت انسان ہے۔

جواب: ہم شکل ہونا ہم حقیقت ہونے کی دلیل نہیں ہے مثلاً قاتل ناحق قتل کرتا ہے پھر ثبوت قتل کے بعد قاتل کو عدالت بطور سزا پھانسی کی سزا دیتی ہے، وہ بھی قتل ہو جاتا ہے، یہ دونوں قتل ایک جیسے نہیں جبکہ پہلا قتل ظلم و زیادتی اور دوسرا قتل عدل و انصاف پر مبنی ہے، اس لیے قتل اور اس طرح ہر جنگ کے حسن و قبح کا فیصلہ مقصد جنگ کے فیصلے پر موقوف ہے، اگر جنگ کا مقصد فتنہ و فساد کو ختم کرنا ہے اور امن و سکون کو عام کرنا ہے تو جنگ کرنا اچھی ہو گی بصورت دیگر اگر جنگ کو سلطنت کے وسیع کرنا اور دیگر ممالک پر تسلط جوانی کی غرض سے ہو گی تو یہ مقصد سراسر برا ہے بلکہ فتنہ کو نئے سرے سے ہوا دینا ہے۔۔۔ چونکہ معرکہ خیر و شر اور حق و باطل ابد سے جاری ہے اس لیے درست سوچ اور باطل فکر لوگوں کے درمیان جنگ ناگزیر ہے۔ ان حالات میں حق کی سربلندی کے لیے اہل ایمان کے ذمے فرض ہو گئی، جو قوتیں جدوجہد کر کے قانون کی بالادستی قائم کریں گی وہ پوری انسانیت کی طرف سے جنگ ہو گی، اس جنگ میں دشمن کا مٹ جانا اس لیے حق ہے کہ عدل زندہ رہے اور دوسری طرف راہ جہاد میں مال و جان صرف کرنا جان آفریں کے حقوق کی حفاظت کے لیے ہے، ان کی فانی زندگی کی قربانی قوم کو امن و سلامتی اور حیات جاوید کی فلاح کے لیے ہو، تاکہ ظلم مٹے اور انصاف کو بول بالا ہو۔ ظالموں کی سرگرمیاں اس قدر خطرناک ہیں کہ مثال کے طور پر کوئی زہریلا پھوڑا کسی عضو پر نکل آتا ہے اور باقی بدن تک اس کے جراثیم پھیل جانے کا خطرہ ہوتا ہے تو باقی بدن کے بچاؤ کے لیے آپریشن کرنا ضروری ہوتا ہے یعنی اس عضو کو کاٹ دیا جاتا ہے، یہی حال انسان کے اجتماعی وجود کا ہے، جب اس کا کوئی حصہ اجتماعی وجود کے لیے خطرہ بن جائے تو اس حصے کو بروقت کاٹنا انسان کے اجتماعی وجود سے ازبس ضروری ہو جاتا ہے، اسی کا نام جہاد ہے، جسے غلط تاویلات اور تشریحات سے انتہا نہیں سمجھا جاتا۔ ڈاکٹر گبن کہتا ہے کہ ''قرآن پارلیمنٹ کی روح ہے اور قانون اساسی ہے، شریعت محمدی ایسے دانش مندانہ اصول پر مرتب ہوئی کہ سارے جہاں میں اس کی مزید نہیں مل سکتی اور مسٹر کارلائل کہتے ہیں کہ شریعت محمدی کے قوانین وضوابط کا لوہا مان جانے

کو آج دنیا بایں ہمہ ترقی علم وحکمت پر مجبور ہے جبکہ شریعت محمدی کی نظیر نہیں ملتی اور قواعد وضوابط بے مثال ہیں تو پھر جہاد بھی شریعت محمدی کا ایک حصہ ہے وہ کیونکر برا اور ہلاکت انسان کا ذریعہ ہوسکتا ہے۔

جنگ شاہاں جہاں غارت گری است
جنگ مومن سنت پیغمبری است

یہود ونصاریٰ اور جہاد: یہود ونصاریٰ تلوار کے استعمال کو ممنوع قرار دیتے ہیں اور اپنے لیے جائز سمجھتے ہیں نیز دنیوی معاملات میں درست اور دینی معاملات میں ناجائز سمجھتے ہیں۔ ضیاالنبی کے مصنف بہ حوالہ کتاب استثناء باب ۷ کی آیت ۱، ۲ میں لکھتے ہیں کہ یہود کو حکم ہے ''جب تمھارا خدا تمھیں اس سر زمین میں پہنچا دے جس پر قبضہ کرنے تم جا رہے ہو اور وہ ''حقیوں'' وغیرہ سات قوموں کو جو تم سے تعداد میں اور قوت میں زیادہ ہیں ان سے ان علاقوں کو خالی کر دے اور تمھارا رب یقیناً ان قوموں کو تمھارے رحم وکرم پر چھوڑ دے گا' تمھیں چاہیے کہ تم ان کو شکست دو تمھیں چاہیے کہ تم ان کو تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھو، تم ان کے ساتھ نہ تو کسی قسم کا معاہدہ کرو اور نہ ہی ان کے ساتھ نرمی اور شفقت کا سلوک کرو''۔ مستشرقین جناب مسیحؑ کی صلح جوئی اور امن پسندی کو اسلام کے اذن جہاد کے خلاف دلیل پیش کرتے ہیں لیکن جناب مسیحؑ بہ قول ان کے اپنا اعلان ان کے الزام کی تردید کرتا ہے مسیحؑ نے فرمایا ''کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں؟ میں صلح کرانے نہیں بل کہ تلوار چلانے آیا ہوں۔ کیوں کہ میں جدائی ڈالنے آیا ہوں، باپ اور بیٹے کے درمیان، بیٹی اور ماں کے درمیان، ساس اور بہو کے درمیان جدائی ڈالنے آیا ہوں''۔

اسلام اور جہاد: مذکورہ مذاہب کے مختصر فلسفہ جہاد کے بیان کے بعد اسلامی جہاد کی حکمت بیان کرنا ضروری ہے کہ اسلام جہاد کی اجازت کیوں دیتا ہے؟ کن حالات میں اجازت دیتا ہے؟ یا اپنے مفادات ومقاصد کی برآری کے لیے جائز سمجھتا ہے؟

ارشاد ربانی ہے'' وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ'' (البقرہ۔۱۹۰) (اور لڑو اللہ کی راہ میں ان سے جو تم سے لڑتے ہیں اور (ان پر بھی) زیادتی نہ کرنا۔ بے شک اللہ دوست نہیں رکھتا زیادتی کرنے والوں کو)

اس آیت کریمہ میں بتایا جا رہا ہے کہ کسی سے لڑنے میں پہل نہ کی جائے البتہ جو لڑے اس سے لڑا جائے اور ذاتی مفاد کی خاطر جنگ نہ کی جائے لڑو تو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے'' الحب لله و البغض لله'' ۔اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ لڑیں تو زیادتی نہ کی جائے، اتنا ہی انتقام لیا جائے جس قدر نقصان پہنچا ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ سورہ انفال آیت ۶۱ میں ہے۔

" وَاِن جَنَحوا لِلسَّلمِ فَاجنح لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ اِنَّهُ هُوَ السَّمِيعَ العَلِيم " ۔(اور اگر کفار مائل ہوں صلح کی طرف تو آپ بھی مائل ہو جایئے اس کی طرف اور بھروسہ کیجیے اللہ تعالیٰ پر۔ بے شک وہی سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے) اس آیت میں بتایا جا رہا ہے کہ صلح کرنے والوں سے لڑنا نہیں چاہیے بل کہ صلح کی طرف مائل ہوں اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھا جائے وہ سمیع وعلیم ہے۔

ایک اور مقام پر ہے " وَقٰتِلُوهُم حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ للهِ فَاِنِ انتَهَوا فَلَا عُدوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِينَ " (سورۃ البقرۃ۔۱۹۳) (اور لڑتے رہو ان سے یہاں تک کہ نہ رہے فتنہ (فساد) اور ہو جائے دین صرف اللہ کے لیے پھر اگر وہ باز آ جائیں تو (سمجھ لو) کہ سختی (کسی پر) جائز نہیں مگر ظالموں پر"۔

لہٰذا جہاد کا مقصد جہاد کے قواعد وضوابط اور کن لوگوں کے خلاف جہاد ہو بنیادی امور ہیں۔ جہاد کے چند ایک ضوابط و آداب پیش کرتے ہیں۔

جہاد کے قاعدے اور ضابطے

اول: سورہ الحج ۴۰۔۳۹ میں ہے " اذن دے دیا گیا (جہاد کا) ان (مظلوموں) کو جن سے جنگ کی ہے اس بنا پر کہ ان پر ظلم کیا گیا اور بے شک اللہ تعالیٰ ان کی نصرت پر پوری طرح قادر ہے۔ وہ (مظلوم) جن کو نکال دیا گیا تھا ان کے گھروں سے ناحق، صرف اتنی ہی بات پر کہ انھوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے اور اگر اللہ تعالیٰ بچاؤ نہ کرتا لوگوں کا انھیں ایک دوسرے سے ٹکرا کر تو (طاقت ور کی غارت گری سے) منہدم ہو جاتیں خانقاہیں اور گرجے اور کلیسے اور مسجدیں جن میں اللہ تعالیٰ کے نام کا ذکر کثرت سے کیا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ ضرور مدد فرمائے گا اس کی جو اس (دین) کی مدد کرے گا۔ یقیناً اللہ تعالیٰ قوت والا (اور) سب پر غالب ہے۔ اس ضابطہ میں بتایا جا رہا ہے

ا: جہاد کی اجازت انھیں عطا کی جا رہی ہے جن پر ظلم ہوئے اور اللہ تعالیٰ کو اپنا معبود برحق مانتے ہیں۔ بتوں اور مورتیوں کی مخالفت کرتے ہیں اس جرم میں انھیں گھروں سے نکالا گیا اور ہجرت پر مجبور کر دیا گیا۔

۲: عبادت گاہوں کی حفاظت کے لیے جن میں اللہ کا ذکر بلند ہوتا ہے، جہاد ضروری قرار دیا۔

دوم: البقرہ۔۱۹۰ میں ہے " اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور (خیال رکھو ان پر کسی طرح بھی) زیادتی نہ کرنا بے شک اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا"۔ اس ضابطہ میں مشروط جہاد کی اجازت ہے۔ ان سے لڑو جو تم سے لڑیں اور زیادتی نہ ہونے پائے۔

سوم: البقرہ۔۱۹۳ میں ہے " اور ان (لڑنے والوں) سے لڑو یہاں تک کہ (ان کا لڑائی اور فساد کا) فتنہ باقی نہ رہے اور اللہ کا دین (اس کی اطاعت کا نظام قائم) ہو جائے۔ پھر اگر وہ (تمھارے ساتھ لڑنے اور حق کی تبلیغ روکنے سے) باز آ جائیں تو ظالموں کے سوا کسی پر سختی جائز نہیں"۔ اس قاعدہ میں بتایا

جا رہا ہے کہ لڑائی کا مقصد صرف اللہ کو برحق معبود مانا جائے۔ دیوی دیوتاؤں اور بتوں' مورتیوں کی عبادت نہ کی جائے کہ وہ الہ نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا دین قائم ہو جائے، فتنہ فساد باقی نہ رہے، ظالم ظلم سے بعض آجائیں تو ان پر سختی نہ کی جائے۔

چہارم: البقرہ۔۱۹۴ میں ہے ''تو جس نے تم پر کوئی زیادتی کی تو تم اس پر اتنی ہی زیادتی کرو جتنی اس نے تم پر زیادتی کی اور اللہ سے ڈرتے رہا کرو اور جان لو کہ اللہ (کی مدد) ڈرنے والوں کے ساتھ ہے''۔ اس قاعدہ میں بتایا گیا ہے کہ اگر کوئی تم سے زیادتی کرے تو بدلے میں اس سے اتنی ہی زیادتی کی جائے جتنی تم پر کی گئی۔ زیادہ زیادتی نہیں ہونی چاہیے اور خواہ مخواہ کسی پر زیادتی درست نہیں اور زیادتی کرنے میں اللہ سے ڈرنا چاہیے۔

پنجم: انفال۔۶۱ میں ہے ''اور اگر کفار صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی صلح کے لیے مائل ہو جاؤ (ان سے صلح کر لو) اور اللہ پر بھروسہ کرو بے شک وہی سننے والا جاننے والا ہے''۔ اس ضابطہ میں مسلمانوں کو ہدایت دی جا رہی ہے کہ اگر غیر مسلم آمادہ صلح ہوں تو ان سے لڑا نہ جائے صلح کر لی جائے۔ اسلام صلح کرنے والے غیر مسلموں کے ساتھ بھلائی کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ (سورہ الممتحنہ۔۸۔۹) میں ارشاد خداوندی ہے۔ ترجمہ: ''اللہ تمھیں ان (کافر) لوگوں کے ساتھ احسان کرنے اور ان کے ساتھ انصاف کا برتاؤ کرنے سے نہیں روکتا جنھوں نے تم سے لڑائی نہ کی اور نہ ہی تمھارے گھروں سے نکالا' بے شک انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے اللہ تو تمھیں ان (کافر) لوگوں سے دوستی کرنے سے روکتا ہے جنھوں نے دین میں تم سے لڑائی کی اور تمھیں تمھارے گھروں سے نکالا اور (یا) تمھارے نکالنے پر (نکالنے والوں کی) مدد کی''۔ قرآن مجید کی آیات بینات سے جہاد کی اجازت ان وجوہات پر ہے۔

الف: مسلمان پر ظلم ہو۔

(ب) مسلمانوں کو اپنے دین پر عمل کرنے اور تبلیغ کرنے کی اجازت نہ ہو۔

(ج) جو محض مسلمان ہونے کی وجہ سے غیر مسلم لڑیں ان سے تو انھیں بھی بچاؤ کی خاطر لڑنا جائز ہے۔

(د) لڑائی میں زیادتی نہیں ہونی چاہیے اگر غیر مسلم ایک پتھر مارے مگر مسلمان اسے دو پتھر مارے یا جان سے مار دے' اس کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔ نیز ایک غیر مسلم نے زیادتی کی اور مسلم اس کی بجائے کسی دوسرے سے بدلہ لے درست نہیں ہے۔

(س) اگر غیر مسلم لڑائی سے باز آجائیں تو مسلمانوں کو بھی لڑائی نہیں کرنی چاہیے۔

(ش) اگر غیر مسلم صلح کرنا چاہیں تو مسلمانوں کو بھی صلح و آشتی کی طرف اقدام کرنا چاہیے کیوں کہ قرآن مجید صلح کو خیر قرار دیتا ہے۔ ''والصلح خیر'' (النساء ۱۲۸)

احادیث کی روشنی میں

اسلام امن و سلامتی کا دین ہے۔ کبھی بھی کسی سے جنگ مول نہیں لیتا لیکن جب جنگ ناگزیر ہو چکی ہو تو اپنا دفاع کرنا ضروری ہو جاتا ہے اگر دفاع نہ کیا جائے تو دشمن حرف مکرر کی طرح مٹا دے گا۔ اس وقت تلوار اٹھانا ناجائز ہی نہیں بل کہ سنت انبیاء پر عمل کرنا اور پیروی کرنا قرار پاتا ہے اور اگر تلوار نہ اٹھائی جائے تو ظلم ہے، اللہ کے احکام کی خلاف ورزی ہے اور اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھنے کے مترادف ہے۔ دین اسلام سے موافقت نہیں بلکہ منافقت ہے۔

دنیا میں قتیل اس سا منافق نہیں کوئی
جو ظلم تو سہتا ہے بغاوت نہیں کرتا

اسلام کا جہاد خیر و بھلائی کا دامن نہیں چھوڑتا۔ جنگ میں بھی امن و سلامتی اور عوام کی حفاظت کا درس دیتا ہے۔ اسلام نے جنگ کے بھی قواعد و ضوابط دیے ہیں جیسے (۱) اللہ کا نام لے کر سفر جہاد پر روانگی۔ (۲) بوڑھے بچے یا عورت کو ہرگز قتل نہ کرنا۔ (۳) خیانت نہ کرنا۔ (۴) غنائم کو اکٹھا نہ کرنا اور حالات درست کرنے کی کوشش کرنا۔ (۵) دشمن کے ساتھ بھی احسان کرنا' بے شک اللہ احسان کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

ایک لشکر کو وداع کرتے ہوئے فرمایا: اللہ کا نام لے کر خدا کی راہ میں جہاد کرنے کے لیے روانہ ہو جاؤ۔ اللہ کے دشمنوں کو تہ تیغ کرنا، خیانت نہ کرنا، کسی سے دھوکہ نہ کرنا، کسی مقتول کی لاش کا مثلہ نہ کرنا اور کسی بچے کو قتل نہ کرنا۔ آنحضرت ﷺ نے خالد بن ولید ؓ سے فرمایا تھا ''بچوں کو قتل نہ کرنا' کسی مزدور کو قتل نہ کرنا۔ آپ ﷺ نے ایک موقع پر وصیت فرمائی: وہ سبز درختوں کو برباد نہ کریں، درختوں کو نہ کاٹیں۔ کم زور بچوں اور عورتوں کو قتل نہ کریں اور ان مردوں کو بھی قتل نہ کریں جو جنگ کے سلسلہ میں رائے نہیں دیتے اور کسی طرح جنگ میں شریک نہیں ہوتے۔ حضرت صدیق اکبر ؓ نے یزید بن سفیان ؓ کو لشکر کی روانگی کے وقت فرمایا! میں تمھیں دس باتوں کی وصیت کرتا ہوں۔ (۱) نہ کسی عورت کو قتل کرنا (۲) نہ کسی بچے کو قتل کرنا۔ (۳) نہ کسی بوڑھے شخص کو قتل کرنا۔ (۴) پھل دار درختوں کو نہ کاٹنا۔ (۵) کھجور کے درختوں کو نہ کاٹنا۔ (۶) درختوں کو نذر آتش نہ کرنا۔ (۷) کسی آبادی کو تباہ و برباد نہ کرنا۔ (۸) کسی گائے یا بکری کو کھانے کے مقصد کے بغیر ذبح نہ کرنا۔ (۹) بزدلی نہ کرنا، خیانت نہ کرنا۔ (۱۰) شہد کی مکھیوں کو نہ جلانا اور نہ ان کو بھگانا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ مسلمان (بھائی) کو

ڈرائے۔(ص ۳۷۴)

صحیح مسلم میں یہ بھی ارشاد ہے ''جو کوئی اپنے بھائی کی طرف ہتھیار سے اشارہ کرتا ہے اس پر اللہ کے فرشتے لعنت کرتے ہیں تا کہ وہ اس سے باز آ جائے''۔

حضرت جریرؓ بیان کرتے ہیں کہ حجۃ الوداع کے موقع پر آپؐ نے مجھے فرمایا ''لوگوں کو چپ کراؤ۔ میں نے چپ کرایا (تو) آپؐ نے فرمایا ''لوگو! میرے بعد ایک دوسرے کی گردنیں مار کر کافر نہ بن جانا''۔

اسلام میں کہیں بھی کھوپڑیوں کے مینار نہیں بنائے گئے ہیں۔ لاشوں کا مثلہ نہیں کیا جاتا ہے۔ کبھی عورتوں، بچوں، بوڑھوں پر ظلم کا ہاتھ اٹھتا نظر نہیں آتا۔ سبز کھیت اجڑتے نہیں بل کہ اسی طرح لہلہاتے ہیں، باغات کو نقصان نہیں پہنچایا جاتا۔ جانوروں کو اذیت دینا ممنوع قرار دیا جاتا ہے۔ کسی سفیر، کسی مسلم شہری حتیٰ کہ غیر مسلم کو بلا وجہ قتل نہ کرنے کا درس دیتا ہے۔ مکہ میں چھوڑی ہوئی جائیداد زمین، مکان، دکان، گھر بار وغیرہ کے متعلق آپؐ نے فرمایا کہ ہر شے سے دست بردار ہو جاؤ۔ سب جان نثاروں نے ایسا ہی کیا کوئی مطالبہ نہ کیا کوئی شے بھی نہ لی۔ بھلا فاتح ہو کر مفتوح سے اپنے مال و دولت ،گھر بار واپس نہیں لیتا اور نہ ہی تلوار لہراتا ہے وہ نیام میں ہی رہتی ہے۔ تاریخ ایسی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی خاطر مسلمانوں نے سب کچھ تج دیا، خیر باد کہہ دیا اور اپنے لیے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو کافی جانا۔ دوسری طرف یہودی قانون جن قوموں کو تباہ کرنے کا حکم دیتا ہے اور جن پر کسی قسم کا رحم کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ ان کا جرم صرف یہ بتاتا ہے کہ خدا نے ان کی سرزمین اپنی لاڈلی مخلوق نسل اسرائیل کے قبضہ میں دے دی ہے۔ اس لیے ان کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ پھر عیسائی مصنفین مسیح کی زبان سے اعلان کروا رہے ہیں کہ وہ سرزمین پر صلح کرنے نہیں آیا ہوں بل کہ تلوار چلانے آیا ہوں۔ الامان! مسلمان کا سب کچھ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی رضا پر موقوف ہے۔

قدم بڑھاؤ ترقی کرو ضرور ولے
رسول کے رہے قدموں پہ سر خدا کے لیے

کیا آپ نہیں جانتے کہ کریم آقا ﷺ نے حنین کے قیدیوں سے کیسا سلوک کیا۔(ن۲ص ۶۹۶) اس سلوک سے تو بنوسلیم اور بنوفزارہ کے لیے ایک انوکھا تجربہ تھا کہ لڑ کر مفتوح ہونے والے قیدیوں کو مفت میں رہائی مل رہی ہے یہی نہیں بل کہ غنیمت میں جن لوگوں کے پاس قیدی تھے آپؐ نے ہر قیدی کے بدلے چھ اونٹ دے کر ان کو بھی رہا کروا دیا۔ پورے چھ ہزار قیدی رہا ہوئے اور ہر قیدی کو آپؐ نے ایک ایک قبطی چادر عطا فرما کر روانہ کیا۔(پیغمبر امن۔۱۱۶)

ذرا فتح مکہ کا منظر اپنی آنکھوں کے سامنے لائیں، وہ قریشی جن کے مظالم پہاڑوں سے بھی بڑے تھے کیا ان کے دست تعدی اور ظلم کی کاروائیوں کے بدلے وہ قتل کی سزا کے مستحق نہیں تھے مگر نہیں' کوئی اور ہوتا تو مکہ میں مغرورانہ انداز میں داخل ہوتا۔ایک ایک سے حساب چکاتا۔ ان افراد کو تہ تیغ کرتا جنھوں نے ذرہ برابر کوئی زیادتی کی تھی۔ شہر میں قتل عام کی اجازت دے دیتا، چن چن کر قتل کر کے اور خون کی ندیاں بہادی جاتیں اور کھوپڑیوں کے مینار بنوائے جاتے۔اہل شہر کی عزتیں اور عصمتیں نیلام ہو جاتیں لیکن وہ کریم آقاً، روف ورحیم آقاً فرماتے ہیں ''لاتثریب علیکم الیوم فانتم الطلقاء'' تم سب آزاد ہو آج تم پر کوئی سرزنش نہیں۔

ایک سوال یہ ہے کہ جو لوگ اشاعت اسلام کو روکنے کے لیے تلوار استعمال کر رہے تھے۔ مسلمانوں کو کاٹ ڈالنے کے درپے تھے تاکہ ہمیشہ کے لیے یہ بے چینی واضطراب کی حالت ختم ہو سکے مگر وہ بدترین ظالم اور خون کے پیاسے دشمن مسلمان کیسے ہوئے؟ کیا انھوں نے بھی تلوار کے ڈر سے اسلام کو گلے لگایا تھا۔اور کیا وہ مسلمان تشدد وجبر کی وجہ سے مشرف با اسلام ہوئے تھے۔حبشہ کا نجاشی عمان کا جیفر، دومۃ الجندل کا اکیدر تلوار کے زور سے اسلام میں داخل ہوئے تھے۔؟ نجد کے وحشی، تہامہ کے بدو اور یمن کے مسکین اسلام پر فخر کرتے نظر آتے ہیں۔عبداللہ بن سلام ورقہ بن نوفل عیسائیت کو خیر باد کہہ کر رسالت کی گواہی دیتے ہیں کہ یہ اللہ کے آخری رسولؐ ہیں۔یہود کا زرخرید ''سلمان منا اہل البیت'' کا اعزاز حاصل کر لیتا ہے۔بت پرستوں کے زرخرید ملازم بلالؓ حبشی کو خلیفہ عمرؓ سیدنا کہہ کر پکارتے ہیں۔ عمرو بن العاص جو نجاشی کے دربار میں قریش کا سفیر بن کر گیا تھا وہی چند سال بعد عمان کے بادشاہ کے پاس داعی اسلام بن کر جاتا ہے۔وہی خالد بن ولیدؓ جو جنگ احد میں بت پرستوں کے رسالے کا کمان دار تھا مسلمانوں کو ختم کرنے کے درپے تھا کچھ عرصہ بعد لات وعزیٰ کو اپنے ہاتھوں سے گراتا ہے اور اسلامی فوج کا جنرل کمان دار بن جاتا ہے۔سیف اللہ کے خطاب سے نوازا جاتا ہے۔قریش کا سفیر (صلح حدیبیہ میں) عروہ بن مسعود خود مدینہ منورہ آکر اسلام قبول کر لیتا ہے۔وہ عمر جو تلوار لے کر گھر سے آنحضرتؐ کا سر قلم (نعوذ باللہ) کرنے نکلا تھا، نہ صرف مسلمان ہوتا ہے بل کہ وصال نبوی کے دن وہی تلوار برہنہ لے کر اعلان کرتا ہے کہ جو کوئی کہے گا کہ آنحضرتؐ نے وفات پائی اس کا سر قلم کر دوں گا۔وہ ابوسفیان بن حرب جو اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کا بدترین دشمن تھا اور آنحضرتؐ کی ہجو میں اشعار کہتا تھا۔جنگ حنین میں وہی اکیلا رکاب نبوی تھامے ہوئے تھا۔اور طفیل دوسی جو مکہ میں روئی کی ڈاٹ کانوں میں لگا کر پھرتا کہ محمد ﷺ کی آواز سے کان محفوظ رہیں بالآخر اپنے وطن میں گھر گھر آپ کی آواز پہنچاتا پھرتا ہے (توحید کا پیغام)

یہی نہیں فتح مکہ کے دن جانی اور بدترین دشمن سر جھکائے کھڑے ہیں۔آپؐ کے چچا کے قاتل،

آپؐ کی بیٹی کو نیزے مارنے والے کھڑے ہیں۔ آپ ﷺ کو احد کی لڑائی میں خون آلود کرنے والے موجود ہیں غرضیکہ ہر ہر شخص اپنے کیے پر شرمندہ ہے اور جانتے بوجھتے تھے کہ ان کے جرائم کی سزا موت ہی ہے اور ہر کوئی یہی سوچتا تھا کہ کچھ دیر میں موت آنے والی ہے مگر اس کریم آقا ﷺ نے فرمایا ''جاؤ تم سب آزاد ہو، آج تم پر کوئی مواخذہ نہیں''۔ (صلوا علیہ وآلہ)

ہر سمت تیرے لطف و عنایات کی بارش
ہر سُو تیرا دامان کرم پھیل گیا ہے

مولانا آزاد کہتے ہیں ''مظلومی میں صبر، مقابلے میں عزم، معاملے میں راست بازی اور طاقت و اختیار میں درگزر تاریخ انسانیت کے وہ نوادر ہیں جو کسی ایک زندگی کے اندر اس طرح کبھی جمع نہیں ہوئے۔ (پیغمبر امن۔۱۰۸)

اعتراض نمبر ۲۸۴

نصاریٰ کو جہاد فی سبیل اللہ پر بڑا اعتراض ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ ''مذہب کے لیے جنگ نہیں چاہیے، رسول اللہ ﷺ نے جو کچھ کیا وہ سکندر اور تیمور کے لیے مناسب تھا مگر انبیاء کی شان کے مناسب نہ تھا''۔

جواب: ان کی شائد یہ غرض مذموم ہے کہ انبیاء کی یہی شان ہے کہ وہ ہمیشہ مغلوب رہیں، قوتیں ان کے مخالفین کے پاس رہیں، وہ جب چاہیں ان انبیاء کو اذیتیں دیں، پریشان کریں، قتل ناحق کریں، آگ میں ڈالیں اور یہ برگزیدہ ہستیاں بے دست و پا، مجبور ومحتاج اور ان کے جور وستم کے سامنے مجبور اور بے زبان رہیں۔ دراصل اس اعتراض میں چھپے راز نصاریٰ کے مذموم عزائم کے شاہد ہیں۔ خداوند تعالیٰ نے جب اپنے خاص بندوں کو فی سبیل اللہ کے لیے تلوار ہاتھ میں لینے کا حکم دیا اور فرمایا: حرص المومنین علی القتال، کہ مومنین کو قتال پر آمادہ کرو تو دنیا کا نقشہ بدل گیا، حق کی سربلندی میں تلوار لہرائی گئی تو دنیا میں تہلکہ مچا، مظالم اور بت پرستی کے گھروں میں صف ماتم بچھ گئی، اقتدار ہاتھ سے نکلتا نظر آنے لگا۔ ایشیا اور یورپ کی طاقتیں ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیتی ہیں۔ ایشیاء کی بڑھتی ہوئی طاقت جسے یورپ کی وطنیت قبول نہیں کر سکتی تھی مگر ان مجاہدین اسلام کے سامنے آنے کی ہمت بھی نہیں تھی، اس لیے یہ ڈھونگ رچایا گیا اور پروپیگنڈا کا طوفان برپا کیا گیا جس میں مسلمانوں کے تمام شریفانہ خصائل وجذبات کو فنا کر دیا۔ اس پروپیگنڈا کے خوف سے مسلمانوں نے وہ باتیں اختیار کیں جن کو اصطلاح عجز، صبر، قناعت اور انکساری کہتے ہیں مگر وہ ناسمجھی اور بے خبری میں بہک گئے اور یہ نا سمجھے کہ یہ چیزیں اس وقت صفات حسنہ میں داخل ہوتی ہیں، جب قوت حاصل ہو اور ان صفات کو اختیار کیا جائے۔ بے اختیار محتاج، فقیر تو یہ کرتا

ہی ہے کیونکہ وہ یہ نا کرے تو اور کر ہی کیا سکتا ہے؟ اس منصوبہ بندی سے مسلمانوں میں ایک جماعت پیدا ہوگئی جو اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے جہاد بالسیف کو جائز نہیں سمجھی اور (نعوذ باللہ) رسول اللہ ﷺ کے غزوات کو اسلامی تاریخ پر بدنما داغ سمجھتی ہے۔ وہ اس داغ کو صاف کرنا چاہتی ہے، لہٰذا اس کے لیے اس نے یہ تاویل گھڑی کہ سارے اسلامی غزوات وسرایا مدافعت اور حفاظت خود اختیاری کے لیے تھے، اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے نہ تھے۔ یہ نظریہ اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔ اسلام میں قتل وقصاص، حدود وقضا بھی جزو مذہب ہے۔ غریب کو امیر سے حق دلانا، ظالم سے مظلوم کو حق دلانا، اپنے پرائے کے ساتھ انصاف برتنا فرض ہے، تو یہ اس وقت ممکن ہے جب اقتدار اور طاقت حاصل ہو، محض مواعظ حسنہ سے اقتدار حاصل نہیں ہوتا ارشاد خداوندی ہے'' وکتبنا فی الزبور ان الارض یرثھا عبادی الصلحون ،(سورۃ۔انبیا۔۱۰۵)'' اور ہم نے زبور میں لکھ دیا ہے کہ زمین کی بادشاہت انبیاء اور انبیاء کے متبعین کے لیے ہے۔'' رسول اللہ ﷺ نے توحید کا اعلان کیا اور تیرہ برس تک وعظ ونصیحت کرتے رہے، نیکی وبدی کے فرق سے آگاہ کیا، آگاہی حاصل ہوئی حق وباطل واضح ہوگیا، حجت کی تمام منزلیں طے ہوگئیں لیکن باطل پرستی کا خاتمہ نہ ہوا تو آپ ﷺ نے حق کی حمایت میں تلوار اٹھا کر عملی اقدام شروع کیا اور اعلان فرمایا'' تعاونوعلی البر والتقویٰ ولا تعاونو اعلی الا ثم والعدوان '' اس سے وہ برائیوں بھرا ملک اچھائیوں کا گہوارہ بن گیا۔ ہمت، دلیری اور عدل سے لوگوں کے سینے معمور ہوگئے، حق آگیا اور باطل کا جنازہ اٹھ گیا اور ہر طرف '' جاء الحق و زھق الباطل ان الباطل کان زھوقا '' کا عملا نفاذ ہوگیا مگر اسلام کے جدید پنڈت کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے جہاد نہیں کیا اور توحید کے لیے جہاد نہیں کیا بلکہ جتنے غزوات ہوئے، جتنے سرائے ہوئے وہ صرف اپنی حفاظت کے لیے کیے گئے، یہ جواب صرف اس لیے دیا جاتا ہے کہ ذہنی غلامی نے ہم کو کہیں کا نہیں چھوڑا۔ دلیری شجاعت اور عدل وانصاف کی صفات ہم سے رخصت ہوگئیں۔ عقل کی پستی میں یہاں لا کھڑا کیا کہ رسول اللہ ﷺ اور ان کے پیرو کاروں کے لیے اعلاء کلمۃ اللہ کا حق اپنی حفاظت اور بچاؤ سے کروڑ ہا درجہ ضروری ہے اور اسلام کے پیروان نے یہ کر دکھایا کہ انہوں نے اپنے تمام مخالفین کو معاف کر دیا جو قبل معاف نہیں تھے مگر خدا کی مخالفت اور شرک کی اشاعت کو پنپنے نہ دیا اور اس کا قلع قمع کر کے دم لیا۔ آلا کا رب کا لعقا رب بھی غیروں کے ساتھ باطل نظریات کے حامی بن بیٹھے۔ اللہ تعالیٰ سیدھی راہ دکھائے۔

اعتراض نمبر ۲۸۵

ہجرت سے پہلے محمدؐ بانگ دہل کہتے تھے کہ مذہب میں کوئی جبر نہیں لیکن جوں ہی طاقت حاصل ہوئی تو تلوار نکال لی جسے پھر واپس نیام میں نہیں رکھا گیا اور ان کے پیروکار بھی ان کے نقش قدم پر چلتے

رہے۔(ولیم میور۔پیغمبر امن:ص۲۰۴)

گولڈ زیہر یہودی کہتا ہے کہ ”محمد نے ایک دم اپنا رخ ان اطراف کی طرف کیا جن کا تعلق دنیا سے تھا۔ چنانچہ وہ دنیا میں تلوار لے کر وارد ہوئے انھوں نے جنگ کا بگل بجایا اور اپنی حکومت قائم کرنے کے لیے ان کی تلوار سے خون ٹپکنے لگا۔اپنے مشن کی کامیابی جس نے زمین عرب کی سیاسی فضا کو یک دم بدل ڈالا انھوں نے اور رہنما کا کردار ادا کیا“۔(حوالہ بالا)

سٹینلے پول: اسلام نے اس وقت مستقل اور عالمگیر دین کی حیثیت اختیار کی جب اس نے زرہ پہنی اور جنگجو بنا“۔(حوالا بالا)

ڈی مار گولیتھ کہتا ہے”اسلام ہجرت کے آٹھویں سال میں تلوار کے زور سے پھیلا“۔

فلپ کے ہٹی: لبنانی مستشرق کہتا ہے کہ اسلام نے ثابت کر دکھایا کہ جسے دنیا تسلیم کرتی آئی ہے کہ یہ ایک جنگ جویانہ سیاست پر مبنی دین ہے۔(حوالہ بالا)

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی سپریم کورٹ میں تاریخ عالم کی عظیم ترین قانون دہندہ ہستیوں کو ایک حجری تصویر میں دکھایا گیا ہے جس میں آنحضرتؐ کے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں تلوار تھامے دکھایا گیا ہے۔ مذکورہ سپریم کورٹ کی داخلی دیوار پر حضرت موسیٰؑ ،حضرت سلیمان،کنفیوشس اور شار لیمان وغیرہ کے ساتھ یہ خود اختراعی قیاسی تصاویر ۱۹۳۲ء سے تا حال آویزاں ہیں۔(حوالا بالا)

جواب:اوپر کے تمام الزامات کا بہ غور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے اور یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اسلام بہ زور شمشیر پھیلا اور لوگوں کو زبردستی مسلمان بنایا گیا۔اور اسلامی جہاد کے نام پر لوگوں کو زبردستی مسلمان بنایا جاتا رہا۔حق و باطل کی کش مکش روز اول سے جاری ہے۔ دونوں قوتیں برسر پیکار اور ایک دوسری کو ختم کرنے اور ملیا میٹ کرنے کے درپے ہیں۔ اگر باطل قوت کے مقابل حق کی قوت کو تلوار اٹھانے سے روک دیا جائے تو اس کو زندگی کے حق سے محروم کرنے کے مترادف ہے۔ جسے جینے کا کوئی حق حاصل نہیں یا وہ موت کو گلے لگالے یا چپ سادھ کر غلامی کی زنجیریں پہن کر ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائے۔لیکن جب کسی کو زندگی کے حق سے محروم کر دینے کا بازار گرم ہو اس وقت تلوار اٹھانا مجبوری اور ناگزیر ہو جاتا ہے۔تلوار کے استعمال سے مستشرقین اسلام پر تشدد و خون ریزی کا الزام لگاتے ہیں جب کہ وہ خود تلوار کے استعمال کو جائز اور مسلمانوں کے لیے اس کے استعمال کو ممنوع سمجھتے ہیں۔ اسے کہتے ہیں”اوروں کو نصیحت خود میاں فضیحت“ گویا اسلام کے خلاف یہ ان کا یک طرفہ فیصلہ ہے۔ نیز یہ بھی کہتے ہیں کہ دنیاوی مسائل میں تلوار کا استعمال درست ہے مگر مذہبی یا دینی معاملات میں جائز نہیں ہے۔ یہ مستشرقین کی بھول ہے۔ یہ ان کا بزعم خویش ایک نظریہ ہے۔اس کا سبب یہ ہے کہ وہ دین کو محدود کرتے ہیں جب

کہ اسلام ایک ایسا دین ہے جو مکمل ضابطہ حیات ہے اور زندگی کے تمام شعبہ جات اس کے تابع ہیں۔ اسلام انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق امر و نہی کی قید لگاتا ہے دین کو محض چند عبادات تک محدود رکھنا اور باقی تمام معاملات کو دین سے خارج کر دینا الحاد کی ایک قسم ہے۔ تمام شعبہ ہائے زندگی اگر دین کے تابع ہیں اور اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں رواں دواں ہیں تو یہ عین عبادت ہے۔ پوری زندگی گزارنے کے لیے دین کے ضابطوں کی پابندی کرنا دین داری ہے اور دین کی ہدایات کے بغیر زندگی بسر کرنا لا دینیت ہے۔ بعینہٖ دین کے مطابق تلوار کا استعمال جائز ہے اور دین کے خلاف تلوار کا استعمال ناجائز بل کہ دین کی خلاف ورزی ہے۔

تمام انبیاء کے نزدیک بھی دین محدود نہ تھا بل کہ انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر محیط تھا۔ اسی سبب سے حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ، حضرت موسیٰؑ باطل قوتوں کے سامنے سینہ سپر رہے۔ ان کا مردانہ وار دین کے مطابق مقابلہ کیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ تلوار کسی کا حق چھیننے یا حق زندگی سے محروم کرنے کے لیے اٹھائی گئی تھی یا اپنے حقوق کے دفاع میں ظلم کو روکنے کے لیے بہ حکم خداوندی شمشیری سہارا لیا گیا تھا؟ بس ان دو باتوں کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو کبھی کوئی یہ نہ کہے کہ فلاں مذہب یا فلاں قوم تشدد پسند اور ظالم ہے اور اس کا اوڑھنا بچھونا جنگ اور شمشیر زنی اور جبراً لوگوں کو مسلمان بنانا ہے۔ اگر ظلم کو روک دیں تو ظلم کو روکنے والا خیر خواہ اور ہم درد ہے۔ کم زوروں کے لیے مددگار ہے۔ معاشرے کی خوش حالی اور امن عامہ کا باعث ہے۔

سٹینلے پول کا اعتراف: حقیقت تو یہ ہے کہ اکثر عیسائی کسی بھی طرح اپنے مذہب اور عقیدے پر زور دینے میں بے قرار نہیں تھے کیوں کہ ان کے ساتھ سابقہ ادوار کی نسبت اسلامی دور میں اب بہتر سلوک ہونے لگا تھا۔ مسلمان حکام کی جانب سے کسی قسم کی رکاوٹ اور خوف کے بغیر انھیں ہر طرح کی مذہبی آزادی حاصل تھی اور اپنے ہمسایہ ملکوں کے ساتھ ہر طرح کی تجارت کرنے کی انھیں اجازت تھی۔ اپنی سابقہ حاکمیت کی بحالی کے علاوہ جواب ناممکن تھی، وہ کوئی اور خواہش کر ہی نہیں سکتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے مسلمان حکومت کے اعلیٰ، فقید المثال اخلاق اور بہترین رواداری سے متاثر ہو کر ان فاتح حکام کو خوش آمدید کہا اور ان سے بھر پور تعاون کیا۔ (پیغمبر امن۔ ۳۲۴) اس کے سابقہ الزام کی اب اس اعتراف سے کوئی قدر و قیمت نہیں رہتی جب کہ اس نے خود ہی اس کا ذکر کر دیا ہے۔

ٹی۔ ٹی۔ ڈبلیو۔ آرنلڈ رقم طراز ہے ''محمدؐ اپنے زمانے کے افراتفری اور طوائف الملوکی کے سماج میں ملی وحدت کے جذبے کو متعارف کرانے میں کامیاب ہوئے۔ باہمی حقوق و فرائض کا ایسا احساس و شعور جس سے اہل عرب قبل ازیں یک سر ناآشنا تھے۔ اس طرح اسلام ان طبقات و قبائل کو آپس میں

الفت ومحبت کی لڑی میں جوڑ رہا تھا جو سالہا سال سے باہم دست وگریباں تھے۔ پیغمبرؐ کے وصال پر ''ہائے افسوس'' کہ محمدؐ ہم سے جدا ہو گئے'' کے الم ناک الفاظ ملک عرب کے ایک قبیلے کا نعرہ بن گئے تھے۔ اس قبیلے کے ہر فرد کی زبان پر یہی کلمات تھے کہ ''جب تک محمدؐ حیات رہے' میں اپنے دشمنوں سے مامون ومحفوظ رہا''۔ (حوالہ بالا۔۳۲۵)

جبراً مسلمان بنانا: ہر کام کرنے کا کوئی ایک مقصد ہوتا ہے، کوئی غرض ہوتی ہے لیکن مسلمانوں کو کسی غیر مسلم کو جبراً مسلمان بنانے میں کوئی غرض نہ تھی۔ مذہبی، سیاسی اور اقتصادی مقاصد نہیں تھے اور نہ ہی سلطنت کو وسیع کرنے اور دوسروں کو غلام بنانے سے کوئی غرض وابستہ تھی۔ وہ تو اپنے رسول اور رسول پر نازل ہوئی کتاب کے ہر حکم کے پیروکار تھے۔ ذرا برابر بھی انحراف ممکن نہیں تھا۔ قرآن میں ہے ''لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی'' (دین میں کوئی زبردستی نہیں بے شک واضح ہو گئی ہے ہدایت گمراہی سے) تو اس فرمان سے کیونکر منحرف ہو کر غیر مسلموں کو تلوار کے زور پر مسلمان بنائیں گے۔ تلوار سے اسلام پھیلا ہوتا تو شکست خوردہ افراد کو کہا جاتا کہ اسلام قبول کر و ورنہ گردن زدنی کے لیے تیار ہو جاؤ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اسپین میں مسلمانوں نے آٹھ سو سال حکومت کی غیر مسلموں سے کسی قسم کی زیادتی نہیں کی۔ بل کہ غیر مسلموں کو اس قدر مسلمانوں پر اعتماد تھا کہ اگر ان پر عیسائیوں کی طرف سے ظلم و زیادتی ہوتی تو وہ مسلمانوں سے امداد طلب کرتے۔ اسپین میں عیسائیوں کی حکومت تھی اور اس کا اہم علاقہ جس کا گورنر کاؤنٹ جولین تھا۔ کاؤنٹ نے اپنی بیٹی فلورنڈا کو طیطلہ میں شاہ راڈرک کے محل میں تعلیم وتربیت کے لیے بھیجا جیسا کہ مسلمانوں کی اندلس آمد سے پہلے یہ دستور تھا کہ امراء سلطنت اور گورنر وغیرہ اپنے بچوں کو شاہی آداب سیکھنے کے لیے شاہی محل بھیجا کرتے تھے۔ جب کاؤنٹ کی بیٹی جوان ہوئی تو راڈرک اس کے حسن پر مرمٹا اور بادشاہت کے نشہ میں چور ہو کر اس کی چادر عصمت کو تار تار کر دیا۔ بیٹی نے بڑی مشکل سے اپنے باپ کو اطلاع دی۔ کاؤنٹ اس بے عزتی پر بادشاہ کا جانی دشمن بن گیا اور انتقام لینے کے لیے موسیٰ بن نصیر سے مدد کی درخواست کی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب مسلمانوں کا شمالی افریقہ پر اقتدار قائم ہو چکا تھا۔ (ضیائے حرم ستمبر ۲۰۰۸ تہذیبوں کا تقابل)

۹۱ھ میں موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد کی کوششوں سے اندلس پر حملہ ہوا' مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی اور وہاں کی مظلوم رعایا کو مظالم سے نجات دلائی۔ قابل غور بات یہ ہے کہ معاملہ کسی مسلمان دوشیزہ کی عفت وعصمت کا نہیں بلکہ ایک عیسائی بادشاہ نے اپنی ہی رعایا کے گورنر کی بیٹی کو ہوس کا نشانہ بنایا تو عوام اور غریب وکم زور لڑکیوں کی عصمت کے نگینوں کو کیسے توڑا جاتا ہو گا؟۔ دوسری طرف یاد رکھیے کہ مسلمانوں کو جبراً مسلمان بنانے اور تلوار سے اسلام پھیلانے کا طعنہ دیا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک تو

عیسائی دوشیزہ کی عصمت ایک مسلمان دوشیزہ کی عصمت کی طرح تھی جنھوں نے غیر مسلم مظلوموں کی حمایت میں اپنے ارباب اقتدار کو ظالموں کے مقابلہ میں لا کھڑا کیا۔ برصغیر میں عقیدہ اور عقیدت کے نام پر مندروں میں دیوداسیوں کا ناچ ہوتا تھا اور پھر پروہت عقیدتوں کے اس توشہ سے اپنا پیٹ ہوس سے بھرتے تھے۔تو اس وقت محمود غزنوی کے اقدامات سے ہندوستان کے لوگوں کو سکھ ملا اور ہندو دوشیزاؤں کی عصمت لٹنے سے محفوظ ہوگئی۔کوئی یہ کہے کہ محمد بن قاسم نے ایک مسلم خاتون کی پکار پر راجا داہر کے خلاف لشکر کشی کی بل کہ مسلمان تو مسلم اور غیر مسلم خاتون کی عزت کو ایک جیسا سمجھتے ہیں۔فرق ہے تو غیر مسلموں نے روا رکھا ہے۔

دور حاضر میں ڈاکٹر عافیہ جو War on Terror کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔ہوس و اقتدار کے بھوکے اپنے سیاسی پنڈتوں نے امریکہ کے سامنے قربان کیا۔اے مسلمانو! ہم ٹھنڈے شربت پیتے ہیں مگر بلگرام کی جیل میں عافیہ پر کیا گزرتی ہوگی۔ برطانوی رکن پارلیمنٹ لارڈ نذیر کے حوالے سے BBC کی رپورٹ ہے کہ اس خاتون کو جیل کے عملے نے مسلسل جنسی زیادتی کا نشانہ بنایا۔ یہ بھی رپورٹوں میں بتایا گیا ہے کہ عافیہ اپنا ذہنی توازن کھو چکی ہے۔کیا ارباب اقتدار ریمنڈ ڈیوس کے بدلے عافیہ کی رہائی پر زور نہیں دے سکتے تھے۔امریکیوں نے اسے گرفتار نہیں کیا تھا بل کہ اپنے محافظوں نے اسے پکڑ کر امریکہ کے حوالے کیا تھا۔امریکہ اپنوں کو ان سے چھڑا لے جائے اور یہ اپنوں کو ان کے رحم و کرم پر ان کے سپرد کر دیں۔اس سے بڑھ کر اور دون ہمتی کیا ہو سکتی ہے؟۔برطانوی صحافی ریڈلی ایک بار طالبان کی قید میں آئی۔گیارہ روزہ قید کی کہانی اپنی کتاب میں لکھتی ہے" طالبان اسے بہن سمجھتے تھے۔اسے پہلے کھانا کھلاتے بعد میں خود کھاتے تھے۔ان کی خواتین اس کے کپڑے دھوتی تھیں۔ریڈلی ان رویوں اور سلوک سے مسلمان ہو جاتی ہے۔ریڈلی اور عافیہ کی کہانیوں سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ دہشت گرد، انتہاء پسند، خون خوار کون ہیں؟

آپ ہی اپنی اداؤں پہ ذرا غور کریں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہو گی

اسلام نے غیر مسلم خواتین کی رہائی کے ساتھ چادریں بھی عطا کی ہیں۔غیر مسلم جانی دشمنوں کی خواتین کو اپنے حرم میں داخل کر کے ان کی تالیف قلبی کی۔پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں؟

جہاں تک جبراً غیر مسلموں کو اسلام میں داخل کرنے کا سوال ہے تو اس سلسلہ میں غیر مسلم سر آرنلڈ کے شہادت پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ " یہ بات کہ ان لوگوں کا قبول اسلام کسی طاقت یا جبر کا نتیجہ نہیں تھا، ان خوشگوار تعلقات سے بھی واضح ہوتی ہے جو اس زمانے کے عیسائیوں اور

مسلمانوں کے درمیان موجود تھے۔ خود (محمد ﷺ) نے کئی ایک عیسائی قبائل سے معاہدات کیے جن کی رو سے آپ ﷺ نے ان کی حفاظت کا ذمہ لیا اور ان کو اپنے مذہب پر آزادی سے عمل کرنے کی ضمانت دی اور ان کے مذہبی پیشواؤں کے ان تمام حقوق اور اقتدار کو قائم رکھا جو انہیں اسلام سے قبل حاصل تھے۔ میثاق مدینہ واضح اور بے مثال دستاویز ہے جو اقلیتوں کو تحفظ دینے کی ضمانت دیتی ہے۔ آرنلڈ آگے لکھتا ہے جب مسلمانوں کی افواج وادی اردن میں پہنچی اور حضرت ابو عبیدہؓ نے فحل کے مقام پر اپنا خیمہ لگایا، تو اس علاقے کی عیسائی باشندوں نے عربوں کو لکھا: اے مسلمانو! ہم تمہیں بازنطینیوں پر ترجیح دیتے ہیں اگر چہ وہ ہمارے ہم مذہب ہیں کیونکہ تم نے ہمارے ساتھ اپنا عہد زیادہ اچھی طرح نبھایا ہے، تم ہم پر زیادہ مہربان ہو، کوئی بے انصافی نہیں کرتے ہو اور ہم پر تمہاری حکومت ان کی حکومت سے بہتر ہے کیونکہ انہوں نے ہمارا مال واسباب اور گھر سب کچھ لوٹ لیا ہے۔'' مسلمانوں کی غیر مسلموں کے ساتھ اچھے برتاؤ، وعدہ کی پابندی اور انصاف کی بہتر شہادت ہے تو پھر یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ مسلمان غیر مسلموں کو جبراً مسلمان بناتے تھے اور ماخذ اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ مسلمانوں نے کسی فرد واحد کو جبراً مسلمان نہیں بنایا ہے بلکہ انہیں اپنے مذہب پر عمل کرنے کی کھلی چھٹی ہے۔ قرآن مجید نے اس کو صراحت سے بیان فرما دیا'' لا اکراہ فی الدین ''

اعتراض نمبر ۲۸۶

یہ بڑا اوزنی الزام ہے کہ مدینہ میں طاقت تھی تب تلوار اٹھائی، مکہ میں کم زور تھے مظالم سہتے رہے اور تلوار کا استعمال نہ کیا۔

۲۔ اسلام انفرادی مذہب ہے۔

۳۔ اسلام میں جمود ہے۔

۴۔ اسلام عرب جاہلیہ کی ''مروۃ'' کا بدلہ ہوا نام ہے۔

جواب: اگر بہ زور شمشیر مسلمان بنانا ہوتا تو فتح مکہ جیسے تاریخی واقعہ کے موقعہ کو ہاتھ سے جانے نہ دیا جاتا۔ لیکن سب سے انتقام نہ لیا اور سارے لوگوں کو معاف کر دیا۔ آپ کے متبعین مسلمانوں نے سپین میں آٹھ صدیوں تک حکومت کی۔ حکمرانی کے باوجود عیسائیت و یہودیت مذاہب ختم نہ ہوئے کیوں کہ انھیں اپنے دین کے مطابق زندگی بسر کرنے کی آزادی حاصل تھی۔ حد تو یہ ہے کہ جب مسلمانوں کو زوال نے آلیا اور عیسائیت نے باگ ڈور سنبھالی۔ اقتدار کی کرسی ملی تو مسلمانوں کے لیے قافیہ تنگ ہو گیا حتیٰ کہ راستے دو ہی بچے اول عیسائیت قبول کر لیں یا اپنے دین کی خاطر آگ میں کود جائیں۔

انڈونیشیا، ہندوستان، چین براعظم افریقہ کے ساحلی علاقے اور صحرائی جہاں کروڑوں مسلمان

رہتے ہیں ان جگہوں میں مسلمانوں کی کافروں سے جنگیں نہ ہوئی تھیں۔ آج کے دور میں امریکہ کی مثال لیجیے وہ جس ملک پر حملہ کرنا چاہتا ہے کرتا اور کرسکتا ہے۔ دوسرے ملکوں میں اسے مداخلت کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں بل کہ وہ اپنا حق سمجھتا ہے تو کیا آج کوئی مسلمان ملک امریکہ والوں کو بہ زور شمشیر مسلمان بنانے کی پوزیشن میں ہے۔ نہیں!۔ لیکن اس کے باوجود امریکہ میں اسلام تیزی سے پھیل رہا ہے۔ یورپین ملکوں میں اذان کی صدائیں گونج رہی ہیں اور روز بہ روز لوگ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں۔ کیا وہ لوگ امریکی تلوار کے زور سے مسلمان ہوتے جا رہے ہیں؟

کارلائل کہتا ہے کہ ''اس بات کو بہت ہوا دی گئی ہے کہ محمدؐ نے اپنے دین کو تلوار کے زور پر پھیلایا۔ اگر دین تلوار کے زور پر پھیلا تھا تو دیکھنا یہ ہے کہ وہ تلوار کہاں سے آئی تھی؟ ہر نئی رائے کے آغاز میں صرف ایک اکیلے شخص کے ذہن میں جنم لیتی ہے۔ ابتداء میں صرف ایک شخص اس رائے پر یقین رکھتا ہے ایک آدمی ایک طرف ہوتا ہے اور ساری انسانیت دوسری طرف' ان حالات میں وہ اکیلا آدمی تلوار لے کر کھڑا ہو جائے اور اپنی رائے کی تبلیغ تلوار کے زور سے شروع کرے تو وہ کچھ نہیں کر پائے گا۔ مختصر یہ کہ ابتداء میں ہر چیز اپنی استطاعت کے مطابق اپنا پرچار کرتی ہے۔ عیسائی مذہب کے متعلق بھی تاریخ ہمیں یہ نہیں بتاتی ہے کہ جب تلوار اس کے ہاتھ میں آگئی تو اس کے بعد اس نے ہمیشہ اس کے استعمال سے پرہیز کیا۔ شارلیمان نے سیکسن قبائل کو تبلیغ کے ذریعے عیسائی نہیں بنایا تھا''۔ کارلائل کہتا ہے کہ طاقت آتی ہے تو تلوار کا استعمال ہوتا ہے تو کیا کارلائل یا کوئی اور بتا سکتا ہے کہ گھر بار، وطن، اولاد، رشتہ دار دین پر قربان کرنے والوں کے ہاتھ جب طاقت آئی تو لوٹی ہوئی ان کی ہر شے کا کسی موڑ پر واپسی کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ ایک آدھ کے سوا آپؐ کی تمام جنگیں دفاع میں ہوئیں اور یہ تمام لڑائیاں خون ریزی، تشدد کر کے دشمن کو مٹانے کے لیے نہیں کی تھیں بل کہ یہ بھی انصاف و ہمدردی کے جذبے سے معمور تھیں۔ ملک میں امن وامان قائم کر کے فتنہ وفساد کا خاتمہ کرنا تھا۔ تیس لاکھ مربع کلومیٹر علاقہ کی فتح کے دوران فریقین مسلم و غیر مسلم کے ۱۰۱۸' افراد قتل ہوئے۔ اتنے بڑے انقلاب میں اس قدر کم مقتول اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ غزوات و سرایا فتنہ وفساد کو ختم کر کے معاشرہ کو امن کا گہوارہ بنانا تھا جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے ''ان (کفار) سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فساد نابود ہو جائے''۔

آپؐ نے معاہدات بھی کیے جو برمبنی امن وامان تھے۔ وہ معاہدہ قبیلہ جہینہ سے ہو یا بنوضمرہ سے، بنومدلج سے معاہدہ ہو یا قریش مکہ سے (صلح حدیبیہ) ہو، تیما کے یہودیوں سے معاہدہ امن ہو یا نجران کے عیسائیوں کے ساتھ معاہدہ یا میثاق مدینہ جو پوری دنیا کے لیے دستور امن ہے۔ اس دستور کا مکمل متن یا کافی حصہ کانریڈ کے دستور (مجریہ۔۱۰۳۷) شاہ الفانسو نیم کے قانون جس بے جا (جو یہ۔۱۱۸۸) میگنا

کارٹا کے منشور اعظم (مجریہ۔1215) برطانوی پارلیمنٹ کے قانون چارہ جوئی (مجریہ۔۱۳۵۵) پارلیمنٹ کے قانون حبس بے جا (مجریہ۔۱۶۷۹) امریکہ کے اعلان آزادی (مجریہ۔۱۷۷۶) فرانس کے منشور انسانی حقوق (مجریہ۔۱۷۸۹) تھامس پین کے حقوق انسانی (مجریہ۔۱۷۹۲) منشور اوقیانوس (مجریہ۔۱۹۴۱) اور اقوام متحدہ کے حقوق انسانی کے منشور (مجریہ۔۱۹۴۸) میں پھیلا ہوا ملتا ہے۔کوئی ریفارمر پیغمبر امن کے اس دستور سے بے اعتنائی اختیار نہیں کرسکا۔ایسا عالمی امن کا دستور جس سے دنیا میں بنائے جانے والے بعد کے منشور بھی استفادہ کرتے چلے آرہے ہیں تو اس داعی اسلام اور پیغمبر امنؐ کے ہاتھ میں تلوار دکھانا اور تشدد وظلم و بربریت کے الزام دھرنا کہاں کی عقل مندی ہے؟ اس نے ہمیشہ صلح وامن میں وسعت پیدا کی اور تاریخ اسلامی شاہد ہے کہ آپؐ نے مختلف قبائل سے معاہدے کیے (اوپر ذکر ہو چکا ہے) جنگ نہیں کی۔تلوار کو بے نیام نہیں کیا۔

آج کی مہذب دنیا میں اس طرح کی کوئی مثال مل سکتی ہے کہ دشمن اور وہ بھی یہود جیسا فتنہ پرور اور فتنہ گر نمبر ایک تھا اور حکومت کی رٹ کو چیلنج کرتا ہے جسے عام الفاظ میں ملک وحکومت سے بغاوت اور غداری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ان کی فتنہ پروری کے باوجود اگر وہ امان طلب کریں۔صلح کی پیش کش کریں۔اسے بلا چون وچرا قبول کرلیا جاتا ہے۔ "هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ" (لاؤ تم دلیل اپنی، اگر تم سچے ہو) (۲۔۱۱۱)

یہ الزام کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا، بوجوہ بے بنیاد ہے۔اول اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے دین میں جبر سے منع فرمادیا ہے، لا اکراہ فی الدین ، آپ ﷺ کی کم وبیش اٹھاسی مہمات سے ایک بھی ایسی مہم نہیں جو اسکی قبیلے یا قوم کے دین کے بدلنے کے لیے بھیجی گئی ہو، دوم یہ کہ مذہب ایک شدید ترین تعصب کا نام ہے جس کی جڑیں روح کی گہرائیوں میں ہوتی ہیں، روح کا نکلنا تو آسان ہے لیکن مذہب کا چھٹنا مشکل ہے، اگر مذہب تلوار سے بدل سکتا ہے تو پھر آیئے تلوار میں دیتا ہوں ذرا تم پشاور سے آگے کوہستانی قبائل میں جایئے اور ان کا مذہب بدل کر دکھایئے، اگر ہم لمحہ بھر کے لیے اس الزام کو مان لیں تو سوال یہ ہے کہ انڈونیشیا میں گیارہ کروڑ، ملایا میں ایک کروڑ، جزائر بحرالکاہل میں اسی لاکھ، چین میں آٹھ کروڑ اور افریقہ میں بائیس کروڑ مسلمان کہاں سے آ گئے، ان میں تو ہماری تلوار کبھی نہیں گئی تھی، ہاں! ہمارے علماء وصوفیا کرام، دیانت دار تاجر اور راست باز مسافر ضرور گئے تھے یہ انہی لوگوں کا حسنِ کردار تھا جس سے کروڑوں انسان مشرف با اسلام ہوئے اور خدائے واحد کے حضور جھک گئے۔(ن۔۴۔۳۷۶)

۲۔ maxime rodinson کہتا ہے کہ اسلام انفرادی مذہب ہے" جبکہ دین اسلام نے ۱۴ سو سال قبل عالمی اور بین الاقوامی برادری قائم کرنے کی راہ دکھائی۔اس برادری کو ایک ضابطہ اخلاق دیا۔

ہر فرد کے حقوق کو پورا کرنے اور حق تلفی سے اجتناب کی تلقین کی اگر چہ دیگر مذاہب اور نظریات کا نقطہ نظر عالمی نہیں صرف وہ ایک مخصوص نسل اور خطہ کے لوگوں کی ترجمانی کرتے ہیں اس لیے دیگر نسلیں اپنے لیے قابل قبول نہیں ہو پاتیں۔ پھر انسانی زندگی کو مختلف دائروں میں تقسیم کر کے دائرہ کار محدود ہو جاتا ہے کوئی انسان کی تقسیم طبقات میں کر کے اپنے کو پس ماندہ طبقے میں محدود کر لیتا ہے اور دیگر طبقات کا وجود حرف مکرر کی طرح مٹا دینے کی سوچ میں مگن رہتا ہے۔ اس منظر نامہ میں اسلام ہی وہ مذہب ہے جو دنیا کے تمام انسانوں کو ایک ضابطہ حیات دیتا ہے۔ عالمی برادری کے قیام کے دروازے اور راہیں کھولتا ہے۔ اسلام رنگ و نسل، علاقائی حدود، ذات پات کی تقسیم مال و دولت اور طاقت اور اقتدار کے تمام امتیازات کو رد کرتا ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے "اِنَّ اَکرَمَکُم عِندَ اللہِ اِتقاکُم سے واضح رہنمائی کے ہوتے ہوئے اسلام کو انفرادی مذہب قرار دینا یا اس کی افادیت کو کسی مخصوص زمانہ یا خطہ تک محدود کرنا کھلی زیادتی ہے کیونکہ یہ وہ عالمی مذہب ہے جو محض ایک فرد کی اصلاح کا بیڑا نہیں اٹھاتا بلکہ صالح افراد کی اصلاح کے ساتھ ساتھ عملی اور نظری طور پر دنیا کے معاشرے کی ترتیب کرتا ہے۔

۳۔ اسلام حرکت و عمل کا مذہب ہے حرکت کو جمود سے تعبیر کرنے کا نظریہ سراسر غلط ہے۔ مسلمانوں کی کسی وقت بھی پس ماندگی کو اسلام کے نام مڈھ دینا محض طعن ہے۔ پس ماندگی بے عملی، وسائل کی کمی کے سبب ہوتی ہے۔ مسلمانوں نے قدرت کے باوجود اپنے دور عروج میں اسلامی تعلیمات کی وجہ سے محکوموں کے ساتھ ظلم و جور کا سلوک روا نہیں رکھا اور نہ ہی ان کے وسائل کو لوٹا اور برباد کیا۔ جبکہ ترقی یافتہ ممالک کی ترقی کا راز دوسرے ممالک کے وسائل پر قبضہ اور ان کی فعالیت پر موقوف ہے اس میں ان کے مذاہب کا عمل دخل نہیں۔ یہی بات اگر اہل مغرب سے کہی جائے تو بے شمار تاریخی ثبوت شہادت دیں گے کہ مغرب نے جب تک اپنا دامن کلیسا سے نہیں چھوڑایا اس وقت تک ترقی کی راہیں مسدود رہی ہیں۔ اپنی کمزوریوں کو دوسرے کے سر تھوپ دینا عقل مندی نہیں۔ اس ضمن میں ایک یہ بات بھی قابل غور ہے کہ "مسلمانوں کی پستی کا ذمہ دار اسلام ہے" جیسا کہ متعدد مستشرقین کہتے ہیں یہ مذکورہ بات ایک نئے انداز سے دہرائی گئی ہے سراسر غلط ہے چونکہ اسلام ہر علاقے، ہر رنگ اور ہر نسل کے لیے ایک قابل عمل نظام ہے اس کے قانون کی پابندی کے لیے کسی بیرونی طاقت کا سہارا نہیں لیا جاتا بلکہ یہ فرد کی اندرونی قوت ہے جو ہر شخص کو پابند رکھتی ہے تو اب ایسا عمل کا نظام کیسے مسلمانوں کی پستی کا ذمہ دار ہو سکتا ہے؟ البتہ مسلمانوں میں قوت عمل میں کمی واقع ہوئی ہے انہوں نے وسائل کو بڑھا کر مسائل کو حل کرنے میں سستی برتی ہے جس کا خمیازہ بھگتنا پڑ رہا ہے یہ اسلام نے پستی نہیں دی بلکہ ان کی سستی اور غفلت کا سر پر سنیچر سوار ہے اور ان کی اپنی پیدا کردہ ہے ان شاء اللہ وہ وقت قریب میں دوبارہ اٹھیں گے

اور اپنے حال کو ماضی کی طرح درخشاں و تاباں بنائیں گے۔ اسلام منفعت دہ اور دفع ضرر ہے۔ فقر و احتیاج کو دور کرنے کے لیے ہر نفع بخش طاقت کو اپنی حفاظت کی خاطر لانے کی راہ دکھاتا ہے۔

۴۔ گولڈزیہر اسلام کو عرب جاہلیہ کی ''مروہ'' کا بدلہ ہوا نام دیتا ہے۔ عرب جاہلیہ کی توحید جس کا ذکر مغرب کرتا ہے، وہ سرے سے توحید ہی نہیں تھی بتوں کے علاوہ سورج چاند ستاروں کی پوجا پاٹ کی جاتی تھی۔ درخت اور پتھر ان کے معبود تھے۔ ہاں مگر اللہ کو معبود اعظم کی حیثیت دیتے تھے۔ اس کا تصور یہ تھا کہ بڑے کاموں کی تدبیر اللہ کرتا ہے لیکن چھوٹے کام دیوی دیوتاؤں کے ذمہ تھے جن سے مختلف الوہیت کی صفات منسوب کر رکھی تھیں۔ اور یہ بھی ان کے عقیدہ میں داخل تھا کہ یہ بت یا محسوس مسجود و معبود قرب الٰہی کا ذریعہ ہیں اور ان کی سفارش موجب نجات ہے۔ اپنے غلط اور باطل عقائد بھی مسلمانوں کے سر مڈھ دینے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں جسے وہ دلائل و براہین کے علاوہ تاریخی حقائق تو مسخ کرتے ہیں ایسی باتیں کسی طور قابل قبول و تسلیم نہیں ہوسکتیں۔

اعتراض نمبر ۲۸۷

بین الاقوامی ماہر قانون پروفیسر نیپولڈ کہتا ہے ''جنگ کا کسی قانون سے کوئی تعلق نہیں' کیوں کہ جنگ میں قانونی تحفظات نہیں، جنگی تقاضے اہمیت رکھتے ہیں''۔ یہ بھی کہا جاتا ہے "Every thing is fair in love and war"

جواب: عہد جاہلیت میں کوئی ضابطہ اور قاعدہ مقرر نہ تھا، مردوں، عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور اپاہجوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا لاشوں کی بے حرمتی کر کے انا کی تسکین اور انتقامی ہوس کی آگ کو بھڑکایا جاتا تھا۔ قیدیوں سے جانوروں کی طرح سلوک کیا جاتا۔ آج کے دور میں کچھ ماہرین نے جنگی حدود و آداب مقرر کرنے کے لیے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے، غور و خوض کرنے کے بعد جنیوا اور ہیگ کنونشنز میں کچھ قاعدے ضابطے بنائے گئے لیکن وہ اصول عظیم جنگوں کی بھینٹ چڑھ گئے۔ اس پر بین الاقوامی ماہر پروفیسر نیپولڈ کہہ اٹھا ''جنگ کا کسی قانون سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ جنگ میں قانونی تحفظات نہیں، جنگی تقاضے اہمیت رکھتے ہیں''۔ پیارے آقا حضور ﷺ نے جنگ میں بھی بے نظیر اصول عطا فرمائے جس پر غلام السیدین کہتا ہے کہ ''محسن انسانیت نے جنگ کو بھی ایک تعلیمی ادارہ بنا دیا'' معرکہ خیبر کے دوران قلعہ نطاۃ کا محاصرہ کر لیا، ایک چرواہا آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور اسلام قبول کر لیتا ہے، اس کے پاس یہود کی بہت ساری بکریاں تھیں، اس نے ان بکریوں کے بارے میں آپ ﷺ سے پوچھا: آپ ﷺ نے حالت جنگ میں امانت و دیانت اور وعدہ ایفاء کے اصول پر آنچ نہ آنے دی ارشاد ربانی ہے ''وَلَا یَجۡرِمَنَّکُمۡ شَنَاٰنُ قَوۡمٍ عَلٰۤی اَلَّا تَعۡدِلُوۡا اِعۡدِلُوۡا ہُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰی

(المائدہ:۸) ترجمہ: کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس امر پر مائل نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو ضرور انصاف کرو کہ یہ تقویٰ کے قریب ہے۔'' آپ ﷺ کی ہدایت پر وہ چرواہا ان بکریوں کو ہانک کر یہودی قلعہ کے قریب چھوڑ آیا اور خود خالی ہاتھ واپس آیا لیکن وہ اب خالی ہاتھ نہ تھا اسلام کی نعمت بے پایاں سے سرفراز تھا، اس سے بڑھ کر یہ کہ اس نے جہاد میں شرکت کی اور جام شہادت نوش کیا، یہ سعادت اتنی عظیم ہے کہ خالد بن ولید نزاع کے وقت رو رہے ہیں پوچھا گیا: کیا موت کے سبب روتے ہو؟ انہوں نے فرمایا: نہیں اس لیے روتا ہوں کہ اتنی جنگیں لڑیں مگر شہادت کی سعادت نصیب نہ ہوئی۔!

حضرت زیدؓ کی قیادت میں ایک سریا حسمیٰ کی جانب گیا ایک ہزار اونٹ، پانچ ہزار بکریاں اور ایک سو بچے قیدی غنیمت میں ملے۔ قبیلے کا سردار زید بن رفاعہ جزامیؓ کچھ ساتھیوں سمیت اسلام کو گلے لگا چکا تھا ،ان کی درخواست پر قبیلہ کا سارا مال واپس کر دیا'' قیدی آزاد کر دیئے ،اس پر پورا قبیلہ مشرف با اسلام ہو جاتا ہے۔ کیا یہ سنہری ضابطے اور قاعدے اسلامی جنگوں میں نہیں ملتے تو پھر کیوں غیر مسلم کہتے ہیں کہ جنگ کا کسی قانون سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ نپولڈ کی یہ بات درست نہیں ہے کیوں کہ اسلام نے جنگی حکمت عملی کے ان مٹ نقوش چھوڑے ہیں جو رہتی دنیا تک کے لیے انمول اصول و قانون ہیں۔ جنگ میں بھی امن، حفاظت اور احساس ہمدردی کو اپنایا گیا ہے۔ پیچھے ان اصولوں پر سیر بحث حاصل ہو چکی ہے۔ مختصر یہ کہ دوران جنگ درختوں کا کاٹنا، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں پر ہاتھ نہ اٹھانا، جو بھاگ نکلے یا ہتھیار ڈال دے یا قیدی بن جائے ان سے اچھا سلوک کیا جائے وغیرہ۔ یہ امور جنگی تقاضوں اور جنگ کا کسی قانون سے کوئی تعلق نہیں کی دلیل اور نظریہ باطل کا رد نہیں ہے۔ جنگ کو امن وحفاظت کا گہوارا بنا دیا۔ اتنا بڑا انقلاب اور کل مسلم اور غیر مسلم مقتول کی تعداد ۱۰۱۸ بنتی ہے۔ عقل تسلیم کرتی ہے اور یہ بھی صرف ایک جنگ میں نہیں بل کہ یہ تیرہ سالہ مدنی دور کی تمام جنگوں کا حساب ہے۔ غلام السیدین کا کہنا بجا ہے کہ ''محسن انسانیت نے جنگ کو بھی ایک تعلیمی ادارہ بنا دیا''۔ دنیا نے دیکھا ہے اور پڑھا ہے جسے تاریخ نے اپنے دامن میں محفوظ کر رکھا ہے کہ آپؐ نے بدر کے قیدیوں کی رہائی کے لیے فدیہ ادا کرنے کا حکم دیا لیکن جو فدیہ ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے' دس دس مسلمان بچوں کو پڑھا دیں۔ یہ ان کی رہائی کا فدیہ تھا۔ ارشاد ربانی ہے ''اگر تم بدلہ لو تو تم اتنا ہی بدلہ لو جتنی تمھیں تکلیف دی گئی ہے''۔ (النحل آیت ۱۲۶)

کسی حسینہ سے محبت ہو جائے اس کے بغیر جینا حرام ہو گیا ہو تو کیا کوئی بادشاہ اپنی ہوس بجھانے کی خاطر اس کی عصمت کو تار تار کر دے، یہ کسی صورت درست نہیں۔ اگر غریب کی یہ حالت ہو جائے تو اسے ایک لمحہ بھر جینے کا حق نہ دیا جائے اور موت کے گھاٹ اتار دیا جائے سراسر غلط ہے۔ قانون سب کے لیے یکساں ہو۔ ایک نظر میں اسلام نے جنگوں کے دوران ہدایات فراہم کی ہیں ان میں سے چند

ایک درج ذیل ہیں۔

۱۔ پھلدار درختوں کا کاٹنا یا آگ لگانا منع ہے۔

۲۔ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں پر ہاتھ نہ اٹھانا اور نہ ہی قتل کرنا ہے۔

۳۔ جو بھاگ جائے یا ہتھیار ڈال دے یا قیدی بن جائے، اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔

۴۔ کسی آبادی کو تباہ نہ کیا جائے۔

۵۔ کسی گائے بکری کو کھانے کے مقصد بغیر ذبح نہ کرنا۔

۶۔ خیانت نہ کرنا۔

۷۔ شہد کی مکھیوں کو نہ جلانا اور نہ بھگانا۔

۸۔ کسی کو دھوکہ نہ دینا، بے وفائی نہ کرنا۔

۹۔ لاش کا مثلہ نہ کرنا۔

۱۰۔ ان لوگوں کو قتل نہ کیا جائے جو جنگ کے سلسلہ میں رائے نہیں دیتے اور جنگ میں شریک بھی نہیں ہوتے۔

۱۱۔ غنائم کو اکٹھا نہ کرنا اور حالات درست کرنے کی کوشش کرنا۔

۱۲۔ دشمن کے ساتھ بھی احسان کرنا، بے شک اللہ احسان کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

۱۳۔ مخالف صلح پر آمادہ ہو تو صلح کی طرف قدم بڑھانا مخالف کے ساتھ اتنی زیادتی کی جائے جتنی اس نے کی۔

۱۵۔ اگر ہو سکے تو دشمن معاف کر دینا۔

اعتراض نمبر ۲۸۸

سر ولیم میور کہتا ہے ’’مسلمان اس بات پر بہت پریشان ہوئے کہ ایک آسان اور قیمتی شکار کے امکانات ایک خون ریز جنگ میں بدل گئے تھے لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ انھیں اب بھی یہ امید تھی کہ وہ لشکر کو شکست دے کر کاروان کو لوٹنے میں کامیاب ہو جائیں گے‘‘۔ (ضیاء النبی۔۷/۵۶۲)

منٹگمری واٹ کہتا ہے ’’بدر کی مہم سمیت یہ مہمیں ڈاکے تھے اور ان کا مقصد یہ تھا کہ غیر ضروری خطرات مول لیے بغیر مال غنیمت اکٹھا کیا جائے۔ مزید کہتا ہے کہ ’’ڈاکے اور جہاد میں فرق صرف نام کی تبدیلی کا ہے اس طرح وہ کام جو دراصل ڈاکہ ہی تھا اس کو مذہبی رنگ دینے کی کوشش کی گئی‘‘۔

جواب: مسلمان ہونے والے لوگوں کی اکثریت عرب بدوؤں پر مشتمل نہ تھی بل کہ ان کا تعلق مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ کے مہذب شہریوں سے تھا۔ اہل مکہ کا ذریعہ معاش تجارت تھا۔ وہ شام سے لے کر

یمن تک تجارت کرتے تھے۔ مدینہ والے زراعت پیشہ لوگ تھے۔ ڈاکہ زنی ان دوشہروں کے باشندوں کا پیشہ نہیں تھا اور نہ ہی ان کے آباؤ اجدا کا پیشہ لوٹ مار اور ڈاکہ زنی تھا۔ اہل مدینہ نے جو آپؐ کے ساتھ معاہدہ کیا تھا وہ یہ تھا کہ جو بھی مدینہ میں آپؐ پر حملہ آور ہوگا اس کے مقابلہ میں ہتھیار اٹھائیں گے اور آپؐ کا پورا پورا ساتھ دیں گے۔ لیکن انصار کی ابتدائی غزوات میں شرکت محض غنیمت اکٹھا کرنے کے سبب تھی کہنا درست نہیں کیوں کہ مستشرقین شاید یہ سمجھتے ہیں کہ مدینہ والوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ دیگر قبائل کے خلاف تلوار اٹھانا اور ان پر حملہ آور ہونے کا انجام کیا ہوگا۔ کسی بھی تجارتی قافلے یا قبیلے پر حملہ کرنے کے انجام سے بہ خوبی واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جن پر حملہ کیا گیا وہ کسی بھی وقت انتقامی کاروائی کے لیے مدینہ پر چڑھ دوڑیں گے۔ اہل مدینہ جنگجو تھے۔ انھیں جنگ کا تجربہ تھا۔ وہ دشمن کی نفسیات سے واقف تھے۔ دشمن پر ڈاکہ ڈالنے کا انجام ان سے پوشیدہ نہیں تھا۔ اس لیے عجیب لگتا ہے کہ انصار غنیمت کے لالچ میں مہاجرین کے ساتھ ڈاکہ زنی میں شامل ہوتے تھے۔ بل کہ ان کا مطمع نظر اور نصب العین یہ تھا۔

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

غزوات وسرایا کو ڈاکہ زنی کا نام اور اسلام کے خلاف اس الزام کو ثابت کرنے کی یہ دلیل دی ہے کہ ڈاکے ڈالنا اور دوسروں کے اموال چھیننا عربوں کا معمول تھا۔ مدینہ طیبہ میں مسلمانوں کے سامنے چونکہ کوئی اور ذریعہ معاش نہیں تھا اس لیے عربوں کے عام دستور کے مطابق انھوں نے ڈاکہ زنی کو ہی اپنا پیشہ بنایا۔ یہ الزام کئی وجوہ سے بے بنیاد ہے۔ اول یہ کہ اسلام نے مسلمانوں کو جہاد کی اجازت ڈاکہ ڈالنے کے لیے نہیں دی بل کہ فتنہ وفساد اور جبر وتشدد کو ختم کرنے کے لیے دی ہے۔ اپنا دفاع کرنے اور تحفظ کے لیے اجازت دی ہے۔ ارشاد ربانی ہے ”اور لڑو اللہ کی راہ میں ان سے جو تم سے لڑتے ہیں اور زیادتی نہ کرنا بے شک اللہ دوست نہیں رکھتا زیادتی کرنے والوں کو“۔ (سورہ البقرہ۔۱۹۰) سورہ البقرہ میں ۔۱۹۴ میں ہے ”تو جو تم پر زیادتی کرے تم اس پر زیادتی کر لو اس قدر جتنی زیادتی اس نے تم پر کی ہو اور ڈرتے رہا کرو اللہ سے اور جان لو یقیناً اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے“۔ (سورہ انفال۔۶۱) ”اور اگر کفار مائل ہوں تو صلح کی طرف تو آپ بھی مائل ہوں اس کی طرف اور بھروسہ کیجیے اللہ پر‘ بے شک وہی سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے“۔

اگر مسلمان ڈاکہ زنی کو اپنا ذریعہ معاش بناتے‘ دوسروں کو مال ہتھیا لیتے، لوٹ مار کر کے فتنہ وفساد کا بازار گرم کرتے مگر یہ ممکن ہی نہیں کیوں کہ انھیں تو حکم دیا جا رہا ہے کہ فتنہ وفساد، زیادتی وظلم کا خاتمہ کیا جائے۔ وہ از خود کیونکر فتنہ پرور اور زیادتی پسند ہو سکتے ہیں۔ اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو وہ مسلمان نہیں ہو سکتا۔ مدینہ طیبہ میں آ کر مسلمانوں نے انصار کی مدد لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ ہمیں بازار کا راستا بتا دیں۔ یعنی

وہ تجارت، کاروبار یا مزدوری کریں گے۔ اپنی مدد آپ کے تحت خود کمائیں گے اور بال بچوں کا پیٹ پالیں گے۔ اگر وہ ڈاکو لٹیرے (نعوذ باللہ) ہوتے تو کبھی بھی بازار کی راہ نہ لیتے جب کہ انھوں نے خود انحصاری پر عمل کیا اور اللہ پر بھروسہ کیا۔ بالآخر حالات بدل گئے۔

مفاد پسند ملک کبھی تیل پر قبضہ جمانے کے لیے لاکھوں انسانوں کو تہ تیغ کر دیتے ہیں۔ کبھی سیاسی اور وسعت پسندی کے مقاصد کی خاطر خون کی ندیاں بہا دیتے ہیں۔ انسانیت کی آزادی کو سلب کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں لیکن وہ پھر بھی ڈاکو نہیں، وہ پھر بھی ظالم اور جاہ پسند نہیں ہیں۔ لیکن وہ جو دنیا کے دکھوں کو بانٹنے والا ہے۔ وہ جو رحمۃ للعالمینی کا پیکر ہے۔ اس پر اور اس کے پیروکاروں پر یہ الزام دھرتے ہیں۔ پھر بھی ''شرم تم کو مگر نہیں آتی''۔

ایک ضمنی اعتراض

منٹگمری واٹ کہتا ہے'' ڈاکے اور جہاد میں فرق صرف نام کی تبدیلی کا ہے۔ وہ کام جو دراصل ڈاکہ تھا اس کو مذہبی رنگ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

جہاد کا لفظ جہد سے مشتق ہے اور معنی ہے وسعت اور جیم کی پیش کے ساتھ جُہد مشقت کے معنی میں مستعمل ہوا ہے۔ ان دونوں مادہ ہائے اشتقاق کی روشنی میں جہاد کا مفہوم یہ ہوگا'' وہ امر خیر جس میں انتہائی طاقت اور وسعت صرف کی جائے اور ہر قسم کی تکلیف و مشقت برداشت کی جائے''۔ شرعی اصطلاح میں جہاد اس محنت و مشقت کا نام ہے جو اعلائے کلمۃ اللہ یعنی دین کی سربلندی کے لیے کی جاتی ہے۔ خواہ یہ کوشش انفرادی ہو یا اجتماعی، زبانی ہو یا قلبی، مالی ہو یا جانی لیکن اس انتہائی جدوجہد اور کمال درجے کی محنت و کوشش میں نصب العین غلبہ دین ہوتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا'' جس نے اس نیت سے لڑائی کی کہ اللہ کا حکم (دین) غالب ہو جائے تو اس کا لڑنا اللہ کی راہ میں (جہاد فی سبیل اللہ) ہے۔ جہاد میں محنت و مشقت اور حقوق کی پاس داری درست ہے بلکہ جہاد زندگی کی بقا، زندگی کی خوش حالی اور حقوق انسانی کا علم بردار ہے جب کہ ڈاکہ محض لوٹ مار و زیادتی کا نام ہے اور جہاد امن و سکون کی نعمت، سکھ کی جان اور حقوق انسانی کا محافظ ہے۔ ظلم کو مٹانے والا ہے۔ عزت، مال و جان، اہل و عیال، گھر، علاقہ، وطن کا تحفظ ہر انسان کے بنیادی حقوق میں شامل ہیں۔ دنیا کا کوئی قانون یا اخلاقی ضابطہ کسی فرد یا جماعت کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ کسی کے بنیادی حقوق کو پامال کر دے۔ اسلام حقوق انسانی کا سب سے بڑا علم بردار ہے اس لیے ان حقوق کے تحفظ کے دفاع کو جائز ہی نہیں بل کہ فرض قرار دیتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔ ترجمہ: ''جن لوگوں سے لڑائی کی جاتی ہے انھیں (جہاد) کی اجازت دی گئی ہے، اس لیے کہ یقیناً ان پر ظلم کیا گیا اور بے شک اللہ ان کی مدد کرنے پر ضرور قادر ہے''۔ یعنی لڑائی کرنے والوں سے جہاد کیا جاتا

ہے۔ جوڈاکہ ڈالتے ہیں لوگوں کا مال ہڑپ کر جاتے ہیں۔ ان کے حقوق کو پامال اور ان کے سکون کو تہ و بالا کر دیتے ہیں۔ ان کے ساتھ لڑنے کی رخصت ہے۔ کہاں از خود لوٹنے اور ڈاکہ ڈالنے کی اجازت ہے۔ ایسی باتیں صرف بدنام کرنے اور اپنے جیسا ثابت کرنے کے سوا کچھ نہیں ہیں۔

آج اہل اسلام کو اندرونی تخریب کاری اور بیرونی جارحیت کا سامنا ہے۔ بیرونی جارحیت نہایت خطرناک ہوتی ہے لیکن اندرونی خلفشار اور دہشت گردی اس سے بڑھ کر انسانی معاشرے کی تباہی کا باعث ہے۔ بیرونی جارحیت غیر مسلموں کی یہ ہے کہ مسلمانوں کے علاقوں پر قبضہ اور بڑے پیمانے پر ان کا قتل عام ہے۔ نام نہاد رہنما کروڑوں ڈالرز کی امداد لینے والے ایک آدھ بھی حرف شکایت زبان پر نہیں لاتے بل کہ ان کے نظریات کی تائید و حمایت میں رطب اللسان رہتے ہیں۔ ''واٹ'' جسے نام کی تبدیلی کا فرق کہتا ہے یہ ہمارے اپنے رہنما بھی جہاد کے نئے نئے مفہوم کا پرچار کر رہے ہیں اور قوم کی نئی نوجوان نسل کو ذہن نشین کروانے میں مصروف ہیں۔ وہ جہاد کا مطلب صرف اپنے نفس سے جہاد کرنے کا لیتے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جب تک دشمن کی جنگی صلاحیت اور جدید اسلحہ جیسا اسلحہ اور صلاحیت حاصل نہیں ہو پاتی تب تک جہاد بالسیف نہیں کیا جا سکتا۔ یہی نہیں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ریاست کی جانب سے اعلان جہاد کے بغیر آزادی کی جدوجہد بغاوت اور فتنہ و فساد ہے۔ مستشرقین کی پیروی کرتے ہوئے غلام احمد قادیانی نے اسلامی جہاد کے خلاف ہرزہ سرائی کی اور اس کے وسیع معانی کو علمی مشقت و دماغ سوزی اور سماجی بہبود تک محدود کر دیا۔

سر سید احمد خاں نے مغربی انداز فکر اپناتے ہوئے جہاد سے انکار کیا۔ نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی نے اسلام تلوار سے پھیلا اور یہ کہ مسلمانوں نے غیر مسلموں کو جبراً مسلمان بنایا کے جواب میں معذرت خواہانہ رویہ اور انداز اپنا کر کے جہاد اسلامی کی خصوصیات ہی نہیں، اس کے بنیادی تصور ہی کا انکار کر دیا ہے۔ مولوی چراغ علی نے بزعم خویش مستشرقین کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے سورہ انفال کی متعدد آیات کا انکار کر دیا جن میں جہاد اور قتال کے کلمات بار بار مترادف کے طور پر آئے ہیں۔ ان میں اہل اسلام کو کفار کی طرف سے پہل کرنے پر اور فتنہ و فساد کو ختم کرنے کی صورتوں میں جہاد بمعنی قتال ہی کی اجازت مرحمت فرمائی گئی ہے۔ (ضیائے حرم ستمبر ۲۰۰۸)

اس طرح مجید خدوری ایک عراقی عیسائی اپنی کتاب islamic law of nations میں جہاد کی یوں تعریف کرتا ہے، jihad is a collective duty imposed upon muslims to fight the unbelievers where he is: اسلام نے جارحیت کی کی سختی سے ممانعت کی ہے البتہ دفاعی جنگ کی اجازت ہے قران مجید میں ہے '' وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ (۲۔۱۹۰) یعنی ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم

سے جنگ کرتے ہیں اس کے معنی دفاعی جنگ کے ہوں گے، قاتلو فی سبیل کا مطلب ہے کہ جنگ صرف اللہ کے لیے ہو اپنے دنیاوی فائدے اور منفعت کے لیے نہ ہو، اسے جہاد کہتے ہیں۔ باوجود جنگ شروع ہونے کے ''تعدی اور تجاوز نہ کرو'' بلکہ ایک ایسا برتاؤ ہو جو انسانیت کے لحاظ سے قابل قبول ہو۔ جب جارحانہ جنگ کی اجازت ہی نہیں تو پھر امن بقائے باہمی کے سلسلہ میں کوئی مشکل و دشواری پیش نہیں آتی۔ حدیث پاک میں ہے ''اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِہٖ وَیَدِہٖ ''مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔

مجید خدوری کا بیان درست نہیں کہ to fight the unbeliever where he is جب تک اس کی تشریح نہ کی جائے اس وقت تک یہ بیان گمراہی ہے۔ ہاں! یہ بات درست ہے کہ اگر جنگ کا اعلان ہو چکا تو دشمن کے لوگ جہاں بھی ہوں، ہمیں ان سے جنگ کرنا جائز ہے اور ہمارا حق ہے، لیکن یہ حق ہمارے دشمن کو بھی حاصل ہے، ایسا نہیں کہ اپنے لیے جائز اور دوسروں کے لیے ناجائز۔

اعتراض نمبر ۲۸۹

کسی طور پر جہاد کی نہ اسلام میں اجازت ہے اور نہ اہل اسلام نے کبھی ایسا کیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے'' و قاتلوا فی سبیل الله الدین یقاتلولکم'' (اور خدا کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں) یعنی مسلمان تو لڑتا ہی نہیں۔ لڑتا ہے جب اسے مجبور کیا جاتا ہے۔

مولوی چراغ علی کو اصرار ہے کہ جہاد کے اصل معنی وہی ہیں جو زمانہ جاہلیت کی عربی شاعری اور اس کی سورتوں میں مراد لیے گئے تھے جن کی رو سے جہاد نام ہے محنت اور خوب کوشش کرنے کا۔ جہاد بمعنی قتال کے متعلق وہ کہتے ہیں یہ نوتراشیدہ معنی متاخرین کی اختراع ہیں۔ یہ متاخرین ہیں جنھوں نے اصطلاحی اور غیر وضعی مفہوم کو ترجیح دے کر اس کو مذہبی جنگ کے معنی پہنائے ہیں''۔

دیکھا قارئین کرام ''واٹ'' کی ہمنوائی کر رہا ہے۔

جواب: یہ بالکل درست بات ہے کہ جو لوگ جہاد کے رکن اسلام ہونے کا انکار کرتے ہیں یا اسے لغوی معنی تک محدود رکھنے کے لیے قرآن حکیم، احادیث، تعامل صحابہ اور اجماع امت کی بجائے زمانہ جاہلیت کی شاعری کو دلیل بناتے اور مانتے ہیں۔ انھیں بھی سطوت و شوکت اسلام اسی طرح ناگوار محسوس ہوتی ہے جس طرح مغربی محققین اور سیاسی رہنماؤں کو ناپسند ہے۔ اس لیے یہ مذہبی پنڈت حفاظت دین کے لیے مسلمانوں کے جذبہ جہاد کو سرد کرنے کے لیے جہاد کے معانی و مفاہیم کو ہی بدل دیتے ہیں یا اس کے لیے عجیب و غریب مراحل کو پہلے طے کرنے پر زور دیتے ہیں تاکہ نہ وہ مراحل (

صلاحیت جنگی، اسلحہ اور حکومتی اجازت) طے ہوں اور نہ جہاد کا مرحلہ آئے۔ وہ مسلمانوں کو قرآنی حکم کے مطابق ہر لحظہ دشمنان اسلام کے خلاف جہاد کے لیے حالت تیاری میں رہنے کی بجائے ان کے دلوں میں کفار کی عسکری فوقیت و برتری اور اعلیٰ قسم کے ہتھیاروں کی دھاک بٹھانے اور صرف دیگر عبادات (نماز، روزہ) پر توجہ مرکوز رکھنے پر زور دیتے ہیں تا کہ مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کو ممکنہ خطرات سے بچایا جا سکے۔ اقتصادی ترقی کی اہمیت جتلا کر جہاد سے روگردانی کی یہ تعلیمات سرکاردوعالم ﷺ سے متصادم ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ''جب تم سودی کاروبار کرو گے اور گائیوں کی دمیں پکڑ لو گے اور کھیتی باڑی میں مگن ہو جاؤ گے اور جہاد کو ترک کر دو گے تو اللہ تعالیٰ تم پر ذلت مسلط کر دے گا۔ یہ ذلت نہ ختم ہو گی جب تک تم اپنے دین کی طرف لوٹ نہ آؤ گے''۔ ایک اور حدیث مبارک میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''قریب ہے کہ قومیں تم پر اس طرح حملہ آور ہو جائیں جس طرح کھانے والوں کو کھانے کے برتن کی طرف بلایا جاتا ہے، تو کسی نے کہا: اس روز یہ ہماری تعداد کی کمی کی وجہ سے ہو گا، نہیں حضور ﷺ نے فرمایا ''اس روز تمہاری تعداد بہت ہو گی لیکن تم سیلاب کے خس و خاشاک کی طرح ہوں گے اور اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے سینوں سے تمہاری ہیبت ختم کر دے گا اور (اللہ تعالیٰ) تمہارے دلوں میں واھن ڈال دے گا، کہنے والے نے کہا یارسول اللہ: یہ واھن کیا ہوتا ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: دنیا کی محبت اور موت سے نفرت۔

اعتراض نمبر ۲۹۰

ڈاکٹر فضل الرحمان اپنی معروف کتاب "History of Religion Islam" میں جہاد کے متعلق لکھتے ہیں۔

" Among the latter Muslims legal schools, However it is only the fanatic kharijites who have declared Jihad to be one of the pillars of the faith"

''متاخر مسلم فقہی مکاتب میں سے یہ صرف انتہا پسند خارجی تھے جنھوں نے جہاد کو ارکان اسلام میں سے ایک رکن قرار دیا''۔

جواب: دراصل خوارج مسلمانوں کے کسی فقہی مکتب سے نہیں تھے۔ بل کہ ان کے اختلافی موضوعات کلامی اور سیاسی نوعیت کے تھے۔ انھیں کلامی مکتب تو کہا جا سکتا ہے، فقہی ہرگز نہیں۔ نیز جہاد کے رکن اسلام ہونے کی حیثیت کا علم قرآن حکیم اور احادیث مبارکہ سے ہوتا ہے جن میں نماز، روزہ اور حج کے بعد سب سے زیادہ زور جہاد پر دیا گیا ہے۔ لہٰذا ڈاکٹر مذکور کا جہاد کو رکن اسلام ماننے سے انکار محل

نظر ہے۔اب ان علماء کے انکار پر سیف اللہ خالد کا تبصرہ ملاحظہ کیجیے جو جہاد کی اہمیت کم کرنے میں پیش پیش ہیں۔وہ اپنی کتاب ''مقالات جہاد اعتراضات وشبہات کا ازالہ'' کے صفحہ ۲۵ پر ''تبلیغی جماعت کے ترک جہاد'' کے زیرِ عنوان فکری جہاد کے خودساختہ فلسفوں پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''اس کی ایک مثال تبلیغی جماعت ہے۔انھوں نے اسلام میں سے چند نکات جوڑ کر ایک خاص شکل بنائی ہے ان کی واضح غلطی یہ ہے کہ انھوں نے اسلام کی بنیادی چیزوں کو یہ کہہ کر چھوڑ دیا ہے کہ ہم ابھی ایسے دور میں تبلیغ کا کام کر رہے ہیں جس میں نہی عن المنکر اور جہاد وغیرہ کام نہیں آتے۔مثلاً ان سے پوچھا جاتا ہے کہ بھائی تم جہاد کو کیوں معطل کرتے ہو؟ تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو جہاد کرتے ہیں اور وہ جہاد بالنفس ہے اور جہاد کی تمام قرآنی آیتوں کی تاویل کرتے ہیں۔احادیث رسول اور نبی مکرمؐ کے جہادی سفروں کے تمام واقعات کو تبلیغی خروج پر منطبق کرتے چلے جاتے ہیں۔لہٰذا یہ فلسفہ اسلامی کاز (cause) کے لیے فائدے سے زیادہ نقصان کا باعث ہے''۔

اعتراض نمبر ۲۹۱

مارگولیس کہتا ہے کہ '' حکومت اسلامی کی وسعت اور استحکام سے بدوی قبائل نہایت خائف تھے۔جن کو ریگستان کی آزادی بہت عزیز تھی''۔(سیرۃ النبیؐ۔صفحہ ۳۰۴)

جواب: لڑائی کی جڑ یہ تھی کہ کفار و مشرکین آپ ﷺ کی دعوت اسلام سے بیزار تھے، اپنے بتوں کی مذمت سے چیں بجبیں تھے اور کسی طور بھی صرف اس کلمہ لا الہ الا اللہ کو تسلیم نہیں کرتے تھے اس حد تک کہ جان سے جا سکتے تھے۔اب دیکھنا یہ ہے کہ اگر یہی وجہ تھی تو باقی کے دھرے الزام بداہتاً غلط ہو جاتے ہیں ۔ مارگولیس کے الزام میں کچھ ظاہری اور باطنی اشارے ہیں۔اوّل حکومت اسلامی کی وسعت اور استحکام یعنی مسلمان اپنی سلطنت کو وسعت اور مستحکم کرنا چاہتے تھے۔اس لیے تلوار اٹھائی اور جہاد کرنے کی ٹھانی۔

دوم: بدوی قبائل اس وسعت سے خائف تھے کہ انھیں اپنے خطہ اراضی کی حکومت، جائداد وغیرہ سے بے دخل ہونا پڑے گا۔

سوم: ان کی ریگستانی آزادی چھن جائے گی جو انھیں نہایت عزیز تھی۔آیئے ان باتوں کا جائزہ لیں۔

قریش مکہ نے وہ کون سا ظلم تھا جو مسلمانوں پر روا نہ رکھا۔وہ کون سی تکلیف اور آزمائش تھی جو ان پر نہ ڈھائی گئی ہو۔وہ کون سا لالچ تھا جو انھیں نہیں دیا گیا۔نوبت یہاں تک پہنچی کہ آنحضرت ﷺ کو جان سے مار دینے کے لیے درِ نبوت پر پہرہ بٹھا دیا (نعوذ باللہ) مگر ہر مرحلہ پر بے درد قصائی کیا جانے پیڑ

پرائی، واقعی قریش نا کام و نامراد ہوئے اور پیغام توحید کے داعی کے پائے استقلال میں ذرہ برابر لغزش نہ آئی۔ یہی نہیں بل کہ اہل مکہ نے انھیں ہجرت کر جانے کے بعد تقریباً چار سو میل دور بھی مدینۃ النبی میں بھی چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ وہ مسلمان جو حبشہ ہجرت کر گئے ان کا تعاقب کیا اور ملک حبشہ پہنچ کر وہاں کے بادشاہ نجاشی سے کہا کہ انھیں ہمارے حوالے کر دیا جائے مگر اس نے کفار کے ہاتھوں ان مسلمانوں کو سپرد کرنے سے انکار کر دیا۔

مسلمانوں نے چپ چاپ بغیر کسی فریاد و دہائی کے مال، مویشی، دولت، جائداد۔ مکان، دکان صرف اور صرف دین اسلام کی خاطر سب کچھ تج کر کے پہلے حبشہ پھر مدینہ ہجرت کی۔ اب صورت حال اور بھی گھمبیر ہو چکی تھی کہ کفار سے اپنی جان و مال کی حفاظت کے لیے سوائے جنگ کے کوئی چارہ کار نہ تھا۔ اگر مدافعتی اقدام نہ کرتے ان کے سامنے نہ آتے تو بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کر دیے جاتے۔ سب سے بڑھ کر یہ نقصان ہوتا کہ پیغام توحید کی منادی کرنے والا کوئی نہ بچتا۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی حالت پر رحم فرمایا اور جہاد کی اجازت دی تا کہ مظلوم اپنی جان کی حفاظت کر سکیں۔

اُذن:۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ''جنگ کرنے والوں کو اجازت دی جاتی ہے کیوں کہ ان پر ظلم ہوا اور اللہ ان کی مدد پر بے شک قادر ہے۔ یہ لوگ اپنے وطن سے بلاوجہ صرف اس لیے نکالے گئے کہ انھوں نے اللہ کو اپنا رب مان لیا ہے اور اگر بعض لوگوں (حملہ آوروں) کو بعض لوگوں (مسلمانوں) سے اللہ تعالیٰ دفع نہ کراتا تب ضرور عیسائیوں کے گرجے، یہودیوں کے معابد اور ترسا کے مندر اور مسلمانوں کی مسجدیں جن میں اسم الٰہی کا ذکر کثیر ہوتا ہے، گرا دی جائیں''

اجازت جہاد کی وجوہات:

اول: مظلوم کو اپنے دفاع کا حق ہے۔

دوم: اللہ تعالیٰ کو اپنا رب مان لینے پر گھروں سے نکال دیا گیا۔ املاک سے بے دخل کیا گیا۔ یہ کسی صورت میں درست نہ تھا۔ جیسا ایڈورڈ ہفتم نے پچاس سالہ جشن ہند پر اپنی رعایا کو حکومت کا یہ پیغام دیا تھا کہ ''اس پچاس برس کے عرصہ میں کسی بھی شخص کو محض اختلاف عقیدہ کی وجہ سے اذیت نہیں دی گئی''۔ لیکن مسلمانوں کو قربانی کا بکرا بنایا گیا۔

سوم: مسلمانوں کو ذاتی، مذہبی یا قومی مفاد کے لیے اجازت نہیں دی گئی تھی بل کہ اس لیے کہ جو معاہدات یہود و نصاریٰ اور دیگر قوموں سے کیے تھے۔ ان معاہدات میں ہر ایک کو مذہبی آزادی دی گئی تھی۔ اب معاہدہ کی پاس داری نہ ہوتی تو سب مذہبوں کی آزادی ختم ہو جاتی جس کے سبب ان کی

عبادت گاہیں ملیا میٹ اور خاک میں مل جاتیں۔ شاید کسی کے ذہن میں یہ خیال ابھرے کہ مکہ میں مسلمان قلیل تعداد میں تھے۔ مقابلہ کے لیے سامنے نہ آئے مگر جب مدینہ میں تعداد بڑھی۔ تو ان کے پر پرزے نکل آئے اور تلوار سنبھال لی جبکہ منشائے ایزدی کا تقاضا یہی تھا کہ مسلمانوں کو بعد میں اجازت جہاد دی گئی پہلے اجازت نہیں تھی جس کے سبب مسلمان مکی زندگی میں صبر سے کام لیتے رہے اور ہر آنے والی مصیبت کا مردانہ وار ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے۔ اگر قلیل تعداد کی فکر ہوتی تو جنگ بدر میں مسلمانوں کی تعداد قلیل تھی دشمن کے مقابلہ میں ایک تہائی سے بھی کم تھی تو کنی کترا جاتے، بدر کی راہ نہ لیتے اور کفار سے جنگ نہ کرتے نیز کفار اسلحہ سے لیس تھے اور مسلمان بے سروسامان۔ اور جو سامان تھا آٹے میں نمک کے برابر تھا۔ ان کے پاس ستر اونٹ، دو گھوڑے، ایک سیدنا مقدادؓ اور دوسرا سیدنا زبیر بن العوام کے پاس تھا (ابن سعد ایک اور گھوڑے کا ذکر کرتا ہے جو سیدنا مرثد بن ابی مرثد غنویؓ کے پاس تھا۔

۲: مسلمانوں نے جنگ کی ابتداء نہیں کی۔ کفار نے مسلمانوں پر جنگ مسلط کی۔ اب اپنی جانوں کو بچانے کی خاطر بہ امر مجبوری مدافعانہ اقدام کرنا پڑا۔ اس پر قرآن کریم کی مذکورہ آیات بینات شاہد ہیں کہ "جنگ کرنے والوں کو اجازت دی جاتی ہے کیوں کہ ان پر ظلم ہوا۔

اعتراض نمبر ۲۹۲

مستشرقین کہتے ہیں کہ مہمات سلطنت کی وسعت اور استحکام کا ذریعہ تھیں۔

وسعت اور استحکام: یہ بھی کسی الزام دھرنے والے کو غلط فہمی نہ ہو کہ مسلمانوں نے جنگ بدر یا دیگر جنگیں حکومت اسلامی کی وسعت اور استحکام کے لیے چھیڑی تھی۔ وہ تو بے سروسامان تھے۔ قلیل تعداد میں تھے۔ اس کے بہ جز کفار مسلمانوں کو برابر پریشان کرتے آرہے تھے اور کررہے تھے۔ ان بے چاروں کے خلاف ہمیشہ طاقت کا استعمال کیا اور ہمیشہ یہ نیت بد رہی کہ اسلام کو تلوار کے ذریعے حرف مکرر کی طرح مٹا کر دم لیں گے۔ پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا کے مصداق وہ کچھ نہ کر سکے اور اسلام دن رات پھیلتا ہی چلا گیا اور اسلام کی اشاعت میں دن دگنی رات چوگنی ترقی ہوتی گئی۔ اب قلیل تعداد اور بے سروسامانی کے باوجود انھیں مدینہ پر حملہ آوروں کو روکنا تھا۔ اس سلسلہ میں جتنی بھی جنگیں ہوئیں ان میں مسلمانوں کو کامیابیاں ہوئیں جس کے نتیجہ میں دیگر قبائل اسلام میں داخل ہونا شروع ہو گئے۔ جہاں جہاں بھی وہ قبائل بستے تھے وہیں آباد رہے مگر اسلام کا دم بھرنے لگے جس وجہ سے اس علاقہ یا جگہ کو اسلامی سلطنت کہا گیا۔ اور وہاں دین اسلام کی حقانیت کا پرچم لہرانے لگا۔

جنھوں نے حق سمجھ کر از خود اسلامی ریاست میں شرکت کی۔ اسے وسعت یا استحکام سے تعبیر کرنا سراسر ناانصافی اور زیادتی ہے۔ اس لیے بھی کہ ہر قبیلہ کو اپنی مذہبی آزادی کا حق حاصل تھا۔ اب جس قبیلہ

نے جو سمجھا وہی اپنایا۔ انھوں نے خود، بغیر کسی دباؤ کے یا جبراً اسلام میں داخل ہونے کے' یہ اقدام اٹھایا تھا۔ تبوک مدینہ سے ساڑھے تین سو میل کے فاصلے پر ہے۔ شامی تاجروں کی اطلاع پر کہ رومی فوجیں حملہ آور ہونا چاہتی ہیں۔ آپؐ روانہ ہوئے۔ چودہ دن بعد وہاں پہنچے۔ رومی فوجیں سامنے نہ آئیں۔ آپ بھی جنگ کیے بغیر واپس تشریف لے آئے۔ وسعت کا خیال ہوتا تو بغیر جنگ کبھی واپس نہ آتے۔

بدوی قبائل خائف تھے: کیا بدوی قبائل کا خائف ہونا اس سبب سے تھا کہ

۱: مسلمان انھیں جبراً اسلام میں داخل کرنا چاہتے تھے۔

۲: ان قبائل نے مسلمانوں کے خلاف قریش کی مدد کی تھی اور وہ بدلہ لینا چاہتے تھے۔

۳: مسلمانوں نے ان قبائل یا ان قبائل کے کسی فرد واحد کو بلاوجہ کبھی نقصان پہنچایا ہو۔

۴: بدوی قبائل سے مسلمان لڑنا چاہتے تھے۔

کوئی ایسی وجہ بدوی قبائل کے خائف ہونے کی نظر نہیں آتی اور غیر جانب دار مورخ کا جواب بھی مذکورہ وجوہات کے بارہ میں یہی ہوگا کہ بدوی قبائل ان وجوہات کی بنا پر خائف نہ تھے بل کہ قبائل تو کہا کرتے تھے کہ اسے اپنی قوم سے نمٹ لینے دو اگر وہ اپنی قوم پر غالب آ گیا تو سچا نبی ہے۔ اس صورت میں کامیاب نہ ہوا تو خطرہ مٹ جائے گا اور کامیاب ہوا تو سچا نبی مان لیں گے۔ پھر خطرہ کاہے کا''۔

تو آیئے ان وجوہات کا ذکر کریں جن کے باعث وہ خائف تھے۔ بدوی قبائل کو اسلام کی حکومت سے ڈر کیوں لگتا؟ کیا وہ اسلام قوانین سے خائف ہیں یا عملی زندگی میں ان کے نفاذ اور انطباق سے ڈرتے ہیں جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے " لَا یَنۡهٰکُمُ اللّٰهُ ۔۔۔ وَتُقۡسِطُوۡۤا اِلَیۡهِمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الۡمُقۡسِطِیۡنَ (۶۰۔۸) ترجمہ: اللہ تعالیٰ تم کو ان لوگوں کے ساتھ احسان اور انصاف کا برتاؤ کرنے سے نہیں روکتا جو تم سے دین کے بارے نہیں لڑے اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا۔ اللہ انصاف کا برتاؤ کرنے والوں سے محبت رکھتے ہیں۔

جو بھی اب تک جنگیں ہوئیں ان میں کفار کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ مسلمان کامیاب ہوتے رہے۔ ان کامیابیوں پر انھیں اپنے باپ دادا کا مذہب خطرے میں گھرا نظر آیا جس سے سرِ مو انحراف باعث ذلت و بدنامی تھا۔ پھر بھی وہ ایک آس لگائے بیٹھے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ مکہ پر کوئی ایسا شخص فتح یاب نہیں ہو سکتا جسے اللہ کی نصرت حاصل نہ ہو۔ اگر مسلمان کامیاب ہوئے تو وہ صادق اور مقبول خدا ہوں گے۔ تب دیکھا جائے گا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ مختلف قبائل میں ایسے لوگ اب تک موجود ہیں جنھوں نے ابرہہ حبشی بادشاہ کے ۴۰، ۶۰ یا ستر ہزار کے لشکر کو دیکھا تھا جو مکہ پر حملہ آور ہوا تھا۔ اہل مکہ پہاڑوں پر چڑھ گئے تھے۔ انھوں نے یہ بھی دیکھا تھا کہ ابرہہ کا لشکر اس سمیت تباہ و برباد ہو گیا تھا۔

لاشے مکہ سے چار میل دور پڑے سڑتے رہے تھے۔

غزوات وسرایا کے مقاصد کی فہرست درج ذیل ہے۔

اول: تکمیل معاہدات وتبلیغ اسلام ومواعظ کے لیے سفر۔

غزوہ ودان، غزوہ بواط، غزوہ ذوالعشیر ہ، سریا دومۃ الجندل، غزوہ حدیبیہ۔

دوم: حملہ آور دشمن کے احوال کی دریافت۔

سیف البحر، رابغ ضراز، سریا نخلہ، سریا قردہ، سریا ابوقتادہ۔

سوم: گرداوری تاسرحد حملہ آوران جس کو مقصود دشمن کو مرعوب کر کے اس کو حملہ کرنے سے روکنا تھا

غزوہ قرقرۃ القدر، سریا قرقرۃ القدر، غزوہ ذی امر، بدر اخریٰ، غزوہ دومۃ الجندل، سریا قریظہ، بنولحیان، سریا عمر، سریا بنوثعلبہ، سریا جموم، سریا طرف، سریا وادی القریٰ، سریا فدک، غزوہ وادی القریٰ، غزوہ ذات الرقاع، سریا عیص، سریا کدید، سریا غالب سریا تربہ، سریا بنوکلاب، سریا منقعہ، سریا بنومرہ، بشیر، سریا ابن ابی العوجا، سریا کعب بن عمیر، سریا شجاع بن واہب، سریا عمرو بن العاص، سریا ابوعبیدہ، سریا ابوقتادہ، سریا عیینہ، سریا قطبہ، غزوہ تبوک، سریا دومۃ الجندل۔

چہارم: سزادہی گروہ ڈکیتی پیشگاں

سریا حسمیٰ، سریا ام قرفہ، سریا عرینین۔

پنجم: تعاقب ڈکیتاں

غزوہ سفوان، سریا قطن، غزوہ ذی قردہ یا غزوہ غابہ، سریا عبداللہ بن حزافہ۔

ششم: معاہدہ اقوام کی جانب سے بغاوت اور غدر اور بلوے اور ان کا انجام۔

غزوہ بنوقینقاع، سریا رجیع، سریا بیر معونہ، غزوہ بنونضیر، سریا بنومصطلق، غزوہ بنوقریضہ، سریا ذی القصہ، سریا بنی طے۔

ہفتم: غلط فہمیاں

سریا عمرو بن امیہ، سریا عبداللہ بن رواحہ، سریا عمرو بن امیہ، سریا خربہ، سریا خالد، سریا ضحاک بن سفوان۔

ہشتم: بت شکنی

سریا خالد، سریا عمرو بن العاص، سریا سعد اشہلی۔

نہم: جنگ

بدر الکبریٰ، غزوہ احد، غزوہ احزاب، غزوہ خیبر، سریا موتہ، فتح مکہ، غزوہ حنین۔

دہم: تعاقب دشمناں

غزوہ السویق، حمراء الاسد، غزوہ طائف۔

یازدہم: لوکل یا پرسنل واقعات مقامی یا شخصی

سریا عمیر، سریا عالم بن عمیر، سریا محمد بن سلمہ۔ سریا ابن انیس، سریا ابن عتیک،

ابتدائی سرایا اور غزوات کا نقشہ (۱)

نمبر شمار	نام سرایا/غزوات	تاریخ	نتیجہ	وجہ
۱	سریہ حمزہ بن عبدالمطلب/ سیف الجحر	۱ھ	جنگ نہ ہوئی	تجارتی قافلوں کو روکنا
۲	عبیدہ بن حارث/ رابغ	۱ھ	جنگ نہ ہوئی	ایضاً
۳	سریہ سعد بن ابی وقاص/خرار	۱ھ	جنگ نہ ہوئی	’’
۴	غزوہ ابوء	۲ھ	جنگ نہ ہوئی	’’
۵	غزوہ بواط	۲ھ	جنگ نہ ہوئی	’’
۶	غزوہ بدر وائی/صفوان	۲ھ	دشمن فرار	’’
۷	غزوہ ذوالعیشر ۃ	۲ھ	جنگ نہ ہوئی	’’
۸	سریہ نخلہ	۲ھ	مقابلہ ہوا	’’

مذکورہ ابتدائی سرایا اور غزوات پر مشتمل خاکہ واقعاتی نہیں اور نہ ہی ماخذی ہیں۔ یہ قیاسی جدول ہے جو کئی مورخین نے اول تحقیق کیے بغیر اور ماخذ کا اچھی طرح استعمال کیے بغیر اقتصادی پوزیشن کو مضبوط کرنے کے سبب کا سہارا لے کر لکھ دیا۔ دوم غیر مسلم مورخوں نے قدیم کی بجائے جدید ماخذ سے مدد لی اور ایسے الزامات سر پر دھرے جن کی کوئی وقعت نہیں۔ نیز غیر مسلم مورخین نے تو خوب اپنی دشمنی کا مظاہرہ کر دکھایا اور تعصب کی بنا پر حقائق کو چھپا کر محض قیاس اور مفروضات سے رائی کا پہاڑ بنا کر پیش کیا۔ ان پہلوؤں سے پردہ ہٹانے کی ضرورت ہے جس سے نکھر کر حقیقت سامنے آجائے۔ لہٰذا ایک اور ماخذ سے مزید واقعات پر مبنی جدول کو پیش کرنے کی ضرورت درکار ہے۔ تا کہ جدول اول اور دوم کے تقابل سے ان تمام بے بنیاد، بے حقیقت اور باطل الزامات کی قلعی کھل جائے۔

اعتراض نمبر ۲۹۳

مغربی مورخین کہتے ہیں کہ مال و دولت سے لدے قریشی کاروانوں نے مسلمانوں میں حرص و ہوس اور آسانی سے مل جانے والی دولت کی آگ بھڑکا دی اور وہ اپنی اقتصادی مجبوریوں سے تنگ آ کر لوٹ مار کے لیے نکل کھڑے ہوئے اور یہ ابتدائی جھڑپیں انہی کا دوسرا عملی روپ تھیں، بعض مورخین نے تھوڑی سی تاویل کی کہ ان جھڑپوں کا مقصد دولت یا کاروانوں کا لوٹنا نہ تھا بلکہ مکہ کی اقتصادی ناکہ بندی تھی جس کے ذریعے مکہ اشرافیہ کو مدینہ کی اسلامی ریاست سے کسی قسم کی مفاہمت پیدا کرنا تھا بہر حال ان دونوں صورتوں میں ان جھڑپوں کا مقصد اور مسائل و معاملات اقتصادی و معاشی تھے۔ (ن۔۵۔۳۶۶۔۳۶۵)

جواب: نظریاتی طور پر مسلمانوں کو اقدام جنگ کی اجازت نہ تھی۔ اس کے علاوہ مسلم ریاست اس وقت اس فوجی صلاحیت اور سیاسی قوت کی مالک نہ تھی کہ وہ جزیرہ نمائے عرب کی سب سے بڑی سیاسی اور فوجی طاقت سے ٹکر لے سکتی ہے، چنانچہ مسلمان قریشی کاروانوں پر حملہ کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے اور نہ ہی ان پر چھپ کر چھاپہ مار سکتے تھے۔۔۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ قریشی کاروانوں کے ساتھ محافظین کی تعداد کافی ہوتی تھی اور عددی لحاظ سے مسلم دستے کی قوت بہت کم تھی جیسا کہ سرایا کی تعداد سے مترشح ہے۔ چھ غزوات نبوی میں سے صرف تین مسلم دستوں کی تعداد افراد دو سو اور سو مسلمانوں پر مشتمل تھی جبکہ ان کے مقابلہ میں قریشی کاروانوں کی افرادی تعداد خاص کر ان کی جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کا سامنا ہوا تھا، کئی گنا زیادہ تھی۔ مغربی شاہراہ پر بسے ہوئے قبائل کا ایک دوسرا معاملہ تھا یعنی ان کے رویے اور طرز عمل کا۔ ماخذ بتاتے ہیں کہ مدینہ میں اسلامی ریاست کے قیام و استحکام سے پہلے تمام قبائل عرب جو اس علاقے میں بستے تھے، قریشی تاجران مکہ سے دوستی کے رشتہ سے منسلک تھے۔۔۔ عموماً تاجر قبیلے شاہراہ تجارت کے ارد گرد بسے ہوئے قبائل سے دوستی کے معاہدے کر لیتے تھے، یہ باہمی تعاون پر مبنی تھے۔ ان قبیلوں کو چند مراعات حاصل تھیں کہ وہ ٹیکس لیتے اور اس کے بدلہ میں وہ قبائل ان کی حفاظت کرتے تھے۔۔۔ جیسے جہینہ کے سردار مجدی بن عمرو جہنی کے رویے اور جملے سے ہوتا ہے۔۔۔ اس صورت میں نہ وہ قریش مکہ سے جنگ بلکہ بدوی قبائل سے جنگ کا خطرہ مول لینے کے لیے کبھی تیار نہ ہوتے۔

اگر ان جھڑپوں کو چھاپہ مار کاروائی سمجھ لیں اور پہلی مہم جہنی سردار کی کوشش سے لڑائی کی نوعیت نہیں آئی تھی اور مسلم دستہ صاف بچ گیا تو دوسری کاروائی ''رابغ'' میں برتر قریشی کاروانوں نے کمزور مسلمانوں پر حملہ کر کے تہس نہس کیوں نہ کیا، اگر یہ مان لیا جائے کہ قریشی کاروان بلا وجہ جھگڑا کرنا نہیں چاہتے تھے اور تجارت کے سبب سلامتی کے لیے جنگ سے پہلو تہی کرتے تھے، تو پھر سوال یہ ہے کہ

انہوں نے اپنی تجارت پر خطرے کو مسلسل منڈلاتے سائے کا سدباب کیوں نہ کیا؟ کیا وہ اپنی تجارت سے اتنا غافل تھے اور کیا تھا، اور کیوں کیا؟ کیا انہوں نے اپنے کاروانوں میں محافظ دستے کی فوجی طاقت میں اضافہ نہ کیا تھا یا عرب قبائل سے مزید مدد مانگی تھی، بظاہر دوسری صورت تو پیش نہیں آئی تھی کیونکہ واقعات اس کی نفی کرتے ہیں، رہی سہی پہلی صورت، تو ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ بجائے محافظین کی تعداد میں اضافہ کے ان میں مسلسل کمی آتی جارہی تھی۔ بدر سے ذرا پہلے قریشی کاروان جو شام گیا تھا محافظین اس سے کم تھے۔ صاف ظاہر ہے کہ جدید مغربی مورخین اور ان کے خوشہ چیں مسلم مولفین سیرت کو قریشی تجارت پر ان ابتدائی کاروائیوں کی صورت میں جو خطرہ منڈلاتا نظر آرہا ہے وہ کم از کم اس وقت کے تاجران مکہ کو غالباً بالکل نظر نہیں آرہا اس لیے انہوں نے محافظوں کی تعداد میں کمی کرتے نہ رہتے اور اپنی تجارت کا بھٹہ نہ بٹھاتے۔ ریاست اسلامی کے قیام کے بعد قریش کو خدشہ پیدا ہوا ہوگا اس لیے ابتدائی کاروانوں کی ابتدائی تعداد افراد زیادہ تھی لیکن وقت کے دھارے کے ساتھ مدینہ کی طرف سے لاحق خدشات، اگر تھے، تو وہ مٹتے گئے اور اپنے کاروانوں کے لیے مطمئن ہو گئے پھر قریش مکہ بخوبی جناب رسول اللہ ﷺ کی سیرت اور فکر و عمل سے واقف تھے، وہ جانتے تھے کہ مکہ کا الصادق والامین مدینہ میں اپنی فطرت وطبیعت کے خلاف اپنی روایات، امانت و دیانت سے یوں گریز نہ کرے گا کہ کسب معاش کے لیے لوٹ مار کی راہ اختیار کرے۔ بعض روایات سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ بدر سے پہلے تک مکہ والوں کو اپنی تجارت کے لیے، مدینہ والوں سے کوئی خطرہ نہیں تھا جیسا کہ سعد بن معاذؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ ''سعد بن معاذؓ اپنے دوست امیہ بن خلف جھنی کے ساتھ خانہ کعبہ کا طواف کررہے تھے، ابوجہل نے انہیں عمرہ سے محروم کرنے کی دھمکی دی کہ اگر انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی حمایت سے ہاتھ نہ کھینچا، جواب میں سعدؓ نے ابوجہل کو مکی تجارت کے شامی راستہ بند کرنے کی دھمکی دی تھی اور دشمن اسلام خاموش ہوگیا۔''

ایک اہم نکتہ منازل کا ہے، ان جھگڑوں کی منازل الگ تھیں، یہ تجارتی شاہراہ پر نہ تھیں، اگر مناز ل شاہراہ پر ہوں تو مورخین کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ کئی مہمات شاہراہ تجارت سے ہٹ کر بدوی علاقہ میں تھیں، ایک قطعی تردید یہ ہے کہ ان مہموں میں لگنے والی مدت خاص کر مسلم دستوں کے اپنی منازل مقصود پر قیام سے متعلق ہے۔ مورخین صراحت سے بیان کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ان بدوی علاقوں میں کتنی مدت قیام فرمایا مثلاً غزوہ ودان کے دوران آپ ﷺ نے منزل پر تقریباً دو ہفتے

قیام کیا تھا اسی طرح بواط اور ذوالعشیرہ میں آپ ﷺ کا قیام، دونوں مقامات پر ایک ماہ کے لگ بھگ رہا

ماخذ سے مرتب کردہ نقشہ (۲)

نمبر شمار	نام سریہ/ غزوہ	واقدی	ابن اسحاق	ابن ہشام	ابن سعد	طبری	یعقوبی	بلاذری	نتیجہ	وجہ
۱	سریہ حمزہ بن عبد المطلب /سیف البحر	چھاپہ مارنا	اتفاقی ملاقات کارواں سے	اتفاقی ملاقات کارواں سے	اتفاقی ملاقات کارواں سے	چھاپہ مارنا	---	---	بچ بچاؤ	قبیلہ جہینہ سے تعلقات قائم کرنا
۲	سریہ عبیدہ بن حارث/ رابغ	اتفاقی ملاقات کارواں سے	اتفاقی ملاقات کارواں سے	اتفاقی ملاقات کارواں سے	اتفاقی ملاقات کارواں سے	اتفاقی ملاقات کارواں سے	---	---	بچ بچاؤ	بنوخزاعہ اور بنوضمرہ سے تعلقات قائم کرنا
۳	سریہ سعد بن ابی وقاص/ الخرار	چھاپہ مارنا مقصود نہ تھا	چھاپہ مارنا مقصود نہ تھا	چھاپہ مارنا مقصود نہ تھا	چھاپہ مارنا مقصود نہ تھا	چھاپہ مارنا مقصود نہ تھا	---	چھاپہ مارنا مقصود نہ تھا	کارواں نکل گیا	بنوضمرہ سے دوستی کرنا
۴	غزوہ الواء	چھاپہ مارنا تھا	معاہدہ	معاہدہ	چھاپہ مارنا تھا	معاہدہ	---	چھاپہ مارنا مقصود نہ تھا	کاروان نکل گیا	بنوضمرہ سے معاہدہ کیا
۵	غزوہ بواط	چھاپہ مارنا تھا	خبرگیری حالات	خبرگیری حالات	چھاپہ مارنا تھا	واقدی+ابن سعد کا مجموعہ	چھاپہ مارنا نہ تھا	کاروں کے لیے نکلے لیکن جہینہ سے تعلقات قائم رہے	کاروان نکل گیا	جہینہ سے تعلقات قائم کرنا تھے
۶	غزوہ بدر اولیٰ/ صفوان	تادیبی کاروائی	تادیبی کاروائی	تادیبی کاروائی	تادیبی کاروائی	تادیبی کاروائی	تادیبی کاروائی	تادیبی کاروائی	کاروان نکل گیا	تلاش کرز بن جابر فہری
۷	غزوہ ذو العشیرۃ	چھاپہ مارنا تھا	قریش کے ارادے سے نکلے	قریش کے ارادے سے نکلے		ابن اسحاق+ ابن ہشام+ واقدی کا مجموعہ لیکن مقصد نہیں بتایا گیا	دوبدوی عربی قبائل سے معاہدہ کے لیے	چھاپہ مارنا تھا	کاروان نکل گیا	بنومدلج سے معاہدہ کیا
۸	سریہ عبداللہ بن جحش/نخلہ	چھاپہ مارنا تھا	خبرگیری قریش	خبرگیری قریش	چھاپہ مارنا تھا	خبرگیری حالات	خبرگیری حالات	چھاپہ مارنا تھا	مقابلہ	اتفاقاً ملاقات/ لڑائی قیدی/غنیمت

تھا، جیسے یہ کہا جاتا ہے، کہ کارواں ہاتھ سے نکل گئے، یہ مان لیں تو سوال یہ ہے کہ پھر وہاں اتنے دن قیام کیوں فرمایا؟ یہ بھی غلط ہے کہ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھی تجارتی کاروانوں کی واپسی کے منتظر تھے

یا دوسرے کاروانوں کی تاک میں تھے۔ پہلی صورت میں کاروان اتنی جلدی واپس نہیں آسکتے کیونکہ آمد ورفت کے لیے تین ماہ کی مدت درکار ہے۔ مزید دلچسپ بات یہ ہے کہ جب کاروانوں کی واپسی کا وقت قریب آیا تو آپ ﷺ مدینہ لوٹ آئے۔ جہاں تک دوسرے کاروانوں پر حملے کا سوال ہے تو ہمارے تمام ماخذ اس پر متفق ہیں کہ ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔

قریشی کاروانوں کی آمد ورفت کی تیز رفتاری اور مکی تجارت کے معیار کے بارے سوال پیدا ہوتا ہے۔ اگر مغربی مورخین کا یہ نظریہ مان لیا جائے کہ کرز بن جابر فہری کے خلاف کیے گئے غزوہ سفوان کے علاوہ بقیہ تمام مہموں کا مقصد چھاپہ مار کاروائی تھی، تو سوال یہ ہے کہ آخر مکی تجارت کتنی بڑی اور عظیم تھی کہ ہجرت کے بعد دس ماہ کی قلیل مدت میں تاجران مکہ نے لگ بھگ نو، کاروانوں کو شام بھیجا تھا اور وہ ابوجہل، ابوسفیان اور امیہ بن خلف جیسے بڑے سرداروں کی زیر کمان لیکن بعد کے زمانہ میں پورے چار برسوں کی مدت میں ۔۔۔ بدر، حدیبیہ کے دوران، یہی تاجران مکہ صرف دو کارواں شام بھیج سکے تھے اور دونوں ہی کارواں اسلامی ریاست کی حدود سے بچ کر نہیں جا سکے تھے اور مسلم فوجی دستوں کے ہاتھوں پکڑے گئے تھے، اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ قائدین مدینہ بے تدبیر اور فوجی حکمت عملی سے عاری اور سیاسی بصیرت سے محروم اور عمل میں کورے تھے کہ انہوں نے نو بار گھات لگائی اور سوائے ایک موقعہ کے ہر بار ناکام رہے۔

بعد کی فوجی کاروائیوں سے اسی غلط تاثر ونتیجہ کی نا صرف تردید ہوتی ہے بلکہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جب جب مسلمانوں نے تلوار اٹھائی، وہ کاری ضرب لگائے بغیر نیام میں نہ گئی۔ جب انہوں نے چاہا کہ کوئی کارواں کسی تجارتی شاہراہ پر سے نہیں گزرے گا، تو کوئی کارواں بچ کر نہ نکل سکا۔ حتیٰ کہ عیص کے مسلمانوں نے بے سروسامانی کے باوجود کاروانوں کو بچ کر نہیں نکلنے دیا، یہ الزام بھی باطل ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کا جاسوسی نظام ناقص تھا۔

ماخذ سے مرتب کردہ نقشہ (۲)

مذکورہ نقشہ میں مورخین کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ کس کی رائے قبول کریں۔ یہ پریشان کن بات نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مذکورہ ماخذ جو قریشی کاروانوں پر حملہ کرنے یا نہ کرنے کی بات کرتے ہیں ان

میں اول الذکر نتیجہ یہ نکالتے ہیں کہ مسلم جماعت نے کاروائی تو چھاپہ مارنے کے لیے کی تھی اور کارواں بچ نکلتے تھے۔اس کے نتیجہ میں جو کاروائی مسلم جماعت کی طرف سے عمل میں آئی تھی کہ اس جماعت نے اس علاقہ جہاں ان مسلم دستوں کو بھیجا گیا تھا، کے لوگوں سے تعلقات استوار کیے۔ معاہدے کیے۔ جب کہ موخر الذکر تو پہلے سے ان جنگوں کے خلاف ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ صرف بدوی قبائل سے تعلقات قائم کرنے کے لیے تھیں اور ان سے معاہدے کر کے دوستی کو مستحکم کرنا تھا۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ واقعاتی اعتبار سے سوائے غزوہ صفوان اور سریہ نخلہ کے باقی تمام سرایا اور غزوات مدینہ کے گردونواح میں بدوی قبائل جو بستے تھے ان کے ساتھ دوستی کا ہاتھ بڑھانے کی غرض سے تھے۔اس کا ایک تاریخی ثبوت آپؐ کی مدینہ آمد سے ملتا ہے کہ آپؐ نے مدینہ منورہ میں مختلف قبائل اور یہود سے معاہدہ کیا تھا جسے میثاق النبی کے نام سے تاریخ نے اپنے اوراق میں سنبھال اور محفوظ کر رکھا ہے۔ یہ ایک تادیبی کاروائی تھی جو کرز بن جابر فہری کے خلاف تھی جو اس نے مدینہ کی چراگاہ میں چرنے والی اونٹنیوں کو ہانک کر لے گیا تھا۔تعاقب کرنے پر وہ نہ مل سکا۔دوسرا نخلہ کا واقعہ اتفاقی ہے کیوں کہ مسلم دستہ تو صرف قریش کے حالات کی خبر گیری کے لیے بھیجا گیا تھا۔قریش کا کارواں ادھر آنکلا۔ مڈھ بھیڑ ہوئی۔ایک قتل، دو قیدی اور غنیمت ہاتھ لگا۔اس کی تفصیلی بحث آگے آئے گی۔جس سے تمام الزامات کی نفی ہو جاتی ہے گویا کہ یہ حملہ لوٹ مار تھا اور نہ غدارانہ فعل تھا۔

اعتراض نمبر ۲۹۴

۱: اسلام لوٹ ہے۔ (Rodinson)

۲: اسلام جنگی ٹولے کا مذہب ہے (Bryon)

۳: آپ ﷺ غارت گر اور غارت گروں کے سردار تھے۔(نعوذ باللہ)

۴: صحابہ کو غارت گری کی تعلیم دی۔ (شبلی ص ۱۸۷۔۱۸۸ سیرت النبی)

۵: غزوات لوٹ مار کی مہمیں تھیں اور عربوں کی غربت اور تنگ دستی دور کرنے کا ذریعہ۔

۶: اپنے اصل منصب العین کو حاصل کرنے اور ایک منتشر برادری کو متحد کرنے کے لیے محمد ﷺ کو مہاجرین وانصار میں ہم آہنگ تعاون چاہتے تھے تو اس کے مکی قافلوں پر حملوں کے ذریعے حاصل کردہ (مہاجرین کی) اقتصادی خود مختاری کی ضرورت تھی۔ (گریونے بام)

۷: کاروانوں کو روکنے کا مقصد معاشی دباؤ بڑھانا تھا۔ڈاکٹر حمید اللہ۔

نخلہ کی مہم مدینہ کی کثیر آبادی کی مادی ضروریات پورے کرنے کے عوامل کا نتیجہ تھی اور ایک غدارانہ حملہ تھا۔اس نے صلح کے زمانہ کا خاتمہ کر دیا جس کے نتیجہ میں شدید ردِ عمل ہوا۔مکہ میں اور مدینہ میں بھی خاصی بے چینی پیدا ہوئی۔(فرانسکو جبرئیلی۔ن ۳۰۲/۵)

جواب: تمام الزامات ''اسلام لوٹ ہے'' کی کوکھ سے جنم لے رہے ہیں۔ بہ ظاہر اس کے ماننے والے لٹیرے اور جنگی مذہبی ٹولہ ٹھہرائے گئے ہیں۔ اس کے معلم غارت گروں کے سردار گردانے گئے۔ تمام غزوات لوٹ مار کی مہمیں تھیں اور تنگ دستی و غربت کے خاتمہ کا ذریعہ سمجھی گئیں اور اصل مقصد اقتصادی خودمختاری کا حصول قرار دیا وغیرہ۔ ان الزامات کا تفصیلی جائزہ لینا ضروری ہے تا کہ ان بے سود، فضول اور لغو الزامات کی اصل حقیقت معلوم ہو سکے مگر اس سے قبل ایک بڑے شبہ کا بیان کرنا ضروری ہے۔

شبہ کا ازالہ: جدید مصنفین نے تمام غزوات و سرایا کو فوجی مہمات سے منسوب کیا ہے جس سے ان کی اصل نوعیت و ماہیت کے بارے میں یہ غلطی در آئی ہے۔ متقدمین کے ہاں دو اصطلاحیں موجود تھیں ایک سریہ ہے جس کی جمع سرایا اور دوسری غزوہ جس کی جمع غزوات ہے۔ جس اسلامی دستے کی آپ ﷺ نے خود بہ نفس نفیس قیادت فرمائی اسے غزوہ اور جس میں آپؐ نے شرکت نہ فرمائی اور صحابہ کرامؓ کو بھیجا اسے سریہ کہتے تھے۔ ان سابقہ اصطلاحات غزوہ، غزوات، سریہ اور سرایا کو مہم یا مہماتِ فوجی سمجھ لیا گیا ہے۔ اس کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ مدنی مسلمانوں نے ان فوجی مہمات کے ذریعے روز افزوں اقتصادی مسائل کو حل کرنے اور گھٹتے ہوئے مالی وسائل کو بڑھانے کے لیے ''لوٹ مار اور رزّیہ'' کا سہارا لیا اور ان تمام غزوات و سرایا کا مقصد اقتصادی وسائل کی فراہمی قرار پایا۔ (مارگولیتھ) کا یہی خیال ہے۔ (ن۔۱۱۔۴۰۰) غزوہ بدر سے قبل ابتدائی سرایا و غزوات جن کی تعداد آٹھ ہے، کا تنقیدی جائزہ پیش کرتے ہیں تا کہ بے تکے اعتراضات کا جواب دے کر حقیقت کو نکھارا جائے۔

سریہ اول حمزہ بن عبدالمطلب، سیف البحر یا العیص

اس سریہ کو تین نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ العیص کے نواح میں قبیلہ جہینہ کے علاقے تھے۔ یہ قبیلہ انصار مدینہ کے قبیلہ خزرج کا قدیمی حلیف تھا۔ اس کے نواح میں ایک اور قبیلہ منرینہ تھا جس کے تعلقات مدنی قبیلہ اوس کے ساتھ تھے۔ اوس و خزرج ہجرت نبوی کے بعد آپس میں بھائی بھائی بن گئے تھے۔ مدتوں کی دشمنی کا خاتمہ ہوا۔ عرب کا دستور تھا کہ حلیف کے حلیف دوست ہوتے تھے۔ اس دستوری طریقہ سے اوس و خزرج کے حلیف قبائل منرینہ اور جہینہ رسول ﷺ اور مہاجرین کے حلیف اور دوست ہو گئے تھے۔ ان کے تعلقات مسلمانوں کے ساتھ انصار کی طرح کے تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس سریہ میں مسلمانوں اور قریش کی ملاقات اتفاقاً ہوئی تھی۔ لڑائی کی نوبت آ پہنچی تو جہینہ کے سردار مجدی بن عمرو نے مصالحت کروا دی کیوں کہ قبیلہ جہینہ کے تعلقات ہر دو فریق یعنی مسلمانوں اور قریش کے ساتھ تھے۔ اس کی تائید ''واٹ'' بھی کرتا ہے کہ مہاجرین و انصار کے بعد سب سے زیادہ یہی قبیلے تھے جن کا تعاون اسلامی ریاست کو ملا تھا طبری اور اثیر اس سریہ کا مقصد قبیلہ جہینہ سے دوستی کرنا تھی' بتاتے ہیں۔

ثانیاً قریش مکہ کے کاروانِ تجارت کی افرادی قوت مسلمانوں کی افرادی قوت سے ایک تہائی زیادہ تھی۔قریشی کارواں والوں نے اسلامی دستہ پر حملہ کیوں نہ کیا تاکہ ہمیشہ کے لیے سر درد ختم ہو جاتا اور تجارتی کارواں کا راستا ہموار ہو جاتا اور کوئی خطرہ، ڈر وخوف نہ رہتا۔

سوم: اسلامی دستہ اپنے سے مضبوط قریشی کارواں پر حملہ کرنے کی جرات نہیں کرسکتا تھا۔مسلمان قلیل تعداد میں تھے اور قریش کثیر تعداد میں تھے۔ان سے جنگ مول لینا خود کو ہلاک کرنا تھا۔

چہارم: بعض کہتے ہیں کہ جاسوسوں اور مخبروں کی اطلاع پر کاروائی عمل میں لائی گئی تھی تو قریش کی عسکری طاقت کو معلوم کرنے میں

غلطی لگی کیوں کہ کارواں پر حملہ کرنا مقصود تھا تو چھوٹی جماعت کو بھیجنا نامناسب اور بے جا تھا۔ اگر لوٹنا ہی مقصود تھا تو چھوٹے دستہ کو بھیجنا نامناسب ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلم دستہ محض خبر گیری اور حالات کا جائزہ لینے کے لیے بھیجا گیا تھا اور کوئی غرض نہیں تھی۔

پنجم: چھاپہ مار منصوبے کی تصدیق ماخذ سے نہیں ہوتی۔ مذکورہ امور کی روشنی میں حقیقت یہی ہے کہ قریشی کارواں اور اسلامی دستہ کی اتفاقی ملاقات تھی۔تلخی ہوئی آخر کار مجدی بن عمرو کی کوشش سے انجام بہ خیر ہوا۔مسلمان دستہ نے جہینہ کے قبیلہ سے تعلقات استوار کیے۔لہذا یہ دستہ قبیلہ جہینہ سے تعلقات کی بڑھوتری کی وجہ سے بھیجا گیا تھا نہ کہ جنگی حکمت عملی کے تحت۔

سریہ دوم: عبیدہ بن حارث یا رابغ

یہ سریہ عبیدہ بن حارث کی قیادت میں ترتیب دیا گیا تھا جس کی منزل رابغ تھا۔مسلمانوں کی تعداد صرف ساٹھ اور قریش کا کارواں دوسو افراد پر مشتمل تھا۔فریقین کا آمنا سامنا تجارتی شاہ راہ سے ہٹ کر ہوا ۔وہ اس لیے کہ مشرکین مکہ تجارتی راستا چھوڑ کر چلے آئے تھے صرف اپنے مویشیوں کو چرانے کے لیے۔

دوم: مسلمان کارواں کی قریشی کارواں کے خلاف بھیجنے کی ماخذ تصدیق نہیں کرتے۔

سوم: اس سریہ کا مقام احیاء چشمہ تھا جو عام راستا سے ہٹ کر تھا۔گویا مسلمانوں نے تجارتی راستا پر سفر ہی نہیں کیا تھا۔اگر چھاپہ اور لوٹ مار مقصود تھا تو اصل راستے سے کیوں کر ہٹ گئے تھے۔

چہارم: مویشیوں کے چرانے سے یہ بات بھی قرین قیاس ہے کہ انھیں اہل مدینہ سے کوئی حملہ کا خوف وخطرہ نہ تھا۔ورنہ وہ وہاں پڑاؤ نہ کرتے۔خطرے کے پیش نظر ہر مدافعاتی عمل بہ روئے کار لایا جاتا ۔ادھر صورت حال اس کے برعکس ہے وہ یوں کہ قریشی کارواں کی تعداد پہلے سے ایک تہائی کم تھی۔حال آنکہ افرادی قوت کو بڑھانا چاہیے تھا کہ ہر آنے والے خطرے سے نمٹا جا سکے۔

پنجم: وادی رابغ کا علاقہ قبیلہ خزاعہ اور ان کے حلیف بنو ضمرہ کا تھا۔خزاعہ قبیلہ سے مسلمانوں

کے تعلقات تھے جب کہ مدینہ واپس آ کر بنوضمرہ سے معاہدہ کیا گیا تھا۔ اگر حملہ کرنا یا چھاپہ مارنا مقصود ہوتا تو ان قبائل سے امداد لے کر قریشی کاروان پر چڑھ دوڑتے۔

ششم: اگر کوئی یہ سوال کرے کہ مسلم فوج کے کسی آدمی نے حملہ کا کہا تھا تو جواب یہ ہے کہ اختلاف رائے ہوسکتا ہے لیکن کسی کے کہنے پر لڑائی نہیں کی گئی تھی۔

ہفتم: اگر کوئی یہ کہے کہ قریشی کارواں بچ کر نکل گیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان کا تعاقب کر کے اگلی منزل تک گھیرا جا سکتا تھا۔ لیکن اس قسم کی کوئی کاروائی نہیں کی گئی تھی۔ اس لیے کہ مسلم جماعت کا مقصد چھاپہ مارنا نہ تھا۔ حملہ آور ہونا نہ تھا بل کہ کچھ اور تھا۔ وہ کیا تھا؟ وہ یہ کہ بدوی قبائل سے تعلقات مضبوط و مستحکم اور استوار کرنا تھے۔ تا کہ قریش کے حملوں اور ان کے مذموم عزائم سے بچا جا سکے جو مسلمانوں کو پیوند خاک کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے تھے۔ یہ سریا بھی احوال اہل مکہ کے معلوم کرنے کے لیے بھیجا جاتا اسے ثنیۃ المرہ پر موجود دیکھا گیا۔

سریہ سوم: سعد بن ابی وقاص یا سریہ خرّار

یہ سریہ بھی قریشی کارواں کے خلاف نہ تھا۔ ماخذ اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ چھاپہ مارنا مقصد نہ تھا۔ یعقوبی کے بیان کے مطابق خرار بنوضمرہ کا علاقہ تھا۔ کارواں معاملہ طے کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ انجانے میں بنوضمرہ کے چرنے والے مویشی پکڑ لیے۔ بعد میں مسلمانوں نے مویشی واپس کر دیے تھے کیوں کہ بنوضمرہ سے نبی مکرم ﷺ کا معاہدہ ہو چکا تھا۔

دوم: واقدی، ابن سعد، بلاذری اور طبری نے قریشی کارواں کا ذکر تو ضرور کیا لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ نے کارواں پر حملہ کرنے کا حکم صادر فرمایا تھا۔ ماخذ قریشی کارواں پر حملہ کرنے کی تصدیق نہیں کرتے۔

سوم: اگر کارواں کو لوٹنا ہی مقصود تھا تو سعد بن ابی وقاص کو خرار سے آگے جانے کی اجازت کیوں نہ دی؟ البتہ یہ قرین قیاس ہے کہ ممانعت نہ ہوتی تو مسلمان قافلہ کو جا لیتے۔ نیز کارواں کو پکڑنے کے لیے سوار جماعت کو کیوں نہ بھیجا گیا؟ پیدل دستہ بھیجنے کے کیا معنی تھے؟ اگر سوار دستہ ہوتا تو کارواں بچ بچا کر کے نکل کر نہ جا سکتا تھا۔

چہارم: قریشی کارواں کی تعداد بہ تدریج گھٹتی جا رہی تھی۔ اس سریہ میں ہر دو فریق کی تعداد میں خاصی کمی آ گئی تھی۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قریش کو مسلمانوں سے کسی قسم کا خطرہ نہیں تھا۔ اور مسلمان خبر گیری کرنے والے تھے۔ انھیں لڑنا نہیں تھا۔ اس لیے ان کی تعداد میں کمی ہی ہونا چاہیے تھی۔

پنجم: سب سے اہم نکتہ جو قابل غور ہے کہ رات کو سفر کیا جائے اور دن کو چھپے رہنا۔ اس سے

صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس سریہ کا مقصد خبر گیری حالات اور معلومات کا حصول تھا۔ ورنہ دن رات سفر جاری رکھا جانا چاہیے تھا تاکہ تجارتی کارواں کو گھیرا جاتا اور کارواں کو لوٹ مار کا نشانہ بناتے اور اپنا مقصد کو پا لیتے۔ یہ قافلہ گشت لگا کر واپس آ گیا۔

سریہ چہارم: غزوہ ابواء یا ودان

''نہ وہ آپ پر حملہ کریں اور نہ وہ آپ کے خلاف کسی کی مدد کریں'' یہ اس معاہدہ کے الفاظ ہیں جو آپ نے اس غزوہ میں کنانہ کے خاندان بنوضمرہ سے معاہدہ کیا تھا۔ معاہدہ کے بعد آپ مدینہ تشریف لے آئے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپؐ بنوضمرہ کا ارادہ رکھتے تھے۔ اس سے بنوضمرہ پر حملہ کا کوئی اشارا نہیں ملتا اور نہ ہی بنوضمرہ نے ایسی کوئی غلطی کی تھی اور نہ ہی کوئی مخالفت کی تھی کہ ان پر حملہ کیا جاتا۔

دوم: آپ کو جنگ کی جو اجازت تھی " وا قاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا ان اللہ لایحب المعتدین ' 'یعنی ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے کرتے ہیں اس کے معنی دفاعی جنگ کے ہوں گے اور اللہ کی خاطر جنگ ہو کے ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنگ انھی سے ہوگی جو پہل کریں گے۔

سوم: بنوضمرہ نے بھانپ لیا کہ اسی میں مصلحت ہے لہٰذا ان سے معاہدہ طے پایا۔

چہارم: اگر بنوضمرہ کے خلاف کاروائی مقصود تھی اور مصالحت پر انجام پذیر ہوئی۔ اسی طرح قریشی قافلہ کا سامنا ہو جاتا اور وہ آمادہ صلح ہوتے تو ان کے ساتھ بھی صلح ہو سکتی تھی۔

پنجم: قریش اور بنوضمرہ کے متحدہ محاذ سے مسلمانوں کے لڑنے کی سکت نہ تھی۔ نیز نہ صرف قریش بل کہ بدوی قبیلہ کو بھی دشمن بنا لینے کے

مترادف تھا جو سیاسی نقطہ نگاہ سے درست نہیں تھا۔

سریہ پنجم: غزوہ بواط

بُواط قبیلہ جہینہ کا علاقہ تھا۔ ماخذ میں اس غزوہ کا مقصد کاروان قریش، یا قریش تھا بتایا گیا ہے لیکن کارواں کہاں سے روانہ ہوا اور اسے کہاں کو جانا تھا' کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ اسلامی جماعت کی تعداد قریش سے دوگنا تھی جب کہ تمام مسلم دستہ سواروں پر مشتمل تھا۔ چاہتے تو تعاقب کر کے گھیر لیتے کیوں کہ اس قریشی کارواں کی رفتار سست تھی اس میں ۱۵۰۰ اونٹ تھے اور محافظ صرف سو تھے۔ یہ ثابت کرتا ہے کہ قریشی کارواں پر چھاپہ مارنا اور لوٹنا مقصود نہ تھا صرف ان کی حرکات سے متعلق خبر گیری کا حصول تھا۔ جیسا کہ ابن سعد کہتا ہے کہ پرانے حلیفوں سے تعلقات کو پکا کرنا تھا۔

دوم: ابواء مدینہ سے ایک دو دن کی مسافت پر واقع تھا لیکن آپؐ نے پندرہ دن یا ایک ماہ وہاں قیام

فرمایا۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپؐ نے وہاں اتنی مدت قیام کیوں فرمایا تھا؟ کسی اور کارواں کا انتظار تھا؟ یا کوئی اور مقصد تھا؟ ہاں مقصد صرف یہ تھا کہ اس علاقہ کے لوگوں سے دوستی قائم کی جائے۔

سوم: ماخذ کی داخلی شہادتوں سے بھی قریشی کارواں پر حملہ کرنے کی تردید ہوتی ہے۔

سریہ ششم: غزوہ بدر اولیٰ یا غزوہ ستوان یا غزوہ طلب بن کرز بن جابر فہری ربیع الاول ۲ ہجری میں کرز بن جابر فہری مدینہ کی چراگاہ سے مسلمانوں کی اونٹنیاں ہانک کر لے گیا تھا۔خبر ملنے پر آپ ﷺ اس کے تعاقب میں نکلے مگر وہ نکل چکا تھا، نہ ملا۔اسے لوٹ کہتے ہیں جو مخالف کی طرف سے شروع ہوئی اور سر مسلمانوں کے تھوپ دی۔جدید و قدیم مورخین اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ یہ غزوہ کسی کاروان قریش کے خلاف نہیں تھا۔مستشرق منٹگمری واٹ کی سنیے وہ کہتا ہے کہ ''نبی مکرم ﷺ کو اس قسم کے خطرات سے مستقل طور پر باخبر رہنا تھا۔چناں چہ آپ ﷺ نے قرب و جوار کے ایک لٹیرے کے خلاف تادیبی کاروائی کی تھی اور آیندہ آپ نے اس قسم کے لٹیروں کے ساتھ سختی کا سلوک کیا تھا''۔اگر تادیبی کاروائی نہ کی جاتی تو مخالف کا حوصلہ بڑھ جاتا اور یہ بھی محسوس کرتا کہ مسلمانوں میں بدلہ لینے کی طاقت نہیں ہے۔نیز مدینہ تشریف آوری سے مدینہ میں ایک ریاست کا قیام ہو چکا تھا۔ریاست کی حدود میں ایسی کاروائیاں کرنا حکومت وقت کی رٹ کو چیلنج کرنا تھا۔اس لیے تادیبی کاروائی کا اقدام ضروری تھا۔آج کے موجود دور میں بھی کسی ملک کی سرحدوں کو پار کر کے ہوائی یا دیگر اسلحہ سے حملہ کرنا جارحیت ہے اور کھلی دہشت گردی ہے اس ملک کی سالمیت کو نقصان پہنچانا ہے۔یہ کھلی دہشت گردی کے زمرے میں آتا ہے۔

سریہ ہفتم: غزوہ ذی العشیرۃ

مسلم جماعت قریش کے ارادہ سے نکلی تھی۔بعد ازاں کاروان قریش کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ابن سعد کہتا ہے کہ یہ کاروان تھا جو ابوسفیان کی قیادت میں بدر سے پہلے شام گیا تھا جسے واپسی پر مسلمانوں نے روکنا چاہا تھا اور اس کے نتیجہ میں غزوہ بدر واقع ہوا تھا۔واقدی اس کاروان

قریش کی روانگی جمادی الآخر میں غزوہ ذی العشیرۃ سے پہلے بتاتا ہے جب کہ ابن اسحاق جمادی الاول کے شروع کی تاریخ بتاتا ہے اور یہ کارواں نخلہ کے بعد رجب ۲ھ میں روانہ ہوا تھا اور واپسی دو ماہ بعد رمضان ۲ھ میں ہوئی تھی۔اگر ابن اسحٰق کی تاریخ کو صحیح مان لیں تو واقدی کا دعویٰ کہ غزوہ ذی العشیرۃ میں آپؐ نے اس کارواں پر حملہ کرنا چاہا تھا غلط معلوم ہوتا ہے۔حال آنکہ غزوہ بدر کی تفصیلات سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول کریم ﷺ اس کاروان قریش کی واپسی پر ہی حملہ کر کے اسے روکنا چاہتے تھے۔واقدی کے بہ قول رسول کریم ﷺ اس کاروان کی واپسی کا انتظار کرتے رہے تھے۔

دوم: ابن اسحاق کا بیان ہے کہ مسلمانوں میں سے بعض نے اس حکم نبوی پر خوشی اور بعض نے

نا گواری کا اظہار کیا تھا کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ مدینہ سے باہر نکل کر لڑنے کے لیے نہ خود جائیں گے نہ ان سے کہیں گے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس سے پہلے آپ سرایا اور غزوات بہ شمول غزوہ ذی العشیر ۃ چھاپہ مارنے یا جنگ کرنے کے لیے نہیں گئے تھے کیوں کہ چھاپہ مارنے میں بھی جنگ اور خون ریزی کا خطرہ ضرور تھا اور اسی سے بعض لوگ بچنا چاہ رہے تھے۔

سوم: آپ عام راستے سے ہٹ کر طویل سفر طے کر کے ذی العشیر ۃ پہنچے تھے۔ ایک اور متبادل راستا تھا وہ اختیار کرتے تو نہ صرف جلدی پہنچ جاتے بل کہ کارواں ہاتھ سے نہ نکل سکتا۔ لیکن آپ کی منزل شاہراہ تجارت پر نہ تھی۔ اصل منزل بنو مدلج کا علاقہ تھا۔ جس کی خاطر آپ نے یہ طویل سفر طے فرمایا تھا۔

چہارم: واقدی کا بیان ہے کہ آپ وہاں ڈیڑھ ماہ تک رہے اس طرح آپ کی واپسی ماہ رجب کے آخر یا وسط کے بعد ہونی چاہیے لیکن یہ غلط ہے۔ دیگر ماخذ میں ہے کہ جمادی الآخر، رجب، شعبان اور رمضان کے پہلے ہفتہ تک مدینہ میں رہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابوسفیان کا کاروان شام اس وقت تک روانہ نہیں ہوا تھا تو پھر چھاپہ، حملہ اور روکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

پنجم: اس کاروان قریش کی تعداد افراد مزید گھٹ کر رہ گئی تھی۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اہل مدینہ کا قریش کو کوئی ڈر خوف نہ تھا۔ یعنی غزوہ ذی العشیر ۃ چھاپہ مار کاروائی نہ تھی بل کہ وہاں کے لوگوں سے معاہدہ کرنا تھا۔

ششم: موسم سرما میں تجارتی کاروان یمن کی بہ جائے شام کو روانہ کیے جاتے تھے۔ یہ کارواں اس کے برعکس موسم سرما میں شام کو بھیجا گیا تھا۔ (قریش۔۱)

ہشتم سریہ عبداللہ بن جحش یا سریہ نخلہ

اعتراض نمبر ۲۹۵

سریہ نخلہ کے بارے مستشرقین نے بڑی لے دے کی ہے۔ بڑے زور بیان سے کڑی تنقید کی ہے۔ ''کارل بروکلمان'' (ن۱۲/۳۰۱) کہتا ہے کہ مسلم مہم نے رسول کریم ﷺ کے حکم پر ماہ مقدس کی بے حرمتی کر کے ایک مالا مال کاروانِ مکہ کو لوٹ لیا کیوں کہ مکی کاروان کے محافظ ماہِ مقدس کی وجہ سے اس کے تحفظ کی طرف سے مطمئن تھے لیکن اس قبائلی اخلاقی ضابطہ کی خلاف ورزی پر مدینہ میں ایک طوفان کھڑا ہوا تو رسول کریم ﷺ نے حملہ کرنے کا حکم دینے کی واقعیت سے انکار کر دیا۔ حال آنکہ اس کا ناقابل تردید ثبوت یہ ہے کہ حملہ آپ کی خواہشات کے مطابق ہوا تھا اور بعد میں آپ کی تردید یا انکار آپ کے اپنے احکام کی غلط تعبیر و تشریح تھی لیکن جب کثیر غنیمت نے آپ میں شدید حرص پیدا کر دی تو آپ نے

ایک بعد کی آیت منزلہ میں کافروں کے خلاف اعلان جہاد کرنے اور غنیمت کی تقسیم اور ماہ مقدس میں جنگ کے جواز کا اعلان کرنے کی جرات کی"۔

"فرانسکو جبریئلی" کہتا ہے کہ "یہ مہم مدینہ کی کثیر آبادی کی مادی ضروریات پوری کرنے کے عوامل کا نتیجہ تھی اور ایک غدارانہ حملہ تھا۔ اس نے صلح کے زمانہ کا خاتمہ کر دیا جس کے نتیجہ میں شدید ردِ عمل مکہ میں ہوا اور مدینہ میں بھی خاصی بے چینی پیدا ہوئی"۔

جواب: ان دو مذکورہ مستشرقین کے الزامات اور "منٹگمری واٹ" جس نے سریہ نخلہ پر بڑھ چڑھ کر تنقید کی ہے کا تفصیلی جائزہ پیش کرنا ضروری ہے تاکہ کھرے اور کھوٹے میں تمیز ہو سکے۔

سریہ نخلہ کی کہانی: آپ ﷺ نے غزوہ بدر اولیٰ کی واپسی پر آٹھ صحابہ پر مشتمل ایک دستہ عبداللہ بن جحشؓ کی قیادت میں نخلہ بھیجا اور ساتھ ہی ایک خط عطا فرمایا اور حکم دیا کہ اس خط کو دو دن بعد کھولیں اور تحریر شدہ حکم پر عمل کریں۔ بہ حکم نبوی دو دن بعد خط کو کھولا جس میں لکھا تھا "جب تم میرا یہ خط پڑھو تو چلتے رہو یہاں تک کہ مکہ اور طائف کے درمیان واقع نخلہ میں قیام کرو اور وہاں قریش پر کڑی نظر رکھو اور ہمارے لیے ان کی خبریں معلوم کرو"۔ خط پڑھ کر انھوں نے آمنا وصدقنا کہا اور ساتھیوں سے مخاطب ہوئے "نبی کریم ﷺ نے مجھ کو نخلہ جا کر قریش پر نظر رکھنے اور ان کی خبریں معلوم کرنے کا حکم دیا ہے۔ آپ نے مجھ کو تم میں سے کسی کو مجبور کرنے سے منع کیا ہے۔ اگر کسی کو شہادت کی تمنا ہے تو وہ آگے چلے اور جس کو نہ ہو وہ واپس چلا جائے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں رسول کریم ﷺ کے حکم پر عمل پیرا ہوں گا"۔

روانگی: کسی ساتھی نے واپسی کا راستہ نہ لیا اور سارے ایک ساتھ چل پڑے۔ سعدؓ اور عتبہؓ کا سواری کا اونٹ گم ہو گیا۔ اس کو تلاش کرتے کرتے مسلم قافلہ اپنی جماعت سے بچھڑ گئے۔ باقی نخلہ جا پہنچے۔ وہاں قریشی کارواں سے مقابلہ ہوا۔ عمرو بن الحضرمی قتل ہوا۔ دو قیدی ہوئے ان میں سے ایک مسلمان ہو گیا اور دوسرے نے چالیس اوقیہ چاندی کے بدلے رہائی پائی اور غنیمت بیس ہزار درہم کی مالیت (مع چاندی چالیس اوقیہ کے) ہاتھ لگی۔ مدینہ واپسی پر غنیمت بارگاہ نبوی میں پیش کی تو آپ ؐ نے فرمایا "میں نے تم کو ماہ مقدس میں لڑنے کا حکم نہیں دیا تھا"۔ غنیمت قبول کرنے سے انکار کر دیا اور یا کچھ عرصہ کے لیے اسے روکے رکھا۔ پھر آیت نازل ہوئی۔ "یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ ۔۔۔۔۔ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا"۔ (البقرہ ۲۱۸) (ترجمہ) "تجھ سے پوچھتے ہیں حرام مہینے کو اس میں لڑائی کرنے کو، تو کہہ لڑائی اس میں بڑا گناہ ہے اور روکنا اللہ کی راہ سے اور اس کو نہ ماننا اور مسجد حرام سے روکنا اور نکال دینا اس کے لوگوں کو وہاں سے' اس سے زیادہ گناہ ہے اس کے ہاں اور دین سے ہٹانا، مار ڈالنے سے زیادہ، اور وہ تو لگے ہی رہتے ہیں تم سے لڑنے کو یہاں تک کہ تم کو پھیر دیں تمھارے دین

سے اگر مقدور پاویں‘‘۔اس آیت کریمہ کی روشنی میں غنیمت تقسیم کی گئی اور قیدیوں کو رہائی ملی۔اب اس سریہ کے محرکات کیا تھے پر غور کرنا ہے۔اس کا مقصد چھاپہ مار کاروائی تھی یا قریش کے ارادوں ،منصوبوں اور کاروائیوں کے بارے معلومات حاصل کرنا مقصود تھیں۔ایک گروہ کہتا ہے کہ قریش پر کڑی نظر رکھنے اوران کی حرکات سے متعلق خبریں معلوم کرنا تھا۔دوسرا گروہ کہتا ہے کہ قریش کے کارواں پر نظر رکھنا تھا۔اس گروہ کا انحصار نامہ مبارک نبوی پر ہے۔

اول یہ کہ نامہ مبارک نبوی کی عبارات مختلف نقل کی گئی ہیں۔بعض الفاظ اور فقروں کی موجودگی اور حذف والحاق ہونے سے صورت حال پیچیدہ ہوگئی ہے۔پہلے طبقہ کی عبارت کا آخری فقرہ’’ و یعلم لنا من اخبارھم‘‘ (ہمارے لیے ان کی خبریں حاصل کرو) کی بجائے دوسرے طبقے کی عبارت میں نہیں ہے اور’’ ترصد لبھا قریش‘‘ (قریش پر نظر رکھو) کی بجائے’’ ترصد لبھا عیر قریش‘‘ ہے۔واقدی کی روایت کہ کسی خاص کارواں پر نظر رکھنا تھی‘ کو تسلیم کرنے سے دو احتمال پیدا ہوتے ہیں۔اول یہ کہ اس سے کون سا کارواں مراد تھا۔دوم طائف سے مکہ آنے والا کارواں جس کی مڈبھیڑ مسلم جماعت سے ہوئی، وہ تھا یا کوئی اور؟ حال آنکہ نامہ مبارک نبوی میں نخلہ کے کارواں کا ذکر ہے۔

ضمناً اعتراض

کارواں کو لوٹنے کے لیے مسلمانوں کا کارواں آیا تھا۔

جواب: جہاں تک لوٹ مار اور مسلمان لوٹنے کے لیے آدھمکے تھے، کا تعلق ہے، وہ زبردستی لوگوں کو اپنے دین میں شامل کرتے تھے جبکہ ایسا نہیں، کہنے کو تو جس کا جی چاہے کچھ کہتا رہے لیکن اس سے حقیقت بدل نہیں سکتی تاریخ کی شہادت اور قرآن پاک کی مذکورہ آیت غیر مسلموں کے سارے خود ساختہ مفروضوں اور افسانوں کی تردید میں کافی ہے۔کوئی قوم طاقت کے نشہ میں چور ہو، اس کے پاس وسائل کی کمی نہ ہو اور اس کا مقابل کمزور و ناتواں ہو، اور دین واخلاق کا کوئی ضابطہ منع کرنے والا نہ ہو، تو کہا جا سکتا ہے کہ ایسی قوم جنگ کا اعلان کردے تاکہ کمزور دشمن کو ملیا میٹ کر کے اپنی حکومت قائم کرلے اور ریاست کو وسعت دے، لیکن تاریخ ہمیں ایسی ایک بھی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے کہ کسی کمزور، افرادی قوت میں کمی، سامان جنگ سے خالی قوم محض اپنے شوق میں طاقت ور، عددی بہتات اور ہر قسم کے اسلحہ سے لیس قوم کو جنگ کے لیے للکارا ہو۔مستشرقین کا الزام کہاں تک درست ہے کہ جنگ مسلمانوں کا مشغلہ تھا، کیا مسلمان ان حالات میں جنگ چھیڑ سکتے تھے؟ ہرگز نہیں! تم قرآن کریم کے ان الفاظ پر غور کرو’’ وَهُوَ كُرۡهٌ لَّكُم‘‘ کہ تم پر جہاد فرض کیا گیا ہے حالانکہ وہ تمہیں پسند نہیں، اگر مسلمان طبعاً جنگجو ہوتے، ان کا دین لوٹ مار کی تعلیم دیتا تو کیا ہو جنگ کو ناپسند کرتے بلکہ وہ تو خوئے بدرا بہانہ بسیار پر عمل

کرتے ہوئے کسی موقعہ کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے تا کہ ان کی تمنائیں بر آئیں۔

جہاں تک ماہ مقدس میں کارواں پر حملہ کر کے بے حرمتی کی ہے، کا تعلق ہے، اس کی وضاحت یہ ہے کہ جس روز واقعہ ہوا، مسلمان اس خیال میں تھے کہ رجب کا چاند دکھائی نہیں دیا اور جمادی الثانی کی تیس تاریخ ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ رجب کا چاند نظر آ گیا ہے اس واقعہ سے کفار مکہ اور یہود مدینہ اور منافقین مدینہ کو مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کا ایک سنہری موقع ہاتھ لگا، انہوں نے سر آسمان پر اٹھا لیا، شور و غوغا اور اودھم مچایا اور کہا: دیکھیے! مسلمان لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہیں اور خود ماہ حرام میں قتل کرنے میں مستعد رہتے ہیں۔ غیر مسلموں کا رائی کا پہاڑ اور بات کا بتنگڑ بنانے اور گھناونے پروپیگنڈا کا ان آیات میں منہ توڑ جواب دیا گیا ہے وہ پوچھتے ہیں کہ ماہ حرام میں جنگ کرنے کا حکم کیا ہے، آپ ﷺ فرمایئے کہ ''لڑائی کرنا اس میں بڑا گناہ ہے لیکن روک دینا اللہ کی راہ سے اور کفر کرنا اس کے ساتھ اور روک دینا مسجد حرام سے اور نکال دینا اس میں بسنے والوں کو اس سے، اس سے بھی بڑے گناہ ہیں، اللہ کے نزدیک فتنہ قتل سے بھی بڑا گناہ ہے اور لڑتے رہیں گے تم سے یہاں تک کہ پھیر دیں تمہیں تمہارے دین سے، اگر بن پڑے۔'' ان کے کرتوت کہ مسجد حرام میں کسی حق پرست کو داخلہ سے منع کرتے ہیں۔ امن و سلامتی کے اس شہر سے اس کے اصلی باشندوں کا جلاوطن کرنے میں ہرگز جھجک محسوس نہیں کرتے۔ مسلمانوں کو طرح طرح کے عذاب دیتے ہیں اور شک و شبہ میں ڈال کر حق سے منحرف کرنے میں کوشاں رہتے ہیں، ان جرائم کو کچھ بھی نہیں سمجھتے، ان قبیح حرکات اور جرائم کے ہوتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ان کے الزامات کو پیوند خاک کر دیا اور ان کے ماہ مقدس کی بے حرمتی کا رد فرما کر تمام الزامات کی تردید کر دی۔

اعتراض نمبر ۲۹۶

''منٹگمری واٹ'' کا خیال ہے کہ ''ہم یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ رسول کریم ﷺ اس کارواں کے اس راستے سے نخلہ سے گزرنے کا علم تھا کہ نہیں بہت ممکن ہے کہ آپ کو اس کارواں کے نخلہ سے گزرنے کا علم تھا لیکن وقت و تاریخ کے بارے میں یقین نہ تھا۔ غالباً وہ کچھ مدت بعد گزرنے والا تھا لیکن کسی وجہ سے وہ کارواں وقت سے پیش تر آ نکلا تھا۔ اس لیے آپ کے تمام اندازے غلط ہو گئے اور مجاہدین کو مجبوراً ماہ مقدس میں حملہ کرنا پڑا'' (نعوذ باللہ)

پھر ''واٹ'' کہتا ہے کہ ''آپ کو اس کارواں کے گزرنے کا علم نہ رہا ہو بلکہ اپنے عمومی امکان کو مدنظر رکھ کر ہدایت دی ہو کہ اس سے نسبتاً محفوظ راستے پر عموماً کارواں گزرتے ہی رہتے ہیں۔ غالباً آپ کو یہ خیال تھا کہ شاہراہ تجارت شامی کے مقابلے میں اس مقامی تجارتی شاہراہ پر کارواں کے ساتھ محافظ

بھی کم ہوں گے‘‘۔

جواب: مندرجہ بالا دلائل ناقابل تسلیم ہیں اور یہ واقعات سے ہٹ کر تاویلات من گھڑت اور خود ساختہ ہیں۔اول یہ کہ مدینہ میں بیٹھ کر اتنی دور نخلہ سے کسی کارواں کے گزرنے کی مخصوص تاریخ کا علم نہ ہو ممکن نہیں مگر محال ضرور ہے۔آپ کو کیسے علم ہوا تھا۔دو ہی ذریعے تھے۔ایک مسلم جاسوسوں کے ذریعے دوم کسی مسافر کے ذریعے۔آخر الذکر ذریعہ قطعیت کے ساتھ خبر پہنچانے کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔مسافری ذریعہ کا ایک تجربہ پہلے بھی ہو چکا تھا جب تاجروں نے شامی افواج کے اجتماع کی خبر رسول اکرمؐ کو دی تھی۔اسلامی فوج مشکل سے وہاں پہنچی، رومی مقابلہ کو نہ آئے اور آپ ﷺ بھی جنگ کیے بغیر واپس چلے آئے۔نیز جاسوسوں کے ذریعہ اتنی دور تک ان کی رسائی رہی ہو ممکن نہیں ہے۔اگر اسے مان لیں تو پہلے کی مہمات کے چھ تجربے اس کی تردید کرتے ہیں۔یعنی مورخین کے بیان کے مطابق نبی مکرم ﷺ کی زیر قیادت یا آپؐ کے بھیجے جانے والے سرایا کاروانوں کو نہ پا سکے۔

تضاد: واٹ کی تضاد بیانی دیکھیے کبھی کہتا ہے کہ نخلہ سے قریشی کارواں کے گزرنے کا علم تھا کہ نہیں ہم یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے۔پھر کہتا ہے کہ بہت ممکن ہے کہ آپ کو اس کارواں کے نخلہ سے گزرنے کا علم تھا۔کس بات کو مانیں اور کس کو رد کریں۔خود اس کا اپنا بیان تضاد کے سبب ناقابل تسلیم ہے۔دوم ہرزہ سرائی کہ کارواں پہلے آنکلا۔آپ کے تمام اندازے غلط ہو گئے اور مسلمان مجاہدین کو مجبوراً ماہ مقدس میں حملہ کرنا پڑا۔کیا مسلمان جماعت جب مدینہ سے روانہ ہوئی انھیں ماہ مقدس کا علم نہ تھا؟ کارواں کی خبر لینے کے لیے سریہ بھیجا گیا۔اگر پہلے آئے یا بعد میں، مسلمانوں کو تو خبریں معلوم کرنا تھا۔پہلے اور بعد سے غرض نہ تھی تو پھر آپ کا اندازہ کیونکر غلط ہوا؟ شکر ہے واٹ نے یہ مانا کہ مجاہدین کو مجبوراً لڑنا پڑا اور نبی آخر الزماں ﷺ کی طرف سے تعارض کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔سب سے اہم بات واٹ کے بیان میں یہ ہے کہ بروکلمان اور فرانسسکو جبرائیلی کے بیانات کی تردید کرتا ہے۔ان دونوں نے پہلے کہا کہ رسول اللہ ﷺ کے حکم پر ماہ مقدس کی بے حرمتی کر کے مالا مال کارواں کو لوٹ لیا۔رسول اللہ ﷺ نے حملہ کرنے کا حکم دینے کی واقعیت سے انکار کر دیا حال آنکہ اس کا ناقابل تردید ثبوت ہے کہ حملہ آپ کی خواہشات کے مطابق ہوا تھا۔دوسرا فرانسسکو کہتا ہے کہ یہ مہم مدینہ کی کثیر آبادی کی مادی ضروریات پوری کرنے کے عوامل کا نتیجہ تھی اور ایک غدارانہ حملہ تھا۔اس نے صلح نامہ کا خاتمہ کر دیا۔وغیرہ وغیرہ۔ دوبارہ واٹ کے الفاظ دہراتا ہوں تاکہ مذکورہ دو حضرات کی نرالی منطقیں غلط ثابت ہو جائیں۔واٹ کہتا ہے کہ ’’مجاہدین کو مجبوراً ماہ مقدس میں لڑنا پڑا‘‘۔اس سے چند امور ثابت ہوئے۔

ا: سریہ جنگ کرنے کے لیے نہیں بھیجا تھا۔صرف خبریں حاصل کرنا مقصود تھا۔

۲: کاروانِ قریش سے لڑنے کا حکم، حکم نبوی نہ تھا۔ (واٹ خود کہتا ہے کہ مجبوراً لڑنا پڑا)

۳: مسلمانوں کا ارادہ لڑائی نہ تھا' انھیں مجبوراً لڑنا پڑا۔ اگر نہ لڑتے تو جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے۔ لہٰذا ماہ مقدس کی بے حرمتی تو دشمن کے پلے پڑتی ہے۔ ان کی جنگی کاروائی سے مسلمان مجاہدین کو مدافعانہ اقدام کرنا پڑا۔ اگر نہ لڑتے تو تہ تیغ ہو جاتے۔

۴: غنیمت نے آپ میں شدید حرص پیدا کر دی یا یہ مہم مدینہ کی کثیر آبادی کی مادی ضروریات پوری کرنے کے عوامل کا نتیجہ تھی وغیرہ وغیرہ۔ (فرانسسکو جبرائیلی کا اعتراض) تو از خود ''واٹ'' کے بیان سے قطعی تردید ہوتی ہے۔ وہ یوں کہ مجاہدین کو مجبوراً لڑنا پڑا۔ اگر اتنا مال ہاتھ آ رہا تھا کہ کثیر آبادی مدینہ کے لیے کافی تھی تو انھیں مجبوری کی بجائے بہ رغبت خویش اپنے مادی وسائل کو پورا کرنے کے لیے اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے تھا۔ لیکن وہ لڑتے ہی نہیں ہیں کیوں کہ ان کا مقصد نہ لڑائی تھا نہ لوٹ مار۔

۵: آپ میں حرص کا پیدا ہونا تب ممکن مانا جا سکتا تھا اگر آپ ﷺ مجاہدین کو جنگ کرنے کا حکم عطا کرتے۔ بل کہ سریہ کی واپسی پر آپ نے فرمایا ''میں نے حملہ کرنے کی اجازت نہیں دی تھی'' اور غنیمت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ایسی باتیں لوٹ مار یا معاشی اور مادی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ہو سکتی ہیں؟ مزید مادی ضروریات پوری کرنے کے الزام کی آگے تفصیل آئے گی۔

واٹ کی مزید تحقیق اور لغت سے لاعلمی:

نامہ مبارک کے ایک لفظ ''ترصد'' کے معنی گھات لگانے کی بجائے نگرانی کے قرار دینے کے لیے بعض روایات میں ''یعلم لنا من اخبارھم'' (ان کی خبریں ہمارے لیے معلوم کرو) کا فقرہ الحاقی ہے جو بعد میں راویوں نے ملا دیا۔

جواب: یہ عربی نحوی قاعدہ اور تاریخی اصولوں کے خلاف ہے۔ لغوی اعتبار سے کسی بھی لغت سے ''ترصد'' کے معنی گھات لگانے یا چھاپہ مارنے کے نہیں ہیں۔ قدیم وجدید لغات میں ترصد کے معنی نگرانی کرنے، امید کرنے، انتظار کرنے یا موقع کے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے واٹ کو لغات سے صرف گھات لگانے کے معنی ملے حال آنکہ ''قاعدہ عربی نحوی کے مطابق جب تک لفظ ''ترصد'' کے لیے'' ''ل'' کا صلہ نہ آئے اس وقت تک اس کے معنی گھات لگانے کے نہیں بنتے''۔ لہٰذا طبقہ دوم کے واقدی کی عبارت ''ترصد بہا لعیر قریش'' ہونا چاہیے تھی اور یہ بھی ممکن نہیں کہ واقدی ''ترصد'' کا فرق نہ جانتے ہوں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ جس روایت میں ''یعلم لنا من اخبارھم'' والا الحاقی فقرہ موجود ہے اس میں لفظ ''عیر'' موجود نہیں ہے۔ جب کہ طبقہ اول یعنی ابن اسحٰق وغیرہ کی روایت میں موجود ہے۔ جو کاروان قریش کی بجائے قریش پر نظر رکھنے کی ہدایت نبوی کا ذکر کرتے ہیں۔

الحاقی ہونے کا الزام: الحاقی ہونے کا الزام بعد کی روایات پر تو سمجھ آتا ہے لیکن ترتیب زمانی کے لحاظ سے قدیم اور اولیں روایات پر یہ الزام دھرنا قطعی ناانصافی، خلاف عقل اور تاریخی حقائق سے چشم پوشی کے مترادف ہے۔ واقدی ابن اسحٰق سے پچاس ساٹھ سال بعد تحریر کر رہے ہیں تو کیا وہ بے سوچے سمجھے اپنی روایتوں میں قریش سے پہلے "لفظ عیر" بڑھانے کے مرتکب ہوئے تھے نہ کہ ابن اسحٰق۔

واٹ کی سطحی تحقیق: "واٹ" نے "ترصد" پر خاصی گفتگو کی ہے۔ مگر ترتیب زمانی کے بارے میں اشارہ تک نہیں کیا۔ سب سے بڑھ کر یہ زہری اور یزید بن ہارون کے واسطے سے عروہ بن زبیر کی روایت جو پہلی مرتبہ ابن اسحٰق نے بیان کی اس میں مکی کارواں پر گھات لگانے کا ذکر کیا ہے۔ حال آنکہ اصل روایت میں قریش ہے' کاروان قریش نہیں ہے۔

واٹ کی ایک اور دلیل: "نامہ مبارک میں ترصد کے معنی گھات لگانے کی ایک اور دلیل واٹ دیتا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے اس سریہ کی تیاری میں نہایت راز داری سے کام لیا تھا"۔ جیسے

۱: مجاہدین کو مہم کی منزل اور اس کا مقصد واضح نہیں کیا تھا۔ ۲: قائد سریہ کو مہر بند (لفافہ) خط عطا فرمایا تھا جس کے مضمون سے آپ اور کاتب اور غالباً ایک دو مشیروں کے سوا کوئی نہ جانتا تھا۔ ۳: معروف راستے کی بجائے نسبتاً ایک غیر معروف راستے سے جانے کی تاکید کی تھی۔ ۴: سفر مشرقی جانب سے شروع ہوا تھا جب کہ منزل مقصود مکہ کے جنوب میں واقع تھی۔ ۵: یہ راز داری مکینوں کے جاسوسی نظام کو اپنے اصل ارادوں کے بارے میں تاریکی میں رکھنے کے لیے برتی گئی تھی۔ غالباً آپ کی بعض سابقہ مہمیں دشمنوں کے باخبر ہونے سے ناکام ہوئی تھیں۔ خط میں کسی قافلے پر حملہ کرنے کا کوئی حکم نہیں ہے۔ بل کہ خط میں لکھے ہوئے فرمان پر عمل کرنے کا حکم تھا۔ ۶: یہ مہم مدینہ سے بہت دور اور مکہ کے زیادہ قریب جا رہی تھی۔ اس کاروائی کا پتہ دشمنوں کو ہو جاتا تو مجاہدین سریہ کی زندگی خطرہ سے دوچار ہو سکتی تھی۔

جواب: یہ بات درست ہے کہ اگر مجاہدین کی کاروائی کا دشمنوں کو پتہ چل جاتا تو نہ صرف ان کی جان جوکھوں میں پڑ جاتی بل کہ سریہ کے بھیجنے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا۔ لیکن اس سے چھاپہ مار کاروائی کا مفہوم کیسے اخذ ہوتا ہے؟ ۲: ماخذ بتاتے ہیں کہ اس احتیاط اور راز داری کا مقصد یہ تھا کہ قریش کو گشتی دستے کا علم نہ ہونے پائے۔ اگر علم ہو جاتا تو قریش کی خبریں کیسے معلوم کر سکتے تھے؟ اور نہ ہی ان کی نگرانی کر کے اصل ارادوں اور قریش کی کاروائیوں پر نظر رکھ سکتے تھے۔ بل کہ انھیں تو اپنی زندگی کو خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔ نیز نخلہ میں قیام کر کے قریش یا کاروان قریش کے بارے خبریں حاصل کرنے میں بھی احتیاط اور راز داری کی اتنی ہی ضرورت تھی جتنی کسی کارواں پر چھاپہ مارنے کے لیے۔

اعتراض نمبر ۲۹۷

واٹ کہتا ہے کہ نامہ مبارک پڑھنے کے بعد اسلامی دستہ میں احکام نبی پر عمل کرنے میں ہچکچاہٹ تھی۔اس بنا پر تھی کہ ان کو تعمیل حکم کی صورت میں کسی کی اخلاقی ضابطہ شکنی یا اپنی مہم کے اخلاقی پہلوؤں کے بارے میں کسی قسم کا احساس ستا رہا تھا۔ان کی جھجک واضح خطرہ سے تھی کیوں کہ عرب خون کھول جانے پر عاقبت نا اندیش حد تک شجاعت کا مظاہرہ کرسکتا ہے لیکن ہوش وحواس کی درستی میں حتیٰ الامکان خطرات سے گریز کرتا ہے۔اس بنا پر امیر سریہ کو ہدایت تھی کہ وہ صرف اپنے منصوبے کے حامی اصحاب کے ساتھ کاروائی کریں اور جو اس سے متفق نہ ہوں ان کو واپس مدینہ بھیج دیں۔اسی سلسلہ میں واٹ کی لن ترانی یہ بھی ہے کہ اونٹ گم ہوجانے کی کہانی مدینہ واپسی پر سنائی تھی۔(وہ اونٹ جو سعد بن ابی وقاصؓ اور عتبہ بن غزوانؓ کا گم ہوگیا تھا)۔واٹ کا کہنا ہے کہ ان کا یہ کہانی سنانا ایک واقعہ ہوسکتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ کہانی صحیح ہے۔ایک اور روایت بھی اس کہانی کو صحیح نہیں بتاتی۔واٹ نے سعد بن ابی وقاصؓ پر صرف اس مہم میں بزدلی کا الزام نہیں لگایا ہے بل کہ سعد کو خاص نشانہ بناتے ہوئے ان کو جنگ قادسیہ میں بھی بزدلی کا طعنہ دیا ہے کہ جنگ میں انھوں نے مسلم فوج کی کمان بیماری کے سبب ساقۂ لشکر میں ایک پالکی میں بیٹھ کر کی تھی۔گویا واٹ کہنا یہ چاہ رہا ہے کہ سعد اور عتبہؓ نے بزدلی کا ثبوت دیا تھا کیوں کہ وہ سریہ نخلہ کے خطرات سے واقف تھے اور منصوبہ سے متفق نہ ہونے کے سبب جان بوجھ کر پیچھے رہ گئے تھے اور اس سے ان کے نزدیک جماعت میں ہچکچاہٹ ثابت ہوتی ہے۔جوابات: واٹ کی لن ترانیاں بے سود، بیکار اور فضول ہیں۔کئی وجھوں سے اس کے اعتراض قابل تسلیم نہیں ہیں۔اول ماخذ، مسلم جماعت میں جھجک کا اشارہ تک نہیں کرتے۔البتہ ابن اسحٰق کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن جحشؓ نے نامہ مبارک نبوی پڑھنے کے بعد فرمایا کہ اے ساتھیو! ''رسول کریم ﷺ نے مجھے نخلہ جاکر وہاں قریش کی خبریں معلوم کرنے کی ہدایت کی ہے اور مجھ کو تم میں سے کسی پر جبر وزور، زبردستی کرنے کا حکم نہیں دیا۔چنانچہ تم سے جس کا جی چاہے آئے جس کا جی چاہے نہ آئے۔جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں تعمیل حکم کرنے جا رہا ہوں''۔چنانچہ وہ روانہ ہوئے۔باقی بھی ساتھ ہو لیے ان میں کوئی پیچھے نہ ہٹا۔ بحران کے مقام پر پہنچے تو سعدؓ اور عتبہؓ کا اونٹ گم ہوگیا۔اس کی تلاش میں پیچھے رہ گئے۔باقی نخلہ جا پہنچے۔

اول:۔مذکورہ بیان میں کسی کے پیچھے ہٹنے کا ذکر نہیں اور جھجک کا بھی کوئی ثبوت نہیں ملتا۔اگر فرض محال دو صحابہ کے پیچھے رہ جانے کو ان کی بزدلی تصور کریں تو باقی جماعت کی ہچکچاہٹ کہاں ثابت ہوتی ہے۔جماعت کے تو صرف دو ساتھی پیچھے رہ گئے تھے۔

دوم: نامہ مبارک کے پڑھنے اور عبداللہ بن جحش کے خطاب کو سن کر پیچھے رہ جانے والے اصحاب

نے لیت ولعل اور بہانہ جوئی نہیں کی تھی اور جماعت کے ساتھ رہے۔عتبہ وغیرہ فوراً نہیں بچھڑے تھے بل کہ سوچ سمجھ کر اپنے گم شدہ اونٹ کی تلاش میں نکلے تھے۔ نیز کارواں سے پیچھے رہ جانا کسی سبب سے ممکن ہے۔

سوم: امیر سریہ نے کھلی اجازت دی تھی اور کہا تھا ''جس کا جی چاہے آگے آئے اور جس کا جی نہ چاہے نہ آئے''۔اس بیان کی روشنی میں پس وپیش کرنے اور پیچھے رہ جانے کا بہانہ کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ ان صحابہؓ سے حضور ﷺ کی حکم عدولی کا سوچا بھی نہیں جا سکتا وہ ''وماآتکم الرسول ۔۔ کے فرمان سے باخبر ہوتے ہوئے فرمان نبوی کو دل وجان سے سچا مان کر عمل کرتے ہیں

چہارم: مدینہ پہنچ کر کہانی گھڑنے کی کیا سوجھی؟ کیا ضرورت پیش آئی؟ حال آنکہ پیچھے رہ جانے سے کسی سے مواخذہ ہونے والا نہیں تھا۔انھوں نے تو نامہ مبارک کی تحریر اور عبداللہ بن جحش کی تقریر سے استفادہ کیا تھا۔ یہ رعایت اخلاقی اور قانونی طور پر حاصل تھی۔کوئی امیر سریہ کا ساتھ دے یا نہ دے۔لہٰذا کسی پر بھی یہ الزام نہیں دھرا جا سکتا۔

اعتراض نمبر ۲۹۸

(سعد بن ابی وقاصؓ اور عتبہ بن غزوانؓ) ان دونوں صحابیوں کی کہانی محض واقعہ نہیں تھی بل کہ صحیح بھی تھی''۔

جواب: اس کی تائید واقدی اور اس کے پیروکار مورخین کی روایات سے بھی ہوتی ہے۔اگرچہ واقدی کے ہاں نامہ مبارک میں جماعت صحابہؓ میں سے کسی کو مجبور کرنے کا فقرہ عبارت کا جز ہے۔جب کہ ابن اسحاق کے یہاں عبداللہ بن جحش کی تقریر کا فقرہ ہے جو انھوں نے نامہ مبارک پڑھنے کے بعد اپنے ساتھیوں کے سامنے کی تھی۔ابن حاتم کی روایت کے علاوہ تمام ابن اسحاق کی تائید میں ہیں۔اگر واقدی کے نقل کردہ نامہ مبارک کو معیاری مان لیں تو بھی کسی جھجک کا ثبوت نہیں ملتا۔ ہر دو صحابیوں کا کہانی گھڑنے کا جواز باطل ٹھہرتا ہے۔اور واٹ کا یہ دعویٰ کہ غیر متفق صحابہ مدینہ واپس چلے آئے تھے، کا ثبوت بھی کسی روایت میں نہیں ملتا۔البتہ طبری کی ایک روایت میں دو آدمیوں کے واپس مدینہ آنے کا ذکر ہے۔لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کہاں سے لوٹے تھے؟ کیوں واپس آئے تھے؟ اور کب لوٹے تھے؟ کسی امر کی وضاحت نہیں ملتی (۳۰۶)

سعد بن ابی وقاصؓ: جہاں تک سعد بن ابی وقاص کی اس موقع اور جنگ قادسیہ میں بزدلی کے مظاہرے کا تعلق ہے۔ پھر اس کو چھپانے کے لیے تیر چلانے کی روایت گھڑنے سے محض شان صحابی میں

گستاخی اور مرتبہ گھٹانے کی مذموم کوشش ہے۔

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ پر دون ہمتی کا الزام سراسر بہتان ہے اس کی تردید تاریخی واقعات سے ہوتی ہے۔ آپ نے ابتدائی سرایا و غزوات میں پورا پورا حصہ لیا۔ سریہ کے قائد بنائے گئے۔ اگر بزدل (نعوذ باللہ) ہوتے تو سریہ کی کمان ان کے سپرد نہ کی جاتی اور نہ ہی وہ انتخاب نبوی ہو پاتے۔'' ابن سعد کہتا ہے کہ اصحاب نبی میں ان کا شمار ماہر تیراندازوں میں ہوتا تھا''۔ جنگ احد میں ماہرانہ تیر اندازی سے دشمنوں کی یلغار کو روکا تھا اور نبی مکرم نے ان کی تعریف فرمائی تھی ''سعد تیر چلاتے رہو، تم پر میرے ماں باپ قربان''۔

شبہ کا ازالہ: پھر ایک اور نرالی منطق واٹ صاحب کی یہ ہے کہ ''یہ دعویٰ کہ ان کی تیراندازی میں حضرت سعدؓ کے کے کارنامے کی قدر و قیمت کم کر کے دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ابن ہشام نے اپنے تبصرے میں ابن حضرمی کا قتل جو اسلام میں اولیں قتل تھا، واقد کے کارنامے کی قدر کا اعتراف اور اعلان کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ سعد اور واقد امت مسلمہ کے اہم ترین فرد تھے۔ ان شواہد کے ہوتے ہوئے واٹ کے جملہ الزامات اور اعتراضات بے بنیاد اور بے کار ہیں۔ واٹ کی تمام دلیلیں بے وزنی، فضول، لغو اور باطل ہیں۔

ضمنی اعتراض: نامہ مبارک پڑھنے کے بعد عبداللہ بن جحش کی تقریر کا ایک فقرہ شہادت کی تمنا سے متعلق تھا۔ جس سے یہ گماں ہوتا ہے کہ امیر سریہ یا ان کے ساتھیوں کو یا بہ ذات خود ذات نبوی کو جانی نقصان کا خدشہ تھا۔ واٹ اور ان کے حامی اس فقرہ سے اور بعض دوسرے قرائن سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اس لیے سریہ خطرناک تھا کہ مسلمان جماعت چھاپہ مار کاروائی کے لیے جا رہی تھی۔ جس میں ہر دو فریق کے لیے جانی نقصان کا خدشہ تھا۔

جواب: اول یہ کہ پہلے سرایا و غزوات میں جنہیں مورخین چھاپہ مار کاروائیاں کہتے ہیں کسی قسم کے خطرہ کا احساس نہیں پایا جاتا حال آنکہ ان میں زیادہ جانی نقصان کا خدشہ ہو سکتا تھا کیوں کہ تجارتی شاہ راہ پر گزرنے والے قریشی کاروانوں کے خلاف ٹیمیں بھیجی گئی تھیں۔ جو تعداد کے لحاظ سے بڑے تھے۔ دوم نخلہ مہم کی نوعیت بھی دیگر تھی۔ یہ ایک طلیعہ (گشتی دستہ) تھا۔ صرف قریش کی حرکات کا پتہ لگانے کے لیے ترتیب دیا گیا تھا۔

سوم: چوں کہ یہ مہم مکہ سے تھوڑے فاصلہ یعنی نخلہ کی طرف بھیجی گئی تھی۔ قریش کو جاسوسوں کے ذریعے خبر ہو جاتی تو ایسے حالات پیدا ہو جاتے کہ زندگی کے امان کی کوئی صورت مسلمانوں کو نظر نہ آتی اسی سبب سے قائد سریہ عبداللہ بن جحشؓ نے شہادت کے متمنی حضرات کو لے جانا چاہا تھا۔

چہارم: اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ نبی مکرم ﷺ نے حملہ کا حکم نہیں دیا تھا بل کہ قریش پر نظر رکھنے اور ان کی خبریں حاصل کرنے یا کسی خاص کارواں کی کاروائی سے باخبر رہنے کے لیے یہ اقدام اٹھایا تھا۔

ضمنًا اعتراض

ماہ حرام میں کاروان قریش کو لوٹنے کی ذمہ داری رسول اکرم ﷺ کی طرف سے مجاہدین کی طرف منتقل کرنے کی بے سود کوشش کی ہے۔ واٹ کا دعویٰ ہے کہ اس غدارانہ حملے اور ماہ مقدس کی بے حرمتی پر جب مدینہ میں شدید ردعمل ہوا تو آپ ﷺ نے اس حقیقت سے انکار کر دیا کہ آپ نے کاروان پر حملہ کرنے کا حکم دیا تھا اور اس طرح امیر سریہ اور ان کے جان بازوں کے کاندھوں پر اس کی تمام تر ذمہ داری ڈال دی''۔

جواب: بروکلمان اور فرانسسکو کے اعتراض سے یہ ملتا جلتا الزام ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ عوام کے عدم اطمینان سے نہ صرف اپنے سابقہ حکم سے مکر گئے بل کہ وفادار مجاہدین کو خطرہ میں ڈال دیا اور مورخین نے آپ کے دفاع میں نامہ مبارک کی عبارت میں الحاق و تحریف کی اور خاص کر ''ان کی خبریں ہمارے لیے معلوم کرو''۔ والا فقرہ گھڑ کر شامل کر دیا تاکہ اس حملہ کی ذمہ داری سے نبی مکرم ﷺ کو بچایا جائے اور مسلم جماعت کو قربانی کا بکرا بنایا جائے۔

اول تو نامہ مبارک پڑھنے کے بعد مجاہدین کو حکم نبوی کا بہ خوبی علم ہو گیا تھا۔ یہ نامہ مبارک براء بن فمیر یا ملل میں پڑھا گیا تھا اور بعد نخلہ کو روانہ ہوئے۔ یہ عمل ارشاد نبوی کی تعمیل تھی۔

دوم: وہاں (نخلہ) پہنچ کر حملہ کرنے میں کیا چیز مانع تھی؟

سوم: حملہ کرنے سے خوف زدہ کیوں تھے؟ ایک دوسرے کو کیوں ہمت و حوصلہ دے رہے تھے؟

چہارم: پھر قافلہ پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیوں کیا گیا؟

پنجم: وہ خون ریزی اور شہادت کے حصول کے لیے نخلہ چلے آئے تھے۔ تو پھر یہ بحث و مباحثہ، تذبذب اور لوٹ لینے کا فیصلہ کیا معنی رکھتا ہے؟ اس سے ثابت ہوا کہ یہ مجاہدین کا اپنا فیصلہ تھا نہ کہ حکم نبوی۔ اگر کوئی یہ سوال کرے کہ حملہ کرنے کا حکم نبوی تعمیل میں ہچکچاہٹ تھی محض ماہ مقدس کی وجہ سے۔ اس کی تردید میں یہ دلیل قاطع ہے کہ جب نامہ گرامی کے مضمون سے مجاہدین واقف و آگاہ ہوئے تو روانہ ہوئے تھے۔ بہ خوبی جانتے تھے کہ ماہ حرام تھا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ مدینہ سے روانگی کے وقت بھی ماہ حرام کو جانتے پہچانتے تھے۔ اچانک پہنچنے پر یہ خیال ماہ مقدس کا وارد نہیں ہوا تھا، ثابت ہوا کہ حملہ کی ذمہ داری کو رسول مقبول ﷺ کی طرف سے ان کی طرف منتقل نہیں کی گئی تھی۔ جب کہ یہ مسلم مجاہدین کا اپنا فیصلہ تھا اور وہ بھی انھیں مخصوص حالات کی بنا پر کرنا پڑا تھا۔ جو اس وقت کے حالات کا متقاضی تھا۔

۲: جب مجاہدین کی جماعت مدینہ لوٹی تو صحابہ نے اس حملہ پر برہمی کا اظہار کیا تھا۔ کسی نے بھی حملہ کی ذمہ داری رسول اکرم ﷺ کی نہ سمجھی تھی۔ اگر آپ کی طرف ذمہ داری منسوب ہوتی تو مجاہدین سے صحابہ برہمی کا اظہار نہ کرتے۔

۳: ''آپؐ نے حکم دیا، پھر ردِعمل دیکھ کر مکر گئے'' (نعوذ باللہ) آپ کی پوری پاکیزہ اور مقدس زندگی کے یہ بات منافی ہے۔ اپنوں میں بتائے زندگی کے چالیس سال نے قریش اور دیگر دشمنوں کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ آپ کو الصادق اور الامین پکاریں۔ کسی بات سے انکاری نہ ہوئے جو انھوں نے کی۔ نہ کسی اور ساتھی کے ذمہ ڈالی۔

۴: اپنے سے خطرہ ٹال کر اپنے ساتھیوں کو خطرہ میں ڈال دینا بے ہودہ اور لچر بیان ہے۔ بھلا سوچیے خدانخواستہ اگر آپ کا کردار ایسا ہوتا تو کب تک آپ کے ساتھی آپ کا ساتھ دیتے اور بد دل ہو کر یکے بعد دیگرے ہٹتے ہی جاتے، ساتھ چھوڑ جاتے۔ مگر ایسا نہیں ہے سب جانتے ہیں کہ آپ ﷺ، سر جائے بات میں فرق نہ آئے کے پیکر تھے۔ حال آنکہ امت مسلمہ کی تعداد بڑھتی چلی گئی اور اسلام سے بامشرف ہونے کا اعزاز حاصل کرتی رہی۔ اس دعویٰ کی تردید آپ کے اسوہ حسنہ سے ہوتی ہے کہ آپ نے پوری زندگی میں بلاوجہ کسی ساتھی کا ساتھ نہیں چھوڑا اور نہ ہی ان کے دفاع وتحفظ سے پرہیز کیا۔

۵: حملہ کا حکم دیا ہی نہیں تھا تو ماہ حرام کی بے حرمتی اور حملہ کی ذمہ داری نبی مکرم پر ڈالنے کی منطق باطل اور غیر معقول ہے۔

واٹ کی تضاد بیانی: واٹ کی تضاد بیانی از خود اس کی دلیل اور اس کی تحقیق کا رد کرتی ہے۔ ایک طرف وہ کہتا ہے کہ ماہ مقدس میں حملہ کی ذمہ داری اور حکم آپ ﷺ کا تھا۔ دوسری طرف اس کی تردید کرتا ہے کہ ''اگر آپ نے رجب میں حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا ہی تھا اور آپ کے ساتھیوں نے اسے عملی جامہ پہنایا بھی تھا تو ایسا کر کے ارادتاً بے حرمتی کا ارتکاب نہیں کیا تھا کیوں کہ آپ ماہ رجب کو مقدس ہونے کے تصور کو جاہلی مذہب کا حصہ سمجھتے تھے اور پورے جاہلی مذہب کے خلاف برسرِ پیکار تھے۔ اس لیے آپ کے نزدیک کارواں پر حملہ کرنا کوئی گناہ کا کام نہیں تھا''۔

مذکورہ تضاد بیانی کئی وجوہ سے قابل تسلیم نہیں ہے۔

۱: آپ نے مجاہدین سے فرمایا کہ میں نے حملہ کرنے کا نہیں کہا تھا۔

۲: مالِ غنیمت قبول نہ فرمایا اور کچھ وقت کے لیے اسے معطل رکھا۔

۳: ماہ مقدس کی بے حرمتی کے اشارے تک ماخذ سے نہیں ملتا۔

اعتراض نمبر ۲۹۹

مدنی مسلمانوں میں بہت سوں کو غالباً اس بات کا ڈر تھا کہ ماہ مقدس کی بے حرمتی کی پاداش میں قدیم دیوی دیوتاؤں کا عذاب کہیں ان کے اس جرم میں پوری قوم کو آ پکڑے۔اس ردعمل سے رسول کریم ﷺ نے اول تو حملہ کرنے سے اپنے سابقہ حکم کی تردید کی تھی۔اور سرزنش کی تھی اور غنیمت کی تقسیم کو معطل کر رکھا تھا''۔

جواب: نہایت بے کار، بے بنیاد الزام ہیں۔۱: مدنی مسلمانوں کو بتوں کو توڑنے کا ڈر نہ تھا تو کیسے ماہ مقدس کی بے حرمتی سے دیوتاؤں سے خوف زدہ تھے۔۲: پوری قوم بت پرستی چھوڑ کر توحید کی قائل تھی قوم جس نے بتوں کی پوجا کو ترک کر دیا اس وقت دیوی دیوتاؤں کے عذاب کا ڈر کیونکر لاحق نہ ہوا تھا۔اگر انھیں خوف وخطر ہوتا تو اسلام کو ہرگز قبول نہ کرتے بل کہ اسلام قبول کر کے ہر قسم کے لغو خوف جاتے رہتے ہیں۔کیسی بچگانہ اور خام خیالی کی باتیں ہیں۔پھر کہتا ہے کہ'' مدنی مسلمانوں کو قدیم مذہب سے مکہ والوں کہ بہ نسبت زیادہ لگاؤ تھا۔۳: مکہ کو اہل مدینہ سے جنگ وجدال کا زیادہ تجربہ تھا۔

مدینہ والوں کو مکہ والوں سے قدیم مذہب سے لگاؤ زیادہ تھا ہرگز نہیں کیوں کہ اس کا ثبوت ان کی تیز رفتاری اور خلوص نیت سے اسلام کا قبول کرنا تھا۔آئے دن لوگ جوق در جوق حلقہ اسلام میں داخل ہو رہے تھے۔کوئی مدنی اسلام قبول کرنے میں کسی سے پیچھے نہ رہا تھا۔نیز متعدد مدنی صحابہ کے بت شکنی کے واقعات اس کی تردید کرتے ہیں۔ہاں یہود مدینہ کو اہل مکہ سے زیادہ مذہبی لگاؤ تھا۔جہاں تک مکہ والوں کو جنگ کا تجربہ زیادہ تھا تو یہ بھی درست نہیں اگر مدینہ والوں کو زیادہ تجربہ نہ تھا تو کم بھی نہ تھا۔تاریخ شاہد ہے کہ اوس، خزرج یہودی قبائل کے خلاف مدتوں لڑتے رہے تھے جس کے نتیجہ میں بیس سال طویل اور خونی جنگیں جیسے سمیر، حرب حالب، حرب کعب بن عمرو اور بعاث وغیرہ لڑی گئی تھیں۔(۳/۳۱۳ن) اتنے طویل عرصہ میں نبرد آزما رہے جس سے انہیں قسم قسم کے جنگی تجربات حاصل ہو چکے ہوں گے۔

ضمناً اعتراض

ماہ حرام کی بے حرمتی کے دو ثبوت الزام لگانے کے یہ ہیں۔۱: مدینہ میں شدید ردعمل، غنیمت کو معطل رکھا اور سریہ کے مجاہدین کی سرزنش کی۔۲: قرآن مجید کی متعلقہ آیت میں ماہ حرام میں جنگ کرنے کے بیان میں جن سوال کرنے والوں کی طرف اشارہ ہے اس سے مراد مسلمانان مدینہ ہیں۔

جواب: غنیمت کی معطلی مسلمانوں کے کسی مخالفانہ عمل کے سبب نہ تھی بل کہ اصل وجہ یہ تھی کہ نبی مکرم ﷺ کی اجازت اور حکم کے بغیر حملہ کیا گیا تھا۔اس کے نتیجہ میں غنیمت جائز نہ تھا۔

۲: مسلمانوں پر واضح کر دیا گیا کہ بلا تصریح اجازت و حکم کے حملہ کرنا اور غنیمت لانا کسی صورت میں جائز نہیں۔

۳: نیز اس وقت تک غنیمت کے بارے میں کوئی حکم خداوندی موجود نہ تھا جس کی پیروی کی جاتی۔

۴: یہ قول بعض مورخین غنیمت کے احکام جنگ بدر کے موقع یعنی اختتام جنگ پر نازل ہوئے تھے۔ واٹ بھی اس قرآنی حکم سے انکار نہیں کرتا تو کیا ان دعوؤں کی تردید کے لیے یہ کافی نہیں۔

ان مخالفین کے اپنے ایک مورخ نے لکھا ہے "یہ امر خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ محمد ﷺ کی فوج نے بدر کے غنیمت پر جھگڑا بالکل اسی طرح شروع ہوا، جس طرح حضرت داؤدؑ کی فوجوں میں عمالکی غنیمت پر ہوا تھا، جو لوگ جنگ بدر میں شریک ہوئے تھے وہ اس بات پر مصر تھے کہ مال و اسباب کی نگرانی کرنے والے کو، جو جنگ میں شریک نہیں ہوئے، کوئی حصہ نہ دیا جائے لیکن دونوں صورتوں میں ایک ہی فیصلہ دیا گیا جو مستقبل میں قانون کے مطابق سب کو حصہ ملنا چاہیے"۔ (روح البیان ۸۔۴۶۳) بنو نضیر کی زمینیں اور سامان جنگ جو وہ اپنے ساتھ نہ لے جا سکے تھے، آنحضرت ﷺ نے انصار سے اجازت لے کر مہاجرین میں تقسیم کر دیئے۔ مہاجرین اپنے مدنی انصار بھائیوں کے فیاضانہ سلوک سے خوش ہوئے، آپ ﷺ کو معلوم تھا کہ اہل مدینہ کی امداد غیر مستقل ہے اس لیے آپ ﷺ نے انصار کے روساء کو جمع کیا اور ان سے دریافت فرمایا کہ اس مال کو ان کے غریب مہاجرین بھائیوں میں تقسیم کرنے پر انہیں کوئی اعتراض نہیں؟ سب نے بیک آواز کہا: یہودیوں کا مال ہمارے مہاجر بھائیوں میں تقسیم کر دو اور ہمارے مال سے بھی کچھ حصہ انہیں دے دو، ہم بخوشی اجازت دیتے ہیں ۔اس پر آپ ﷺ نے جائداد کو مہاجرین میں تقسیم کر دیا اور انصار کو بھی حصہ ملا جو بہت غریب تھے۔

جز دوم: سورہ بقرہ کی آیت کی تائید و تفسیر و روایت سے نہیں ہوتی ہے کہ ماہ مقدس میں قتال کرنے کے لیے مسلمانوں نے سوال کیے تھے یہ جز واقدی اور بلاذری کے، جو کہتے ہیں کہ مدینہ کے مسلمانوں نے سوالات کیے تھے اور طبری کی ابو جعفر والی روایت میں ایسا ہے باقی کسی میں نہیں۔ بعض مفسرین نے آیت کے سیاق و سباق کے حوالہ سے کہا ہے کہ اس سے مراد مشرکین مکہ تھے ان کی دلیل یہ ہے کہ "خدا کی راہ میں روکنے والے، مسجد حرام میں داخل نہ ہونے دینے اور کفر الٰہی کرنے اور مسجد حرام کے باسیوں کو جلاوطن کرنے اور قتل سے زیادہ فتنہ کے خطرناک ہونے کا مسلمانوں کو جواب میں طعنہ نہیں دیا جا سکتا ہے۔ یہ وہ جرم تھے جن کا ارتکاب قریش کرتے تھے۔ خاص کر آیت کا آخری فقرہ (ترجمہ) کہ وہ تم سے برابر لڑتے رہیں گے اور اپنی استطاعت بھر تم کو دین سے برگشتہ کرنے کی کوششیں کرتے رہیں گے" سے پہلے حصہ آیت کی تصریح ثابت ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ الزامی جوابات قریش مکہ کے اعتراضات کے رد عمل کے طور پر بیان ہوئے

ہیں۔ نیز ماہ حرام کی تقدیس کا اعتراف کیا گیا ہے اور واٹ کا خیال کہ ''نبی مکرم کو ماہ مقدس کی حرمت کا خیال تک نہ تھا'' باطل ٹھہرا۔ مقدس مہینوں کے معاملہ میں عرب کے قدیم جاہلی مذہب اور دین اسلام میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہ رہا ہر گز نہیں!۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان مہینوں میں قتال مشروط ہے۔ یعنی مسلمانوں پر کہیں سے بھی جنگ مسلط کی جاتی ہے تو اس کے مقابلہ میں مدافعاتی عمل از بس ضروری ہے۔ اس کا نتیجہ تھا کہ رسول اکرم ﷺ نے بعد کے زمانے میں متعدد سرایا و غزوات مختلف مقدس مہینوں میں بھیجے یا خود حصہ لیا۔

واٹ کی ایک اور لن ترانی: واٹ کا خیال ہے کہ ''شہر حرام'' کی تعین خاصی مشکل ہے۔۲: قرآن بعض دوسری جگہوں پر صرف ایک ماہ کا ذکر کرتا ہے۔۳: ایک اور مستشرق کے خیال سے اتفاق کر کے واٹ کہتا ہے کہ غالباً عرب کے مختلف علاقے اور قبیلے مختلف مہینوں کی تصدیق کے قائل تھے۔ چنانچہ دونوں مستشرقین کے نزدیک چار ماہ کی قید دراصل مصالحت کی ایک کوشش تھی۔

جواب: سورہ توبہ آیت نمبر ۳۶ کی علمائے کرام نے صراحت کی ہے اور چار ماہ، رجب، ذی قعدہ، ذوالحج اور محرم الحرام کو حرام مانا اور جانا ہے۔ جہاں دوسرے دعویٰ کا تعلق ہے کہ مختلف قبیلے مختلف مہینوں کے قائل تھے نص قرآنی سے اس دعویٰ کی تردید ہوتی ہے۔ ارشاد ربانی ہے (ترجمہ) مہینوں کی گنتی اللہ کے پاس بارہ مہینے ہیں۔ اللہ کے حکم میں جس دن زمین و آسمان پیدا کیے۔ ان میں چار ماہ ادب کے ہیں۔ لیکن واٹ یہ نتیجہ اخذ کرنے کی بے سروپا باتیں کرتا ہے۔ ایک ماہ حرام سے قرآن کے نزدیک بھی مقدس مہینوں میں مشتبہ ہے کم از کم متعین ہے۔ یہ بھی غلط ہے کیوں کہ جہاں جہاں قرآن مجید میں صیغہ واحد کا استعمال ہوا ہے وہاں ان مقدس مہینوں سے کوئی ایک مقدس مہینہ مراد ہے جس کا سیاق وسباق سے پتہ چلتا ہے۔

چار ماہ کی قید مصالحانہ کوشش ہے ورنہ مختلف علاقوں میں مختلف مقدس مہینے سمجھے جاتے تھے۔ یہ ایک اور شعوری طور پر غلطی ہے۔ اس بارے میں نہ تو کوئی تاریخی شہادت ہے اور نہ ہی پرکھ پڑچول اور تنقید کی کسوٹی سے یہ سچ ثابت ہوتی ہے۔ البتہ اس کی تردید عربوں کے قاعدہ ''نسی'' سے بھی ہوتی ہے جس سے وہ اپنی خواہشات اور مصلحتوں سے مقدس مہینوں کو حلال کر لیتے تھے۔ قرآن مجید کی اگلی آیت میں اس بے حرمتی کی شدید مذمت کی گئی ہے۔ مختلف مہینے اگر حرام ہوتے تو سال کا کوئی حصہ خالی نہ ہوتا اور ''نسی'' کی ضرورت ہی نہ رہتی۔ (۳/۳۱۶ ن)

اعتراض نمبر ۳۰۰

سریہ نخلہ میں مجاہدین نے فرمان نبوت کی ہدایت سے تجاوز کر کے یا ایک طرح کی حکم عدولی کر کے ماہ مقدس میں کاروانِ قریش پر حملہ کیوں کیا تھا؟ وہ تو قریش یا کاروانِ قریش کی خبریں معلوم کرنے کے لیے گئے تھے۔ مستشرقین اس حملہ کو لوٹ مار کہتے ہیں۔۲: واقدی اسے دنیاوی غرض سمجھتا ہے

اور ماہ مقدس میں حملہ کرنے کی توجیہہ مآخذ سے کی جاتی ہے کہ کارواں ہاتھ سے نکل جاتا تھا تاخیر کی صورت میں۔۳: واٹ یہ بھی کہتا ہے کہ ''کاروانِ نخلہ نے متوقع تاریخوں سے کچھ پہلے سارے اندازے گڑبڑ کر دیے تھے''۔

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ اگر وہ کارواں اپنی تقدیم آمد کے سبب خلاف توقع پہنچ گیا تھا تو اسے نکل جانے دیتے کیوں کہ اس راہ پر تو کارواں آتے جاتے رہتے تھے کوئی اور آ جاتا، یہ نہ سہی۔ ایک دو دن بعد کسی اور کو گھیر لیتے۔ واقدی نے جس کارواں کا حوالا دیا ہے یہی خاص تھا۔ واقدی کے اس بیان کی تردید اس کی اپنی روایت کے اس حصہ سے ہوتی ہے جس میں مسلم مجاہدین کے حملہ کرنے اور نہ کرنے والوں کا ذکر کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلم جماعت غالباً سر شام ہی نخلہ پہنچی تھی کہ اچانک کاروان بھی آ پہنچا اور قریب ہی خیمہ زن ہو گیا۔ ہر دو فریق کو ایک دوسرے سے خوف تھا۔ کارواں کو غارت گری کا خوف تھا جسے حضرت عکاشہ بن محض اسدیؓ نے فوری حلق کرا کے زائرین ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ یہ غارت گر نہیں ہیں۔ قریش مطمئن ہو گئے۔ دوسرا یہ کہ قریش بھی ان کے بارے میں تفتیش نہ کریں کیوں کہ یہ غارت گری کی چال نہ تھی۔ یہ مسلم جماعت خبر گیری کے لیے آئی تھی۔ لیکن مسلمانوں کا اضطراب بڑھتا گیا کہ کوئی قریشی انھیں پہچان نہ لے۔ پہچان کی صورت میں خبروں کی فراہمی کا کام مشکل ہو جاتا اور خود مسلم جماعت کی زندگی خطرہ میں پڑ سکتی تھی۔ اس صورت حال میں مسلمانوں کے پاس سوائے اس کے کوئی اور چارہ نہ تھا کہ کاروان قریش پر حملہ کر کے تمام آدمیوں کو ٹھکانے لگا دیں یا قابو کر لیں تا کہ ان کی موجودگی کا علم نہ ہونے پائے۔ جب کہ ایک شخص بچ بچا کر نکل گیا جس سے منصوبہ ناکامی سے دوچار ہوا۔ مسلم جماعت نے فیصلہ کیا جو بھی ملے اسے قتل یا گرفتار کر لیا جائے۔ مال اپنے قبضے میں کر لیا جائے۔ ان مذکورہ بیانات سے ثابت ہوتا ہے کہ اصلاً حملہ کرنا مقصود نہ تھا۔ چھاپہ مارنا اور لوٹ مار کرنا نہ تھا۔ یہ بدلتے حالات کی نزاکت کے تحت وقتی فیصلہ تھا۔ نیز ایک شخص کے بچ نکلنے سے نخلہ کے مقام پر قیام بے معنی ہو گیا تھا۔ اس لیے مدینہ لوٹ آنا فطری عمل تھا لیکن یہ بات یقینی ہے کہ یہ سریہ قریش پر نظر رکھنے کے لیے بھیجا گیا تھا نہ کہ چھاپہ مارنے یا حملہ کرنے کی غرض سے تھا۔ جدول نمبر۲ پر ایک نگاہ ڈالیں تو ان سرایا اور غزوات کی وجوہات کا علم ہو سکے گا کہ یہ سریے اور غزوے کیونکر ہوئے۔

نتیجہ سرایا اور غزوات کا: اس نقشہ کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ پہلی مہم قبیلہ جہینہ سے تعلقات قائم کرنے کے لیے بھیجی گئی تھی۔ دوسرا سریہ بنوخزاعہ اور بنوضمرہ سے دوستی کا ہاتھ بڑھانے کی غرض سے بھیجا گیا تھا۔ تیسرا سریہ دوبارہ بنوضمرہ سے مزید گفتگو کر کے معاہدہ کی راہ ہموار کرنے کے لیے گیا تھا۔ چوتھا غزوہ ابواء تھا۔ بنو ضمرہ سے معاہدہ کیا۔ پانچواں غزوہ بواط تھا جس کی غرض قبیلہ جہینہ کے ساتھ تعلقات استوار کرنا مقصود تھا۔

چھٹا غزوہ تادیبی کاروائی تھی جو کہ ملی جنگ جو کرز بن جابر فہری کے خلاف تھی، جو اونٹنیاں ہنکا کر لے گیا تھا۔ ساتواں غزوہ ذوالعشیر ۃ کا مقصد بنو مدلج سے معاہدہ کرنا تھا اور معاہدہ کیا گیا۔ آٹھواں سریہ نخلہ جس کی غرض قریش پر نظر رکھنا اور خبریں معلوم کر کے مرکز کو پہنچانا تھا۔ اتفاقاً مڈبھیڑ ہوئی جس کے نتیجہ میں ایک قتل، دو قیدی اور غنیمت تقریباً بیس ہزار درہم ہاتھ لگا۔ یہ تھا نتیجہ غزوہ بدر سے پہلے بھیجے گئے دستوں کا۔

ایک اور زاویہ نگاہ سے حملہ اور لوٹنے کا مختصر جائزہ: ایک اور زاویہ نگاہ سے غزوہ بدر سے پہلے کے سرایا اور غزوات پر نظر ڈالتے ہیں کہ الزامات کی رہی سہی کسر نکل جائے اور الزامات کا بھانڈا چوراہے میں پھوڑ دیا جائے۔ سب سے پہلے ایک جدول پیش کرتے ہیں تاکہ آئندہ کی گفت گو کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

کاروانوں کی منازل اور منازل پر مدت قیام

نمبر شمار	نام سریہ/غزوہ	نام منزل	مدینہ سے فاصلہ تا منزل	تعداد مسلم جماعت	تعداد کفار کارواں
۱	سریہ حمزہ بن عبدالمطلب/ سیف البحر	عیص	۳۰ میل	۳۰	۳۰۰
۲	سریہ عبیدہ بن حارث/ رابغ	رابغ	۶۰ میل	۸۰۔۶۰	۲۰۰
۳	سریہ سعد بن ابی وقاص/ الخرار	خرار	۱۰۰ میل	۸	--
۴	غزوہ ابواء/ ودان	ودان (ابواء)	۸۰ میل	۷۰۔۶۰	--
۵	غزوہ بواط	بُواط	۲۰ میل	۲۰۰	۱۰۰
۶	غزوہ زالعشیر ۃ	ذالعشیر ۃ	۹۰ میل	۲۰۰۔۱۵۰	--

ان سرایا اور غزوات میں غزوہ سفوان اور سریہ نخلہ کا ذکر جانتے ہوئے جدول میں درج نہیں کیا گیا کیوں کہ ان کی نوعیت بالکل مختلف تھی یعنی غزوہ سفوان ایک تادیبی کاروائی تھی۔ کرز بن جابر مسلمانوں کی اونٹنیاں بھگا لے گیا تھا۔ اس کا تعاقب کیا تھا لیکن وہ نکل چکا تھا اور سریہ نخلہ کی منزل نخلہ مدینہ سے ۴۰۰ کلو میٹر کے قریب تھی۔ باقی مذکورہ چھ مجاہدین کی جماعتیں بہ قول معترضین قریشی کاروانوں کو لوٹنے کے لیے بالخصوص بھیجی گئی تھیں۔ اگر یہ مان لیا جائے تو کاروانوں کو لوٹنے کے لیے تجارتی شاہ راہوں پر پہنچنا ضروری تھا۔ ان منازل کی طرف مجاہدین کی جماعتوں کو بھیجنے کے کیا معنی؟

دوم:۔ کاروانوں کا راستا یمن سے شام کو براستا مدینہ جاتا تھا تو کیا یہ منزلیں تجارتی شاہ راہ پر واقع تھیں جہاں سے گزرتے تھے؟

سوم: ماخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منازل کاروانوں کی گزرگاہ سے ہٹ کر تھیں۔

راستے اور منزلیں الگ: اس کا ثبوت یہ ہے کہ دوسری مہم کے بارے میں ابن سعد کا بیان ہے کہ جس جگہ فریقین کا آمنا سامنا ہوا، شاہراہ تجارت سے ہٹ کر ہوا تھا۔ کفار اپنے جانوروں کو چرانے کی

غرض سے شاہراہ چھوڑ آئے تھے اور مجاہدین کی منزل شاہ راہ تجارت سے ہٹ کر تھی۔ اسی طرح کی خرار منزل بھی ہٹ کر تھی۔ ابواء مکی کاروانوں کی گزرگاہ تھا مگر ودان راستے سے چھ میل اندر کی طرف تھا۔ جب سرایا اور غزوات کی منازل الگ تھیں اور تجارتی کارواں کے راستے الگ تھے تو پھر یہ لوٹ مار کی مہمیں کیسے ہوئیں؟ اسلام لوٹ ہے، کا کیا جواز؟ مجاہدین کے دستے غارت گر اور ان کا سردار غارت گروں کا سردار کیوں اور کیسے؟ الغرض اقتصادی خودمختاری یا عربوں کی غربت اور تنگ دستی کا ذریعہ یا قریش پر معاشی دباؤ بڑھانے کا طعنہ اور غدارانہ حملہ کہنا سب کے سب باطل ٹھہرتے ہیں۔

وقت کا ضیاع: ان کاروائیوں میں سریہ حارث بن عبدالمطلب میں ڈیڑھ ماہ لگا۔ ابواء میں ۱۵ دن یا ایک ماہ، بُواط میں سترہ دن یا ایک ماہ۔ ذوالعشیر ۃ میں ایک ماہ بائیس دن یا ڈیڑھ ماہ لگا۔ سریہ نخلہ میں دس یا بارہ دن اور ینبوع میں ہفتہ یا عشرہ لگا ہوگا۔ مدینہ سے منازل کے فاصلہ کا تعین تقریباً تیس سے سو میل تک ہے جہاں مجاہدین کی جماعتوں کو بھیجا گیا تھا۔ ان تمام منازل کو دو سے پانچ چھ دن میں طے کیا جا سکتا تھا اور واپسی مدت بھی اتنی ہی ہوگی مگر مجاہدین کے دستے زیادہ عرصہ وہاں ٹھہرے رہے۔ یہ وقت کا ضیاع کیونکر کیا گیا تھا اور وہیں قیام کرنا قریش کے کاروانوں کے انتظار کی غرض سے نہیں تھا۔ اس سلسلے میں واقدی نے بنو جزام کے جاسوس کی جو روایت بیان کی ہے غلط ہے کہ قریشی کارواں گزر گیا۔ شام کی طرف آپ ذی العشیر ۃ پہنچے پھر ڈیڑھ ماہ قیام کیا اور انتظار کیا۔ جب کارواں کے لوٹنے کا وقت آیا تو مدینہ چلے آئے پھر نیا لشکر تیار کیا اور کارواں کو روکنے کے لیے پہنچے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ کارواں کے لیے جاتے وقت مسلمانوں کا پہلا لشکر ہی کافی تھا اور پھر واپسی آنے والے کارواں قریش کے لیے نئے لشکر کی ضرورت کیوں پڑی تھی؟ وہاں رہ کر تھوڑی کمک کا انتظام کر لیا جاتا تو یہ آنے جانے کی محنت و کوفت سے آسان تھا مگر ایسا نہیں کیا گیا کیوں؟ ان تمام باتوں سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ مجاہدین کی کاروائی کا مقصد کچھ اور تھا یعنی خبر گیری اور دشمن کی کاروائیوں پر نظر رکھنا تھا۔ اس کے سوا کوئی اور مقصد نہ تھا۔

واٹ کی ہرزہ سرائی: واٹ ایک طرف یہ کہتا ہے کہ مسلمانوں کا نظام جاسوسی ناکام تھا۔ کارواں بچ بچ کر نکل جاتے تھے۔

جواب: اپنی دلیلوں کے خلاف واٹ یہ کہتا ہے کہ نخلہ میں آپ کو گزرنے والے کارواں کی تاریخ کا اتنا حتمی علم تھا کہ مدینہ کا فوجی دستہ تین چار سو کلومیٹر کا سفر طے کر کے کارواں کو لوٹنے میں کامیاب ہوا۔ جھوٹ کے پیر کہاں! جھوٹ عقل کو کھا جاتا ہے۔ کبھی کچھ کہنا کبھی کچھ ان کے جھوٹ کی رام کہانی ہے۔ عقل کے اندھوں کو کیا کہا جائے۔ انھیں نہ اپنے دعویٰ کی فکر نہ اپنی دلیل سے غرض جو سوجھی کہتے چلے جاتے ہیں۔ کیا یہ بات حیران کن نہیں ہے کہ تین چار سو کلومیٹر دور تو مسلم جاسوسوں کی خبر سو

فیصد صحیح نکلی لیکن بہ قول واٹ ہی کے مسلمان اپنے گھر کے قریب درست خبر معلوم کرنے میں ناکام رہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ اپنے علاقے میں چھ سات مرتبہ ناکام رہے۔ حال آنکہ صورت حال اس کے برعکس ہے وہ یہ کہ نظام جاسوسی میں کمی نہ تھی۔ یہ (طلیعے) گشتی دستے قریش کی کاروائیوں پر نظر رکھنے کے لیے مقرر کیے گئے تھے۔ ان کی تردید اور رد کے لیے یہی کافی ہے کہ غزوہ بدر اور صلح حدیبیہ کے درمیانی مدت میں حضرت زید بن حارث نے دو قریشی کاروانوں پر چھاپے مارے تھے جو بچ کر نہ جا سکے۔ یعنی نہ تو مسلم جاسوسوں نے ناکامی کا منہ دیکھا تھا نہ مجاہدین کے دستوں نے اور نہ ہی مسلم فوجی حکمت عملی نے منہ کی کھائی تھی۔ تو پھر بھلا کیسے ان کے نظام جاسوسی کی کم زوری مان لیں اور اسے ناقص نظام جاسوسی سے تعبیر کریں۔

لوٹ مار سے آمدنی اور کفالت مجاہدین یا اہل مدینہ: سب سے پہلے سرایا اور غزوات کے غنیمت کا شیڈول ملاحظہ کرلیں۔ تاکہ اقتصادی خودمختاری کا حصول بہ ذریعہ لوٹ مار کے مستشرقین کا الزام خاک بوس ہو جائے۔

لوٹ اقتصادی خودمختاری کے حصول کا ذریعہ تھی۔

نمبر شمار	سنہ	مہم سریہ یا غزوہ	تخمینہ غنیمت
۱	۲ھ ۶۲۴	سریہ نخلہ/عبداللہ بن جحش	بیس ہزار درہم
۲	۲ھ ۶۲۴	غزوہ بدر اکبر	ایک لاکھ ساٹھ ہزار درہم
۳	۲ھ ۶۲۴	غزوہ بنو قینقاع	۲۵۰ لاکھ درہم
۴	۲ھ ۶۲۴	غزوہ سویق	۲ ہزار درہم
۵	۳ھ ۶۲۴	غزوہ الکدر	۲۰ ہزار درہم
۶	۳ھ ۶۲۴	سریہ قروہ	ایک لاکھ
۷	۳ھ ۶۲۴	غزوہ احد	چھ سو سولہ درہم
۸	۴ھ ۶۲۵	سریہ قطن	باون ہزار چار سو درہم
۹	۴ھ ۶۲۵	غزوہ بنی النضیر	۳ لاکھ
۱۰	۵ھ ۶۲۶	غزوہ دومۃ الجندل	دس ہزار

۱۱	۵ھ ۶۲۶	غزوہ مریسع/مطلق	۲لاکھ درہم
۱۲	۵ھ ۶۲۶	غزوہ خندق	۲ہزار درہم
۱۳	۵ھ ۶۲۶	بنوقریظہ	سات لاکھ ۲۰ ہزار درہم
۱۴	۶ھ ۶۲۷	سریہ القرطا	
۱۵	۶ھ ۶۲۷	سریہ الغمر	
۱۶	۶ھ ۶۲۷	سریہ الصقہ	ستر ہزار درہم
۱۷	۶ھ ۶۲۷	سریہ الجموم	
۱۸	۶ھ ۶۲۷	سریہ دار الطرف	
۱۹	۶ھ ۶۲۷	فدک	
۲۰	۶ھ ۶۲۷	فزارہ	
۲۱	۷ھ ۶۲۹	غزوہ خیبر	
۲۲	۷ھ ۶۲۹	غزوہ فدک	
۲۳	۷ھ ۶۲۹	سریہ تیما	
۲۴	۷ھ ۶۲۹	سریہ وادی القری	٦لاکھ ۵۰ ہزار درہم
۲۵	۷ھ ۶۲۹	سریہ نجد	
۲۶	۷ھ ۶۲۹	سریہ فدک	
۲۷	۷ھ ۶۲۹	سریہ میفعہ	۲لاکھ
۲۸	۷ھ ۶۲۹	سریہ الجناب	
۲۹	۳۰-۶۲۹ھ	سریہ الکدید	
۳۰	۳۰-۶۲۹ھ	سریہ السی	پچاس ہزار درہم

۳۱	۳۰_۶۲۹ھ	سریہ موتہ	
۳۲	۳۰_۶۲۹ھ	سریہ الحضر ۃ	
۳۳	۳۰_۶۲۹ھ	غزوہ فتح مکہ	
۳۴	۳۰_۶۲۹ھ	غزوہ حنین	۳۲لاکھ درہم
۳۵	۳۱/۳۰ھ	سریہ بیشہ	
۳۶	۳۱/۳۰ھ	سریہ الفلس	
۳۷	۳۱/۳۰ھ	سریہ دومۃ الجندل	دو لاکھ ۵۰ ہزار درہم
۳۸	۳۱/۳۰ھ	سریہ الیمن	

بدر اکبر۔ قینقاع، سویق، احد، دومۃ الجندل، مریسع، خندق، بنوقریظہ، حنین، خیبر، فدک، تیما، وادی القریٰ، مکہ، السی، موتہ، الحضر ہ۔۔۔۔ اٹھاون لاکھ چوبیس ہزار چھ سو سولہ۔۔صرف کل مالیت ہی لکھ دی ہے تفصیل کے لیے نقوش جلد ۱۱/ ۴۲۷ دیکھیں۔

کل ۱۱ غزوات میں غنیمت ہاتھ لگا۔ ان میں سریہ تیما، فدک، وادی القریٰ، السّی، موۃ الحضر ہ شامل ہیں۔ کیوں کہ غزوہ مکہ اور خیبر کی الگ غنیمت معلوم نہیں ہو سکی۔ ان کی مالیت اٹھاون لاکھ چوبیس ہزار چھ سو سولہ ہے۔

غزوات ۹ سرایا ۱۵=۲۴۔ یعنی ۲۴ غزوات و سرایا میں تلوار چلی۔ باقی (۶۴_۵۸_۶۲) میں تلوار استعمال نہ ہوئی۔

یعنی دس سال میں اوسط لڑائیاں ۸۶ جن میں صرف چوبیس میں تلوار باقی ۶۲ میں بے سیف ہوئے اور وہ ۲۴ بھی مسلمانوں پر مسلط کی گئی تھیں جیسا کہ چارٹ سے ظاہر ہے۔

تمام سرایا و غزوات سے جو غنیمت میں ہاتھ لگا اس سے کس حد تک مسلم معیشت مدینہ کی مال داری اور غریب مسلمانوں کی ناداری و مفلسی دور کرنے کا وسیلہ بنا تھا؟ اب سوال یہ ہے کہ عہد نبوی کی غنیمت کا مالیت کا مجموعی تخمینہ کتنے افراد ملت مسلمہ کی خورونوش اور دوسری ضروریات زندگی کی کفالت کے لیے کافی تھا۔ فرض کریں کہ ایک اوسط درجہ خاندان چار افراد پر مشتمل ہو تو اسے سالانہ تین ہزار درہم کی ضرورت ہوتی تھی۔ خلیفہ اول کو اڑھائی تین ہزار سالانہ تنخواہ ملتی تھی اس حساب سے ایک خاندان کا خرچہ فرض کیا گیا ہے۔ اس مجموعی رقم سے مشکل سے گزر بسر ہو سکتی ہے۔ غنیمت کی کل مالیت باسٹھ لاکھ

درہم تھی جو تقریباً ۲۰۶۷ خاندان کے لیے ممکن ہے اور یہ کفایت بھی صرف ایک سال کے لیے۔ ہجرت سے قبل یہودی آبادی پانچ یا چھ ہزار خاندان یا تیس سے چالیس ہزار افراد پر مشتمل تھی اور انصار مدینہ کی آبادی بھی یہودی آبادی سے کم نہ تھی بل کہ اسلام میں داخل ہونے والے افراد سے اضافہ ہوتا جا رہا تھا جس کے نتیجہ میں کہا جا سکتا ہے کہ مسلم آبادی یہودی آبادی سے کہیں زیادہ تھی۔ غزوہ فتح مکہ میں دس ہزار مجاہدین تھے جن میں کم از کم نصف مدینہ کے انصار و مہاجرین تھے۔ اس طرح مدینہ کے مسلمانوں کی آبادی تیس یا پینتیس ہزار تھی۔ کچھ مسلمان فتح مکہ میں دفاع مدینہ یا دیگر وجوہات سے شامل نہ ہو سکے اور مدینہ کے کئی خاندانوں میں سے ایک ہی خاندان کے کئی افراد نے شرکت کی تھی۔ اگر اس تعداد کو کل تعداد سے تفریق کر دیں تو مدینہ کی آبادی کم ہو جائے گی لیکن مدینہ کی آبادی مذکورہ اعداد و شمار سے کم نہ تھی۔ فتح مکہ کے بعد مزید اضافہ ہوا اور تقریباً دو برس بعد غزوہ تبوک میں اسلامی فوج کی تعداد دس ہزار تھی۔ برکات احمد کے مطابق کل مدنی آبادی ۵۰ یا ۶۰ ہزار نفوس کے لگ بھگ تھی۔ اگر ایک ہی خاندان کے ایک سے زیادہ افراد شامل ہونے کو بنیاد بنائیں اور نصف گھٹا دی جائے تب بھی مدنی آبادی ۲۵ یا ۳۰ ہزار بنتی ہے۔ اس کی تصدیق ابن کثیر کی روایت سے بھی ہوتی ہے کہ مسلمانوں کی کل آبادی عہد نبوی میں تیس ہزار تھی۔ یہ آبادی تو صرف مدینۃ النبی کی ہے جب کہ پورے عرب کی مسلم آبادی کی زیادہ سے زیادہ ایک تہائی آبادی کی صرف ایک سال کی ضروریات زندگی کی کفالت کر سکتی تھی۔ جب کہ اس تناسب سے پوری مسلم آبادی کے سالانہ اخراجات کے لیے کم از کم اٹھارہ یا بیس ملین درہم کی ضرورت تھی جب کہ مدینہ کی آس پاس آبادی اس سے علاوہ ہے۔

بہ قول ڈاکٹر حمید اللہ ''کم سے کم ایک لاکھ چالیس ہزار مسلمانوں نے رسول کریم کے آخری حج کے موقع پر میدان عرفات میں قیام کیا''۔ یہی ڈاکٹر موصوف کہتے ہیں کہ آخری زمانہ میں مسلمانان عرب کی تعداد پانچ سے دس لاکھ تھی۔ (۲۱۴) اس آبادی کی کم سے کم تعداد مان لیں پھر بھی ایک سال میں مسلم اخراجات کا تخمینہ کم سے کم شرح زندگی کے اوسط کی بنیاد پر تین سو ملین ہوگا۔ اور دس سال میں یہ تین ہزار ملین بن جائے گا۔ ثابت ہوا کہ ایک مسلم فرد بھی غنیمت کا سہارا نہ لے سکا اور ان کی پوری کمائی صرف اور صرف پر امن ذرائع سے تھی جیسے مزدوری، تجارت زراعت، صنعت و حرفت وغیرہ۔ تجارت و زراعت کو مسلم معیشت میں مرکزیت حاصل تھی۔ ہر موقع سے فائدہ اٹھا کر تجارت کو بڑھاتے تھے حتیٰ کہ جنگوں میں بھی تجارتی سامان لے جاتے تھے اور مقامی بازار سے بہت نفع کماتے تھے۔ (ن۔۱۱۔۴۳۸)

ضمناً اعتراض

اعتراض یہ ہے کہ ''مہمات کی تنظیم میں کافی روپیہ خرچ کیا تھا۔ نقل و حمل، کپڑے، غذا، چارہ اور

آلات حرب وغیرہ پر بڑی رقمیں خرچ کی تھیں‘‘۔اور اخراجات کیسے پورے ہوئے؟

جواب: اول یہ کہ جنگ احد میں قریش کے تین ہزار جنگ جو تھے۔تقریباً چھ لاکھ درہم کی رقم خرچ کی تھی۔جنگ خندق کے موقع پر دس ہزار فوجی تھے۔اہل مکہ کے ہر فرد نے چالیس درہم خرچ کیے تھے اس طرح کافی بڑی رقم جمع کر لی تھی۔جنگ بدر میں قریش کے پاس ۳۰۰ گھوڑے اور ۷۰۰ اونٹ تھے جب کہ مسلمانوں کے پاس دو گھوڑے اور ساٹھ اونٹ تھے یہی صورت حال آلات حرب کا تھا۔مسلمان اپنے گھریلو اخراجات بہ مشکل پورا کرتے تھے ان پر پیسہ کہاں سے لا کر خرچ کرتے؟

فتح مکہ کے بعد آپ ﷺ نے حنین کا ارادہ فرمایا تو مکہ کے تین مال دار قریشیوں سے مجموعی طور سے ایک لاکھ تیس ہزار درہم (تیرہ ہزار دینار) اور بڑی تعداد میں ہتھیار ادھار لیے تھے۔یہ سرمایہ صرف مکی مسلمانوں کو لیس کرنے کے لیے تھا جو ایمان لا کر لشکر اسلامی میں داخل ہوئے تھے۔اندازاً فتح مکہ اور حنین میں اسلامی لشکر پر ایک ملین درہم خرچ اٹھے گا۔غزوہ تبوک میں ۳۰ ہزار کا لشکر تھا سب سے زیادہ عطیہ حضرت عثمان غنیؓ نے ستر ہزار درہم سے کچھ اوپر تھا، دیا۔جس سے ایک تہائی لشکر کی ضروریات پوری کی گئی تھیں۔اگر بہ ظاہر یہی تسلیم کر لیا جائے تو کل تیس ہزار لشکر کا خرچہ ۴/۱ ملین درہم ہوا جو صحیح نہیں۔وہ یوں کہ لشکر میں بیس ہزار اونٹوں اور دس ہزار گھوڑوں کی قیمت بالترتیب چالیس اور تین سو درہم فی راس کے حساب سے میزان تین ملین درہم بنے گا۔ہتھیار، کپڑا، غذا، چارہ اور دیگر ضروریات پر خرچہ اس کے علاوہ ہوگا۔گویا حضرت عثمان کا عطیہ صرف نادار و مفلس مجاہدین کے ایک تہائی کے لیے تھا جو کہ مجاہدین خرچہ برداشت کرنے کے قابل نہ تھے۔(ن۔۱۱۔۴۳۱)

دوم: کل سرایہ اور غزوات میں مجاہدین کی تعداد ایک لاکھ تک پہنچ جاتی ہے۔جنگ احد میں قریش کے تین ہزار کے لشکر پر چھ لاکھ درہم رقم خرچ ہوئی تھی یعنی دو سو درہم ایک فوجی پر خرچ کیے گئے تھے۔اس حساب سے ایک لاکھ اسلامی مجاہدین پر خرچ کی رقم دو سو لاکھ درہم بنتی ہے۔قریش کی نسبت مسلمانوں کی معیشت کم زور تھی۔چلو اس معیشت کی کم زوری کے سبب ۳/۱ خرچہ کم کر دیا تو مصارف کا میزان ۶۶.۶ لاکھ درہم رہ جاتا ہے۔یہ میزان غنیمت کی کل مالیت سے چار اعشاریہ ۶ یا ۵ لاکھ درہم زیادہ ہے۔

سوم: بہ قول ڈاکٹر حمید اللہ حجۃ الوداع کے موقع پر ایک لاکھ چالیس ہزار مسلمان تھے۔عہد نبوی کے آخری زمانے میں مسلمانان عرب کی تعداد دس لاکھ کے لگ بھگ تھی۔اس حساب سے مصارف کا تخمینہ تین سو ملین اور دس سال میں تین ہزار ملین آئے گا۔اس طرح مدنی آبادی کے ایک سال کے مصارف کے مقابلے میں دس سال کی غنیمت کی تخمینی رقم ۳۴٪ بنتی ہے۔

چہارم: قیدیوں کا خرچہ، جنگی نقصان اور خسارہ (مال مویشی کی چوری/مجاہدین کا قتل) فصلوں،

درختوں کا نقصان، کئی سرایا میں صرف نقصان ہی اٹھانا پڑا۔ ان میں سے چند یہ ہیں۔ سریہ محمد بن مسلمہ، سریہ ذوالقصہ، سریہ زید یا وادی القریٰ، سریہ بشیر بن سعد، سریہ فدک، سریہ ابی العوجا، سریہ بنوسلیم، سریہ ذات الاطلاع اور موتہ وغیرہ وغیرہ۔

کامیاب جنگوں میں بھی نقصان ہوئے تھے۔ اگر آمدنی اور نقصان کا حساب لگایا جائے تو منافع کی اصل شکل ہیچ ندارد ہوگی۔ یعنی غزوات و سرایا کی ترغیب وتحریص مادی حصول کی خاطر نہ تھی۔ نہ صحابہ کو اس کے لیے برانگیختہ کیا جاتا تھا۔ اور نہ ہی صحابہ کرامؓ اس غرض سے غزوات و سرایا میں شامل ہوتے تھے۔

اعتراض نمبر ۳۰۱

اسلام لوٹ اور غارت گری کا مذہب ہے:

حضرت زید بن حارثؓ کی قیادت میں سریہ حسمیٰ کا واقعہ ہوا وہ یوں کہ مدینہ میں خبر ملی کہ بنوجزام جو مدینہ سے تین سو میل شمال میں تیما کے قریب آباد تھے مدینہ کے قافلوں اور مسافروں کو لوٹ لیتے تھے۔ ان کے خلاف تادیبی کاروائی عمل میں لائی گئی۔ انھیں شکست فاش ہوئی۔ غنیمت میں ایک سو قیدی، ایک ہزار اونٹ اور پانچ ہزار بکریاں ملیں۔ (۴۰۶/۴ ن) اس جیسی کاروائیوں کی اجازت تھی۔ ارشاد خداوندی ہے "مَالَكُم لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللهِ ۔۔۔۔ هَذِهِ القَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا"۔ (النساء۔۷۵)

ترجمہ: "تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کے لیے کیوں نہیں لڑتے جو ہر وقت دعا مانگتے رہتے ہیں کہ اے اللہ ہمیں اس بستی سے نجات دلا جس کے باشندے ظالم ہیں"۔

وہ مذہب جو لوٹ کے خلاف ہو، لوٹنے والوں کا مخالف ہو اور انھیں کیفر کردار تک پہنچانے کا داعی ہو۔ پھر یہ طعنہ کہ اسلام لوٹ ہے، یہ جنگی ٹولہ کا مذہب ہے یا اس کے پیروکاروں کو غارت گری کی تعلیم دی جاتی ہے اور ان کے سردار غارت گروں کے سردار اور یہ لوٹ ماران کی اقتصادیات کو مضبوط اور غربت کو دور کرنے کا ذریعہ بتایا جائے محض خام خیالی، نادانی اور تعصب ہے۔

اسلام میں لوٹ مار کی حرمت: جنگ خیبر میں صلح ہونے کے بعد نوجوانوں نے لوٹ مار شروع کی تو یہودیوں کے سردار نے آپؐ سے اس پر شکایت کی۔ آپؐ نے خطبہ ارشاد فرمایا "بلا شبہ اللہ نے تمھارے لیے یہ جائز نہیں کیا کہ بلا اجازت اہل کتاب کے گھروں میں گھس جاؤ یا ان کی عورتوں کو مارو پیٹو یا ان کے پھل کھاؤ جب کہ وہ تمھیں اپنے ذمے کا واجب ادا کر رہے ہوں"۔

ایک دفعہ سفر جہاد میں اہل لشکر نے کچھ بکریاں لوٹ لیں اور ان کا گوشت پکا کر کھانا چاہا۔ جب آپ ﷺ کو علم ہوا تو آپ نے ہانڈیاں الٹ دینے کا حکم دیا اور فرمایا "لوٹ کا مال مردار سے زیادہ حلال نہیں"۔ (پیغمبر امن۔۴۳۱)

اسلام غداری کی سزا دیتا ہے: قبیلہ بنو عُرینہ کے آٹھ افراد شوال ۶ ھ میں مدینہ آئے۔ اسلام قبول کیا اور مدینہ ہی میں رہنے لگے۔ آب و ہوا موافق نہ آئی۔ نبی مکرم نے انھیں مدینہ کے قریب ذوالجدر چراگاہ میں بھیج دیا جہاں آپ ﷺ کی اونٹنیاں چرا کرتی تھیں۔ اونٹنیوں کا چرواہا یسار تھا۔ یہ لوگ چنگے بھلے صحت یاب ہو گئے۔ تب انھوں نے یسارؓ کی آنکھیں پھوڑ دیں، ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے، پھر قتل کر دیا اور پندرہ اونٹنیاں بھگا لے گئے۔ ان کی سرکوبی کے لیے کرز بن جابر کو بھیجا (جو مسلمان ہو چکے تھے) اس نے انھیں جا لیا۔ حضورؐ نے انھیں سخت سزا دی۔ آپ ﷺ نے ان سے کیسا اچھا سلوک کیا تھا یعنی مہمان نوازی کی، رہنے کو جگہ دی (مدینہ اور ذاولجدر میں) اعتماد کیا لیکن بدلہ میں یسارؓ کی آنکھیں پھوڑ دیں، ہاتھ پاؤں کاٹ دیے پھر قتل کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ پندرہ اونٹنیاں بھی ہانک کر لے گئے۔ پھر بھی ہم سے گلہ کہ وفادار نہیں اور غارت گری کی تعلیم، لوٹ مار وغیرہ کا الزام اور مسلمانوں کے ذمے لگانا نادانی، حماقت، جہالت اور تعصب پر مبنی ہے۔

شبلی فرماتے ہیں کہ اول تو اسلامی شریعت اسے گناہ قرار دیتی ہے۔ دوم اگر ان مہمات کا مقصد لوٹنا اور ڈاکہ زنی اور غارت گری ہوتا تو قریش کے تجارتی قافلوں کے علاوہ یہ کہیں اور پورا نہ ہو سکتا تھا؟

ایک غلطی کا ازالہ: مسلمانوں کے دباؤ اور کوفت کے سبب لوگ اسلام قبول کرتے تھے۔ اس بارے میں قبیلہ ہمدان کی مثال پیش کی جاتی ہے۔ اس قبیلہ کے اسلام لانے سے متعلق بہت سی روایات ہیں لیکن وہ صحیح نہیں ہیں۔ خود صاحب مواہب لدنیہ نے تسلیم کیا ہے۔ ان روایات کا مفہوم یہ ہے کہ ہمدان کے لوگوں نے حضرت علیؓ کے ڈر سے اسلام قبول کر لیا تھا لیکن یہ راویوں کا حسن ظن ہے واقعہ نہیں۔

ایک روایت میں ہے کہ آپ نے ہمدان قبیلہ کو حکم دیا کہ وہ ثقیف سے ہمیشہ لڑا کریں اور ان پر غارت گری کیا کریں لیکن حافظ ابن قیم نے تصریح کی ہے کہ یہ روایت بالکل غلط ہے۔ ایک تو یہ ہمدان یمن کا قبیلہ تھا اور ثقیف مکہ کے پاس طائف میں تھے۔ یہ حکم تو دو ہمسایہ قبیلوں کو دیا جا سکتا تھا''۔ (شبلی)

مستشرقین صرف عدم صحت والی روایت پر انحصار کر کے آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ ان میں یہ صلاحیت ہی نہیں کہ روایات کی تہ تک پہنچا جائے اور تحقیق کی جائے کہ روایت باعتبار صحت درست ہے بھی کہ نہیں۔ مگر ان کو اس سے دور کا واسطہ بھی نہیں۔ وہ صرف اسلام، داعی اسلامؑ اور متبعین اسلام سے دشمنی کی بنیاد پر غلط ملط لکھ کر اعتراض کرنے سے نہیں چوکتے۔ ''لا اکراہ فی الدین'' کی قطعی نص کے ہوتے ہوئے خوف بڑھا کر یا دباؤ ڈال کر مسلمانوں کا اسلام میں غیر مسلموں کو داخل کرنے کی ممانعت تھی۔ تو پھر کیوں کر وہ مسلمان اسلامی تعلیم کی خلاف ورزی کر سکتے تھے؟

آپ ﷺ کی تعلیمات احسن ہیں: ڈاکٹر کلارک لکھتا ہے کہ ''حضرت محمد ﷺ کی تعلیمات کی ہی

یہ خوبی ملی ہے کہ اس میں وہ تمام اچھی باتیں (اعلیٰ باتیں) موجود ہیں جو دیگر مذاہب میں نہیں پائی جاتیں"۔(ن۔۴۔۴۶۶)

جواکم بواف کہتا ہے"اسلام کی تعلیم کی برتری فضیلت، منزلت اظہر من الشّمس ہے۔محمد ﷺ کا اسلام کامل مذہب ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ اسلامی تعلیم بالکل خالص ہے"۔

ماسٹر شنکر داس گیانی: آپ کی تعلیم میں ہمیں بہت سی خوبیاں نظر آتی ہیں جن کو دیکھ کر بے اختیار تعریف کرنے کو جی چاہتا ہے۔اگر آپ کچھ نہ کرتے،صرف خدا پرستی اور مساوات کی تعلیم پر اکتفا کرتے تو بہت کچھ تھا۔اتنے پر دنیا ان کے قدموں پر عقیدت کے پھول نچھاور کرتی۔مگر اب جب کہ آپ کی تعلیمات میں توحید،تقوی،نیکی،پارسائی،محبت،رواداری اور عورتوں کے حقوق کی آزادی وغیرہ چیزیں بھی نظر آتی ہیں تو ایسی حالت میں ان کی تعریف سے چشم پوشی کرنا ہٹ دھرمی اور بدترین تعصب ہے"۔ (ن۔۴۔۴۶۷۔۴۶۸)

یہ ضمناً غیر مسلموں کے بیانات اور ریمارکس تحریر کیے ہیں تا کہ معلوم ہو سکے کہ وہ مخالف کیوں کہتے ہیں کہ صحابہ کو غارت گری کی تعلیم دی جاتی تھی۔آخر میں یہ بھی ملاحظہ کریں۔

ایڈورڈ گبن صاحب کہتے ہیں کہ"محمد ﷺ کا مذہب شکوک وشبہات سے پاک صاف ہے۔قرآن خدا کی وحدانیت پر ایک عمدہ شہادت ہے۔مکہ کے پیغمبر نے بتوں کی،انسانوں کی اور ستاروں کی پرستش کو معقول دلائل سے رد کر دیا۔وہ اصول اول یعنی ذات خدا تعالیٰ جس کی بناء عقل و وحی پر ہے۔محمد ﷺ کی شہادت سے استحکام کو پہنچی چنانچہ اس کے معتقد ہندوستان سے لے کر مراکو تک موحد کے لقب سے ممتاز ہیں۔

مہمات کا ایک اور زاویہ سے جائزہ؛ دور جہالت کا قبائلی دستور:ظہور اسلام سے قبل یہ قبائلی دستور تھا کہ وہ اپنے تجارتی قافلوں کی حفاظت کی غرض سے علاقہ کے قبائل سے مدد طلب کرتے تھے۔ اس کے بدلہ میں انھیں معاوضہ دیا کرتے تھے۔اس کی تائید اس پہلو سے بھی ہوتی ہے جب ابوذر غفاریؓ نے اپنے اسلام لانے کا اعلان کیا تو کفار ان پر ٹوٹ پڑے۔مار پیٹ کرنے لگے۔حضرت عباس بن عبد المطلبؓ نے ان کو روکا اور کہا تم تاجر ہو اور تمھاری تجارت بنو غفار کے راستے سے ہوتی ہے۔کیا تم اپنی تجارت کو ختم کرنا چاہتے ہو؟ یہ کہنا تھا کہ کفار کے ہاتھ مار پیٹ سے رک گئے تھے۔(ن۔۱۲۔۳۲۸)

ہر خود مختار قبیلہ اپنے حلیفوں کو تجارتی قافلے بہ حفاظت اپنے علاقے کی حدود سے لے جانے کی اجازت دیتا تھا۔حتیٰ کہ تاجروں کے علاوہ حکمرانوں کو بھی حفاظت درکار ہوتی تھی کہ وہ اپنے تجارتی قافلوں کی حفاظتی ذمہ داری کسی بڑے قبیلہ کے سپرد کریں۔اسی سلسلہ میں حیرہ کے عرب حکمران نے اپنا تجارتی قافلہ عکاظ میں بھیجنا چاہا تھا تو بنی کنانہ اور قیس سے کہا کہ"تم میں سے ایسا کون بہادر ہے جو بہادری سے

میرے قافلہ کو عکاظ لے جائے اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری لے۔ میں اس خدمت کے بدلہ میں معقول معاوضہ ادا کروں گا۔ (مستشرقین مغرب کا انداز فکر۔ ص ۲۷۶)

قبیلہ کنانہ کے براض نامی شخص نے یہ ذمہ داری قبول کی تو عروہ بول اٹھا جو قیس قبیلہ سے تھا اور پورے عرب کے مقابلے میں ذمہ داری قبول کرنے کا دعویٰ کیا۔ نعمان بن منذر (جرہ کے حکمران) نے یہ ذمہ داری عروہ کو سونپ دی اور کارواں چل پڑا۔ براض نے عروہ کو قتل کر دیا اور کارواں کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ اس واقعہ سے چند امور برآمد ہوتے ہیں۔

الف:۔ ہر علاقے میں قبائلی نظام تھا اور کسی قبائلی علاقے سے کسی دوسرے قبیلہ کا تجارتی قافلہ بدوں اجازت و منظوری نہیں گزر سکتا تھا۔ گویا ایک قسم کا یہ پرمٹ سسٹم تھا۔

ب:۔ اس اجازت نامہ کے بدلہ ٹیکس دینا پڑتا تھا۔

ج:۔ بغیر اجازت اور منظوری تجارتی قافلے غیر محفوظ تھے۔

د:۔ قبائلی علاقہ کے سردار کی اجازت کے بغیر تجارتی کاروانوں کا گزرنا، اس کی رٹ کو چیلنج کرنا تھا جسے کسی قیمت پر برداشت نہیں کیا جا سکتا تھا۔

س:۔ یہ اجازت ایک طرح سے علاقائی معاہدہ تھا۔ معاہدہ کی توثیق اور معاوضہ کی ادائیگی کے بعد ہی یہ ممکن تھا کہ کارواں علاقائی حدود سے گزریں۔

ہجرت مدینہ کے بعد مدینہ میں ایک اسلامی ریاست کا قیام ہو چکا تھا۔ میثاق النبی اس کا بین ثبوت ہے جس کی ایک شق یہ ہے کہ ’’اس معاہدہ کے پابند افراد اور گروہ باہمی اختلاف اور تنازعہ کا مقدمہ خدا اور اس کے رسول ﷺ کے سامنے پیش کریں گے۔ (ن ۲ ص ۵۷۶)

آہستہ آہستہ آپؐ نے مدینہ کے اطراف کے بدوی قبائل سے بھی معاہدات کیے۔ جہینہ کے قبائل، بنو ضمرہ اور بنو مدلج وغیرہ سے معاہدے کیے۔ ان معاہدات کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست معرض وجود میں آ چکی تھی۔ اس کی حدود ساحل بحر تک پھیلی ہوئی تھیں جب کہ قریش اس ریاست کو تسلیم کرنے سے انکاری تھے اور اس ریاست کے مخالف اور بدترین دشمن تھے۔ ریاست کی حدود کی خلاف ورزی ان کا معمول تھا۔ ریاستی حدود کا پاس کیوں کر کرتے جب کہ وہ ریاست کے وجود کو بھی تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اس لحاظ سے مدینہ والوں کے جانوروں کو بھگا لے جاتے تھے۔ انھیں یہ احساس تک نہ تھا اور نہ ہی خوف تھا کہ وہ ریاست مدینہ کی رٹ کو چیلنج کر رہے تھے۔ ان حالات میں اسلامی ریاست کو یہ حق حاصل تھا کہ اپنی حدود کی حفاظت کرے اور ان حدود کی خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف کاروائی کرے۔ دشمن کو اپنے علاقہ میں آنے سے روکے۔ کیوں کہ انھوں نے ریاستی اقتدار یعنی

حکومت کی رٹ کو چیلنج کیا، ریاستی حدود کی خلاف ورزی کی۔ یہی قریش کی کھلی بغاوت تھی اور کاروانوں کی حیثیت سمگلروں جیسی تھی۔ مخالفین کے بہ قول ان کی ناکہ بندی اور سرکوبی کے لیے مہاجر و انصار کے چھوٹے موٹے دستے (گشتی) بھیجے جاتے تھے۔

اکثر اوقات قریش کارواں بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ قریشی کاروانوں کی ناکہ بندی کرنا نہ تھی بل کہ قریش کی کاروائیوں پر نظر رکھنے کی خاطر گشتی دستے بھیجے جاتے تھے۔ (جن کی تفصیل پیچھے گزر چکی تھی)۔ جنگ بدر کے بعد کاروانوں پر سختی سے گرفت کی گئی۔ ان کی گرفتاری عمل میں آئی۔ یہ کاروائی کرنا اسلامی ریاست کا حق تھا بل کہ ریاست کی رٹ کو قائم رکھنے کے لیے نہایت ضروری اقدام تھا۔ اگر ان سے نہ نمٹا جاتا تو نہ صرف نااہل ریاست گردانی جاتی بل کہ ریاست کے وجود کو بھی خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔

تجارتی محصول کا دستور صرف عرب کے قبائل ہی میں نہیں بل کہ متمدن دنیا کا بھی دستور ہے۔ آج ہی کی مثال لیجیے! تجارت کا مال بغیر معاہدوں کے ایک ملک سے دوسرے ملکوں کو نہیں بھیجا جا سکتا۔ اس وقت رومن ایمپائر میں مال تجارت پر ٹیکس لیا جاتا تھا۔ اناجیل میں بھی محصول وصولی کا ذکر بار بار آیا ہے۔ اس کے علاوہ اس دور میں نبی مکرم کے آباؤ اجداد نے شام، عراق اور حبشہ سے تجارت کی غرض سے وہاں کی حکومتوں سے باقاعدہ معاہدے کیے تھے۔

آپ ﷺ کے جد امجد خواجہ ہاشم اس پایہ کے آدمی تھے کہ رومی امراء اور غسانی شہزادے ان سے معاہدہ کیا کرتے تھے۔ رسول رحمت میں ۱۴۴ پر ہے کہ آپ کے پردادا خواجہ ہاشم نے قیصر روم سے تجارت کا پروانہ حاصل کیا تھا تو قیصر نے اپنے ہم مذہب حکمران شاہ حبش کے نام ایک سفارشی خط لکھ دیا تھا کہ اہل مکہ کے تجارتی قافلے اپنے ملک میں آنے دیں۔ جناب ہاشم نے شاہ حبش سے قریش کے تجارتی مال پر ٹیکس نہ لینے کا اجازت نامہ حاصل کیا تھا۔ خلاصہ یہ کہ (۱) ریاست کے خلاف کاروائیاں قریش کی ناجائز تھیں۔ (۲) شرارتی گروہ یا ناپسندیدہ افراد کا داخلہ آئینی اخلاقی طور پر ناجائز تھا مزید برآں کہ وہ فتنہ فساد برپا کریں۔ (۳) ریاستی حدود کی خلاف ورزی کرنے والے مجرم تھے۔ (۴) ایسی کاروائیوں میں ملوث افراد یا گروہ کو گرفتار کرنا یا سزا دینا ریاست کی ذمہ داری اور حق تھا کہ امن عامہ کو خراب ہونے نہ دے۔ (۵) اس مڈھ بھیڑ میں ہر قسم کا نقصان ہو سکتا تھا جس کی ساری ذمہ داری فریق مخالف کے سر جاتی ہے۔ (۶) تجارتی مال کو بہ حق سرکار ضبط کرنا قانونی کاروائی تھی جو سراسر درست ہے۔ ان امور کی روشنی میں وہ تمام الزامات جو لگائے گئے ہیں، بالکل فضول، بے کار اور بے بنیاد ہیں۔

اعتراض نمبر ۳۰۲

سب سے اہم مسئلہ جو آنحضرت ﷺ کو درپیش تھا وہ یہ تھا کہ اہل مکہ کے بارے میں کیا موقف اختیار

کیا جائے اور آپ ﷺ جانتے تھے کہ ایک متحدہ دولت عربیہ اس وقت تک قائم نہیں کی جاسکتی جب تک مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن یعنی قریش پر غلبہ حاصل نہ کیا جائے کیونکہ اہل عرب پر ان کا زبردست اثر تھا اور وہ انہیں نہایت عزت واحترام کی نظروں سے دیکھتے تھے اگر وہ مطیع ہو جاتے تو تمام عرب مطیع ہو جاتا لیکن جب تک ان مسلمانوں سے ٹھنی رہتی دیگر قبائل کا مسلمانوں کی اطاعت قبول کرنا ممکن نہ تھا۔ چونکہ اہل مکہ تجارت پیشہ تھے اور ان کے تجارتی قافلے دور دراز علاقوں میں جاتے تھے اس لیے آپ نے انہیں مطیع کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ یہ سوچا کہ ان کے قافلوں کی ناکہ بندی کردی جائے اور شام جانے کی گزرگاہ جس پر سے اہل مکہ کے قافلے گزرتے تھے بند کردی جائے چنانچہ آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو حکم دیا کہ وہ کفار مکہ کے تجارتی قافلوں کی ٹوہ رکھیں اور کسی قافلے کو مدینہ کے قریب سے گزرنے کی اجازت نہ دیں چنانچہ کفار مکہ کے تجارتی قافلوں کی باقاعدہ ناکہ بندی شروع کردی گئی۔ (ترجمہ سرور کائنات۔ ۴۰۔۳۹)

جواب: خود مترجم کتاب ہذا میں اس کا جواب دیتا ہے ''مصنف کا یہ خیال قطعاً غلط ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی حکومت کے قیام کی خاطر قریش کے قافلوں کو روکنے کا منصوبہ بنایا تھا حقیقت یہ ہے کہ جیسا کہ ہر شخص کو معلوم ہے۔ قریش رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کے سخت دشمن تھے جب تک آپ ﷺ مکہ میں رہے وہ آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کے متبعین کو سخت تکلیفیں دیتے رہے انہی کے مظالم سے تنگ آ کر رسول کریم ﷺ ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ ہجرت کے بعد بھی کفار مکہ نے آپ ﷺ کو چین سے بیٹھنے نہ دیا اور سکھ کا سانس لینے نہ دیا اور مدینہ پر حملہ کرنے اور مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کے مشورے کرنے لگے۔ سب سے پہلے انہوں نے مدینہ کے منافقین کے سردار عبداللہ بن ابی بن سلول کو ایک تحدید آمیز خط لکھا کہ تم نے ہمارے آدمی کو پناہ دی ہے تو تم اسے ہمارے حوالے کردو ورنہ ہم تم پر حملہ کر کے تمہیں تباہ و برباد کردیں گے۔ اور عبداللہ بن ابی بے بس تھا وہ کچھ نہ کرسکا۔۔۔ تب قریش نے مدینہ پر حملہ کرنے کے باقاعدہ منصوبے بنانے شروع کیے۔ تجارتی قافلوں میں سرمایہ لگایا تاکہ جو کچھ رقم حاصل ہو جنگی تیاریوں میں صرف کیا جائے چونکہ یہ قافلے مدینہ کے بالکل قریب سے گزرتے تھے اور ان کا مدینہ سے اتنا قریب ہو کر گزرنا مسلمانوں کے لیے سخت خطرات کا موجب ہوسکتا تھا کیونکہ یہ قافلے ارد گرد بسنے والے قبائل کو مسلمانوں کے خلاف اکساتے تھے دوسرے تجارتی قافلے مسلمانوں کے خلاف جنگی چالوں کو پایہ تکمیل تک پہچانے کے لیے بھیجے جارہے تھے۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ نے ان کی روک تھام ضروری سمجھی اور ان کے روکنے سے حضور ﷺ کا مقصد نعوذ باللہ ہوس ملک گیری اور لوٹ مار کرنا نہ تھی جیسا کہ مصنف کتاب ہذا میں بھی مستشرقین کے زیر اثر سمجھا ہے۔

اعتراض نمبر ۳۰۳

غزوہ بدر کا واقعہ قریش کے تجارتی کارواں کو لوٹنے کے سبب رونما ہوا۔ ارباب سیر نے بھی کارواں لوٹنے کا سبب بتایا اور بخاری کی تصریحات کیوں پائی جاتی ہیں کہ بدر کی ابتداء قافلہ پر حملہ کرنے کی غرض سے ہوئی تھی۔

جواب: زمانہ جاہلیت سے انتقام (ثار) عرب کا خاصہ رہا تھا۔ ایک قبیلہ کا کوئی شخص دوسرے قبیلہ کے کسی شخص یا افراد سے قتل ہو جاتا تھا تو لڑائیوں کا ناختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا یا ان کا عرصہ کئی سالوں پر محیط ہوتا تھا جیسے داحس اور لبسوس کی خونی جنگیں چالیس سال تک لڑی جاتی رہی تھیں۔ سریہ نخلہ میں عمرو بن حضرمی کا قتل ہوا تھا جس کے سبب معرکہ بدر پیش آیا تھا۔ قریشی سردار ابوالولید بن ربیعہ چاہتے تھے کہ محمد ﷺ سے ابن حضرمی کے قتل کا خون بہا لے لیا جائے اور سب لوگ واپس چلے جائیں لیکن ابوجہل نہ مانا بل کہ حضرمی کے بھائی عامر کو بلایا اور کہا کہ اپنے بھائی کے خون کے بدلہ کی دہائی دو۔ جہالت کے دستور کے مطابق عامر ننگا ہو گیا اور پکارا ''ہائے عمرو! (حضرمی) ہائے عمرو!

دوم: سریہ نخلہ کا واقعہ کاروانِ قریش، جس کا قائد ابوسفیان تھا، کی روانگی بہ سوئے شام پہلے وقوع پذیر ہو چکا تھا اور غزوہ بدر ابوسفیان کی شام سے واپسی کے بعد واقع ہوا تھا۔

سوم: تجارتی کارواں تو بحفاظت مکہ جا پہنچا۔ ادھر قریش کی مسلح فوج مکہ سے روانہ ہو چکی تھی جو کئی لوگوں کی کوششوں، کہ جنگ نہ ہو، کے باوجود قریش جنگ کرنے سے باز نہ آئے۔ یہ بھی کہا گیا کہ مسلمانوں سے قصاص لے لیں مگر ایک نہ مانی۔ اگر کارواں کو لوٹنا مقصود تھا تو اس کو روکا کیوں نہ گیا؟ اسے کیوں جانے دیا؟ اور قریش خود جنگ سے گریزاں تھے کہ قافلہ بہ حفاظت آ پہنچا ہے اب لڑائی ٹھیک نہیں۔ لیکن قریش کی فوج نکل چکی ہے۔ ارشاد ربانی ہے '' وَتَوَدُّونَ أَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُونُ لَكُمْ وَيُرِيدُ اللَّهُ أَن يُحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكَافِرِينَ ''۔ ترجمہ: اور تم چاہتے تھے کہ تمہیں وہ ملے جس میں کانٹے کا کھٹکا نہیں اور خدا چاہتا تھا کہ اپنی باتوں سے حق کو قائم کر دے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے''۔ (انفال۔۷)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک طرف سے کارواں اور دوسری طرف سے فوج قریش آ رہی تھی۔ مجاہدین کارواں پر حملہ کرنا چاہتے ہیں مگر خدا کی مرضی ہے کہ حق کو قائم کر دے اور کفار کی جڑ کاٹ دے۔ اب صاف ظاہر ہے کہ نبی مکرم کا فیصلہ وہی ہو گا جو فیصلہ خداوندی ہے۔

اسی سورہ کی آیت نمبر ایک میں ارشاد ربانی ہے '' وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ لَكَارِهُونَ يُجَادِلُونَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَأَنَّمَا يُسَاقُونَ إِلَى الْمَوْتِ ''۔ ترجمہ: ''اور مسلمانوں کی ایک جماعت ناخوش تھی وہ تجھ سے حق ظاہر ہوئے پیچھے بھی جھگڑا کرتی تھی۔ گویا کہ موت کی ہنکائے جا رہے ہیں''۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اضطراب و بے چینی تجارتی کارواں پر حملہ کرنے کے سبب نہ تھی ،کیوں کہ اس سے قبل بھی قریشی کاروانوں کی حرکات کی معلومات حاصل کرنے کے لیے کارواں بھیجے جا چکے تھے۔ کہیں بھی بے چینی کی لہر نہ دوڑی تھی۔ کہیں خوف وڈر کی کیفیت نہ تھی۔ نیز پہلے چھوٹے چھوٹے دستے چار آٹھ سے لے کر دوسو افراد پر مشتمل بھیجے گئے تھے۔ اس مرتبہ ۳۱۳ افراد دو گھوڑے اور ساٹھ اونٹوں اور کم مقدار میں آلات حرب کا کیونکر بندوبست کیا گیا تھا۔ گویا یہ یقینی بات ہے کہ مدینہ میں خبر پہنچ چکی تھی کہ قریشی فوج مدینہ پر حملہ آور ہو رہی ہے۔ قرآن کریم قریشی فوج کی روانگی کا یوں ذکر فرماتا ہے۔" وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِم بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ " (انفال۔۴۷) ترجمہ: "اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اپنے گھروں سے مغرورانہ نمائش اور خدا کی راہ سے روکتے ہوئے نکلے"۔

خدا کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہوئے نکلے اور شان اور دکھاوے کے لیے نکلے تو مسلمان اس دکھاوے اور خدا کی راہ سے روکنے سے بری ہیں۔ وہ تو خدا کی راہ کی طرف بلانے والے ہیں۔ اسلام نمود ونمایش کی تعلیم نہیں دیتا۔ یہ نمود ونمایش اور مسلمانوں کو روکنا اسلام کے خاتمہ یا اس کی ترقی کی راہ میں روڑے اٹکانا تھے اور یہ کفار کی جماعت تھی۔

قرآن کریم کی صریح آیات جن کا ذکر پہلے ہو چکا' کے مطابق تجارتی کارواں کو نشانہ بنانا مقصود نہ تھا بل کہ مکہ والوں کے حملہ کرنے کے لیے ان کی فوج جو روانہ ہو چکی تھی' کے سامنے ایک مدافعاتی کاروائی تھی۔ اسی وجہ سے کچھ صحابہؓ کا دل اضطراب کی آماجگاہ بن چکا ہے اور سمجھتے ہیں کہ گویا" كَأَنَّمَا يُسَاقُونَ إِلَى الْمَوْتِ" موت کی طرف ہنکائے جا رہے ہیں۔ (انفال۔۶)

قطعی دلیل: مدینہ سے نکلنے سے پہلے حملہ کرنے کی خبر پہنچ چکی تھی اس غرض سے آپ نے انصار کو مخاطب کیا کیوں کہ معاہدہ بیعت عقبہ کے مطابق اب انصار کی مدد کا وقت آ پہنچا تھا۔ دوم تجارتی کارواں پر حملہ کرنا ہی مقصود ہوتا تو آپ کو شام کی طرف روانہ ہونا چاہیے تھا مگر آپ مکہ کی طرف جاتے ہیں۔ یعنی شمال کی طرف سفر کرنے کی بجائے جنوب کی طرف سفر اختیار کیا اور بدر کے مقام پر تشریف لائے نیز قریش کے ارادہ جنگ کا اظہار اس بات سے ہوتا ہے کہ قریش کو خبر ملتی کہ کارواں تو بہ حفاظت آ پہنچا ہے مگر مسلم فوج اس کے تعاقب میں تھی تو قریش نکل آتے اور جنگ پیش آ جاتی۔ ایسا نہیں ہے بل کہ وہ تو مدینہ پر تیاری کر کے چڑھ دوڑے تھے۔

سوم: قریش نے یہود و نصاریٰ کو خط لکھے تھے کہ انھیں مدینہ سے نکال دو ورنہ ہم مدینہ آ کر تم کو بھی برباد کر دیں گے۔

چہارم: کرز بن جابر فہری مدینہ کی چراگاہ پر حملہ آور ہوا اور آنحضرت ﷺ کے اونٹ ہنکا لے گیا تھا۔

پنجم: ابو جہل نے سعد بن معاذؓ کو دھمکی دی تھی کہ تم نے ہمارے مجرموں کو پناہ دی ہے اگر امیہ کی ضمانت نہ ہوتی تو میں تم کو قتل کر دیتا وغیرہ وغیرہ۔ یہ ایسی باتیں ہیں جن کو تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ نہیں رہتا۔ اور ثابت ہوتا ہے کہ غزوہ بدر کارواں لوٹنے کے سبب سے واقع نہیں ہوا تھا۔

ایک نکتہ: آنحضرت ﷺ نے انصار سے کیوں پوچھا۔ وجہ یہ تھی کہ ان سے معاہدہ ہوا تھا کہ مدینہ پر کوئی بھی حملہ آور ہوگا تو ہم آپ کا ساتھ دیں گے۔ کٹ مریں گے۔ اب یہ مدینہ سے باہر جانا پڑ رہا تھا اس لیے پوچھا کہ ان کی رائے معلوم ہو جائے اور معاہدہ شکنی بھی نہ ہونے پائے۔ (یعنی انصار نے بیعت کے وقت اقرار کیا تھا کہ وہ اس وقت تلوار اٹھائیں گے جب دشمن مدینہ پر چڑھ آئے گا) اس پر سعد بن عبادہؓ نے عرض کیا، کیا حضور ﷺ کا اشارہ ہماری طرف ہے؟ خدا کی قسم! آپ فرمائیں تو ہم سمندر میں کود پڑیں گے۔ کتب سیرت اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ غزوہ بدر میں مہاجرین سے انصار مدینہ کی تعداد دگنا سے بھی کچھ اوپر تھی اور سردار انصار لشکر میں تھے۔

غلطی کا ازالہ: تجارتی کارواں قریش پر حملے کرنے کی غلطی کیسے لگی؟ جنگ بدر کی وجہ یہی کارواں کیوں بنا؟ حقیقت یہ ہے کہ بعض غزوات میں یہ مبہم رکھا جاتا تھا کہ مجاہدین کو کہاں جانا ہے؟ اس سے مقصود کیا ہے؟ کس غرض سے یہ کاروائی روبہ عمل ہے؟ جنگ بدر کی کعب بن مالکؓ کی روایت کا ایک ٹکڑا یہ ہے کہ ''میں غزوہ بدر میں پیچھے رہ گیا اور کسی پیچھے رہ جانے والے پر کوئی عتاب نہیں ہوا کیوں کہ نبی مکرم ﷺ قریش کے قافلے کے ارادے سے نکلے تھے''۔ یہ دہری کیفیت کیونکر پیدا ہوئی؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ کعب بن مالکؓ کا ہی قول ہے کہ ''آنحضرت ﷺ جب کسی غزوہ کا ارادہ فرماتے تو کسی اور موقع کا توریہ فرماتے''۔ ''توریہ'' کے معنی شارحین بخاری کے مطابق یہ ہیں کہ آپ ایسے موقع پر مبہم اور محتمل المعنیین الفاظ استعمال فرماتے تھے۔

شبلی مرحوم فرماتے ہیں کہ ''گو میرے نزدیک یہ کلیہ اس معنی میں صحیح نہیں تاہم واقعات کے استقصاء سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ بعض موقعوں پر واقعہ اس طرح مبہم رکھا جاتا تھا کہ لوگ مختلف قیاس پیدا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ بدر میں سعد بن خثیمہ کو پہلے ہی یہ معلوم ہو گیا تھا کہ قافلہ نہیں، فوج کا مقابلہ ہے''۔ اوپر کی روایت کے ایک ٹکڑا مذکور میں تو کارواں سے تعارض کرنا مقصود تھا''۔ یہ بات تھی جس سے اپنوں اور پرایوں نے رائی کا پہاڑ بنا دیا۔ اس کے بارے میں شبلی مرحوم فرماتے ہیں ''راوی (جس میں صحابہ بھی داخل ہیں) بہت سے موقعوں پر جو واقعہ بیان کرتا ہے وہ حقیقت میں واقعہ نہیں ہوتا بل کہ اس کا استنباط

ہوتا ہے یعنی اس نے اس کو یوں ہی سمجھا۔ بدر میں بھی یہی صورت پیش آئی اور اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ صحابہؓ نے مختلف قیاس کیے اور جو اس کے مذاق عام کے مناسب تھا وہی پھیل گیا''۔ شبلی مرحوم کی تائید میں باقی اختلاف کو چھوڑ کر ڈاکٹر حمید اللہ کہتا ہے کہ ''کانما یساقون الی الموت'' کی آیت سے استدلال کر کے کم از کم جنگ بدر کی حد تک اپنی رائے کو مستحکم کر لیا ہے کہ آنحضرت ﷺ قافلہ روکنے کے لیے نہیں بل کہ قریش کے امدادی دستے (فوج) کے مقابلہ کے لیے نکلے تھے۔ (ن۔۵۔۲۸۵)

ضمناً اعتراض

عام مورخین کا خیال ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا مدینہ سے نکلنا قافلہ لوٹنے کی غرض سے تھا۔ (الفاروق۔۴۵)

جواب: جب آپ مدینہ سے نکلے تو دو چار منزل چل کر معلوم ہوا کہ قریش فوجیں لیے چلے آتے ہیں اس وقت آپ ﷺ نے مہاجرین اور انصار کو جمع کیا کہ ان کا عندیہ دریافت کریں۔ قرآن کریم کی شہادت سے بڑھ کر کوئی شہادت نہیں ہو سکتی۔ اس واقعہ کے ذکر میں ارشاد ربانی ہے۔ ترجمہ ''جیسا کہ تجھ کو تیرے گھر سے سچائی پر نکالا اور بے شک مسلمانوں کا ایک گروہ ناخوش تھا وہ تجھ سے سچی بات پر جھگڑتے تھے بعد اس کے کہ سچی بات ظاہر ہو گئی گویا وہ موت کی طرف ہانکے جاتے ہیں اور وہ اس کو دیکھ رہے ہیں اور جب اللہ تعالیٰ دو گروہوں میں سے ایک کا تم سے وعدہ کرتا ہے اور تم چاہتے تھے کہ جس گروہ میں کچھ زور نہیں ہے وہ ہاتھ آئے''۔ ان آیات سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ:

۱: جب آنحضرتؐ نے مدینہ سے نکلنا چاہا تو مسلمانوں کا ایک گروہ ہچکچاتا تھا اور سمجھتا تھا کہ موت کے منہ میں جاتا ہے۔

۲: مدینہ سے نکلنے کے وقت کافروں کے دو گروہ تھے ایک غیر ذات الشوکۃ یعنی ابوسفیان کا کاروان تجارت اور دوسرا قریش مکہ کا گروہ جو مکہ سے حملہ کرنے کے لیے بے سروسامان نکل چکا تھا۔

اس کے علاوہ ابوسفیان کے قافلہ میں کل چالیس آدمی تھے اور آنحضرتؐ مدینہ سے ۳۱۳ بہادروں کے ساتھ نکلے تھے۔ تین سو آدمی چالیس آدمیوں کے مقابلے میں موت کے منہ میں جانا نہیں خیال کر سکتے ہیں۔ اس لیے آنحضرتؐ قافلے کو لوٹنے کے لیے نکلتے تو اللہ تعالیٰ ہرگز قرآن مجید میں یہ نہ فرماتا کہ مسلمان ان کے مقابلے کو موت کے منہ میں جانا سمجھتے تھے۔

وَاِنَّ فَرِيقاً مِنَ الْمُومِنِينَ لَكَارِهُونَ (اور مسلمانوں کا ایک گروہ قطعاً نہ خوش تھا) (انفال۔۵)

اول ترکیب نحوی کی رو سے وان میں جو ''واؤ'' ہے حالیہ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں کا ایک گروہ جو لڑائی سے جی چراتا ہے، یہ موقعہ عین وہ موقعہ تھا، جب آپ ﷺ مدینہ سے نکل رہے تھے نہ

کہ مدینہ سے نکل کر جب آپ ﷺ آگے بڑھے کیونکہ ''واو حالیہ'' کے لحاظ سے خروج من البیت اور اس گروہ کے جی چرانے کا وقت اور زمانہ ایک ہونا چاہیے۔

دوم: آیت مذکورہ میں بہ تصریح مذکور ہے کہ یہ جس وقت کا واقعہ ہے اس وقت دو گروہ تھے سامنے، ایک کاروان تجارت اور ایک قریش کی فوج، جو مکہ سے آ رہی تھی۔ ارباب سیر کہتے ہیں کہ آیت قرآنی میں یہ اس وقت کا واقعہ مذکور ہے جب آپ ﷺ بدر کے قریب پہنچ چکے تھے لیکن بدر کے قریب پہنچنے پر کاروان صحیح سلامت بچ کر نکل چکا تھا۔ اس وقت کا یہ واقعہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ '' دونوں میں ایک کا وعدہ ہے'' اس لیے یہ بالکل ظاہر ہے کہ قرآن مجید کے نص کے مطابق یہ واقعہ اس وقت کا ہونا چاہیے جب دونوں گروہوں کے ہاتھ آنے کا احتمال ہوسکتا ہے، اور یہ صرف وہ وقت ہوسکتا ہے جب آپ ﷺ مدینہ میں تھے اور دونوں طرف کی خبریں آ گئی تھیں کہ ادھر ابوسفیان کا تجارتی کارواں تجارت لے کر چلا ہے اور ادھر قریش جنگ کے سروسامان کے ساتھ نکل چکے ہیں۔

سوم: سب سے زیادہ قابل لحاظ یہ امر ہے کہ قرآن مجید کی آیت مذکورہ بالا میں دو فریق کا خدا نے بیان کیا ہے ایک قافلہ تجارت اور دوسرا صاحب شوکت یعنی کفار جو مکہ سے لڑنے آ رہے تھے۔ آیت میں تصریح ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت ایسی تھی جو چاہتی تھی کہ کاروان تجارت پر حملہ کیا جائے، خدا نے ان لوگوں پر ناراضی ظاہر کی اور فرمایا (اور تم چاہتے تھے کہ بے خرشہ والا گروہ تم کو ہاتھ آ جائے اور خدا یہ چاہتا تھا کہ اپنی باتوں سے حق کو قائم کردے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے) ایک طرف وہ لوگ ہیں جو قافلہ تجارت پر حملہ کرانا چاہتے ہیں دوسری طرف خدا ہے، جو چاہتا ہے کہ حق کو قائم کردے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے اب سوال یہ ہے کہ آپ ﷺ ان میں سے کس کے ساتھ ہیں؟ عام روائتیوں کے مطابق اس سوال کا جواب کیا ہوگا، میں اس سے کانپ اٹھتا ہوں۔

چہارم: اب واقعہ کی نوعیت پر غور کرو۔ واقعہ یہ ہے کہ آپ ﷺ مدینہ سے اس سروسامان سے نکل رہے ہیں کہ تین سو سے زیادہ جانباز مہاجر وانصار ساتھ ہیں۔ ان میں فاتح خیبر اور سید الشہدا حضرت حمزہؓ بھی ہیں جن میں سے ہر ایک بجائے خود ایک لشکر ہے۔ باوجود اس کے (قرآن مجید نے بتصریح مذکور ہے) ڈر کے مارے کچھ صحابہ کا دل بیٹھا جاتا ہے اور ان کو نظر آتا ہے کہ کوئی ان کو موت کی طرف دھکیلے جاتا ہے۔ (اور مسلمانوں کی ایک جماعت ناخوش تھی وہ تجھ سے حق ظاہر ہوئے، پیچھے بھی جھگڑا کرتی تھی، گویا موت کی طرف ہنکائے جارہے ہوں) ''انفال۔ا''

اگر صرف قافلہ تجارت پر حملہ کرنا مقصود ہوتا تو یہ خوف، یہ اضطراب اور یہ پہلوتہی کس بناء پر تھی حالانکہ اس سے پہلے بار ہا (بقول ارباب سیر) قافلہ قریش پر حملہ کرنے کے لیے تھوڑے آدمی

بھیجے گئے تھے اور کبھی ان کو ضرر نہ پہنچا تھا، اس دفعہ قافلے کو فنا کا ڈر ہے کہ تین سو چیدہ اور منتخب فوج ہے اور پھر لوگ ڈر کا مارے سہمے جاتے ہیں، یہ قطعی دلیل ہے کہ مدینہ ہی میں خبر آ گئی تھی کہ قریش مکہ سے جمعیت عزیم لے کر مدینہ پر آ رہے ہیں۔

پنجم: قرآن مجید میں ایک اور آیت اسی بدر کے واقعہ کے متعلق نازل ہوئی اور اس وقت جب آپ ﷺ مدینہ میں موجود تھے چنانچہ صحیح بخاری تفصیل سورہ النساء میں تصریحاً مذکور ہے، آیت یہ ہے۔ ترجمہ: (بجز معذروں کے وہ لوگ جو بیٹھ رہیں اور وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرتے ہیں، برابر نہیں ہو سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کو جو مال اور جان سے جہاد کرتے ہیں، درجہ میں فضیلت دی ہے)

ششم: کفار قریش جو مکہ سے لڑنے بدر آئے تھے ان کی نسبت قرآن مجید میں ہے: ترجمہ (اور ان لوگوں کی طرح نہ بنو جو اپنے گھروں سے مغرور آنا نمائش اور خدا کی راہ سے روکتے ہوئے، نکلے) اگر قریش صرف قافلہ تجارت کے بچانے کے لیے نکلتے تو خدا یہ کیوں کہتا، کہ وہ اظہار شان اور دکھاوے کے لیے خدا کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہوئے نکلے؟ اس میں اظہار شان اور دکھاوے کی کیا بات تھی اور خدا کی راہ سے لوگوں کو روکنا کیا تھا؟ البتہ چونکہ درحقیقت کفار مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے نکلے تھے جس سے مقصود اپنے زور اور قوت کا اعلان نمائش اور اسلام کی ترقی کا انسداد تھا اس لیے خدا نے اس کو غرور نمائش اور "صَدَّ عَن سَبِيلِ الله" کہا۔۔۔ حضرت کعب والی حدیث کے سوا اور کسی حدیث میں یہ واقعہ میری نظر سے گزرا نہیں کہ آپ ﷺ بدر میں قریش کے قافلہ تجارت کو لوٹنے کے لیے نکلے تھے۔ کعب بن مالک کی حدیث متعدد وجوہ سے قابل بحث ہے۔ حدیث یہ ہے "کعب کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کو چھوڑ کر کسی غزوہ سے پیچھے نہیں رہا بجز تبوک کے، اور ہاں: غزوہ بدر میں بھی شریک نہ تھا اور جو اس میں شریک نہ ہوا، اس پر کچھ عتاب نہیں ہوا، کیونکہ آپ ﷺ قریش کے قافلے کے لیے نکلے تھے اور خدا نے دونوں فریق کو اچانک مقابل کر دیا"۔ اس کے برخلاف مسلم شریف میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ کو جب ابوسفیان کے آنے کی خبر معلوم ہوئی تو آپ ﷺ نے مشورہ طلب فرمایا: حضرت ابوبکرؓ بولے تو آپ ﷺ نے توجہ نہ فرمائی، پھر حضرت عمرؓ بولے، آپ ﷺ نے ان کی طرف بھی توجہ نہ کی پھر حضرت سعد بن عبادہؓ کھڑے ہوئے اور کہا: یا رسول اللہ! کیا آپ ﷺ کا روئے خطاب ہم انصار کی طرف ہے؟ خدا کی قسم! اگر دریا میں سواری ڈالنے کا حکم دیں تو ہم ڈال دیں گے اور اگر برک الغماد تک جانے کا حکم دیں گے، تو ہم کریں گے۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ اس کے بعد آپ ﷺ نے لوگوں کو شرکت جنگ کی دعوت دی، لوگ چل پڑے اور بدر پر اترے۔" حدیث کے پہلے ٹکڑے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب ابوسفیان کے آنے کا حال معلوم ہوا، اسی وقت آپ ﷺ نے انصار و مہاجرین سے

مشورہ کیا اور انصار سے اعانت کی خواہش کی، اور یہ مطلقاً جا بت ہے کہ ابوسفیان کی آمد کا حال مدینہ میں ہی معلوم ہو چکا تھا۔ اس بناء پر یہ ثابت ہو گیا کہ اس غزوہ میں شرکت کے لیے آپ ﷺ نے انصار سے مدینہ میں ہی خواہش کی تھی، ورنہ اگر باہر نکل کر یہ معاملہ پیش آتا، جیسا کہ کتب سیر میں ہے تو اس وقت انصار وہاں کہاں ہوتے نیز اس ٹکڑے میں مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مشورہ کے بعد لوگوں کو شرکت کی دعوت دی۔ ارباب سیر کے مطابق یہ واقعہ ہونا چاہیے کہ انصار معاہدہ اور معمول سابق کے خلاف شرکت کے لیے نکلے۔ آنحضرت ﷺ نے پھر ان کا عندیہ دریافت کیا اور اس کے بعد شرکت کے لیے آمادہ کیا، ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ ایک مجنونانہ بات ہے۔۔۔۔۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ جب ہم مدینہ آئے تو وہاں پھل کھانے کو ملے، جو ہمارے ناموافق مزاج تھے، اس لیے ہم لوگ بیمار ہو گئے۔ آنحضرت ﷺ بدر کا پوچھا کرتے، جب ہم کو خبر ملی کہ مشرکین آ رہے ہیں تو رسول اللہ ﷺ بدر کو چلے۔ بدر ایک کنویں کا نام ہے جہاں ہم مشرکین سے پہلے پہنچ گئے۔ اس حدیث میں تصریح ہے کہ مشرکین مکہ کے حملہ کی خبر سن کر آپ ﷺ نکلے تھے اور بدر آ کر قیام فرمایا تھا۔ اس پوری حدیث میں ابوسفیان کے قافلہ تجارت کا ذکر تک نہیں ہے، ان قطعی نصوص کے بعد کسی اور استدلال کی ضرورت نہیں ہے۔

ضمناً اعتراض

سوال یہ ہے کہ ارباب سیر لکھتے ہیں کہ جب آپ ﷺ نے مدینہ منورہ میں صحابہؓ کو کاروان تجارت پر حملہ کرنے کی ترغیب دی تو لوگوں نے چنداں مستعدی نہ دکھائی کیونکہ لوگ سمجھے کہ کوئی مہم اور معرکہ جہاد نہیں ہے بلکہ صرف تحصیل غنیمت ہے اس لیے جن لوگوں کو مال غنیمت کی حاجت تھی، وہ گئے۔

جواب: ہم دیکھتے ہیں کہ انصار میں جس قدر رعیاں قوم اور سر لشکر تھے، سب گئے۔ زر و مال کے محتاج تھے تو وہ مہاجرین تھے، لیکن جانے والوں میں انصار کی تعداد مہاجرین سے دوگنی تگنی تھی۔ آنحضرت ﷺ کے استمزاج کے جواب میں جن لوگوں نے جان نثارانہ فقرے کہے تھے۔ مہاجرین نے ابوبکرؓ و عمرؓ و مقداد تھے اور انصار نے سعد بن عبادہؓ، اگرچہ بدر میں شریک نہ ہو سکتے تھے اور مدینہ سے باہر نہ جا سکے تھے۔ اس لیے قطعاً یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مدینہ ہی میں حضرت سعدؓ نے یہ جواب دیا تھا اور وہیں قریش کے حملے کا حال معلوم ہو گیا تھا۔ اس لیے یہ قطعی ہے کہ مدینہ ہی میں اس بات کی ضرورت پیش آئی تھی کہ انصار کا استمزاج لیا جائے۔ عالم ارباب سیر لکھتے ہیں اور احادیث میں بھی منقول ہے کہ غزوہ بدر میں جب آنحضرت ﷺ نے لوگوں کو چلنے کی ترغیب دی تو کچھ لوگ آمادہ نہ ہوئے اور کسمسائے، جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ جانتے تھے کہ جہاد یا غزوہ نہیں، صرف قافلہ لوٹنا ہے، اس لیے یہ اپنی مرضی پر موقوف ہے کہ جس کا جی چاہے، جائے اور جس کا جی چاہے نہ جائے۔ طبری میں ہے ''لوگوں نے بیان کیا ہے کہ جب

آپ ﷺ نے ابوسفیان کا شام سے روانہ ہونا سنا، تو مسلمانوں کو بلا کر فرمایا کہ یہ قریش کا قافلہ آ رہا ہے جس میں ان کا مال ہے چلو شائد خدا تم کو اس میں مال غنیمت دے دے۔ لوگ آمادہ ہوئے لیکن بعضوں نے پہلو تہی کی کیونکہ وہ سمجھے کہ آپ ﷺ کو کوئی لڑائی تو پیش نہیں آئے گی۔'' لیکن یہ واقعات صریح آیات قرآنی کے خلاف ہیں۔ قرآن مجید میں یہ تصریح موجود ہے کہ جو مدینہ سے نکلتے ہوئے کسمسائے تھے وہ عدم ضرورت کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس وجہ سے کہ ان کو یہ نظر آتا تھا کہ موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے ''ترجمہ: اور مسلمانوں کا ایک فریق نکلنے سے ناراض تھا وہ تجھ سے حق کے متعلق جھگڑتا تھا، بعد اس کے کہ حق ظاہر ہو گیا تھا، وہ گویا موت کی طرف ہنکائے جا رہے ہیں''۔

تمام کتب احادیث والسیر میں تصریح ہے کہ مدینہ منورہ سے ایک میل چل کر (مقام بئیر ابی عنبۃ میں) آپ ﷺ نے فوج کا جائزہ لیا اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ وغیرہ اس بناء پر واپس بھیج دیئے گئے کہ ان کی عمریں پندرہ برس سے کم تھیں یعنی سن بلوغ کو نہیں پہنچے تھے۔ اگر صرف قافلہ لوٹنا ہوتا تو یہ کام نوخیز نوجوان زیادہ خوبی سے انجام دے سکتے تھے لیکن چونکہ واقع میں جہاد مقصود تھا، جو ایک فریضہ الٰہی ہے اور اس کے لیے بلوغ کی قید ہے، اس لیے نابالغ لوگ واپس کر دیئے گئے کہ وہ اس کے اہل نہیں۔

حافظ ابن عبدالبر نے استیعاب میں روایت کی ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے لوگوں کو قافلہ قریش پر حملہ کرنے کی ترغیب دی تو خیثمہؓ نے جو ایک انصاری تھے، اپنے بیٹے سعدؓ سے کہا کہ مجھے جانے دو اور تم یہاں مستورات کی خبر گیری کرو۔ سعدؓ نے کہا حضور! اگر کوئی اور موقعہ ہوتا تو ضرور میں تم کو اپنے اوپر ترجیح دیتا، لیکن یہ شہادت کا درجہ ہے میں اس کو کیونکر چھوڑ سکتا ہوں؟ چنانچہ قرعہ اندازی ہوئی اور سعدؓ کے نام قرعہ نکلا۔ سعدؓ شریک جنگ ہوئے اور شہید ہوئے، اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ قافلے کو لوٹنا نہیں تھا بلکہ جہاد پیش نظر تھا اور لوگوں کو دولت شہادت کے حاصل کرنے کی آرزو تھی۔ (مولانا شبلی کی تقریر ختم ہوئی)

ضمناً اعتراض

(برٹا ڈ لیوس ''محمد رسول اللہ۔۴۱۳'') ''محمد ﷺ کی قیادت میں مسلمانوں نے مکہ کے تجارتی قافلے پر اچانک حملہ کر دیا۔ حملہ آوروں کو بہت سا غنیمت ہاتھ لگا اور قرآن میں ان کے کارناموں کو رضائے الٰہی کے شان دار اظہار کی صورت میں سراہا گیا ہے''۔

جواب: اس کا جواب مکمل پچھلے صفحات میں تفصیل سے دیا گیا ہے۔ یہاں صرف ایک دو باتیں کہنا ضروری سمجھتا ہوں اول یہ کہ نقشہ پر نگاہ ڈالیں تو بات واضح ہو جائے گی کہ جنگ بدر، بدر کے مقام پر ہوئی تھی۔ تجارتی قافلہ اذیت سے گزر چکا تھا۔

۲: ابوجہل کو کئی لوگوں نے کہا قافلہ بخیریت گزر گیا ہے ہمیں جنگ نہیں کرنی چاہیے وہ اپنی ضد اور

اپنی جھوٹی انا پر ڈٹا رہا حتیٰ کہ ایک شخص اخنس بن شریق جو بنو زہرہ کے ساتھ وابستہ تھا نے بنو زہرہ سے کہا کہ ہم جس مقصد کے لیے آئے تھے وہ پورا ہو چکا ہے یعنی قافلہ بخریت چلا گیا اس لیے ہم کو خوامخواہ جنگ میں شریک نہیں ہونا چاہیے۔ اگر تم میرا ساتھ دو تو ہمیں ابو جہل کی نکمی باتوں پر کان دھرنے کی بجائے لوٹ جانا چاہیے۔ بنی زہرہ نے اخنس کی تائید کی اور سب کے سب واپس چلے گئے۔

قابل غور: مقصد پورا ہو گیا تھا کہ قافلہ بخریت گزر گیا۔ اس پر حملہ نہ کیا گیا۔ ۲: بنو زہرہ جنگ کرنے کے بجائے واپس چلے گئے۔ ۳: ابو جہل کی ضد اور ہٹ دھرمی سے فریقین کے درمیان جنگ ہوئی اور یہ جنگ بدر کے مقام پر ہوئی نہ کہ تجارتی قافلہ پر حملہ کیا گیا تھا اور مقام بدر کی بجائے کسی اور مقام پر ہوئی تھی؟۔ ۴: جنگوں میں فاتح فوج کے ہاتھ غنیمت تو آتا ہے لازمی طور پر اس جنگ میں غنیمت ہاتھ لگا جس کی مجموعی قیمت ایک لاکھ ساٹھ ہزار بنتی ہے۔

ضمناً اعتراض

واٹ کہتا ہے کہ ''نکلتے وقت یہ تصور بھی نہ کرتے ہوں گے کہ جنگ درپیش ہے۔ اگر انھیں معلوم ہوتا تو شاید حیلوں بہانوں سے اس جنگ کو ٹال جاتے جب انھیں قریش کی آمد کا علم ہوا تو وہ اس قدر قریب تھے کہ بھاگنے کی کوشش بھی نہیں کر سکتے تھے۔

۲: واٹ مزید کہتا ہے کہ محمدؐ نے پانی پر قبضہ کر کے دشمن کو مجبور کر دیا کہ وہ ان کی مرضی کے مطابق جنگ لڑے۔ قریش پر چھاپہ نہیں مارا گیا۔ انھیں اس موقف میں رکھا گیا کہ وہ جنگ کرنے پر مجبور ہو گئے''۔

جواب: مذکورہ جواب ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ یہ تضاد ان اعتراض کی تردید کے لیے کافی ہے۔ ایک طرف وہ یہ کہتا ہے کہ لاعلمی میں مسلمان کفار کے نرغے میں آ گئے۔ مجبوراً جنگ کرنا پڑی اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ حوصلہ مندی اور جرات و بہادری کی کمی تھی۔ راہ فرار اختیار کرنا چاہتے تھے لیکن جانے کا راستا نہیں تھا۔ راہ مسدود تھی۔ جاتے تو کہاں جاتے۔ آخر مجبوراً آمادہ جنگ ہوئے۔ دوسری طرف یہ کہتا ہے کہ پانی پر قبضہ جما کر دشمن کو لڑنے پر مجبور کر دیا۔ کبھی مسلمانوں کبھی کفار کے متعلق ہے کہ انھیں مجبوراً لڑنا پڑا۔ صاف نہیں بتاتا کہ کس نے کس کو لڑنے پر مجبور کیا۔ یہ تضاد اس لیے پیدا ہوا کہ دو مختلف نظریے بہ یک وقت پیش کرنے کی کوشش بے کار کی جا رہی ہے۔ اول یہ کہ اسلام کی وسعت بہ زور شمشیر ہے۔ عقل مندرا اشارا کافی است۔ بھلا ۳۱۳ اور ایک ہزار کا مقابلہ بہ زور شمشیر کا عکاس ہے یا اسلام کی وسعت و اشاعت تلواروں کی مرہون منت ہو سکتی ہے؟ دوسرا نظریہ یہ کہ بدر کے غزوہ میں مسلمانوں کی فتح اتفاقی تھی جس کی وجہ سے مستشرق کو مسلم صفوں میں حیلے بہانے اور بے چینی و اضطراب کا نقشہ کھینچنا پڑا ہے۔ جب کہ مسلمانوں کے لیے تو دین اسلام ان کا اوڑھنا بچھونا

ہے۔اس کی خاطر جاں کی بازی لگاتے ہیں بل کہ اس کی خاطر ان کی جاں بھی چلی جائے تو سستا سودا سمجھتے ہیں جیسا کہ کئی مثالیں تاریخ اسلام میں موجود ہیں کہ صحابہ کرامؓ جام شہادت کی خواہش کرتے ہیں جیسے عبداللہ بن جحشؓ اور سعد بن ابی وقاصؓ نے شہادت کے لیے احد کے روز جنگ شروع ہونے سے پہلے دعا مانگی تھی۔ واٹ بزعم خویش یہ مفروضے گھڑتا ہے جو کسی طور قابل قبول نہیں ہیں۔

ضمنا اعتراض

''لیمن'' کہتا ہے کہ فتح بدر کی وجوہات یہ تھیں کہ مکہ والے حقیقت میں جنگ جو نہ تھے۔انھیں جنگی امور میں کوئی تجربہ نہیں تھا۔جنگوں میں ان کا دارومدار ''احابیش'' پر تھا جو حبشی (نیگرو) غلاموں کی فوج تھی جس میں بدوؤں کی باقاعدہ فوج بھی شریک تھی۔(مستشرقین مغرب کا انداز فکر۔۳۰۱) مستشرقین یہ بھی کہتے ہیں کہ جنگ بدر میں ۳۱۳ مسلمانوں کی ایک ہزار مشرکین قریش پر کامیابی کوئی قابل فخر کارنامہ نہیں بل کہ قریش کے حالات اور کیفیت کے مطابق ایسا ہونا چاہیے تھا کیوں کہ حبشی غلاموں کی فوج کرائے کی تھی۔اسے کیا غرض کہ جا ن مار کر لڑتے''۔(مستشرقین مغرب کا انداز فکر۔۳۰۲)

ایچ لامانس کا خیال ہے کہ احابیش حبشہ کے سیاہ فام تھے، جب قریش اپنی جنگی صلاحیتیں کھو بیٹھے تو انھوں نے احابیش کی ایک فوج ضروریات جنگی کے لیے ملازم رکھی، پشتیبان پیشہ وار بدوں کے جو قزاقوں سے بہتر تھے۔

جواب: احابش ایک وادی کا نام ہے وہاں ایک معاہدہ ہوا جس میں بنی الحارث (کنانہ) بنی خزیمہ (مدرکہ) اور بنی مصطلق (خزاعہ) شریک تھے۔یہ سارے کے سارے عرب تھے۔مستشرقین نے احابش (کرائے کی فوج) قرار دے دیا اور ساتھ ہی انھیں بزدلی کا طعنہ دیا طعنہ مارنا دنیائے عرب کے نزدیک گالی تھی۔یہ لفظ بزدلی ہی تھا جس کا طعنہ ابوجہل نے عتبہ کو دیا تھا اور جنگ بدر ٹلتے ٹلتے بھڑک اٹھی تھی۔ ہر دو جانب سے قریشی لڑ رہے تھے۔عرب سے باہر ایران اور روم سے نبرد آزما ہونے والے یہی قریشی تھے۔بنو امیہ ہوں یا بنو عباس سب کے سب قریشی تھے۔ بدر سے قبل تاریخ عرب ایسا واقعہ پیش کرنے سے قاصر ہے جس واقعہ میں کوئی گروہ قریش پر غالب آیا ہو۔

نرالی منطق: جنگ بدر میں قریش کے بعض معمر روساء بھی شریک تھے۔اس پر مستشرقین نے دعویٰ کیا کہ قریش کم زور تھے اور بوڑھے تھے اور مسلمان اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ بوڑھے لڑ نہ سکیں گے اسی لیے اپنی عددی کم تری کے باوجود اس فوج سے بھڑ گئے گویا قریشی فوج میں چن چن کر صرف بوڑھے بھرتی کیے گئے تا کہ وہ اپنی مدافعت کیے بغیر ہی قتل ہو جائیں۔کیا لایعنی باتیں ہیں۔پہلے احابیش کو کرائے کی فوج قرار دے کر کہا کہ انھیں کیا پڑی تھی کہ کفار کی طرف سے مسلمانوں کے ساتھ بے جگری سے

لڑتے۔ پھر یہ تاویل گھڑی کہ فوج میں بوڑھے آدمی تھے تاکہ عددی طاقت کو بڑھایا جاسکے اور یہی لوگ جنگ میں کام آئیں۔ تضاد سے بھرپور اور باطل سے معمور باتیں ان کے ذہن کی پیداوار ہیں جن کا حقیقت سے کچھ تعلق نہیں۔

۲: ایچ لامانس کا خیال ہے کہ احابیش حبشہ کے سیاہ فام تھے جب قریش اپنی جنگی صلاحیتیں کھو بیٹھے تو انھوں نے احابیش کی ایک فوج ضروریات جنگ کے لیے ملازم رکھی پشتیبان پیشہ ور بدووں کے جو قزاقوں سے قدرے بہتر تھے۔ (ن ۱۱/۵۹۴)

جواب: واٹ ابن ہشام، واقدی اور طبری کی روایت سے ظاہر کرتا ہے کہ ہوسکتا ہے احابیش زیادہ تر بے قبیلہ لوگوں پر مشتمل رہے ہوں جو بعد میں دوسرے قبیلوں کے حلیف بن گئے ہوں۔ وہ مکہ کے قرب وجوار میں ایک کم زور نیم قبائلی گروہ تھے۔ مکہ والوں کے سیاہ فام غلام' احابیش سے جدا تھے۔ غلام اپنے آقاؤں کے ساتھ جنگ میں حصہ لیتے اور احد میں ان کا ایک گروہ تھا۔ غلام غالباً مکہ میں رہتے تھے جب کہ احابیش مکہ سے دودن کے سفری فاصلہ پر رہتے تھے۔ لامانس کے شرانگیز تصور کہ مکہ کی عسکری قوت کی بنیاد سیاہ فام غلاموں کی ایک فوج پر رکھی گئی تھی بے بنیاد ہے۔

ابن ہشام کہتا ہے " مکہ کی آبادی کا تیسرا گروہ احابیش کہلاتا ہے۔ یہ قریش کے وفاقی تھے۔ یہ مکہ کے زیریں اضلاع کی احابیش نامی وادی میں وفاق قائم کرنے کے لیے مجتمع ہوگئے تھے اور اس وادی کے نام پر احابیش کہلاتے تھے۔ ابن اسحٰق کے بیان کے مطابق بنوحارث بن عبدمناف بن کنانہ، امہون بن خزیمہ بن مدرکہ اور خزاعہ میں سے بنوالمصطلق احابیش کہلاتے تھے۔ ابن ہشام کہتے ہیں کہ انھوں نے آپس میں معاہدہ کیا تھا چونکہ ہر معاہدہ احبش نامی وادی میں ہوا تھا جو مکہ کے نشیب میں ہے اس لیے یہ لوگ احابیش کہلائے۔ (سیرت ابن ہشام ص ۴۷ جلد اول)

جوادعلی نے ایک اور نظریہ پیش کیا ہے کہ بنوکنانہ تہامہ کے ساحلی علاقہ میں رہتے تھے جیسا کہ بطلیموس نے ذکر کیا ہے۔ یہ علاقہ عرصہ دراز تک حبشہ کے تحت رہا تھا اور حبشہ کے باشندوں اور بنوکنانہ کی مقامی آبادی خلط ملط ہوگئی۔ غالباً بنوکنانہ کو حبشہ کی اطاعت شعاری اور ابتداء زمانہ میں اہل حبشہ سے ازدواجی تعلقات کے سبب انھیں احابیش کا لقب دیا گیا۔ مکہ کے اردگرد میں آباد ہونے کے بعد ان کو کنانہ کے دوسرے خاندانوں سے ممیّز کرنے کے لیے انھیں احابیش کہا گیا۔ گویا احابیش لازماً حبشہ کے سیاہ فام نہ تھے وہ عرب تھے۔ ان میں سے بعض غلام تھے اور دوسرے مکہ والوں کے کرایہ کے فوجی تھے۔ غلاموں کو معاوضہ کی بنیاد پر خواہ وہ نقدی کی صورت ہو یا کسی انتقامی کاروائی میں امداد کی صورت میں' کام لیا جاتا تھا۔ جیسے جبیر بن مطعم نے اپنے وحشی نامی غلام کو جنگ احد میں یہ کہہ کر بھیج دیا تھا کہ اگر تو حضور ﷺ کے چچا حضرت حمزہؓ کو

میرے چچا طعیمہ بن عدی بن الخیار (جسے بدر میں حضرت حمزہ نے قتل کیا تھا) کے بدلے میں قتل کر دو تو میں تمھیں آزاد کر دوں گا۔ جواد علی نے اپنے نظریہ کی تائید اس شہادت سے کی ہے کہ ''احابیش قریش کی طرح بت پرست نہ تھے۔ وہ خدا اور عیسائیت پر ایمان رکھتے تھے۔ انھوں نے یہ مذہب افریقی ساحل کے مقابل تہامہ کے ساحلی علاقہ میں اپنے قیام کے دوران اختیار کیا''

لہٰذا احابیش عربوں کا ایک آزاد گروہ تھے جو مکہ کے اطراف میں رہتے تھے۔ وہ عرب کے مختلف مقامات مثلاً تیعہ اور عرب کے ساحلی علاقہ جو حبشہ کے بالمقابل تھا اور بنو کنانہ کا اصل وطن تھا' سے اٹھے تھے۔

احابیش نے اپنے خلاف قریش کے ساتھ رسول اکرم ﷺ کے خلاف جنگیں لڑنے میں حصہ لیا لیکن یہ غلط ہے کہ وہ اصل عسکری قوت تھے یا قریش اور ان کے اتحادیوں سے بہتر تھے نیز آپؐ کے خلاف جنگوں میں ان کی نفری برائے نام تھی۔ درج ذیل سے بہ خوبی اندازہ ہوگا۔

ا: غزوہ احد میں تین میں سے ایک پرچم احابیش کے پاس تھا۔ ۲: غزوہ خندق میں کچھ احابیش تھے۔ ۳: ظہور اسلام کے وقت ابن الدغنہ' احابیش کا لیڈر تھا۔ ۴: الحلیس بن زبان جنگ احد میں حضرت حمزہؓ کی لاش کو مسخ کرنے پر ابوسفیان کو ٹوکا جس پر ابوسفیان نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ (ابن ہشام) ۵: حدیبیہ میں قریش نے الحلیس کو ایلچی بنا کر نبی مکرم ﷺ کے پاس بھیجا اور آپ نے فرمایا یہ ان لوگوں میں ہے جو خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔ (ابن ہشام)

بے شمار تاریخی شواہد کے ہوتے ہوئے بھی لامانس نے یہ مفروضہ گھڑا کہ محمد ﷺ کا مقابلہ کرنے والے قریش جنگ جو نہیں رہے تھے اور وہ بیش تر جنگی معاملات میں احابیش کی ایک فوج پر تکیہ کرتے تھے جو حبشہ اور دیگر سیاہ فاموں پر مشتمل تھی جن کے ساتھ کرایہ کے بدو تھے جو قزاقوں سے قدرے بہتر تھے۔

واٹ اس بارے کہتا ہے ''لامانس کا نظریہ اور ماخذ کی من مانی تاویل دونوں غیر سائنسی ہیں۔ وہ اپنے من گھڑت مفروضات کے مطابق جس روایت کو چاہتا ہے مسترد کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے قبول کرتا ہے۔ روایت کے رد و قبول میں اس کے پاس کوئی علمی اصول نہیں ہوتا۔ (واٹ) روایت سے پتہ چلتا ہے کہ احابیش عرب تھے۔ وہ حبشی غلام نہ تھے۔ نیز جنگوں میں ان کی کوئی بنیادی اہمیت نہ تھی اور نہ ہی ان کی تعداد اور شمولیت نے مسلمانوں کی مشکلات میں اضافہ کیا''۔ لامانس کا شر انگیز تصور ہے کہ مکہ کی عسکری قوت سیاہ فام غلاموں کی فوج سے مستحکم تھی۔ مستشرقین کی یہ تضاد بیانی اس کے مصداق ہے (اس کے اپنے خاندان کے ایک گواہ نے شہادت دی)

'' قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِي عَنْ نَفْسِي وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِنْ أَهْلِهَا'' (سورۃ یوسف۔ ۲۶) ''کہا اس نے مجھ کو سمجھایا کہ میں اپنی حفاظت نہ کروں اور عورت کے گھر والوں میں سے ایک گواہ نے گواہی دی''۔

لامانس کی شرانگیزی اس کی بدنیتی پر مبنی ہے۔ وہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی کامیابی کا راز اسلام کے ابدی پیغام اور خود آپ کی زندگی کے نمونہ میں نہیں بل کہ قریش کی کم زوری میں ہے جو جنگ جو نہیں رہے تھے۔ یہ بھی کہتا ہے کہ سیاہ فام غلاموں کی فوج جو انھوں نے نبی مکرم ﷺ کو روکنے کے لیے آگے بڑھائی تھی کرایہ کی تھی اور جس کا اپنا کوئی مقصد نہیں تھا۔

مستشرقین تضاد کا شکار ہیں۔ ایک طرف حقیقت پسندی کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں اور دوسری طرف خود حقیقت کو افسانہ اور ''احمقانہ نظریہ'' اور شرانگیز تصور قرار دیتے ہیں۔ اسی صورت کا نقشہ قرآن کریم نے پیش کیا ہے۔ '' قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيَاتِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُونَ''۔ (سورۃ آلِ عمران۔ ۱۱۸)

''ان کے دل کا بغض ان کے منہ سے نکلا پڑتا ہے اور جو کچھ وہ اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے ہیں وہ اس سے شدید تر ہے۔ ہم نے تمھیں صاف صاف ہدایات دے دی ہیں اگر تم عقل رکھتے ہو''۔

احابیش قریش مکہ کے حلیف قبائل کا گروپ تھا۔ ان کی شمال اور جنوب کے علاقوں میں زیادتی تھی۔ حبشہ سے احابیش نام کو کوئی تعلق نہیں تھا نیز خزاعہ جو نسلاً یمنی تھے ان کا تعلق بھی احابیش سے نہیں تھا۔ اور ذرائع یہ بتاتے ہیں کہ ''لحیان'' قبیلہ احابیش قبیلہ کا رکن نہیں تھا۔ لیکن یہ لوگ قریش کے ہم نوا تھے اور آپ ﷺ کی مخالفت پر کمر بستہ رہے اور فتح مکہ تک مخالف ہی رہے۔

ماہرین ان قبائل کے اتحاد کے حوالے سے وضاحت کرتے ہیں جب کہ کچھ کہتے ہیں کہ اسے ''کدہ حبشی'' سے نسبت ہے جو مکہ کے جنوب میں ہے۔ جہاں ایک معاہدہ ہوا جس کے باعث قبیلے کا نام پڑ گیا۔ ذرائع کہتے ہیں کہ یہ معاہدہ یا اتحاد پہلے پہل بنو بکر کے خلاف تھا لیکن ازاں بعد یہ لوگ قریش کے ہم نوا بن گئے۔ حضرت ابو بکرؓ نے ہجرت کی تو آدھے راستے سے ہی القارہ کا مقام سے احابیش کے قبیلہ کا سردار ابن الدغنہ واپس لایا تھا۔ مسلمانوں کے معاشرتی بائیکاٹ میں احابیش نے قریش کا ساتھ دیا جسے بخاریؒ نے بیان کیا ہے (۴۵۔۲۵) قریش افسوس کرتے تھے کہ انھوں نے عجلت کی اور احابیش کا جنگ بدر کے لیے روانہ ہونے کا انتظار نہ کیا۔

جنگ احد میں بھی احابیش قبائل شریک ہوئے۔ اس وقت ان کا سردار حلیس بن زیان تھا اور عمارہ نامی خاتون جنھوں نے جنگ احد میں ۹ علم برداروں کی شہادت کے بعد اسلامی پرچم تھام لیا تھا اور اختتام جنگ تک علم ان کے پاس ہی رہا۔ وہ احابیشی قبیلہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ فتح مکہ کے موقع پر ایک معمولی سی مزاحمت ہوئی جو احابیشی قبیلے کی طرف سے ہوئی جسے آسانی سے کچل دیا گیا اور مسلمانوں کا مکہ پر قبضہ ہو گیا۔ ان حقایق اور ذرائع کی روشنی میں ایچ لامانس کا الزام لغو اور باطل ہے۔ وہ نہ تو حبشہ

کے سیاہ فام تھے اور نہ ہی کرائے کی فوج تھی بل کہ جیسا کہ بیان ہو چکا ہے وہ قریش کے ہم نوا تھے اور مکہ کے شمال وجنوب کے علاقوں میں مقیم تھے۔ خزاعہ کے علاوہ تمام حلیف قبائل آپس میں رشتہ دار تھے۔ یہ نقشہ ان قبائل کے شجرہ کی وضاحت کرتا ہے۔

غزوہ احد کے متعلق مستشرقین کے اعتراضات

اعتراض نمبر ۳۰۴

بعض حضرات کا یہ خیال ہے کہ غزوہ احد میں مسلمانوں کو فتح کے بعد شکست ہوگئی اور ایک فاتح فوج کی معمولی سی غلطی سے شکست خوردہ فوج کے زمرہ میں داخل ہوگئی۔

جواب: عام مورخین نے اس جنگ کا یہی نتیجہ نکالنے کی کوشش کی ہے' لیکن ہمارے نزدیک یہ بات غلط ہے یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک اعلیٰ نمبروں میں کامیاب ہونے والا درجہ دوم کی کامیابی کو اپنی ناکامی سمجھنے لگے (حال آنکہ وہ پاس ہے کامیاب ہے اور اگلے درجہ کی کلاس میں داخل ہونے کی سند رکھتا ہے)۔ اس جنگ کا نتیجہ نکالنے سے قبل یہ بات ذہن میں رکھنا نہایت ضروری ہے کہ مکہ سے قریش کا سوا تین ہزار بہادروں پر مشتمل لشکر جرار غصہ سے دانت پیستا ہو امدینہ کی طرف بڑھا کہ نہ صرف مسلمانوں سے جنگ بدر کا انتقام لے بل کہ اہل مدینہ کو بھی حکم عدولی کا مزا چکھا ڈالیں جوانھوں نے دھمکی آمیز خطوط کے جواب میں کی کہ انہوں نے محمدؐ اور ان کے ساتھیوں کو برابر پناہ دے رکھی۔ ان کے خط میں یہ دھمکی کوئی معمولی نہ تھی کہ محمدؐ کو نکال دو یا اس سے جنگ کرو ورنہ ہم مدینہ پہنچ کر تمھارے جوانوں کو قتل کر دیں گے اور عورتوں کو لونڈیاں بنالیں گے۔ لیکن ہوا کیا؟ سات سو مسلمانوں کا پا پیادہ لشکر مدینہ سے نکل کر احد میں پہنچا۔ صرف چند گھنٹوں کا مقابلہ ہوا اور اس لشکر جرار کو جو سوار بھی تھا اور ہر قسم کے اسلحہ سے لیس تھا حواس باختہ بھاگنے پر مجبور ہو گیا۔ پھر اس کا تعاقب بھی کیا اور خوف زدہ ہو کر ایسا بھاگا کہ پلٹنے کا نام بھی نہ لے سکا۔ بلکہ تعاقب کی خبر سن کر ایسے دل برداشتہ ہوئے کے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ گیا۔

کوئی مورخ اس کی وجہ بیان نہیں کر سکا کہ جنگ کے اختتام پر فاتح مرعوب اور ہیبت زدہ (یعنی کفار کا لشکر) اور شکست خوردہ مطمئن اور بے خوف کیوں تھا؟ کوئی وجہ نہیں بتائی کہ قریش کا یہ لشکر کامیابی کے بعد ناکام کیوں ہو گیا؟ سوال یہ ہے کہ جب مسلمان نیم جاں ہو چکے تھے تو پھر کیا ہوا کہ قریش نے اپنی تلواریں روک لیں۔ سب کو اپنی خون آشام تلواروں کا لقمہ کیوں نہ بنایا؟ مدینہ میدان جنگ سے صرف تین میل دور تھا اور بالکل خالی تھا۔ جو لوگ وہاں موجود تھے وہ یا تو یہود تھے یا منافقین تھے وہ پہلے ہی ان کے تھے۔ قریش نے اپنے لشکر کے پانچ چھ سو جوان بھیج کر مدینہ پر حملہ کیوں نہ کیا تا کہ مسلمانوں کی طاقت

ختم ہو کر رہ جاتی۔ اگر وہ مدینہ پر حملہ کر دیتے تو ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنا دیتے کہ ''ہم مدینہ کے جوانوں کو قتل کر دیں گے اور عورتوں کو باندیاں بنا لیں گے''

ایک ایسا موقع آیا کہ ابوسفیان اور خالد بن ولید نے پہاڑ کی بلندی سے مسلمانوں پر حملہ کا سوچا اور یہ حملہ بہت خطرناک ہو سکتا تھا کیوں کہ دشمن بلندی پر تھا اور مسلمان نشیب میں تھے۔ ایک کثیر تعداد مسلمانوں کی شہید ہو چکی تھی لیکن سیدنا عمرؓ نے چند ساتھیوں کے ساتھ معمولی سا حملہ کیا تو اس طاقت ور اور فاتح دشمن نے تیزی سے اس بلندی سے اتر کر مکہ کا راستا لیا۔ جس مقصد کے لیے قریش میدان کارزار میں آئے تھے کیا وہ مقصد پورا ہوا؟ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ قریش مسلمانوں کا ایک جنگی قیدی بھی حاصل نہ کر سکے لیکن مسلمانوں نے قریش کے تین آدمی گرفتار کیے۔ شام سے پہلے جو سامان لے جا سکتے تھے سمیٹا اور کوچ کر گئے جبکہ مسلمان وہاں دیر تک موجود رہے شہداء کی لاشیں دفن کیں، زخمیوں کی دیکھ بھال کی، دشمن کا تعاقب کیا لیکن خون کا پیاسہ دشمن جو شاندار فتح حاصل کر کے بھاگا جا رہا ہے اور مسلمان جنہیں شکست خوردہ کہا جاتا ہے، دشمن کے تعاقب کر کے مخالف کے افراد گرفتار کرتا ہے۔ اپنے کیمپ میں آگ جلاتا ہے کہ دشمن کو موجودگی کا علم ہو اور ہمت ہو تو مقابلے کو دوبارہ لوٹ آئے اور اپنے قیدی چھڑا لے جائے ۔اس قسم کے کئی اور سوالات ہیں اور مورخیں دلائل سے ان کا جواب دینے سے قاصر ہیں۔ اس کا جواب صرف اور صرف یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا جو اس جنگ کے آغاز میں کیا تھا اور اس کے پورا ہونے میں کچھ دیر صرف اس لیے کی گئی تھی کہ مسلمانوں نے حکم عدولی کر کے کم ہمتی اور نزاع باہمی کا راستا اختیار کیا تھا جو ان کے لیے زیبا ہی نہیں تھا چنانچہ وہ وعدہ ان الفاظ میں کیا ''مسلمانو! ہم عن قریب ان کے دلوں میں رعب ڈال دیں گے جنھوں نے کفر کی راہ اختیار کی''۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے فرمان کی حکم عدولی پر یہ سزا دی۔ سزا کے بعد اپنے وعدہ کو سچا کر دکھایا اور مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔

عظیم مورخ الحاج محمود شیت اپنی کتاب ''الرسول القائد'' میں واضح، مورخین کی اس بات سے کہ احد میں مسلمانوں کو شکست ہوئی اتفاق نہیں کرتا جو کچھ مذکور مورخ لکھتا ہے پیش خدمت ہے

غزوہ احد کے نتیجہ کے لحاظ سے میں مورخین کی اس بات پر اتفاق نہیں کر سکتا کہ اس میں مشرکین کو کامیابی اور مسلمانوں کو شکست ہوئی کیونکہ جنگی نقطہ نظر سے جانی و مالی نقصان شکست نہیں ہوتی، غزوہ احد کے نتائج کی حقیقت نمایاں کرنے کے لیے فوجی نقطہ نظر سے نقشہ پیش کرتے ہیں۔ جنگ کی ابتدا میں مسلمان غالب آئے حتیٰ کہ میدان جنگ سے انہوں نے مشرکین کو بھگایا اور ان کے اموال اور عورتوں کو گھیرے میں لے لیا اور مشرکین کا جھنڈا خاک آلود ہو گیا، لیکن خالد بن ولید کا مسلمانوں کے پیچھے سے حملہ آور ہونا اور ان کے واپسی کے راستے کو کاٹنا اور سامنے کی طرف سے مشرکین کا حملہ ایسا تھا کہ تمام

اطراف سے مشرکین کی قوتیں مسلمانوں کی قوتوں پر منطبق ہوگئیں اور اس سے اضافہ ہوگیا لیکن آخر تک نصرت مسلمانوں کے حق میں رہی اس لیے کہ ہر جنگ کا نتیجہ فوجی نقطہ نظر سے دیکھا جاتا ہے صرف جانی نقصان کو نہیں دیکھا جاتا بلکہ جنگ سے متعلقہ اہداف و مقاصد کے حصول کو دیکھا جاتا ہے اور وہ دشمن کا ہر لحاظ سے مادی اور معنوی لحاظ سے صفایا ہے۔

کیا مشرکین مادی اور معنوی لحاظ سے مسلمانوں پر حاوی رہے۔۔۔۔۔ بلا شبہ خالد بن ولید کا تیزی سے حملہ آور ہونا مسلمانوں کے لیے بے حد نقصان کا باعث ہوا، بکھرے ہوئے مشرکین مسلمانوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور چاروں جانب سے مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے اور مسلمانوں سے تعداد میں پانچ گناہ زیادہ تھے، جس کا لازماً نتیجہ مسلمانوں کی طاقت کے مکمل خاتمہ کی صورت میں نکلتا ہے لیکن یہ منہ زور اور بپھری ہوئی طاقت اس پر مکمل غلبہ نہ پاسکی بلکہ یہ چھوٹی قوت اپنی فوج کے دس فیصد نقصان کے باوجود ان سے بچنے میں کامیاب ہوگئی اور معنوی و مادی اعتبار سے اس بڑی قوت کو اس چھوٹی قوت پر مکمل تسلط صرف اس بڑی قوت کی بزدلی اور کمزوری کی وجہ سے حاصل نہ ہوسکا۔ اور انہوں نے اپنے دفاع کے لیے غزوہ احد کے ایک دن بعد مدینہ سے بہت دور تک قریش کا تعاقب کیا اور رسول اللہ ﷺ نے اس اقدام میں اپنے ساتھ صرف ان لوگوں کو دیا جنہوں نے غزوہ احد میں شرکت کی تھی، ان کے علاوہ دوسرے لوگوں میں سے کسی ایک سے مدد نہ لی۔ بلاشبہ اس جانکاہ موقع پر مسلمانوں کا جان بچالینا ہی بہت بڑی کامیابی تھی کیونکہ اس سے پہلے ہر جانبت سے مشرکین نے ان کو گھیر لیا تھا اور ان کی مکمل تباہی صاف نظر آتی تھی۔

ڈاکٹر محمد الطیب النجار مولف سیرت سید المرسلین کہتے ہیں ''اور ہم اس محترم عالم کی رائے کی مکمل تائید کرتے ہیں اور اس پر یقین رکھتے ہیں اور ہمارے لیے آپ ﷺ کا موقف ہی بہترین ہے، جو غزوہ موتہ سے واپسی پر مسلمانوں کے متعلق اختیار فرمایا تھا۔ اپنی جنگی حکمت عملی کی بناء پر اس کی تاکید فرمائی تھی، پس یقیناً خالد بن ولید اس وقت یہ طاقت رکھتے تھے کہ مسلمانوں کے لشکر کے بچ جانے والے تمام لوگوں کو نیست و نابود کر دیں اور جس وقت یہ لشکر مدینہ واپس آیا تو ان مسلمانوں نے جنہوں نے اس موقف کو سطحی انداز سے تجزیہ کیا، انہوں نے ان کے منہ پر مٹی پھینکی اور انہیں کہتے اے راہ فرار اختیار کرنے والوں! تم نے اللہ کے راستے میں جہاد سے فرار اختیار کیا لیکن آپ ﷺ نے ہر پہلو سے اس موقف کا جائزہ لیا، انہیں خوشدلی سے خوش آمدید کہا اور فرمایا'' ہرگز نہیں! یہ تو سب سے بڑھکر حملہ کرنے والے ہیں اور میں اسی گروہ سے ہوں'' اور یہ بہتر ہے کہ ہم غزوہ احد سے واپسی پر آپ ﷺ نے جو دعا فرمائی، پر اختتام کریں۔

ترجمہ: ''اے اللہ! تیرے ہی لیے ساری حمد ہے۔ اے اللہ! جس چیز کو تو کشادہ کر دے اسے کوئی تنگ نہیں کر سکتا اور جس چیز کو تو تنگ کر دے اسے کوئی کشادہ نہیں کر سکتا، جس شخص کو تو گمراہ کر دے، اسے کوئی

ہدایت نہیں دے سکتا اور جس شخص کو تو ہدایت دے دے، اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا، جس چیز کو تو روک دے، اسے کوئی دے نہیں سکتا اور جس چیز کو تو قریب کر دے، اسے کوئی دور نہیں کر سکتا۔ اے اللہ! ہمارے اوپر اپنی برکتیں، رحمتیں اور فضل و رزق پھیلا دے۔ اے اللہ! میں تجھ سے ہر قرار دینے والی نعمت کا سوال کرتا ہوں جو نہ ٹلے اور نہ ختم ہو۔ اے اللہ! میں تجھ سے فقر کے دن مدد کا اور خوف کے دن، امن کا سوال کرتا ہوں۔ اے اللہ! جو کچھ تو نے ہمیں دیا اس کے شر سے اور جو کچھ نہیں دیا اس کے بھی شر سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔ اے اللہ! ہمارے نزدیک ایمان محبوب کر دے اور اسے ہمارے دلوں میں خوشنما بنا دے اور کفر وفسق اور نافرمانی کو ناگوار بنا دے اور ہمیں ہدایت یافتہ لوگوں میں کر دے''۔ (سیرت سید المرسلین۔ ۲۲۹۔۲۳۰)

ضمناً اعتراض

مسلمانوں کو جنگ بدر کی فتح نصیب ہوئی۔ اس پر مستشرقین نے الزامات کا خوب چرچا کیا۔ خون ریزی، جارحیت اور انتقامی کاروائی کے لیے ابھارنے کے لیے طعن و شماتت کا اظہار کیا۔ لیکن دوسری طرف جنگ احد کے بارے مغربی انداز فکر یہ ہے کہ اس میں مسلمانوں کو عبرت ناک شکست ہوئی تھی۔ مسلمانوں کے عقیدہ کو ڈانواں ڈول (متزلزل) کر دیا تھا کہ جب اللہ نے فتح کا ارادہ کر لیا تھا تو یہ شکست کیوں ہوئی؟ منافقین نے مذاق اڑانا شروع کر دیا تھا۔ ایک شوخ چشم منافق نے سوال کیا کہ کیا بدر کی فتح اگر تمھارے نبی کی رسالت کی تصدیق کرتی تو احد کی شکست کو کس طرح تعبیر کرو گے؟ (حیات محمد۔ ہیکل۔ ص ۳۴۶)

جواب: سب سے پہلے دیکھتے ہیں کہ حملہ آور کون تھے؟ ان کے اغراض و مقاصد کیا تھے؟ یہ مقاصد کس حد تک پورے ہوئے؟ شکست و فتح کا اندازہ اسی بات پر موقوف ہے کہ قریش مکہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوئے کہ نہیں اور اہل مدینہ کو اس جنگ سے کس قدر نقصان اٹھانا پڑا یا انھیں شکست کا سامنا کرنا پڑا کہ نہیں۔ جنگ بدر کا انتقام انگڑائیاں لے رہا تھا اس شکست کا انتقام لینے کے ساتھ مسلمانوں کی قوت کا قلع قمع کرنا چاہتے تھے اس لیے تین ہزار کا لشکر لے کر چڑھ دوڑے۔ ان میں ۷۰۰ زرہ پوش اور دو سو گھوڑے تھے۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ جنگ احد میں شکست ہوئی تو کون سی رکاوٹ حائل تھی جس کے سبب قریش اپنے مقصد (یعنی مسلمانوں کا ملیامیٹ کرنے) کو حاصل کیے بغیر لوٹ گئے۔ یہ بات درست ہے کہ مسلمانوں کا جانی نقصان ہوا اس کے باوجود میدان جنگ میں موجود رہے۔ اپنی میتوں کو دفنایا جب کہ کفار اپنے ہلاک شدگان کو میدان جنگ میں چھوڑ کر گھر چلے گئے۔ نہ انھیں دفنایا نہ ہی ان کو اٹھا کر اپنے شہر لے آئے۔ جس طرح وہ بڑے طمطراق سے چلے آئے تھے اسی طرح اگر انھیں فتح ہوتی تو خوب جشن مناتے بل کہ مدینہ پر چڑھ دوڑتے اور نہتے مسلمانوں کو ہلاک کر ڈالتے تا کہ یہاں سے دوبارہ لاوانہ

چھوٹ پڑے۔ کفار مکہ کچھ سامان حرب بھی میدان میں چھوڑ گئے جو مسلمانوں کے ہاتھ لگا۔ آپؐ نے کفار کے تعاقب کے لیے مسلمانوں کو بھیجا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں دم خم تھا بد دل نہ ہوئے تھے اور نہ ہی ہمت ہار بیٹھے تھے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ جب دشمن کو بھنک پڑی کہ مسلمان ان کے پیچھے آ رہے ہیں تو دم دبا کر بھاگ گئے۔ پلٹ کر مسلمانوں پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

علی ابن طالبؓ کو مشرکین کے پیچھے جا کر حال معلوم کرنے کا حکم دیا۔ فرمایا "کاروان کے پیچھے پیچھے جاؤ اور معلوم کرو کہ یہ کیا کرنا چاہتے ہیں؟ (یہ جماعت ستر آدمیوں پر مشتمل تھی) (ابن ہشام۔۲۔۷۸) رسول اللہ کی طرف سے اعلان کرنے والے نے دشمن کے تعاقب کا اعلان کیا۔ (ابن ہشام۔۲۔۸۴)

ابن اسحٰق نے کہا' حَتّٰىٓ اِذَا فَشِلْتُمْ کے معنی "تخاذلتم" کے ہیں یعنی تم کمزور ہو گئے ہو اور ایک دوسرے کی مدد چھوڑ دی۔ تَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ "تم نے میرے حکم میں اختلاف کیا" یعنی تمھارے نبی نے جو ہدایت دی تھی اور جو ذمہ داری تم پر ڈالی تھی وہ پوری نہ کی۔ اس سے تیر اندازوں کی طرف اشارا ہے۔ (وہ تیر انداز جنھیں نبی کریم نے ایک ٹیلے پر ٹھہرایا اور فتح و شکست میں یہ جگہ نہ چھوڑنے کا حکم فرمایا)۔

من بعد ما ارٰکم ما تحبون اس کے بعد تمھیں وعدہ پورا کر کے دکھایا جس کے تم خواہاں تھے یعنی وعدہ فتح جس میں کوئی شک نہیں رہ گیا تھا۔ قریش کی پوری پوری ہزیمت ہو چکی تھی وہ اپنی عورتوں اور اموال کو چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے (ابن ہشام۔۲۔۱۰۲)

تمام امور جن سے فتح کا نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کو چھوڑ کر صرف جنگ میں کافی نقصان کی زیادتی کو فتح سمجھ لیا جائے سراسر غلط ہے اور عقل سے بعید ہے۔ قریش کو فتح ہوتی تو وہ جشن مناتے، مدینہ کا رخ کرتے اور مسلمان مرد و زن کو تہ تیغ کرنے سے دریغ نہ کرتے کیوں کہ مسلمانوں کی لاشوں کا مثلہ کر چکے تھے۔

دوم: آپ نے شہداء احد کا معائنہ فرمایا (الرحیق المختوم۔۴۵۵)۔ ابوسفیان لڑائی اگلے سال پر ملتوی کر کے میدان جنگ چھوڑ گیا (عرب کا چاند۔۲۵۵) جو لشکر میدان جنگ چھوڑ دے اپنے ہلاک ہونے والوں کو نہ لے جا سکے یا وہیں دفنا نہ سکے اور دوسرے لشکر کے رحم و کرم پر چھوڑ دے اسے فاتح نہیں کہا جا سکتا۔ پھر مسلمانوں نے قریش کا تعاقب کیا نہ کہ کفار نے۔ مسلمان میدان جنگ میں موجود تھے انھوں نے اپنے شہداء کا کفن دفن کیا۔ یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ جانی و مالی نقصان کی زیادتی شکست کے زمرے میں نہیں آتی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی جنگ میں ہوتا رہتا ہے کہ اگلے وقت میں ایک فوج کا پلہ ہلکا اور دوسری کا بھاری ہوتا ہے۔ اس میں ہلکے پلے والے کو شکست خوردہ اور بھاری پلے والے کو فاتح قرار نہیں دیا جا سکتا جب تک کہ دونوں لشکروں میں صاف صاف فیصلہ نہ ہو جائے۔ المختصر فیصلہ مسلمانوں کے حق میں ہوا۔ ارشاد خداوندی ہے " وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ

مُؤمِنِينَ“ (آل عمران ۔۱۳۹) ترجمہ: ”دل شکستہ نہ ہو اور غم نہ کرو اگر تم مومن ہو تو تم ہی غالب رہو گے“

قابل غور: کوئی منچلا یہ نہ کہہ دے کہ ابوسفیان للکارا لیکن کسی نے جواب نہ دیا گویا مسلمان ڈر گئے تھے اور اب ان میں کفار پر دوبارہ حملہ کرنے کی ہمت نہ رہی تھی وغیرہ وغیرہ۔ ایسا ہرگز نہیں ہے، واقعہ یوں ہے کہ ابوسفیان سامنے کی پہاڑی پر چڑھ کر للکارا کہ یہاں محمدؐ ہیں؟ آپؐ نے حکم دیا کہ کوئی جواب نہ دے۔ ابوسفیان حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کا نام لے کر پکارا اور جب کوئی آواز نہ آئی تو پکار کر بولا سب مارے گئے۔ حضرت عمرؓ سے ضبط نہ ہو سکا۔ بول اٹھے ”او دشمن خدا! ہم سب زندہ ہیں“

ابوسفیان بولا: ”اے ہبل! تو اونچا رہ“

صحابہؓ نے بہ حکم رسولؐ اللہ کہا: ۔خدا اونچا اور بڑا ہے۔

ابوسفیان نے کہا: ہمارے پاس عزیٰ ہے تمھارے پاس نہیں“۔

صحابہ نے کہا: ”خدا ہمارا آقا ہے اور تمھارا کوئی آقا نہیں۔

ابوسفیان نے کہا: یہ بدر کا بدلہ ہے۔

فکر نبوی کا اعجاز ہے کہ ایک وقت کے لیے ابوسفیان کی پکار کا جواب دینے سے اپنے صحابہ کو روک دیا۔ لیکن جب وہ یہ کہنے لگا کہ سب مر گئے تو حضرت عمرؓ نے فوراً جواب دیا کہ اے دشمن خدا! ہم سب زندہ ہیں۔ پھر ابوسفیان کے تمام سوالوں کا جواب صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق ترکی بہ ترکی دیا۔ اگر ڈر تھا تو جو کچھ ابوسفیان کہتا رہتا کسی ایک کا جواب بھی نہ دیتے لیکن یہاں تو ایک ایک پکار کا للکار سے جواب دیا جا رہا ہے۔ یہی نہیں بل کہ جب ابوسفیان آپؐ اور آپ ﷺ کے صحابہ کو پہاڑی پر دیکھ لیتا ہے تو فوج لے کر بڑھا مگر حضرت عمرؓ اور دیگر چند صحابہ کرام نے پتھر برسائے جس سے وہ آگے نہ بڑھ سکا۔ اس کے بعد اگلے سال لڑائی کا عندیہ دے کر گھر کی راہ لیتا ہے۔ یہی فاتح فوج تھی کہ مقابل میدان میں موجود رہے اور فاتح سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ جائے۔

کفار نے ہر طرح سے مسلمانوں کو مٹانے کی کوشش کی۔ خالد بن ولید عقب سے حملہ کر کے پہاڑی پر موجود چند صحابہؓ کو شہید کر کے سوار دستہ کے ساتھ نہایت بے جگری سے حملہ کیا۔ پھر سے دونوں فوجیں آمنے سامنے تھیں۔ گھمسان کا رن پڑا۔ ابوسفیان فوج لے کر پہاڑی پر چڑھ آتا ہے اور مسلمانوں کی مزاحمت سے آگے نہ بڑھ سکا۔ پیچھے کی راہ لی اور گھر کو سدھارا۔ ان تمام حالات میں مسلمانوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ بہت بڑا جانی نقصان ہوا۔ ستر صحابہؓ شہید ہوئے۔ لاشوں کا مثلہ کیا گیا۔ آخر کفار میدان چھوڑ گئے ۔اپنے ہلاک شدگان کو مسلمانوں کے رحم و کرم یا گوشت خور جانوروں کے حوالے کر کے راہ فرار اختیار کی۔ دانش منداور اہل بصیرت ان حقائق کی روشنی میں بہ خوبی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کفار کو کیسے فتح ہوئی۔ اس کو فتح سے تعبیر کیا جا

سکتا ہے؟ ضرور وہ یہی رائے دیں گے۔ نہیں ہر گز نہیں۔

الزام: اللہ نے فتح کا ارادہ کر لیا تھا تو یہ شکست کیوں؟ یہ شکست ہے ہی نہیں کیونکہ یہ لوگ محض جانی و مالی نقصان کو فتح سمجھتے ہیں جو محض غلط ہے۔ دوم: اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو سبق دیا کہ نبی کی بات پر عمل کیا جائے، اگر نہ کیا جائے تو اللہ تعالیٰ ان کو سزا دے گا۔ مالی جانی نقصان یا ایک وقت میں مسلمانوں کا پلہ ہلکا اور کفار کا بھاری رہا۔ صرف اور صرف نبی پاک کی نافرمانی کا سبب تھا (وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ۔ آل عمران۔ ۱۳۹)۔ انھیں یہ سزا دے کر آخر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں ہی کو فتح نصیب فرمائی۔

ضمناً اعتراض

''واٹ'' کہتا ہے کہ عبداللہ بن ابی نے علیحدگی اس لیے اختیار کی کہ وہ مدینہ کی مرکزی آبادی کا تحفظ کر سکے۔ (ن۔۵۔۲۸۷)

جواب: واٹ کے اس خیال کی اولیں ماخذ سے تائید نہیں ہوتی۔ واقعات بھی اس کے خلاف ہیں۔ احد کے قریب مقام ''شوط'' پر پہنچے۔ دشمن بالکل قریب تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ اس وقت آستیں کا سانپ عبداللہ بن ابی رئیس المنافقین اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر محض لشکر اسلام کو زک پہنچانے کے لیے لوٹ آیا اور بہانہ یہ گھڑا کہ آپ ﷺ نے میری بات نہ مانی اور ہماری بجائے نوجوانوں کی مانی تو ہم خواہ مخواہ اپنی جانیں کیوں گنوائیں۔ یہ بہانہ محض بہانہ تھا۔ اگر یہی سبب تھا تو مدینہ سے اس مقام تک کیوں چلا آیا؟ مقصد کچھ اور تھا۔ وہ لشکر اسلام میں افراتفری اور بد دلی پھیلانا چاہتا تھا دوسری طرف قریش کی مدد کرنا چاہ رہا تھا۔ ان کی مدد کر کے اپنی حمایت کا مظاہرہ کیا۔ ایسے موقعہ پر جب دشمن سب کچھ دیکھ رہا ہو اور سپاہی کمانڈر کو چھوڑ جائیں تو باقی کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں اور لشکر کی کمر ٹوٹ جاتی ہے دوسری طرف دشمنوں کے حوصلے بلند ہو جاتے ہیں۔ یہ کاروائی پیغمبر اسلام ﷺ اور ان کے مخلص ساتھیوں کے خاتمے کی ایک نہایت موثر حکمت عملی تھی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ '' ہمیں معلوم ہے کہ جنگ وغیرہ کچھ نہ ہوگی یہ خواہ مخواہ کی باتیں ہیں اگر واقعی جنگ ہوتی تو ہم بھی ساتھ دیتے ساتھ نہ چھوڑتے''۔ (قرآن میں سے لویعلم منالاسبا کم)

اس سے چند امور واضح ہوتے ہیں۔

۱: اس کی بات نہ مانی گئی تو مدینہ ہی میں کہہ دیتا کہ میری بات مانی نہیں تو میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتا اور مقام شوط جا کر اسے اپنی بات کا احساس ہوا کہ نہیں مانی گئی، کتنی لغو بات ہے۔

۳: لشکر اسلام کو زک پہنچانا چاہتا تھا۔

۴: قریش کی کھلم کھلا امداد تھی۔ لشکر سے علیحدگی اختیار کر کے قریش کو باور کرایا کہ ہم تمہارے

ساتھی ہیں۔

۵:اس کی یہ موثر ترکیب اور حکمت عملی اسلامی لشکر کے حوصلے پست کرنے اور قریش کی فوج کے حوصلے بلند کرنے کے لیے بہترین حکمت عملی تھی۔

٦: مدینہ ہی میں کہہ دیتا تم جاؤ، میں مدینہ کی مرکزی آبادی کا تحفظ کرتا ہوں۔ جب مدینہ کو چھوڑ اسلامی لشکر کے ساتھ احد کے قریب چلا آیا اس وقت مدینہ کی مرکزی آبادی کا خیال نہ تھا۔ اسے کہتے ہیں ''من حرامی حجتاں ڈھیر'' یا فارسی میں کہتے ہیں ''خوئے بدرا بہانہ بسیار''۔

دوم: علاوہ ازیں جنگ احد کے بعد پہلے جمعہ کو مسجد نبوی میں ابن ابی کو اسی بنا پر ذلیل وخوار کیا گیا کہ اس نے جنگ کے نازک موقع پر انتہائی گھناؤنے کردار کا مظاہرہ کیا تھا۔ یہ واقعہ ابن ہشام جلد دوم ص ۸۹ پر اس طرح ہے کہ ابن اسحاق نے کہا مجھ سے ابن شہاب زہری نے بیان کیا' ذاتی اور قومی شرف حاصل کرنے کے باعث عبداللہ بن ابی کے لیے مسجد میں ایک جگہ مقرر تھی۔ جہاں وہ بے روک ٹوک آتا جمعہ ادا کرتا۔ جمعہ کے دن جب آنحضرت ﷺ منبر پر خطبہ کے لیے بیٹھتے تو یہ کھڑے ہو کر اعلان کرتا ''لوگو! یہ اللہ کے رسول تمھارے درمیان موجود ہیں' اللہ نے آپ کی برکت سے تمھیں عزت وحرمت دی ہے، تمھیں چاہیے کہ آپ کی اعانت ونصرت کرو اور تقویت پہنچاؤ، آپ کے احکام سنو اور فرماں برداری پر کار بند رہو۔ یہ سلسلہ جاری رہا کہ جنگ احد پیش آئی۔ اس موقعہ پر وہ اپنے تین سو ساتھی لے کر واپس مڑ آیا تھا۔ معمول کے مطابق جمعہ کے دن وہی تقریر کرنے کھڑا ہوا مگر مسلمانوں نے مزاحمت کی، ہر طرف سے اس کے کپڑے پکڑ لیے اور کہا او دشمن خدا! بیٹھ جا تو اس قابل نہیں کہ کچھ یہاں کہے۔ جنگ احد میں تو نے وہ کیا جو تجھے نہیں کرنا چاہیے تھا۔ عبداللہ بن ابی لوگوں کی گرفت سے نکلتا ہوا اور یہ کہتا ہوا مسجد سے باہر چلا گیا ''گویا میں نے کوئی بری بات نہیں کہی تھی، میں تو ان کے معاملے کی مضبوطی کے لیے کھڑا ہوا تھا''۔

دندان مبارک

غزوہ احد میں آپ ﷺ کے دندان مبارک شہید ہوئے، کا ذکر ہے۔ اس پر مصنف سیرت سید الوریٰ نے خوبصورت بحث کی ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔

قابل غور: اردو کے اکثر سیرت نگاروں نے آنحضرت ﷺ کے چار دندان مبارک کی شہادت کا ذکر کیا ہے۔ بعض نے دو کا بھی ذکر کیا ہے۔ مگر تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ یہ محض غلط فہمی ہے۔ اس بات کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے حدیث، تاریخ اور لغت کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔

صحیح بخاری میں ہے کہ غزوہ احد میں رسول اللہ کا رُبَاعِیَہ ٹوٹ گیا تھا۔ کُسِرَت رَبَاعِیَتہ۔ (بخاری ج ۲ ص ۵۸۴)

کون سا رباعیہ ٹوٹا تھا؟ تمام محدثین اور مورخین متفق ہیں کہ رَبَاعِیَۃ یُمنیٰ سُفلٰی ٹوٹا تھا، یعنی دائیں طرف والا نچلا رباعیۃ۔ حاشیہ بخاری میں ہے ''اَیِ الیُمنٰی السُّفلٰی ص۔۵۸۳ یعنی دایاں نچلا رباعیہ۔ ابن ہشام، مواہب اور سیرت کی دیگر کتابوں میں یہی لکھا ہے۔

واضح رہے کہ رباعیہ، ثنیہ اور ناب عربی میں مونث ہیں مگر ترجمے میں ہم نے ''دانت'' کی مناسبت سے ان کو مذکر سے تعبیر کیا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رباعیہ کیا ہے؟ تو اس کی وضاحت آئمہ لغت نے یوں کی ہے۔

'' اَلرَّبَاعِیَۃ۔۔ مِثلُ الثَّمَانِیَۃِ۔۔۔ اِحدٰی الاَسنَانِ الاَربَعِ الَّتِی تَلِی الثَّنَایَا' بَینَ الثَّنِیَّۃِ وَالنَّابِ۔۔۔ وَالجَمعُ رَبَاعِیَات۔ قَالَ الاَصمَعِیُّ :لِلاِنسِ۔ان مِن فَوقِ ثَنِیَّتَانِ و رَبَاعِیَتَانِ بَعدَھُمَا۔۔۔ وَکَذٰلِکَ مِن اَسفَل۔

(رَبَاعِیہ) بروزن ثَمَانِیَہ' ان چار دانتوں میں سے ایک دانت کو کہتے ہیں جو ثنایا سے ملے ہوتے ہیں اور یہ ایک دانت ثنیہ اور ناب کے درمیان واقع ہوتا ہے۔ رَبَاعِیَہ کی جمع رَبَاعِیَات ہے۔ اصمعی نے کہا ہے کہ ہر انسان کے اوپر والے دانتوں میں دو ثنیہ ہوتے ہیں اور دو رباعیہ اسی طرح نیچے کے دانتوں میں بھی ثنیہ اور رباعیہ ہوتے ہیں۔ (لسان العرب ج۸ مادہ زلع)

مزید وضاحت کے لیے دانتوں کا درج ذیل عکس ملاحظہ فرمایے:۔

مندرجہ بالا حوالہ جات سے واضح ہے۔

۱: رباعیہ مفرد ہے۔ احدی الاسنان یعنی وہ ایک دانت جو ناب اور ثنیہ کے درمیان ہوتا ہے۔

۲: اس کی تثنیہ رباعیتان اور جمع رباعیات ہے۔

۳: جان دو عالم کا صرف ایک رباعیہ ٹوٹا تھا جیسا کہ بخاری میں ہے کُسِرَت رَبَاعِیَہ۔ اگر دو دانت ٹوٹے ہوتے تو اس صورت میں اگر وہ دونوں رباعیے ہوتے تو حدیث کے الفاظ اس طرح ہوتے رَبَاعِیَہ وَثَنِیَّتِہٖ یا کُسِرَت رَبَاعِیَتِہٖ وَنَابَہٗ' یعنی رباعیہ اور ثنیہ یا رباعیہ اور ناب ٹوٹ گئے تھے۔

۴: محدثین ومورخین کے نزدیک بالاتفاق ٹوٹنے والا دانت رباعیہ یمنی سفلیٰ تھا یعنی دایاں نچلا رباعیہ۔ ان حقایق کے پیش نظر یہ بات قطعی اور یقینی ہے کہ جان دو عالم ﷺ کے دو یا چار دانت ہرگز نہیں ٹوٹے تھے بل کہ صرف ایک دانت مبارک شکستہ ہوا تھا یعنی وہ دانت جو دائیں ثنیہ اور دائیں ناب کے درمیان واقع تھا۔ نہ جانے دو اور چار دانتوں والی بات اردو کے بعض سیرت نگاروں نے کہاں سے نکال لی۔ پھر رباعیہ بھی سارا نہیں ٹوٹا تھا بل کہ اس کا ذرا سا حصہ ٹوٹ کر جدا ہوا تھا۔ بخاری شریف کے حاشیہ میں ہے (آپ کا رباعیہ جڑ سے نہیں ٹوٹا تھا بل کہ اس کا ایک حصہ ٹوٹا تھا) یہ چھوٹا سا ٹکڑا جو جدا ہوا تھا' اوپر

والا تھا یا سائیڈ والا۔۔؟ اس کے بارے میں کوئی وضاحت نہیں مل سکی تاہم ہمارے خیال میں۔۔واللہ اعلم بالصواب۔۔ یہ سائیڈ والا حصہ رہا ہوگا کیوں کہ اوپر سے جو دانت ٹوٹ جائے وہ دانتوں کے ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق ہمیشہ اسی طرح رہتا ہے اور دوسرے دانتوں کے ساتھ کبھی برابر نہیں ہو سکتا۔ اس صورت میں چاہیے تھا کہ آپ کا حلیہ مبارکہ بیان کرنے والے اور آپ کے حسین دانتوں کی منظر کشی کرنے والے یہ تذکرہ ضرور کرتے کہ پہلے آپ کے دانت مبارک برابر وہموار تھے بعد میں غزوہ احد کے دوران ایک دانت ٹوٹ جانے کی وجہ سے وہ دانت باقیوں کی بہ نسبت پست ہوگیا تھا حال آنکہ کسی بھی حلیہ نگار نے اس بات کا ذکر نہیں کیا۔ یوں بھی اس طرح کے دانت خوب صورت نہیں سمجھے جاتے ہیں جب کہ جان دو عالم ﷺ کے دندان مبارک کا حسن وتناسب شک وشبہ سے بالا تر ہے۔اس لیے ہمارے خیال میں اوپر کا نہیں بل کہ سائیڈ کا ذرا سا ٹکڑا الگ ہوا ہوگا جو بعد میں جلد ہی متوازن ہوگیا ہوگا۔ کیونکہ ماہرین دندان کہتے ہیں کہ اگر ایک داڑھ نکل جائے تو درمیانی رکاوٹ ہٹ جانے کی وجہ سے دونوں طرف کی داڑھیں ایک دوسرے کی طرف جھک جاتی ہیں۔ان میں فاصلہ کم رہ جاتا ہے

جان دو عالم ﷺ قدرتی طور پر مفلج الاسنان تھے یعنی آپ کے دندان مبارک بہت زیادہ جڑے ہوئے نہیں تھے۔مناسب وموزوں فاصلہ تھا اور اس طرح کے دانتوں میں اگر کسی دانت کی سائڈ سے چھوٹی سی کرچ جدا بھی ہوجائے تو دیکھنے میں کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہوتا۔ پھر چند دن بعد دونوں دانتوں کے ایک دوسرے کی طرف جھک جانے سے معمولی فرق بھی کالعدم ہوگیا ہوگا۔کسی حلیہ نگار نے اس کو بیان نہیں کیا' نہ جان دو عالم ﷺ کے دندان مبارک کے حسن وجمال اور ربط واتصال میں ذرا برابر کوئی کمی واقع ہوئی۔

جن کے گچھے سے لچھے جھڑیں نور کے
ان ستاروں کی زینت پہ لاکھوں سلام

(حاشیہ سید الوریٰ ج ۲ ص ۴۰ تا ۴۲)

عجیب واقعہ

بدر کے قیدیوں کے بارے حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا کہ فدیہ لے کر چھوڑ دیں جبکہ حضرت عمرؓ نے فرمایا، سب کو تہ تیغ کردو۔حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو بکرؓ کی رائے پر عمل کرنے کا قصد کیا اور میری رائے پر عمل کرنے کا اردادہ نہ فرمایا اور قیدیوں سے فدیہ لے لیا۔ دوسرے دن میں حاضر ہوا تو رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکر صدیقؓ رو رہے تھے، میں عرض کیا یا رسول اللہ! مجھے بتلایئے کہ آپ اور تمہارا ساتھی کس وجہ سے رو رہے ہیں، اگر مجھے رونا آیا تو

میں بھی رولوں گا ورنہ آپ دونوں کے رونے کی وجہ سے رونے کی کوشش کروں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تمہارے اصحاب کے فدیہ لینے کی وجہ سے رو رہا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ کے قریب ایک درخت تھا آپ ﷺ نے فرمایا، اس درخت کے قریب مجھ پر ان لوگوں کا عذاب پیش کیا گیا تھا ابن جریر نے محمد بن اسحٰق سے روایت کیا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: لولا کتب من اللہ سبق لمسکم فیما اخذتم عذاب عظیم ''اگر پہلے سے معافی کا حکم اللہ کی طرف سے لکھا ہوا نہ ہوتا تو تم نے (کافروں سے) جو (فدیہ کا مال) لیا تھا اس کی وجہ سے تم کو ضرور بڑا عذاب پہنچتا'' تو آپ ﷺ نے فرمایا ''اگر آسمان سے عذاب نازل ہوتا تو عمر بن خطابؓ اور سعد بن معاذؓ کے سوا (لوگوں میں سے) کوئی عذاب سے نہ بچتا کیونکہ انہوں نے کفار کے خون بہانے کو زیادہ پسند کیا تھا۔ اس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ بدر کے قیدیوں کو فدیہ لے کر رہا کرنا کوئی پسندیدہ فعل نہ تھا ورنہ اللہ تعالیٰ یہ نہ فرماتا: ما کان لنبی ان یکون لھو اسری حتیٰ یثخن فی الارض، ''کسی نبی کی شایانِ شان اس وقت قیدی بنانا جائز نہیں ہے جب تک کہ وہ زمین پر اچھی طرح کافروں کا خون نہ بہالے۔

جواب: علامہ غلام رسول بحوالہ علامہ سید احمد سعید کاظمی لکھتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: جنگ بدر میں ستر کافروں کا خون بہا دیا تھا اور ستر کافروں کا خون بہانے کے بعد باقی ماندہ کو قید کر لیا گیا تھا۔ آپ ﷺ نے ستر کا خون بہانے کے بعد ستر کو گرفتار کیا تھا۔۔۔ قرآن مجید کی اس آیت کے عین مطابق تھا یہ عمل اس وقت ناپسندیدہ اور آیت کے خلاف ہوتا جب جنگ میں کسی کافر کا خون بہائے بغیر کافروں کو گرفتار کر لیا جاتا اور جب ستر کافروں کا خون بہانے کے بعد ستر کافروں کو قیدی بنایا گیا تو پھر آپ ﷺ کا یہ عمل کیسے ناپسندیدہ ہو سکتا ہے۔؟

امام رازی لکھتے ہیں کہ یہ جو فرمایا: ما کان لنبی ان یقون لہ اسریٰ ''کافروں کا اچھی طرح خون بہائے بغیر ان کو قید کرنا کسی نبی کی شان کے لائق نہیں ہے'' اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اچھی طرح خون بہانے کے بعد کافروں کو قید کرنا جائز ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یوم بدر کو صحابہ کرامؓ نے کافروں کی ایک بڑی تعداد کو قتل کیا تھا اور زمین میں اچھی طرح خون بہانے کی یہ شرط نہیں کہ تمام لوگوں کو قتل کر دیا جائے اور قتل کرنے اور خون بہانے کے بعد صحابہؓ نے کافروں کو قید کیا تھا۔ جب صحابہ نے ایک جائز کام کیا تھا تو اس آیت سے یہ استدلال کرنا صحیح نہیں ہے کہ انہوں نے یا معاذ اللہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے کوئی گناہ یا مصیبت کی تھی، خاص طور پر جبکہ اللہ تعالیٰ نے بعد میں خود اس فعل کا حکم دے کر اس کے جواز کو موٴکد کر دیا۔ سورہ محمد: ۴ میں ہے ''سو جب تمہارا کفار سے مقابلہ ہو تو (تمہارا پہلا کام) ان کی گردنِ مارنا ہے، حتیٰ کہ جب تم ان کا اچھی طرح خون بہا چکو تو پھر ان کو مضبوطی سے باندھ لو (اس کے بعد تمہیں اختیار ہے) خواہ محض ان پر احسان کر کے انہیں

رہا کر دو یا ان سے فدیہ لے کر انہیں چھوڑ دو‘‘ (تبیان القرآن جلد ۵: ۳۴۸ تا ۳۴۲)

۲۔ باقی رہا یہ سوال کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کیوں فرمایا: تریدون عرض الدنیا واللہ یرید الآخرۃ (انفال۔ ۶۷) ’’اے مسلمانوں! تم دنیا کا مال چاہتے ہو اور اللہ (تمہارے لیے آخرت کا ارداہ فرماتا ہے۔‘‘ اس کا جواب یہ ہے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں ان صحابہ کرامؓ کو ملامت کی گئی ہے، جنہوں نے فدیہ لے کر قیدیوں کو آزاد کرنے کا مشورہ دیا تھا لیکن حقیقتاً یہ خطاب ان تمام صحابہ کرامؓ کی طرف متوجہ نہیں ہے بلکہ اس آیت کا روئے سخن ان بعض مسلمانوں کی طرف ہے جنہوں نے نیا نیا اسلام قبول کیا تھا اور مال دنیا کے طمع میں فدیہ لینے کی خواہش کی تھی اور حضرت ابو بکرؓ مال دنیا کی طمع سے بری ہیں ان کا مشورہ اس وجہ سے تھا کہ ہوسکتا ہے ان میں سے کچھ لوگ اسلام لے آئیں اور اسلام کی نشر و اشاعت میں اضافہ ہو اور مسلمانوں کو شوکت اور غلبہ خاص ہو، سو حضرت ابو بکرؓ نے جو فدیہ لے کر قیدیوں کو رہا کرنے کا مشورہ دیا تھا، وہ آخرت کی ہی بناء پر تھا اور اس وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے اس مشورہ کو قبول فرمایا تھا لہذا یہ آیت قیدیوں کو رہا کرنے کے خلاف نہیں ہے۔

۳۔ یہ سوال بھی کیا جاتا ہے کہ اگر قیدیوں کو رہا کرنا جائز تھا تو پھر اللہ تعالیٰ نے یہ کیوں فرمایا ’’لو لا کتب من اللہ سبق فیما اخذتم عذاب عظیم ۔(انفال ۸۔۶۸)‘‘ ترجمہ‘‘ اگر پہلے سے (معافی کا حکم) اللہ کی طرف سے لکھا ہوا نہ ہوتا تو تم نے جو مال لیا تھا، اس کی وجہ سے تم کو ضرور بڑا عذاب پہنچتا ہے) اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ فدیہ لینے کی وجہ سے تم عذاب کے مستحق تھے، کیونکہ اس سے پہلے فدیہ لینے سے ممانعت نہیں کی گئی تھی تو پھر فدیہ لینا عذاب کا سبب کیسے ہوسکتا تھا بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ سابقہ شریعتوں میں غنیمت لینا حرام تھا اور ابھی اس کے حلال ہونے کا حکم نازل نہیں ہوا تھا، اور جب مسلمانوں نے بلا اجازت کافروں کا مال غنیمت لوٹ لیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

امام ترمذی روایت کرتے ہیں ’’حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا تم سے پہلے بنی آدم میں کسی کے لیے بھی غنیمت حلال نہیں کیا گیا۔ آسمان سے ایک آگ نازل ہوتی اور غنیمت کو کھا جاتی، سلیمان اعمش نے کہا اس بات کو اب ابو ہریرہؓ کے سوا کون کرسکتا ہے اور جب جنگ بدر ہوئی تو غنیمت کی حلت کے حکم نازل ہونے سے پہلے مسلمانوں نے غنیمت لوٹنا شروع کر دیا، اس وقت یہ آیت نازل ہوئی ’’ترجمہ‘‘ (اگر پہلے سے (معافی کا حکم) اللہ کی طرف سے لکھا ہوا نہ ہوتا (کیونکہ اللہ تعالیٰ فرما چکا ہے، جب تک آپ ان میں ہیں، ان پر عذاب نازل نہیں ہوگا) تو تم نے جو مال لیا تھا اس کی وجہ سے تم کو ضرور عذاب پہنچتا۔ اس صحیح حدیث سے واضح ہو گیا کہ اس آیت کا تعلق فدیہ لینے سے نہیں بلکہ بلا اجازت غنیمت سمیٹنے سے ہے اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ اس کے بعد والی آیت میں اللہ تعالیٰ نے غنیمت لینے کی عام اجازت دے دی۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے ’’ فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا (

انفال:٦۹)''سواب اس غنیمت کو کھاؤ جو تم نے حاصل کیا ہے درآں حالانکہ وہ حلال،طیب ہے۔''

اس بحث سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ اس سورہ انفال کی ان آیات میں قیدیوں سے فدیہ لے کر انہیں رہا کرنے کی مذمت نہیں کی گئی بلکہ بلا اجازت غنیمت لینے پر ملامت کی گئی اور اگر بالفرض ان آیات کا ربط قیدیوں سے فدیہ لے کر آزاد کرنے سے ہی جوڑا جائے تو اس ملامت کی وجہ یہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں کفار کی بیخ کنی ہی مطلوب تھی،اس وجہ سے کفار کو قتل نہ کرنے اور گرفتار کرنے کو ناپسند قرار دیا لیکن بعد میں جب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو عزت اور غلبہ عطا فرمایا اور مسلمانوں کی کثرت ہو گئی تو پھر یہی حکم نازل ہوا کہ میدان جنگ میں کافروں کی گردنِ اڑا دو،پھر ان کو گرفتار کر لو اور گرفتار کرنے کے بعد یا ان کو فدیہ لے کر چھوڑ دو یا بلا فدیہ رہا کر دو چنانچہ علامہ محمود آلوسی لکھتے ہیں''جب اسلام ایک کمزور شاخ کی مانند تھا اور دشمنان اسلام بہت قوی تھے تو اللہ تعالیٰ نے کافروں کے خون بہانے کا حکم دیا اور فدیہ لینے سے منع کیا(فی الواقع اللہ تعالیٰ نے فدیہ لینے سے منع نہیں کیا۔اور جب مسلمانوں کی حالت سنبھل گئی اور شجر اسلام اپنے تنے پر مضبوطی سے قائم ہو گیا تو پھر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اختیار دیا کہ وہ چاہیں تو فدیہ لے کر قیدیوں کو چھوڑ دیں اور اگر چاہیں تو بغیر فدیہ کے امتناناً اور احساناً قیدیوں کو رہا کر دو اور فرمایا فاما منا بعد و اما خداءً ماخدا۔۔۔(سورۃ محمد۔۴)

ان امور پر توجہ دی جائے جس سے اس اعتراض کی حقیقت سامنے آجائے گی۔

اول:آیت کے معنی: ما کان لنبی ان یقون له اسری حتی یثخن فی الارض کا معنی یہ کرنا پڑتا ہے کہ کسی نبی کے لیے مناسب نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی ہوں اور وہ انہیں قتل کرنے اور اچھی طرح خون بہائے بغیر زندہ چھوڑ دے۔حالانکہ ان الفاظ کا مفہوم یہ ہے کہ''کسی نبی کے لیے مناسب نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی ہوں،تا آنکہ وہ خون ریزی نہ کرے یعنی جنگ میں اچھی طرح خون ریزی کر لینے سے پہلے کسی کو قیدی بنانا مناسب نہیں ہے اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ گرفتار شدہ لوگوں میں خون ریزی کا سلسلہ جاری رکھا جائے۔

دوم:شان صدیقت:تفسیر کی رو سے جن لوگوں نے فدیہ کو ترجیح دی،انہوں نے آخرت کی بجائے دنیا کو اختیار کیا اور یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ فدیہ کی تجویز صدیق اکبرؓ نے پیش کی تھی۔کیا صدیق اکبرؓ جیسے جانثار اور اخلاص وایثار کے پیکر سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ اس نے آخرت پر دنیاوی مفادات کو ترجیح دی ہوگی؟

سوم:مقام نبوت:اس تفسیر کی رو سے اللہ کا آخری رسول بھی نہیں بچتا،کیونکہ آپ نے ابو بکر صدیقؓ کی رائے کو پسند کیا تھا اور اپنی نگرانی میں فدیہ کا کام انجام دیا تھا۔وہ ہستی جو فقر پر فخر کرنے والی ہے اس ذات کو بھی،تریدون عرض الدنیا''میں داخل سمجھا جائے؟(معاذ اللہ)

چہارم: تفسیر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے، جیسے فدیہ لینا کوئی بہت ہی بڑا جرم تھا اور اس کے ارتکاب کرنے والے بڑے عذاب کے مستحق تھے۔ اس جرم کے مرتکب حضرات میں سرفہرست کون تھے۔۔ یہ بات قابل غور ہے کہ قرآن کریم نے دوسری جگہ خود ہی فدیہ لینے کی اجازت دی ہے سورہ محمد میں قیدیوں کے بارے میں ارشاد ہے" فاما منا بعد و اما فداء "یعنی گرفتار کرنے کے بعد یا تو ان کو بطور احسان چھوڑ دو یا فدیہ لو۔ گویا ایک طرف تو خود ہی فدیہ لینے کی اجازت دی جا رہی ہے اور دوسری طرف فدیہ لینے والوں کو عذاب کا مستحق ٹھہرایا جا رہا ہے! اگر کہا جائے کہ سورہ محمد والی آیت اس واقعہ کے بعد نازل ہوئی تھی تو یہ بات درست نہیں ہے۔ تاہم اگر اسے درست مان بھی لیں تو یہ بات بھی درست نہیں کیونکہ جو کام چند روز پہلے اللہ تعالیٰ کو پسندیدہ نہ تھا اور اس کے مرتکب بڑے عذاب کے مستحق تھے، چند دن بعد وہی کام اللہ تعالیٰ کو پسند آ گیا کہ قیامت تک کے لیے اس کی اجازت دے دی۔

پنجم: ترمذی کی حدیث: ترمذی کی روایت کے مطابق فدیہ لینے سے پہلے جبرائیل امینؑ نازل ہوئے تھے اور جان دو عالم ﷺ سے کہا تھا کہ آپ کے اصحاب قیدیوں کو قتل کرنے اور فدیہ لینے میں جو صورت چاہیں اختیار کر سکتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ہی کے دیئے ہوئے اختیار کو استعمال کیا اور صحابہؓ نے فدیہ لینا پسند کر لیا تو اللہ تعالیٰ ناراض ہو گیا اور صحابہؓ کو عذاب کا مستحق ٹھہرایا، بلکہ جان دو عالم ﷺ کو درخت کے قریب عذاب کا مشاہدہ بھی کرا دیا۔ الغرض اس روایت کی تفسیر جو مفسرین نے کی ہے ظاہر معنی کے خلاف ہے، شان صدیقیت کے متصادم ہے، مقام رسالت کے خلاف ہے، سورہ محمد کی آیت سے معارض ہے، ترمذی کی روایت سے متصادم ہے۔۔۔ اس لیے قطعی طور پر نا قابل قبول ہے۔

غزوہ خندق

اعتراض نمبر ۳۰۵

خون ریزی آئین اسلام کی رو سے بدترین عمل ہے اگر کوئی مسلمان دوسرے مسلمانوں کو بلا وجہ قتل کر دے تو قصاص کے علاوہ اسے ابدی جہنم کی بشارت دی گئی ہے اور اگر غیر مسلم کو قتل کرو تو سو اونٹ بہ طور تاوان ادا کرنے پڑتے ہیں لیکن اگر کسی شخص یا جماعت سے امن عامہ کا خطرہ ہو تو اہراق دم فرض ہو جاتا ہے۔ اس میں کفر و اسلام کی تخصیص نہیں۔" اَلْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْل "تو مسلمانوں کی کامیابی اور اسلام کی پیش رفت کے لیے ایسی غلط بیانی کو کیسے نا درست قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایسی معمولی غلطی کو جو اَلحَربُ خُدعَةٌ" کے ذیل میں آ سکتی ہے ناجائز کہنا انسانی فراست کی تحقیر ہے (ڈاکٹر پروفیسر غلام ربانی ۔سیرت طیبہ ج ۲۔ ۱۶۶)

جواب: نعیم بن مسعود الشجعی غطفانی رئیس تھے۔ وہ اسلام لا چکے تھے لیکن کفار کو اس کا علم نہیں تھا۔

انھوں نے قریش اور یہود سے بات کی جس سے دونوں میں پھوٹ پڑ گئی۔

۲۔ مشرکین یہ بھی کہتے ہیں کہ نعیم بن مسعود کی وہ کوششیں جو انہوں نے بنو قریضہ کو حملہ آور ہونے سے باز رکھنے کے لیے کیں، گویا ایک جرم تھا۔

ابن اسحاق کی روایت ہے کہ نعیم نے اس تفرقہ اندازی میں دونوں سے ایسی باتیں کہیں جس سے دونوں میں بدگمانی پیدا ہو جائے اور اس بنا پر کہیں کہ خود آنحضرتؐ نے ''الحرب خدعۃ'' کی تعلیم کی تھی۔ لیکن ابن اسحاق نے روایت کی سند نقل نہیں کی اور اگر وہ کرتے بھی تو ابن اسحاق کا پایہ نہیں کہ ایسا واقعہ محض ان کی سند سے قبول کر لیا جائے۔ اس کے علاوہ واقعات اس قسم کے جمع تھے کہ دونوں فریقوں کا اتحاد بغیر اس کے توڑا جا سکتا تھا بجائے اس کے کہ کوئی غلط بیانی کی جائے۔ ابن اسحاق کی روایت میں بھی اس قدر مذکور ہے کہ نعیم نے یہود سے کہا کہ قریش تو چار دن کے بعد چلے جائیں گے تمھارا اور مسلمانوں کا ہم وطنی کا ساتھ ہے۔ اس لیے تم کیوں بیچ پڑتے ہو اور لڑائی مول لیتے ہو۔ اگر اس پر آمادہ ہی ہو تو قریش سے کہو کہ کچھ معزز آدمی ضمانت کے طور پر تمھارے ہاں بھجوا دیں اگر قریش لڑائی کا فیصلہ کیے بغیر جانا چاہیں تو ان لوگوں کو روک لینا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ یہود بنو قریظہ عہد شکنی پر تیار نہ تھے اور کہتے تھے کہ ہم محمدؐ سے معاہدہ کیوں توڑیں؟ لیکن حیّ بن اخطب نے اسی شرط پر ان کو راضی کیا تھا کہ قریش چلے گئے تو میں خیبر چھوڑ کر تمھارے پاس آ جاؤں گا۔ قریش اس قسم کی ضمانت نہیں دے سکتے تھے اس لیے جب انھوں نے انکار کیا ہوگا تو دونوں میں خود بہ خود پھوٹ پڑ گئی ہوگی۔ اس لیے ایک صحابی کو دروغ بیانی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

مولانا شبلی کے اس قیاسی تائید مغازی موسیٰ بن عقبہ کی روایت سے ہوتی ہے جس کو مختصراً مصنف ابن ابی شیبہ میں اور تفصیل کے ساتھ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے۔ اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ بنو قریظہ نے اس جنگ میں شرکت اس شرط پر کی تھی کہ قریش ضمانت کے طور پر کچھ اپنے معزز آدمی بنو قریظہ کے سپرد کر دیں گے لیکن انھوں نے یہ شرط پوری نہیں کی اس لیے قریش کی طرف سے بے اطمنانی پیدا ہوئی اور انھوں نے خفیہ رسول اللہ ﷺ کو اس شرط کے ساتھ مصالحت کا پیغام بھیجا کہ بنو نضیر کو جو خیبر کو جلا وطن کر دیے گئے تھے پھر مدینہ آنے کی اجازت دیں۔ نعیم جو اسی موقع پر مسلمان ہوئے تھے ایک ایسے آدمی تھے جو پیٹ کے ہلکے تھے۔ حضورؐ نے ان سے دانستہ طور پر بنو قریظہ کے اس مخفی پیغام کا ذکر فرما دیا۔ انھوں نے جا کر قریش سے کہہ دیا اس پر قریش اور بنو قریظہ میں بدگمانی پیدا ہو گئی اور اس پر قریش اور بنو قریظہ کے اتفاق کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ جب حالات ساز گار تھے نیز تاریخ کی گواہی مستند ہے تو پھر دروغ گوئی کا الزام درست نہیں۔

اعتراض نمبر ۳۰۶

فتح مکہ: آپ ﷺ نے مکہ کے کسی اور گھر کو (سوائے ابوسفیان کے گھر کے) امان گاہ کیوں نہ بنایا؟ اس میں شک و شبہ نہیں کہ ابوسفیان اسلام اور داعی اسلام کا بہت بڑا دشمن تھا۔جنگیں لڑیں ۔مسلمانوں کواذیتیں دیں ۔معاہدہ کی بحالی کے لیے کوشش کی۔حتیٰ کہ اس نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ اس کے باوجود جب کبھی آوارہ لڑکے بڑوں کے بہکاوے میں آ کر گلیوں میں سرورکونین پر پتھر پھینکتے اس وقت اگر آپ ابوسفیان کے گھر کے قریب ہوتے تو آپؐ اس گھر میں پناہ حاصل کر لیتے۔ابوسفیان آوارہ لڑکوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر بھگا دیتا۔ جب لڑکے بھاگ جاتے تو آپ اپنی منزل کی جانب چل پڑتے۔(ڈاکٹر حمید اللہ۔محمد رسول اللہ۔۸۱)

اس واقعہ سے اشارہ ملتا ہے کہ آنحضرت جس گھر میں پناہ لیتے تھے فتح مکہ کے موقعہ پر اسی (ابوسفیان) کے گھر کو امان گاہ (دارالامان) بنایا۔فرمایا: جو ابوسفیان کے گھر پناہ لے اسے امان ہے۔یہ اعزاز اسی کا بدلہ تھا کہ آپ اسی گھر میں پناہ لیتے تھے اور اسی گھر کو جو آقا ﷺ کے لیے پناہ گاہ تھا' مکہ کے تمام گھروں کو چھوڑ کر صرف ابوسفیان ہی کے گھر کو دارالامان قرار دیا۔حال آنکہ مکہ کا ہر گھر امان گاہ تھا۔ کیوں کہ آپؐ نے اعلان فرمایا کہ جو بھی اپنے گھر میں بیٹھ رہے اسے بھی امان ہے لیکن مکہ کا ہر گھر اپنے گھر والوں کے لیے امان تھا۔ پبلک شیلٹر ہاؤس نہ تھا۔ یہ پبلک شیلٹر ہاؤس (public shelter House)صرف ابوسفیان ہی کا گھر تھا۔

ایک دن بزدل ابوجہل نے سردار الانبیاء ﷺ کی کم سن بیٹی حضرت فاطمہؓ کو دیکھا تو ان سے ایسا گستاخانہ برتاؤ کیا وہ بدبخت کو بددعا دیتے ہوئے نہ رہ سکیں۔اس پر ابوجہل نے حضرت فاطمہؓ کے رخسار مبارک پر اس قدر زوردار طمانچہ مارا کہ وہ رونے لگیں۔ابوسفیان ادھر سے گزر رہے تھے۔انہوں نے بچی سے رونے کی وجہ پوچھی۔حضرت فاطمہؓ سے سارا ماجرا سن کر ابوسفیانؓ بچی کو بازو سے تھام کر ابوجہل کے پاس گئے اور اس کے دونوں ہاتھ قابو کر لیے، پھر انہوں نے حضرت فاطمہؓ سے کہا کہ وہ ابوجہل کے منہ پر تھپڑ مار کر اپنا بدلہ لے لیں۔حضرت فاطمہؓ نے ابوجہل کو تھپڑ رسید کیا اور مسکراتی ہوئی گھر لوٹ گئیں۔ فطری بات ہے کہ جب آپ ﷺ کو اس واقعہ کا علم ہوا ہوگا تو آپ ﷺ ابوسفیان کے ممنون ہوئے ہوں گے (حالانکہ ابوسفیان اس وقت مشرف بہ اسلام نہیں ہوئے تھے۔(محمد رسول اللہ۔ڈاکٹر حمید اللہ۔۸۱)

ایک روایت میں ہے کہ آنحضرتؐ کے چچا عباس بن عبدالمطلب نے آپؐ سے درخواست کی کہ ابوسفیان قریش کا سردار ہے اس کی تالیف قلبی کے لیے مہربانی فرمائی جائے۔اس پر آپؐ نے اس کے گھر کو عوام کی پناہ گاہ کا درجہ عطا کر دیا۔مذکورہ روایات میں تعارض نہیں ہے بل کہ یہ تو سونے پر سہاگہ ہے کہ

آپ نے اپنا بدلہ بھی چکا دیا اور ساتھ ہی ساتھ چچا کی درخواست کو پذیرائی بخش کر ابوسفیان کی تالیف قلبی بھی فرما دی۔ سبحان اللہ! کیا بات ہے کملی والے کی۔

اعتراض نمبر ۳۰۷

بعض کہتے ہیں کہ اسلام میں دوسری ریاست پر جارحیت کرنا جائز نہیں لیکن مدینہ کی ریاست جب مضبوط ہوگئی تو مکہ والوں پر حملہ کرنے میں پہل کی گئی تھی یہ مسلمانوں کی جارحانہ کاروائی تھی۔

جواب: مکہ پر حملہ کرنے میں پہل مسلمانوں نے نہیں کی تھی۔ اگر کوئی معترض یہ کہنے پر مصر ہے تو اسے اس کا ثبوت پیش کرنا چاہیے۔ تاریخی حقائق اس کی شہادت دیتے ہیں کہ حدیبیہ کے مقام پر سن چھ ہجری میں مسلمانوں اور اہل مکہ کے درمیان دس سال کی مدت کے لیے معاہدہ ہوا تھا۔ اس میں شرط یہ تھی کہ فریقین ایک دوسرے پر پوشیدہ یا اعلانیہ ظلم و تعدی کرنے سے باز رہیں گے۔ اس کے باوجود جب اہل مکہ کے حلیف بنو کنانہ اور مسلمانوں کے حلیف بنو خزاعہ میں جھگڑا ہوا، تو اہل مکہ نے معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بنو کنانہ کو ہتھیار فراہم کیے، پھر چھپ کر بنو خزاعہ پر حملہ آور ہوئے اور مسلمانوں کو تہ تیغ کیا۔ اس صورت حال میں وہ اپنی شکایت بارگاہ نبوی میں پیش کرتے ہیں اور استدعا کرتے ہیں کہ ہماری مدد فرمائی جائے۔ آپ ﷺ نے ایک قاصد قریش کے ہاں بھیجا اور یہ پیغام انہیں دیا گیا کہ ان تین باتوں میں سے ایک کا انتخاب کرلیں۔

۱۔ مقتولین خزاعہ کی دیت دی جائے۔

۲۔ یا بنو کنانہ کے عہد و پیما سے الگ ہو جائیں۔

۳۔ یا معاہدہ حدیبیہ کے تنسخ کا اعلان کر دیں۔

قریش نے تیسری شرط کو مان لیا پھر انہیں اس قدم پر ندامت ہوئی اس سلسلہ میں ابوسفیان تجدید معاہدہ کے لیے مدینہ گیا اور بارگاہ نبوی میں تجدید کے لیے عرض کی آپ ﷺ نے اس تجویز کو رد کر دیا اور غزوہ مکہ قریش کی عہد شکنی کے باعث ہوا۔ مدینہ کے مسلمانوں نے انتقام کے طور پر اہل مکہ پر چڑھائی کی۔ اسے جارحانہ حملہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ابتدا کفار کی طرف سے ہوئی تھی اور جواب مسلمانوں نے دیا۔ فتح مکہ کے موقع پر سالار اعظم نبی محترم ﷺ نے ایسا کارنامہ انجام دیا جس کی مثال نہیں ملتی۔ اس زمانہ میں دس ہزار فوج چھپ کر نہیں جا سکتی تھی۔ رفتار سست تھی اگر آج مدینہ سے مکہ جاتے ہوئے دو گھنٹے لگتے ہیں تو اس وقت دو ہفتے لگتے ہوں گے اس کے باوجود اسلامی فوج مکہ شہر کے مضافات میں ڈیرے ڈالتی ہے، اس وقت تک اہل مکہ کو اطلاع نہیں ہوئی تھی، پھر شہر مکہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہوتا ہے اور سوائے چند شریروں کی مزاحمت سے ہونے والے نقصان کے قطرہ خون بہایا نہیں جاتا۔ آپ ﷺ کا عام معافی کا اعلان اور

اس کے بعد آپ ﷺ کا یہ فرمان، کہ آج تم پر کوئی ذمہ داری باقی نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ کفار، راتوں رات مسلمان ہوئے، ان کی کایا پلٹ گئی اور دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ ان وجوہات کی بناء پر اور تاریخی حقائق کے شواہد کے ہوتے ہوئے اہل مدینہ کا اہل مکہ پر جارحانہ حملہ یا ایک ریاست کا دوسری ریاست کے خلاف جارحیت نہ تھی۔ اسے جارحیت سے تعبیر کرنا غلط اور محض باطل ہے۔

غزوہ خیبر: یہودیوں کی سازش غیر مسلموں کی جانب سے ہر دور میں ناکام سازشیں ہوتی رہیں۔ خلیفہ عباسی قائم باعراللہ کے سامنے یہودیوں کی جانب سے ایک تحریری دستاویز پیش کی گئی جسے محنت سے تیار کیا گیا تھا۔ اس دستاویز کے ذریعے حضور ﷺ نے خیبر یہودیوں کو جزیہ کی معافی پر دے دیا تھا۔ تحریر کنندہ حضرت علیؓ اور دو گواہوں کے دستخط (حضرت معاویہؓ اور سعد بن وقاصؓ) کے تھے۔ یہ تحریر خلیفہ کو دکھائی گئی انھوں نے تصدیق کے لیے مشہور مورخ علامہ خطیب بغدادی کے سامنے رکھی۔ تحریر میں تضاد تھا۔ اسے جعلی قرار دیا گیا۔ ایک غلطی یہ تھی کہ خیبر کی فتح ہجرت کے ساتویں سال مکمل ہوئی تھی اور حضرت معاویہ خیبر کے بعد دائرہ اسلام میں آئے۔ ۲: حضرت سعد بن معاذ خندق میں زخمی ہوئے اور بنی قریظہ کے غزوہ کے بعد شہید ہوئے۔ ۳: اس وقت جزیہ کا حکم نازل نہ ہوا تھا۔ جزیہ کا حکم غزوہ تبوک کے بعد آیا۔

شبہ کا ازالہ: خیبر کے واقعات میں ایک غلط روایت نقل کی ہے وہ یہ کہ اول آپ ﷺ نے یہود کو اس شرط پر امان دی کہ کوئی چیز نہیں چھپائیں گے لیکن جب کنانہ بن ربیع نے خزانہ بتانے سے انکار کیا تو آپؐ نے زبیرؓ کو حکم دیا کہ سختی کر کے اس سے خزانے کا پتہ لگائیں۔ حضرت زبیرؓ نے چقماق جلا کر اس کے سینہ کو داغتے تھے یہاں تک کہ اس کی جان نکلنے کے قریب تھی۔ بالآخر آپ نے کنانہ کو قتل کروادیا اور تمام یہودی لونڈی اور غلام بنا لیے گئے۔ اس روایت کا اس قدر حصہ صحیح ہے کہ کنانہ کو قتل کروادیا گیا لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ خزانے بتانے سے انکار کرتا تھا بلکہ وجہ یہ تھی کہ کنانہ نے محمود بن مسلمہ کو قتل کیا تھا۔

طبری میں تصریح ہے "پھر آنحضرت ﷺ نے کنانہ کو محمد بن مسلمہ کے حوالے کیا انھوں نے اپنے بھائی محمود بن مسلمہ کے قصاص میں اس کو قتل کر دیا۔ (سیرت النبی۔ ج ا۔ ص ۲۸۵) تفصیل کے لیے سیرت النبی دیکھیے۔

ابوداؤد میں ہے کہ آپ ﷺ نے سیعتہ سے پوچھا کہ وہ خزانہ کیا ہوا؟ اس نے کہا لڑائیوں میں صرف ہو گیا باوجود اس کے آپ ﷺ نے کنانہ کے قتل کا حکم دیا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ کنانہ کا قتل محمد بن مسلمہ کے قصاص میں ہوا تھا، ورنہ خزانے کے چھپانے میں اور لوگ بھی تھے ان کے قتل کا حکم کیوں نہ ہوا؟ اصل واقعہ یہ ہے کنانہ اس پر امان دی گئی تھی کہ کسی قسم کی بدعہدی اور خلاف ورزی نہ کرے۔ روایت میں یہ بھی ہے کہ اگر اس کے خلاف اس نے کچھ کیا تو وہ قتل کا مستحق ہوگا۔ کنانہ نے وعدہ توڑا اور امان ٹوٹ گئی، نیز کسی شخص پر خزانہ بتانے کے لیے اس قدر سختی کرنا کہ اس کے سینے پر چقماق سے آگ

جھاڑی جائے۔ یہ رحمت لعالمین کی شان کے خلاف ہے۔ وہ زہر دینے والے کو معاف کر دیتا ہے تو کیا وہ چند سکوں کی خاطر کسی کو آگ سے جلانے کا حکم دے سکتا ہے۔

حضرت صفیہؓ حرم نبوی میں داخل ہوئی تو یہودی آپ کے رشتہ دار بن گئے۔ اس رشتے کا اثر فطری طور پر اسلامی فوج کے سپاہیوں کے دلوں میں پیدا ہوا۔ آپ ﷺ نے یہودیوں کو سرکاری زمینوں کے مزارعین کی حیثیت سے خیبر میں رہنے کی جگہ دے دی جو یہودی مدینہ میں مقیم تھے، ان کے ساتھ فیاضانہ سلوک کیا گیا۔ انہیں سالانہ وظائف دیئے جاتے تھے جب تک وہ پر امن رہے، ان کے ساتھ جھگڑا نہیں کیا اور انہیں مذہبی، قانونی وعدالتی اور اقتصادی معاملات میں مکمل آزادی وخودمختاری حاصل تھی جس سے وہ بہت خوش تھے۔ یہ رعایت اس وقت تک تھی جب تک وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کا احترام کریں گے ورنہ وہ سزا کے مستحق ٹھہریں گے۔ جب آپ ﷺ نے بعض مالیاتی اصلاحات لاگو کیں تو ان کے ٹیکسوں میں ادائیگی کے حوالے سے مسلمانوں اور یہودیوں میں فرق رکھا گیا، مسلمان پر دوسری چیزوں کے ساتھ اپنی بچت پر ٹیکس ادا کرتے تھے اور غیر مسلم اس سے مستثنیٰ تھے۔ غیر مسلموں پر جزیہ لاگو تھا مگر بچوں، عورتوں، غریبوں اور کئی دوسروں کو جزیہ سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا۔

جنگ موتہ:

اعتراض نمبر ۳۰۸

بعض حضرات کا خیال ہے کہ اس جنگ (موتہ) میں کسی فریق کو فتح نہیں ہوئی۔ (خاتم النبین۔۸۰۶)

جواب: مصنف خاتم النبین کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک یہ بات صحیح نہیں۔ فتح مسلمانوں کو ہوئی۔ اگر فتح نہ ہوتی تو رومی مسلمانوں کو زندہ واپس نہ آنے دیتے بل کہ سب کو ختم کر دیتے لیکن مسلمانوں کے صرف بارہ آدمی جنگ میں کام آئے۔ دوسری بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کو فتح اور رومیوں کو شکست ہوئی چنانچہ سعدؓ ابو عامر سے روایت کرتے ہیں کہ جب خالد بن ولید نے رومیوں پر حملہ کیا تو انھیں ایسی شکست فاش دی کہ میں نے ایسی شکست کبھی نہیں دیکھی۔ مسلمان جہاں چاہتے تھے وہیں اپنی تلوار رکھتے تھے اور بخاری میں بھی ہے ''حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی''۔ (بخاری جلد دوم)

حاکم کی روایت میں ہے کہ غنیمت میں کچھ سامان بھی مسلمانوں کے ہاتھ لگا تھا۔ رومیوں کی شکست کے بعد سیدنا خالد بن ولیدؓ نے ان کا تعاقب جنگی مصلحت کے پیش نظر مناسب نہ سمجھا اور وہ

مسلمانوں کے لشکر کو لے کر واپس مدینہ آئے۔ (حاکم۔۸۰۷۔۸۰۸)

غزوہ حنین

ضمناً اعتراض

فتح کی بجائے ویلہ اول میں مطلع صاف تھا رسول اللہ ﷺ نے نظر اٹھا کر دیکھا تو رفقائے خاص میں سے کوئی بھی پہلو میں نہ تھا۔

جواب: لیکن اور روایتوں میں چند صحابہ کا ثابت قدم رہنا مذکور ہے۔ان روایات میں تطبیق یہ ہے کہ دو مختلف وقتوں کے حالات ہیں۔ راوی نے اپنا مشاہدہ لکھا ہے چنانچہ چند چیزیں قابل غور ہیں۔پہلی یہ کہ مصنف نے ویلہ اول میں مسلمانوں کی شکست تسلیم کی ہے۔ یہ ابن اسحٰق کی رائے ہے لیکن حدیث صحیح میں بیان ہے کہ مسلمانوں کو پہلے کامیابی ہوئی لوگ غنیمت پر ٹوٹ پڑے۔دشمن کے تیر اندازوں نے تیراندازی شروع کر دی جس سے مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا ہو گیا۔ بخاری میں حضرت براءؓ کے الفاظ ہیں جن کا ترجمہ ہے''اور جب ہم نے ان پر حملہ کیا تو وہ شکست کھا کر پیچھے ہٹ گئے تو ہم مال غنیمت پر ٹوٹ پڑے تو انھوں نے ہم کو تیروں پر دھر لیا''۔ دوسری بات یہ کہ شکست کے ظاہری اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس جنگ میں کچھ لوگ محض اس غرض سے شریک ہوئے تھے کہ مسلمانوں کو عین لڑائی میں دھوکہ دیں۔

چنانچہ صحیح مسلم میں ہے کہ ام سلیمؓ نے جو اس جنگ میں شریک تھیں حضور انور ﷺ سے عرض کی یا رسول اللہ! ان طلقاء کو قتل کر دیجیے، انھی کی وجہ سے شکست ہوئی ہے۔امام نووی نے اس کی شرح میں لکھا ''سب لوگ نہیں بھاگے تھے بل کہ مکہ کے مولفۃ القلوب میں جو منافق تھے اور مکہ کے مشرکین (جو جنگ میں شریک تھے مگر مسلمان نہیں ہوئے تھے) انھوں نے بھاگنا شروع کر دیا اور یہ ناگہانی ہزیمت اس وجہ سے ہوئی۔ اس میں اہل مکہ بھی تھے جو ابھی راسخ مسلمان نہیں ہوئے تھے ان میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے جو غنیمت کی چاہ میں چلے آئے تھے۔امام ابن جریر کے بہ قول'' کہا جاتا ہے کہ مکہ کے طلقاء بھاگے تھے اور ان کا مقصد تھا کہ مسلمانوں کو شکست ہو جائے''۔

صاحب روح المعانی تفسیر سورہ توبہ میں لکھتے ہیں''سب سے پہلے طلقاء مکر و فریب سے شکست کھا کر پیچھے ہٹ گئے۔اس سے مسلمانوں میں بے ترتیبی اور پسپائی کی صورت پیدا ہوئی''۔

تیسری بات یہ کہ پسپائی کے وقت آنحضرتؐ کے ساتھ مسلمانوں کی ایک جماعت ثابت قدم رہی۔اس سلسلہ میں بنائے اشتباہ بخاری کی حضرت انس والی روایت ہے جس کا ترجمہ یہ ہے''لوگ

پیچھے ہٹ گئے یہاں تک آپ ﷺ تنہا رہ گئے''۔ مصنف نے ان الفاظ کو پیش نظر رکھا لیکن ظاہر ہے کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ جس جگہ رسول اللہ ﷺ تھے وہاں کوئی نہ تھا۔ اسی لیے اسی روایت میں حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ جب حضرت رسول اللہ ﷺ نے انصار کو آواز دی تو انصار نے کہا ''ہم حاضر ہیں یا رسول اللہ! آپ خوش ہیں کہ ہم آپ کے پاس ہیں''۔

حافظ ابن حجر نے آپؐ کی تنہائی اور رفقائے خاص کے پاس رہنے کی تطبیق کی ہے ''اور اس قول میں کہ حضور ﷺ تنہا رہ گئے اور ان واقعات میں جو اس پر دال ہیں کہ حضورؐ کے ساتھ صحابہ کی ایک جماعت تھی۔ تطبیق یہ ہے کہ حضورؐ کے دشمن کے سامنے تھے سب سے آگے اور جو آپ کے ساتھ ثابت قدم تھے وہ آپؐ کے پیچھے تھے''۔

دوسرے حضرت براءؓ کی حدیث میں تصریح ہے کہ ابوسفیان بن حارثؓ اس وقت آپؐ کے پاس موجود تھے اور آپؐ کی سواری کی لگام تھامے ہوئے تھے۔ (غزوہ حنین بخاری)

مسلم میں حضرت عباسؓ کے الفاظ یہ ہیں کہ ''میں نے اور ابوسفیان بن حارثؓ نے حضورؐ سے علیحدگی اختیار نہیں کی۔ صحیحین کی ان روایات کے سوا یہ روایات بھی پیش نظر رہنی چاہییں۔

ابن ابی شیبہ کی ایک مرسل روایت میں جو حکم بن عتیبہ سے مروی ہے۔ چار آدمیوں کا حضورؐ کی خدمت میں باقی رہنا بتایا گیا ہے۔

ترمذی نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ اس دن حضور ﷺ کے ہم راہ سو آدمی رہ گئے تھے۔ مسند احمد میں اور حاکم میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ اس دن آپؐ کے ہم راہ اسی (۸۰) آدمی رہ گئے تھے۔

بیہقی نے حارثہ بن نعمان سے روایت کیا ہے کہ سو آدمی باقی رہ گئے تھے۔ ابونعیم نے دلائل میں سو کی تفصیل بتائی ہے کہ تیس سے کچھ اوپر مہاجرین تھے، بقیہ انصار تھے۔

ابن اسحاق کی روایت کہ حضور ﷺ کے ساتھ ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ وعلیؓ، حضرت عباسؓ، ابوسفیانؓ، حضرت فضل بن عباسؓ، حضرت ربیعہؓ، حضرت اسامہ بن زیدؓ، حضرت ایمن بن ام ایمن رضی اللہ علہیم اجمعین تھے۔

اس تفصیل سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت انسؓ سے مروی روایت ''اپنے ظاہری معنی پر باقی نہیں رہ سکتی''۔ حافظ ابن حجر نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ ان الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ آگے تھے اور بقیہ پیچھے تھے۔ لیکن اس کی صاف توجیہ یہ ہے کہ ان الفاظ سے ثابت قدم رہنے والوں کی کمی کا ظاہر کرنا مقصود ہے ورنہ حقیقت یہ نہ تھی۔

ثابت قدم رہنے والوں میں جو اختلاف پایا جاتا ہے اس کی توجیہ یہ ہے کہ وہ لوگ حضورؐ کے آس پاس تھے اور تھوڑی تعداد میں آپ کے پاس پہنچنے لگے۔ یہاں تک کہ خاصی جماعت آپؐ کے ارد گرد جمع ہوگئی۔ اسی وجہ سے مختلف لوگوں نے مختلف تعداد بتائی ہے۔ (حاشیہ سیرت النبی ۳۰۶ تا ۳۰۸)

یہ صحابہؓ کے ان الفاظ کی پاداش میں سب کچھ ہوا۔ ارشاد ربانی ہے۔

"وَيَومَ حُنَينٍ اِذاَ عجَبتكُم كَثرَ لَكُم" (التوبہ۔ ۲۵) "اور حنین کا دن یاد کرو جب تم اپنی کثرت پر فخر کرنے لگے تھے"۔

شبہ کا ازالہ: شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی نے طلقاء کو شکست کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ لیکن تاریخی واقعات سے واضح نہیں ہوتا ہے کہ سب سے پہلے فرار اور پیٹھ دکھانے والے حضرت خالد بن ولیدؓ کی کمان میں بنو سلیم کا شہ سوار دستہ تھا جو نو سو سے کچھ زیادہ تھا۔ ان کا فرار بزدلی یا مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی غرض سے نہیں تھا جیسا سید صاحب نے کہا ہے کہ بنیادی طور پر یہ جنگی اور تکنیکی ہزیمت تھی چونکہ دشمن پہلے سے وادی کے دروں اور غاروں میں چھپا ہوا تھا اور مسلم فوج کے مقدمہ پر اس نے اچانک تیر اندازی کرنی شروع کردی۔ اس لیے ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ قرآن کریم کی سورہ توبہ (ع۔۴) واضح طور پر فرار کی ذمہ داری تمام مسلمانوں پر ڈالتی ہے اور اس کو مسلمانوں کی نازش بے جا کا عمل مکافات قرار دیتی ہے۔ "وَيَومَ حُنَينٍ اِذاَ عجَبتكُم كَثرَ لَكُم" (التوبہ۔ ۲۵) "اور حنین کا دن یاد کرو جب تم اپنی کثرت پر فخر کرنے لگے تھے"۔

قرآن مجید نے کسی خاص طبقہ مسلم کو اس کا ذمہ دار قرار نہیں دیا ہے۔ دوسری اہم چیز یہ کہ نبی مکرمؐ نے اس فرار کی ذمہ داری کا الزام کسی پر نہیں دھرا اور نہ ہی اس سلسلے میں کسی فرد یا طبقہ کو خاص کیا تھا۔ اس لیے فرار کی ذمہ داری طلقاء یا نومسلمانوں پر ڈالنا صریح زیادتی ہے بل کہ قرآن کریم کی واضح آیات کی خلاف ورزی ہے۔ (ن۔۱۲۔۱۴۷) مورخین کو عہد نبوی کی شکست شاق گزرتی ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ فتح ہمارے ہی نام لکھی ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر شکست کو موقع پر قربانی کے بکرے تلاش کرنے پڑا کسایا ہے اسی طرح اس جنگ میں بھی طلقاء کا نام لے دیا۔

اعتراض نمبر ۳۰۹

دشمنان اسلام و پیغمبر اسلام ﷺ نے دشمنی میں اندھے ہو کر طرح طرح کے الزامات لگائے۔ انہوں نے پیغمبر اعظم ﷺ کی سپاہیانہ مہارت اور بے مثل عسکری قیادت تک کو مشکوک بنانے کی بچگانہ کوشش اور سعی ناکام کی ہے۔ بیگٹ گلب پہلے تو اس بات پر تعجب کرتا ہے کہ محض جوش و جذبہ کے بل بوتے پر نسبتاً غیر تربیت یافتہ اور غیر منظّم بدوی افواج نے غیر معمولی فتوحات کیسے کر لیں۔؟

جواب: ذراسی بات تھی مگر اسے صرف زیب داستان کے لیے بڑھا دیا گیا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ارکان اسلام میں نظم وضبط، پابندی وقت اور اجتماعیت کی جو شان موجود ہے، اس مثالی ضبط و نظم کی وجہ سے مسلسل جہادی غزوات وسرایہ میں کم تعداد کے باوجود دشمن کی کثیر اور غیر منظّم فوج کو بار بار شکست فاش دی نیز اطاعت واتباع کے بے نظیر جذبہ کی وجہ سے دنیا نے قیادت کی مرکزی کمان کے جو مناظر دیکھے وہ بے مثال ہیں۔ اب مسلمان مجاہدین کو غیر منظّم اور نہ ہی غیر تربیت یافتہ کہا جاسکتا ہے کیونکہ ان کی مذہبی تعلیمات میں ہر قسم کے تربیت اور نظم وضبط بدرجہ کمال پایا جاتا ہے۔

جہاں تک دوسرے اعتراض کا تعلق ہے اس میں تعصب ونفرت کی بو آتی ہے۔ بھلا قیادت اس قدر کمزور ہو تو فتح ہر میدان میں دروازے کی کنیز کیسے بن سکتی ہے؟ یہ کہنا بجا ہوگا کہ معترض اتنا بھولا اور سادہ نہیں جبکہ فن حرب کی ابجد سے تھوڑا بہت ہر شخص باخبر ہوتا ہے اور جدید زمانہ میں سپہ سالار بہت پیچھے رہ کر ہی لڑائی لڑتا ہے۔ وہ دشمن کی فوج کی نقل وحرکت کو دیکھتا ہے، آگے بڑھنے اور پیچھے ہٹنے کے احکام جاری کرتا ہے کیونکہ وہ پیچھے سے ان چیزوں کو manage اور مانیٹر کررہا ہوتا ہے۔ جنگی نقطہ نگاہ سے یہ لازمی ہے کہ سپہ سالار پیچھے ہی رہے کیونکہ اگر سپہ سالار اگلی صفوں میں موجود ہے تو دشمن کا سارا زور اور دباؤ اگلی صفوں پر رہتا ہے جس کا نقصان پوری فوج کو اٹھانا پڑتا ہے۔ یہ بھی جنگی ماہرین جانتے ہیں کہ سپہ سالار جہاں کہیں بھی ہوگا اس کی فوج کو تہس نہس کرکے اس تک پہنچنے کی سرتوڑ کوشش کی جاتی، البتہ یہ امر تباہ کن ہے کہ سپہ سالار میں اگر کسی قسم کی بزدلی کا اشارہ مل رہا ہے تو کوئی فوج کسی معرکے کو سر نہیں کرسکتی۔ حضرت براء بن عازب کا قول ہے ”اللہ کی قسم! جب لڑائی میں شدت آتی تو ہم نبی ﷺ کی پناہ ڈھونڈا کرتے تھے، جب بھی سخت ترین مقام آیا، آپ ﷺ نے بڑھ کر اس کو سر کیا، جنگ خندق کے موقع پر سخت ترین چٹان تھی، ہٹنے کا نام تک نہ لیتی تھی، آپ ﷺ کو اطلاع دی گئیں تو آپ ﷺ نے صرف تین ضربوں میں اسے تین ٹکڑوں میں تقسیم کردیا۔ جنگ حنین میں ایک ایسا وقت آیا کہ پسپائی ہو رہی تھی مگر آپ ﷺ سینہ تان کر سب سے آگے تھے اور صدا دی۔۔۔۔ انا النبی لا کذب۔۔۔ انا ابن عبدالمطلب، بس یہ نعرہ فضا میں گونجا کہ مجاہدین نے پلٹ کر حملہ کیا کہ دشمن کے چھکے چھوٹ گئے۔ جنگ کا پانسہ ہی نہ بدلہ بلکہ فتح نصیب ہوئی۔ جنگ احد میں تیراندازوں کی غفلت سے جو افتاد پڑی تو آپ ﷺ کی جرات وبہادری میں صحابہ کرامؓ کو حوصلہ بخشا اور وہ جم کر لڑے کہ دشمن میدان جنگ سے بھاگ نکلا۔ ان کا تعاقب کیا گیا، ان کی لاشوں کو ایک کنوے میں ڈال دیا اور ان کا چھوڑا ہوا مال غنیمت مسلمانوں نے سمیٹ لیا، پھر بھی مستشرقین کو گلہ ہے کہ قیادت میں کمزوری تھی اور وہ پیچھے کی صفوں میں لڑتے تھے۔ مدت العمر واقعات میں کوئی دکھا سکتا ہے کہ آپ ﷺ کسی مرحلے پر پیچھے رہے اگر وہ ایسا کہتے ہیں تو ان کی پراگندہ سوچ کا نتیجہ ہے

جنگ تبوک

ضمناً اعتراض

مارگولیس کہتا ہے ''چوں کہ حنین میں انصار غنیمت سے محروم رہے تھے اس لیے وہ بد دل ہو گئے تھے کہ ہم کیا لڑیں جب فوائد جنگ دوسروں کو حاصل ہوں گے''۔ (ضیا النبی ۷۔۳۱۲)

جواب: صحابہ کرامؓ میں بے چینی پائی جاتی تھی کہ جن لوگوں پر انعام کی بارش ہوئی وہ اہل مکہ اور اکثر نئے اسلام لانے والے تھے۔ اس پر انصار بول اٹھے۔ بعضوں نے کہا رسول اللہ ﷺ نے قریش کو انعام دیا اور ہمیں محروم رکھا حال آنکہ ہماری تلواروں سے اب تک قریش کے خون کے قطرے ٹپکتے ہیں۔ (صحیح بخاری غزوہ تبوک)

بعض نے کہا کہ مشکلات میں ہماری یاد آتی ہے اور غنیمت اوروں کو ملتی ہے۔ بعضوں نے کہا آنحضرتؐ نے انصار سے کہا کہ تم نے ایسا کہا وہ بولے کہ بخدا! ہمارے سر پر آوارہ لوگوں میں سے کسی نے یہ نہیں کہا نو خیز نوجوانوں نے یہ فقرے کہے تھے۔ (صحیح بخاری غزوہ طائف)

صحیح بخاری باب مناقب الانصار میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے انصار کو بلا کر پوچھا کہ یہ کیا واقعہ ہے؟ تو چوں کہ انصار جھوٹ نہیں بولتے تھے انھوں نے کہا آپ نے جو سنا صحیح ہے۔ آپؐ نے خطبہ دیا فرمایا ''کیا یہ سچ نہیں کہ تم پہلے گم راہ تھے، خدا نے میرے ذریعہ سے تم کو ہدایت کی۔ تم منتشر اور پراگندہ تھے، خدا نے میرے ذریعہ سے تم میں اتفاق پیدا کیا۔ تم مفلس تھے خدا نے میرے ذریعے سے تم کو دولت مند کیا۔ تم آپس میں ایک دوسرے کے لہو کے پیاسے تھے اللہ نے میرے ذریعے تم کو ایک دوسرے کا ہم درد بنا دیا''۔ آپ ﷺ فرماتے جاتے تھے اور ہر فقرہ پر انصار کہتے جاتے تھے کہ ''خدا اور اس کے رسول ﷺ کا احسان سب سے بڑھ کر ہے''۔ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں تم یہ جواب دو کہ اے محمد ﷺ کہ جب لوگوں نے جھٹلایا تو ہم نے تیری تصدیق کی۔ تجھ کو جب لوگوں نے چھوڑ دیا تو ہم نے پناہ دی، تو مفلس آیا تو ہم نے تیری ہر طرح مدد کی''۔ (غزوہ طائف)

یہ کہہ کر آپؐ نے فرمایا کہ ''تم یہ جواب دیتے جاؤ اور میں یہ کہتا جاؤں گا کہ تم سچ کہتے ہو لیکن اے انصار کیا تم کو یہ پسند نہیں کہ لوگ اونٹ بکریاں لے کر جائیں اور تم محمد ﷺ کو لے کر اپنے گھر آؤ''۔ انصار بے اختیار بول پڑے ''ہم کو صرف محمد ﷺ درکار ہیں'' اکثر کی روتے روتے داڑھیاں تر ہو گئیں۔ آپ نے انصار کو کہا کہ مکہ کے لوگ نئے اسلام میں وارد ہوئے ہیں۔ میں نے ان کو جو کچھ دیا حق کی بناء پر نہیں دیا بل کہ تالیف قلب کے لیے دیا''۔ یہ تھا وہ واقعہ جسے مارگولیس غنیمت سے محروم انصار کے بارے کہتا ہے کہ وہ بد دل ہو گئے تھے کہ

ہم کیا لڑیں جب فوائد جنگ دوسروں کو حاصل ہوں گے‘‘۔

اول: جدید الاسلام لوگوں کو جو کچھ دیا ان کو حق کی بناء پر نہیں دیا تھا بل کہ تالیف قلب کے لیے دیا تھا۔ جب یہ بات انصار کو بتا دی گئی از اں بعد ان کی طرف سے کوئی بات نہیں کی گئی۔

دوم: جب انھیں حقیقت کا احساس ہوا تو روتے روتے ان کی داڑھیاں تر ہو گئیں۔ اگر بے سبب محرومی ہوتی تو کبھی ان کے دل کا غبار صاف نہ ہوتا۔ رونے سے داڑھیاں تر نہ ہوتیں یا انصاف سے ہٹ کر انعام کی بارش کی جاتی تو انصار بد دل رہتے مگر وہ صحیح صورت حال کا ادراک کر کے آپؐ کی ہر بات کو سچا کہتے رہے۔

سوم: وہ مال کے متمنی نہ تھے انھیں اللہ کا رسول چاہیے تھا۔ جب آپ نے فرمایا ’’اے انصار! کیا تم کو یہ پسند نہیں کہ لوگ اونٹ بکریاں لے کر جائیں اور تم محمد ﷺ کو لے کر اپنے گھر آؤ‘‘۔ تو وہ بے اختیار بول پڑے ’’ہم کو صرف محمدؐ درکار ہیں‘‘۔ اب بھی کوئی بد دلی کی گنجایش باقی رہتی ہے۔

چہارم: تقسیم غنیمت کا بیان ضروری ہے تا کہ معلوم ہو سکے کہ کیا واقعی مولفۃ القلوب پر بخشش تھی؟

ابوسفیان مع اولاد	۳۰۰ اونٹ اور ۱۲۰ اوقیہ چاندی
حکیم بن حزام	۲۰۰ اونٹ
نضر بن حارث بن کلاہ ثقفی	۱۰۰ اونٹ
صفوان بن امیہ	۱۰۰ اونٹ
قیس بن عدی	۱۰۰ اونٹ
سہیل بن عمر	۱۰۰ اونٹ
حویطب بن عبدالغریٰ	۱۰۰ اونٹ

ان کے علاوہ تین غیر ملکی نو مسلم رئیس تھے انھیں بھی انعام سے نوازا گیا،

اقرع بن حابس (تمیمی)	۱۰۰ اونٹ
عیینہ بن حصن (فزاری)	۱۰۰ اونٹ
مالک بن عوف (نصری)	۱۰۰ اونٹ

ان کے علاوہ بہت سے لوگوں کو پچاس پچاس اونٹ عطا کیے۔

عام تقسیم: عام تقسیم کے مطابق فوج کے حصہ میں فی کس چار اونٹ اور چالیس بکریاں تھیں۔ چوں کہ سواروں کو تین گنا حصہ ملتا تھا اس اعتبار سے ہر سوار کو ۱۲ اونٹ اور ۱۲۰ بکریاں ملیں۔

صحابہ کا ایثار: صحابہ کرامؓ نے بڑھ چڑھ کر جنگ کے لیے مال و اسباب کی فراہمی کی۔ اونٹ

پیش کیے۔ چاندی دی۔ بڑی بڑی رقمیں لا دیں تاہم مسلمان اس بناء پر جنگ میں شرکت سے رہ گئے کہ زادراہ نہ رکھتے تھے۔ یہ لوگ آپ کی خدمت میں اس درد سے روئے کہ آنحضرت ﷺ کو ان پر رحم آ گیا تاہم ان کے جنگ میں جانے کا کوئی بندوبست نہ ہو سکا۔ ان کی شان میں آیات قرآنی ملاحظہ کیجیے۔

''وَلَا عَلَى الَّذِينَ إِذَا مَا أَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَا أَجِدُ مَا أَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوا وَّ أَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمعِ حَزَنًا أَلَّا يَجِدُوا مَا يُنفِقُونَ''۔ (سورہ توبہ۔۹۲)

''اور نہ ان لوگوں پر کچھ اعتراض ہے کہ جب تمھارے پاس آئے کہ ہم کو سواری دیجیے اور تم نے کہا کہ میرے پاس سواری کہاں ہے جس پر تم کو سوار کر سکوں تو وہ واپس گئے اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے کہ افسوس ہمارے پاس خرچ نہیں''۔

منافقین کا حال: منافقین کا بھانڈا چوراہے میں پھوٹا وہ بہ ظاہر مسلمان بنے ہوئے تھے جب کہ در پردہ وہ دشمن سے ملے ہوئے تھے اور اس کے ساتھ رابطے میں تھے۔ وہ خود بھی جنگ میں جانے سے کنی کتراتے تھے اور دوسروں کو بھی روکتے تھے کہ ''لَا تَنفِرُوا فِي الْحَرِّ''(توبہ ۱۸) ''گرمی میں نہ نکلو''۔ یہی نہیں سویلم ایک یہودی کے گھر منافقین جمع ہوتے اور مسلمانوں کو جنگ پر جانے سے منع کرتے اور طرح طرح کے منصوبے بناتے۔ اسی سلسلہ میں میٹنگ ہو رہی تھی کہ آنحضرت ﷺ نے سیدنا طلحہ بن عبید اللہؓ کی کمان میں چند مسلمانوں کو بھیج کر سویلم کے گھر کو آگ لگوا دی (خاتم النبین۔۸۷۰)

جنگ میں شرکت نہ کرنے کے بہانے: بنو سلمہ کے جد بن قیس سے جب رسول اکرم ﷺ نے فرمایا ''تم بنو اصغر (رومیوں) کے ساتھ جہاد کرنے نہیں چلو گے؟ تو اس نے ایک نہایت پورا جواب دیا کہ یا رسول اللہ! مجھے ہم راہ نہ لے جائیے۔ میری قوم جانتی ہے کہ میں عورتوں کے بارے میں کس قدر حواس باختہ ہوں، رومیوں کی عورتیں حسن و جمال میں شہرہ آفاق ہیں، اس لیے انھیں دیکھ کر خود پر قابو نہ رکھ سکوں گا۔ یہ جواب سن کر پیغمبر اسلام ﷺ نے اس سے منھ موڑ لیا۔ (حوالہ بالا)

مذکورہ عبارات سے معلوم ہوا کہ مارگولیس جن صحابہ کرامؓ کے ذمہ تہمت دھرتا ہے وہ تو تہمت سے بری ہیں ان کی جان پر بن آتی جب زادراہ نہیں اور جنگ میں شرکت نہیں کر سکتے۔ روتے ہیں کہ ہم پیچھے رہ گئے۔ ہمارے پاس خرچہ نہیں ہے اور حکومت کی طرف سے کوئی بندوبست نہیں ہو پاتا جس کی وجہ سے باامر مجبوری جنگ میں شریک نہ ہو سکے۔ حنین میں غنیمت نہ ملنے کی وجہ سے بددل نہ تھے۔

دوم: مولانا شبلی بتاتا ہے (سیرت۔۳۲۲) مارگولیس صاحب فرماتے ہیں کہ چوں کہ حنین میں انصار مال غنیمت سے محروم رہے تھے اس لیے وہ بے دل ہو گئے تھے کہ ہم کیا لڑیں جب فوائد جنگ دوسروں کو حاصل ہوں گے لیکن مارگولیس کا اپنا مفروضہ ہے (قرآن نے خود بتا دیا تو قیاس کی کیا حاجت ہے)

مارگولیس کے اس اعتراض کا کہ مسلمانوں نے جنگ تبوک میں شرکت نہ کی۔ وہ حنین کی غنیمت سے بددل ہوگئے تھے کا مکمل طور پر رد ہوتا ہے۔ یہ الزام بے بنیاد اور لغو ہے۔ یہ درست ہے کہ انصار میں پہلے پہل بدگمانی تھی مگر آپ کے خطبہ وتقریر سے ان کے دلوں کا غبار ایسا چھٹا کہ روتے ہوئے داڑھیاں تر ہوگئیں اور بہ یک آواز بول اٹھے ”ہم کو صرف رسول اللہ درکار ہیں“۔

خطبہ حجتہٗ الوداع اور انسانی حقوق کا عالمی اعلامیہ۔۔۔۔ایک تقابلی جائزہ

انسان امن وسلامتی کا ہمیشہ سے خواہاں رہا ہے اور ہر دور میں اس ضمن میں کوششیں ہوتی رہی ہیں۔ اس کی سب سے پہلی، منظّم اور مکمل نظیر خطبہ حجتہٗ الوداع ہے۔ بعد ازاں جو کوششیں کی گئیں، ان میں سے ایک کوشش آج ہمارے سامنے انسانی حقوق کے عالمی اعلامیے کی صورت میں ہے۔ اس جدید اعلامیے کی ابلاغِ عامہ جس طرح تشہیر کرتے ہیں اور اس کے برعکس اس کا حقیقی کردار جس انداز میں ہمارے سامنے آرہا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ذیل کی سطور میں خطبۂ حجتہ الوداع اور انسانی حقوق کے اعلامیے کا ایک تقابلی جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

خطبۂ حجتہ الوداع

نبی کریم ﷺ وصحابہ وبارک وسلم حج کے ارادہ سے مدینہ منورہ سے ۲۵ ذیقعد ۱۰ ہجری کو روانہ ہوئے اور نو دن کی مسافت کے بعد ۴ ذی الحجہ ۱۰ ہجری کو مکہ معظّمہ میں داخل ہوئے۔ آپ ﷺ کے ہمراہ ایک لاکھ چوالیس ہزار یا ایک لاکھ چوبیس ہزار مسلمان تھے۔ اس سفر کا مقصد حج کے علاوہ عرب کے مسلمانوں کے سامنے خصوصاً اور ساری دنیا کے لیے عموماً اسلام کی شریعت اور اخلاق کے تمام بنیادی اصولوں کا اعلان کرنا تھا۔

آپؐ نے ۹ ذی الحجہ ۱۰ ہجری کو مقام عرفات میں فی البدیہہ خطبہ دیا جو حجتہ الوداع‘ حجتہ الکامل‘ حجتہ البلاغ جیسے ناموں سے مشہور ہے۔ اس خطبے میں جو امور بیان کیے گئے وہ اپنی جامعیت میں اپنی مثال آپ ہیں اور رہتی دنیا تک کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔

۱: خطبہ حجتہ الوداع کی ابتداء خالقِ کائنات رب للعالمین کی حمد وثنا سے شروع ہوئی اور پھر لوگوں سے مخاطب ہوکر فرمایا گیا لوگو! اللہ کا ارشاد ہے کہ ’اے انسانو! ہم نے تمھیں ایک ہی مرد وعورت سے پیدا کیا اور تمھیں جماعتوں اور قبیلوں میں بانٹ دیا کہ تم الگ الگ پہچانے جا سکو۔ تم میں زیادہ عزت والا خدا کی نظر میں وہی ہے جو اس سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔ لہٰذا نہ کسی عربی کو عجمی پر کوئی فوقیت حاصل ہے اور نہ کسی عجمی کو عربی پر اور نہ گورا کالے سے افضل ہے نہ کالا گورے سے، ہاں بزرگی اور فضیلت کا کوئی

معیار ہے تو وہ پرہیزگاری ہے۔

۲: سب انسان آدمؑ کی ہی اولاد ہیں اور آدمؑ مٹی سے بنائے گئے تھے۔ اب بزرگی و برتری کے سارے دعوئے خون و مال کے سارے مطالبے اور سارے انتقام میرے پاؤں تلے روندے جا چکے ہیں۔ بس بیت اللہ کی تولیت اور حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمات پہلے کی طرح باقی رہیں گی۔ قریش کے لوگو! ایسا نہ ہو کہ اللہ کے حضور تم اس طرح آؤ کہ تمھاری گردنوں پر تو دنیا کا بوجھ لدا ہو اور دوسرے لوگ سامانِ آخرت لے کر آئیں۔ اگر ایسا ہوا تو میں خدا کے سامنے تمھارے کسی کام نہ آسکوں گا۔

۳: قریش کے لوگو! خدا نے تمھارے جھوٹے غرور کو ختم کر دیا اور باپ دادا کے کارناموں پر تمھارے فخر کی کوئی گنجائش نہیں۔ لوگو! تمہارے خون و مال اور عزتیں ایک دوسرے پر ہمیشہ کے لیے حرام کر دی گئی ہیں۔ ان چیزوں کی اہمیت ایسی ہی ہے جیسی اس دن کی اور اس ماہِ مبارک کی خاص کر اس شہر میں ہے۔ تم سب خدا کے سامنے پیش ہوگے اور وہ تم سے تمھارے اعمال کے بارے میں سوال کرے گا۔

۴: دیکھو! میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ آپس میں دنگا فساد کرنے لگو۔ اگر کسی کے پاس امانت رکھوائی جائے تو وہ اس بات کا پابند ہے کہ امانت رکھوانے والے کو پہنچا دے۔

۵: لوگو! ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اپنے غلاموں کا خیال ضرور رکھو انھیں وہی کھلاؤ جو خود کھاتے ہو ایسا ہی پہناؤ جو خود پہنتے ہو۔

۶: دورِ جاہلیت کی سب باتیں میں نے اپنے قدموں تلے روند دیں۔ زمانہ جاہلیت کے سب خون کے انتقام اب نہیں لیے جائیں گے۔ پہلا انتقام جسے میں ختم کرتا ہوں میرے اپنے خاندان کا ہے۔ ربیعہ بنی حارث (بنی سعد) کے دودھ پیتے بیٹے کا خون جسے بنو ہذیل نے مار ڈالا تھا، اب میں معاف کرتا ہوں۔ دورِ جاہلیت کے سود کی کوئی بھی حیثیت نہیں۔ پہلا سود جسے میں چھوڑتا ہوں عباس بن عبدالمطلب کے خاندان کا سود ہے، اب یہ ختم ہو گیا۔

۷: لوگو! خدا نے ہر حق دار کو اس کا حق دے دیا۔ اب کوئی کسی وارث کے حق میں وصیت نہ کرے۔

۸: بچہ اس کی طرف منسوب کیا جائے گا جس کے بستر پر پیدا ہوا۔ جس پر حرام کاری ثابت ہو اس کی سزا پتھر ہے، حساب و کتاب خدا کے ہاں ہوگا۔

۹: جو کوئی اپنا نسب بدلے گا یا کوئی غلام اپنے آقا کے مقابلے میں کسی اور کو اپنا آقا ظاہر کرے گا اس پر خدا کی لعنت۔

۱۰: لوگو! اپنی بیویوں کے متعلق اللہ سے ڈرتے رہو۔ خدا کے نام کی ذمہ داری سے تم نے ان کو بیوی بنایا اور خدا کے کلام سے تم نے ان کا جسم اپنے لیے حلال بنایا ہے۔ تمھارا حق عورتوں پر اتنا ہے کہ وہ

تمھارے بستر پر کسی غیر مرد کو نہ آنے دیں لیکن اگر وہ ایسا کریں تو ان کو ایسی مار مارو جو نمودار نہ ہوں۔ عورتوں کا حق تم پر یہ ہے کہ تم ان کو اچھی طرح کھلاؤ، اچھی طرح پہناؤ۔

۱۱: لوگو! میں تم میں وہ چیز چھوڑ چلا ہوں کہ اگر اسے مضبوط پکڑ لو گے تو کبھی گم راہ نہ ہو گے۔ وہ اللہ کی کتاب قرآن مجید ہے۔

۱۲: لوگو! نہ تو میرے بعد کوئی پیغمبر ہے اور نہ کوئی مزید امت پیدا ہونے والی ہے۔ خوب سن لو! کہ پروردگار کی عبادت کرو اور پنجگانہ نماز ادا کرو۔ سال بھر میں ایک مہینہ رمضان کے روزے رکھو۔ مالوں کی زکوۃ نہایت خوش دلی کے ساتھ دیا کرو۔ خانۂ خدا کا حکم حج بجالاؤ اور اپنے اولیائے امور و حکام کی اطاعت کرو جس کی جزا یہ ہے کہ تم پروردگار کے فردوسِ بریں میں داخل ہو گے۔

۱۳: لوگو! قیامت کے دن تم سے میری بابت بھی دریافت کیا جائے گا۔ مجھے بتا دو کہ تم کیا جواب دو گے؟ سب نے کہا ہم اس کی شہادت دیتے ہیں کہ آپؐ نے اللہ کے احکام ہم کو پہنچا دیے۔ آپؐ نے رسالت و نبوت کا حق ادا کر دیا۔ آپؐ نے ہم کو کھوٹے کھرے کی بابت اچھی طرح بتا دیا۔ (اس وقت) نبی ﷺ نے اپنی انگشت شہادت کو اٹھایا۔ آپ ﷺ آسمان کی طرف انگلی اٹھاتے تھے اور پھر لوگوں کی جانب جھکاتے ہوئے فرماتے تھے: اے خدا سن لے۔ اے خدا گواہ رہنا۔ اے خدا شاہد رہنا۔

۱۴: دیکھو! جو لوگ موجود ہیں وہ ان لوگوں کو جو موجود نہیں ہیں ان کو یہ باتیں پہنچا دیں، ممکن ہے کہ بعض سامعین سے وہ لوگ زیادہ تر اس کلام کو یاد رکھنے اور حفاظت کرنے والے ہوں جنھیں (ان باتوں کی) تبلیغ کی جائے۔

انسانی حقوق کا عالمی اعلامیہ

پہلی جنگِ عظیم کی ہولناکیوں کے بعد اقوامِ عالم کے سرکردہ گروہ سر جوڑ کر بیٹھے اور امن کی کوششوں کے ضمن میں لیگ آف نیشنز بنائی گئی۔ اس کی ناپائیداری کا عالم یہ تھا کہ نصف صدی کا عرصہ بھی نہیں گزرا تھا کہ دوبارہ اس سے زیادہ تباہ کاری دوسری جنگ عظیم کی صورت میں سامنے آئی اور اس کے خاتمے کے بعد ایک بار پھر وہی گروہ جو ظلم و تعدی میں پیش پیش تھا، سامنے آیا اور اقوام متحدہ وجود میں آئی۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے طویل غور و خوض اور مشاورت کے بعد ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ کو مندرجہ ذیل تیس شقوں پر مشتمل ایک دستور ''انسانی حقوق کا عالمی اعلامیہ'' کے نام سے جاری کیا۔

شق نمبر ۱: تمام انسان آزاد پیدا ہوئے ہیں۔ عزت اور حقوق میں آپس میں برابر ہیں۔ انھیں ضمیر جیسی قوت عطا کی گئی ہے اور انھیں چاہیے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارے کے جذبے کے ساتھ تعاون کریں۔

شق نمبر۲: بلا امتیاز نسل، رنگ، جنس، زبان، مذہب، سیاسی حیثیت وغیرہ کے ہر ایک اس اعلامیے کے حقوق کا حق دار ہے۔ مزید براں اس کی راہ میں کوئی سیاسی، عدالتی یا عالمی قومی حیثیت یا علاقہ جس سے وہ شخص تعلق رکھتا ہے خواہ اس کی حیثیت آزاد ہو یا نہ ہو، حائل نہیں ہوسکتی۔

شق نمبر۳: ہر ایک کو زندگی، آزادی اور تحفظ کا حق حاصل ہے۔

شق نمبر۴: کسی کو غلام نہیں رکھا جاسکے گا اور غلامی اور غلاموں کی تجارت اپنی تمام اقسام کے ساتھ ممنوع ہوگی۔

شق نمبر۵: کسی کو اذیت نہیں دی جائے گی اور نہ ہی اُس کے ساتھ غیر انسانی اور ذلت آمیز سلوک کیا جائے گا۔

شق نمبر۶: ہر ایک کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی جگہ بھی بہ حیثیت ایک شخص قانون کے سامنے اپنی شناخت تسلیم کرا سکے۔

شق نمبر۷: قانون کی نظروں میں سب ایک ہیں اور بلا امتیاز ہر ایک کو قانون کا تحفظ حاصل کرنے کا اختیار ہے۔ ہر ایک اس نظریے کے اعلامیہ سے متصادم تحریک ترغیب کے خلاف تحفظ کا حق رکھتا ہے۔

شق نمبر۸: ہر ایک کو یہ حق حاصل ہے کہ آئین یا قانون کے تحت دیئے گئے بنیادی حقوق کی خلاف ورزی ہونے کی صورت میں ملکی عدالتوں سے رجوع کرے۔

شق نمبر۹: کسی کو بلا جواز گرفتار کیا جاسکتا ہے، روکا جاسکتا ہے اور نہ ہی جلا وطن کیا جاسکے گا۔

شق نمبر۱۰: ہر ایک یہ حق رکھتا ہے کہ اپنے حقوق سے متصادم کسی بھی مجرمانہ الزام کے خلاف کسی ایک آزاد اور غیر جانب دارانہ کھلی عدالت میں اپنے حقوق کا تحفظ کر سکے۔

شق نمبر۱۱: (الف) ہر وہ شخص جس پر قانونی جرم کا الزام ہو یہ حق رکھتا ہے کہ اُسے اُس وقت تک بے گناہ سمجھا جائے جب تک کہ ایسی عدالت جس میں اُسے اپنے دفاع کی ساری سہولتیں حاصل ہوں، قانون کے تحت اس پر الزام ثابت نہیں ہوجاتا۔

(ب) کسی کو مجرم محض ایسی غلطی یا فروگزاشت پر نہیں ٹھہرایا جائے گا جو اُس وقت کی گئی ہو جب وہ ملکی یا عالمی قوانینِ جرم کے تحت نہ آتی ہو اور نہ ہی کسی کو اس کے جرم کی مروجہ سزا سے زیادہ سزا دی جائے گی۔

شق نمبر۱۲: کسی کی ذاتی زندگی، خاندان، گھر اور خط وکتابت میں بے جا مداخلت نہیں کی جائے گی اور نہ ہی اُس کی عزت اور شہرت پر حملہ کیا جائے گا۔ ایسی مداخلت کے خلاف اُسے قانونی تحفظ حاصل

ہے۔

شق نمبر۱۳:(الف) ہرایک کو ہر ملک کے اندر کسی بھی جگہ جانے اور رہائش کا حق حاصل ہے۔

(ب) ہرایک کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ (بہ شمول اپنے وطن کے) کسی بھی ملک سے ہجرت کر سکے اور اپنے وطن آ سکے۔

شق نمبر۱۴: (الف) ہرایک یہ حق رکھتا ہے کہ وہ ستم گری سے نجات پانے کے لیے دوسرے ممالک میں جائے پناہ ڈھونڈ سکے۔

(ب) یہ حق مقدمے کی صورت میں استعمال نہیں کیا جا سکتا بالخصوص جب کہ یہ غیر سیاسی جرائم سے متعلق ہو یا اقوامِ متحدہ کے اصول و مقاصد سے متصادم ہو۔

شق نمبر۱۵: (الف) ہرایک کو شہریت حاصل کرنے کا حق حاصل ہے۔

(ب) کسی کو اس کے حقِ شہریت سے محروم کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اُسے شہریت تبدیل کرنے سے روکا جا سکتا ہے۔

شق نمبر۱۶: (الف) بالغ مرد و زن کو بلا تفریق مذہب، قومیت، نسل کے شادی و طلاق میں برابری کے حقوق حاصل ہیں۔

(ب) شادی ہر دو فریق کی مکمل آزادانہ رضا مندی سے ہو گی۔

(ج) خاندان معاشرے کا ایک قدرتی اور بنیادی حصہ ہے اور اسے معاشرے و ملک کی جانب سے تحفظ دینے کا حق حاصل ہے۔

شق نمبر۱۷: (الف) ہرایک یہ حق رکھتا ہے کہ اپنی جائیداد انفرادی یا اجتماعی حیثیت میں بنائے۔

(ب) کسی بھی فرد کو اس کی جائیداد سے بے قاعدہ طور پر محروم نہیں کیا جائے گا۔

شق نمبر۱۸: ہرایک کو آزادیٔ سوچ اور آزادیٔ مذہب حاصل ہے۔ اس آزادی میں مذہب یا عقیدے کی تبدیلی شامل ہے خواہ یہ انفرادی حیثیت میں ہو یا اجتماعی اور عام ہو یا ذاتی، وہ مذہب یا عقیدہ کو پڑھائی، عملی زندگی، عبادات اور مشاہدات میں عیاں کر سکتا ہے۔

شق نمبر۱۹: ہرایک کو آزادیٔ رائے کا حق حاصل ہے۔ وہ بلا روک ٹوک اپنی رائے رکھ سکتا ہے اور اس کے مطابق معلومات اور نظریات بلا تفریق علاقہ جات کسی بھی ذریعہ سے حاصل کر سکتا ہے۔

شق نمبر۲۰: (الف) ہرایک آزادانہ طور پر پُر امن اجتماع اور انجمنیں قائم کرنے کا حق رکھتا ہے۔

(ب) کسی کو کسی انجمن سے تعلق رکھنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

شق نمبر۲۱: (الف) ہرایک اپنے ملک کی حکومت میں حصہ لینے کا خواہ وہ براہِ راست ہو یا

نمائندوں کے ذریعے منتخب ہو' آزادانہ حق رکھتا ہے۔

(ب) ہر ایک کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے ملک کی سرکاری ملازمت میں مساوی طور پر حصہ لے۔

(ج) حکومت کی بنیاد لوگوں کی مرضی پر ہوگی اور مرضی مقررہ معیاد یا حقیقی انتخابات کے انعقاد سے عبارت ہوگی۔

شق نمبر ۲۲: بہ حیثیت ایک معاشرے کے فرد کے ہر ایک کو یہ حق حاصل ہے کہ اُسے سماجی تحفظ حاصل ہو اور وہ ملکی اور عالمی امداد باہمی سے فائدہ اُٹھانے کا حق رکھتا ہے۔ مملکت کے معاشی، سماجی اور ثقافتی حقوق کو اپنی شخصیت کی فلاح کے لیے استعمال کرنے کا حق رکھتا ہے۔

شق نمبر ۲۳: (الف) ہر ایک کو آزادانہ طور پر اپنی مرضی کے مطابق صحیح ملازمت کا حق حاصل ہے اور وہ بے روزگاری کے خلاف تحفظ کا حق رکھتا ہے۔

(ب) ہر ایک بلاتفریق وتعصب مناسب کام کے عوض مناسب اجرت کا حق رکھتا ہے۔

(ج) ہر کارکن کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے اور اپنے خاندان کے لیے باعزت طور پر مناسب معاوضہ حاصل کرے اور اگر ضروری ہو تو اُسے سماجی تحفظ کے دوسرے ذرائع سے امداد دی جائے۔

(د) ہر شخص تجارتی انجمنیں بنانے اور ان میں شمولیت کا حق رکھتا ہے تا کہ اُسے مفادات کا تحفظ حاصل ہو سکے۔

شق نمبر ۲۴: ہر آدمی کو آرام اور تفریح کا حق حاصل ہے جس میں کام کے مناسب اوقات کی حدود اور معیاری چھٹیاں مع تنخواہ شامل ہیں۔

شق نمبر ۲۵: (الف) ہر ایک یہ حق رکھتا ہے کہ اُسے اور اس کے خاندان کو صحت مندانہ اور خوش حال زندگی بسر کرنے کے لیے خوراک لباس، مکان، طبی سہولیات اور ضروری سماجی خدمات میسر ہوں۔ مزید برآں بے روزگاری، بیماری، معذوری، بیوگی، عمر رسیدگی اور قدرتی آفات جیسے مصائب میں اُسے تحفظ حاصل ہو۔

(ب) ماں اور بچہ دونوں خصوصی نگہداشت اور مدد کے حصول کا حق رکھتے ہیں۔ تمام بچے خواہ وہ جائز یا برعکس حیثیت رکھتے ہوں ایک جیسا سماجی تحفظ حاصل کریں گے۔

شق نمبر ۲۶: (الف) تعلیم پر ہر ایک کو حق حاصل ہے۔ کم از کم ابتدائی سطح کی تعلیم مفت ہوگی۔ پرائمری کی سطح کی تعلیم ضروری ہوگی۔ ٹیکنکل اور پیشہ وارانہ تعلیم عام طور پر مہیا کی جائے گی اور قابلیت پر اعلیٰ تعلیم کے دروازے ہر ایک کے لیے کھلے رکھے جائیں گے۔

(ب) تعلیم کو اس طرح ترقی دی جائے گی کہ اس سے انسان کی شخصیت اور اس کے حقوق و

آزادی کو استحکام ملے گا۔ یہ تمام ملکوں، قوموں اور مذہبی رویوں، باہمی ہم آہنگی اور دوستی کے رشتوں کو فروغ دے گی اور اقوام متحدہ کو امن قائم کرنے میں معاونت دے گی۔

(ج) والدین کو یہ اولین حق حاصل ہے کہ وہ اپنے بچوں کے لیے تعلیمی نوعیت کا انتخاب کر سکیں گے۔

شق نمبر ۲۷: (الف) ہر ایک یہ حق رکھتا ہے کہ کسی اقلیت کی ثقافتی زندگی میں حصہ لے اور ادبیات سے لطف اندوز ہو نیز سائنسی ترقی اور اس کے فوائد میں حصہ دار بنے۔

(ب) ہر شخص اپنی کسی بھی سائنسی، علمی یا ادبی سرگرمیوں کی وجہ سے جنم لینے والی اخلاقی و مادی خوش حالی میں ایک تحفظاتی حق رکھتا ہے۔

شق نمبر ۲۸: ہر شخص اُس معاشرتی اور عالمی حق کا مستحق ہے جس میں وہ حقوق اور آزادیاں دی گئی ہوں جو اس اعلامیہ میں موجود ہیں۔

شق نمبر ۲۹: (الف) ہر شخص پر اُس معاشرے کا حق ہے جس معاشرے میں اُس کی آزادی اور ترقی ہو۔

(ب) اپنے حقوق اور آزادیوں کے حصول میں ہر ایک اُن حدود کا پابند ہوگا جو قانون، حقوق اور آزادیوں کی خاطر تحفظ، شناخت اور احترام نیز جمہوری معاشرے میں اخلاقی اور عوامی مفاد کے تحت لاگو کرے گا۔

(ج) ان حقوق اور آزادیوں کو اقوامِ متحدہ کے مقاصد اور اصولوں کے خلاف کسی طور پر بھی استعمال نہیں کیا جا سکتا۔

شق نمبر ۳۰: کسی ملک، گروپ یا شخص کی خاطر اس اعلامیے کو کسی ایسے طور پر استعمال نہیں کیا جا سکتا جو ان دیئے گئے حقوق اور آزادیوں کی تباہی کا موجب ہو۔

تجزیہ

جب ہم خطبہ حجتہ الوداع اور اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے اعلامیے کے ابتدائی کلمات کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہیں تو چند دلچسپ حقائق سامنے آتے ہیں:۔

☆ انسانی حقوق کا اعلامیہ جنگِ عظیم کی تباہ کاریوں کے بعد وجود میں آیا جب کہ حجتہ الوداع کا خطبہ اُس وقت دیا گیا جب اسلام کا غلبہ اور اس کے ثمرات عام ہو چکے تھے۔ اس طرح پہلے امراض کا علاج کیا گیا اور بعد ازاں حفاظتی تدابیر بتا دی گئیں تا کہ امراض کے دوبارہ حملہ آور ہونے کا سدِ باب کیا جا سکے۔

☆ خطبہ حجتہ الوداع کو کسی قانونی یا عمومی ادارے سے منظوری کی ضرورت پیش نہیں آئی اور یہ اس کی صداقت کا ایک اہم ترین ثبوت ہے۔

☆ اقوام متحدہ کا منشور بہت سی اقوام کے بہت سے افراد کی کوششوں کا نتیجہ تھا جن کے کردار کی کوئی مثالی حیثیت ہمارے سامنے نہیں ہے۔ عام فہم سی بات ہے کہ اسے بار بار ڈرافٹ کیا گیا ہوگا اور خاصی مشکلات کے سفر کے بعد اسے موجودہ صورت ملی ہوگی جب کہ خطبہ حجتہ الوداع ایک انفرادی اور فی البدیہہ کوشش ہے اور اسے ایک ایسی ہستی گرامیؐ نے دیا جس کا کردار کامل ترین ہے۔

☆ یہ خطبہ صدیوں پرانا ہے اور اس کی وسیع تشہیر ہو چکی ہے۔ کون دعویٰ کر سکتا ہے کہ اقوام متحدہ کے منشور تیار کرنے والے گروہ میں سے کسی ایک فرد یا زیادہ نے خطبہ کے ناصحانہ نکات کی پیروی کرنے کی کوشش نہیں کی ہوگی۔

☆ آخری خطبہ مختصر ترین مگر جامع ہے اور اس کا خطاب ساری دنیا سے ہے جب کہ اعلامیے میں بار بار بیانات کی تجدید کی گئی ہے اور یہ صرف ممبر ممالک پر ہی لاگو ہے۔

☆ انسانی حقوق کا عالمی اعلامیہ بنا کر چند بڑے ممالک کی گود میں ڈال دیا گیا کہ یہ تمھارے لئے ہے۔ اس کے ذریعے اپنی راج دھانی کو مستحکم کرو۔ جب کہ آخری خطبہ کسی ایک گروہ کے نہیں بل کہ ہر ایک انسان کے حوالے کر کے کہا گیا کہ اس کے ذریعے بھلائی کو فروغ دو اور اپنی حکم رانی کی بجائے اللہ کی حاکمیت کو مستحکم کرو۔ خطبہ حجتہ الوداع شقوں کے تعداد میں تو اعلامیے کی نسبت بہت مختصر ہے مگر جامعیت، وضاحت، اہمیت اور ہمہ جہتی میں اعلامیے کی اس کے سامنے کوئی اہمیت نہیں اور یہ اپنی وسعت میں اعلامیے سے کہیں بڑھ کر ہے۔

☆ خطبے میں پیدا کرنے اور پالنے والے مالک کی حمد وثناء اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ شکر گزاری کا اظہار کیا جا رہا ہے اور یہ چیز حقیقتوں کو ظاہر کرتی ہے۔ ساتھ ہی لوگوں کو یہ حقیقت بھی بتا دی گئی کہ تم سب دراصل ایک ہو اور تمھارے لیے ایک دوسرے کی عزت، فرائض اور حقوق برابر ہیں۔ تم میں سے اگر کسی کو دوسروں پر فضلیت حاصل ہے تو وہ پرہیز گاری کے معیار کی وجہ سے ہے اور یہ ایک ایسا معیار ہے جہاں انسان ایثار کے جذبوں کے تحت کام کرتا ہے۔ لہٰذا ظلم ونفرت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

☆ خطبے میں واضح کر دیا گیا کہ سب انسان برابر ہیں نیز ایک دوسرے پر فوقیت کا مطالبہ یا ظلم و تشدد اور انتقام کا مطالبہ ختم ہو چکا ہے۔ اس طرح بری اور نفرت وظلم کی باتیں تو ختم کر دیں لیکن جو نیکی کے کام تھے مثلاً بیت اللہ کی دیکھ بھال اور حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمت ان کو برقرار اس لیے رکھا کہ واضح ہو جائے کہ نیکی کو برقرار رکھنا مقصود ہے خواہ وہ کسی بھی دور سے متعلق ہو۔ نیز ایک نعمت جو اللہ نے

پہلے ہی کسی کو دے رکھی ہے اُسے چھیننے کا حق کسی کو بھی حاصل نہیں۔

☆ داعیٔ حق نبی کریمؐ نے اپنے قریبی لوگوں پر یہ واضح کر دیا کہ تمھارے اعمال ہی تمھاری نجات کا باعث بنیں گے، میں ظالم کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گا اور نہ کروں گا۔

عالم اعلامیہ کی شق نمبر ۳ میں اعلامیہ کی شق نمبر ۱ کی بات دہرائی گئی۔ دوسری طرف خطبے کی ناصحانہ شق زیادہ واضح اور جامع ہے۔ جہاں اس طرف اشارا کیا گیا ہے کہ تمھاری جھوٹی شان و شوکت اور آباؤ اجداد کے کارناموں پر فخر کرنا بے حیثیت ہے، وہاں یہ بات بھی واضح کر دی گئی کہ ہر ایک کو باعزت طور پر امن و سلامتی کے ساتھ رہنے کا حق حاصل ہے۔ ایک دوسرے کے خون و مال اور عزتوں کو اسی طرح متبرک قرار دیا جس طرح اس خطبے کے دن کو اور اس ذی الحجہ کے مہینے کو متبرک قرار دیا اور پھر اس مہینے کی متبرک حیثیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ یہ متبرک مہینہ اس متبرک شہر (مکہ معظّمہ) میں ہے۔ نیز نبی کریم ﷺ کی ذات بابرکات اس وقت اس شہر میں موجود ہے۔ اس کے ساتھ ہی لوگوں کو خبردار کر دیا گیا کہ تم اپنے اعمال میں آزاد نہیں ہو بلکہ یاد رکھو کہ تمھیں اپنے اعمال کے سلسلے میں ایک ایسی ہستی کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے گا جو علیم و قدیر بھی ہے سمیع و بصیر بھی ہے۔

☆ اعلامیے کی شق نمبر ۴ کا حق اسلام نے پہلے ہی دے رکھا ہے اور خطبے کی ابتدا ہی میں اس کا ذکر ہے۔ اعلامیہ کی یہ شق بھی مختلف الفاظ میں پہلی شقوں کا تکرار ہے جب کہ اس کے مقابلے میں خطبے میں نئی نصیحت بیان کی گئی ہے اور لوگوں کو آپس میں دنگا و فساد سے اجتناب برتنے اور امانت داری اختیار کرنے کا سبق دیا گیا ہے۔

☆ خطبے میں زیادہ واضح طور پر بھائی چارے کی نصیحت کی گئی ہے۔

☆ شق نمبر ۵ کے تحت اعلامیے میں ایک عام سی بات کی گئی جب کہ اس کے مقابلے میں خطبے میں دورِ جاہلیت کے ظلم و ستم پر مبنی اقدامات کو ختم کرنے کا اعلان کیا گیا ہے اور اس سلسلے میں اول خویش بعد درویش کو سامنے رکھتے ہوئے عملی قدم اٹھایا گیا ہے۔

☆ اعلامیے کی شق نمبر ۷ میں اس پہلی شق کی تجدید ہے جب کہ خطبے میں ایک ایسے حق کے تصفیے کے بارے میں وضاحت ہے جو بنیادی حیثیت کا ہے اور اگر یہ حق انسان کے پاس رہتا ہے تو عدل و انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے اس لیے اس حق کا فیصلہ خدائے رحیم و کریم اور عادل ذات نے خود کر دیا ہے۔

اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے بین الاقوامی اعلامیہ کی شق نمبر ۱۹ واضح کرتی ہے کہ ہر شخص کو اپنی رائے رکھنے اور اس کے اظہار کی آزادی ہے۔ کسی مداخلت کے بغیر اپنی رائے رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ

وہ ہر قسم کی اطلاع اور خبر حاصل کرنے کا حق رکھتا ہے اور اس کا اظہار بھی کر سکتا ہے۔ شق نمبر ۱۹ ہی نے ۱۹۸۶ میں انسانی حقوق کی ایک نئی بین الاقوامی تنظیم کے قیام کی افادیت کا دائرہ متعین کیا چنانچہ اسی نسبت سے نئی تنظیم کو شق نمبر ۱۹ کہا جاتا ہے۔ اس کی پہلی عالمی رپورٹ کا عنوان 'اطلاعات، آزادی اور سنسر شپ ہے' اس میں مختلف نظریاتی اور سیاسی نظاموں کے حامل ۵۰ ممالک کا جائزہ لیا گیا اور ثابت ہوتا ہے کہ یہ آزادی دنیا کے کسی ملک میں (شاید تسلی بخش طور پر ہی سہی) کہیں بھی نہیں۔ اسلام نے آج سے صدیوں پہلے اپنی لاریب حقانیت کو اس سلسلے میں ثابت کر دیا تھا۔ وہاں اقوامِ متحدہ بھی بے بس ہے بل کہ سچ تو یہ ہے کہ جہاں رائج ہے وہاں بھی اقوامِ متحدہ ایک کھلونے کی حیثیت رکھتی ہے۔

☆ خطبے میں اس بات کی وضاحت کی گئی کہ کسی انسان کو دوسرے انسان پر حرام کاری کا بے بنیاد الزام لگانے کی اجازت نہیں اور اگر حرام کاری ثابت ہو جائے تو اس کی سزا سنگ ساری ہے اور غریب، امیر، کم زور، طاقت ور، بے اختیار اور با اختیار کسی کی کوئی تفریق نہیں لیکن اس میں ظلم و تعدی نہیں ہونی چاہیے ورنہ یاد رہے کہ خدا کے ہاں حساب و کتاب ہوگا۔ گویا ایک مجرم کو بھی اتنی ہی سزا دی جا سکے گی جتنے کا وہ سزاوار ہے اور اس پر بھی زیادتی کو ظلم قرار دیا ہے اور ڈرایا گیا ہے کہ زیادتی کی پوچھ گچھ خدائے قادرِ مطلق کے پاس ہوگی۔

☆ شق نمبر ۹ کے تحت اعلامیے کا حق تو عمدہ ہے لیکن اس کی عملی حیثیت موجودہ دور میں صفر نظر آ رہی ہے کیوں کہ اقوامِ متحدہ کے پاس کوئی طاقت نہیں۔ وہاں صرف وہی ہو سکتا ہے جو پانچ ویٹو کی حامل طاقتیں چاہیں۔

☆ وفاداری کو ایمان کی شرط قرار دے دیا گیا ہے یوں اس کی وجہ سے معاشرے میں ہمواریت اور اپنے فرائض کی بہتر ادائیگی کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔

☆ عالمی اعلامیے میں کہیں بھی دعویٰ موجود نہیں کہ ایسا کرو گے تو ایسا ہو سکے گا۔ لیکن حجتہ الوداع کے خطبہ میں تمام بھلائیوں کے اختیار کرنے کے حکم کے بعد واضح طور پر اعلان کر دیا گیا کہ اس کا انجام نہایت ہی حسین ہے۔

☆ کائنات میں میاں بیوی کا رشتہ بنیادی رشتوں میں سے ایک ہے۔ اس رشتے کا استحکام پورے معاشرے کو استحکام بخشتا ہے۔ اسلام نے (میاں بیوی) دونوں کے حقوق اور فرائض مقرر کیے ہیں اور اگر گہری نظر سے جائزہ لیا جائے تو اسلام نے دونوں کی یکساں برتری عطا کی ہے۔ کسی بھی چیز کو کنٹرول کرنے کے لیے کوئی ذریعہ ہوتا ہے اور یہ ذریعہ اگر طاقت ور ہوگا تبھی کنٹرول صحیح طور پر بر آور رہے گا۔ اسی اصول پر تنظیموں اور ملکوں کے دساتیر بنائے جاتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ ہر انسان اپنے آپ

کو برتر رکھنے کے لیے ایسے دساتیر اپنے مفادات کو محسوس اور غیر محسوس انداز میں سامنے رکھ کر بناتا ہے یا اس کی کوشش کرتا ہے۔ یہی صورتِ حال انتہائی واضح طور پر عالمی اعلامیے میں ہے جب کہ خطبہ حجتہ الوداع میں جس قانون کو اختیار کرنے کی نصیحت فرمائی گئی ہے اور جس کے متعلق واضح طور پر بتا بھی دیا گیا کہ اسی میں نجات ہے، وہ انسانی نہیں بل کہ خالق و مالک کا بنایا ہوا ہے جو بے نیاز ذات ہے۔

☆ ناصح کی نصیحت اُسی وقت کارگر ہوسکتی ہے جب خود سچا بھی ہو اور باکردار و باعمل بھی۔ نبی پاک ﷺ کی ذات و بابرکات تو سراپا رحمت اور امین و صادق ہے۔ اس کے باوجود آپؐ نے خطبہ ارشاد فرمانے کے بعد لوگوں سے اپنے متعلق پوچھا تاکہ آنے والے وقت میں کہیں کچھ منافق لوگ اس پر اعتراض نہ کرسکیں اور سچائی دھندلا نہ سکے۔ اس کے بعد سچائی کی گواہی کو انسانوں تک محدود نہیں رکھا بل کہ پروردگارِ عالم کے سامنے اقرار کیا اور اُس علیم و بصیر سے گواہ رہنے کی دعا فرمائی۔

☆ جو کچھ کہا ایک ایسی قوت کو گواہ بنا کر کہا جس کے آگے سب قوتیں ہیچ ہیں اور جو سب پر نگران ہے، بصیر و علیم ہے۔

☆ آخری خطبہ کسی طاقت کے زور پر لاگو نہیں کیا گیا بل کہ اس کے لیے اخلاقی قوتوں پر انحصار کیا گیا۔ مزید برآں اس کی اہمیت زورِ بیان ہی سے محسوس کی گئی اور روزِ انتہا تک کے لیے تسلیم کی گئی اسی لیے اس کی تبلیغ پر زور دیا گیا۔ پیارے نبی ﷺ کا فرمان ہو اور مسلمان اس پر امنّا وَصدّ قنا نہ کہیں، یہ کیونکر ممکن ہوسکتا ہے؟ گویا یہ حکمِ تبلیغ مسلمانوں پر فرض ہوگیا۔

☆ اہلِ حق، اہلِ نظر اب خود فیصلہ کریں کہ حقیقت کیا ہے اور اس کے ثمرات کیوں کر حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

۹ ذی الحج کی نماز فجر آپؐ نے ادا کی۔ پھر سورج نکلنے تک توقف فرمایا۔ آفتاب طلوع کے بعد آپؐ نے اپنی ناقہ قصواء پر سوار ہوکر عرفات کی جانب روانہ ہوئے۔ عرفات پہنچ کر وادی وغیرہ ایک قبہ میں قیام فرمایا۔ زوال کے بعد آپؐ نے قصواء پر کجاوہ کسنے کا حکم فرمایا۔ آپ بطن وادی میں تشریف لائے اس وقت آپؐ کے اردگرد ایک لاکھ چوالیس ہزار یا دوسری روایت کے مطابق ایک لاکھ چوبیس ہزار انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا۔ ان میں کئی تلبیہ پکار رہے تھے اور بعض تکبیرات۔ آپؐ وسطِ عرفات میں تشریف لائے اور ناقہ مبارک پر بیٹھے ایک خطبہ ارشاد فرمایا جو دنیا میں حقوق انسانی کا سب سے پہلا چارٹر ہے اور آج تک بل کہ رہتی دنیا تک دنیا اس سے بہتر انسانی حقوق کا چارٹر نہیں دے سکتی۔ حال آنکہ دنیا کے سامنے یہ ایک بے نظیر و بے مثال نمونہ بھی موجود تھا۔ اگرچہ اس سے کچھ اخذ بھی کیا ہوگا لیکن اس خطبہ کی اہمیت اپنی جگہ تسلیم شدہ ہے۔ آپؐ اس خطبہ کے ہر جملہ کے بعد توقف فرماتے اور اسی لمحہ سیدنا ربیعہ

بن امیہ بن خلف انھی الفاظ کا اعادہ با آواز بلند فرماتے۔ حجتہ الوادع کی ابتداء رب للعالمین کی حمد وثناء سے شروع ہوئی پھر لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا'' ہاں جاہلیت کے تمام دستور میرے دونوں پاؤں کے نیچے ہیں''۔ (صحیح مسلم و ابوداؤد)

۲: لوگو! بے شک تمھارا رب ایک ہے اور بے شک تمھارا باپ ایک ہے۔ ہاں عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر، سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضلیت نہیں مگر تقویٰ کے سبب۔ (مسند احمد)

۳: ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور مسلمان باہم بھائی بھائی ہیں۔ (طبری و ابن اسحاق)

۴: تمھارے غلام، تمھارے غلام، جو خود کھاؤ ان کو کھلاؤ جو خود پہنو وہی ان کو پہناؤ۔ (ابن سعد)

۵: جاہلیت کے تمام خون (یعنی انتقام خون) باطل کر دیئے گئے اور سب سے پہلے میں اپنے خاندان کا خون ربیعہ بن الحارث کے بیٹے کا خون باطل کرتا ہوں۔ (صحیح بخاری و مسلم و ابوداؤد بروایت جابر)

۶: جاہلیت کے تمام سود بھی باطل کر دیئے گئے اور سب سے پہلے (اپنے خاندان کا سود) عباسؓ بن عبدالمطلب کا سود باطل کرتا ہوں۔ (صحیح مسلم و ابوداؤد)

۷: عورتوں کے معاملہ میں خدا سے ڈرو۔ (صحیح مسلم و ابوداؤد)

۸: تمھارا عورتوں پر اور عورتوں کا تم پر حق ہے۔ (طبری۔ ابن ہشام)

۹: تمھارا خون اور تمھارا مال تا قیامت اس طرح حرام ہے جس طرح یہ دن اس مہینہ میں اور اس شہر میں حرام ہیں۔ (صحیح بخاری و مسلم و داؤد)

۱۰: میں تم میں ایک چیز چھوڑتا ہوں اگر تم نے اس کو مضبوط پکڑ لیا تو تم گم راہ نہ ہو گے وہ کیا چیز ہے؟ کتاب اللہ۔ (صحاح)

۱۱: خدا نے ہر حق دار کو (از روئے وراثت) اس کا حق دے دیا اب کسی کو وراثت کے حق میں وصیت جائز نہیں۔

۱۲: لڑکا اس کا ہے جس کے بستر پر پیدا ہوا۔ زنا کار کے لیے پتھر ہے اور ان کا حساب خداوند کے ذمہ ہے۔

۱۳: جو لڑکا اپنے باپ کے علاوہ کسی اور کے نسب سے ہونے کا دعویٰ کرے اور جو غلام اپنے مولیٰ کے سوا کسی اور طرف اپنی نسبت کرے اس پر خدا کی لعنت ہے۔

۱۴: ہاں عورت کو اپنے شوہر کے مال میں سے اس کی اجازت کے بغیر کچھ دینا جائز نہیں، قرض ادا کیا جائے، عاریت واپس کی جائے، عطیہ لوٹایا جائے، ضامن تاوان کا ذمہ دار ہے۔ (سنن ابن ماجہ، ابن سعد و ابن اسحاق)

۱۵: تم سے خدا کے ہاں میری نسبت پوچھا جائے گا تم کیا جواب دو گے؟ (صحیح مسلم و ابو داؤد) صحابہ نے عرض کی ہم کہیں گے کہ آپؐ نے خدا کا پیغام پہنچا دیا اور اپنا فرض ادا کر دیا۔ آپؐ نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی اور تین مرتبہ فرمایا ''اے خدا تم گواہ رہنا۔ (مسلم و ابو داؤد)

دسویں دن: آپ نے فرمایا ''مذہب میں غلو اور مبالغہ سے بچو۔ کیوں کہ تم سے پہلی قومیں اس سے برباد ہوئیں''۔ (ابن ماجہ، نسائی)

''حج کے مسائل سیکھ لو، میں نہیں جانتا کہ اس کے بعد مجھے دوسرے حج کی نوبت نہ آئے''۔ (مسلم، ابو داؤد)

''ابتداء میں جب خدا نے آسمان و زمین پیدا کیا تھا زمانہ پھر پھرا کر آج پھر اس نقطہ پر آ گیا ہے''۔ (بروایت ابو بکرہ)

''سال کے بارہ مہینے ہیں جن میں چار مہینے قابل احترام ہیں۔ تین متواتر مہینے ہیں۔ ذیقعدہ، ذوالحجہ اور محرم اور چوتھا رجب کا مہینہ''۔ (بروایت ابو بکرہ)

پوچھا ''آج معلوم ہے کون سا دن ہے؟ لوگوں نے عرض کیا کہ خدا اور اس کے رسول کو ہم سے زیادہ علم ہے۔ آپؐ دیر تک خاموش رہے۔ لوگ سمجھے کہ شاید آپؐ اس دن کا کوئی اور نام رکھیں گے۔ دیر تک سکوت کے بعد فرمایا کیا آج قربانی کا دن نہیں ہے؟ لوگوں نے کہا ہاں بے شک ہے۔ پھر ارشاد ہوا، یہ کون سا مہینہ ہے؟ لوگوں نے پھر اسی طریقہ سے جواب دیا۔ آپؐ نے سکوت فرمایا اور فرمایا کیا یہ ذوالحجہ نہیں ہے؟ لوگوں نے کہا: ہاں بے شک ہے۔ پھر پوچھا یہ کون سا شہر ہے؟ لوگوں نے بہ دستور جواب دیا۔ آپؐ نے اسی طرح سکوت فرمایا اور کہا یہ بلدۃ الحرام نہیں ہے؟ لوگوں نے کہا ہاں بے شک ہے۔ جب سامعین کے دل میں یہ خیال پوری طرح جاگزیں ہو چکا کہ آج کا دن بھی، مہینہ بھی اور خود شہر بھی محترم ہے تو آپؐ نے فرمایا ''تو تمھارا خون تمھارا مال اور تمھاری آبرو (تا قیامت) اس طرح محترم ہے جس طرح یہ دن، یہ مہینہ اور یہ شہر''۔ (بروایت ابو بکرہ)

آپؐ نے فرمایا ''ہاں میرے بعد گم راہ نہ ہو جانا کہ خود ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو تم کو خدا کے سامنے حاضر ہونا پڑے گا اور وہ تم سے تمھارے اعمال کی باز پرس کرے گا''۔ (بروایت ابو بکرہ)

آپؐ نے فرمایا ''ہاں مجرم اپنے جرم کا خود ذمہ دار ہے۔ ہاں باپ کے جرم کا ذمہ دار بیٹا نہیں اور بیٹے کے جرم کا جواب دہ باپ نہیں''۔ (ابن ماجہ، ترمذی)

''اگر کوئی حبشی ناک بریدہ غلام بھی تمھارا امیر ہو اور وہ تم کو خدا کی کتاب کے مطابق لے چلے تو اس کی اطاعت اور فرماں برداری کرو''۔ (صحیح مسلم)

''ہاں شیطان اس بات سے مایوس ہو چکا ہے کہ اب تمھارے اس شہر میں اس کی پرستش تا قیامت نہ کی جائے گی لیکن البتہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں اس کی پیروی کرو گے اور وہ خوش ہوگا''۔(ابن ماجہ،ترمذی)

''اپنے رب کو پوجو، پانچوں وقت کی نماز پڑھو، مہینہ کے روزے رکھو اور میرے احکام کی اطاعت کرو۔خدا کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے''۔(مسند احمد،مستدرک حاکم)

اس کے بعد فرمایا:''کیوں میں نے پیغام خداوندی سنا دیا''؟

سب بول اٹھے ہاں! فرمایا:اے خدا! گواہ رہنا''۔

پھر فرمایا''جو لوگ اس وقت موجود ہیں وہ ان کو سنا دیں جو موجود نہیں''۔

مختلف ماخذوں سے جمع کرنا پڑا ہے جیسا کہ مذکورہ حوالہ جات سے ظاہر ہے۔اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ ایک طویل خطبہ تھا۔ ہر ایک شخص کو جو فقرہ یاد رہ گیا اسی کی اُس نے روایت کی اس لیے مختلف ماخذوں سے ان ٹکڑوں کو اکٹھا کر لیا گیا۔

اختلاف: روایات میں یہ اختلاف بھی ہے کہ خطبہ ۹ ذوالحجہ کو اور بعض ۱۰ ذوالحجہ کو بتاتے ہیں۔ بعض رواتیں ایام التشریق کے خطبہ کی ہیں۔ابن اسحاق نے اس کو مسلسل خطبہ کے طور پر نقل کیا ہے۔ ابن ماجہ اور ترمذی و مسند احمد میں خطبہ کے چند فقرے منقول ہیں جن میں تصریح نہیں کہ یہ کون سے دن سے متعلق ہیں۔ بہ ہر حال صحاح ستہ اور مسانید کی تمام روایات کو جمع کرنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ نے اس حج میں تین بار خطبہ دیا۔۹ ذوالحجہ یوم عرفہ کو ۱۰ ذوالحجہ یوم النحر کو اور تیسرا خطبہ ایام التشریق میں ۱۱ یا ۱۲ کو۔ان خطبوں میں اصولی طور پر بعض باتیں مشترک ہیں۔

شبہ کا ازالہ: اعلامیہ کی بعض شقوں میں تکرار پائی جاتی ہے۔کوئی منچلا اعتراض کر سکتا ہے کہ خطبہ حجتہ الوداع میں بھی تکرار ہے۔اس پر خاموشی کیوں اور اعلامیہ پر اعتراض کیوں؟

خطبہ حجتہ الوداع کی تکرار میں حسن و خوبی اس لیے ہے کہ بعض مختص المقام ہیں۔ یہ بہت ممکن ہے جیسا کہ بعض محدثین نے تصریح کی ہے کہ چوں کہ یہ مجمع بہت بڑا تھا اور آپؐ جو پیغام امت کو پہنچانا چاہتے تھے وہ نہایت اہم تھا اس لیے آپؐ نے اپنی تقریر کے بعض فقرے مکرر اعادہ فرمائے ہیں۔(سیرت النبی۔۲۔۱) جیسا کہ آپؐ نے فرمایا''جو لوگ اس وقت موجود ہیں ان کو بتا دیں جو موجود نہیں۔خطبہ کے جملوں کو دہرانے کا ایک مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ موجود تمام لوگ اچھی طرح سمجھ جائیں۔سب کو خطبہ کی باتیں معلوم ہو جائیں۔کسی قسم کا ابہام نہ رہے۔اس لیے سیدنا ربیعہ بن امیہ بن خلف آپؐ کے ادا کردہ الفاظ کو دوبارہ با آواز بلند کہتے تھے۔

ایک مقصد یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ظہورِ اسلام سے قبل جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا قانون تھا۔ کم زور، غریب، لونڈی، غلام حتیٰ کہ عورتوں کا کوئی بھی مرتبہ ومقام نہ تھا۔ کوئی ان کا پرسان حال نہ تھا۔ لیکن اسلام نے ہر طبقہ کے مرد وزن کو حقوق عطا کیے۔ ان حقوق کی پاس داری کے لیے اس موقع پر بھی انھیں فراموش نہیں کیا بل کہ از سر نو لوگوں کو یاد دہانی کرائی اور فرمایا۔ تمھارے غلام، تمھارے غلام (شق ۴) ''عورتوں کے معاملہ میں خدا سے ڈرو، تمھارا عورتوں پر اور عورتوں کا تم پر حق ہے''۔ (شق نمبر ۷، ۸)

اس کا ایک مقصد یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک اور پیغام کو پہنچانے کے ساتھ پہلی بات کو بھی بیان کرنے سے اس بات کی اہمیت بھی واضح ہوجاتی ہے اور دوسری بات کے ساتھ بیان کرنے سے اس کے اعادہ سے وہ بات ذہن میں نقش ہوجاتی ہے۔ یہ بہ ظاہر تکرار ہے لیکن یہ حسن تکرار ہے کہ ایک نئے انداز میں پہلے پیغام کو دوبارہ بیان کر کے اس کی اہمیت کو مزید اجاگر کر کے چار چاند لگا دیے جاتے ہیں۔

ایک ہی مضمون کو مختلف اسالیب میں بیان کرنے میں جو فضلیت ہے وہ پوشیدہ نہیں۔ نیز ایک ہی بات کو کمی بیشی الفاظ کے ساتھ بیان کر کے عجیب تاثر پیدا کیا گیا جس سے خطبہ دینے والے کی شخصیت دوسرے اس قسم کے خطبہ دینے والوں سے مختلف نظر آتی ہے اور آج تک اس جیسا عالمی انسانی چارٹر کوئی قوم نہیں دے سکی۔ لہٰذا یہ رسالت کا شاہ کار ہے۔

اعتراض نمبر ۳۱۰

واٹ نے سارا زور اس بات پر لگایا ہے کہ شمال کی بازنطینی سلطنت کے خلاف شروع سے ہی گویا اپنے معاشی وتجارتی مقاصد کے تحت آپ ﷺ جارحانہ عزائم رکھتے تھے، وہ کہتا ہے ''عربوں پر حکمرانی کے لیے آپ ﷺ پر لازم تھا کہ قبائل کی آویزش کا خاتمہ کیا جائے لیکن اس کے لیے اس قدر کافی نہ تھا کہ خون کے اصول پر اصرار کیا جائے۔ یہ بھی ضروری تھا کہ ایک کثیر آبادی کی جنگ جنگجویانہ قوتوں کی نکاسی کے لیے کوئی (متبادل) راستہ مہیا کیا جائے۔ آپ ﷺ کو یقین تھا کہ یہ راستہ شمال کی طرف سے ہو کر گزرتا ہے''۔

جواب: اسلامی مورخین کے بیان کے مطابق عرب کے شمالی عیسائی قبائل کے ساتھ جھگڑے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ حضور ﷺ نے صلح حدیبیہ کے بعد ان قبائلی سرداروں کو دعوتی وہ تبلیغی خطوط لکھے بعض روایات کے مطابق کم از کم ایک سو چار خطوط لکھے گئے تھے۔ قیصر روم کے نام آپ ﷺ کا خط بخاری شریف میں مکمل متن کے ساتھ موجود ہے اسی طرح ایک خط حاکم بصریٰ کے نام تھا، جس کو حارث بن عمر لے کر گئے تھے، جنھیں حاکم غسان شرجیل بن عمرو نے قتل کر دیا تھا۔ آپ ﷺ نے عمرۃ القضا سے واپسی کے بعد ذات اطلح میں پندرہ مسلمانوں کو تبلیغ کے لیے روانہ کیا تھا، ان میں سے صرف کعب بن عمیرؓ بچ

پائے، باقی سب کو تہ تیغ کر دیا۔ سفیر کا قتل ہو یا ذات اطلح کا افسوس ناک حادثہ، سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مسلمانوں کے خلاف اعلان جنگ تھا، اب حکومت کی رٹ کو برقرار رکھنے کے لیے قصاص لینے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا غزوہ موتہ ایسے ہی سانحات کے ردعمل میں پیش آیا۔ واٹ اول تو مکاتیب نبوی کی تاریخی سند کو تسلیم نہیں کرتا اور اگر درست مانتا بھی ہے تو ان میں قبول اسلام کی دعوت، ضرور بعد کے لوگوں کی ایجاد ہیں کا شوشہ چھوڑتا ہے۔ یہ اس کی اپنی مرضی کا منحصر ہے جسے چاہیے مستند بنائے یا غیر مستند۔ دبے پاؤں اعتراف کرتا ہے کہ غزوہ موتہ کا ایک سبب شرجیل کا یعنی نبی کریم کے سفیر کو قتل کرنے کا ہوسکتا ہے، لیکن وہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ سب کچھ ثانوی حیثیت رکھتا ہے، اصل بات یہ ہے ”یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ سیاسی نقطہ نظر سے آپ ﷺ کی توجہ شمالی راستے کی جانب ہی مرکوز تھی“۔ المختصر یہ کہ رسول اللہ ﷺ اپنے عرب عوام کی جنگی صلاحیتوں کو ایک دوسرے کے خلاف ضائع ہونے سے بچانا چاہتے تھے، اس لیے آپ ﷺ نے اس مقصد کے لیے شمال کی عیسائی سلطنت کی طرف راستہ لیا۔ اس سے جہاں اسلامی سلطنت کے استحکام کو یقینی بنایا وہاں معاشی مسائل بھی حل کرنے کی ترکیب سوچی ۔۔۔ یہ پالیسی پیغمبرانہ نہ تھی اور وہ عام دنیا دار اور توسیع پسندی کے حامل سیاست دانوں کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے، جو اپنے عوام کی توجہ اندرونی مسائل سے ہٹا کر بیرونی محاذ پر چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں، اس کے علاوہ جذبہ حب الوطنی کے نعرے سے اپنی عوام کو متحد رکھتے ہیں۔ واٹ کہتا ہے ”اسلام روز اول سے ہی اپنی سرشت کے اعتبار سے ایک عالمی مذہب تھا اور اسلامی ریاست کی توسیع کے ساتھ ہی یہ ایک عالمی مذہبی بن گیا، لیکن یہ بات ناقابل یقین ہے کہ ایک ذہین ماہر سیاست ہوتے ہوئے ایک نازک موقعہ (صلح حدیبیہ کے موقعہ پر) اپنے سیاسی کردار کے اس مرحلہ پر آپ ﷺ نے (قبول اسلام کی) مخصوص دعوت پیش کی۔ اسلام یقیناً روز اول سے ہی ایک عالمی مذہب تھا، اس لحاظ سے اسے محض عربوں کی وحدت اور اصلاح، اس کا حتمی مقصد نہ تھا، اسلام کی تعلیمات بین الاقوامی اور آفاقی مزاج کی حامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف نسلوں، زبانوں اور علاقوں کے لوگ قبول اسلام کے بعد برابری کی سطح پر اسلامی برادری کے رکن بن گئے۔ دوسری قوموں کے خلاف خواہ مخواہ جنگ چھیڑ کر مسلم امہ میں وحدت پیش کرنے کی مصنوعی کوشش نہیں کی گئی۔ ایسی وحدت قائم کرنے کے لیے اسلامی اصول مواخات اور جاہلی عصبیت کے خلاف موثر اور مسلسل مہم ہی کافی تھی، اس بات کا اعتراف مشہور مستشرق ”فلپ کے ہٹی“ نے کیا ہے ”مدینہ میں مذہبی بنیادوں پر قائم ہونے والا بھائی چارہ بعد کے عالمی بھائی چارے (امہ) کی ہی ابتدائی شکل تھی۔“

لشکر اسامہؓ کی شام پر چڑھائی

ضمناً اعتراض

(۱) بعض حضرت اسامہؓ کے لشکر کو نہ بھیجنے کی رائے رکھتے تھے۔

(۲) مستشرقین اس مہم کو سرحدی جھڑپ سے زیادہ حیثیت نہیں دیتے (سیدنا ابو بکر ص ۲۸۶)

جواب: آپؐ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں حضرت اسامہ بن زیدؓ کی قیادت میں شام کو روانہ کیا۔ آپ نے جھنڈا خود اپنے ہاتھ سے باندھا۔ یہ لشکر ابھی مدینہ سے باہر مقام ''جرف'' میں پہنچا تھا کہ آپ سخت علیل ہوئے۔ یہ لشکر وہیں ٹھہر گیا۔ حتیٰ کہ آپؐ کا انتقال ہو گیا۔ آپ کی وفات کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ اس لشکر کو بھیجا جائے یا دوسرے ملکوں کی کاروائی کے لیے روک لیا جائے۔ اس بارے میں جناب صدیق اکبر نے فرمایا ''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہ اگر تمام مدینہ خالی ہو جائے اور میں تنہا رہ جاؤں اور درندے اور کتے مجھے کھانا شروع کر دیں میں اس وقت بھی اسامہ اور اس لشکر کو سرکار دو عالم ﷺ کے حکم کے مطابق اس مہم پر روانہ کروں گا۔ (صدیق اکبر ص ۲۷۴)

یہ سرحدی جھڑپ نہ تھی۔ قیصر روم نے بڑے بڑے پادریوں کو اکٹھا کیا اور کہا ''یہ وہی لوگ ہیں جن سے میں تم لوگوں کو ہر وقت خبردار کیا کرتا تھا لیکن تم نہیں مانتے تھے۔ تم ان عربوں کی ہمت کو دیکھتے ہو کہ ایک ماہ کی مسافت پر آ کر وہ تم پر حملہ کرتے ہیں اور کامیاب و کامران واپس چلے جاتے ہیں''۔ (بحوالا ابن عساکر صدیق اکبر ۲۸۶)

دوم: اس حملہ سے مرتدین گھبرا گئے۔ رومیوں کو دیکھ کر خود ہرقل بھی ڈر گیا۔ یہی وجہ ہے کہ دومۃ الجندل کے سوا عرب کے شمالی حصوں میں رہنے والوں نے مدینہ پر حملہ کرنے میں انتہائی تامل کیا حال آنکہ وہ مدینہ پر چڑھائی کا ارادہ کر چکے تھے۔

سوم: منٹگمری واٹ: ان کی اپنی رائے پیش کرتے ہیں ہیں جس سے مستشرقین کے الزام کی باطلانہ نیت ظاہر ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے ''پیغمبر اسلام ﷺ نے اس بات کو بہ خوبی محسوس کر لیا تھا جب تک شام کی طرف مہمیں روانہ نہیں کی جائیں گی۔ عرب قبائل پر امن نہیں رہ سکتے۔ ابو بکرؓ اس سیاسی اہمیت سے واقف تھے۔ اس وجہ سے باوجود شدید مخالفت کے اور سخت خطرات کے انھوں نے اسامہ کی زیر قیادت ایک بڑا لشکر روانہ کیا تھا''۔ (بہ حوالا انسائکلو پیڈیا آف اسلام جلد اص ۱۱)

چہارم: جنگ موتہ میں عرب اور شام کی سرحد کے ایک رئیس شرجیل بن عمرو نے رسول اللہ ﷺ کے قاصد کو سیدنا حارث بن عمیر کو قتل کیا تھا۔ اس کے انتقام کے لیے سیدنا زید بن حارثہ کی قیادت میں لشکر بھیجا۔ اسی لشکر کو سخت نقصان پہنچا۔ یکے بعد دیگرے تین جرنیل جعفر بن ابی طالب، عبداللہ بن رواحہ

اور زید بن حارثہ شہید ہوئے۔اس سے عیسائیوں کے حوصلے بڑھ گئے۔اس کے بعد آپ نے خود غزوہ تبوک کے لیے تیس ہزار فوج سے لشکر کشی کی۔اس مہم کا مقصد مذکورہ قاصد اور جرنیلوں کا انتقام تھا۔ نیز یہ بھی خطرہ تھا کہ کہیں رومی فوج عرب پر حملہ آور نہ ہو جائے۔رومی مقابلہ پر نہ آئے۔ جنگ کی جرأت نہ ہوئی۔مگر اس کے بعد ان کا رویہ سخت ہو گیا۔اس پر لشکر اسامہ کی روانگی کا آپؐ نے حکم فرمایا تھا۔ یہ جنگ تھی، سرحدی جھڑپ نہ تھی۔

اہل بقیع کے لیے آپ ﷺ کی دعائے مغفرت۔

''حضورؐ کے غلام حضرت ابومویہبہؓ سے مروی ہے کہ حضورؐ نے آدھی رات کو مجھے بیدار کیا اور فرمایا'' مجھے حکم ہوا ہے کہ اہل بقیع کے پاس جاؤں اور ان کے لیے استغفار کروں۔پھر مجھے ہمراہ لیا اور بقیع تشریف لا کر بہت دیر تک کھڑے استغفار کرتے رہے اور ان کے لیے ایسی دعا فرمائی کہ میں تمنا کرنے لگا کہ میں بھی ان اہل قبور میں سے ہوتا اور اس دعا سے مشرف یاب ہوتا۔اس کے بعد فرمایا:''السلام علیکم یا اہل القبور'' تمھیں وہ نعمتیں مبارک ہوں جن میں تم صبح وشام کرتے ہو اور جن میں تم رہتے ہو اور تم ان فتنوں سے دور ہو جن میں لوگ مبتلا ہیں اور حق تعالیٰ نے تم کو ان سے نجات دے دی ہے اور خلاصی فرمادی ہے۔ بلاشبہ ان پر سیاہ رات کی مانند فتنے امڈ امڈ کر آئیں گے اور اس کا آخری کنارا اول کے ساتھ ملا ہو گا اور پے در پے آئیں گے۔ان فتنوں کا آخری کنارا پہلے سے بدتر ہے۔اس کے بعد فرمایا''اے مویہبہؓ دنیا کے خزانوں کی کنجیاں مجھے پیش کی گئی ہیں اور مجھے اس کے درمیان مخیّر کیا گیا ہے کہ اگر چاہوں تو میں دنیا میں ہمیشہ ہمیشہ رہوں یہاں تک کہ جنت میں مراتب و درجات پاؤں یا پھر یہ کہ اپنے رب سے ملاقات کروں اور اس کی طرف جانے میں جلدی کروں۔میں نے اپنے رب کی ملاقات کو اختیار کیا ہے۔

ابومویہبہؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کی'' یا رسول اللہ! کچھ عرصہ دنیا میں اور اقامت فرمایے۔اس کے بعد جنت میں جائیے تاکہ آپؐ کی بہ دولت ہم بھی آسودہ رہیں۔فرمایا''اے مویہبہؓ! نہیں۔ میں نے اپنے رب کی ملاقات کو اختیار کر لیا ہے''۔ (مدارج النبوت ۔۲۔ ۴۸۸) بقیع میں تشریف لا کر اہل بقیع کے لیے دعا واستغفار کرنے میں ایک حکمت یہ ہے کہ جب حضورؐ نے زندوں کے لیے دعا ونصیحت فرمائی ہے اور ان کو پند ونصائح سے نوازا ہے تو اموات کو بھی دعا واستغفار سے سرفراز فرمایا ہے۔جیسا کہ ایک روایت میں ہے کہ صحابہؓ کی طرف متوجہ ہوئے جو موجود تھے فرمایا: دنیا سے گزر جانے والے تم سے بہتر ہیں۔

روحوں کے ساتھ مکالمے کا دروازہ کھل گیا۔

دور حاضر میں روحوں کے ساتھ مکالمہ کو جو دروازہ کھل گیا ہے اس علم کے اور عامل ہر دو فریق روحوں

کے ساتھ باتیں کرنے کے بعد دوسروں کو بتاتے ہوئے اعتراف کرتے ہیں کہ ''ارواح سے مکالمہ کا ادراک مکالمہ کرنے والوں کی روحانی قوت پر مبنی ہے'' یہ عاملین یہاں تک دعویٰ کرتے ہیں کہ ''مردہ کو روحوں کے ساتھ دو ایک سوالات ہی نہیں بل کہ اس سے زیادہ مکالمات بھی ممکن ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ مکالمات زندہ انسانوں کے ہیں، مردہ لوگوں کی روحوں کے درمیان اور معمولی طریق پر نہیں بل کہ ان مکالمات جہاں ماضی و مستقبل دونوں ڈانڈے مل جاتے ہیں وہاں زمان و مکان بھی حائل نہیں رہتے''۔

باایں ہمہ ابھی تک علم کے جاننے والے دوسروں کے سامنے علم الارواح کو ایسے واضح طریقے پر بیان کرنے سے قاصر ہیں جسے ہر درجہ کا انسان سمجھ سکے۔ جب موجودہ دور تمدن کی دریافت کا یہ حال ہے کہ ہمارے سامنے اس علم کے مدعی موجود ہیں جن کی تحقیق و تصدیق دوسرے ارباب علم و تنقید نے بھی کر دی ہو لیکن جس علم کی ہمہ گیری و پذیرائی کی یہ حالت ہو جو اوپر بیان کی گئی ہے تو پھر ہمارے اس انکار کی کیا وجہ ہے جو ابومویہبہ روایت کرتے ہیں؟ اگر ان روایات کے مطابق تسلیم کیا جائے کہ رسول خدا معنوی اور روحانی ہر دو لحاظ سے دوسروں سے زیادہ اسرار کائنات سے آگاہ تھے اور یہ حقائق مقابلہ آپ سے کہیں زیادہ منکشف ہو سکتے تھے تو یہ اعتراف کرنا ہی پڑے گا کہ آنحضرتؐ کے لیے قبل از وقت اپنی وفات پر آگاہی حاصل کرنا مشکل نہ تھا۔ (حیات محمد از ہیکل۔ ۵۱۵)

اعتراض نمبر ۳۱۱

بعض مورخین ابومویہبہؓ کی روایت کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ایسے حضرات کا اعتراض یہ ہے کہ جیش اسامہؓ کے توقف کا سبب آنحضرتؐ کی علالت نہ تھی بل کہ اکابر مہاجرین و انصار اسامہؓ کی نوعمری کی وجہ سے ان کی قیادت پر خفا تھے۔

جواب: پہلی دلیل:۔ اس میں دو رائے نہیں کہ حضرت اسامہؓ کی قیادت پر اختلاف تھا۔ اس سے قبل ان کے والد ماجد کی قیادت (غزوہ موتہ میں) پر بھی اختلاف ہوا تھا۔ اسامہؓ کی قیادت کے بارے آپؐ نے فرمایا، دوستو! اسامہؓ کے منصب پر اعتراض نہ کرو! قسم بجان خویش! آج جو تم اسامہ کی امارت پر حرف گیری کر رہے ہو اسامہؓ کے والد کی امارت پر بھی تم اسی طرح نکتہ چینی کرتے رہے لیکن اسامہ اسی طرح امارت کے لیے خلق ہوا ہے جس طرح اس کے والد زید امارت کے لیے پیدا ہوئے تھے''۔

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں ''میرے نزدیک حضرت زیدؓ بھی لوگوں میں بہت محبوب تھے اور ان کے فرزند حضرت اسامہؓ بھی ان کے بعد لوگوں میں مجھے زیادہ محبوب ہیں۔ دونوں کے ساتھ اچھا گمان ہے۔ اب میری وصیت ان کی شان میں بہ خوبی قبول کرو، وہ یہ ہے کہ وہ تم میں اخیار میں سے ہیں''۔ (مدارج النبوہ۔۲۔۴۸۳)

ابن حجر عسقلانی اصابہ میں لکھتے ہیں کہ ابن سعد کی روایت کے موافق ان کی عمر ۲۰ سال تھی اور ایک روایت میں ۱۸ سال بھی ہے۔اس پر بعض لوگوں نے اختلاف کیا کہ کم عمر لڑکے کو اتنی بڑی فوج پر امیر مقرر کیا گیا ہے اور بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اختلاف ان کے غلام ہونے پر تھا کہ ایسے بڑے بڑے مہاجرین وانصار پر امیر مقرر کر دیا گیا ہے۔ابن ہشام نے کہا لوگوں نے اسامہؓ کی امارت میں اس لیے طعن کیا تھا کہ وہ آزاد کردہ غلام کے بیٹے اور عمر میں چھوٹے تھے۔بعض کہتے ہیں کہ منافقوں نے اسامہ کے متعلق باتیں بنائی تھیں۔

مصنف (اصح السیر ۔۵۰۲) حاشیہ پر لکھتے ہیں گو بہ ظاہر اعتراض کم سنی کی وجہ سے ہو مگر اصل وجہ طعن کی یہی تھی کہ یہ غلام تھے اسی لیے حضورؐ نے فرمایا کہ تم اسامہؓ پر آج طعن کر رہے ہو مگر اس سے پہلے زید بن حارثہ کے امیر ہونے پر بھی طعن کر چکے ہو یعنی اگر عمر میں کم ہیں تو زیدؓ تو کم عمر نہیں تھے۔حضورؐ کے غصہ کی وجہ بھی یہی تھی جو اس طعن سے معلوم ہوا کہ اب تک انصاب پر فخر کا خیال باقی ہے حال آنکہ اصل چیز دیکھنے والی اہلیت ہے جو زیدؓ میں بھی ہے اور اسامہؓ میں بھی ہے۔(واللہ اعلم)

آپؐ کے نزدیک حضرت اسامہؓ کو سپہ سالار بنانے میں چند امور محرک تھے۔

ا:حضرت اسامہؓ کو ان کے والد سیدنا زید بن حارثہ کا نائب بنانا تھا جو اسی مقام پر انھی عیسائیوں کے ہاتھوں جنگ موتہ میں شہید ہوئے تھے تاکہ اپنے باپ کا بدلہ لے سکیں اور ان کو اپنے والد کی شہادت کے صلے میں فتح کا شرف حاصل ہو۔

۲: اسلامی ریاست کی مہمات میں نوجوانوں کو متعین کر کے انھیں مصائب وآلام کے برداشت کرنے کے قابل بنایا جائے نیز آپؐ پھر سے تمام امتیازات کو ختم کرنا چاہتے تھے کہ دیکھیں کہ اسامہ کی سپہ سالاری پر سوالات اٹھائے جاتے ہیں کہ نہیں جیسا کہ ان کے والد کے بارے اعتراض ہوا تھا تو کیا اب ان کے بیٹے پر بھی اعتراض کیا جائے گا۔اس اعتراض کی جو وجوہ ہوں اس میں شاندار اسلامی جمہوریت کا اظہار ہوتا ہے۔کالے کو گورے اور گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔بڑے بڑے مہاجر وانصاری صحابہ کی موجودگی میں اسامہؓ کو سپہ سالار بنا کر ایک بار پھر سے فخر ومباہات کے بت کو پاش پاش کر دیا۔نیز اسلامی تعلیمات کے اصولوں کو اجاگر کر دکھایا اور اپنے اصحاب کو اس عمل پر پیروی کی تعلیم دے دی کہ بیٹے کو اپنے باپ کا بدلہ لینے کے لیے باقی مسلمان اس کی حمایت کریں۔ایسا نہ ہو کہ اسے برتری کے زعم میں نظر انداز کر دیا جائے۔گورے اور کالے،امیر وغریب کے قتل میں کوئی فرق نہیں ،ہر ایک کا بدلہ لیا جائے گا۔

حضرت اسامہؓ کے والد زید بن حارثؓ شام کے عربوں کے ہاتھوں شہید ہوئے تھے،ان قبائل

سے انتقام لینا ضروری تھا۔ آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو اس مہم میں شامل ہونے کی ترغیب دی اور حضرت اسامہؓ کو امیر لشکر مقرر کر کے روانگی کا حکم دیا۔ چونکہ اس لشکر میں کبائر صحابہ کی موجودگی میں اس لڑکے کو کیوں ترجیح دی جا رہی ہے حالانکہ جن لوگوں نے یہ اعتراض کیا بظاہر حقیقت ان کی نظروں سے دور تھی۔ وہ شاید یہ نہ سمجھ سکے کہ یہ مہم انتقامی نوعیت کی تھی، اپنے باپ کا بدلہ لینے کے لیے بیٹے سے بہتر اور کون ہو سکتا ہے؟ نیز قیادت کی صلاحیت کم عمری کے آڑے نہیں آتی۔ تاریخ عالم میں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ محمد بن قاسم کی عمر سترہ برس تھی جب اس نے راجہ داہر کے خلاف لشکر کشی کی تھی۔ بابر نے اقتدار سنبھالا تو اس کی عمر بارہ برس تھی، اسی طرح بختیار خلجی نے جب بہار اور بنگال فتح کیا تو وہ سترہ برس کے تھے۔

ہیکل (حیات محمد۔ ۵۱۵) لکھتے ہیں کہ اگر ہم ایسے مورخین کی (اس) رائے پر تنقید نہ کریں جس (رائے) کا مبنی ابو مویہبہؓ کی روایت ہے تب بھی جیش اسامہ کے اسباب توقف کو توجہ کا مرکز بنانا نامناسب ہے ماسوائے اس ایک وجہ تعویق کے۔ رسول اللہ ﷺ کا شب کے وقت گورستان بقیع میں تشریف لا کر موتہ کے لیے دعائے مغفرت کرنا، محض اس بنا پر تھا کہ آنحضرتؐ کو اپنی وفات کے قریب تر ہونے کا احساس ہو چکا تھا جسے ایسے مورخ نظر انداز کر رہے ہیں۔ (ہیکل کا یہ کہنا کہ وفات کے قریب ترین ہونے کا احساس ہو چکا تھا محل نظر ہے کیوں کہ آپ تو خود اس کا اعلان پہلے فرما چکے تھے خطبہ حجۃ الوداع میں فرمایا ''اے لوگو! میں جو کچھ کہوں اسے بہ گوش ہوش سنو۔ شاید آئندہ سال اور اس کے بعد پھر کبھی میری تمھاری ملاقات نہ ہو سکے!)

اپنے آخری خطبہ میں فرمایا ''اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کو اختیار دے دیا کہ وہ دنیا و عقبیٰ اور خدا کی نعمت دونوں میں سے کسی ایک کو اپنے لیے منتخب کر لے مگر اللہ کے اس بندے نے خدا کی ملاقات کو ترجیح دی ہے''۔ (حوالہ بالا۔ ۵۱۷)

شہداء احد کی قبروں پر اس طرح نماز پڑھی جیسے میت پر نماز پڑھی جاتی ہے۔ پھر پلٹ کر منبر پر رونق افروز ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ میں تمھارا پیش رو تم سے پہلے وفات پانے والا ہوں اور تمھارا گواہ ہوں اور میں خدا کی قسم اپنے حوض کو اس وقت دیکھ رہا ہوں۔ (سیرت مصطفے از عبد المصطفے اعظمی) یعنی آپؐ کو اپنی موت کا علم تھا کہ کب آئے گی۔

واقعہ قرطاس

وفات سے چار دن پہلے جمعرات کو آپؐ نے فرمایا کہ دوات کاغذ لاؤ۔ میں تمھارے لیے ایک تحریر لکھ دوں جس کے بعد تم گم راہ نہ ہوں گے۔ بعض صحابہؓ نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا کہ رسول اللہ ﷺ کو مرض کی شدت ہے اور تمھارے پاس قرآن مجید ہے جو ہمارے لیے کافی ہے۔ اس پر حاضرین میں اختلاف پیدا

ہوا۔بعض کہتے تھے کہ تعمیل ارشاد کی جائے بعض کچھ اور کہتے تھے۔اختلاف اور شوروغل زیادہ ہوا تو بعض نے کہا خود آپ سے دریافت کرلو،لوگ جب پوچھنے لگے تو آپ نے فرمایا ”مجھے چھوڑ دیں میں جس مقام میں ہوں وہ اس سے بہتر ہے جس کی طرف تم بلاتے ہو۔

صحیح مسلم کی دوسری روایتوں میں یہ الفاظ ہیں ”فقالوا ان رسول اللہ ﷺ یھجر“ تو لوگوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ بے حواسی کی باتیں کرتے ہیں۔فقالو ھجرا استفھموہ“ تو لوگوں نے کہا کیا آپ بے حواسی کی باتیں کرتے ہیں آپ سے خود پوچھ لو“۔صحیح بخاری میں جن صحابی نے قلم دوات لانے میں گفت گو کی ان کا نام نہیں لیکن صحیح مسلم میں بتصریح حضرت عمرؓ کا نام ہے۔ اس روایت سے شیعہ وسنی میں بحث چھڑ گئی۔شیعہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ حضرت علیؓ کی خلافت کا فرمان لکھوانا چاہتے تھے جب کہ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ آپؐ کو واقعی تکلیف تھی اور یہ معلوم تھا کہ شریعت کے متعلق کوئی شے باقی نہیں رہی۔ خود قرآن مجید میں ”الیوم اکملت لکم دینکم“ نازل ہو چکی ہے۔

بخاری میں آپ عبداللہ بن ابوبکرؓ کو بلا کر خلافت ابو بکر کا فرمان لکھوانا چاہتے تھے پھر آپؐ نے ضروری نہیں سمجھا اور فرمایا کہ خود خدا اور اہل اسلام ابوبکرؓ کے سوا کسی کو پسند نہیں کریں گے۔ مذکورہ اختلاف کے بارے چند امور قابل غور ہیں جس سے مسئلہ کی پیچیدگی ختم ہو جائے گی۔

اول: اگر ”ایتونی بقرطاس“ یعنی امر کے صیغہ سے وجوب ثابت ہوتا ہے اور سیدنا عمرؓ نے رسول ﷺ کے فرمان کی تعمیل نہیں کی جو گناہ ہے۔اس کے ساتھ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ خطاب صرف عمرؓ کو نہیں ہوا تھا یہ حکم سب کے لیے ہوا تھا۔جس میں حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ بھی شامل تھے اور آپؐ حضرت علیؓ کی خلافت کا فرمان لکھوانا چاہتے تھے تو یہ گناہ ان کے زیادہ ذمہ لگتا ہے۔کیوں کہ نہ دوات قلم فراہم کی اور خلافت کا پروانہ نہ لکھوایا۔

دوم: ”ھجر“ کے معنی ہذیان کے ہی نہیں ہوتے بلکہ ھجر کے معنی جدائی اور فراق کے بھی ہیں۔ یہاں یہی معنی قرین قیاس ہیں کہ آپؐ جدائی اختیار کر رہے ہیں۔اس کے بارے میں آپ سے پوچھ لو۔

سوم: آپؐ حضرت علیؓ کی خلافت کا فرمان لکھوانا چاہتے تھے تو یہ بدیہی غلط ہے کیوں کہ اگر غدیر خم میں ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ کی موجودگی میں علیؓ کی خلافت کا اعلان ہو چکا تھا تو اب لکھوانے کی ضرورت کیا تھی؟ نیز اگر رسول اللہ ﷺ نے غدیر خم کے خطبہ میں سیدنا علیؓ کی خلافت کا اعلان کیا ہوتا یا مرض الموت میں آپ کو سیدنا علیؓ کی خلافت کی تحریر لکھوانا مقصود ہوتی تو سیدنا عباسؓ سیدنا علیؓ کو کبھی نہ کہتے کہ آؤ رسول اللہ ﷺ سے عرض کریں کہ وہ ہمارے لیے خلافت کی وصیت کر جائیں۔مگر سیدنا علی نے یہ کہہ کر انکار کر دیا ”بہ خدا! اگر رسول اللہ ﷺ نے انکار کر دیا تو پھر آیندہ کوئی امید باقی نہ رہے گی۔(

تفہیم البخاری۔۶۔۲۔۵۷۲)

چہارم: یہ واقعہ آپؐ کی رحلت سے چار روز قبل کا ہے۔اتنے دن بقید حیات رہے یعنی چار روز تک ،مگر کسی نے اس بارے میں نہیں پوچھا اور نہ ہی آپؐ نے دوبارہ اس قصہ کو دہرایا۔اگر کوئی ضروری فرمان ہوتا تو لازمی طور پر آپ اپنے صحابہؓ کو بتا دیتے یا لکھوا دیتے۔ارشاد ربانی ہے ''جو اللہ کے پیغاموں کو پہنچاتے ہیں اور اسی سے ڈرتے ہیں اور اس کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے اور اللہ بس ہے حساب (اعمال) کے لیے'' (الاحزاب۔۳۹)

اسی سورہ کی آیت ۴۵۔۴۶ میں ہے ''اے نبی! ہم نے تجھ کو بتانے والا' خوش خبری سنانے والا' ڈرانے والا' خدا کی طرف اس کے حکم سے بلانے والا اور روشن کرنے والا چراغ بنا کر بھیجا''۔

نبی کا کام اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیے گئے احکامات کو پہنچانے والا' سکھانے والا' حکم دینے والا' روکنے والا ہوتا ہے۔اگر کوئی ایسا امر ہوتا ہے تو ضرور بالضرور لوگوں تک پہنچاتے۔ نبی مبین (بیان اور شرح کرنے والا) ہوتا ہے۔وہ کسی چیز کو چھپاتا نہیں ہے۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شدت مرض کی وجہ سے یہ سب کچھ تھا۔

جناب ابن عباسؓ کی رائے: (وہ وفات رسول پر تیرہ سال کے تھے) ان لوگوں نے کیسی غفلت برتی جو بیش قیمت نصائح سے محروم رہ گئے۔کاش! رسول اللہؐ کے املاء کرنے میں سبقت کرتے!

جناب عمرؓ کی رائے: ''آنحضرت ﷺ کی رحلت کے بعد بھی اپنی اس رائے کی تحسین فرماتے رہے اس لیے کہ قرآن اپنے متعلق مَا فَرَّ طنَا فِی الکِتَابِ مِن شَیٔ (۶ : ۳۸) فرماتا ہے۔(حیات محمد ہیکل۔۵۲۰) اپنے اس فعل (فرمان لکھوانے) پر انھیں پچھتاوا نہیں تھا اور نہ وہ اپنی غلطی سمجھتے تھے کیوں کہ بعد ازاں کبھی بھی اس بات پر نادم نہ ہوئے جیسا کہ پہلے صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت عمرؓ اور رسول اللہ ﷺ میں مکالمہ ہو چکا تھا جس کا احساس مدت العمر رہا۔حضرت عمرؓ بارگاہ نبوی میں حاضر ہوتے ہیں اور عرض کرتے ہیں۔

عمرؓ: کیا آپ اللہ کے رسول ﷺ نہیں؟

رسول اللہؐ: کیوں نہیں۔

عمرؓ: کیا ہم مسلمان نہیں؟

رسول اللہؐ: کیوں نہیں۔

عمرؓ: کیا وہ مشرک نہیں؟

رسول اللہؐ: کیوں نہیں۔

عمرؓ: پھر ہم کیوں اپنے دین میں کم زوری قبول کر رہے ہیں؟

رسول اللہؐ: میں اللہ کا بندہ ہوں اور اس کا رسول ہوں۔ میں اس کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کروں گا اور نہ ہی وہ مجھے ضائع کرے گا۔

زہری نے بیان کیا کہ حضرت عمرؓ کہا کرتے تھے کہ اس روز میں نے رسول اللہؐ سے جو گفت گو کی تھی اس وجہ سے میں لگاتار صدقہ کرتا رہا، روزے رکھتا رہا، نمازیں پڑھتا رہا اور غلام آزاد کرتا رہا۔ اپنی اس گفتگو کے ڈر سے جو میں نے معاہدہ حدیبیہ کے موقعہ پر رسول اللہؐ سے کی تھی یہاں تک کہ مجھے امید ہوگئی معاملہ بخیر انجام پائے گا"۔ (سیرت النبی کامل مرتبہ ابن ہشام۔ ج ۲۔ ص ۳۷۷۔۳۷۸)

وصال مبارک

آنحضرتؐ کی تاریخ وفات میں اختلاف پایا جاتا ہے البتہ جن امور پر علماء کا اتفاق ہے۔ وہ یہ ہیں۔ اول سال وفات ۱۱ھ ہے۔ دوم مہینہ ربیع الاول کا تھا۔ سوم یکم سے ۱۲ ربیع الاول تک کوئی تاریخ تھی۔ چہارم دوشنبہ کا دن تھا۔ اس سلسلہ میں مولانا شبلی (سیرت النبی۔ ج ۲۔ ص ۱۱۲) حاشیہ لکھتے ہیں کہ ارباب سیّر کے ہاں تین روایتیں ہیں یکم ربیع الاول، دوم اور ۱۲ ربیع الاول۔ ان تینوں روایتوں میں باہم ترجیح دینے کے اصول روایت و درایت دونوں سے کام لینا ہے اور روایت دوم ربیع الاول کی، ہشام بن محمد سائب کلبی اور ابو مخنف کے واسطے سے مروی ہے۔ اس روایت کو اکثر قدیم مورخوں (مثلاً یعقوبی و مسعودی وغیرہ) نے قبول کیا ہے لیکن محدثین کے نزدیک یہ دونوں مشہور دروغ گو اور غیر معتبر ہیں۔ یہ روایت واقدی سے بھی ابن سعد و طبری نے نقل کی ہے (جزءوفات) لیکن واقدی کی مشہور ترین روایت جس کو اس نے متعدد اشخاص سے نقل کیا ہے وہ ۱۲ ربیع الاول کی ہے۔ البتہ بیہقی نے دلائل میں مسند صحیح سلیمان التیمی سے دوم ربیع الاول کی روایت نقل کی ہے (نور النبر اس ابن سید الناس، وفات) لیکن یکم ربیع الاول کی روایت ثقہ ترین ارباب سیر موسیٰ بن عقبہ سے اور مشہور محدث امام لیث مصری سے مروی ہے۔ امام سہیلی نے روض الانف میں اسی روایت کو اقرب الی الحق لکھا ہے اور سب سے پہلے امام مذکور ہی نے روایتاً اس نکتہ کو دریافت کیا کہ ۱۲ ربیع الاول کی روایت قطعاً نا قابل تسلیم ہے کیوں کہ وہ باتیں یقینی طور پر ثابت ہیں، روز وفات دوشنبہ کا دن تھا۔ اس سے تقریباً تین مہینے پہلے ذوالحجہ ۱۰ھ روز جمعہ سے ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ تک حساب لگاؤ، ذی الحج، محرم، صفر ان تینوں مہینوں کو خواہ ۲۹، ۲۹ خواہ ۳۰، ۳۰ کسی حالت اور کسی شکل سے ۱۲ ربیع الاول کو دوشنبہ کا دن نہیں پڑ سکتا۔ اس لیے درایتاً بھی یہ تاریخ قطعاً غلط ہے۔ دوم ربیع لاول کے حساب سے اس وقت دوشنبہ کا دن پڑ سکتا ہے جب تینوں مہینے ۲۹ کے ہوں۔ جب دو پہلی صورتیں نہیں ہیں تو اب صرف تیسری صورت رہ گئی ہے جو کثیر الوقوع ہے یعنی یہ کہ دو مہینے ۲۹ کے اور ایک

مہینہ ۳۰ کا لیا جائے۔ اس حالت میں یکم ربیع الاول کو دوشنبہ کا روز واقع ہوگا اور یہی ثقہ اشخاص کی روایت ہے۔ ذیل کے نقشہ سے معلوم ہوگا کہ ۹ ذوالحجہ کو جمعہ ہو تو اوائل ربیع الاول میں اس حساب سے دوشنبہ کس کس دن واقع ہوسکتا ہے۔

نمبر شمار	صورت مفروضہ	دوشنبہ	دوشنبہ	دوشنبہ
۱	ذی الحجہ، محرم اور صفر سب ۳۰ دن کے ہوں	۶	۱۳	--
۲	ذی الحجہ، محرم اور صفر سب ۲۹ دن کے ہوں	۲	۹	۱۶
۳	ذی الحجہ ۲۹ محرم ۲۹ اور صفر سب ۳۰ دن کے ہوں	۱	۸	۱۵
۴	ذی الحجہ ۳۰ محرم ۲۹ صفر ۲۹ کا ہو	۱	۸	۱۵
۵	ذی الحجہ ۲۹ محرم ۳۰ صفر ۲۹ کا ہو	۱	۸	۱۵
۶	ذی الحجہ ۳۰ محرم ۲۹ صفر ۳۰ کا ہو	۷	۱۴	--
۷	ذی الحجہ ۳۰ محرم ۳۰ صفر ۲۹ کا ہو	۷	۱۴	--
۸	ذی الحجہ ۲۹ محرم ۳۰ صفر ۳۰ کے ہوں	۷	۱۴	--

ان مفروضہ تاریخوں میں سے ۶، ۷، ۸، ۱۳، ۱۴، ۱۵ خارج از بحث ہیں کہ علاوہ اور وجوہ کے ان کی تائید میں کوئی روایت نہیں، رہ گئیں یکم اور دوم تاریخ صرف ایک صورت میں پڑسکتی ہے جو خلاف اصول ہے۔ یکم تاریخ تین صورتوں میں واقع ہوسکتی ہے اور تینوں کثیر الوقوع ہیں اور روایت ثقات ان کی تائید میں ہیں اس لیے وفات نبوی کی صحیح تاریخ ہمارے نزدیک یکم ربیع الاول ۱۱ھ ہے اس حساب میں فقط رویت ہلال کا اعتبار کیا گیا ہے جس پر اسلامی قمری مہینوں کی بنیاد ہے۔ اصول فلکی سے ممکن ہے کہ اس پر خدشات وارد ہوسکتے ہوں۔ کتب تفسیر میں تحت آیت (الیوم اکملت لکم دینکم) حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ اس آیت کے یوم نزول (۹ ذی الحجہ ۱۰ھ سے روز وفات تک ۸۱ دن ہیں)۔ ہمارے حساب سے ۹ ذی الحجہ ۱۰ھ سے لے کر یکم ربیع الاول تک دو ۲۹ اور ایک مہینہ ۳۰ لے کر جو ہماری مفروضہ صورت ہے پورے ۸۱ دن ہوتے ہیں۔ (یعنی ذوالحج کے ۲۲ محرم وصفر کے ۲۹، ۲۹ اور ربیع الاول یکم = ۸۱ دن)

ابونعیم نے بھی دلائل میں بہ سند یکم ربیع الاول تک تاریخ وفات نقل کیا ہے۔ سید فیض الرسول شاہ ایم فل سکالر لکھتے ہیں کہ بخاری شریف میں ہے سیدنا عمرؓ (نبی کریم کا یوم ولادت اور یوم وصال)

روایت کرتے ہیں کہ ایک یہودی نے ان سے کہا کہ اے امیر المومنین! آپ کی کتاب (قرآن) میں ایک آیت ہے جس کی آپ تلاوت کرتے ہیں اگر وہ آیت ہم یہودیوں پر نازل ہوتی تو ہم اس دن عید مناتے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا وہ کون سی آیت ہے؟ یہودی کہنے لگا وہ آیت ''الیوم اکملت لکم دینکم واتممت نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا'' ترجمہ: '' آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمھارے لیے اسلام کو پسند کیا''۔ (یہودی کہنا چاہتا تھا کہ ''اکملت دین'' پر ہم ایسی خوشی مناتے جیسا کہ یوم عید ہو)

حضرت عمرؓ نے فرمایا ہم اس دن اور اس مقام کو پہنچانتے ہیں جب یہ آیت مبارک نازل ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ اس دن عرفات کے میدان میں تھے اور جمعہ کا دن تھا۔ (یعنی ۹ ذوالحجہ یوم عرفہ) جمعہ ہونے کے سبب عید کا دن تھا۔

تمام امت مسلمہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ نبی کریم نے خطبہ حج ۹ ذوالحج ۱۰ ہجری کو دیا جسے خطبہ حجۃ الوداع کہا جاتا ہے۔ اس خطبہ کے چند ماہ بعد ۱۱ ہجری میں آپؐ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے یعنی ربیع الاول ۱۱ ہجری میں آپ ﷺ کا وصال مبارک ہوا۔ اب ربیع الاول کی ۱۲ تاریخ کو دیکھا جائے تو ۱۲ ربیع الاول کو پیر نہیں پڑتا۔ لہذا آپ کا انتقال ۱۲ ربیع الاول کو ثابت نہیں ہوتا۔ ممکنہ نقشہ سے آسانی سے معلوم ہو جائے گا۔

ذوالحجہ ۳۰، محرم ۳۰، اور صفر بھی ۳۰ دن کا ہو تو:

ذوالحج | محرم | صفر | ربیع الاول

جمعہ	۹	۱۶	۲۳	۳۰	ـ	۷	۱۴	۲۱	۲۸	ـ	۵	۱۲	۱۹	۲۶	ـ	۳	۱۰
ہفتہ	۱۰	۱۷	۲۴	ـ	۱	۸	۱۵	۲۲	۲۹	ـ	۶	۱۳	۲۰	۲۷	ـ	۴	۱۱
اتوار	۱۱	۱۸	۲۵	ـ	۲	۹	۱۶	۲۳	۳۰	ـ	۷	۱۴	۲۱	۲۸	ـ	۵	۱۲
پیر	۱۲	۱۹	۲۶	ـ	۳	۱۰	۱۷	۲۴	ـ	۱	۸	۱۵	۲۲	۲۹	ـ	۶	۱۳
منگل	۱۳	۲۰	۲۷	ـ	۴	۱۱	۱۸	۲۵	ـ	۲	۹	۱۶	۲۳	۳۰	ـ	۷	۱۴
بدھ	۱۴	۲۱	۲۸	ـ	۵	۱۲	۱۹	۲۶	ـ	۳	۱۰	۱۷	۲۴		۱	۸	۱۵
جمعرات	۱۵	۲۲	۲۹	ـ	۶	۱۳	۲۰	۲۷	ـ	۴	۱۱	۱۸	۲۵		۲	۹	۱۶

ذوالحجہ ۲۹ محرم ۲۹ صفر کا مہنہ بھی ۲۹ دن کا ہو تو

ذوالحج | محرم | صفر | ربیع الاول

جمعہ	۹	۱۶	۲۳	۱	ـ	۸	۱۵	۲۲	۲۹	ـ	۷	۱۴	۲۱	۲۸	ـ	۶
ہفتہ	۱۰	۱۷	۲۴	۲	۹	۱۶	۲۳	ـ	۱	۸	۱۵	۲۲	۲۹	ـ	۷	۱۴

اتوار	۱۱	۱۸	۲۵	۳	۱۰	۱۷	۲۴	ـ	۲	۹	۱۶	۲۳	ـ	۱	۸	ـ
پیر	۱۲	۱۹	۲۶	۴	۱۱	۱۸	۲۵	ـ	۳	۱۰	۱۷	۲۴	ـ	۲	۹	ـ
منگل	۱۳	۲۰	۲۷	۵	۱۲	۱۹	۲۶	ـ	۴	۱۱	۱۸	۲۵	ـ	۳	۱۰	ـ
بدھ	۱۴	۲۱	۲۸	۶	۱۳	۲۰	۲۷	ـ	۵	۱۲	۱۹	۲۶	ـ	۴	۱۱	ـ
جمعرات	۱۵	۲۲	۲۹	۷	۱۴	۲۱	۲۸	ـ	۶	۱۳	۲۰	۲۷	ـ	۵	۱۲	ـ

ذوالحجہ۲۹ محرم۲۹ سفر کا مہینہ بھی ۳۰ دن کا ہوتو

ذوالحج　　محرم　　صفر　　ربیع الاول

جمعہ	۹	۱۶	۲۳	۱	ـ	۸	۱۵	۲۲	۲۹	ـ	۷	۱۴	۲۱	۲۸	ـ	۵	۱۲
ہفتہ	۱۰	۱۷	۲۴	۲	۹	۱۶	۲۳	ـ	۱	۸	۱۵	۲۲	۲۹	ـ	۶	۱۳	
اتوار	۱۱	۱۸	۲۵	۳	۱۰	۱۷	۲۴	ـ	۲	۹	۱۶	۲۳	۳۰	ـ	۷	ـ	
پیر	۱۲	۱۹	۲۶	۴	۱۱	۱۸	۲۵	ـ	۳	۱۰	۱۷	۲۴	ـ	۱	۸	ـ	
منگل	۱۳	۲۰	۲۷	۵	۱۲	۱۹	۲۶	ـ	۴	۱۱	۱۸	۲۵	ـ	۲	۹	ـ	
بدھ	۱۴	۲۱	۲۸	۶	۱۳	۲۰	۲۷	ـ	۵	۱۲	۱۹	۲۶	ـ	۳	۱۰	ـ	
جمعرات	۱۵	۲۲	۲۹	۷	۱۴	۲۱	۲۸	ـ	۶	۱۳	۲۰	۲۷	ـ	۴	۱۱	ـ	

ذوالحجہ۳۰ محرم۲۹ سفر کا مہنہ بھی ۲۹ دن کا ہوتو

ذوالحج　　محرم　　صفر　　ربیع الاول

جمعہ	۹	۱۶	۲۳	۳۰	ـ	۷	۱۴	۲۱	۲۸	ـ	۶	۱۳	۲۰	۲۷	ـ	۵	۱۲
ہفتہ	۱۰	۱۷	۲۴	ـ	۱	۸	۱۵	۲۲	۲۹	ـ	۷	۱۴	۲۱	۲۸	ـ	۶	۱۳
اتوار	۱۱	۱۸	۲۵	ـ	۲	۹	۱۶	۲۳	ـ	۱	۸	۱۵	۲۲	۲۹	ـ	۷	۱۴
پیر	۱۲	۱۹	۲۶	ـ	۳	۱۰	۱۷	۲۴	ـ	۲	۹	۱۶	۲۳	۲۹	ـ	۱	۸
منگل	۱۳	۲۰	۲۷	ـ	۴	۱۱	۱۸	۲۵	ـ	۳	۱۰	۱۷	۲۴	۳۰	ـ	۲	۹
بدھ	۱۴	۲۱	۲۸	ـ	۵	۱۲	۱۹	۲۶	ـ	۴	۱۱	۱۸	۲۵	ـ	۳	۱۰	۱۷
جمعرات	۱۵	۲۲	۲۹	ـ	۶	۱۳	۲۰	۲۷	ـ	۵	۱۲	۱۹	۲۶	ـ	۴	۱۱	۱۸

ذوالحجہ۲۹ محرم۳۰ سفر کا مہنہ بھی ۲۹ دن کا ہوتو

ذوالحج　　محرم　　صفر　　ربیع الاول

جمعہ	۹	۱۶	۲۳	۱	ـ	۸	۱۵	۲۲	۲۹	ـ	۷	۱۴	۲۱	۲۸	ـ	۵	۱۲
ہفتہ	۱۰	۱۷	۲۴	۲	۹	۱۶	۲۳	ـ	۱	۸	۱۵	۲۲	۲۹	ـ	۶	۱۳	۲۰
اتوار	۱۱	۱۸	۲۵	۳	۱۰	۱۷	۲۴	ـ	۲	۹	۱۶	۲۳	۳۰	ـ	۷	۱۴	۲۱
پیر	۱۲	۱۹	۲۶	۴	۱۱	۱۸	۲۵	ـ	۳	۱۰	۱۷	۲۴	ـ	۱	۸	۱۵	۲۲

منگل	۱۳	۲۰	۲۷	۵	۱۲	۱۹	۲۶	ـ	۴	۱۱	۱۸	۲۵	ـ	۲	۹	۱۶	۲۳
بدھ	۱۴	۲۱	۲۸	۶	۱۳	۲۰	۲۷	ـ	۵	۱۲	۱۹	۲۶	ـ	۳	۱۰		
جمعرات	۱۵	۲۲	۲۹	۷	۱۴	۲۱	۲۸	ـ	۶	۱۳	۲۰	۲۷	ـ	۴	۱۱		

ذوالحجہ ۳۰ محرم ۲۹ سفر کا مہنہ بھی ۳۰ دن کا ہو تو

ذوالحج محرم صفر ربیع الاول

جمعہ	۹	۱۶	۲۳	۳۰	ـ	۷	۱۴	۲۱	۲۸	ـ	۶	۱۳	۲۰	۲۷	ـ	۴	۱۱
ہفتہ	۱۰	۱۷	۲۴	ـ	۱	۸	۱۵	۲۲	۲۹	ـ	۷	۱۴	۲۱	۲۸	ـ	۵	۱۲
اتوار	۱۱	۱۸	۲۵	ـ	۲	۹	۱۶	۲۳	ـ	۱	۸	۱۵	۲۲	۲۹	ـ	۶	۱۳
پیر	۱۲	۱۹	۲۶	ـ	۳	۱۰	۱۷	۲۴	ـ	۲	۹	۱۶	۲۳	۲۹	ـ	۷	۱۴
منگل	۱۳	۲۰	۲۷	ـ	۴	۱۱	۱۸	۲۵	ـ	۳	۱۰	۱۷	۲۴	۳۰	۱	۸	۱۵
بدھ	۱۴	۲۱	۲۸	ـ	۵	۱۲	۱۹	۲۶	ـ	۴	۱۱	۱۸	۲۵	ـ	۲	۹	۱۶
جمعرات	۱۵	۲۲	۲۹	ـ	۶	۱۳	۲۰	۲۷	ـ	۵	۱۲	۱۹	۲۶	ـ	۳	۱۰	۱۷

ذوالحجہ ۳۰ محرم ۳۰ سفر کا مہنہ بھی ۲۹ دن کا ہو تو

ذوالحج محرم صفر ربیع الاول

جمعہ	۹	۱۶	۲۳	۳۰	ـ	۷	۱۴	۲۱	۲۸	ـ	۵	۱۲	۱۹	۲۶	ـ	۴	۱۱
ہفتہ	۱۰	۱۷	۲۴	ـ	۱	۸	۱۵	۲۲	۲۹	ـ	۶	۱۳	۲۰	۲۷	ـ	۵	۱۲
اتوار	۱۱	۱۸	۲۵	ـ	۲	۹	۱۶	۲۳	۳۰	ـ	۷	۱۴	۲۱	۲۸	ـ	۶	۱۳
پیر	۱۲	۱۹	۲۶	ـ	۳	۱۰	۱۷	۲۴	ـ	۱	۸	۱۵	۲۲	۲۹	ـ	۷	۱۴
منگل	۱۳	۲۰	۲۷	ـ	۴	۱۱	۱۸	۲۵	ـ	۲	۹	۱۶	۲۳	۳۰	ـ	۸	۱۵
بدھ	۱۴	۲۱	۲۸	ـ	۵	۱۲	۱۹	۲۶	ـ	۳	۱۰	۱۷	۲۴		۲	۹	۱۶
جمعرات	۱۵	۲۲	۲۹	ـ	۶	۱۳	۲۰	۲۷	ـ	۴	۱۱	۱۸	۲۵		۳	۱۰	۱۷

ذوالحجہ ۳۰ محرم ۳۰ سفر کا مہنہ بھی ۲۹ دن کا ہو تو

ذوالحج محرم صفر ربیع الاول

جمعہ	۹	۱۶	۲۳	۳۰	ـ	۷	۱۴	۲۱	۲۸	ـ	۵	۱۲	۱۹	۲۶	ـ	۴	۱۱
ہفتہ	۱۰	۱۷	۲۴	ـ	۱	۸	۱۵	۲۲	۲۹	ـ	۶	۱۳	۲۰	۲۷	ـ	۵	۱۲
اتوار	۱۱	۱۸	۲۵	ـ	۲	۹	۱۶	۲۳	۳۰	ـ	۷	۱۴	۲۱	۲۸	ـ	۶	۱۳
پیر	۱۲	۱۹	۲۶	ـ	۳	۱۰	۱۷	۲۴	ـ	۱	۸	۱۵	۲۲	۲۹	ـ	۷	۱۴
منگل	۱۳	۲۰	۲۷	ـ	۴	۱۱	۱۸	۲۵	ـ	۲	۹	۱۶	۲۳	۳۰	ـ	۸	۱۵
بدھ	۱۴	۲۱	۲۸	ـ	۵	۱۲	۱۹	۲۶	ـ	۳	۱۰	۱۷	۲۴		۲	۹	۱۶

جمعرات	۱۵	۲۲	۲۹	ـ	۶	۱۳	۲۰	۲۷	ـ	۴	۱۱	۱۸	۲۵		۳	۱۰	۱۷

نوٹ: مذکورہ نقشہ میں دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ۱۲ ربیع الاول اتوار کے دن بنتی ہے۔ اسی طرح ذوالحجہ ۳۰، محرم ۳۰، صفر ۲۹ کا ہو تو ۱۲ ربیع الاول ہفتہ کے دن ہوتی ہے۔ اگر ذوالحجہ ۳۰ محرم وصفر ۲۹ دن کے ہوں تو ۱۲ ربیع الاول جمعہ کے دن پڑتی ہے۔ اگر ذوالحجہ ۲۹ اور صفر ۳۰ کا ہو یا ذوالحجہ ۲۹ محرم ۳۰ اور صفر ۲۹ دن کا ہو تو بھی یہی دن بنتا ہے۔ اگر ذوالحجہ ۲۹ محرم ۲۹ اور صفر بھی ۲۹ کا ہو تو حساب سے ۱۲ ربیع الاول جمعرات کے دن بنتی ہے۔ پیچھے مولانا شبلی نعمانی کے نقشہ صورت مفروضہ کے حساب سے پیر یکم ربیع الاول کو آتا ہے۔ ۱۲ ربیع الاول پیر کے دن کی تاریخ درست نہیں ہے اور مذکورہ نقشہ سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ ۱۲ ربیع الاول کو پیر کا دن نہیں پڑتا۔ (نقوش ۔۲۔ ۱۹۹) میں ہے کہ ابن سعد کا بیان ہے کہ ’’انخضرتؐ ۲۵ ذی قعدہ کو ہفتے کے دن مدینہ سے روانہ ہوئے‘‘۔

(WUSTENFELDS) نے ذیقعدہ ۱۰ کی پہلی تاریخ کو چہارشنبہ قرار دیا ہے جس کی رو سے ۲۵ کو ٹھیک ہفتہ پڑتا ہے جو روایت کے عین مطابق ہے ’’جب یہ قافلہ مرالظہر اں پہنچا تو دوشنبہ تھا‘‘۔ ابن عباسؓ اور جابرؓ کی روایت کے مطابق یہ ذوالحجہ کی ۴ تاریخ تھی۔ جابرؓ فرماتے ہیں ’’آنخضرتؐ ۴ ذوالحجہ کو تشریف لائے‘‘۔ عبداللہ بن عباس کا بیان ہے ’’اور آنخضرت نے حج کی تحلیل فرمائی تو آپ ۴ ذوالحجہ کو تشریف لائے‘‘۔ ویسٹن فیلڈ کے بہ موجب اگرچہ یہ دونوں بیانات صحیح ہیں کیوں کہ از روئے حساب ذوالحجہ ۱۰ کی پہلی تاریخ کو جمعہ تھا۔ اس لیے دوشنبہ کو ذوالحجہ کی چار تاریخ ہی ہونا چاہیے لیکن روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ اس سال حج جمعہ کو ہوا تھا (جیسا کہ اوپر بخاری شریف کی حدیث بیان ہوئی) یعنی جمعہ کو ۹ تاریخ تھی اور جمعہ ۲ ذوالحج کو پڑتا ہے نہ کہ یکم ذوالحج کو۔ جن کی رو سے دوشنبہ بجائے چار کے پانچ تاریخ کو ہونا چاہیے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ مکہ معظمہ میں ذوالحج کا چاند ۲۹ دن کا تسلیم کرکے بجائے جمعہ کے جمعرات کی پہلی تاریخ قرار دے دی گئی اور حج اسی حساب سے ادا کیا گیا تھا۔ یہ ایک دن کا فرق نہیں جو قمری مہینوں میں بنایا کوئی اہمیت رکھتا ہو۔ نشان زدہ جملہ محل نظر ہے۔ ایک دن کے فرق سے آنے والے واقعات کی ترتیب درست نہ رہنے سے اختلاف پیدا ہوتا ہے جس سے عوام میں فرقہ وارانہ اختلافات جنم لیتے ہیں جو ختم ہونے کا نام تک نہیں لیتے۔ مثلاً ایک گروہ کہتا ہے کہ مسلمانوں کے قربان جایئے کہ وصال نبی مکرم کے دن کو بھی جشن مناتے ہیں۔ جشن ولادت تو سمجھ آتا ہے لیکن وصال کے دن جشن منانے کے کیا معنی ہوئے۔

علماء کے نزدیک جن امور پر اتفاق ہے وہ یہ ہیں کہ آپؐ کی وفات کا سال ۱۱ھ ہے۔ ربیع الاول کا مہینہ تھا اور ربیع الاول کی کوئی تاریخ تھی۔ ربیع الاول کی کوئی تاریخ تھی اس پر تحقیق ہوئی۔ روایت و درایت سے ثابت کیا گیا کہ کسی صورت میں بھی آپ کا وصال ۱۲ ربیع الاول کو نہیں ہوتا جو آپؐ

کی تاریخ ولادت ہے، تاریخ وصال نہیں ہے۔ لہٰذا مخالفین کا وہ اعتراض جاتا رہا کہ مسلمان تو وصال نبی کا بھی جشن مناتے ہیں۔

اعتراض نمبر ۳۱۲

مستشرقین جولین کیلنڈر کے مطابق ۷ جون ۶۳۲ء کو تاریخ رحلت قرار دیتے ہیں۔

جواب: مارگولیتھ اور ایچ جی ویلز نے مذکورہ تاریخ ۷ جون ۶۳۲ء رحلت ٹھہرائی ہے جو اس لیے غلط ہے کہ ۷ جون ۶۳۲ء کو پیر کا دن نہیں پڑتا۔ روایات سے ثابت ہوتا ہے اور علماء کرام کا اس پر اتفاق ہے کہ آپ کا وصال دوشنبہ (پیر) کو ہوا یعنی ۷ جون ۶۳۲ء کو پیر کا دن نہیں پڑتا بلکہ پیر کا دن ۸ جون ۶۳۲ء کو آتا ہے۔

علامہ نور بخش توکلی بہ حوالا وفا الوفا (سیرت رسول عربی۔۱۶۰) پر لکھتے ہیں ''حضرت سلیمان تیمی ابتدائے مرض ۲۲ صفر کو ہوئی اور وفات شریف یوم دوشنبہ ۱۲ ربیع الاول کو ہوئی''۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ابو مخنف کا قول ہی معتمد ہے کہ وفات شریف ۱۲ ربیع الاول کو ہوئی۔ دوسروں کی غلطی کی وجہ ہوئی کہ ثانی کو ثانی عشر خیال کر لیا گیا پر اسی وہم میں بعضوں نے بعض کی پیروی کی۔ (رسول عربی پانچواں باب۔ ص ۱۶۰) پیچھے ذکر ہو چکا ہے کہ ۱۲ ربیع الاول صرف ایک صورت ہو سکتی ہے جو کہ خلاف اصول ہے یعنی سارے مہینے ۲۹ کے شمار کرنے ہوں گے جب کہ تین ماہ مسلسل نہ ۲۹ کے اور نہ ۳۰ کے ہوتے ہیں۔ پیچھے نقشہ ملاحظہ کریں۔

	ربیع الاول			صفر			
جمعہ	۱۲	۵	ـ	۲۰	۱۳	۶	ـ
ہفتہ	۱۳	۶	ـ	۲۱	۱۴	۷	ـ
اتوار	۱۴	۷	ـ	۲۲	۱۵	۸	۱
پیر	۱۵	۸	۱	۲۳	۱۶	۹	۲
منگل	۱۶	۹	۲	۲۴	۱۷	۱۰	۳
بدھ	۱۷	۱۰	۳	۲۵	۱۸	۱۱	۴
جمعرات	۱۸	۱۱	۴	۲۶	۱۹	۱۲	۵

ابتدائے مرض = ۲۲ اتوار

۲۳ پیر

	۲۴	منگل
	۲۵	بدھ
علم سازی/ واقعہ قرطاس	۲۶	جمعرات
	۲۷	جمعہ
روانگی لشکر کا حکم/ آخری خطبہ	۲۸	ہفتہ
شدت مرض	۲۹	اتوار
رحلت	یکم ربیع الاول	پیر

اعتراض نمبر ۳۱۳

بعض لوگ کہتے ہیں کہ وصال نبی کریم ﷺ کے دن کو بھی جشن مناتے ہیں۔جشن ولادت تو سمجھ میں آتا ہے لیکن وصال کے دن جشن منانا چہ معنی دارد مخالفین کا یہ الزام بہت قوی ہے کہ وصال کے دن جشن مناتے۔

جواب: لقد من اللہ علی المومنین اذ بعث فیھم رسولا (آل عمران۔۱۶۴) ترجمہ: تحقیق اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر احسان کیا ہے ان میں انہی سے رسول کو مبعوث فرمایا۔اس اللہ تعالیٰ کی نعمت کبریٰ کے یوم وصال کے سلسلہ میں عوام ابہام کا شکار ہیں خاص طور پر تقسیم ہند کے بعد تو کچھ افراد نے یوم ولادت کو ہی یوم وصال قرار دینے کی سر توڑ کوششیں کیں جو تا حال جاری ہیں۔لہذا اس سے عوام کو باخبر کر کے ان کے اذہان سے شک وشبہ کی گرہ کو کھولا جائے۔آقا کریم ﷺ کا یوم ولادت بارہ ربیع الاول شریف ہے لیکن یوم وسال بارہ ربیع الاول کو نہیں پڑتا۔صحابہ،تابعین تبع تابعین قرون اولیٰ سے عصر حاضر تک عرب وعجم کے مورخین ومحدثین اور موجودہ دور میں بھی مختلف مکاتب فکر کے کثیر اہل علم اور سیرت نگاروں کا موقف اور جمہور امت کا اتفاق رہا ہے کہ حضور ﷺ کا یوم ولادت بارہ ربیع الاول ہے اور وصال کی یہ تاریخ نہیں ہے۔

نمبر شمار	نام	تاریخ ولادت	یوم ولادت
۱	ابن جریر طبری	۱۲ ربیع الاول	پیر
۲	امام برہان الدین حلبی	۱۲ ربیع الاول	
۳	ابن حبان	۱۲ ربیع الاول	
۴	امام ابو بکر ابن ابی شیبہ	۱۲ ربیع الاول	پیر
۵	امام بیہقی	۱۲ ربیع الاول	پیر

۶	ابن ہشام	۱۲ربیع الاول	
۷	ابن حجر مکی	۱۲ربیع الاول	پیر

امام زرقانی (بحوالا ابن کثیر) کہتا ہے کہ یہ تاریخ ولادت جمہور کے نزدیک ہے ابن جوزی الجزار نے بھی اس پر اجماع نقل کیا ہے

۸	نواب محمد صدیق حسن	۱۲ربیع الاول	پیر
۹	علامہ محمد صادق سیالکوٹی	۱۲ربیع الاول	پیر
۱۰	مولانا اشرف علی تھانوی	۱۲ربیع الاول	
۱۱	سید سلیمان ندوی	۱۲ربیع الاول	پیر
۱۲	سید آل احمد رضی	۱۲ربیع الاول	پیر

ان کے علاوہ ابن سید الناس، ملا علی قاری، ابن خلدون محمد صادق ابرہیم، امام سخاوی، امام ذاہبی، امام ابوالحسن الماوردی، علامہ یوسف نبھانی وغیرہ نے بھی اپنی کتب میں ولادت بارہ ربیع الاول پیر کے دن عام الفیل کے سال تحریر فرمائی ہے۔

اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ آپ ﷺ کی تاریخ وصال ۱۲ ربیع الاول ہے تو اس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ ۱۲ ربیع الاول کو سرکار ﷺ کی ولادت کا دن خوشی اور دھوم دھام سے نہ منایا جائے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی ولادت اور وصال دونوں امت کے لیے باعث رحمت ہیں۔ امام مسلم حضرت ابوموسیٰ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے کسی امت پر رحمت کا ارادہ فرماتا ہے تو اس امت سے پہلے اس کے نبی کو اٹھا لیتا ہے اور اس نبی کو اس امت کے لیے اجر اور پیشرو بنا دیتا ہے جب کسی امت پر ہلاکت کا ارادہ فرماتا ہے تو اس نبی کی زندگی میں اس امت کو ہلاک کر کے اپنے نبی کی آنکھوں کو ٹھنڈک عطا کرتا ہے کیونکہ انہوں نے اس نبی کی تکذیب اور اس کی نا فرمانی کی ہے۔ (مسلم شریف ج۔۶۔ص۔۱۹) اس حدیث مبارکہ میں نبی مکرم ﷺ نے وصال کو بھی رحمت قرار دیا اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے کہ اس نے اس امت کے لیے حضور ﷺ کو شفیع بنا دیا جب یہ بات واضح ہوگئی کہ آپ ﷺ کا میلاد اور وصال دونوں رحمت میں امت کے لیے تو جو بڑی ہو خوشی اس کی کرنی چاہیے تو لازمی بات ہے کہ حضور ﷺ کی ولادت نعمت عظمیٰ ہے کیونکہ دوسری رحمت تو اس کے صدقے سے حاصل ہوئی اور پھر وصال کے بعد حزن کی وضاحت آپ ﷺ نے خود فرما دی۔ مسلم شریف میں ام حبیبہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے منبر پر جلوہ افروز ہو کر فرمایا جو عورت اللہ تعالیٰ اور روز آخرت پر ایمان رکھتی ہو اس کے لیے یہ جائز نہیں کہ کسی میت پر تین دن سے زیادہ سوگ کرے البتہ خاوند کی موت کی صورت

میں چار ماہ دس دن سوگ کرے۔۔۔اب اگر بارہ ربیع الاول کو سوگ منائیں کہ یہ سرکار کے وصال کا دن ہے تو فرمان خدا اور فرمان رسول کی خلاف ورزی ہو گی کیونکہ ولادت کی خوشی نہ منا کر اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکرادا نہ کیا اور غم کی صورت میں حدیث رسول کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوئے۔آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ تم سواد اعظم کی پیروی کرو جو اس سے الگ ہوا وہ جہنم میں گیا۔(ماہنامہ انوار لاثانی نومبر ۲۰۱۸)

الجامع الصحیح اللبخاری میں ہے کہ سیدنا عمر فاروقؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک یہودی نے ان سے کہا کہ اے امیر المومنین آپ کی کتاب،قرآن،میں ایک آیت ہے جس کی تم تلاوت کرتے ہو۔اگر وہ آیت ہم یہودیوں پر نازل ہوتی تو ہم اس دن کو عید مناتے۔حضرت عمرؓ نے فرمایا وہ کونسی آیت ہے؟ یہودی کہنے لگا وہ آیت ''الیوم اکملت لکم دینکم اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا'' ترجمہ: آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو پسند کیا۔(یہودی کہنا چاہتا تھا کہ ''اکملت دین'' پر ہم خوشی ایسی مناتے جیسا کہ یوم عید ہے) حضرت عمر فاروقؓ فرمانے لگے ہم اس دن اور اس مقام کو پہچانتے ہیں جب یہ آیت مبارک نازل ہوئی رسول اللہ ﷺ اس دن عرفات کے میدان میں تھے اور جمعہ کا دن تھا(یعنی ۹ ذوالحج یوم عرفہ جمعہ ہونے کے سبب عید کا دن تھا)

تمام امت مسلمہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خطبہ حج ۹ ذوالج دس ھ کو دیا جسے خطبہ حجۃ الوداع کہا جاتا ہے اس خطبہ کے چند ماہ بعد(۱۱ھ میں) آپ ﷺ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے یعنی ربیع الاول ۱۱ھ میں آپ ﷺ کا وصال مبارک ہوا۔اب حضرت عمر فاروقؓ والی حدیث کی روشنی میں دیکھتے ہیں کہ کیا پیر کے روز(جو احادیث مبارکہ میں واضح ہے کہ یہی نبی ﷺ کا یوم وصال ہے) ربیع الاول کی ۱۲ تاریخ بنتی ہے؟ ربیع الاول کی ۱۲ تاریخ کو دیکھا جائے تو قطعا ثابت نہیں ہوتا کہ یوم وصال ختم المرتبت ﷺ ہے کیونکہ صحیح احادیث کثیر سے ثابت ہے کہ یوم وصال ''پیر'' ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

کتابیات

۱۔ تفسیر ابنِ کثیر: حافظ عماد الدین ابوالفدا ابنِ کثیر مترجم خطیب الہند مولانا جونا گڑھی

۲۔ تفسیر ضیا القرآن: پیر محمد کرم شاہ

۳۔ تفہیم القرآن: سید ابوالاعلیٰ مولانا مودودی

۴۔ تبیان القرآن: علامہ غلام رسول رضوی

۵۔ کنز الایمان: صدر الفاضل سید محمد نعیم الدین مراد آبادی

۶۔ تفسیر کبیر: امام فخر الدین، محمد بن عمرازی، مترجم مفتی محمد خان قادری

۷۔ تفسیر روح الایمان: لعلامہ الالوسی البغدادی

۸۔ تفسیر فیوض الرحمان ترجمہ روح البیان: شیخ التفسیر الحدیث، حضرت مولانا مفتی فیض احمد اویسی رضوی

۹۔ تفہیم البخاری: شیخ الحدیث، علامہ غلام رسول رضوی

۱۰۔ موطا امام مالک: امام ابوعبداللہ مالک بن انس بن مالک مترجم ابوالعلا محمد محی الدین جہانگیر

۱۱۔ ترمذی شریف: امام ابوعیسیٰ، محمد بن عیسیٰ

۱۲۔ مسلم شریف: علامہ وحید الزماں

۱۳۔ نسائی شریف: امام عبدالرحمان احمد بن شعیب نسائی

۱۴۔ مشکوٰۃ شریف: فاضل شہیر مولانا عبدالحکیم خاں

۱۵۔ تدوین حدیث: مناظر احسن گیلانی

۱۶۔ ترجمان السنہ: حضرت مولانا بدرِ عالم صاحب میرٹھی

۱۷۔ الشفا: حضرت علامہ قاضی عیاض مکی

۱۸۔ الوفا: امام ابنِ جوزی

۱۹۔ سیرت النبی: علامہ شبلی نعمانی

۲۰۔ حیاتِ محمد ﷺ: محمد حسین ہیکل

۲۱۔ سیرتِ مصطفٰے: عبدالمصطفٰے اعظمی

۲۲۔ سیرتِ رحمۃ اللعالمین: قاضی سلیمان، محمد سلمان منصور پوری

۲۳۔ النبی الخاتم: شیخ مولانا منظر احسن گیلانی
۲۴۔ دلائل النبوۃ (اردو ترجمہ): ابوبکر احمد بن الحسین بیہقی
۲۵۔ السیرت النبویہ دھلانی: امام زینی دھلان
۲۶۔ سیرت خاتم النبیین: حکیم محمود احمد ظفر
۲۷۔ سیرتِ مصطفےٰ جانِ رحمت: امام احمد رضا خان بریلوی
۲۸۔ سیرتِ طیبہ: ڈاکٹر ربانی
۲۹۔ سید المرسلین: ڈاکٹر محمد الطیب النجار رئیس جامعہ الازہر مترجم رخسانہ جبین
۳۰۔ سیرتِ محمدیہ ترجمہ مواہب الدنیہ: حضرت امام احمد بن محمد بن ابی بکر الخطیب القسطلانی، ترتیب وتدوین جدید: محمد عبدالستار طاہر مسعودی
۳۱۔ سیرتِ سید الوریٰ: قاضی عبدالدائم دائم
۳۲۔ سیرت سہل السیر: مولانا حکیم ابوالبرکات عبدالرؤف دانا پوری
۳۳۔ پیغمبر اسلام: ڈاکٹر محمد حمید اللہ
۳۴۔ محمد رسول اللہ ﷺ: ڈاکٹر محمد حمید اللہ
۳۵۔ مدارج نبوت: حضرت علامہ شیخ محمد عبدالحق محدث دہلوی
۳۶۔ محمد رسول اللہؐ: پروفیسر محمد اکرم طاہر
۳۷۔ ضیاء النبیؐ: پیر کرم شاہ الازہری
۳۸۔ پیغمبرِ اعظم وآخر: ڈاکٹر نصیر احمد ناصر
۳۹۔ حیاتِ سرورِ کائنات: مارٹن لنگن مترجم (ابوبکر سراج الدین)
۴۰۔ سیرت ابنِ ہشام: مولانا عبدالجلیل صدیقی
۴۱۔ محمد ﷺ: مارٹن لنگس مترجم ابوبکر سراج الدین
۴۲۔ روحِ اسلام: سید امیر علی شاہ
۴۳۔ سیرۃ النبی (اعلان نبوت سے پہلے): مسعود مفتی منصور احمد بٹ
۴۴۔ نبی اکرمؐ کا گھرانہ: ڈاکٹر محمد اختر نواز
۴۵۔ امہات المومنین: حکیم محمود احمد ظفر
۴۶۔ امہات المومنین ومستشرقین: پروفیسر ظفر علی قریشی
۴۷۔ نقوش رسول نمبر: محمد طفیل

۴۸۔ محمد ﷺ: ریو مارکس ڈاؤس
۴۹۔ محمد اینڈ ہز پاور: پی۔ڈی۔لیسی جان سٹون
۵۰۔ جیول آف مدینہ: شیری جونز
۵۱۔ بلاوہ: قاضی عبدالدائم، دائم
۵۲۔ خطباتِ احمدیہ: سر سید احمد خاں
۵۳۔ قرآنِ پاک ایک ابدی معجزہ: سلطان بشیر محمود
۵۴۔ تاریخِ اسلام: شاہ معین الدین ندوی
۵۵۔ علوم اسلام اور مستشرقین: ڈاکٹر ثناء اللہ ندوی
۵۶۔ امیر المومنین حضرت علی: حکیم محمود احمد ظفر
۵۷۔ تاریخ الخلفا: حضرت علامہ جلال الدین سیوطی
۵۸۔ سو بڑے آدمی: مائیکل ہارٹ
۵۹۔ کائنات در کائنات: اختر کشمیری
۶۰۔ سیرتِ عائشہ صدیقہ: سید سلیمان ندوی
۶۱۔ مقالاتِ افغانی: شیخ الاسلام، محقق الاثر حضرت علامہ سید شمس الحق افغانی
۶۲۔ اسلام اور مستشرقین، مغرب کا اندازِ فکر: ڈاکٹر عبدالقادر جیلانی
۶۳۔ تمدنِ عرب: ڈاکٹر گستاؤلی بان، مترجم شمس العلما مولوی سید علی بلگرامی
۶۴۔ سیرتِ خدیجۃ الکبریٰ: محمد حسیب القادری
۶۵۔ سیرت الکبریٰ: تاج الدین تاج
۶۶۔ بائبل، قرآن اور سائنس: مورس بکائیے
۶۷۔ مغلوں کا زوال: ہاشم فرید آبادی
۶۸۔ شرح بالِ جبریل: پروفیسر یوسف سلیم چشتی
۶۹۔ شمعِ حقیقت: قاضی محمد علی
۷۰۔ نور اللغات: مولوی نور الحسن نیر
۷۱۔ نسیم اللغات: سید قائم رضا نسیم امروہوی
۷۲۔ المنجد: مولانا ابو الفضل عبدالحفیظ بلیاوی

☆☆☆☆☆☆☆

رسولِ کریم ﷺ کی ذاتِ بابرکات کے حوالے سے قلم فرسائی کا موقع خدا کسی کسی کو عطا کرتا ہے۔ ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کے چنیدہ ہوتے ہیں۔ ماسٹر محمد نواز بھی اللہ تعالیٰ کے ان چنیدہ لوگوں میں سے ایک ہیں جنھیں حضور ﷺ کی ذات کے حوالے سے دین اور اردو زبان دونوں کی خدمت کرنے کا موقع ملا ہے۔ مستشرقین کی ہمیشہ سے یہ عادت رہی ہے کہ وہ مسلمانوں کو نیچا دکھانے کے لیے حضور اکرم ﷺ کی ذات کے حوالے سے من گھڑت کہانیاں جوڑتے اور مسلمانوں کو کمزور ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ماسٹر محمد نواز نے ان کے اِن سوالات کے مدلل اور واضح جوابات پیش کیے ہیں۔ ان کا انداز محققانہ اور مدبرانہ ہے۔ وہ ایک سلجھے ہوئے محقق کی طرح لفظوں کو ناپتے ،تولتے اور بیان کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے تمام سوالات کو رد ہی نہیں کیا بلکہ ان کے مثبت جوابات دلائل کے ساتھ دینے کی کوشش کی ہے۔ ان کی یہ کاوش اُن کے ایک قرآن فہم اور تاریخ دان ہونے کی غماز ہے۔ علمی اور فنی اعتبار سے نہ صرف اردو زبان پر ان کی مہارت دکھائی دیتی ہے بلکہ عربی اور انگریزی پر دسترس بھی ان کے عالم ہونے کا ثبوت ہے۔ ''سیرتِ سرورِ عالم ﷺ'' کی اشاعت پر ان کے لیے بھرپور مبارک پیش کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ ان کا یہ کام ان کے لیے توشہ آخرت ثابت ہو۔

طالب حسین کوثری، فیصل آباد